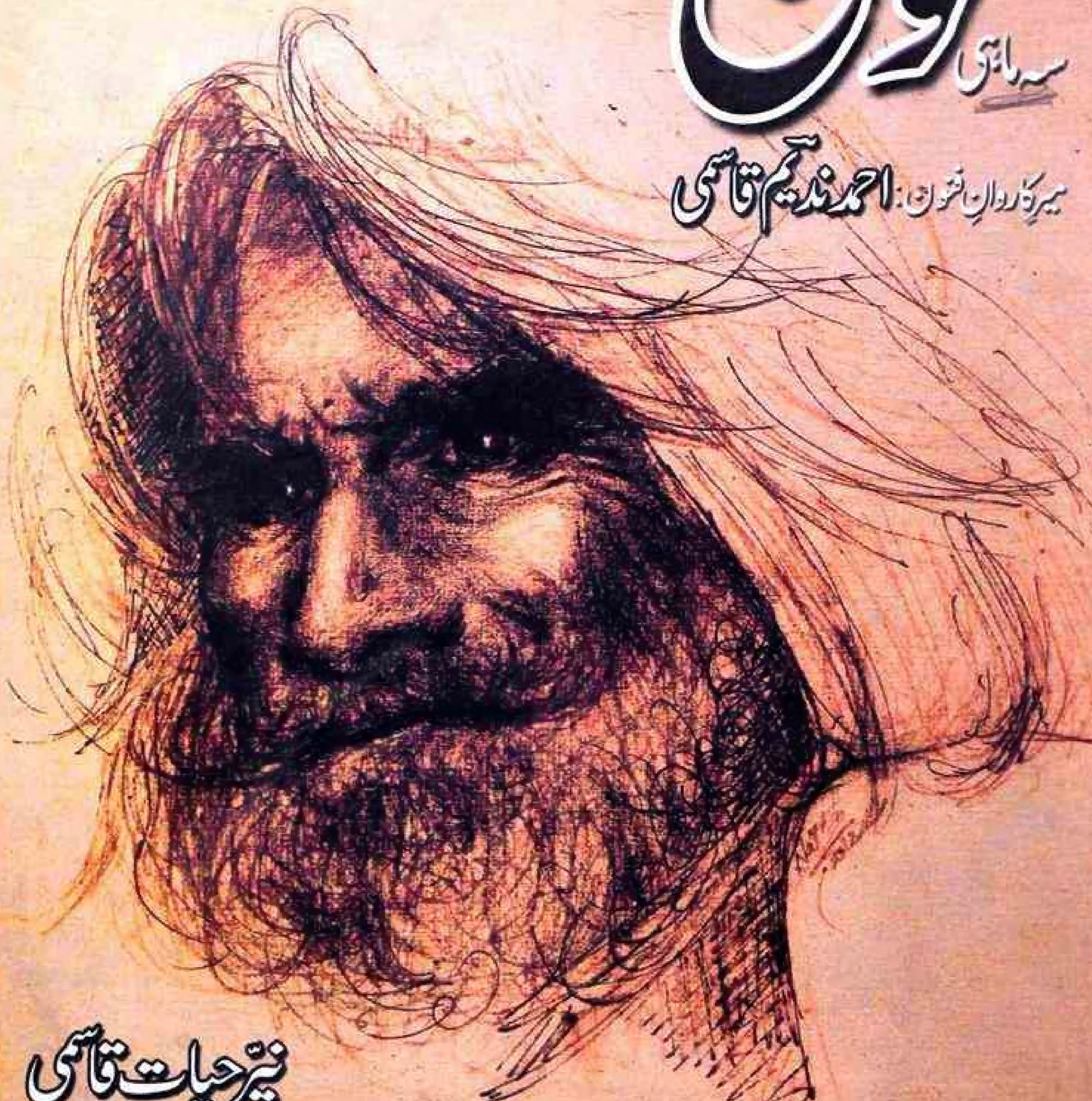
فنون

سہ ماہی

میر کاروانِ فنون: احمد ندیم قاسمی



نیر حیات قاسمی

ڈاکٹر ناہید قاسمی



جناب احمد ندیم قاسمی، انگہ میں اپنے روائتی لباس میں ملبوس۔

سہ ماہی فنون لاہور

(شمارۂ خاص)

میرِ کاروانِ فنون احمد ندیم قاسمی

ادارہ

مدیر: نیّر حیات قاسمی

مدیر اعزاز: ڈاکٹر ناہید قاسمی

زرِ تعاون سالانہ: (چار شماروں کا پیکیج)
پاکستان میں: بارہ سو روپے (مع ڈاک خرچ)
امریکہ، افریقہ، کینیڈا کے لیے: 140 امریکی ڈالر
باقی ممالک کے لیے: 120 امریکی ڈالر

شمارہ: 132
جنوری تا جون 2012ء
قیمت فی شمارہ: 300 روپے
(شمارۂ خاص: 400 روپے)

رابطہ: 251-بلاک F-2-واپڈا ٹاؤن-لاہور (پاکستان)
موبائل فون نمبر: 0092-0301-8449998
ای میل: quarterlyfanoon@gmail.com
quarterlyfunoon@gamil.com

مندرجات

O افسانے:

○ یادداشتیں:

○ سرورق: نفیسہ قاسمی

○ معاونِ طباعت: افضال احمد



HaSnain Sialvi

حرفِ ثانی

نیر حیات قاسمی

کسی بھی معاشرے میں جاری ارتقائی عمل اُس معاشرے کے ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ہونے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ارتقاء ہمیشہ مثبت سمت میں ہی ہو۔ ''ارتقاء'' منفی بھی ہو سکتا ہے۔ ایک معاشرے کی تعمیر میں ملوث اجزائے ترکیبی کی اگر بات کی جائے تو اس میں مقامی فنونِ لطیفہ کی اہمیت نا قابلِ تردید ہے۔ لکھنے، پڑھنے سے متعلق فنونِ لطیفہ کی اقسام کے علاوہ مختلف ہنر، لوک فن اور دستکاریاں وغیرہ بھی ایک معاشرے کے چہرے کے نقش ابھارنے میں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک لمحے کے لیے اگر معاشرے کو ایک جیتا جاگتا فرد تصور کیا جائے تو لکھائی، پڑھائی سے متعلق فنونِ لطیفہ اُس کی باطنی خوبصورتی کو جب کہ ہنر اور دستکاریوں جیسے فنون، اُس کی ظاہری خوبصورتی کہے جا سکتے ہیں۔ یہ بحیثیت مجموعی ہمارا رہن سہن، بول چال، سوچ اور فکر ہی ہیں جو سب مل جل کر ہمارا تاثر بناتے ہیں۔ اسی چیز کو اگر قدیم یونانی معاشرتی قواعد و ضوابط (Civics) کے مطابق دیکھا جائے اور معاشرتی نظام کی درجہ بدرجہ بڑی اکائیوں کی طرف بڑھتے جائیں تو بالآخر ایک قوم کا تاثر اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے اور کسی بھی معاشرے اور قوم کا جائزہ لیا جائے تو اُس کی منفرد پہچان میں اُس کے فنونِ لطیفہ کا عمل دخل انتہائی اہم ہوتا ہے۔ اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

فنونِ لطیفہ کی زوال پذیری، معاشرے میں منفی سوچ و فکر کو جنم دیتی ہے اور اگر اس پر توجہ نہ دی جائے تو جس طرح سیم اور تھور زرخیز زمین کو برباد کر دیتے ہیں۔ اسی طرح منفی سوچ تخلیق کو بنجر کر دیتی ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہمارے ملک عزیز میں خاص طور پر منفی سوچ اور منفی رجحانات میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جبکہ عمومی حالات بھی کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ اگر ارادتاً اس جانب توجہ دے کر محنت نہ کی گئی تو اگلی ایک دو نسلوں کے بعد حالات ہاتھ سے نکل سکتے ہیں۔ تفریح کے مواقع کی قلت، تخلیقی سرگرمیوں کے اظہار میں حائل رکاوٹیں اور اصلی فنونِ لطیفہ کی جانب عدم توجہی، ہمارے معاشرے کے درجہ حرارت میں روز بروز پریشر ککر کی طرح اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ افراد کے مزاج اور رویے سخت گیر اور شدت پسند رجحانات کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ طبیعت کی حلیمی، دھیما پن، خوشگواری مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ حالات تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی خراب ہیں مگر کئی مقامات پر فنونِ لطیفہ کی ترقی معاشرے سے منفی رجحانات کی تاثیر کو زائل کر دیتی ہے۔ افراد کو فنونِ لطیفہ کی صورت میں اپنے تخلیقی جذبات کے اظہار کا اور اپنی خواہشوں، خوابوں کے بیان کا موقع مل جاتا ہے اور یوں یہ کیتھارسس کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ہماری دھرتی بڑی زرخیز ہے، مگر زرخیزی کا فائدہ تبھی ہے کہ اس پر محنت بھی کی جائے تب جا کر اُس کی خالص

پیداوار کی صورت میں فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہمارا ماضی گواہ ہے کہ یہاں دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح فنونِ لطیفہ سے منسلک کیسے کیسے باکمال افراد گزرے ہیں (موجود تو اب بھی ہیں) ان سب نے اپنے مخصوص حوالوں سے بڑی نیک نامی کمائی اور اپنے شعبہ کو اپنے فن کے ذریعے اوجِ کمال تک پہنچایا، چاہے وہ فنونِ لطیفہ سے منسلک لکھاری ہو، شاعر ہو، مصور ہو، موسیقار ہو، اداکار ہو یا صداکار ہو۔ ہم اگر غور کریں تو معاشرے میں پنپتی بے شمار خامیاں نظر آئیں گی۔ ان میں سے بیشتر دوسرے مقامات پر بھی ہوتی ہیں اور کوئی بھی معاشرہ مکمل طور پر خامیوں سے پاک نہیں ہوتا۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ باوجود ان خرابیوں کے، توازن کیسے حاصل کرلیا جاتا ہے اور حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ یقیناً اسی اہم چیز کو فروغ دے کر حاصل کیا جاسکتا ہے، جس کی کمی ہو۔ ہمارے معاشرے میں کس چیز کی کمی ہے؟ یقیناً اس کا جواب ایک علیحدہ اور مکمل بحث کا متقاضی ہے اور یہاں فی الحال فنونِ لطیفہ کے حوالے سے بات چیت کی جارہی ہے، لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ہاں فنونِ لطیفہ کے فروغ اور دوبارہ مقبولیت کے حوالے سے کن کن باتوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ اس سلسلے میں آپ کی قیمتی آرا یقیناً رائے عامہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ آپ ہمیں تحریری طور پر اپنی آراء سے آگاہ کیجیے، جن میں سے منتخب آراء کو اجتماعی صورت میں اگلے کسی شمارے میں شامل کیا جائے گا۔ اِن شاءاللہ۔ اس سلسلے میں ادیب اور لکھاری اپنی ذمہ داری تحریری طور پر ہی ادا کرسکتے ہیں۔ عملی اقدامات یقیناً اربابِ اختیار کے مرہونِ منت ہیں، اگر وہ اس جانب توجہ دے پائیں۔

کچھ باتیں رسالے کے حوالے سے بھی ہو جائیں، ادارہ فنون تہہ دل سے اُن تمام پاکستانی اور غیر ملکی لکھاریوں کا ممنون ہے، جنہوں نے اپنی محبت اور خلوص میں گندھے جذبات، قیمتی مشوروں اور گراں قدر تخلیقات کے ذریعے اِس انتہائی اہم ادبی فورم کو دوبارہ آباد کر دیا ہے۔ آپ سب قابلِ احترام لکھاریوں، ادیبوں، شاعروں اور قارئین کی معیاری اُردو ادب سے وابستگی اور دلچسپی دیکھ کر بہت قلبی اطمینان اور حوصلہ حاصل ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سلسلہ اُس کے کرم کے سائے تلے یونہی جاری وساری رہے، آمین۔

اب جو میں کہنا چاہتا ہوں اُس کے سلسلے میں یہ بیان کرنے کی ضرورت تو نہیں مگر چھوٹی سی تمہید باندھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ادارہ فنون کی توجہ کا مرکز معیاری اُردو تخلیقات کا فروغ ہے۔ اس سلسلے میں کسی خاص شخص، علاقے یا ادارے کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ پاکستان اور دنیا کے کونے کونے سے تخلیقات موصول ہوتی ہیں اور بعض غیر معروف علاقوں سے حیران کن حد تک اعلیٰ معیار کی حامل تخلیقات سامنے آجاتی ہیں۔ تخلیقات کی تعداد قابلِ اطمینان حد تک ماشاءاللہ بہت ہے مگر ایک ادبی رسالے کے محدود وسائل اس کے صفحات کی تعداد میں ایک حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس صورتِ حال میں کچھ ترجیحات وضع کرنا ہوتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد کو نمائندگی دی جاسکے، لہٰذا وہ اصناف بطورِ خاص جنہیں ''خالص تخلیقات'' کا درجہ دیا جاسکتا ہے مثلاً شاعری (بشمول حمد، نعت، نظم، غزل وغیرہ) اور نثر (بشمول افسانہ، تنقید و تحقیق وغیرہ) کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔ اس مرتبہ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ سب سے زیادہ تعداد میں موصول ہونے والی تحریریں تخلیق کاروں کی تصانیف و تخلیقات پر لکھے گئے تبصرے اور آراء ہیں۔ ان کو اگر اکٹھا کیا جائے تو دو عدد ضخیم شمارے تیار ہوسکتے ہیں۔ ہم ان کی بھی قدر کرتے ہیں اور اِن کی اہمیت سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ اعتراض اس بات پر نہیں کہ یہ تبصرہ نما مضامین کیوں لکھے گئے بلکہ ذکر کرنے کا مقصد اُس دباؤ کو بیان کرنا ہے جس کے تحت ان مضامین کی حالیہ شمارے میں لازمی شمولیت پر شدت سے زور دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ رسالہ ایک خاص حد سے زیادہ ضخامت اختیار نہیں کرسکتا تو درخواست یہ ہے کہ معیاری کتب و تخلیقات پر تبصرہ ضرور بھیجیے مگر

اس کے بعد اس کی اشاعت کی باری کا انتظار کیجیے کیونکہ اس کے لیے ایک گوشہ مخصوص ہے اور اس شمارے میں نہیں تو کسی اگلے شمارے میں باری ضرور آ جائے گی مگر ہمارے لیے محض ان تبصروں کی شاعت کی خاطر دیگر اہم تخلیقی اصناف سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہ ہوتا۔ امید ہے کہ آپ ادارے کے نقطۂ نظر کو سمجھ پائیں گے اور اپنے تخلیقی تعاون سے ہمیں مالا مال رکھیں گے۔ شکریہ

چند گزارشات:

() ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ ''فنون'' کا یہ شمارہ بہت پہلے سے مرتب کر دیا گیا تھا لیکن لوڈ شیڈنگ کے ستم کی وجہ سے دیر ہوئی۔ بہر حال بہتری کی توقعات تو برقرار ہیں۔

() یہ شمارہ موصول ہوتے ہی آپ اپنی نئی اور تازہ تخلیقات جلد از جلد ہمیں بھجوا دیجیے گا تا کہ وقت بچایا جا سکے اور ہم ''دیر'' میں کچھ کمی کر کے بروقت اشاعت کا سلسلہ شروع کر سکیں۔

() خیال رہے کہ ''فنون'' میں شامل ہر تحریر سے مدیران، معاونین اور مشیران کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ تہذیب یافتہ علمی و ادبی مباحث سے اختلاف یا اتفاق کے لیے ''اختلافات و تاثرات'' کے در وا ہیں۔

() آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آپ ہی کی تجویز کے مطابق ''فنون'' کے صفحے بڑھا دیے گئے ہیں۔ پھر ''فنون'' کی عام ڈاک سے ترسیل میں کچھ خرابیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ہم نے طے کیا ہے کہ اپنے محدود وسائل کے باوجود رسالہ اب زیادہ تر رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھجوایا جائے گا۔ ان اسباب کی وجہ سے ہمیں رسالہ ''فنون'' کی قیمت بڑھانا پڑ رہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے آپ تعاون کریں گے تا کہ ہم مطمئن ہو کر کام کر سکیں۔

() ...... چار شماروں کا پچھلا پیکیج مکمل ہو چکا ہے۔ اس شمارے سے اگلے نئے پیکیج کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کے لیے بروقت زرِ تعاون بھجوا دیجیے۔ بہت شکریہ۔ زرِ تعاون کی تفصیل پہلے صفحے پر درج ہے۔

..........☆..........

ندیم گفتگو: ''صرف آج کے ادب میں کیا، کسی بھی دور کے ادب میں رُوحِ عصر غیر موجود نہیں ہو سکتی۔ میرو سودا، مصحفی و انشاء تک کی غزلوں کے پس منظر میں رُوحِ عصر موجود ہے، صرف ڈوب کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ آج کے ادب میں تو روحِ عصر اس حد تک موجود ہے کہ اس کے دھڑکنے کی آواز بھی سُنی جا سکتی ہے۔ دراصل روحِ عصر، ادب کی زندگی کے لیے ہوا کا حکم رکھتی ہے۔ ہوا رُک جائے تو پوری دنیائے ادب تڑپ کر چل بسے۔''

''شاعر، افسانہ نگار اور کالم نویس کی حیثیت سے میں پاکستان کے بھی مسائل پر نظر رکھتا ہوں اور یہ دیکھ کر اُداس ہو جاتا ہوں کہ ہم جہاں سے چلے تھے، وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں۔ ہمیں سیاستدانوں اور مارشل لاء نے آگے بڑھنے ہی نہیں دیا...... اگر فیوڈل نظام پاکستان کی ابتدا میں ہی ختم کر دیا جاتا تو آج پاکستان پسماندہ ملک کہلانے کی بجائے ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہو رہا ہوتا مگر ہم نے حکومت ہی فیوڈلز کی خدمت میں بطور خراج پیش کر رکھی ہے۔ اس لیے پاکستان کے مسائل کی تفصیل مجھ سے نہ پوچھیے۔''

(احمد ندیم قاسمی)

بین السطور

خالد احمد

پالنے کی عمروں سے، ادب کچھ بنیادی سوالات سے کھیلتا چلا آ رہا ہے۔ یہ بنیادی سوالات، عہد بہ عہد، جواب آشنا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ دم بدم متغیر حالات، ان بنیادی سوالات کے لیے نت نئے جوابات مہیا کرتے رہے ہیں مگر ان سوالات کا بے چین بچپنا، ان سوالات کی بے کل روح قرار آشنا نہ ہو پائی اور یہ سوال بھیس بدل بدل کر ہر دور میں ادیب کو بہلاتے اور قاری کو لبھاتے رہے۔

ادب کے سوالات، اہل دانش کے سوالات بنتے رہے اور اہل دانش کے لیے خام مال فراہم کرتے رہے۔ اہل دانش کے چمکتے ہوئے تصورات ادباء پر نئی اڑانوں کے لیے آفاق وا کرتے رہے اور ادباء کے تجربات اہل دانش کے آفاق کشا اذہان میں جھلملا جھلملا کر نور کے رنگ بھرتے رہے۔

اہل دانش کسی سوال کا جواب ڈھونڈ لیں تو اس جواب کو ایک آفاقیت سے ہم کنار کرنے کی خاطر پوری زندگی پر محیط کر دیتے ہیں اور یوں ذہن کے ایک گوشے سے اُبھرنے والے اَن گنت سوالوں میں سے کسی ایک سوال کے جواب سے پوری کائنات کی توضیح کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اہل دانش میں یہ نظریہ ساز دانش مند کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اہل ادب اور اہل دانش کا دوطرفہ ربط وضبط ادباء میں بھی ''نظریہ سازی'' کے رجحان کو پروان چڑھاتا ہے اور یوں ادب میں ''نظریہ ساز ادباء'' کے ساتھ ساتھ ''نظریہ ساز نقاد'' بھی جنم لے لیتے ہیں جنہیں بیک وقت ادب اور دانش پر ''مقتدر'' ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ ادیب اسے ''دانش مند'' اور دانش مند اسے ''ادیب'' کہہ کر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یہ دونوں کی جان نہیں چھوڑتا۔

اگر ہم اپنی گفتگو کو پاکستانی ادب تک محدود کر لیں اور اپنی بھرپور توجہ صرف گزشتہ تین دہائیوں کے دوران جنم لینے والے پاکستانی ادب پر مرکوز کر دیں تو ایک بنیادی سوال اپنا دامانِ جواب پھیلائے ہمارے سامنے آ کھڑا ہوگا، اور وہ یہ کہ ہمارے ادب میں زمزمہ آراء ''مجموعی مزاحمتی لے'' گزشتہ تین دہائیوں کے دوران آہستہ آہستہ مدھم سے مدھم کیوں کر ہوتی چلی گئی؟ آیا ہمارے ''مزاحمتی ادب'' کا ''مجموعی بنیادی سوال'' جواب کے گھاٹ اتر گیا ہے یا یہ سوال کوئی ایسا نہ تھا جو طویل عرصے تک ہماری تخلیقی صلاحیتوں کے مواج دریا پر رواں دواں رہ سکتا۔

اس ناگزیر سوال کو جھاڑ پونچھ کر بالکل صاف کیا جائے تو یہ ''سوال عدل'' قرار پائے گا، لیکن یہ سوال کوئی نیا نہیں۔ یہ تو

ادب کے پالنے کی عمروں سے ادب کا حصہ ہے۔ اگر اسے ''ظلم کے خلاف احتجاج'' کی رو سمجھا جائے تو یہ بھی کوئی نئی رو نہیں۔ یہ موج احتجاج تو ادب کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح لگی ہے اور اگر اسے واضح طور پر ایک نا قابل بیان بیزاری کا تسلسل اور متواتر شدید تر اظہار کہا جائے تو یہ یقیناً گزشتہ تین دہائیوں میں ''نغمہ فرما'' سوال سے زیادہ ''جواب'' قرار پائے گا۔ گزشتہ تین دہائیوں کے دوران یہی احساسِ بیزاری آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوتے گم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور ایسا ہوتے ہوتے ادب نے کیا کھویا اور کیا پایا؟

حالات سے بیزاری کا مسلسل اظہار، ادب کے قاری کے ذہن میں حالات سے بیزاری کے ساتھ ساتھ ''زندگی سے بے زاری'' کا احساس بھی پیدا کرتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ ادب سے بھی بیزار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا ''پسندیدہ ادب'' اس کی ''بیزارانہ توقعات'' پر پورا نہیں اتر سکتا۔ ''مزاحمتی ادب'' کا قاری خاص طور پر ''پاکستان کے مزاحمتی ادب'' کا قاری اپنے ادیب سے وہ توقعات رکھتا ہے جو اسے کسی ''مزاحمتی سیاسی کارکن'' سے بھی نہیں ہوتیں۔ وہ ادیب کو ایک ''باقاعدہ اور عملی سیاست کار'' دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک ادب اپنی معنویت کھو دیتا ہے کیونکہ اس کا ادیب اسے ایسی دنیا میں سانس لینا پر مجبور کر دیتا ہے جہاں محض بیزاری کا راج ہوتا ہے۔

ادھر ''مزاحمتی ادباء'' بخوبی ''واقفِ حال'' ہوتے ہیں اور اپنے قاری کی توقعات پر پورا نہ اتر سکنے کے بارے میں شدید احساس رکھنے کے سبب بالآخر ادب سے ہی دست بردار ہو جاتے ہیں اور بہت سے ادباء چائے خانوں میں یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ یہ دور ''ادب'' کا نہیں ''سیاست'' کا ہے۔ یہ حضرات ''ادب'' کا لفظ اتنی حقارت اور نفرت سے ادا فرماتے ہیں گویا اس سے زیادہ ''بے مصرف'' شے دنیا میں وجود ہی نہ رکھتی ہو۔

بیزاری پھیلانے والے بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پاکستانی ادب میں بیزاری کے اس مسلسل اظہار نے ادب کے قارئین کی تعداد کم کی۔ پھر اس کم ہوتی ہوئی تعداد کو لبھانے کی خاطر ''اسلوب'' کے بہانے تراشے اور نتیجتاً ادب کے قارئین کی تعداد کو محدود تر کیا اور پھر آپس میں دست و گریباں ہو گئے کہ ادیب کی آخری ذمہ داری اپنے مقام کا تحفظ رہ جاتا ہے۔

ذمہ داری ایک ایسا مشکل لفظ ہے جسے ''ادا'' کرنے کے ساتھ ساتھ ''نبھانا'' مشکل تر ہے۔ ادب اور ادیب کے منصب پر گفتگو کے دوران ''ذمہ داری'' کا لفظ اتنی بار استعمال ہوتا ہے کہ ادب بھی ایک ''ناقابل سبک دوش ذمہ داری'' بن کے رہ جاتا ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ''بے زاری'' سے دست کشی اسی ''ناقابل سبک دوش ذمہ داری'' سے سبک دوش ہونے کی ایک کوشش کہی جا سکتی ہے۔

موجود عہد کے مقبول شعرا کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور یہ تمام شعراء بے زاری کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ ''انفرادی دکھ''، ''مشین کا خوف''، ''ذاتی شکست و ریخت'' کی تراکیب، ان شعراء کے کلام کی توضیح میں استعمال نہیں ہو سکتیں۔ کیا یہ ایک نکتہ ہمارے ادباء کے لیے بہت کچھ سوچنے کا مواد نہیں رکھتا؟ اگر رکھتا ہے تو آیئے، سوچیں اور بے زاری کی جگہ بیداری اور شعور اور اعتدال کے لیے لکھیں کہ محبت، شعور، اعتدال کی بیداری کے سوا کچھ اور نہیں۔

(''فنون''......جون، جولائی ۱۹۸۶ء)



خورشید بیگ میلسوی

حمد

دشتِ بے آب کو پانی بھی وہی دیتا ہے
میرے لفظوں کو معانی بھی وہی دیتا ہے

گردشِ وقت پہ ہر پل ہے تصرف اس کا
میرے سانسوں کو روانی بھی وہی دیتا ہے

وہی دیتا ہے حقیقت میں سکونِ خاطر
طبعِ نازک کو گرانی بھی وہی دیتا ہے

حُسنِ یوسفؑ کو وہی دیتا ہے تابِ خورشید
اور زلیخا کو جوانی بھی وہی دیتا ہے

وہی کرتا ہے تکلم کو ترنم آثار
جرأتِ شعلہ بیانی بھی وہی دیتا ہے

عشق کی جوت جگاتا ہے وہی سینوں میں
دولتِ اشک فشانی بھی وہی دیتا ہے

وہ جو روپوش ہے آنکھوں سے بظاہر خورشیدؔ
اپنے ہونے کی نشانی بھی وہی دیتا ہے

سرور حسین نقشبندی

حمد باری تعالیٰ

حمد تیرا ہے مری اشک فشانی مولیٰ
کھول دے مجھ پہ درِ حرف و معانی مولیٰ

صبح غنچے بھی دما دم تری تسبیح کریں
ذکر تیرا ہی کرے رات کی رانی مولیٰ

جن کے دیکھے سے ہمیں یاد تری آتی تھی
کر گئے ہیں وہ کہاں نقل مکانی مولیٰ

حمد کہتے ہوئے ہر آن یہ رہتا ہے خیال
حق ادا کیسے کرے بندۂ فانی مولیٰ

سانس جس طرح ارادے کے بغیر آتے ہیں
تیری تسبیح میں ہو ایسی روانی مولیٰ

راس آتا ہے یہی طرزِ تکلم مجھ کو
حالِ دل کہتا ہوں اشکوں کی زبانی مولیٰ

جاتے جاتے ہو ترا ذکر زباں پہ جاری
یوں خوش انجام ہو سرورؔ کی کہانی مولیٰ

ریاض حسین چودھری

نعت

گھر کے دیوار و در مجھ سے کہنے لگے، ہم بھی بہرِ سلامی وہاں جائیں گے
ہمسفر سب ہمارے رہیں مطمئن، اُن کے در کے سوا ہم کہاں جائیں گے

سجدے کرتے ہوئے وادیِ عشق میں، یہ ہوائیں ہی کیا، یہ فضائیں ہی کیا
یہ گھٹائیں ہی کیا، فاختائیں ہی کیا، شہرِ دلکش میں سات آسماں جائیں گے

پھول، جگنو، ستارے، دھنک، کہکشاں، خوشبوئیں، بلبلیں، روشنی تتلیاں
ساتھ میرے مدینے کی گلیوں میں بھی، دیکھنا سب مرے مہرباں جائیں گے

اُن کی راہوں میں پلکیں بچھائے ہوئے، لب درودوں کا پرچم اٹھائے ہوئے
آنسوؤں کے دیئے سب جلائے ہوئے، چشمِ تر کے کئی کارواں جائیں گے

زخم کتنے بدن پر بکھرتے رہے، کتنے موسم دکھوں کے گزرتے رہے
عصرِ نو کی نئی کربلا میں رقم، ہم سناتے ہوئے داستاں جائیں گے

آسمانِ ہدایت پہ لکھا گیا، حشر تک اب قیادت ہے سرکارؐ کی
گمرہی کے وثیقے جو لکھتی ہے شب، آج بھی سب کے سب رائیگاں جائیں گے

یہ قلم میرا ٹوٹا ہوا یہ قلم، چوم لے گا نقوشِ قدم آپؐ کے
حشر کے دن اٹھا کر ثنا کے علم، اُن کے قدموں میں نطق و بیاں جائیں گے

خیمۂ عافیت میں قیامت کے دن، زخم موجِ غضب کے سجائے ہوئے
جن پہ اسمِ محمدؐ ہے لکھا ہوا، کشتیوں کے وہی بادباں جائیں گے

دھڑکنوں کے ہے لب پہ بھی صلِ علیٰ یانبیؐ، یانبیؐ، یانبیؐ مرحبا
رقص کرتے ہوئے میرے حرفِ ادب، سوئے طیبہ، دلِ ناتواں جائیں گے

امنِ عالم کی آقاؐ ضمانت ملے، امتِ بے نوا کو امامت ملے
کب تلک آندھیوں کی ہتھیلی پہ زخمی پرندوں کے یہ آشیاں جائیں گے

بام و در پر چراغاں کرے گی ہوا، جھوم اٹھے گی شہرِ قلم کی فضا
پھر سجیں گی وہی نعت کی محفلیں، قافلے عاشقوں کے جہاں جائیں گے

پیش کرنے کو دامن میں کچھ بھی نہیں، بس پسینے میں ڈوبی ہوئی ہے جبیں
ہم ریاضؔ اپنے آقاؐ کے دربار میں لے کے اشکوں کا سیلِ رواں جائیں گے

آصف ثاقبؔ

نعت

دکھوں میں چشمِ تر یادِ نبیؐ ہے
مداوا سربسر یادِ نبیؐ ہے

سہارا ہے مدینے کی تمنا
ہماری چارہ گر یادِ نبیؐ ہے

مرے زخموں کا سبزہ سبز گنبد
مرا خونِ جگر یادِ نبیؐ ہے

تہہِ دیوار ہیں سب اور یادیں
جہاں میں بام پر یادِ نبیؐ ہے

ہر اک دختر ہے پیرو فاطمہؓ کی
نیازِ ہر پسر یادِ نبیؐ ہے

خیالِ خام مٹ جاتا ہے اک دن
مگر دل میں اَمر یادِ نبیؐ ہے

ہمارا اس بھری دنیا میں ثاقبؔ
نہیں کوئی مگر یادِ نبیؐ ہے

سیّد ریاض حسین زیدی

نعتؐ

نُورِ ازل کی جلوہ گری چار سُو میں ہے
ہر گُل کے، ہر شجر کے، ہر اک رنگ و بُو میں ہے

مختارِ کُل بنایا گیا ہے حضورؐ کو
جو کچھ بھی ہے، حضورؐ ہی کی گفتگو میں ہے

جو کچھ ملے گا، آپؐ کے دم سے، کمال کا
ہر تشنہ لب کی آنکھ کا محور سُبو میں ہے

ہر ولولہ جوان ہے، جذبہ سُرور بخش
لُطف و کرم حضورؐ کا میرے لُہو میں ہے

خوشنودیٔ خُدا کا وسیلہ حضور ہیں
حُرمت خُدا کی آپؐ ہی کی آبرو میں ہے

سب کچھ خدا نے آپؐ کو دل کھول کر دیا
ملتا ہے اُس کو، آپؐ کی جو جستجو میں ہے

آقا! بروزِ حشر سہارا ہو آپؐ کا
ہر آرزو کی جان اسی آرزو میں ہے

گر آنکھ ہے تو دیکھ لے شہرہ حضورؐ کا
عرش و زمین و خُلدِ بریں، کُو بکُو میں ہے

مجھ کو ریاضؔ! مدحتِ خیرالوریٰ، شِفا
قلب و نظر کا چین، اِسی مُشکبو میں ہے

جلیل عالی

جگمگ نور نہایا رستہ (طویل نعت)

مجھ پر کھول خدایا رستہ
نعت محمد والا رستہ

جس پر سوچ سلامت جائے
ہو محفوظ کچھ ایسا رستہ

اس کی شان کے جو شایاں ہوں
وہ الفاظ بچھاتا رستہ

اوروں سے کچھ راہ جدا ہو
پر ہو تیری رضا کا رستہ

عکس دکھائے اُس ہادی کے
اک ایسا آئینہ رستہ

اور بھی اس کے پروانوں کا
ذوق و شوق بڑھاتا رستہ

اس تک جو فریاد رسا ہو
ایسا حرف و صدا کا رستہ

اس کی شفاعت سے مَس کرتا
درِ نجات کو چھوتا رستہ

میں کیا جانوں تُو ہی جانے
دل کی تمنا کیا کیا رستہ

وہ جو حرا سے لایا رستہ
اُجلا، نکھرا، سنورا رستہ

جہل کے گھور اندھیروں اندر
جگ مگ نور نہایا رستہ

سوچ کے پوچ بیابانوں سے
باغوں سمت نکلتا رستہ

دور کرے سب دہر خسارے
خیر و برکت والا رستہ

رستوں کی تاریخ بتائے
کوئی نہیں ہے ایسا رستہ

ہار گئیں کتنوں کی راہیں
ایک اُسی کا جیتا رستہ

پیچھے چھوڑ سبھی رستوں کو
آگے آگے جاتا رستہ

رہتی دنیا تک دھرتی پر
محکم امن حوالہ رستہ

لاکھ سلام اُسے جس دل پر
رب نے آپ اتارا رستہ

اُس نے دکھایا کیسا رستہ
سیدھا، سادا، سچا رستہ

اُس نے بچھایا فرشِ دل پر
عرشِ بریں سے اُترا رستہ

کتنے زمانوں وقت نے دیکھا
تارا تارا اُس کا رستہ

منزل منزل آگے بڑھتا
آخر اُس تک پہنچا رستہ

اللہ اللہ، آقا آقا
کیسی منزل، کیسا رستہ

اللہ اللہ، آقا آقا
واحد منزل، تنہا رستہ

اللہ اللہ، آقا آقا
اپنی منزل اپنا رستہ

اللہ اللہ، آقا آقا
منزل منزل، رستہ رستہ

حکمتِ دوراں، رحمتِ عالم
درد کا رشتہ، پیار کا رستہ

اس نے چنا کیا یکتا رستہ
سینوں بیچ بنایا رستہ

قدم قدم قرباں دل اُس پر
جس کے وسیلے پایا رستہ

جو قرآن میں جھلکا رستہ
اس نے وہی اپنایا رستہ

اُس نے سب انسانوں خاطر
دل آنکھوں سے دیکھا رستہ

انساں بھول چکا تھا رستہ
اُس نے یاد دلایا رستہ

اور پھر اپنے حسنِ عمل سے
اُس نے اور اجالا رستہ

اس نے تمام زمانوں خاطر
راتوں جاگ کے سوچا رستہ

کوئی نہیں تھا جادۂ ہستی
وہ آیا تو نکلا رستہ

ایک وہی تہذیب کی منزل
ایک وہی عرفان کا رستہ

اُس نے تمام جہانوں خاطر
اپنے رب سے مانگا رستہ

اُس پر اترا اور پھر اس نے
سینوں بیچ اتارا رستہ

وقت کے تیرہ زندانوں میں
اس کے نام سے پیدا رستہ

اُس کے لحن میں چپ صحراؤں
پیار کی بولی بولا رستہ

باہم دشمنِ جاں لوگوں پر
امن و اماں کا کھولا رستہ

دل نے دھیان اس کا چھوڑا تو
آنکھ سے اوجھل ہو گیا رستہ

اُس کے نقوشِ پا کی ضیا سے
روشن کاہکشاں سا رستہ

اک آوازِ اذاں پر سب کو
لے کے حرم تک آیا رستہ

اُس کی وفا سے منہ موڑا تو
کھو گئی منزل بھولا رستہ

اس کے خرامِ نور فزا سے
شب زاروں میں دمکا رستہ

دنیا اور کہاں پائے گی
ایسا افضل و اعلیٰ رستہ

اُس سے اگر ناطہ توڑا تو
پھر نہ کسی نے پایا رستہ

اک کردار کہ جس کے ناطے
دل سے دل تک پہنچا رستہ

ہر اک سوچ خسارے والی
اور یہ نفعوں والا رستہ

کیوں بھٹکو ہو سوچ تھلوں میں
اور کرو ہو کھوٹا رستہ

اک رفتار کہ صدیوں والا
پل دو پل میں نمٹا رستہ

کون ہیں، کیا ہیں، کس خاطر ہیں
سب احساس جگاتا رستہ

اس کی یاد رہے سینے میں
آپ سے آپ بنے گا رستہ

اُس نے کیا سمجھایا رستہ
یوں کہ لہو میں دھڑکا رستہ

اک مہتاب فروزاں دل میں
جگ جگ روشن اپنا رستہ
سب رستوں سے بہتر و برتر
صدیوں جانچا پرکھا رستہ
ایک کتاب اور ایک پیمبر
کیسی ہدایت کیسا رستہ

اس کے عشق کی انگلی تھامی
استقبال کو آیا رستہ
اُس نے قدم بڑھائے جس پر
وہ تا حشر چلے گا رستہ
ایک کتاب اور ایک پیمبر
ناطق حکمت گویا رستہ

کیا کیا شوق بہشتوں جانب
دھڑکن دھڑکن بڑھتا رستہ
اُس کے سیرت آئینے سے
خلق پہ روشن پورا رستہ
ایک کتاب اور ایک پیمبر
اپنی قیادت اپنا رستہ

یاد کیا مشکل میں اُس کو
دیواروں سے نکلا رستہ
نفرت کی ماری دنیا میں
سب سے پیار سکھاتا رستہ
اس کی ولا کے سائے سائے
سہل ہوا ہے کتنا رستہ

سہل اُسی کے دم سے ہم پر
ساری مسافت، سارا رستہ
منزل! اُس سے وفا کی منزل
رستہ! اُس کی رضا کا رستہ
کیسے کیسے شوق مراحل
کیا کیا بھید بجھاتا رستہ

کر تحریر محبت اُس کی
دیکھ دلوں میں بنتا رستہ
اُس کی یاد بسائی دل میں
کتنا آساں گزرا رستہ
منزل صرف اُسی کی قسمت
جو اُس سے وابستہ رستہ

لے ہر سانس اُسی کی لَو میں
جس کی رو میں زندہ رستہ
اُس کی رو میں چلتے جائیں
ہم نے یہی پہچانا رستہ
کون سبھوں سے اچھا رستہ؟
اس پہ ہوا جو اِلقا رستہ

اُس کے دھیان سفر میں کیا کیا
پھولوں پھول مہکتا رستہ
جب تاریخ نے پوچھا رستہ
صرف اُس نے بتلایا رستہ
کون ڈگر چل حق تک جائیں؟
اُس نے جو اپنایا رستہ

لاکھ عدو نے روکا رستہ
اُس کا کہاں رُک پایا رستہ
فرشِ غارِ حرا سے لے کر
عرشِ علیٰ تک جاتا رستہ
کون مثالی جادۂ ہستی؟
اُس کے عمل سے نکھرا رستہ

ویراں ہو گئے کیا کیا جادے
اُس کا رواں ہر لحظہ رستہ
اُس کے سفر کی سمت مطابق
وقت نے اپنا بدلا رستہ
کون طریق طریقِ کامل؟
بس اک اسوۂ حسنہ رستہ

کون سبیلِ سبیلِ محکم؟
اس کی سیرت والا رستہ

کب تھی آنکھ بصیرت والی
اور بہت نازک تھا رستہ

اوجِ فلاح و خیر کی جانب
پائے چاند ستارہ رستہ

کون صراط نجاتِ عالم؟
اس نے جو سمجھایا رستہ

یہ اعزاز قلم کی قسمت
تیری عطا سے پایا رستہ

اس محبوب نگاہ میں رکھنا
جس نے دکھایا تیرا رستہ

کون سلوک صفائے انساں؟
خلق عظیم سے نکلا رستہ

اپنے خاص کرم سے مولا
ہم پر کھول صفا کا رستہ

دھول رہوں اُس کے قدموں کی
اور ہے باقی جتنا رستہ

کون روش روشن ہو سینہ؟
اس کا نور نہایا رستہ

سوچوں کے اندھے جنگل میں
کر عرفان کا افشا رستہ

میں کیا مانگوں تو ہی جانے
راس ہمیں ہے کیا کیا رستہ

کون جتن جاں تسکیں پائے؟
اس کی محبت والا رستہ

یارب تو نے سُجھایا رستہ
تیرے کرم سے نکلا رستہ

''جلیل عالی کی طویل نعت''

''جلیل عالی کے فن کی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات کی فراوانی میں بھی اپنا لہجہ دھیمار کھتے ہیں اور شعر کو مقام اطاعت سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ حضور ختمی مرتب، شارع علیہ السلام ہیں۔ شریعت سے تجاوز عقیدت کے اعمال بھی ضائع کر دیتا ہے۔ شریعت، اللہ کی پیدا کی ہوئی راہِ راست سے عبارت ہے۔ اسی لیے عالی نے بہت سوچ سمجھ کر ننانوے اشعار کی نعت نما مناجات میں ''اھدنا الصراط المستقیم'' کے حوالے سے رستہ کی ردیف کا انتخاب کیا ہے اور اسے بہ حسن و خوبی نباہا ہے۔ انہوں نے حضور علیہ السلام کے متعین کردہ راستے کے اتنے پہلو اجاگر کر دیے ہیں کہ قارئین پڑھتے جائیں اور شاعر کی ژرف نگاہی اور ہنر وری کو داد دیتے جائیں۔'' (ایک اقتباس.....امین راحت چغتائی)

خورشید بیگ میلسوی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

جب تصور میں ترا گنبدِ اخضر باندھا
دیدۂ شوق نے فردوس کا منظر باندھا

ذہن و دل، فکر و نظر، حرف و قلم سب مہکے
شاخِ احساس سے یہ کس نے گُلِ تر باندھا

ہر نئی چیز نے دی دعوتِ نظارہ مجھے
میں نے آنکھوں سے مگر ایک ہی منظر باندھا

معنیٔ قندِ مکرر کا ہوا تب ادراک
جب ترا اسم مرے لب نے مکرر باندھا

خالقِ نطق نے اظہار کی بارش کر دی
میں نے جب صلِ علیٰ اپنے لبوں پر باندھا

اس کے سینے کو اجالوں نے بنایا مسکن
جس نے تعویذ تیرےؐ نام کا لکھ کر باندھا

اپنی تحریر میں اربابِ نظر نے مجھ کو
ازرہِ نعت مقدر کا سکندر باندھا

ایک اک حرف دمکنے لگا خورشید مثال
مطلعِ نعت میں جب روئے منور باندھا

قائم نقوی

نعت

زباں پر نعت، دل میں حمدِ رب ہے
اُجالا ہی اُجالا لب بہ لب ہے

تری نسبت سے ہو پہچان میری
یہی میری وفا میرا نسب ہے

اُسی کا عکس ہے ہر آئینے میں
جمالِ یار بھی کتنا عجب ہے

رہوں، تیرا رہوں جس حال میں بھی
کہ جینے کا یہی تو ایک ڈھب ہے

بسی ہے یاد اُن کی دھڑکنوں میں
یہی تو میرے ہونے کا سبب ہے

تمہارے ذکر کی سرشاریوں میں
دیارِ دل میں اِک جشنِ طرب ہے

اشرف جاوید

نعت

نبی کا عشق ملا نعت تک رسائی ہوئی
تمام عمر کا حاصل یہی کمائی ہوئی

حرم میں اب بھی اذانِ بلالی گونجتی ہے
یہ بستی سجدہ گزاروں کی ہے بسائی ہوئی

اُسی کے چشمِ کرم سے دلوں کے قفل کھلے
اُسی کے دم سے اسیران کی رہائی ہوئی

اُسی کے پاس پڑی تھیں امانتیں ساری
اُسی کی جان کو خلق خدا تھی آئی ہوئی

سکوتِ شب کہیں پاتال میں اترتا ہوا
سحر بہار کے مانند چہچہائی ہوئی

قلم سنوارا گیا، لوح کو نکھارا گیا
جمال حرف محبت سے روشنائی ہوئی

یقیں اجال دیا، راستہ بحال کیا
بٹھائی گرد گماں نے جو تھی اڑائی ہوئی

پھر اہل مکہ نے قدموں میں رکھ دیے دل بھی
فضا اخوت و رحمت کی رنگ لائی ہوئی

دیا وہ آخری خطبہ، وہ آخری دستور
ہر آنے والے زمانے کی رہ نمائی ہوئی

نعت

ہم تہی حرف و بیاں، ہم سے کہاں ہوتے ہیں
تیرے اوصاف تو اللہ سے بیاں ہوتے ہیں

جاری رہتا ہے مگر گنبدِ خضریٰ کا طواف!
روز و شب قافلے سدرہ سے رواں ہوتے ہیں

تب بھی روشن تھے ترے ذکر سے یہ کون و مکاں
اب بھی وہ چرچے سرِ کون و مکاں ہوتے ہیں

نظر آتے ہیں بہ ظاہر جو ترے خانہ بدوش
وہی دانائے جہاں، جائے اماں ہوتے ہیں

جگمگاتے ہیں جمالِ کفِ پا سے افلاک
خاک داں نور فشاں، نور فشاں ہوتے ہیں

کیا کرم ہے! قدم اٹھیں جو مدینے کی طرف
راستے آپ ہی منزل کا نشاں ہوتے ہیں

وہی آزاد ہوئے ہیں جو ہوئے تیرے غلام
ورنہ آزاد بھی آزاد کہاں ہوتے ہیں

چاروں یاروں کی تب و تاب اُسیؐ کے دم سے
یہ ستارے مہِ طیبہ سے تواں ہوتے ہیں

اک نظر خیر کی ہم خستہ خرابوں کے لیے
اک نظر جس سے حرم وقفِ اذاں ہوتے ہیں

نورین طلعت عروبہ

نعتِ رسولِ مقبولؐ

مدینے کے نگر کی خاک دے دے
زمیں پر رتبۂ افلاک دے دے

اُنہی کی آرزو سے زندگی ہے
تمنائے شہِ لولاک دے دے

بھلے باغِ جہاں سے کچھ نہ دینا
مدینے کے خس و خاشاک دے دے

عمل کے سب خزانوں سے اُٹھا کر
مجھے وِردِ درودِ پاک دے دے

ہر اک آنسو میں ان کا عشق چمکے
اگر تو دیدۂ نمناک دے دے

ہمیں بھی شہرِ علم و آگہی سے
بہت سی دولتِ ادراک دے دے

وہ جس میں بوئے حضرت عائشہؓ ہو
مجھے ایسی کوئی پوشاک دے دے

نعتِ رسولِ مقبولؐ

ہیں مدینے کی پیاری فضا میں مگن، ضوفشاں، رفعتیں
رشک کی آنکھ سے دیکھتا جائے ہے آسماں، رفعتیں

اُس زمیں پر بلندی کا معیار ہے کس قدر مختلف
جو بھی جتنا جھکا اس نے پائی ہیں اتنی یہاں، رفعتیں

اطمینان و سکوں کی انوکھی فضا، تابہ حدِ نظر!
خوشگواری میں ڈوبی ہوئی حیرتیں، بے کراں، رفعتیں

بس مدینہ جہاں عظمتوں کو رعونت سے نسبت نہیں
اس جگہ بولتی ہیں محبت کی میٹھی زباں، رفعتیں

ساتویں آسماں سے اُدھر جبرائیلِ امیں کی رسائی نہ تھی
میرے ہادی گئے جن مقامات پر دے رہی تھیں اذاں رفعتیں

پورے قد سے کھڑی ہوں میں تو ان کی ثنا کا کرشمہ ہے یہ
ورنہ پاتے ہیں سارے حروف و بیاں بھی کہاں رفعتیں

متقی جانتا ہے فقط اُن کی تقلید کی عظمتیں
رفعتوں نے کہا، اُن کے قدموں کے سارے نشاں رفعتیں

ہارون الرشید

نعت

اے مرے آقاؐ سبھی کے دستگیر
آپؐ ہی ارض و سما میں بے نظیر

آپؐ والی آپؐ داتا آپؐ شاہ
میں تو اک دریوزہ گر میں اک فقیر

آپؐ کے نقشِ کفِ پا چارسُو
کاش مل جائے کوئی اس کی لکیر

اپنا سایہ مجھ پہ پھیلا دیجیے
ہے گریباں چاک دامن لیر لیر

سوچتا ہوں تو تڑپ جاتا ہوں میں
آپؐ کی ہستی ہے کتنی ناگزیر

آپؐ پر ماں باپ میرے ہوں نثار
آپؐ کے صدقے مری جانِ حقیر

آپ کے ہاں ہو مری جائے اماں
میں مسافر شب کا میں اک راہ گیر

انیل چوہان

نعتیہ

مُعَین جو ہوئی راہِ ہدایت آپ کی آقاؐ
نجاتِ دین و دنیا ہے اطاعت آپ کی آقاؐ

بہت سے انبیا رُشد و ہدایات دینے آئے تھے
چلے گی تا قیامت ہی شریعت آپ کی آقاؐ

بدل ڈالی ہے ان کی کاتب تقدیر نے قسمت
دلوں میں ضوفگن جن کے محبت آپ کی آقاؐ

تبھی تو یہ موذن بھی گواہی روز دیتے ہیں
خدا نے جو ہمیں دی ہے شہادت آپ کی آقاؐ

محبت سے بدل ڈالا چلن دشمن زمانے کا
بنی ہے باعثِ رحمت نبوت آپ کی آقاؐ

علامت ہے کوئی ایسی نہ کوئی استعارہ ہے
کمالِ حسن ہے سیرت بھی صورت آپ کی آقاؐ

ہماری زندگی کارِ زیاں کا اک تسلسل ہے
طلب ہے حشر میں ہم کو شفاعت آپ کی آقاؐ

سرور حسین نقشبندی

نعت شریف

پلکوں پہ ستارے سے چمکتے رہے تادیر
لب ان کی ثناء کر کے مہکتے رہے تادیر

جب ذکر کسی نے بھی کیا ان کی گلی کا
آنکھوں سے میری اشک ٹپکتے رہے تادیر

کل مدح کے لفظوں نے عجب رنگ جمایا
باغات دل و جاں میں چہکتے رہے تادیر

جاتا ہوا دیکھا ہے مدینے کو جو زائر
ہم شوقِ حضوری میں سسکتے رہے تادیر

دیکھی جو تب و تاب میرے حرف ثناء کی
پلکیں گل و مہتاب جھپکتے رہے تادیر

کچھ دیر کیا ذکر نبیؐ مل کے سبھی نے
پھر گھر کے در و بام چمکتے رہے تادیر

اس گنبدِ خضراؑ کو تصور میں جما کر
میں اور دلِ بیتاب دھڑکتے رہے تادیر

سرور جنہیں مدحت کے لیے میں نے چُنا تھا
وہ حرف مجھے پیار سے تکتے رہے تادیر

نعت شریف

حدودِ طائرِ سدرہ، حضورؐ جانتے ہیں
کہاں ہے عرشِ معلیٰ، حضورؐ جانتے ہیں
ہر ایک حرفِ تمنا، حضورؐ جانتے ہیں
تمام حال دلوں کا، حضورؐ جانتے ہیں
انہیں خبر ہے کہیں سے پڑھو درود انؐ پر
تمام دہر کا نقشہ، حضورؐ جانتے ہیں
میں اس یقین سے نکلا ہوں حاضری کے لیے
میرے سفر کا ارادہ، حضورؐ جانتے ہیں
بروزِ حشر شفاعت کریں گے چُن چُن کر
ہر اک غلام کا چہرہ، حضورؐ جانتے ہیں
بروزِ حشر شفاعت کریں گے وہ لیکن
اگر ہُوا یہ عقیدہ، حضورؐ جانتے ہیں
پہنچ کے سدرہ پہ روح الامین کہنے لگے
یہاں سے آگے کا رستہ، حضورؐ جانتے ہیں
بُلا بھی سکتے ہیں وہ اور آ بھی سکتے ہیں
کہ دُوریوں کو مٹانا، حضورؐ جانتے ہیں
میں مانگتا ہوں انہیؐ سے، انہیؐ سے مانگتا ہوں
حضورؐ پر ہے بھروسہ، حضورؐ جانتے ہیں
خدا نے اس لیے قاسم انہیں بنایا ہے
کہ بانٹنے کا قرینہ، حضورؐ جانتے ہیں
اسی لیے ہے لقب انؐ کا رحمتِ عالم
کہ حال و ماضی و فردا، حضورؐ جانتے ہیں
قیامت آئے گی کب ان کو علم ہے سرور
ظہورِ کُن کا بھی لمحہ، حضورؐ جانتے ہیں

اقبال کا علمِ کلام (۲)

محمد ارشاد

اقبال نے جبر و قدر، حیات بعد ممات، خیر و شر سے خطبات میں ضرور بحث کی ہے اور یہ مسائل فلسفے کے بھی مسائل ہیں۔ علی عباس جلالپوری کے اپنے الفاظ میں بھی "دور جدید میں فلسفے کے تین پہلو تسلیم کیے گئے ہیں: تکوین کائنات پر غور کر کے ایک واضح اور مربوط نظام فکر پیش کرنا جس میں تضاد و تناقض نہ پایا جائے نیز حیات انسانی کی غایت اور مقصد اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق سے بحث کرنا اور خیر و شر، حیات بعد ممات، جبر و قدر وغیرہ کے مسائل پر قلم اٹھانا، اسے مابعد الطبیعیات یا نظری فلسفہ یا فلسفہ اول کہا جاتا ہے۔" خیر و شر، جبر و قدر اور حیات بعد ممات پر اقبال نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے، کلامی نقطۂ نظر سے نہیں۔

جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ علم کلام کیا ہے یعنی مسلمانوں کے نزدیک اس کی تعریف کیا ہے، کلامی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر میں فرق معلوم نہیں کیا جا سکتا اور فرق معلوم کیے بغیر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اقبال فلسفی تھے یا متکلم۔ سید شریف جرجانی نے کتاب التعریفات میں علم کلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

> الکلام: علم۔ یبحث فیہ عن ذات اللہ تعالیٰ وصفاتہ واحوال الممکنات من المبدأ والمعاد علی قانون الاسلام والقید الاخیر لاخراج العلم الالٰھی للفلاسفہ۔ یعنی کلام وہ علم ہے جس میں خدا کی ذات و صفات اور احوال ممکنات از مبدا و معاد سے شرع اسلام کے مطابق بحث کی جاتی ہے اور شرع اسلام کی قید فلاسفہ کے علم الٰہی (الٰہیات) سے اخراج کی خاطر یعنی دونوں میں فرق اور امتیاز کی خاطر ہے۔

یہی بات علامہ ابن خلدون نے قدرے تفصیل سے بیان کی ہے:

> متکلمین کائنات اور اس کے حالات سے وجود و صفات باری تعالیٰ پر دلیل لاتے ہیں۔ فلاسفہ بھی طبعیات میں جسم طبعی (کائنات) پر بحث کرتے ہیں مگر دونوں کا انداز بحث جدا ہے۔ فلسفی جسم میں اس حیثیت سے بحث کرتا ہے کہ وہ متحرک ہے یا ساکن اور متکلم اس زاویہ خیال سے کہ وہ اپنے جاعل و فاعل کو بتاتا ہے اور اس کی شناخت کرواتا ہے۔ اسی طرح فلسفی الٰہیات میں وجود مطلق سے اس کے اقتضاءات کے مطابق گفتگو کرتا ہے اور متکلم بھی اسی وجود کو زیر بحث لاتا ہے لیکن اس جہت سے کہ وہ اپنے موجد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علم کلام کا موضوع وہ تسلیم شدہ حقائق ایمانیہ ہیں جن کا ثبوت

پختہ عقلی دلائل سے پہنچایا جائے۔'' (مقدمہ)

علم کلام کا موضوع وہ تسلیم شدہ عقائد ایمانیہ ہیں جن کا ثبوت پختہ عقلی دلائل سے پہنچایا جائے، جیسا کہ ابن خلدون نے تصریح کر دی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خود علی عباس جلالپوری کے نزدیک اقبال کے ''علم کلام'' کا موضوع وہ تسلیم شدہ عقائد ایمانیہ ہیں جن کا ثبوت اقبال نے پختہ عقلی دلائل سے پہنچایا ہے؟ علی عباس جلالپوری کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں نفی میں ہے۔ کتاب کے باب ''اقبال کا تصور ذات باری'' میں بحث کا آغاز انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''ذات باری سے متعلق قدیم زمانے سے دو نظریات مروج رہے ہیں۔ ماورائی یعنی خدا کائنات سے ماورا ہے اور سریانی یعنی خدا کائنات میں جاری وساری ہے۔ ماورائی نظریہ سامی النسل اقوام کالدی، صابئین، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں سے مخصوص ہے اور سریانی آریائی نسل اقوام ہندوؤں، یونانیوں، رومنوں، ویدانتیوں اور نو اشراقیوں میں مقبول رہا ہے[۱]۔ جہاں تک تصورات ذات باری کا تعلق ہے اقبال فلسفۂ ارتقاء کے سریانی نظریے سے متاثر ہوئے۔ اپنے خطبات میں انہوں نے ذات باری کا یہی سریانی تصور پیش کیا ہے۔ اقبال کے سریانی تصور پر دو اعتراض وارد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ سریان کا تصور لازماً غیر شخصی ہوتا ہے جس سے مذہب کے شخصی خدا کی نفی ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ اگر کائنات ہر لحظہ ارتقاء پذیر ہے اور اس ارتقاء کا باعث ذات باری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذات باری ناقص ہے جسے ارتقاء کے مراحل طے کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو بھی اس اشکال کا احساس تھا، فکر اقبال میں فرماتے ہیں:

''اقبال جس مطلق خودی کا ذکر کر رہا ہے، وہ وجود مطلق اور ذات واجب الوجود کی ماہیت ہے لیکن خدا کی نسبت مومن یہ کیسے گوارا کرے گا کہ اس قسم کے عقائد بیان ہوں کہ آفرینش حیات و کائنات سے خدا نے ورزش ارتقاء کے لیے تخم خصومت بویا اور عالم آفرینی ایک طرح کی خود فریبی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں وجود سرمدی کا تصور عام توحید پرستوں سے بہت کچھ الگ ہو گیا ہے۔

''یہ عام توحید پرست وہی ہیں جنہیں عرفِ عام میں مسلمان کہا جاتا ہے۔ جو خدا کو کامل و اکمل، غیر متبدل، قادر مطلق، مستقل بالذات، منزہ و ماورا شخصیت سمجھتے ہیں۔ برگساں اور الگزینڈر کی تقلید میں ارتقائی سریان کا نظریہ پیش کر کے اقبال نے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید نہیں لکھی بلکہ اسی سرانی عقیدے کو سائنٹفک صورت بخش دی ہے جس کے خلاف وہ عمر بھر جہاد کرتے رہے۔''

سنگ آمد و سخت آمد۔ اقبال جس عقیدے کے خلاف عمر بھر جہاد کرتے رہے وحدت وجود کا عقیدہ ہے۔ وحدت وجود کا عقیدہ سریانی ہے جسے اقبال نے سائنٹفک صورت برگساں اور الگزینڈر کی تقلید میں دی ہے۔ یہی عقیدہ اقبال نے چونکہ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید میں پیش کیا ہے، غیر اسلامی ہے۔ پس اقبال نے درحقیقت الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید نہیں کی، غیر اسلامی عقیدے وحدت وجود کو پیش کیا ہے۔ مفتی علی عباس جلالپوری کے نزدیک صرف اقبال ہی نہیں وحدت وجود کا ہر

---

(۱) سریانی نظریہ نہ ویدوں میں موجود ہے نہ یونانی اور رومی مذاہب میں۔ ہندوؤں، یونانیوں اور رومیوں کے دیوتا اور دیویاں شخصیت سے مختص ہیں۔

قائل، غیر مسلم ہے چاہے وہ سنی ہو یا شیعہ۔ شیعہ میں صدر الدین شیرازی، شاہ نعمت اللہ، جن کے مرید نعمت اللہی کہلاتے ہیں اور ایران میں بکثرت موجود ہیں۔ حاجی ملا ہادی صاحب منظومۂ حکمۃ و شرح منظومۂ حکمۃ نیز شارح مثنوی رومی، سب کے سب دائرہ اسلام سے خارج۔ یہی حال سنیوں کی کثیر تعداد کا بھی ہے۔ خرد افروزی کے پرچارک یہ بھول گئے کہ وہ خود بھی بدرجہ اولیٰ وحدت وجودی ہیں۔ جدلیاتی مادیت کے قائل ہیں اور مادیت جدلیاتی ہو یا کلاسیکی وجود واحد، مادہ، کی قائل ہے۔ مادیئین حیات اور ذہن کو مادہ ہی کے شئون قرار دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جناب جلالپوری کو اس کا مطلق علم نہیں۔ اسی سانس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں: ''مثنوی رومی میں ارتقاء کا جو تصور ملتا ہے نوفلاطونی ہے۔ ارتقاء کے اس تصور کو تخلیقی اور بروزی ارتقاء کے روپ میں پیش کر کے اقبال اور ان کے شارحین خلط مبحث اور انتشار خیال کا باعث ہوئے۔ ان نظریات میں بعد المشرقین ہے۔'' اگر بعد المشرقین ہے تو پوری بحث کا یہ حاصل انہوں نے کیونکر ٹھہرا لیا کہ ''اقبال کے فکر و نظر کا آغاز بھی وحدت وجود اور سریان سے ہوا تھا اور انجام بھی وحدت وجود اور سریان پر ہی ہوا۔'' بحالیکہ جناب جلالپوری اس نکتے سے بخوبی آگاہ تھے کہ وحدت وجود کا قائل خودی کی حقانیت کا قائل نہیں ہو سکتا کہ اس سے تعدد وجود لازم آتا ہے اور اثبات خودی کا قائل وحدت وجودی نہیں ہو سکتا۔ تمام وحدت وجودی نفی خودی کے قائل رہے ہیں اور اثبات خودی کو کفر کے مترادف گردانتے ہیں۔

خودی کفر است نفی خویش کن زود
کہ جز حق در حقیقت نیست موجود

اور وہ خود اقبال کے ابتدائی دور کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس زمانے میں وہ اثبات خودی کی بجائے نفی ہستی کے قائل تھے جو وحدت وجود، نوفلاطونیت اور ویدانت کا بنیادی تصور ہے..... اور اہنکار یا خودی اور پردۂ ہستی کو راہ سلوک و طریقت میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔'' جب نفی خودی وحدت وجود کا بنیادی تصور ہے اور اقبال یورپ سے واپسی کے بعد تادم آخر اثبات خودی کے قائل اور پرچارک رہے اور کسی ایک موقعے پر بھی خودی کے بارے میں اپنے موقف سے ذرہ بھر پیچھے نہیں ہٹے تو کس منطق کی رو سے اقبال کے فکر و نظر کا انجام بھی وحدت وجود پر ہوا؟ یہ موقف انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ اس کے بغیر وہ اقبال کو متکلم ثابت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ کہہ بیٹھے تھے: ''بہر صورت اقبال نے غزالی کی طرح فلسفہ پڑھا تھا اور غزالی ہی کی طرح اسے اپنے موروثی عقائد کی توثیق کے لیے وقف کر دیا۔'' اسی موقف کو باور کروانے کے لیے وہ خطبات میں وحدت الوجود ڈھونڈتے رہے۔ دھاندلی یہاں تک کہ ''تاویلات اقبال'' کے ذیلی عنوان ''حیات بعد ممات'' میں خطبات سے ایک طویل اقتباس کے آخر کی وہ عبارت ہی چھوڑ دی جس میں اقبال کا غیر وحدت الوجودی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ خطبات میں ارشاد ہوتا ہے:

''متناہی خودی لامتناہی خودی کے سامنے حاضر ہو گی تو صرف اپنی انفرادیت کو ساتھ لیے ہوئے کیونکہ یوں ہی اپنی آنکھوں سے اپنے گزشتہ اعمال کو دیکھ کر وہ اس امر کا اندازہ کر سکتی ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ وکل انسان الزمنہ طائرہ فی عنقہ ونخرج لہ یوم القیامۃ کتابا یلقہ منشورا۔ اقرا کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ پھر انسان کا انجام کچھ بھی ہو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی انفرادیت کھو دے گا۔ قرآن مجید کے نزدیک انسان کی انتہائی مسرت اور سعادت ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنی متناہیت سے محروم ہو جائے، اس کے اجر غیر ممنون کا مطلب ہے اس کے ضبط نفس، اس کی یکتائی اور بحیثیت خودی اس کی فعالیت کا زیادہ سے زیادہ شدت اختیار کرتے جانا حتیٰ کہ عالمگیر تباہی کا وہ منظر بھی جس سے قیامت کی

ابتداء ہوگی۔ اس قسم کی تربیت یافتہ خودی کے سکون و اطمینان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوات ومن فی الارض الامن شاءاللہ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے استثناء کا اطلاق انہی شخصیات پر ہوسکتا ہے، جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو۔ لہٰذا بقائے دوام انسان کا حق نہیں اس کے حصول کا دارومدار ہماری مسلسل جدوجہد پر ہے۔ بالفاظ دگر ہم اس کے امیدوار ہیں۔''

قطع نظر اس سے کہ جو عبارت علی عباس جلالپوری نے نقل کی ہے، اسی سے اقبال کا غیر وحدت وجودی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ وحدت وجود کے قائل بلا استثناء فنا فی اللہ کے بھی قائل ہیں اور اقبال یہاں اس موقف کی تردید کر رہے ہیں۔ علی عباس جلالپوری نے سفسطہ سے کام لیتے ہوئے ''لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے استثناء کا اطلاق انہی شخصیات پر ہوسکتا ہے جن میں خودی کی شدت انتہا کو پہنچ گئی ہو۔'' کے بعد کی یہ عبارت چھوڑ دی ہے:

''لہٰذا اس کے نشوونما کا معراج کمال یہ ہے کہ ہم اس خودی سے براہ راست اتصال میں بھی جو سب پر محیط ہے، اپنے آپ کو قائم اور برقرار رکھ سکیں جیسا کہ قرآن پاک نے حضور سرور کائنات صلعم کے مشاہدۂ ذات کے بارے میں ارشاد فرمایا: مازاغ البصر وماطغیٰ۔ یہ ہے اسلام کے نزدیک انسانیت کامل کا تصور جس کا اظہار فارسی کے اس شعر سے بڑھ کر جو حضور رسالت مآب صلعم کے واقعہ معراج کے بارے میں کہا گیا اور کہیں نہیں ہوا:

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

لیکن وحدت الوجود کو یہ نقطہ نظر پسند نہیں۔'' (ترجمہ نذیر نیازی۔ صفحہ ۱۷۸)

اقبال کے ان الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ وہ وحدت الوجود کے خلاف موقف رکھتے ہیں۔ اس کے باوصف علی عباس جلالپوری اقبال کو وحدت الوجودی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر بدنیتی پر مبنی نہیں تو پھر وہ گڑبڑائے ہوئے ذہن کے مالک ہیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان کے افکار کو منطقی ربط سے محروم پایا ہے۔ اقبال بالفرض وحدت الوجودی بھی ہوتے تو بھی اقبال کو متکلم ثابت کرنا غیر ممکن تھا کہ وحدت الوجود علم کلام کا مسئلہ ہی نہیں کسی بھی ملت و مذہب کے کسی بھی دور کے علم کلام کا۔ شگفت انگیز بات یہ ہے کہ ''عام فکری مغالطے'' میں وہ مذہب اور تصوف کو دو مختلف ڈسپلن شمار کرتے ہیں اور تصوف سے بھی ان کی مراد وحدت الوجود ہی ہے۔ اس موقف کے ساتھ اقبال کو متکلم کہنا سفسطہ کی نادر و نایاب مثال ہے۔ ایسی مثال علی عباس جلالپوری کے سوا کوئی اور قائم نہیں کر سکتا۔

صوفیا کے حلقوں میں ابن عربی کے افکار کے شیوع اور وحدت وجود کی وسیع پذیرائی اور ہمہ گیر مقبولیت کے باعث سنائیؔ، عطارؔ اور رومیؔ تک کو وحدت الوجودی باور کر لیا گیا بلکہ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ تصوف سے مراد وحدت الوجود ٹھہری۔ جناب جلالپوری نے اس عام غلط فہمی میں مبتلا بعض شہیر اہل علم وقلم کی تحریروں سے اقتباسات رومی کے وحدت وجودی ہونے کے بارے میں بطور ثبوت نقل کیے اور ساتھ ہی یہ نیا انکشاف بھی کیا کہ رومی، ابن عربی کے شاگرد صدرالدین قونوی کے شاگرد تھے اور بواسطۂ رومی فکر اقبال کا سلسلہ ابن عربی کے افکار سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقام حیرت ہے کہ اقبال نے تمام وجودی صوفیہ وفلاسفہ کی سخت مخالفت کی لیکن مولانا رومی کو جو وحدت وجود کے مشہور اور ممتاز ترجمان سمجھے جاتے ہیں نہ صرف مستثنیٰ قرار دیا بلکہ ان کو اپنا پیر و مرشد بھی تسلیم کرلیا۔''

جناب جلالپوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''اقبال فلسفے کے منتہی تھے'' پس یہ ممکن ہے کہ فلسفے کے منتہی اقبال نے ابن عربی کے موقف اور رومی کے موقف میں فرق، جو دوسرے معلوم نہ کر سکے ہوں، معلوم کر کے ہی رومی کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہو۔ یہ دوسرے وہ ''مورخین وشارحین'' ہیں جن کی تحریروں سے انہوں نے اقتباسات دیتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا روم، مولانا صدرالدین قونوی کے واسطے سے شیخ اکبرابن عربی سے مستفید ومتاثر ہوئے تھے۔ تمام مورخین و شارحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مولانا روم وحدت وجود کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس کے پرجوش مبلغ بھی تھے۔''

جن ''مورخین وشارحین'' کا رومی کے وحدت الوجودی ہونے پر اتفاق ہے، ان کو تو انہوں نے پڑھا ہے اور جن کو اتفاق نہیں، انہیں پڑھنا انہیں نصیب ہی نہیں ہوا۔ پھر وہ کیسے تمام مورخین وشارحین کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ رومی وحدت الوجودی تھے۔ ایران کے شہیر محقق اور شیخ فریدالدین عطار کے متخصص محمد رضا شفیعی کدکنی، ''مختارنامہ عطار'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''تصوف مولوی استمرار تصوف عطار است وتصوف عطار صورت تکاملی تصوف سنائی است ...... دریں تصوف شور و وجد براستدلال ونظام خاص فکری غلبہ دارد، یعنی اگر بخواہیم برائے مولانا مدرسہ، خاصے در تصوف قائل شویم، ایں مدرسہ اصول خود را در نظامے کہ بر شور وحال استوار است، می جوید برخلاف مکتب عرفانی معاصر مولانا، محی الدین ابن عربی کہ تابع نظام دیگر است و در آنجا تفکر وحتیٰ نوعے استدلال بر وجد وحال غلبہ دارد۔ دریں مدرسہ عرفانی یعنی مدرسہ عطار و مولانا جائے برائے مقولہ وحدت وجود، وجود نہ دارد و آنچہ بنام وحدت می خوانند چیزے ست تقریباً برابر متضاد شرک واصلاً باوحدت در اصطلاح اتباع محی الدین رابطہ ای نہ دارد۔

''مولانا اصولاً گویا استنکارے ہم نسبت بہ محی الدین وآراد کتب او داشتہ است وشاہد ایں موضوع آنکہ در یک مورد در کتاب مناقب العارفین افلاکی داستانے نقل شدہ است کہ در آں مولانا آواز قوالے بنام زکی را برفتوحات مکی ابن عربی رجحان دادہ است وہمیں خود بہترین نشان دہندۂ تمایز ایں دو شیوۂ عرفانی است۔ عرفان ابن عربی کہ برنوع نظم و دلیل و دستگاہ خاص استوار است (فتوحات مکی) وعرفان مولانا کہ بر ذوق و وجد وحال (آواز قوال) متکی است۔

''ہمچناں از عرفاے اصحاب منقول است کہ بعضے علماے اصحاب در باب کتاب چیزے می گفتند کہ عجب کتابے است کہ اصلاً مقصودش نامعلوم است وسر حکمت قائل نامفہوم، از ناگاہ زکی قوال از در درآمد وسر آغاز اسرار کرد۔ حضرت مولانا فرمود: حالیا فتوحات زکی بہ از فتوحات مکی است وسماع شروع فرمود (مناقب العارفین ج)

ترجمہ: تصوف مولوی، عطار کے تصوف کا استمرار (Continuation) ہے اور تصوف عطار، سنائی کے تصوف کی اکمال یافتہ صورت۔ اس تصوف میں شور و وجد کو نظام خاص فکری پر غلبہ حاصل ہے یعنی اگر ہم تصوف میں مولانا کے مکتب خاص کے بارے میں بات کرنا چاہیں تو یہ مکتب ایک ایسے نظام کا جویا ہے جو وجد وحال پر استوار ہے۔ برخلاف محی الدین ابن عربی، معاصر مولانا کے مکتب عرفانی کے جو ایک دوسرے نظام کے تابع ہے اور جو تفکر حتیٰ استدلال پر مبنی ہے اور وجد وحال پر غالب ہے۔

مولانا اور عطار کے کتب عرفان میں وحدت وجود کا وجود نہیں۔ وہ جسے وحدت کہتے ہیں تقریباً شرک کی ضد ہے اور اصلاً اس وحدت سے غیر مربوط ہے جو ابن عربی کی اتباع میں اصلاحاً مستعمل ہے۔ مولانا اصولاً گویا محی الدین ابن عربی اور ان کی آراء و کتب سے استنکار ظاہر کیا ہے۔ (یعنی ابن عربی کے موقف کو رد کیا ہے۔ م ا) اس کی شہادت افلاکی کی مناقب العارفین میں درج ایک واقعے سے ملتی ہے جس کے مطابق مولانا نے آواز زکی (قوال) کو فتوحات مکی (ابن عربی) پر ترجیح دی ہے اور یہی بات مولانا اور ابن عربی دونوں کے شیوہ عرفانی کے درمیان فرق اور امتیاز کی بہترین نشان دہی کر رہی ہے۔ عرفانِ ابن عربی ایک خاص دستگاہ، استدلال اور نظم (سسٹم) پر استوار ہے۔ (فتوحات مکی) اور عرفانِ مولانا ذوق و وجد و حال (آواز زکی) پر تکیہ رکھتا ہے۔''

''عرفائے اصحاب سے منقول ہے کہ بعضے علمائے اصحاب کتاب فتوحات مکی کے بارے میں ایسی باتیں کر رہے تھے کہ عجب کتاب ہے کہ مقصود اس کا اصلاً نا معلوم ہے اور سرِ حکمت قائل نامفہوم، اچانک زکی قوال دروازے سے داخل ہوا اور عرفانی کلام گنگنانے لگا۔ حضرت مولانا نے فرمایا: حالیا فتوحات زکی فتوحات مکی سے بہتر ہے اور سماع شروع کرنے کا حکم فرمایا۔''
(مناقب العارفین۔ ج)

علی عباس جلالپوری ''تمام مورخین و شارحین رومی'' کے حوالے سے جو خبریں نشر کر رہے ہیں وہ رومی کے عرفاء و علماء اصحاب کے علم میں نہیں تھیں۔ یہ اصحاب علم و عرفان مولانا کے موقف سے بھی پوری طرح آگاہ تھے اور ابن عربی کی فتوحات مکی بھی پڑھنے کے بعد ہی یہ کہہ رہے تھے کہ عجب کتاب ہے کہ نہ اس کا مقصود ہی معلوم ہے اور نہ صاحب کتاب کا سرِ حکمت ہی مفہوم ہو رہا ہے۔ ابن عربی بلاشک وشبہ وحدت الوجود کے پرچارک تھے۔ اگر رومی بھی ''وحدت الوجود کے قائل، پرجوش مبلغ، مشہور اور ممتاز ترجمان سمجھے جاتے۔'' تو مناقب العارفین میں منقولہ واقعہ درج نہ ہوتا۔ رومی، ابن عربی اور قونوی کا ذکر اسی ارادت مندی سے کرتے جس ارادت مندی سے انہوں نے سنائی، عطار اور شمس تبریزی کا ذکر کیا ہے۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اور

ہفت شہر عشق را عطار گشت
ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

اور شمس تبریزی کے بارے میں یہ کہنے:

بگریز بہ نور شمس تبریز
تا کشف شود ہمہ معانی

اور

چوں امانتہائے حق را آسماں طاقت نداشت
شمس تبریزی چگونہ گستریدش برزمیں

کی بجائے ابن عربی اور صدر الدین قونوی سے اس طرح کی عقیدت و واردات کا اظہار کرتے، جن کا ذکر مثنوی اور

دیوان کبیر (جو موسوم ہی دیوان شمس تبریزی کے نام سے ہے)[1] تو کیا ملفوظاتِ رومی (نثر) تک میں موجود نہیں

شمس تبریز را چو دیدم من
نادرہ بحر و گنج و کان کہ منم

قصہ کوتاہ علی عباس جلالپوری نے رومی اور ابن عربی کے افکار کا تقابلی مطالعہ اور دونوں کے عرفان میں فرق و امتیاز از خود تلاش کرنے کے بجائے اپنے سست موقف کو اقتباسات سے مزین کر کے، دوسروں کے اقوال کو دلائل کے طور پر پیش کر کے تقویت پہنچانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ وہ فلسفے سے نابلد تھے نہ فارسی زبان سے۔ فلسفے میں ایم اے تھے اور فارسی میں ایم اے گولڈ میڈلسٹ۔ محمود شبستری کی گلشن راز وحدت وجود پر اہم مثنوی شمار ہوتی ہے اور اقبال کی گلشن راز جدید اسی کا جواب ہے، دونوں کا تقابلی مطالعہ ان کو اس نتیجے تک بآسانی پہنچا سکتا تھا کہ اقبال وحدت الوجودی نہیں تھے یا پھر ان کے ذہن پر جو دھن سوار تھی انہیں ایسا نہیں کرنے دے رہی تھی۔

سائنس کے نظریات کی طرح فلسفیانہ نظریات بھی خلاء میں نہیں گھڑے جاتے۔ ہر سائنسدان کی طرح ہر فلسفی بھی اپنا کام وہیں سے شروع کرتا ہے جہاں دوسرے اسے چھوڑتے ہیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کے کندھوں پر سوار ہے۔ اسی سے فلسفہ اور سائنس کی تاریخ میں تسلسل برقرار ہے۔ جس زمانے میں اقبال یورپ میں زیر تعلیم تھے، طبیعات میں بعض انکشافات نے خود طبیعات کی بنیادوں کو ہی نہیں ریاضی تک کی بنیادوں کو ہلاک کر رکھ دیا تھا۔ آئن سٹائن، ہائزبرگ، میکس پلانک، میکس بورن، شروڈنگر جن میں سے ہر ایک نوبل انعام یافتہ ہے، کوئی صورتحال نے سائنس سے فلسفے میں دھکیل دیا تھا۔

طبیعات، نیوٹن کے دور سے لے کر ۱۹۰۰ء تک میکانیات پر استوار تھی۔ نیوٹن کے دریافت کردہ قوانین کا اطلاق اجرام فلکی سے لے کر Atoms تک پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ کائنات کی اس میکانیاتی تصویر میں پہلی بار رخنہ اندازی میکسویل (Maxwell) کے دریافت کردہ الیکٹرومیگنیٹک فیلڈ نے کی۔ لیکن سب سے زیادہ ہلچل آسٹریا کے ماہر طبیعات ارنسٹ ماخ نے نیوٹن کی طبیعات کے بنیادی تصورات، زمان مطلق، مکان مطلق اور حرکت مطلق کو رد کر کے پیدا کی اور بتایا کہ نیوٹن کے اپنے دلائل اور تجربے اور مثال سے زمان، مکان اور حرکت مطلق کی بجائے اضافی ثابت ہوتے ہیں۔ آئن سٹائن نے اپنا کام یہیں سے شروع کیا اور ماخ کی رہنمائی کا اعتراف بھی کیا۔ ماخ کا یہ بھی کہنا تھا کہ زمان و مکان اور حرکت کا مطلق ہونا مشاہدے سے تصدیق یافتہ نہیں نہ آئندہ ہی اس کا امکان موجود ہے کہ ان کے مطلق ہونے کی تصدیق مشاہدے سے کی جا سکے گی۔ اس لیے زمان مطلق، مکان مطلق مابعد الطبیعیاتی تصورات ہیں۔ چنانچہ اس نے قوانین حرکت کو Actual تجربات کے ضمن میں restate کیا اور کہا کہ جن تصورات کی تصدیق مشاہدے سے ممکن نہیں انہیں سائنس میں باقی رکھ رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ سائنس کے قوانین ہمارے حسی مشاہدات کا خلاصہ ہیں۔ قانون کشش ثقل یہ بتاتا ہے کہ اجسام کس طرح ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں اجسام یعنی مادہ کی اصلیت و حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ارنسٹ ماخ نے تعلیل (Causation) کو بھی مابعد الطبیعاتی تصور کہہ کر رد اور سائنس سے خارج کر دیا اور کہا کہ کائنات میں بیک وقت بے شمار واقعات کا ایک سلسلہ رواں دواں ہے۔ ان میں سے دو کو چن لینا اور ایک کو علت (Cause) اور دوسرے کو معلول (Effect) ٹھہرا لینا، طبیعیات میں مابعد الطبیعات کی دراندازی ہے۔ ماخ پہلا آدمی نہیں جس نے سلسلۂ علت و معلول پر یہ اعتراض کیا ہے۔

---

(۱) رومی اپنی غزلوں کے مقطعے میں اپنا تخلص یا نام نہیں لاتے بلکہ شمس تبریزی کا ذکر لاتے ہیں۔ اسی لیے ان کا دیوان، دیوان شمس تبریزی کہلایا۔

تاریخ فلسفہ میں سب سے پہلے یہی اعتراض غزالی نے اور اس کے بعد ہیوم (Hume) نے کیا۔ برٹرینڈ رسل نے اپنے مقالے "On the Nation of Cause" میں تعلیل کے بارے میں کہا:

All philosophers, of every school, imagine that causation is one of the fundamental axioms or postulates of science, yet oddly enough, in advanced sciences such as gritational astronomy the word 'cause' never occurs... to me it seems that philosophy ought not to assume such legislative functions, and that the reason why physics has ceased to look for causes is that there are no such things. The Law of causality, I believe, like much that passes muster among philosophers, is a relic of a bygone age, surviving, like monarchy, only because it is erroneously supposed to do no harm... and Bergson, who has rightly perceivd that the law as stated by philosophers is worthless, nevetheless continues to suppose that it is used in science...

A great part of Bergson's attack on science rests on the assumption that is employ this principle. Infact it employs no such principle, but philosophers- even Bergson-are too apt to take their views on scince from each other, not from science.

غزالی نے قانون تعلیل پر اعتراض تہافتہ الفلاسفہ میں کیا ہے اور برٹرینڈ رسل بھی یہاں تہافتہ الفلاسفہ کے کام میں مصروف ہیں۔ علی عباس جلالپوری فرماتے ہیں کہ اشاعرہ اور غزالی نے ''سبب اور مسبب یا علت و معلول کے تعلق و ربط باہم سے انکار کر دیا اور کہا کہ کوئی سبب کسی مسبب کا باعث نہیں ہوتا۔ اس نظریئے نے سائنٹفک تحقیق کو سخت نقصان پہنچایا کیونکہ سائنٹفک کی بنیاد ہی سلسلۂ سبب و مسبب پر استوار ہوتی ہے۔ جب اہل علم اسباب و مسببات کے ربط و تعلق سے قطع نظر کر لیں وہ سائنس میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔''

فلسفہ اور سائنس کو بیسویں صدی میں درپیش مسائل اور ان کی تاریخ سے علی عباس جلالپوری کی آگاہی کی حد کے بارے میں مزید کچھ کہنا تضیع اوقات کے مترادف ہے۔ قصہ کوتاہ اس صدی کے اوائل میں سائنسی انکشافات و نظریات نے نہ صرف طبیعات بلکہ پوری سائنس کی بنیادوں کو بلکہ پورے علم انسانی کی بنیادوں کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے خود سائنس دانوں کو بھی فلسفے، جو تمام سائنسوں کی سائنس بھی کہا جاتا ہے، کے میدان میں آنا پڑا۔ بیسویں صدی کا سارا فلسفہ اسی گمبھیر صورت حال کے مسائل اور ان کے حل کی کوششوں پر مبنی ہے۔ آئن سٹائن، ہائزبرگ، ماکس پلانک، ماکس بورن، شروڈنگر، فلپ فرانک نہ صرف جدید سائنسی نظریات کے فلسفیانہ مضمرات پر لکھ رہے تھے بلکہ برٹرینڈ رسل، وائٹ ہیڈ، پوئنکارے کے سے اجلہ ریاضی دان ریاضی کی بنیادوں (Foundations) کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھے۔ برگساں ماہر حیاتیات تھا، اسے بھی درپیش صورت حال سے نمٹنے کے لیے فلسفے کے میدان میں کودنا پڑا۔ لینن کو مادیت کی ہلتی ہوئی بنیادوں کی فکر پڑ گئی۔ اس کی Materialism and Empiracriticism اسی صورتحال سے عہدہ برا ہونے کی ایک کوشش ہے۔

اقبال بھی اسی فضا میں سانس لے رہے تھے اور اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ خطبات اسی پس منظر میں لکھے گئے

ہیں۔ اس پس منظر میں جس طرح فلسفے کی ایک نئی شاخ فلسفۂ سائنس ظہور میں آئی جو سائنس کی بنیادوں میں تحقیق اور تفتیش پر مبنی ہے، فلسفۂ مذہب بھی ظہور پذیر ہوا جس کا مقصد مذہب کے لیے ٹھوس بنیادوں کی تلاش ہے۔ اقبال کے تین خطبات، علم اور مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار اور کیا مذہب ممکن ہے، من حیث مجموع مذہب کے لیے ٹھوس بنیادوں کی تلاش ہیں، دوسرے لفظوں میں فلسفہ، سائنس اور فلسفۂ مذہب میں ہم آہنگی کی کوشش ہے۔ چونکہ فلسفۂ مذہب بھی فلسفہ ہے اور فلسفۂ سائنس بھی فلسفہ ہے، خطبات بنیادی طور پر فلسفۂ مذہب کی کتاب ہے، علم کلام کی نہیں۔ یہ کتاب چونکہ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سائنسی اور فلسفیانہ افکار کے تناظر میں تحریر ہوئی ہے اس لیے اس دور کے مختلف سائنسدانوں اور فلسفیوں کے حوالے، ان کے افکار سے اخذ واستفادہ جرم نہیں کہ اقبال کو برگساں، الگزینڈر، فشتے، نیطشے کا قابل مواخذہ مجرم بنا کر پیش کیا جائے۔ ہر سائنسدان اور ہر فلسفی جیسا کہ قبل ازیں کہا جا چکا ہے، کسی نہ کسی کے کاندھوں پر کھڑا ہے۔ مارکس نے مادیت فائر باخ سے، جدلیات ہیگل سے اور قدر زائد کا نظریہ رکارڈو سے لیا۔ مارکس سے کوئی یہ نہیں کہتا، میں بھی نہیں کہتا:

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

کہ مارکس میرے نزدیک بھی ایک عظیم اور بے مثال فلسفی ہے جس نے ظالمانہ نظام سرمایہ داری کو اس کی جڑوں تک ننگا کر کے پوری نسل آدم پر احسان کیا ہے۔ یہی وجہ ''حیرت میری'' کی ہے۔

ہاں بانگ بلند است پوشیدہ نمی گویم

علی عباس جلالپوری نے ''اقبال کا علم کلام'' میں ہر باب (مقالہ) اس طرح لکھا ہے جس طرح ایم اے (فلسفہ) میں زیر تعلیم کوئی محنتی اور لائق طالب علم اپنے اسائنمنٹ لکھتا ہے۔ وہ اپنے اس دور سے کبھی نکل نہیں پائے۔

..........☆..........

''بخدمتِ اقبالؔ''

جس قدر اُمتِ مُسلم پہ کرم ہیں تیرے
اُتنے ہی ملتِ آدم پہ ہیں تیرے احساں
آخرِ کار سرِ منزلِ عرفاں پہنچی......
تیری چٹکی میں تھی جس ناقۂ دوراں کی عناں
عہدِ فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی
تیرے شعروں سے چُنیں جائیں گے اُس کے عنواں
رومیؔ و سعدیؔ و غالبؔ میں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں

(احمد ندیمؔ قاسمی)

ادبی چوریاں

ڈاکٹر سلیم اختر

ادبی چوریاں کیوں؟

سوال آسان مگر جواب مشکل۔ سیدھا سا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ محنت کیے بغیر دوسرے کی محنت کو اپنی محنت قرار دے کر شہرت اور ناموری حاصل کرنا، ادبی چوری کا محرک ہے۔ ادبی چوری کو شہرت کا شارٹ کٹ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اخلاقی چوری کے مقابلہ میں ادبی، علمی، تحقیقی اور تنقیدی چوریاں زیادہ معیوب اور اسی لیے قابل گرفت ہونی چاہئیں کہ عالم فاضل لوگ اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ خیالات، تصورات، افکار کی چوری کا بھی اسی ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے۔ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کو اپنے نام سے شائع کرانا بھی اسی زمرہ میں شامل ہے۔ الغرض! ادبی چوریوں میں خاصا تنوع ملتا ہے۔

جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے جو تحقیقی مقالات قلم بند کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں بعض اوقات یہ شکایت ملتی ہے کہ اپنے مقالہ میں دوسروں کے خیالات، آراء، مقالات، کتب اور بالخصوص (غیر مطبوعہ) تھیسز سے بلا حوالہ مواد اخذ کر کے ذاتی تحقیق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس ضمن میں معروف طریقہ یہ ہے کہ ثانوی ماخذ کو بنیادی حوالہ بنا کر یہ تاثر دینا کہ یہ ذاتی تحقیقی کاوش ہے۔

یہ تو ہے ہمارا حال جب کہ اس کے برعکس مغربی محققین اور ناقدین اقتباس کے معاملہ میں اتنے محتاط ہیں کہ کسی نکتہ کو نمایاں کرنے کے لیے اگر Italics استعمال کریں تو فٹ نوٹ میں وضاحت کر دیتے ہیں، یہ لکھ کر "Itlaics Mine"۔

ہمارے ہاں گزشتہ چند برس سے H.E.C نے اعلیٰ تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں کیں ان کے نتیجہ میں ایم اے کی ڈگری ختم ہوگئی۔ اب پی ایچ ڈی کرنے کے لیے پہلے ایم فل کرنا لازم ہے۔ ایم اے اب BS کہلاتا ہے اور ان سب ڈگریوں کے حصول کے لیے تھیسس لازم ہے لیکن ہر طالب علم کو تحقیق سے دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ ادھر مقالہ کے نگران اساتذہ کی ''مصروفیات'' ایسی کہ طالب علموں کی مناسب راہنمائی نہیں کر پاتے جس کی وجہ سے طالب علم نے جو انٹ شنٹ لکھا، وہ تھیسس قرار پا گیا۔ خوبصورت لڑکی کو تو قدر دان لڑ کا یا ''سرپرست'' پروفیسر تھیسس لکھوا دیتا ہے۔ یہ سہولت حاصل نہ ہو تو پھر دوسروں کے مال پر ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سب طلبا ایسا نہیں کرتے لیکن اس نوع کے سرقہ کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ جو اساتذہ تحقیقی مقالات کے ممتحن رہے ہیں یا انٹرویو لیتے جاتے رہتے ہیں، وہ میری بات کی تائید کریں گے۔ ایسی چوریاں پکڑے جانے پر اصولاً تو طالب علم کا تھیسس منسوخ کر دینا چاہیے لیکن یہ سوچ کر کہ طالب علم کا کیریئر برباد ہو جائے گا اس لیے عام طور پر درگزر سے کام لیا

جاتا ہے۔

تحقیق (اور اس کے ساتھ تنقید) کے لیے محنت اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ایسی ذہنی تربیت جس کا ذاتی سوچ، اپج، نکتہ رسی اور استخراجی صلاحیتوں سے رنگ چوکھا ہوتا ہے اور ہر طالب علم تو کجا بسا اوقات تو ان کے معزز اساتذہ بھی اسی صلاحیت سے تہی دست ثابت ہوتے ہیں۔ادھر ہر ڈگری کے لیے تھیسس لازم ،لہٰذا شارٹ کٹ سے کام لیا جاتا ہے۔

چلیں طالب علم تو بچۂ نادان ہے لیکن اساتذہ اگر یہ کام کریں تو وہ قابل معافی نہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے خرم سہیل کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بتایا ''سرقہ بازی کے واقعات اکثر پتہ چلتے ہیں۔قائداعظم یونیورسٹی اور جامعہ کراچی میں بھی کچھ اس طرح کے واقعات کا پتہ چلا، حتیٰ کہ پی ٹی وی پر ایک صاحب نے جان اپڈائیک کی کہانیوں کا سرقہ کر کے دے دیا، بہر حال وہ پکڑے گئے۔''

(بحوالہ ''باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے'' از خرم سہیل، ص ۱۵۰)

اس ضمن میں چند خبریں ملاحظہ ہوں:

پروفیسر پر تحقیق چوری کرنے کا الزام، منفرد مقدمہ دائر

مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے: ڈاکٹر چیمہ، تحقیقی کام میرا ہے: طالب علم کا موقف

اسلام آباد (محمد احمد نورانی) حقوق ملکیت دانش کا ایک منفرد مقدمہ اسلام آباد ہائی کورٹ میں دائر کیا گیا ہے جس میں قائداعظم یونیورسٹی کے ایم فل کے ایک طالب علم نے فیکلٹی کے ڈین اور پروفیسر پر اپنی تحقیق کو چوری کرنے کا الزام لگایا ہے اور اس تحقیق کو ایک بین الاقوامی جریدے میں اپنے نام سے شائع کرایا ہے۔دائر مقدمہ میں سابق چیئرمین ڈیفنس اینڈ سٹریجک سٹڈیز قائداعظم یونیورسٹی کے پروفیسر اور سوشل سائنسز فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر ظفر اقبال چیمہ پر ان کے اپنے شاگرد مرزا مسعود اکبر نے تحقیق کو چوری کرنے اور شائع کرانے کا الزام عائد کیا۔ طالب علم کو خدشہ ہے کہ ان کے ریسرچ کے کام کو یونیورسٹی سے غائب کر دیا جائے گا اور یونیورسٹی کے امتحانی ریکارڈ سے ضائع کر دیا جائے گا۔ڈاکٹر چیمہ نے اپنے شاگرد کے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ قائداعظم یونیورسٹی میں ان کے مخالفین کی طرف سے ان کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ ۲۰۰۸ء میں جریدے میں شائع ہونے والا تحقیقی کام ان کا اپنا ہے جو کہ انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز کے جریدے میں شائع ہوا۔انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ طالب علم مرزا مسعود اکبر دو سطریں بھی لکھنے کے قابل نہیں، تاہم ''دی نیوز'' کی تحقیقات کے مطابق جو حقیقت سامنے آئی اس کے مطابق نہ صرف آئی آر ایس اور اس کے ایڈیٹرز کے ساتھ تفصیلی ای میلز کا تبادلہ ہوا اور اس تحقیقی کام کے شائع ہونے سے قبل ایک معروف ماہر سٹیو کوہن جو کہ واشنگٹن میں رہتے ہیں، اس تحقیق پر نظر ثانی کی جب کہ مسعود نے دائر درخواست میں موقف اختیار کیا کہ ڈاکٹر چیمہ سٹریجک کلچر کی فیلڈ کے ماہر نہیں ہیں کیونکہ ان کی فیلڈ نیوکلیئر سٹڈیز ہے اور میں نے اس کی تھیوری ڈاکٹر ظفر نواز جسپال سے پڑھی تھی۔ بعد ازاں ڈاکٹر چیمہ نے مسعود کو یہ بھی بتایا کہ انہیں ۹ جنوری کو آئی آر ایس سے چیک بھی وصول ہوا اور وہ اس رقم کو اسے دینے کے لیے تیار ہیں لیکن مسعود نے آرٹیکل اپنے نام سے شائع کرنے کے علاوہ کسی چیز کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ مسعود نے آئی آر ایس کو بھی تمام دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ درخواست بھی دی ہے اور کہا ہے کہ آرٹیکل کو اس کے نام پر دوبارہ شائع کیا جائے لیکن آئی آر ایس کی طرف سے کوئی

جواب نہ آیا۔ انہوں نے قائداعظم یونیورسٹی میں اپنے شعبہ میں بھی درخواست دی کہ کمیٹی تشکیل دی جائے جو معاملہ کی تحقیقات کرے۔ ڈاکٹر چیمہ نے اس دوران سینئر سول جج کی عدالت میں کمیٹی کی تشکیل کو روکنے کے لیے پٹیشن دائر کی۔ ''دی نیوز'' نے آئی آر ایس کے ایڈیٹر ابوالبرکات سے رابطہ کیا اور معاملے کے متعلق پوچھا لیکن انہوں نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ تاہم آئی آر ایس کے ایک سینئر افسر نے ''دی نیوز'' کو بتایا کہ ڈاکٹر ظفر چیمہ ان کا کارسپنڈنس ہے اور انہوں نے ریسرچ ورک کے متعلق ہمیشہ بتایا کہ یہ کام ان کے طالب علم مسعود نے کیا ہے۔''

(روزنامہ جنگ ۲۱ مئی ۲۰۰۹ء)

جامعہ کراچی کے تین پروفیسرں کے بارے میں بھی دو خبریں ملاحظہ کیجیے:

علمی سرقے میں ملوث جامعہ کراچی کے تین پروفیسرز کو نوٹس جاری کر دیے گئے

کراچی (سٹاف رپورٹر) علمی سرقے میں ملوث جامعہ کراچی کے معطل ڈین پروفیسر جلال الدین نوری اور شعبہ کیمیا کے معطل چیئرمین سعید آرائیں اور شعبہ فارمیسی کی معطل پروفیسر نجمہ سلطانہ کو نوٹس جاری کر دیے گئے ہیں۔ جسٹس (ر) طارق الخیری نے ۷ جولائی کو جلال الدین نوری جبکہ جسٹس (ر) سلیم اختر نے ۶ جولائی کو سعید آرائیں اور نجمہ سلطانہ کو طلب کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ جامعہ کراچی کی سینڈیکیٹ نے علمی سرقے کے الزام میں ان تین پروفیسرز کو معطل کر کے ریٹائرڈ ججوں سے ان کی تحقیقات شروع کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔

(روزنامہ جنگ لاہور، ۳ جولائی ۲۰۰۴ء)

جامعہ کراچی کے تین پروفیسرز پر علمی سرقے کا جرم ثابت

جلال الدین نوری، نجمہ سلطانہ اور سعید آرائیں کا کیس شعبہ قانون کو بھجوانے کا فیصلہ

کراچی (سٹاف رپورٹر) کراچی یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ کے ۵۹۵ ویں اجلاس میں تین پروفیسرز پر علمی سرقے کا جرم ثابت ہونے پر کیس مزید تحقیق کے لیے یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے حوالے کرنے سے متعلق نیا معاہدہ کرنے کے فیصلے کر لیے گئے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا کی زیر صدارت اجلاس میں یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس پروفیسر نجمہ سلطانہ، پروفیسر سعید آرائیں پر تحقیقی مقالوں میں چوری شدہ مواد شامل کرنے کے حوالے سے شریعت کورٹ کے سابق چیف جسٹس اختر کی جانب سے کی جانے والی تحقیقات اور جرم ثابت ہونے کے بعد کیس مزید کارروائی کے لیے یونیورسٹی کے شعبہ قانون کو بھیجنے کی منظوری دے دی ہے۔

(روزنامہ جنگ لاہور، ۱۲۵ کتوبر ۲۰۰۹ء)

شاہین خان کا پی ایچ ڈی مقالہ درست قرار دیے جانے کی بات غلط ہے: ترجمان ایجوکیشن کمیشن

اسلام آباد (سعدیہ خالد) کراچی یونیورسٹی کی علمی سرقہ کمیٹی نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کی چیئرپرسن اور فیڈرل ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی ڈائریکٹر جنرل شاہین خان کا مقالہ واضح طور پر علمی سرقے کے زمرے میں آتا ہے۔ ڈاکٹر ایم ساجدین، ڈاکٹر ایس ایم عقیل برنی اور ڈاکٹر عابدہ اظہر (ای سی او سیکرٹریٹ تہران کی جانب سے شائع کردہ رہنما کتاب (گائیڈ بک) کا حرف بہ حرف ترجمہ ہے۔ اس معاملے میں ہائر ایجوکیشن کمیشن کی نمائندگی ایگری کلچر یونیورسٹی فیصل آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر اقرار احمد خان نے کی اور وہ کراچی یونیورسٹی کے وائس

چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے زیر قیادت ہونے والی علمی سرقہ کمیٹی کی متعلقہ میٹنگ میں موجود تھے۔ ڈاکٹر اقرار احمد نے ایچ ای سی کو آگاہ کیا ہے کہ اس میٹنگ میں تمام اراکین اس امر پر متفق تھے کہ مذکورہ مقالے میں یقینی طور پر علمی سرقہ سرزد ہوا ہے۔ ذرائع کے مطابق کمیٹی میں کچھ ارکان ایسے تھے جنہوں نے شاہین خان کو یہ کہہ کر تحفظ دینے کی کوشش کی کہ ممکن ہے کہ شاہین خان اپنے مقالے میں ای سی او کی دستاویز سے لیے گئے مواد کا حوالہ دینا بھول گئی ہوں، تاہم دیگر ارکان نے اس جواز کو قبول نہیں کیا۔ ذرائع کے مطابق یہ چند نہیں بلکہ ۱۰۰ صفحات کا معاملہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے بیان کے مطابق شاہین خان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے متعلق میڈیا میں آنے والے بیانات بے بنیاد ہیں کیونکہ میٹنگ میں اس طرح کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ طے شدہ معیارات کے طریقہ کار (اسٹینڈرڈ آپریٹنگ پروسیجرز) کے مطابق میٹنگ کے نکات مزید کارروائی کے لیے سینڈیکیٹ کو بھجوائے جائیں گے۔

(روزنامہ جنگ لاہور، ۱۸ اگست ۲۰۱۰ء)

یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کے بارے میں اگر سرقہ کی اطلاع ملے تو ادارہ کی نیک نامی کی خاطر عموماً ایسے پروفیسر کے خلاف کوئی ایکشن بھی نہیں لیا جاتا۔ ہمارے ہاں سفارش، ذاتی تعلقات، دوستی، سرپرستی اور پیسے کی بنا پر یہ سب جائز ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے تنگ آ کر H.E.C نے یہ فیصلہ کیا۔

روزنامہ جنگ لاہور، ۲۸ نومبر ۲۰۱۰ء کی یہ خبر ملاحظہ ہو:

علمی سرقے میں ملوث پی ایچ ڈی اسکالرز کو بلیک لسٹ کر دیا جائے گا

ایچ ای سی نے ملوث افراد کے خلاف کارروائی کے لیے ۳۰ دسمبر کی ڈیڈ لائن دے دی

اسلام آباد (سعدیہ خالد) ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) بہت جلد پی ایچ ڈی اسکالرز جو مبینہ طور پر علمی سرقے میں ملوث ہیں اور جن کے خلاف متعلقہ یونیورسٹیاں مناسب ایکشن لینے میں ناکام رہی ہیں، کو بلیک لسٹ کر دے گی اور اس حوالے سے متعلق یونیورسٹیوں کو پہلے ہی خط لکھ دیئے گئے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ایچ ای سی نے اپنے ۱۰ نومبر کو ہونے والے اجلاس میں ایسے فیکلٹی ممبرز کو بلیک لسٹ کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے جن کے خلاف ایچ ای سی کی متعدد یاد دہانیوں کے باوجود متعلقہ یونیورسٹیاں مناسب ایکشن نہیں لے سکی ہیں۔ اس نمائندے کے پاس موجود ان خطوط کی کاپیوں کے مطابق ایچ ای سی نے مبینہ طور پر علمی سرقے میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کے لیے یونیورسٹیوں کو ۳۰ دسمبر ۲۰۱۰ء کی ڈیڈ لائن دی ہے۔

شاہین خان کے بارے میں خبر کے تناظر میں روزنامہ جنگ لاہور (۲۶ جولائی ۲۰۱۰ء) کی خبر بھی ملاحظہ ہو:

جعلی ڈگری کی حامل خاتون افسر محکمہ تعلیم کے دو اہم عہدوں پر فائز

ایچ ای سی چیئرمین فیڈرل بورڈ شاہین خان کی پی ایچ ڈی تھیسز کو ادبی سرقہ قرار دے چکا، اصلی ہے نقل نہیں: شاہین خان

اسلام آباد (سعدیہ خالد) جعلی ڈگریوں کے حامل صرف عوامی نمائندگان ہی نہیں جنہیں بچانے کے لیے وزارت تعلیم کوشاں ہے بلکہ اس وزارت کی چھتری تلے کام کرنے والے بھی مشکوک تعلیمی پس منظر رکھتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال وہ افسر ہے جو محکمہ تعلیم کے دو انتہائی اہم عہدوں پر فائز ہیں لیکن ہائر ایجوکیشن کمیشن کے مطابق وہ پی ایچ ڈی کی جعلی ڈگری رکھتی ہیں۔ فیڈرل ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی چیئرپرسن اور فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن کی چیئرپرسن شاہین خان وہ شخصیت ہیں جو اس وقت دو عہدوں پر فائز ہیں اور ان کے فوائد حاصل کر رہی ہیں۔ حالانکہ ان کی ڈگری ایچ ای سی سے

جعلی ثابت ہو چکی ہے۔ منظور نظر شاہین خان کو اپریل ۲۰۱۰ء میں فیڈرل ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ کے ڈی جی کا اضافی چارج اس وقت دلایا گیا جب گزشتہ دو سال مستقل واحد ڈی جی ڈاکٹر شہناز اے ریاض کو اکیڈمی آف ایجوکیشن پلاننگ اینڈ مینجمنٹ میں بحیثیت ڈی جی تبدیل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر شہناز ریاض کو سپریم کورٹ کی ہدایت پر ڈی جی ایف ڈی اے تعینات کیا گیا تھا لیکن اپنی مستقل تعیناتی کے بعد ایک ماہ کے اندر سیاست کا شکار ہو گئیں۔ اطلاعات کے مطابق شاہین خان کا پی ایچ ڈی کا تھیسز ہائر ایجوکیشن کمیشن نے جعلی قرار دیتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کو ان کے خلاف ادبی سرقہ کے جرم میں کارروائی کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن یونیورسٹی نے دو ماہ گزرنے کے باوجود کوئی اقدام نہیں کیا۔ وزارت تعلیم کے ذرائع کو یقین ہے کہ شاہین خان کے وزارت تعلیم کے اعلیٰ حکام کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں، اس لیے انہیں کسی قیمت پر یہاں سے نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اعلیٰ حکام سے بہترین تعلقات کی وجہ سے سپریم کورٹ کے فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے شہناز ریاض کو ایک ماہ کے اندر ہی ہٹا کر انہیں لایا گیا۔ نقالی پالیسی کے تحت اگر دو ماہ کے اندر یونیورسٹی کوئی اقدام نہیں کرتی تو ایچ ای سی کی کمیٹی معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے تھیسز نقل کرنا ثابت ہونے پر ڈگری کو منسوخ کر سکتی ہے۔ ایچ ای سی کے مشیر کوالٹی ایشورنس محمود رضا نے ''دی نیوز'' سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شاہین خان ادبی سرقہ میں ملوث پائی گئی ہیں اور ہم نے کراچی یونیورسٹی کو فوری طور پر ان کے خلاف کارروائی کا کہا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس امر سے آگاہ ہیں اور انہوں نے مناسب کارروائی کی یقین دہانی کرائی ہے۔ ہم مزید دو ہفتے یونیورسٹی کی طرف سے مناسب کارروائی کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد ملزم کے خلاف کارروائی کا حق ایچ ای سی کے پاس محفوظ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ شاہین خان کا تھیسز او آئی سی کی ایک دستاویز سے ترجمہ کیا گیا جو واضح طور پر ادبی سرقہ کا کیس ہے۔ ایچ ای سی نے کراچی یونیورسٹی کو کہہ دیا ہے کہ شاہین خان کے خلاف کارروائی کی جائے۔ بصورت دیگر ان کی ڈگری کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ شاہین خان نے ''دی نیوز'' کے رابطہ کرنے پر تسلیم کیا ہے کہ ایچ ای سی اور کراچی یونیورسٹی میں ان کے تھیسز کے حوالے سے انکوائری چل رہی ہے، تاہم انہوں نے ادبی سرقہ میں ملوث ہونے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ایچ ای سی اور کراچی یونیورسٹی کو خط لکھ کر وضاحت کر دی ہے کہ میرا تھیسز اصلی ہے اور کسی دوسری دستاویز سے نقل نہیں کیا گیا۔

یہ تو ہے اپنا احوال، اب ذرا دور دیس کی بھی مثال ملاحظہ کر لیں:

اچھی مثالوں سے ہی آج جرمنی جرمنی ہے، مضامین چوری کرنے کا الزام، جرمن وزیر دفاع ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے دستبردار ہو گئے

فرینکفرٹ (آن لائن) اچھی مثالوں سے ہی آج جرمنی جرمنی ہے۔ جرمن وزیر دفاع مضامین چوری کے الزام کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ جرمن ٹی وی کے مطابق وزیر دفاع گوٹبرگ پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تھیسز کے بعض مضامین چوری کیے ہیں جس پر انہوں نے کہا تھا کہ وہ عارضی طور پر اس ڈگری سے کنارہ کش ہو رہے ہیں، تاہم یونیورسٹی آف برتھ نے انہیں ڈگری چھوڑنے کی ہدایت کی جس پر انہوں نے اس اعلیٰ ڈگری سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے۔

(روزنامہ جنگ لاہور، ۲۳ فروری ۲۰۱۱ء)

اس مختصر خبر کی تفصیل مجھے خبرنامہ ''شب خون'' شمارہ نمبر ۱۳ (الٰہ آباد فروری تا اپریل ۲۰۱۱ء) سے ملی۔ نذر خلیق ''مشرق و مغرب میں سرقہ کی داستانیں'' میں لکھتے ہیں:

''حال ہی میں جرمنی کے وزیر دفاع کارل تیوڈور زو گٹنبرگ (Karl-Theodor zu Guttenberg) کے

بارے میں ایک حیران کن خبر دیکھنے میں آئی ہے۔ روزنامہ جنگ کے انٹرنیٹ ایڈیشن پر یکم مارچ کو خبر دی گئی تھی کہ انہوں نے اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اس کی تفصیل جاننے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ جناب Karl-Theodor zu Guttenberg نے ۲۰۰۷ء میں The University of Bayeruth سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ۲۵ سے لے کر ۳۰ تک ایسے صفحات پائے گئے جو ان کے اپنے خیالات نہیں تھے بلکہ انہوں نے دوسروں کے خیالات کو ان کا حوالہ دیئے بغیر اپنے افکار کے طور پر بیان کر دیا ہے۔

یہ الزام سامنے آیا تو جرمنی کے لوگ حقیقت جاننے کے لیے مذکورہ مقالہ کے متعلقہ حصوں اور اصل کتابوں کے متن کا موازنہ کرنے میں لگ گئے۔ تب یہ واضح ہو گیا کہ جرمن چانسلر کے انتہائی قریب سمجھے جانے والے وزیر دفاع Karl-Theodor zu Guttenberg نے دوسروں کے خیالات کو حوالہ دیئے بغیر اپنے مقالہ کا حصہ بنالیا ہے۔ اس بلا حوالہ ترجمہ کو سیدھا سیدھا سرقہ قرار دیا گیا اور جرمنی کے علمی و ادبی حلقوں میں اس پر شدید ردعمل سامنے آیا۔

اپنے پچیس سے تیس صفحات کے سرقہ کو چھپانے کے لیے جرمن وزیر دفاع نے اپنے کسی فرمانبردار کے ذریعے اپنے دفاع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ الزام لگانے والوں کے خلاف کوئی غلیظ مہم شروع نہیں کرائی۔ نہ مذہب کا کسی رنگ میں کوئی سہارا لیا، نہ اپنے مخالفین کی سازش قرار دیا۔ اس نے اپنے کیے پر شرمندگی محسوس کی اور نہ صرف اپنے مقالے سے دستبردار ہو کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری چھوڑ دی بلکہ وزیر دفاع کی حیثیت سے بھی مستعفی ہو گئے۔ جہاں یہ سارا منظر ایک طرف جرمن وزیر دفاع کی ایک علمی و شخصی خامی کی نشاندہی کرتا ہے، وہیں اپنی قوم کے اجتماعی مزاج اور خود (سابق) وزیر دفاع کے کردار کے روشن پہلو کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ وہ چاہتے تو سیاست دانوں کی طرح (اور اردو کے سارق ادیبوں کی طرح) نہ صرف ڈھٹائی کے ساتھ الزام تراشی کرنے والوں کے خلاف مہم شروع کرا سکتے تھے بلکہ اپنی عظمت کا مزید ڈھنڈورا پیٹ سکتے تھے لیکن کسی منفی ہتھکنڈے کو استعمال کرنے کے بجائے وہ اپنے سرقہ شدہ مقالہ سے بھی دستبردار ہو گئے اور وزارت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ابھی انہیں عدالت کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔

اس واقعہ کی یہ ساری تفصیل سامنے رکھ کر پھر دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اپنی اردو دنیا کی ادبی اخلاقیات کے بارے میں سوچیں تو شدید شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں مغربی مصنفین کی کتابوں سے جو سرقے کیے گئے ہیں وہ جرمن وزیر دفاع کی طرح صرف پچیس، تیس صفحات پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ڈھائی سو اور تین سو صفحات سے بھی زیادہ ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا سرقہ ہے جو پورے شواہد کے ساتھ سامنے آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں حوالے کے طور پر ارشد خالد کے رسالے ''عکاس انٹرنیشنل'' اسلام آباد کے شمارہ مئی ۲۰۰۹ء کے ڈاکٹر نارنگ نمبر اور حیدر قریشی کی ہنگامہ خیز کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کا ذکر کروں گا۔

سرقوں کے شواہد کے اعتبار سے بھی یہ کتابیں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اپنے سرقہ چھپانے کے لیے اور ان سے توجہ ہٹانے کے لیے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کیا کیا حربے اختیار کیے، ان سب کی روداد بھی ان میں جمع کر دی گئی ہے۔ اتنی بڑی سطح کے سرقے سامنے آنے کے بعد چند باضمیر ادیبوں نے افسوس کا اظہار ضرور کیا لیکن اردو دنیا کی بدبختی دیکھیں کہ شاعروں اور ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اتنے بڑے جرم پر لاعلمی یا عدم دلچسپی کی چپ تان رکھی ہے۔ سب اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان، دونوں طرف کی ادبی اخلاقیات اور ادبی کرداروں کا موازنہ جرمنی

کے وزیرِ قانون کے سرقہ کے واقعہ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ادبی ڈاکے کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو شدید شرمندگی کے ساتھ یہی آواز سنائی دیتی ہے:

ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

(بشکریہ معزز روزنامہ ہمارا مقصد، دہلی مورخہ ۲۳ مارچ ۲۰۱۱ء)

دیگ کے چند چاولوں کے ذائقہ کے بعد علم وادب اور تحقیق وتنقید کی دنیا میں آئیں تو یہاں بھی ایسے دلاروں کی کمی نہیں جہاں سرقہ کے ساتھ ساتھ جعل سازی کے واقعات مل جاتے ہیں۔ پروفیسر حنیف نقوی مقالہ بعنوان ''غالب سے منسوب تین تحریریں'' (مطبوعہ صحیفہ لاہور، شمارہ نمبر ۱۹۴۔۱۹۳۔ اپریل ۲۰۰۸ء تا ستمبر ۲۰۰۹ء) میں رقم طراز ہیں:

''غالب کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے والے اہلِ علم میں جہاں بڑی تعداد ان حضرات کی ہے جنہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور عمر کا بڑا حصہ ان کی شخصیت اور کلام کے مطالعے میں صرف کیا ہے، وہیں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو غلط بیانی یا فریب کاری کی راہ سے اس انجمن میں باریاب ہوئے ہیں اور اس حقیقت کے انکشاف کے باوجود اب بھی وقتاً فوقتاً اسی حوالے سے ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں دو نام بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں، ایک مولانا عبدالباری آسی کا اور دوسرا سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی کا۔ مولانا آسی نے ڈاکٹر عظمت الٰہی کی خاندانی بیاض کے حوالے سے متعدد غزلیں غالب کے نودریافت کلام کے طور پر پہلے اپنے زمانے کے معروف ترین ادبی جریدے ماہنامہ ''نگار'' لکھنؤ میں شائع کروائیں، بعد ازاں ۱۹۳۰ء میں انہیں ''شرح دیوان غالب جدید'' کے عنوان سے کتابی شکل دے کر اور ایک سال کے بعد ''مکمل شرح کلامِ غالب'' میں شامل کر کے مستقلاً کلامِ غالب کا حصہ بنا دیا۔ یہیں سے اس کلام کو مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتبہ دیوان غالب تک رسائی حاصل ہوئی۔ نسخۂ عرشی کی اشاعت (۱۹۵۸ء) کے قریباً گیارہ برس بعد ۱۹۶۹ء میں جلیل قدوائی کے مضمون ''غالب کا الحاقی کلام۔ ایک داستان'' سے باوثوق طور پر حقیقت سامنے آئی کہ یہ نودریافت کلام غالب کا نہیں، خود مولانا آسی کی تصنیف ہے۔ رسا ہمدانی نے کچھ اسی قسم کا کارنامہ نثر میں انجام دیا۔ انہوں نے ۱۹۳۹ء میں ''نادر خطوط غالب'' کے نام سے غالب کے ستائیس اردو خطوط کا ایک مجموعہ شائع کیا جن میں تئیس خط ان کے دادا سید کرامت حسین ہمدانی کے نام ہیں۔ ان میں سے چند خطوط ۱۹۳۱ء میں متذکرہ بالا مجموعے کی اشاعت کے بعد انہوں نے اس پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا جو ماہنامہ ''جامعہ'' دہلی کے مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ دوسرا تبصرہ قاضی عبدالودود نے ''معیار'' پٹنہ کی جنوری ۱۹۴۴ء کی اشاعت میں تحریر کیا۔ ان دونوں تبصروں سے یہ بات مدلل طور پر ثابت ہوگئی کہ کرامت حسین ہمدانی کے نام کے یہ تمام خط جعلی ہیں جو غالب کے بعض مطبوعہ خطوط کے مختلف اجزا کو باہم مربوط کر کے مرتب کر لیے گئے ہیں۔

غالب کے شائع شدہ خطوط کی مدد سے اس طرح نئے خطوط کی تصنیف یا ترتیب کے سلسلے میں اب تک صرف رسا ہمدانی ہی کا نام لیا جاتا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہ تو وہ اس میدان کے تنہا شہسوار ہیں اور نہ یہ طریق کار ان کے جدت طراز ذہن کی اختراع ہے۔ ان سے برسوں پہلے صفدر مرزاپوری پیوندکاری کے اسی عمل کے ذریعے مولانا احمد حسین مینا مرزاپوری کے نام غالب کے دو خط تیار کر کے اپنی تصنیف ''مرقع ادب'' کے حصہ دوم، مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں شائع کر چکے تھے۔ یہ دونوں خط اسی کتاب سے ''غالب کی نادر تحریریں'' مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں نقل ہوئے۔ بعد ازاں انہیں ''غالب کے خطوط'' کی جلد دوم، مطبوعہ ۱۹۸۵ء میں شائع کر لیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۲۴ء سے اب تک ان خطوط کی اصلیت پر کسی قسم کا شبہ وارد نہیں کیا گیا ہے۔''

حنیف نقوی صاحب نے اس مقالہ میں مرزا غالب سے منسوب نظم پتنگ کو بھی جعلی قرار دیا ہے' جسے غالب کے کلام کا قدیم ترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔'' پتنگ پر یہ نظم صفدر مرزا پوری کی ''ایجاد'' تھی۔

پروفیسر حنیف نقوی کا یہ مقالہ ''ارمغانِ افتخار صدیقی'' مرتبین: پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن (لاہور ۲۰۰۹ء) میں بھی شامل ہے۔

ادبی چوریوں کے ضمن میں مزید معلومات کے لیے ان مقالات کا بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

نذر خلیق/ ڈاکٹر شفیق احمد ''سرقہ اور جعل سازی کی روایت (دوسری زبانوں کے حوالے سے)'' مطبوعہ ''تخلیقی ادب'' اسلام آباد، شمارہ ۵، ۲۰۰۸ء۔

رؤف خیر ''ایک نیا انداز سرقہ'' مطبوعہ ''مخزن'' لاہور شمارہ نمبر ۲۲، ۲۰۱۱ء۔

ادبی چوریوں، علمی سرقوں، حوالوں اور اقتباسات پر ڈاکے کے ساتھ ساتھ خیال وافکار اور تصورات پر شب خون مارنے کی بھی مثالیں مل جاتی ہیں۔

سعد شاہ گلشن نے ولی کو جب ''نصیحت'' کی کہ فارسی شاعری سے مضامین اخذ کرو، تم سے کون پوچھے گا تو یہ بھی خیالات وتصورات کی چوری کے مترادف تھا۔ آج کل یہ کار خیر کمپیوٹر کے ذریعے سے ہورہا ہے۔ انٹرنیٹ پر دنیا بھر کے علوم وفنون اور تحقیق وتنقیدی نوعیت کا مواد، ادبیات اور طرح طرح کی معلومات وکوائف دستیاب ہیں۔ یوں بلا محنت وجستجو مفت کی تحقیق آسان ہوگئی لیکن محنت سے کچھ حاصل کرنے کی لذت اور طمانیت کی قیمت پر۔ تحقیق وتنقید میں شارٹ کٹ نہیں ہوتا لیکن اب کمپیوٹر یہ شارٹ کٹ فراہم کررہا ہے، یوں کہ تحقیق اب کھیل بچوں کا ہوا۔

کئی نیٹ چور پکڑے گئے لیکن متعدد ہنوز گرفت سے آزاد ہوں گے۔

کسی بھی تحقیقی منصوبہ کے لیے فراہمی مواد کے سلسلہ میں کی گئی محنت بلکہ مشقت اور پھر مطلوبہ معلومات/ کوائف/ حوالے حاصل کرلینے کی مسرت محققین کی ایسی کاوش کا سب سے بڑا انعام اور صلہ ہوتی ہے مگر اب تحقیقی کاوش محض کمپیوٹر کے'' کی بورڈ'' کے بٹن دبانے کے مساوی ہے۔ سائبر کرائم اب تحقیق وتنقید میں بھی راہ پارہا ہے۔

جامعہ پنجاب کے کچھ پروفیسرز کمپیوٹر سے چوری کے مرتکب پائے گئے اور گورنر پنجاب جناب خالد مقبول کے حکم پر ملازمتوں سے برخاست کیے گئے، یہ تو وہ تھے جو پکڑے گئے، نہ جانے اور کتنے ایسے ہوں گے جو پکڑے نہ جاسکے۔

تنقیدی چوریوں، تحقیقی سرقوں اور ادبی جعل سازیوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً مقالات چھپتے رہے ہیں۔ ایسے مقالات جنھیں اگر جمع کیا جاسکے تو ادبی چوریوں کی داستان مرتب ہوسکتی ہے۔ مثالوں اور کوائف کے ساتھ اس ضمن میں ممتاز لیاقت کی مرتبہ ''بکف چراغ دارد'' (لاہور: ۱۹۶۸ء) کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اس میں وقار عظیم اور سجاد باقر رضوی کی مبینہ چوریوں کے شواہد تھے۔

ادبی چوریوں کے ضمن میں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ ایک ادیب اگر ایک مرتبہ سرقہ کا مرتکب پایا جائے تو اس کے بقیہ کام سے کیا سلوک ہونا چاہیے؟ ہم نے دیکھا کہ جو ادیب سرقہ کے مرتکب پائے گئے ان کی عمومی شہرت برقرار رہی۔

''چہ دلاور است'' میں سید حسن مثنیٰ ندوی نے مقالہ ''سرکاری فائلوں کی چوری'' میں سعادت حسن منٹو کے بارے میں عجیب بات لکھی:

''منٹو سرقے کی واردات میں ملوث تو نظر نہیں آتا لیکن خود اپنے معاشی حالات اور شراب نوشی کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر آخری عمر میں اتنا بے خبر ہو گیا تھا کہ ان افسانوں کو جو اصلاح کی غرض سے اس کے پاس آتے تھے، اپنے نام سے شائع کرا دیتا تھا۔ سماج سے بغاوت کا یہ انداز منٹو کے لیے باعث ندامت ہے۔ منٹو ایک باغی کے انداز میں دوسروں کی تخلیق کو غصب کرتا نظر آتا ہے۔ وہ بھی اپنی سماجی اور معاشی بدحالی کی بنا پر، لہٰذا ہم منٹو کو غاصب تو کہہ سکتے ہیں لیکن سرقہ باز قرار نہیں دے سکتے۔ منٹو میموریل سے شائع ہونے والی کتاب ''منٹو میرا دوست'' کے ص ۸۱ سے ۸۵ (میں) مختصراً یہ لکھا تھا کہ نگر نگر کے فسانے جس کا مقدمہ احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا، افسانوں کے اس مجموعے کو مصنف نے منٹو کو بھی دیکھنے کے لیے دیا اور جب ایک دن مصنف منٹو سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے افسانوں میں ایک افسانہ منٹو کے پاس نقل کر کے رکھا ہوا ہے اور باہر جانے کی تیاری میں مصروف ہے، جب مصنف نے منٹو سے اس کی اس حرکت کے بارے میں پوچھا تو منٹو نے جواب دیا:

> ''یار کیا کیا جائے، کچھ لکھا نہیں ہے اور کھانے پینے کے لیے پیسے نہیں۔ سوچا کہ تمہارا افسانہ ہی ٹھکانے لگا آئیں۔ منٹو کا نام چلتا ہے چاہے کسی کی بھی چیز ہو۔ منٹو کا نام ہو تو منٹو کے نام پر بک جائے گی۔''
>
> اگلے پیرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ نگار محمد اسد اللہ ہو گا۔ (ص ۲۰۔۱۹)

اس اقتباس کی روشنی میں اب منٹو کے محققین کے لیے اس امر کا تعین بھی لازم ہو گیا کہ داخلی شواہد سے کھرے سے کھوٹے کو الگ کریں۔ منٹو جیسا جینیس کسی کا افسانہ تو نہیں چرا سکتا تھا کہ خود صاحب طرز اور صاحب اسلوب افسانہ نگار تھا لیکن کسی کا افسانہ اپنے نام سے فروخت کر دینا بھی تو ایک نوع کی چوری ہی ہے۔

یہ ہے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی کے زیر اہتمام مرتبہ کتاب ''چہ دلاور است'' (مرتبین: سید خالد جامعی/سلیمان چشتی/ریحان چشتی) سعید خالد جامعی کے مفصل مقدمہ کے ساتھ ۲۰۰۷ء میں شائع کی گئی، اسے ''مشرق و مغرب میں سرقہ بازی کی تاریخ'' قرار دیا گیا ہے۔ سرورق کی عبارت کے بموجب یہ ہے کہ:

> ''علامہ اسلم جیراج پوری، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر احمد امین مصری، مولوی عبدالحق، مرزا غلام احمد قادیانی، مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی عبدالغفار، ایڈورڈ ہنری پامر، محمد حسین آزاد، دانتے، ڈاکٹر سرادھا کشن، عصمت چغتائی، کرشن چندر، ڈاکٹر میر ولی الدین، پروفیسر آل احمد سرور، یونس بٹ، ن۔م۔ راشد کے سرقوں کی سرگزشت۔''

یہ اتنے بڑے نام اور قد آور شخصیات ہیں کہ ان پر سرقہ کے الزام کا سوچا بھی نہیں جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ دستاویزی شہادتوں سے سب کچھ ثابت کیا گیا ہے۔

مقالات تحریر کرنے والوں میں یہ حضرات شامل ہیں: سید خالد جامعی، سید حسن مثنیٰ (۱۴ مقالات) سید علی اکبر (دو مقالات) سید ابوالخیر کشفی (چھ مقالات) ڈاکٹر حبیب الحق ندوی، پروفیسر حافظ غلام مصطفیٰ، قاضی عبدالودود بیرسٹر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مولانا احسان مارہروی، نظیر صدیقی اور سلیم عاصمی۔ ان کے علاوہ رسالہ زمانہ کانپور اور رسالہ الناظر لکھنؤ میں مطبوعہ مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔ سید خالد جامعی کا مفصل مقدمہ ''سرقے کی روایت تاریخ و تحقیق کی روشنی میں فارسی، عربی، اردو اور یورپی زبانوں میں سرقہ کی مختصر تاریخ'' بیان کی گئی ہے۔

''چہ دلاور است'' چشم کشا کتاب ہے کہ سرورق پر درج اسماء کے علاوہ بھی کتاب میں متعدد اہل قلم کا تذکرہ ملتا ہے۔

''چہ دلاور است''، ضخیم اور مفصل کتاب ہے، کتاب کیا ہے ادبی سرقوں پر اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا ہے جسے پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں (سب نہیں، کچھ) نے سرقہ کی جملہ اقسام سے کام لیا اور خوب کام لیا لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

ان دنوں ہندوستان میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی معروف کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کی بابت بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ نارنگ صاحب پاکستان اور ہندوستان میں مقبول اور محترم ہیں مگر برطانیہ کے عمران شاہد بھنڈر کچھ اور ہی انکشاف کر رہے ہیں۔ مقالہ بعنوان ''دانشوروں کے سرقے کا جواز مزید معروضات'' مطبوعہ ''انگارے'' (ملتان، نومبر ۲۰۰۷ء) کا آغاز یوں کیا:

> ''گزشتہ برس میں نے گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں نقالی کے رجحان کی نشاندہی کرنے کے لیے ایک مضمون بہ عنوان ''گوپی چند نارنگ مترجم ہیں مصنف نہیں'' تحریر کیا جو پہلی بار ۲۰۰۶ء میں ''نیرنگ خیال'' کے سالنامے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس مضمون پر از سر نو نظر ڈالی اور نئے تحقیقی مواد کی بنیاد پر چند اور اقتباسات بشمول تفصیلات خط تحریر میں لایا جو ''جدید ادب'' کے شمارہ نمبر ۹ جولائی تا دسمبر میں دوبارہ شائع ہوا۔ اس مضمون میں تناظر کے اعتبار سے اپنی ترجیحات متعین کرنے کے سلسلے میں بھی چند حوالے مغربی مابعد جدید مفکروں (لیونارڈ، بیٹرس، فوکو وغیرہ) کے افکار کے مختصر تنقیدی جائزے کے بعد پیش کیے گئے۔ اس مضمون میں نقالی کے رجحان کو عیاں کرنے کے علاوہ مقصود محض تناظر کی اہمیت واضح کرنا تھا۔''

عمران شاہد بھنڈر نے اس ضمن میں ایک اور مقالہ بھی قلم بند کیا۔ ''گوپی چند نارنگ کی سچائی اور تناظر سرقے کی زد میں'' اس مقالہ میں بھی شواہد فراہم کیے گئے تھے۔ (مقالہ مطبوعہ ''عکاس'' انٹرنیشنل شمارہ نمبر ۹، مئی ۲۰۰۹ء مرتبین ارشد خیال اور امین خیال (جاپان) اسلام آباد۔ ''عکاس'' کے اس شمارہ کو ''گوپی چند نارنگ'' قرار دیا گیا ہے اور لکھنے والوں میں یہ حضرات شامل ہیں۔ مسعود حسین خان، مشفق خواجہ، وسیم مینائی، کمارل اہل، فاروق ارگلی، سکندر احمد، ارون کمار، زبیر رضوی، حیدر قریشی، تنہا تماپوری، محمد احمد سبزواری، فضیل جعفری، جاوید حیدر جوئیہ شمیم طارق اور اشعر نجمی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر یہ مبینہ الزام ہے کہ انھوں نے کیتھرین بیلسی، جولیا کرسٹوفر، کرسٹوفر نورس، میرنس ہاکس، ٹیری ایگلٹن، رامن سیلڈن، جان سڑوک، کی کتابوں سے بلا حوالہ مواد اخذ کیا۔ حیدر قریشی (جرمنی) مقالہ ''جدید ادب کے شمارہ نمبر ۱۲ کی کہانی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی مہربانی در مہربانی'' میں رامن سیلڈن اور نارنگ صاحب کی کتاب سے سرقہ شدہ صفحات کے نمبر بھی درج ہیں۔

رامن سیلڈن کی کتاب	گوپی چند نارنگ کے سرقہ شدہ صفحات
۲۷ تا ۴۲	۷۹ تا ۱۰۶
۳۹ تا ۷۰	۲۸۸ تا ۳۲۹
۱۴۹ تا ۱۵۸	۲۳۳ تا ۲۴۰

۸۶ تا ۱۰۳ ۲۴۳ تا ۲۶۷

(بحوالہ ''عکاس'' شمارہ نمبر ۹، مئی ۲۰۰۹ء)

اس شمارہ میں نند کشور وکرم کے استفسار کے جواب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جو جواب دیا، وہ بھی پیش ہے تا کہ نارنگ صاحب کا موقف بھی واضح ہو جائے۔

نند کشور وکرم: کہا جاتا ہے کہ ساختیاتی تنقید کو اردو ادب میں پیش کرنے والوں نے اسے ترجمہ یا اخذ و تلخیص کی صورت میں پیش کیا ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

گوپی چند نارنگ: جب میں نے تھیوری پر کام کرنا شروع کیا چونکہ میری تربیت ساختیاتی لسانیات کی ہے، مجھے احساس تھا کہ فلسفے میں بنیادی ضرورت سائنسی معروضیت کی ہوتی ہے، میرے سامنے ایسے نمونے تھے جہاں لوگ بات تو فلسفے کی کرتے ہیں لیکن بہت جلد تخیل کے پروں سے اڑنے لگتے ہیں اور ''ایجاد بندہ'' کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہت سے اصل متن سے زیادہ خود کو نمایاں کرنے میں لگ جاتے ہیں یا پھر اپنے اسلوب کا شکار ہو کر کم و بیش انشائیہ لکھنے لگتے ہیں۔ ایک تو اصطلاحیں نہیں تھیں دوسرے نئے فلسفیوں کا انداز ایسا پیچیدہ، معنی سے لبریز اور گنجلک ہے کہ اسے سائنسی معروضی صحت کے ساتھ قاری تک منتقل کرنا زبردست مسئلہ تھا۔ اصل متن کی Precisencess اور زور و صلابت Rigour کو بنائے رکھنے کے لیے بھی بے حد ضروری تھا کہ افہام و تفہیم میں ہر ممکن وسیلے سے مدد لی جائے اور فلسفے کے ڈسپلن کی رو سے تخیل کی رنگ آمیزی سے اور موضوعی خیال بافی سے ممکنہ حد تک بچا جائے۔ میری کتاب کے شروع کے دونوں حصے تشریحی نوعیت کے ہیں۔ تیسرا حصہ یعنی مشرقی شعریات اور اختتام والے حصوں کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ نئے فلسفیوں اور ان کے نظریوں اور ان کی بصیرتوں کی افہام و تفہیم میں، مَیں نے اخذ و قبول سے بے دھڑک مدد لی ہے۔ جہاں ضروری تھا وہاں تلخیص اور ترجمہ بھی کیا ہے۔ بات کا زور بنائے رکھنے کے لیے اصل کے Quotations بھی جگہ جگہ دیئے ہیں تا کہ فلسفیانہ نکتہ یا مفکرین کی بصیرت پوری قوت سے اردو قاری تک منتقل ہو سکے۔ ہر حصے کے ساتھ اس کے جملہ مآخذ اور کتب حوالہ کی فہرست دی ہے اور جن کتابوں سے نسبتاً زیادہ استفادہ کیا ہے یا جن سے زیادہ مدد لی ہے، مآخذ کی فہرست میں ان ناموں پر اسٹار (☆) کا نشان بنا دیا ہے۔ واضح رہے خیالات سوسیئر، لیوی سٹراس، رومن جیکب سن، لاکاں، دریدا، بارتھ فوکو، کرسٹیوا، شکلوسکی، باختن وغیرہ کے ہیں، میرے نہیں۔ اسی لیے کتاب کا انتساب ان سب فلسفیوں اور مفکروں کے نام ہے جن کے خیالات پر کتاب مشتمل ہے۔ اس امر کی وضاحت دیباچے میں کر دی گئی ہے کہ ''خیالات اور نظریات فلسفیوں کے ہیں، افہام و تفہیم اور زبان میری ہے۔'' (سہ ماہی ''ادب عالیہ انٹرنیشنل'' وہاڑی، اپریل، مئی، جون ۲۰۰۸ء)

..........☆..........

''مسائلِ ادب اور اہلِ نظر''

ابنِ عاصی

مثال پبلی شرز......فیصل آباد

علامت کو باوقار بنانے والا افسانہ نگار: منشا یاد

جمیل یوسف

میں اس لحاظ سے منشا یاد کو پاکستان کا ایک بڑا افسانہ نگار سمجھتا ہوں جس نے پیارے وطن پاکستان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کی حقیقت اپنے افسانوں میں بے مثال طریقے سے اُبھاری۔ پریم چند کا ''کفن'' منٹو کا ''ہتک'' اور غلام عباس کا ''آنندی'' ایسے افسانے ہیں جو کسی بھی ملک اور کسی بھی شہر کی کہانی ہو سکتے ہیں مگر ''آس کی موت''، ''کہانی کی رات'' اور ''تماشا'' جیسے افسانے صرف اور صرف پاکستان کی کہانی سناتے ہیں۔ یہ افسانے اور منشا یاد کے ہاں اس قبیل کے کئی اور افسانے اس دلخراش بلکہ دل دہلا دینے والے المیے کی داستان ہیں جو پاکستان پر گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔

منشا یاد کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ہر چند کہ ان کے پلاٹ ارد گرد کی روزمرہ زندگی سے لیے گئے ہیں اور ان کہانیوں کے کردار بھی جانے پہچانے سے لگتے ہیں مگر یہ واقعات بالکل اس طرح رونما نہیں ہوتے جس طرح ایک عام آدمی کے مشاہدہ میں آتے ہیں بلکہ منشا یاد اپنے موقلم سے ان واقعات کے تاروپود میں گہرے انسانی جذبات اور احساسات کے رنگ بھر دیتا ہے جس سے قاری کو یوں لگتا ہے کہ واقعہ خود اس پر گزرا ہے۔ یہی ایک بڑے افسانہ نگار کی پہچان ہے۔ کسی واقعہ کی خبر جو اخبار میں چھپتی ہے اور اس واقعے پر مبنی افسانے میں یہی فرق ہوتا ہے کہ خبر پڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ وقوعہ میں وہ خود شامل تھا مگر اسی واقعے پر مبنی منشا یاد کا افسانہ پڑھ کر اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس واقعے میں سے اپنے پورے جسم اور حسیات کے ساتھ گزرا ہے۔ اس تجربے سے سچائی پوری شدت سے اس پر منکشف ہوتی ہے۔ صحافت اور ادب میں یہی فرق ہے۔

''آس کی موت'' میں جب بابا دینا مشرقی پاکستان کے محاذ پر اپنی فوج کے شیر دل جوانوں کی شکست کی خبر سنتا ہے تو اسے ہرگز اس بات کا یقین نہیں آتا کہ پاک فوج کے جانباز مجاہدوں کو اتنی آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی اسی بات پر اڑا رہتا ہے کہ یہ خبر سچی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ ہر کسی سے کہتا کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے ہزاروں شیر دل جوان ہندوؤں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں، وہ بھی ایک زنانی (اندرا گاندھی) وزیر اعظم کے دور میں۔ اس کا ایمان ہے کہ کافر کبھی مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے۔

''تم سب لوگوں کا ایمان بڑا کمزور ہے۔ امریکی گندم اور ڈالڈا گھی کھانے کی وجہ سے تم لوگ بزدل ہو گئے ہو۔ اوئے سوچو تو ذرا کیا شیروں کے پتر گیدڑوں سے شکست کھا سکتے ہیں؟''

بابا دینا قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتا تھا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ہزارہا شیروں کے پتر بھارت کی قید میں چلے گئے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ شیروں کے پتر اب بھی دشمن کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ بابا دینا کے عزیز و اقارب یہ سمجھتے ہیں

کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ اس کا علاج کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ نشتر سے اس کے جسم کا فاسد خون نکلواتے ہیں تاکہ اسے کچھ افاقہ ہو مگر وہ سب کو گالیاں دیتا ہے۔

''سور کے پتر و! اگر تم میری بوٹیاں بھی کر دو تو بھی میں شیروں کے پتروں کی شکست تسلیم کر کے اس عمر میں اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔''

بابا دینا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ دماغی حالت تو ان کی درست نہیں تھی جو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہماری فوج کے نوے ہزار کے قریب جانبازوں نے شکست کھا کر ہتھیار پھینک دیے ہیں اور اپنے جسم کے خون کا آخری قطرہ بہائے بغیر انہوں نے بزدلی سے ہندوؤں کا قیدی بننا قبول کر لیا ہے۔ بابا دینا کس طرح اپنے نوے ہزار مجاہدوں کے ہتھیار ڈالنے اور ان کے قیدی بن جانے پر یقین کر لیتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اتنا شرمناک واقعہ کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں تو غزوۂ بدر کے ۳۱۳ مسلمان مجاہدین تھے جنہوں نے نہتے ہونے کے باوجود دشمن کے ایک ہزار مسلح سپاہیوں کو مار بھگایا تھا۔ وہ تو طارق بن زیاد کے ان بارہ ہزار مجاہدین کا سوچ رہا تھا جنہوں نے اپنے وطن سے دور دیارِ غیر میں اندلس کے ٹڈی دل لشکر کو شکست دی تھی۔ ہمارے فوجی جوان جو شوقِ شہادت میں سروں پر کفن باندھ کر نکلے تھے، اپنے ہی وطن میں کیسے ہار گئے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں کیسے آ سکتی تھی۔ بابا دینا ٹھیک کہتا تھا ضرور کوئی بڑی خوفناک قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ضرور کوئی بات ہے جو چھپائی جا رہی ہے۔ جب اسے ایک پڑھے لکھے سمجھدار ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے اور ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ بابا جی! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہمارے جانبازوں کو شکست نہیں ہوئی۔ ہمارے شیر دل جوانوں کو وہاں لڑنے سے روک دیا گیا اور ایک سازش کے تحت انہیں دشمن کی قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگر انہیں لڑنے سے زبردستی نہ روکا جاتا تو انہیں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی تھی اور سچی بات یہی ہے کہ ہمارے جانباز ایک ایک کر کے شہید ہو جاتے مگر دشمن کا قیدی بننا گوارا نہ کرتے اور کون نہیں جانتا کہ جب ایک لاکھ مسلح جانباز مرنے مارنے پر تل جائیں تو انہیں کبھی شکست نہیں دی جا سکتی۔ بانیٔ پاکستان قائداعظمؒ نے اسی لیے فرمایا تھا کہ اگر کبھی پاکستان کی بقاء کے لیے جنگ لڑنا پڑے تو ہرگز ہمت نہ ہاریں۔ پہاڑوں اور سمندروں میں جنگ جاری رکھیں چاہے دشمن تمہیں اٹھا کر سمندر میں کیوں نہ پھینک دے۔ اگر ہم قائداعظمؒ کے اس فرمان پر عمل کرتے تو شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے تو بابا دینا یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ہمیں شکست ہو گئی ہے۔

اس نکتے پر بحث قدرے طول پکڑ رہی ہے مگر بابا دینا جس ذہنی الجھن سے دوچار تھا اور اس کے ایمان و یقین کو جو دھچکا لگا تھا اس کے تجزیے کے لیے اس واقعے کے ایک آدھ پہلو کا مزید ذکر کرنا ضروری ہے جو یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

چکوال کے ایک ہونہار سپوت اور پاکستان آرمی کے سابق ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز بریگیڈیئر گلزار احمد (مرحوم) اس وقت سعودی عرب میں تھے جب مشرقی پاکستان پر بھارتی فوج کی یلغار دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ جنرل نیازی نے پاک فوج کو مشرقی پاکستان کے چاروں طرف سرحدوں پر پھیلا رکھا تھا، جہاں ہمارے جانباز وطن کے چپے چپے کی حفاظت کے لیے سینہ سپر تھے۔ بریگیڈیئر گلزار احمد نے جنرل نیازی کو مشورہ دیا کہ سرحدوں کی بجائے ساری فوج کو ڈھاکہ شہر میں مورچہ بند کر دو۔ اگر اس مشورے پر عمل کیا جاتا اور ایک لاکھ کے قریب فوجی ڈھاکہ شہر میں مورچہ بند ہو جاتے تو بھارت کبھی ڈھاکہ پر قبضہ نہ کر سکتا تھا مگر جنرل نیازی کو تو ہمارے زبردستی کے صدر جنرل یحییٰ خان کی طرف سے ہتھیار ڈال دینے کا حکم مل چکا تھا۔ جب فوج کو اس مقصد کے لیے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں اکٹھا کیا گیا تو اعلان یہ کیا گیا کہ مشرقی پاکستان والوں سے ہمارا معاہدہ ہو گیا ہے۔ ہم اپنے

ہتھیار ان کے حوالے کر کے مغربی پاکستان واپس جا رہے ہیں۔ عام سپاہیوں کو تو اصل حقیقتِ حال کا پتہ اس وقت چلا جب ان سے ہتھیار لے کر ایک جگہ جمع کروانے کے بعد انہیں واپس بیرکوں میں بھیج دیا گیا اور تھوڑی دیر بعد انڈین آرمی کے مسلح دستے انہیں اپنا قیدی بنانے کے لیے آن پہنچے۔ گویا ہمارے نوجوانوں کو دھوکے سے غیر مسلح کر کے دشمن کے آگے ڈال دیا گیا۔

اس سازش میں بیرونی طاقتیں تو یقیناً ملوث تھیں۔ امریکہ، روس اور بھارت یہی چاہتے تھے کہ پاکستان دولخت ہو جائے مگر ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوتی اگر ہماری فوجی اور سیاسی قیادت اس سازش میں کلیدی کردار ادا نہ کرتی۔ جنرل یحییٰ کو یہ غلط فہمی تھی کہ مشرقی پاکستان کو کاٹ کر الگ کر دینے سے اس کا اقتدار ہمیشہ کے لیے پکا ہو جائے گا۔

مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی شکست کا دلخراش اور روح فرسا سانحہ سب اہلِ وطن پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ بہت سے اہلِ قلم نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کرب کو الفاظ میں ڈھالا مگر جس طرح منشایاد نے اپنے افسانے ''آس کی موت'' میں اس درد و غم کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے اس کی کوئی مثال میری نظر سے نہیں گزری۔ اس میں بابا دینا محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک علامت ہے جس نے اس سانحے کو اردو ادب میں امر کر دیا ہے۔

منشایاد کا مشہور اور دم بخود کر دینے والا افسانہ ''تماشا'' بھی مجھے پاکستان کی صورتحال کی تمثیل لگتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اگرچہ اسے معاشرے کی اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت بلکہ ان اقدار کے قتل کی کہانی قرار دیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں یہ افسانہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کرنے کے خواب میں گم ہو جانے کی کہانی ہے۔ وہی خواب جو ہم نے قیام پاکستان کی صورت میں دیکھا تھا۔ افسانے کے شروع میں ہی مسجد کے میناروں والی ایک بستی کا ذکر ہے جس تک پہنچنے کی جدوجہد جاری ہے۔

''وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں...... بستی...... جہاں انہیں پہنچنا ہے، اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لیے پل ہے نہ کشتی۔ وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا ہے۔

چھوٹا کہتا ہے ''ابا! پل۔ مجھے پل دکھائی دے رہا ہے۔''

''عجیب بات ہے، جمورے...... پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔''

''اور بستی بھی ابا۔'' چھوٹا کہتا ہے۔ ''مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔''

صاف ظاہر ہے یہ بستی اور مسجد کے مینار علامتی اظہار ہے، اس منزلِ مراد کا جس کا نام پاکستان ہے مگر وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ، کوئی سبیل دکھائی نہیں دے رہی۔

گیت کے جو دو بول باپ بیٹے کے منہ سے نکلتے ہیں، وہ بھی اس مفہوم کی جانب دلالت کرتے ہیں۔

''نیں وی ڈونگھی تلہ پرانا شینہاں تاں پتن ملے'' (ندی گہری اور کشتی پرانی ہے اور گھاٹ پر شیروں کا پہرا ہے۔)

میں وی جانا جوک رانجھن دی نال مرے کوئی چلے (مجھے بھی محبوب کی بستی پہنچنا ہے، کوئی میرے ساتھ چلے۔)

اس افسانے میں ابابیلوں کے لشکر کا ذکر ایک ایسی تلمیح ہے جو ہمارے خیال کو قرآن حکیم میں بیان کیے ہوئے مشہور واقعے کی طرف لے جاتی ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو پتر۔ ابابیلیں ہیں۔''

''ہاں ابا پورا لشکر ہے۔''

''دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر۔''

''کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا۔''

''اور کیا پتر؟''

''ہاتھیوں کو ابا۔''

''نہیں پتر، یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے اور چوگ بدلنے (اختلاط کرنے) والی ابابیلیں ہیں۔''

''مجھے تو یہ ابابیلیں پاکستانی جرنیلوں کا وہ ٹولہ لگتا ہے جس نے امریکی آشیرباد کے سائے میں اپنے ہی ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر ابابیلوں کے اس لشکر کے سردار نے نیا شہر بسایا تھا، ایک نئی بستی۔''

''تو کیا اس پوری بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟''

''ہم رہنے ہی نہیں دیتے۔'' ایک بچہ ہنس کر کہتا ہے ''ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

یہاں پہنچ کر مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا خیال آتا ہے۔ قائداعظمؒ کی موت کے لمحات اور فاطمہ جناح اور حسین شاہد سہروردی کی یاد آتی ہے۔ لیاقت علی خان اور حکیم محمد سعید اور بے نظیر بھٹو کے قتل کے واقعات ذہن میں تازہ ہوتے ہیں۔

یہ ڈراؤنی بستی جس میں مجبوری باپ بیٹے کو کشاں کشاں لے آتی ہے، کسی ایک شہر کی علامت نہیں بلکہ پورے ملک کی علامت ہے جہاں بونوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ان بونوں نے اس بستی پر کوئی ایسا جادو کر رکھا ہے، کوئی ایسا اسرار باندھا ہے کہ مداری اپنا کرتب بھول جاتا ہے۔ جب وہ اپنے بیٹے پر چادر ڈال کر اس کے گلے پر چھری پھیرتا ہے تو اس کا گلا کٹ جاتا ہے۔ اسے فوری طور پر اس بات کا ادراک نہیں ہوتا مگر بستی کے بونوں کو پتہ ہے کہ بچہ ذبح ہو چکا ہے۔ وہ تالیاں بجا بجا کر خوش ہو رہے ہیں۔ پھر وہ وہاں سے کھسکنے لگتے ہیں اور اس لمحے کا انتظار نہیں کرتے جب مداری بچے کے اوپر سے چادر ہٹائے۔ حالانکہ عام حالات میں تماشائیوں کے خوش ہونے اور تالیاں بجانے کی نوبت اس وقت آتی ہے۔ بچے کے قتل میں یقیناً اس بستی کے مکینوں کی کسی سازش کا عمل دخل ہے ورنہ یہ تماشا تو مداری ہر روز دکھاتا ہی رہتا ہے۔ بہرحال بچہ جو مستقبل کی علامت ہے، اس کی گردن کٹ جاتی ہے۔ اب کوئی عیسیٰ نفس ہی آ کر اسے قم باذن اللہ کہے۔

''کہانی کی رات'' تو ہزاروں بلکہ لاکھوں پاکستانیوں کی دیکھی بھالی کہانی ہے۔ یہ اس رات کا ذکر ہے جب اس مظلوم ملک کے چوتھے ''نجات دہندہ'' جنرل مشرف نے شب خون مارا تھا۔ لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک منظر بدل گیا۔ تصویر بھی غائب ہوگئی اور آواز بھی۔ پہلے تو یہی سمجھے کہ کوئی تکنیکی خرابی ہے۔ پھر جب تاریکی اور خاموشی کا وقفہ طویل سے طویل تر ہونے لگا تو پریشانی میں سب لوگوں کا ردعمل وہی تھا جس سے افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔

گھبرا کر ٹیلی فون ملایا ''ہیلو میری سکرین سیاہ ہوگئی ہے۔''

''میری بھی۔''

''اس کا مطلب ہے سب کی۔''

دماغ میں مخالف سمتوں سے ایک ہی پٹڑی پر چڑھ آنے والے انجنوں کے ٹکرانے کا سا دھماکہ ہوا۔

اس نے کہا" کوئی ٹیکنیکل فالٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔" کچھ ہوا ہے۔"

اس صورت حال نے لوگوں کو کئی گھنٹے گومگو اور پریشانی کی کیفیت میں رکھا۔ ٹی وی سکرین پر کچھ نظر آتا تھا نہ ٹی وی کے کمرے سے باہر نکل جانے کو جی چاہ رہا تھا کہ نہ معلوم کس وقت سکرین پھر روشن ہو جائے اور "میرے عزیز ہم وطنو!" کی آواز گونجنے لگے۔ کئی لوگ احباب سے فون پر حقیقت حال معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اِدھر اُدھر گھوم پھر کر جائزہ لیتے رہے کہ کیا ماجرا ہے۔ کئی گھنٹوں پر پھیلا ہوا یہ صبر آزما اور پریشان کن انتظار آخر افسانے کے اس جملے پر ختم ہوتا ہے:

"سکرین پر ایک نامانوس چہرہ نمودار ہوا اور ہم ایک نئی اور دلچسپ کہانی سننے لگے جسے سننے کے لیے کئی گھنٹوں سے ہمارے اعصاب شل ہو رہے تھے۔"

اس افسانے کے پہلے جملے" یکا یک سکرین سیاہ ہو گئی" اور اس کے آخری جملے کے درمیان تقریباً نو دس صفحے ہیں جن میں افسانہ نگار نے اپنی ذہنی کیفیت اور اردگرد کے ماحول کی فضا بیان کی ہے۔ واقعہ بظاہر انتہائی مختصر ہے کہ ٹی وی کی سکرین سیاہ ہو جانے کے بعد کئی گھنٹے مسلسل اس بے چینی اور بے بسی میں گزرے ہیں کہ کیا ہوا ہے یا کیا ہو رہا ہے۔ اس صورتحال کے اظہار میں افسانہ نگار نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ان نو دس صفحات میں بظاہر کوئی مسلسل مربوط کہانی بیان نہیں کی گئی مگر سسپنس کی فضا اور قاری کی دلچسپی مسلسل قائم رہتی ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کئی مناظر سامنے آتے ہیں۔ ان میں بظاہر کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا مگر معنوی اور علامتی سطح پر یہ سارے مناظر ایک دوسرے سے جڑے اور ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں جو مرکزی تاثر کو گہرا کرتے چلے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کی اس فنکارانہ ریزہ کاری کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

"کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر بوکھلایا ہوا چھت پر آیا اور شہر پر نظر دوڑائی مگر کوئی خاص تبدیلی دکھائی نہ دی۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھی مگر پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آنے والی گاڑیاں زیادہ ہیں یا جانے والی دو ایک جگہوں سے دھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ معلوم نہیں بارود کا تھا یا خاکروبوں نے خزاں کے خشک پتوں کو جمع کر کے آگ لگائی تھی۔ اکا دکا فائر کی آواز بھی سنائی دی مگر یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ گولی چلی ہے یا پٹاخہ۔"

پھر باپ بیٹے کی معنی خیز گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔

"تو کیا اینٹی وائرس پروگرام اسے روکتا یا خبردار نہیں کرتا؟"

"ابو جی! آپ کو معلوم تو ہے نت نئے وائرس ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔"

ایک اور منظر میں دادا جان بچوں کو کہانی سنا رہے ہیں۔

"تو پیارے بچو! اس طرح اس ظالم جادوگر نے اپنے جادو کے زور سے سارے دشمنوں کو اور جن جن لوگوں سے اس کو خطرہ تھا، پتھر کی مورتیوں میں تبدیل کر دیا۔"

یہاں قاری کو ٹی وی سکرین کا خیال آتا ہے جو پتھر بن چکی ہے۔ گھر سے باہر کا حال کچھ اس طرح بیان ہوا ہے۔

"ہم مارکیٹ پہنچ گئے۔ وہاں جگہ جگہ لوگ جمع تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پھر بھی وہ کسی طلسماتی شہر کا چپ بازار لگتا تھا مگر ایک کالے کلوٹے سوال کا بھونرا تھڑوں، ہوٹلوں اور دکانوں کے آگے جھنبھناتا اور پوچھتا پھرتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟"

باپ بیٹا گھومتے پھرتے ہوئے زیرو پوائنٹ کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اباجی بولے "یہ زیرو پوائنٹ ہے؟"
"جی۔" میں نے جواب دیا "ہم گھوم پھر کر پھر زیرو پوائنٹ پر آ گئے ہیں۔"

یہ مختلف مناظر اپنے اپنے انداز میں ایک طرح سے کہانی کی تمثیل پیش کرتے ہیں۔ بظاہر بے تعلق اور بے جوڑ مگر علامتی طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور کہانی کی اصلیت اور معنویت کو اجاگر کرنے والے۔ ملک کو پھر ایک بار جمہوریت کی پٹڑی سے اتار کر فوجی آمریت کی کال کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا یعنی ہم گھوم پھر کر پھر زیرو پوائنٹ پر آ گئے ہیں۔

"خیابان قائداعظم جس کا نام ماسٹر پلان کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جناح ایونیو رکھ دیا گیا۔"

اس طرح کا ہر فقرہ وطن عزیز کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہ منشایاد کا خاص انداز ہے، وہ اپنی اکثر کہانیوں میں اسی طرح چھوٹی چھوٹی تمثیلوں کی جھلکیاں دکھاتا جاتا ہے۔ ایک اور کہانی "خواب راستہ" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجیے:

"ہیلو شاہ جی میں بڑی دیر سے بھٹک رہا ہوں، شارع جمہوریت کہاں واقع ہے؟"
"آج کل مرمت کے لیے بند ہے۔"
"مگر ہے کہاں؟"
"کانسٹی ٹیوشن ایونیو کے پاس۔"
"اور وہ کہاں ہے؟"
"کانسٹی ٹیوشن یا ایونیو؟"
"ایونیو یار۔"
"پارلیمنٹ بلڈنگ دیکھی ہے؟"
"ہاں۔ اسی ہانٹڈ ہاؤس کے سامنے تو ہوں جو انڈر دی ٹو آف پریذیڈنسی ہے۔"
"وہاں سے تھوڑا آگے چلو تمہارے بائیں ہاتھ پر ایک خوبصورت اور پروقار عمارت ہوگی۔"
"اچھا جہاں بلوہ ہوا تھا؟"
"ہاں یہی تو کانسٹی ٹیوشن ایونیو ہے۔ اس پر ذرا آگے جا کر کراسنگ آئے گا۔"
"آ گیا اور پہنچ گیا۔"
"یہی شارع جمہوریت ہے۔"
"ہاں۔ مگر شاہ جی! یہ سڑک اتنی چھوٹی کیوں ہے؟"
"بھائی اس ملک میں جمہوریت کی جتنی عمر ہے سڑک کی لمبائی اس کے مطابق رکھی گئی ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ یہ تمثیلچے کہانی کے مرکزی خیال کو اجاگر کرنے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں مگر حیرت یہ ہے کہ اس کے باوجود قاری آخر تک کہانی کے انجام سے بے خبر رہتا ہے۔ کہانی کا انجام اُسے چونکا دیتا ہے۔ کہانی میں بکھرے ہوئے تمثیلچے پھر ایک بار قاری کے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں اور انجام کے تاثر کو گہرا کرتے ہیں۔ کہانی پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کہانی کا ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ اس انجام کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس کے باوجود قاری کا ذہن کہانی کے انجام سے مکمل طور پر آخر میں ہی آشنا ہوتا ہے۔

منشایاد کے افسانوں میں زیادہ تر پاکستان اور پاکستانی معاشرے کی صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ موضوعات اردگرد کی روزمرہ زندگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لوگوں کے مختلف مسائل، ان کی سوچوں کے مختلف زاویوں، ان کے احساسات و جذبات کی مختلف پرتوں اور ان کے شعور اور لاشعور کی مختلف کروٹوں سے ان کہانیوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔ افسانہ نگار کے خواب اور اس کے آدرش وہی ہیں جو ایک عام حساس اور باشعور پاکستانی کے ہوسکتے ہیں۔

منشایاد کے افسانوں میں بڑا تنوع ہے۔ اس کے موضوعات کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ شاید ہی اردو کے کسی اور افسانہ نگار نے زندگی کے اتنے مختلف اور متنوع پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہو۔ اسے کسی ایک طبقے کا افسانہ نگار نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں اس نے اپنی کہانیاں پنجاب کے دیہات سے اخذ کیں مگر اب کہ اس کے افسانوں کے نو مجموعے ہمارے سامنے ہیں، ہم اسے احمد ندیم قاسمی اور غلام الثقلین نقوی کی طرح دیہاتی زندگی کا ترجمان کہہ کر اس کی افسانہ نگاری کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ جس قدر پنجاب کے دیہات کی زندگی، اس کے افسانوں میں اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے، شہری زندگی کی تصویریں بھی اسی بہتات اور کثرت سے موجود ہیں اور اب تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ معاشرے کے ہر طبقے کے کردار اس کی کہانیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

منشایاد کے افسانوں میں آپ کی ملاقات ایک پورے عہد سے ہوتی ہے۔ وہ عہد جس میں وہ خود زندہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنے کرافٹ میں منشایاد باقی سب افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ وہ کہانی سناتا نہیں بلکہ بناتا ہے۔ اسی لیے تو وہ اپنے بارے میں کہتا ہے: ''میں سچی کہانیاں نہیں لکھنا چاہتا۔ میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں۔'' مگر اس کے افسانے سے جو کہانی ابھرتی ہے وہ حقیقی زندگی کے اتنی قریب ہوتی ہے کہ کہیں یہ گمان نہیں گزرتا کہ وہ اپنے پاس سے کوئی کہانی بنا رہا ہے۔ چاہے سو فیصدی کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہوا ہو مگر ایسا واقعہ رونما ہونے کا ہر امکان موجود ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہو بہو ایسا ہی واقعہ ہوا ہوگا۔ اس کے افسانے کی ساری فضا یہی تاثر دیتی ہے۔ ''تماشا'' کے آخر میں جب پتہ چلتا ہے کہ بچے کا گلا واقعی کٹ چکا ہے تو قاری دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسے یہ خیال نہیں آتا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہی فکشن کا فن ہے اور یہی منشایاد کا کمال ہے۔ وہ الفاظ کے فنکارانہ استعمال سے اپنے افسانے میں ایسی فضا کی تخلیق کرتا ہے اور اس فضا کے بیک ڈراپ میں ہمیں ایسی تصویریں دکھاتا ہے جو حقیقی نہیں ہوتیں مگر حقیقی تصویروں سے کہیں زیادہ حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں۔ وہ حقیقت جو روزمرہ زندگی کے لبادے میں پوشیدہ ہوتی ہے اور زندگی کے سفر کے گردوغبار میں اٹی ہوتی ہے۔ منشایاد کسی ایک موضوع یا اسلوب کا اسیر نہیں ہوا۔ اسی لیے اس کے ہاں موضوعات کا بے پناہ تنوع ہے۔ مظفر علی سید نے کیا سچ کہا ہے کہ ''حیرت ہے کہ ایک ہی دور میں کوئی افسانہ نگار اس قدر متنوع قسم کی کہانیاں لکھے یا لکھ سکے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ منشایاد کہانی سے روٹھ جانے والے قارئین کو ہی نہیں، کہانی سے دور چلے جانے والے اپنے ہم عصروں کو بھی کہانی کی طرف واپس لایا ورنہ کچھ لوگوں نے تو علامتی افسانے کو ملامتی کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ منشایاد نے اردو افسانے میں صرف کہانی کو ہی از سر نو زندہ نہیں کیا بلکہ علامتی اور استعاراتی اظہار کو بھی ابلاغ اور وقار عطا کیا ہے۔ بوکا، تماشا، کنواں چل رہا ہے، خواب راستہ، ننگا پیڑ، تیرھواں کھمبا، راتب، راستے بند ہیں، شب چراغ، وقت سمندر، پنج کلیان، شجر بے سایہ، کٹم کاٹا، بحران، سارنگی، ڈنگر بولی اور بہت سے دوسرے افسانے اس کی عمدہ مثالیں ہیں اس کے ہاں کہانی کے خمیر میں علامت اور استعارے کا امتزاج اس طرح رچا بسا ہوتا ہے کہ یہ تینوں عناصر کہانی، علامت اور استعارہ یک جان ہو جاتے ہیں جس طرح شعور اور لاشعور ایک ہو جائیں۔

..........☆..........

گوری سوئے سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس

پیر اکرم

آسکر وائلڈ کہتا ہے "حضرت عیسیٰ کا سوزِ دروں اپنانا آرٹ کی بنیاد ہے یعنی جس کے دل میں غم ہے، سوز ہے، وہی آرٹ کی تخلیق کر سکتا ہے اور یہ غمِ عشق کا سوز ہے۔" یہ خود بخود آنسو شمع کے سے سوز کے آنسو ہیں یعنی جن کی بابت خلیل جبران کہتا ہے: "آنسو سمجھ اور فہم کی بہتی زبان ہیں۔"

اس عشق اور غمِ عشق کے لیے حضرت بُو علیؒ فرماتے ہیں:

گر عشق نہ بُودے بہ خدا کس نہ رسیدے
حُسنِ ازلی پردہ ز رُخ نہ کشیدے

ابوالوقت:

مشہور جرمن فلسفی ہیگل لکھتا ہے:

"ایک زمانے کی روح ہوتی ہے اور ایک عوام کی روح۔ ان دونوں کے درمیان فاصلے کی بنا پر ایک ہیجانی شدت طاری رہتی ہے۔ زمانے کی روح ایسے افراد کی تلاش میں ہوتی ہے جو ذہین، دیدہ ور، فطین، صاحبِ حکمت ہوں۔ اس لیے ایسے لوگوں پر یہ زمان کی روح اترتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں۔"

اسلامی نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو تنزل الملائکۃ والروح فیھا من کل امر السلام کی تصویر سی کھنچ جاتی ہے، لہٰذا ایک فطین شخص کا ورود سوائے مشیت الٰہی اور رحمت ایزدی کے کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو زمانہ سے ہم ساز، دم ساز بنا کر ابوالوقت کی حیثیت عطا کر دی جاتی ہے۔ اب اسے انادھر کی تجلی ہی کہہ لیں کہ تاریخ کو رخ دینا گویا اس کی فطرت میں ودیعت ہوتا ہے۔ اس نظافت کے تحت وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک جو کچھ کرتا ہے وہ جیسے دانستہ یا نادانستہ خود بخود ہوتا جاتا ہے۔ ایک وجدانی سی حالت اس کے ہر فعلِ حیات پر طاری رہتی ہے اور زمانے کے تقاضے پورے کرنا اس کے ذریعے مقدر ہو جاتا ہے۔

امیر خسروؒ کو ایک Genius کی حیثیت حاصل ہے۔ لفظ Genius کے مفہوم کا صحیح ترجمہ مشکل ہے۔ نزدیک ترین لفظ حکیم ہے اور حکمت کا معیار بھی وہ ہے جو قرآنی زبان میں ہے۔ جس کے لیے ارشادِ ربانی ہے کہ جس کو حکمت عطا ہوئی اسے خیر کثیر عطا ہوئی۔ البتہ Genius کا ایک ترجمہ فطین بھی کیا گیا ہے جو شاید Verisatile یا Talented کے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

وسط ایشیائی ترک قبائل میں ایک قبیلہ لاچین تھا۔ لاچین ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی باز یا شاہین کے علاوہ غلام

کے بھی ہیں۔ یہ قبیلہ سمرقند کے قریبی شہر کش میں آباد تھا۔ کش ماوراالنہر[1] کا قدیم اور مشہور شہر تھا۔ (موجودہ شہر سبز) جو تاجکستان اور ازبکستان کی سرحدوں کے قریب واقع ہے۔

امیر سیف الدین محمود بلخ کے امرا میں سے تھے اور لاچین قبیلہ کے سردار تھے۔ جب چنگیز خان کا فتنہ اٹھا تو لاچین قبیلہ اپنے سردار کی سربراہی میں ہجرت کر کے ہندوستان منتقل ہو گیا۔ امیر سیف الدین محمود کی شادی ایک سیاہ فام ہندوستانی امیر کبیر مخلص عماد الدین راوت عرض کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی۔

امیر خسرو ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کی آگرہ کمشنری کے گاؤں پٹیالی میں یکم محرم ۶۵۱ھ بمطابق ۳ امارچ ۱۲۵۳ء کو دولت ناز کے بطن سے پیدا ہوئے۔ چنانچہ امیر خسرو کے والد ترک تھے اور والدہ ہندوستانی تھیں۔

امیر خسرو کا اصل نام ابوالحسن یمین الدین محمود تھا۔ چنانچہ اپنے تخلص اور موروثی خطاب امیر کے جوڑ سے امیر خسرو مشہور ہوئے۔ آپ کا ابتدائی تخلص سلطانی تھا مگر بعد میں آپ نے اسے خسرو سے بدل دیا تھا۔ وہ امیر خسرو دہلوی کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔

امیر خسرو نے اپنی پرآشوب، ہنگامہ خیز اور مصروف زندگی میں شمس الدین التمش کے تسلط سے محمد تغلق کی تخت نشینی تک ۷۲ برس گزارے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کی حکومت دیکھی تھی۔ ان میں سے سات بادشاہوں کی ملازمت کی تھی۔

خسرو کی ذہانت، شاعری، موسیقی، تصوف، زہد، دربار، خانقاہ کے پیچھے اس فطری سوز اور تجلی حق کو پانے کی کوشش کارفرما ہے جس نے انہیں ایک Genius، ایک فطین کی حیثیت بخشی ہے۔ یوں تو ایک حکیم، دانشور کی حکمت و فہم زندگی کے کسی ایک ہی پہلو پر چھائی ہوتی ہے اور اسے دانشور، حکیم، فطین کہا جاتا ہے جیسے دانتے، گوئٹے، ہیگل، شیکسپیئر، کالی داس وغیرہ مگر خسرو کی فطانت تو زندگی کے ہر شعبہ پر کلی طور سے چھائی ہوئی تھی۔

ان کی عقیدتی شاعری نے ان کے بعد آنے والے ہندوستان کے بعض روحانی رہنماؤں کو شاعرانہ وجدان اور تخلیقی تحریک مہیا کی جیسے بابا گورونانک، بھگت کبیر، سنت نام دیو، وارث شاہ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی جنہوں نے ہندوستان کی کئی نسلوں کو روحانی تاثیر سے فیض یاب کیا اور مختلف مذاہب اور عقیدوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ہم آغوش کیا اور انہیں روحانی اتحاد کی ایک لڑی میں پرو دیا۔ اسی لیے ضیاء الدین برنی نے صحیح کہا ہے کہ امیر خسرو کے سے اوصاف و کمالات کا انسان برصغیر کی خاک نہ پیدا کر سکی نہ قیامت تک پیدا کر سکے گی۔

امیر خسرو کو ان ارباب کمال میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کو 'عبقری'[2] کہتے ہیں۔ وہ ایک عظیم قصیدہ گو، ایک عظیم مثنوی نگار، ایک عظیم غزل گو، ایک عظیم نثر نگار، ایک عظیم صوفی اور ایک عظیم ماہر فن موسیقی تھے۔ وہ صوفی کی حیثیت سے فنافی اللہ، ندیم کی حیثیت سے ارسطوئے زمانہ، عالم کی حیثیت سے متبحر علامہ، موسیقی کی حیثیت سے امام المجتہد، مورخ کی حیثیت سے بے نظیر محقق اور شاعر کی حیثیت سے ملک الشعراء تھے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز، عشق و محبت، عجز و نیاز، سادگی، بے تکلفی، شوخی، تصوف، ہم آہنگی، موسیقی، نزاکت اور تناسب جیسے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ (سلیمان اشرف دیباچہ مثنوی ہشت بہشت)

امیر خسرو درباری، فن سپہ گری، شاعری اور موسیقی میں ایک خاص بلند و بالا مقام رکھتے تھے۔ ان مشاغل کے علاوہ وہ عبادت گزاری میں اتنے آگے نکل گئے تھے کہ مسلسل چالیس برس تک صائم الدہر (یعنی روزہ دار) رہے۔ آپ ہر شب کو مکمل

قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ آپ تہجد میں سات پارے پڑھا کرتے تھے۔

امیر خسرو بڑے وضع دار اور شریف النفس انسان تھے۔ خلق خدا سے محبت و شفقت کا سلوک کرتے۔ سخاوت اور خدا ترسی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ آپ کو شاہی دربار سے جو کچھ ملتا تھا، وہ سارے کا سارا غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اپنے یا اپنے افراد خاندان کے لیے نہ رکھتے تھے۔ آپ کے سوانح نگاروں کے مطابق آپ کے عشق الٰہی کا یہ عالم تھا کہ اس کی سوزش سے سینہ پر سے کپڑا ایسا ہو جاتا تھا کہ گویا جل گیا ہو۔ اسی لیے آپ کے شیخ آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ''الٰہی بسوز سینہ این ترک حرا بہ بخش'' یعنی اے اللہ اس ترک کے سینے میں جو آگ روشن ہے، اس کی بدولت مجھے بخش دے۔ وہ سوزِ دروں جس کے لیے حضور نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ کاش خسرو کا سوز مجھے مل جائے تو اپنی چاروں ولایتیں انہیں بخش دوں۔ آپ کے شیخ خانہ کعبہ اور دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جب حاضری دینے گئے تو آپ کو ہمراہ لے گئے۔ حب رسول اللہؐ سے اتنے سرشار تھے کہ بقول عبدالرحمٰن جامی، خسرو کو پانچ مرتبہ خواب میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زیارت کروائی تھی۔

حضرت نظام الدینؒ کو امیر خسرو کتنے محبوب تھے اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا ''اگر شریعت میں اجازت ہوتی تو میں یہ وصیت کرتا کہ امیر خسرو کو میری ہی قبر میں دفن کیا جائے۔'' بالآخر یہ وصیت فرمائی کہ خسرو کی قبر میرے پہلو میں ہونی چاہیے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اپنے مرید خسرو کی صفات ظاہری و باطنی پر اتنا ناز تھا کہ آپ نے فرمایا:

''اگر حشر کے روز مجھ سے پوچھا جائے گا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو میں خسرو کو پیش کر دوں گا۔''

مگر خسرو کے لیے سب کچھ نظام الدینؒ تھے اور خسروؒ کی زندگی کی تفسیر خود ان کی زبان میں

آمد بگوشم، از جاں پیامے
با جانِ جاناں، سازم کلامے
صد جان تازہ، بازم بہ کویش
منزل بہ منزل، گامے بہ گامے
دلبر چو دلبر، سرتاج خوباں
خسرو چہ خسرو، ادنیٰ غلامے

حضرت امیر خسروؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈال کر جو نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ فطین شخص جس کی زمانہ کو تلاش تھی، حضرت امیر خسروؒ ہی کی ذات تھی۔

امیر خسرو کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ تاہم تاریخ فرشتہ کے مطابق امیر خسرو ۲۹ ذی قعدہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو انتقال کر گئے اور انہیں اپنے شیخ کے بائیں چبوترے پر ان کی پائنتی میں دفن کیا گیا۔ امیر خسروؒ نے اپنی زندگی میں یہ شعر کہا تھا:

گوری سوئے سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے، سانج بھئی چو دیس

امیر خسرو کی وفات سے ان کا یہ شعر اپنے مفہوم اور پیش گوئی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور حقیقت کے روپ میں ڈھل گیا۔

خراج تحسین:

علم و ادب، تصوف، فن موسیقی اور زبان دانی کے نامور اہل قلم زعما نے امیر خسروؒ کو نہایت شاندار الفاظ میں خراج تحسین

پیش کیا ہے۔ اختصار کے مدنظر صرف چیدہ چیدہ بزرگوں کے تاثرات مختصر اور محدود الفاظ میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

شیخ سعدی امیر خسرو کے کلام سے اس قدر متاثر تھے کہ شیخ کے دل پر خسرو کے کلام کا بہت اچھا اثر ہوا تھا۔

ہندوستان کے سخنوروں میں امیر خسرو کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا (غالب، عود ہندی)

انہیں مکرینوں کا موجد کہنا چاہیے۔ (مولانا محمد حسین آزاد: آب حیات)

ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا۔ (علامہ شبلی نعمانی۔ شعر العجم)

سعدی، رومی، خسرو، حافظ، احمد جام اور جامی کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ (خواجہ الطاف حسین حالی)

اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں کہ اردو کا پہلا شاعر، اردو کی پہلی تصنیف امیر خسرو کی عالی دماغی کا مولد ہے۔ (لالہ سری رام، خمخانہ جاوید)

جو شاعر مثنوی، قصیدہ اور غزل ہر سہ اصناف میں ید طولیٰ رکھتا ہو وہی خسرو کی تقلید کر سکتا ہے۔ (مولانا محمد اسماعیل میرٹھی)

امیر خسرو تاریخی میدان میں ایک صاحب طرز مورخ، فقہ کے عالیشان دربار میں ایک دانش مند فقیہ، تصوف کے رنگ میں ثانی شبلی و بایزید اور فن موسیقی میں کامل الفن اور شہرۂ آفاق تھے غزل میں شعرائے متقدمین اور شعرائے عہد میں سب سے آگے تھے۔ انہیں غزل کے ہر شعبے میں یکساں کمال حاصل تھا۔ مثنوی میں وہ مولانا نظامی، قصیدے میں خاقانی کے دوش بدوش تھے۔ (محمد سعید ماہروی: حیات خسرو)

ہندی زبان میں مرثیہ گوئی امیر خسرو کی جدت ہے اور انہوں نے فارسی، ہندی بھاشا کو اس طرح ملایا ہے کہ نئی چاشنی پیدا ہوگی ہے۔ (مولوی محمد امین عباسی چڑیا کوٹی۔ مقدمہ چیستان جواہر خسروی)

موجودہ فنِ موسیقی جس حالت میں ہے، اس کی نشو ونما کا آغاز امیر خسرو کے زمانے سے ہوا۔ جن کے ایجاد کیے ہوئے راگ آج تک مروج ہیں۔ ترانہ بھی اُن ہی سے شروع ہوا۔ ستار انہوں نے ایجاد کی اور قوالی کی موجودہ شان توانہی کی قائم کی ہوئی ہے۔ (مولانا عبدالحلیم شرر)

ایک فارسی شاعر کی حیثیت سے امیر خسرو کسی تعریف وتوصیف کے محتاج نہیں۔ ان کا لقب اسی شاعری کی مناسبت سے ''طوطی ہند'' ہے۔ (رام بابو سکسینہ۔ تاریخ اردو ادب)

حضرت وارث شاہ نے اپنے عشقیے ''ہیر رانجھا'' میں رائج الوقت مکتبوں کی کتب نصاب کی فہرست میں امیر خسرو کی تصنیف ''خالق باری'' کو بھی شامل کیا ہے۔

امیر خسرو نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے پیدا کی۔ (مولانا سید سلیمان ندوی)

امیر خسرو جیسا صاحب ذوق ذی کمال و جامع صفات شخص اب تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ فارسی کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی فصاحت، روانی اور خاص کر سوز و گداز جس یں تصوف کی چاشنی بھی شامل ہے، اپنا جواب نہیں رکھتی۔ (مولوی عبدالحق: تقریظ حیات امیر خسرو)

تصانیف:

۱۔ تحفۃ الاصغر	(پہلا دیوان۔۱۲۷۱ء)
۲۔ وسط الحیات	(دوسرا دیوان۔۱۲۷۹ء)
۳۔ غرۃ الکمال	(تیسرا دیوان۔۱۲۹۴ء)
۴۔ قران السعدین	(پہلی مثنوی۔۱۲۸۸ء)
۵۔ مفتاح الفتوح	(دوسری مثنوی۔۱۲۹۰ء)
۶۔ عشقیہ دول رانی وخضر خان	(تیسری مثنوی۔۱۳۱۵ء)
۷۔ سپہر	(چوتھی مثنوی۔۱۳۱۹ء)
۸۔ خمسہ نظامی	(پانچ رومانوی داستانوں کا مجموعہ ۱۲۹۸ء) (لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہشت بہشت، مطلع الانوار، آئینہ سکندری)
۹۔ خزائن الفتوح	(نثر۔۱۳۱۰ء)
۱۰۔ تغلق نامہ	(نثر، غیاث الدین تغلق کے بارے میں ۱۳۲۱ء)
۱۱۔ جواہر خسروی	(ہندی دیوان)

زبان دانی:

امیر خسرو کو اپنے سلسلہ نسب پر بڑا زعم تھا اور وہ ''ترک ہندوستانی'' کہلانے پر بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ روایات کے مطابق انہیں ترکی، عربی، فارسی زبانوں اور شمالی ہندوستان کی بولیوں کھڑی بولی، اردو، ہندی، برج بھاشا، پنجابی اور اودھی پر عبور حاصل تھا۔ دہلی، پنجاب اور اودھ میں قیام کے دوران انہوں نے شمالی ہند کی یہ زبانیں سیکھیں۔ انہوں نے سنسکرت بھی سیکھی جسے وہ عربی کے علاوہ باقی سب زبانوں پر مقدم سمجھتے تھے اور اسے اپنی مذہبی زبان قرار دیتے تھے۔

فی البدیہہ/ حاضر جوابی:

امیر خسرو فی البدیہہ شعر کہنے اور حاضر جوابی کا وافر ملکہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا گزر ایک گاؤں کے پنگھٹ پر ہوا۔ وہاں پنہاریاں اپنے مٹکوں، گھڑوں میں پانی بھرنے کو آئی ہوئی تھیں۔ خسرو نے ان سے پانی پلانے کو کہا تو ایک پنہارن (جو شاید امیر خسرو کو جانتی، پہچانتی تھی) نے فرمائش کی کہ کوئی ایسا شعر سناؤ جس میں کتا، چرخہ، کھیر اور ڈھول کے الفاظ آئیں۔ امیر خسرو نے فوراً کہا:

کھیر پکائی جتن سے، چرخہ دیا جلا
آیا کتا، کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

لا، پانی پلا۔

خسرو اپنے پہلے دیوان ''تحفۃ الاصغر'' میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے مدرسہ کے استاد سعد الدین محمد صاحب کے ساتھ کوتوال شہر خواجہ امیل کے ہاں گئے تو وہاں خواجہ عزیز الدین بھی موجود تھے۔ ان کے استاد نے خواجہ عزیز الدین سے کہا کہ میرا یہ ننھا شاگرد آسمان شعر سے تارے توڑ لاتا ہے۔ ذرا اس کا امتحان لیا جائے۔ خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ لفظوں مو، بیضہ، تیر اور خربوزہ کے نام ملا کر شعر کہنے کو کہا تو امیر خسرو نے عرض کیا:

ہر موئے کہ در در زلف صنم ست
صد بیضہ عنبریں برآں موئے صنم ست
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا
چوں خربزہ دندانش میاں شکم ست

فارسی کلام:

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم
بہ ہر سو رقصِ بسمل بود، شب جائے کہ من بودم
پری پیکر نگارے، سرو قدے، لالہ رخسارے
سراپا آفتِ دل بود، شب جائے کہ من بودم
رقیباں گوش بر آواز او در نازمن ترساں
سخن گفتن چہ مشکل بود، شب جائے کہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود، اندر لامکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم

ابرمی بارد و من می شوم از یار جدا
چو کنم دل بچنیں روز ز دلدار جدا
ابر و باران و من و یار ستادہ بوداع
من جدا گریہ کناں، ابر جدا، یار جدا
سبزہ نوخیز و ہوا خرم و بستاں سرسبز
بلبل روئے سیہ ماند و زگلزار جدا
اے مرا درد تو برنیدز زلفت بندے
چہ کنی بند ز بندم ہمہ یکبار جدا
دیدم ام بہر تو خونبار شد اے مردم چشم
مردمی کن مشواز دیدۂ خونبار جدا
نعمت دیدہ ز خواہم کہ بماندیں ازیں
ماندہ چوں دیدہ ازاں نعمت دیدار جدا
دیدہ صد رخنہ شدا ز تیزر تو خاکی زرمست
زود برگیرد چکاں رخنہ پے نار جدا
می دہم جان مرو ازمن دگرت یاور نیست
پیش ازاں خواہی تو بستاں و نگہدار جدا
حُسن تو دیر نہ ماند چو ز خسرو رفتی
گل بسے دیرنما ند چو شد از خار جدا

ہندی فارسی کلام:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دو راہ نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نہ لیو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف زمان وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین

کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہرآں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
پست من کی ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

ہندی اور فارسی:

سوداگر راچہ می باید۔ بوچے کو کیا چاہیے
تشنہ راچہ می باید۔ ملاپ کو کیا چاہیے
شکار بہ چہ می باید۔ قوت مغز کو کیا چاہیے

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہم ساتھ عجب روٹھا ہے
رُوئے تو رونق شکن آفتاب
سرو بہ پیش قد تو بوٹھا ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
وہ چاہ کند بھاگ میرا پھوٹا ہے

زرگر پسرے چو ماہ پارہ
کچھ گھڑے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بہ شکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

ہندی کلام:

چھاپ تِلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائے کے
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائے کے
پریم بھٹی کا مدھوا پلائے کے
متوالی کر لینی رے موسے نیناں ملائے کے
گوری گوری بیّاں، ہری ہری چوڑیاں
بیّاں پکڑ دھر لینی رے، موسے نیناں ملائے کے
بل بل جاؤں میں تورے رنگریجوا
اپنی سی کر لینی رے موسے نیناں ملائے کے

خسرو نجام کے بَل بَل جایئے
موہے سہاگن کینی رے موسے نیناں ملائے کے

اماں میری بابا کو بھیجوری، کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری، کہ ساون آیا
اماں میرے بھائی کو بھیجوری، کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری، کہ ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری، کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکاری، کہ ساون آیا

میں تو پیا سے نیناں لڑا آئی رے
گھر ناری، کنواری کہے سو کرے
میں تو پیا سے نیناں لڑا آئی اے
سوہنی صورتیا، موہنی مورتیا
میں تو ہردے کے پیچھے سما آئی اے
خسرو انجام کے بل بل جایئے
میں تو انمول چیلی کہا آئی رے
گھر ناری، کنواری کہے سو کرے
میں تو پیا سے نیناں لڑا آئی اے

توری صورت کے بلہاری نجام
توری صورت کے بلہاری
سب سکھیوں میں چنری میری میلی
دیکھ ہنسیں نرناری، نجام
اب کے بہار چنری میری رنگ دے
پیا رکھ لے لاج ہماری، نجام
صدقہ بابا گنج شکر کا
رکھ لے لاج ہماری، نجام
قطب فرید مل آئے باراتی

خسرو راج دُلاری، نجام
کوؤ ساس، کوؤ نند سے جھگڑے
ہم کو آس تمہاری، نجام
توری صورت کے بلہاری، نجام

آج بسنت منا لے، سہاگن، آج بسنت منا لے
انجن منجن کر پیا موری
لیئے نیہر لگایئے
تو کیا سووے نیند کی ماسی
سو جاگے تیرے بھاگ، سہاگن
آج بسنت منا لے
اونچی نار کے اونچے چتون
ایسو دیو ہے بنائے
شاہ امیر تورے دیکھن کو
نینوں سے نیناں ملائے
سہاگن آج بسنت منا لے

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔ کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی؟
پانیاں بھرن کو میں جو گئی تھی۔ جھپٹ موری مٹکی پٹکی
خسرو نجام کے بل بل جایئے۔ لاج رکھو مورے گھونگھٹ پٹ کی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے
ٹو تو صاحب میرا محبوبِ الٰہی
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے
ہمری چنریا، پیا کی پگڑیا
وہ تو دونوں بسنتی رنگ دے
ٹو تو صاحب میرا محبوب الٰہی
جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی

مورا جوبن گروی رکھ لے
تُو تو صاحب میرا محبوب الٰہی
آن پڑی دربار تمہارے
مورج لاج سرم سب رکھ لے
تُو تو صاحب میرا محبوب الٰہی
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے

گیت:

کاہے کو بیاہی بدیس رے ....لکھی بابل مورے
بھائیوں کو دینو محل دو محلے۔ ہم کو دیا پردیس رے ....لکھی بابل مورے
ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں۔ گھر گھر مانگی جائیں رے ....لکھی بابل مورے
ہم تیرے انگنا کی بھولی رے چڑیاں۔ چگیں چگیں اڑ جائیں رے ....لکھی بابل مورے
ہم تیرے کھونٹے کی بھولی رے گیاں ہانکیں جدھر ہک جائیں رے ....لکھی بابل مورے
طاق بھری میں نے گڑیاں جو چھوڑیں چھوٹا سہیلی کا ساتھ رے ....لکھی بابل مورے
سونا بھی دینو روپا بھی دینو، رتن جڑاؤ رے ....لکھی بابل مورے
ایک نہ دی مورے مرکوری کنگھی ساس نند تو نے مار رے ....لکھی بابل مورے
ننگے ننگے پاؤں میرا بابل دوڑا سمدھی ڈولا تھام رے ....لکھی بابل مورے
ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا آیا پرایا دیس رے ....لکھی بابل مورے
امیر خسرو یوں کہیں تیرا دھن دھن بھاگ سہاگ رے ....لکھی بابل مورے

حوالہ جات:

(۱) (ماوراالنہر یعنی دریا کے پار کا ملک۔ چونکہ ملک توران اور ایران کے درمیان دریائے جیحون واقع ہے اس لیے عربی دان ایرانی اس کو ماوراالنہر کہتے ہیں)

(۲) ہر عمدہ اور نفیس چیز کو عبقر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ایک مقام کا نام جہاں نہایت عمدہ اور نفیس کپڑے اور بچھونے تیار ہوتے ہیں۔ عرب میں ایک مقام جسے جنوں کی بستی کہا جاتا ہے۔

اس مضمون کی تالیف میں تمام اقتباسات مندرجہ ذیل تصنیفات میں دیئے گئے مواد اور کوائف سے لیے گئے ہیں۔ ترتیب راقم الحروف کی ہے۔

(۱) شاہد ڈاکٹر، امیر خسرو، شخصیت، افکار و خیالات، فکر و فن، شاہد پبلشرز ۶۴۔ چوبرجی سنٹر، ملتان روڈ لاہور
(۲) شہاب سرمدی، امیر خسرو، اشاعتی ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہندوستان
(۳) محمد عبیداللہ خان درانی، ذہین وفطین امیر خسرو، جاوید اکیڈمی، ملتان
(۴) روزنامہ ''دی نیوز'' انٹرنیشنل بروز اتوار بمطابق ۲ جنوری ۲۰۱۱ء
(۵) انٹرنیٹ۔



ندیم کا شعری خصوص۔(۲) (ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں)

جلیل عالی

احمد ندیم قاسمی ایسے شعرا کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جن کی تخلیقات کے پیچھے ایک مرکزی تخلیقی واردات کارفرما ہوتی ہے اور زندگی، معاشرے اور کائنات کے بارے میں جن کے جملہ رویّے اور افکار اسی کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں۔ ندیم کو خود بھی اس کا احساس ہے۔

اپنے باطن کا ترجمان ہوں میں
میرا ہر شعر واردات مری

اردو میں اس نوع کی سب سے بڑی مثال اقبال کی عظیم شعری واردات ہے جو حیات و کائنات کی اک ایسی جامع، مربوط اور ہم آہنگ تعبیر سامنے لاتی ہے کہ جس سے انسان حیاتی و کائناتی پیراڈاکسوں کے درمیان ایک فعال و متحرک وجود میں ڈھل جاتا ہے۔ شاید نفسِ مطمئنہ ایک صحت منداور تعمیری اضطراب کی حامل ایسی ہی ذہنی و روحانی آسودگی کا نام ہے۔ اقبال روایت کے تسلسل میں ندیم کے کلام میں بھی کثرت سے ایسے اشارے مل جاتے ہیں جو اس کی اپنی سطح پر ایک مربوط فکری و احساساتی نظام کا پتہ دیتے ہیں۔ اقبال سے جذبہ و احساس اور فکر و نظر کا یہ تعلق خاص اقبال پر لکھی ہوئی اس کی نظم ''بخدمتِ اقبال'' میں بھی پوری طرح جھلکتا ہے۔

چمک اٹھتی ہے بلندی پہ تری پیشانی
جب کبھی پھیلنے لگتا ہے نشیبوں میں دھواں
جس قدر امتِ مسلم پہ کرم ہیں تیرے
اتنے ہی ملتِ آدم پہ ہیں تیرے احساں
عہدِ فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی
تیرے شعروں سے چنیں جائیں گے اس کے عنواں
رومی و سعدی و غالب میں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں
مجھ کو دعویٰ ہے کہ اس دور کا شاعر ہوں میں
شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرماں
''ہر کش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست
اے زخود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں''

کلامِ ندیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی طرح وہ بھی ایک ایسے کلّی تصورِ صداقت سے وابستہ ہیں جو روح و مادہ کی ثنویت کی بجائے وحدت کا شعور ابھارتا ہے۔

دنیا اور خدا کا رشتہ جانے کون
جس کا تماشا ہے وہ آپ تماشائی

شاعری کا سنجیدہ قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ندیم کی خدا پرستی، اس کی نعت گوئی، اس کی انسان دوستی، اس کی ترقی پسندی، اس کی انقلابیت، اس کی ناقابل شکست رجائیت اور اس کی مستحکم پاکستانیت اسی جامع نظریہ حیات و کائنات سے ہم رشتہ ہے جس کی تعبیر نو اقبال کے فکر و احساس کی صورت میں ہوئی ہے۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ یہ ہمارا تہذیبی المیہ ہے کہ اقبال نے جس مذہب کو مُلاؤں سے چھین لیا تھا، ہمارے آزاد خیال اور ترقی پسند دانشوروں نے اسے پھر سے ان کی جاگیر بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں اقبال کی اس روایت کا تسلسل سوائے ندیم کے کسی اور کے ہاں کم کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ ندیم نے تو سجاد ظہیر کی طرف سے مذہب سے پیچھا چھڑانے کے مطالبے پر یہ کہہ کر اپنی مذہب دوستی کا برملا اظہار کر دیا تھا کہ میرا مذہب مجھے محنت کشوں اور زیردستوں کی حمایت سے نہیں روکتا۔ اس حوالے سے اپنے شروع کے شعری مجموعے ''جلال و جمال'' کے دیباچے میں درج ندیم کا یہ بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

> ''انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انہیں خدا سے کیوں بیر ہے۔ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو یہ ایک ایسے کیمیائی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے۔ مذہب ہمیں بداخلاقی، ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا...... مادہ کی قوت مسلم لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ جو ایک غیر محسوس کارفرما ہے اس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالم گیر حسن کا احساس ہے۔''

صوفیا حقیقتِ اولیٰ کو حسنِ مطلق سے تعبیر کرتے ہیں اور تمام مظاہر کائنات میں اسی کی جلوہ گری دیکھتے ہیں جیسے میر درد کہتا ہے:

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

بے شک فکری سطح پر اس میں وحدت الوجودیت کا پرتو بھی موجود ہے مگر اس تجربے کی نفسیاتی و احساساتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کے ہاں بھی اس کی دونوں جہتیں نمایاں ہوئی ہیں۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

ندیم کی ایک رباعی دیکھیے:

عکس اس کا بہر رنگ نظر آتا ہے — ہر شے پہ طلسم بن کے منڈلاتا ہے
اے نرم ہواؤ، کلیو، غنچو — یہ کون جھلک دکھا کے چھپ جاتا ہے

کلاسیکی تنقید میں حسن و جمال سے تعلق، لگاؤ، وابستگی اور محبت کے حوالے سے عشق مجازی اور عشق حقیقی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں اور وہی شاعری بڑی شاعری قرار پاتی ہے جو عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف صعودی اور ارتقائی سفر کا سراغ دیتی ہے جس میں حسنِ مجازی بھی حسنِ حقیقی و مطلق کی جھلک دکھاتا ہے۔ ندیم کے ہاں کثرت سے ایسے

اشعار موجود ہیں جو اپنی معنویت میں وسیع سے وسیع تر اور ارفع سے ارفع تر ہوتے ہوئے احساسِ جمال کے نفسیاتی و روحانی تجربے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھلیں — تو سامنے تھا اور تصور خدا کا تھا
وہ مرا کفر بھی ہے وہ مرا ایمان بھی ہے — اس نے لُوٹا ہے مجھے اس نے بسایا ہے مجھے

ہماری روحانی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں بستا ہے۔ ندیم کے ہاں اس تجربے کا والہانہ اظہار دیکھیے:

خورشید بدست جستجو کی — لیکن تو کہیں نظر نہ آیا
ہم دل کا دیا جلا کے لائے — جب جا کے ترا سراغ پایا
شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے — اترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

اللہ تعالیٰ کی ذات بے حدود و بے قیود ہے۔ ہر دن اس کی نئی شان سے طلوع ہوتا ہے۔ حالی نے اس ذاتِ لامحدود سے اپنے تعلق کو یوں بیان کیا ہے۔

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

ندیم کے ہاں اس بصیرت افروز احساس و تجربے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

ذاتِ باری سے زندہ تعلق کی استواری کی ایک صورت شکر گزاری بھی ہوتی ہے۔

اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں
غم دیئے ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی

قرآن میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ روزِ محشر اللہ تعالیٰ خود کو ظاہر کرے گا اور خلق براہِ راست اس کے جلوے سے فیض یاب ہوگی۔ اس پہلو سے ندیم کے فکر و احساس کے رنگ دیکھیے:

اس توقع پہ میں اب حشر کے دن گنتا ہوں — حشر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو تُو ہوگا
اگر ہے موت میں کچھ لطف تو بس اتنا ہے — کہ اس کے بعد خدا کا سراغ پائیں گے ہم

خودی کے پیامبر اقبال نے خدائے واحد کے حضور خود کو جھکا دینے کی نفسیاتی و روحانی برکتوں کی طرف اپنے ایک مشہور شعر میں یوں اشارہ کیا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ندیم بھی اسی تصورِ توحید سے قوت لیتا ہے اور صاحبانِ اقتدار کے جبروت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنی خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتا ہے۔

ہم نے سجدہ کیا صرف ایک خدا کے در پر
ہم سرافراز گزرتے رہے درباروں سے

تصوف میں ''باخدا دیوانہ باشو با محمد ہوشیار'' کا قرینہ بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اس کے مطابق خالق و مالک کے ساتھ صوفی و شاعر بعض اوقات شکوہ و شوخی کر جاتے ہیں مگر رسول پاکؐ کے حضور ایسی جسارت کا سوچ بھی نہیں کر سکتے۔ خدا سے شوخی کے معاملے میں اقبال جیسی مذہبی گہرائی رکھنے والا شاعر بھی کبھی کبھی عالمِ دیوانگی و وارفتگی میں ''بات کہنے کی نہیں تُو بھی تو ہرجائی ہے'' سے بھی بڑھ کر یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ندیم کے کلام میں بھی اس کے اپنے نفسی و جذباتی دائرے میں خدا سے شکوہ و شکایت اور شوخیوں کی صورتیں موجود ہیں۔

تیری رحمت تو مسلّم ہے مگر یہ تو بتا ۔۔۔ کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی
پھٹے پھٹے سے ہیں کیوں ہونٹ میرے کھیتوں کے ۔۔۔ اگر خدا کے تصرف میں سب خدائی ہے
اُس کا ہونا مرے ہونے سے ہے ۔۔۔ میں نہ ہوتا تو خدا کیا کرتا

مگر ندیم جب سنجیدگی سے انسان کے فکر و عمل پر نگاہ ڈالتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ انسان اپنی گمراہی اور سرکشی سے نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مشکلات پیدا کرتا اور اپنے بلند مرتبہ و مقام سے گر کر حقیقی کامیابیوں سے محروم رہتا ہے۔

رخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے تیرے

اقبال کی طرح ندیم بھی مجہول مذہبیت پر کڑی تنقید کرتا ہے۔

ندیم اس عہد کا یہ المیہ ہے
موحد نے خدا کو بُت بنایا

حالی نے کٹڑپن کے نمائندہ مولویوں پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اپنی تقریروں میں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کی جباری و قہاری پر زور دیتے اور عذابِ دوزخ کا نقشہ کھینچتے رہتے ہیں اس کے رحمٰن و رحیم ہونے کا تذکرہ کم کرتے ہیں۔ یوں ان کی اپنی شخصیت عفو درگزر اور شفقت و محبت سے عاری ہو کر خوف و غضب کا پیکر بن جاتی ہے۔

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ندیم اس بات کا تمنائی ہے کہ ذاتِ باری کی رحمتوں، شفقتوں اور محبتوں کا ذکر زیادہ سے زیادہ کیا جائے تا کہ اس سے اس کے ساتھ شکر گزاری اور قربت کا تعلق پیدا ہو۔

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الٰہی کا ثبوت
پھول بھی دشت میں تھے حشر بھی جذبات میں تھے

اس لیے وہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور یہ امید رکھتا ہے کہ

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل
میں کہ ہوں ایک مدح خوانِ جمال

رب کریم نے انسان کو بہترین فطرت پر پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ ''تخلقو باخلاق اللہ'' کے حوالے سے اقبال کے کلام میں انسان کے خلیفۃ اللہ یا نائب الٰہی ہونے کے منصب و مقام کی طرف جگہ جگہ اشارے ملتے ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز

ندیم کے اپنے لب و لہجے میں اس تصور کا اظہار یوں ہوا ہے:

یہ راز مجھ پہ کھلا اس کی حسن کاری سے
کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتو

یوں خود شناسی صحیح معنوں میں خدا شناسی کا زینہ بن جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔'' ندیم نے اس حوالے سے ایک اور نفسیاتی و شعری پہلو نکالا ہے۔

اپنا ادراک ہے دراصل خدا کا ادراک
شاید اس خوف نے خود مجھ سے چھپایا ہے مجھے

حیات و کائنات میں انسان کے اعلیٰ مرتبہ و مقام کے ناطے ندیم کے ایک شعر میں تفاخر اور سرخوشی کا ایسا ظہور ہوا ہے کہ یہ زبان زدِ عام ہو گیا ہے۔

خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
کہ کائنات کا دولہا ہوں میں ندیم ہوں میں

قرآنی تعلیمات کی رو سے کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور تحصیل علم کی خاطر زمین پر چلنے پھرنے اور مشاہدہ کرنے کو ہمارے فرائض میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اقبال نے انسان کے آفاق گیر اور کائنات شکار جوہر کی نشاندہی کرتے ہوئے کیسے کیسے غیر معمولی اشعار کہے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے — کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ندیم نے بھی خلائی تسخیر کے حوالے سے انسانی کامیابیوں پر فخر و انبساط کے تاثرات کو اپنے اسلوبِ خاص میں یوں شعر کیا ہے۔

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو — یہ تو پرواز کی ابتداء ہے
آسماں میری منزل نہیں ہے — آسماں تو خلا ہی خلا ہے
اپنی گم گشتہ جنت کو پا لوں — صرف اتنا مرا مدعا ہے
ہوشیار اے فرشتو کہ پھر سے — ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

(مراجعت)

دنیا کی ہر ادبی روایت میں ایک مثالی انسان کا تصور موجود ہے جس کے پیچھے کسی نہ کسی مقدس ہستی کا پرتو جھلکتا ہے۔ مسلم دنیا کی تمام زبانوں کے ادب کے مرکزی مثالی انسان کے پیکر میں جنابِ رسالت مآبؐ ہی کی سیرت کے عکس جلوہ گر ہیں۔ مسلمان شعرا نے جہاں کہیں زندگی کے مختلف احوال کے تناظر میں اخلاق و فضیلت کے حامل انسانی رویوں اور عظمت کردار کی عکاسی کی ہے وہاں بالواسطہ آپ ہی کی صفاتِ مبارکہ کی جھلکیاں نمایاں ہوئی ہیں۔ مثلاً اقبال کے ایسے کئی اشعار یاد آنے لگتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اسی طرح ندیم جب یہ کہتا ہے کہ:

انسان کو انسان سمجھنا بھی تو سیکھو
اچھا ہے سو اچھا ہے برا ہے سو برا ہے

تو دھیان خود بخود اس حدیث پاک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے مطابق رسول اللہؐ نے ظالم سے بھی محبت کا درس دیا ہے۔ جب آپ سے استفسار کیا گیا کہ ظالم سے محبت کے کیا معنی ہیں تو آپؐ نے فرمایا، اس کو اس کے ظلم سے بچانا۔ ندیم کی غزلوں اور نظموں میں ایسے بہت سے مضامین موجود ہیں جن میں حضور پاک کی سیرت اور تعلیمات کے عکس اُجاگر ہوئے ہیں۔

جب اپنا عشق پہنچا انتہا تک — تو ہر انسان کو سینے سے لگایا
میرے فن کا کام حیات افروزی ہے — صحراؤں کی وسعت میں لالے کی طرح

مگر حضور اکرمؐ سے ندیم کی محبت و عقیدت کا یہ عالم ہے کہ اس نے باقاعدہ نعتیں بھی لکھیں اور ایسے ایسے اشعار کہے جو اردو کی نعتیہ شاعری میں وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اے مرے شاہِ شرق و غرب نانِ جویں غذا تری — اے مرے بوریا نشیں سارا جہاں گدا ترا
ہر آدمی کو تشخص ملا ترے دم سے — جو بے شمار تھے ان کو شمار تُو نے کیا
ظلمتِ دہر میں میں جب بھی پکاروں اس کو — وہ مرے قلب میں قندیل جلا دیتا ہے

وہ اپنے فنِ شعر میں بھی آپؐ کے طرزِ کلام سے فیض یابی کو اپنا اعزاز قرار دیتا ہے

میرا معیارِ غزل خوانی ہے
حرفِ سادہ میں بلاغت انؐ کی

وہ رزم گاہِ حیات میں آپ ہی کے کرم سے سر اٹھا کر جینے کی جوت جگاتا اور جابر و ظالم حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ پاتا ہے۔

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم — مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا
دربارِ شہ میں بھی میں اگر سرکشیدہ ہوں — اس کا ہے یہ سبب مرا پندار آپؐ ہیں

ہماری تہذیبی تاریخ گواہ ہے کہ ہم پر جب بھی کبھی مشکل وقت پڑا تا یا کوئی بحرانی صورت حال سامنے آتی ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے اور حضور پاک کی ذاتِ گرامی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ ندیم کے ہاں بھی ایسے بہت سے اشعار ملتے

ہیں جن میں عصری بحرانوں میں آپ کو یاد کیا گیا ہے۔

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ　　راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا
وہی سرسبز کرے گا مرے ویرانوں کو　　آندھیوں کو بھی جو کردارِ صبا دیتا ہے
غم تو اس دور کی تقدیر میں لکھے ہیں مگر　　مجھ کو ہر غم سے نمٹ لینے کا یارا دے دے

زندگی اور کائنات میں خیر و شر کے درمیان ایک ازلی پیکار جاری ہے۔ حضور اکرمؐ نے قرآنی ہدایت اور اپنی سیرتِ پاک کے ذریعے ہمیں جس نظریۂ حیات و کائنات سے روشناس کرایا ہے اس کے مطابق اس رزم گاہِ حیات میں سوائے ان کے جو کتاب و سنت کی روشنی میں خیرِ کثیر کا راستہ اپناتے ہیں۔ ''بے شک انسان خسارے میں ہے۔'' چنانچہ اللہ کا عطا کردہ جذبۂ خیر نہ صرف ہمارے اندر جاری نیکی و بدی کی کشمکش میں ہمیں اپنی کمزوریوں پر غلبہ پانا سکھاتا ہے بلکہ سیاسی و معاشرتی ظلم و جبر میں سچ کی گواہی دینے اور شر کے خلاف مزاحمت پر ابھارتا ہے۔ اس سے ہماری تخلیقی و فنی دنیا میں ''شاعری جز و یست از پیغمبری'' کے نصب العین کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اقبال کے اخلاقی و روحانی نظریۂ فن کے پیچھے یہی تصورِ خیر کارفرما ہے جو شعرِ رنگیں نوا کو دیدۂ بینائے قوم بناتا اور شرق و غرب سے بیزار ہوئے بغیر ہر شب کو سحر کرنے کا عزم و ارادہ بیدار کرتا ہے۔ مجید امجد بھی کہتا ہے کہ ''میں کائنات میں جاری عملِ خیر کے تسلسل میں شاعری کرتا ہوں۔'' ندیم کا فکر و فن بھی اسی عظیم روایت سے رشتہ جوڑتا ہے۔

یوں تو ہے شعر کا جمال لفظ کا لے سے اتصال　　میں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیغمبری کے بھی
یہ جو ندیم مرے شعروں میں سازِ محبت بجتا ہے　　گونج کچھ ایسی ہی تو سنی تھی روزِ ازل کی اذانوں میں
اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دور سویرا　　تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ
جی چاہتا ہے فلک پہ جاؤں　　سورج کو غروب سے بچاؤں

مجھے نہ مارو
میں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیامبر ہوں
مجھے بچاؤ کہ میں زمیں ہوں
کروڑوں کڑوں کی کائناتِ بسیط میں صرف میں ہی ہوں جو خدا کا گھر ہوں

(بیسویں صدی کا انسان)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نزدیک اعلیٰ ترین ادب اعلیٰ ترین فضیلتوں کا پاس دار ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ ادبِ عالیہ کے لیے درج ذیل تین عناصر لازمی قرار دیے ہیں۔

(۱)　معانی یا خیال میں جمالیاتی تاثیر موجود ہو۔

(۲)　بیان یا اظہار میں جمالیاتی تاثیر موجود ہو۔

(۳)　یہ جمالیاتی تاثیر کسی دوسری فضیلتِ عالیہ سے متصادم نہ ہو۔

ان کے مطابق اسلامی فکر و تہذیبی روایت میں عدم کو ''اُم الفضائل'' ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ ندیم بھی ایسے ادب و فن کو رد کرتا ہے جو خیر کے فروغ سے بے رشتہ ہو کر حق و انصاف کی گواہی سے گریز کرے اور برائی کی مختلف معاشرتی و تہذیبی اور سیاسی و معاشی صورتوں کے خلاف مزاحمت سے کترائے۔ وہ ایسے فنکاروں کو انسانیت کے دشمن قرار دیتا ہے اور ان کے بیمار

خیالات کو "منفیت کے منشور" کا عنوان دیتا ہے۔

ـ چلو کچھ اور سوچیں/ لفظ سے مفہوم کی دولت اُچک لیں/ اور اسے پتھر بنا ڈالیں/ زبانیں نوکِ نشتر کی طرح سینوں میں گاڑیں/نغمگی کو چیخ میں بدلیں/ سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں/ وادیوں میں دلدلیں بھر دیں/ چلو کچھ اور سوچیں/ اب یہی سوچیں/ کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے/ وہ سب کفر ہے/ اور حق فقط یہ ہے/ کہ جو کچھ ہے/ نہیں ہے/ واہمہ ہے/ خواب ہے/ اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں۔

اس کے برعکس ندیم کا منشور جرأت و بے باکی کے ساتھ سچ کی گواہی دینا ہے۔ وہ جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو سب سے بڑا جہاد سمجھتا ہے۔ اس کے کلام میں اس جہاد کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ٹوٹا تو کتنے آئینہ خانوں پہ زد پڑی   اٹکا ہوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا
یہ کیا کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں   اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ ذکرِ شب نہ کریں

ـ مرے آقا کو گلہ ہے کہ میری حق گوئی/ راز کیوں کھولتی ہے/ میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا/ رات دن رولتی ہے/ یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا/ اپنے پَر تولتی ہے/ اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر/ بوند بھی بولتی ہے۔

(پابندی)

ندیم جب اپنے زمانے میں عالمی سطح پر حق وانصاف کی قدروں کو پامال ہوتے، بڑے بڑے دانشوروں کے افکار و نظریات کو استحصال کا آلۂ کار بنتے اور قلم کاروں کو مصلحتوں اور مفاہمتوں کا بیوپار کرتے دیکھتا ہے تو اس کا دل شدتِ کرب سے بلبلا اٹھتا ہے۔ ہمارے شاعر مغلیہ سلطنت کے زوال، انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور معاشرے کے ادبار و انتشار کے حوالے سے شہر آشوب لکھتے رہے ہیں۔ ندیم نے اپنی شاہکار نظم "پتھر" کی صورت میں انسانیت کے عالمگیر اخلاقی و تہذیبی زوال پر عہد آشوب قلم بند کر دیا ہے۔

ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لا دوں
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا

....

جتنے معیار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام ترا ذہنِ رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے میرے زباں پتھر ہے
ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فنکار

ہماری فکری تہذیبی روایت میں انسان دوستی ایک بنیادی قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو دنیا بھر کی فکری و تہذیبی

روایات میں انسان دوستی کے حوالے سے بہت سے مشترکات موجود ہیں اور یہ تمام انسانوں کے باطن میں وہبی طور پر ودیعت کیے گئے عالمگیر اشتراک خیر کا پتہ دیتے ہیں۔ تاہم انسان دوستی کے جذبے کے متحرک و منظم ہونے کے لیے کسی نہ کسی مربوط نظامِ فکر و احساس کی اساس ناگزیر ہے۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مجرد انسان دوستی کوئی شے نہیں ہوتی۔ حقیقی انسان دوستی خلاء میں بروئے کار نہیں آتی بلکہ کسی نہ کسی مربوط نظامِ فکر و احساس پر استوار ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر نظریہ حیات اور فکری و تہذیبی روایت میں انسان دوستی کی جہت لازمی طور پر موجود ہوتی ہے اور ہر فرد یا گروہ کی انسان دوستی کی نوعیت، گہرائی اور گیرائی کا تعین اس کے نظریۂ حیات ہی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ندیم کے ہاں انسان دوستی کے جن خیالات، جذبات و احساسات اور رویوں کا اظہار ہوا ہے، ان سے اس کے سرچشمۂ فیض کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے خدا جانے ‏ ‏ ‏ محبت کا کوئی دھبہ نہیں ہے جن کے دامن پر
میں کسی شخص سے بے زار نہیں ہو سکتا ‏ ‏ ‏ ایک ذرہ بھی تو بیکار نہیں ہو سکتا

ندیم کا ایک اور شعر دیکھیے جس میں اس کی آفاقی انسان دوستی اپنی فکری تہذیبی روایت کی واضح شناخت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔

انساں کا محبت بھرا دل تھا مرا مسکن
مشرق تھا نہ مغرب تھا عرب تھا نہ عجم تھا

کیا اس شعر کے پس پردہ حضور اکرمؐ کا یہ فرمان اپنی واضح جھلک نہیں دکھاتا کہ ''تمام انسان برابر ہیں۔ کسی گورے کو کالے پر یا کسی کالے کو گورے پر، کسی عربی کو عجمی پر یا کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔'' ایسی انسان دوستی کی اگلی منزل سچی عوام دوستی ہے جو لوگ ارد گرد کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے کسی ماورائی قسم کی انسان دوستی کی باتیں کرتے ہیں۔ ندیم ان کے اس رویئے کو رد کرتا ہے اور عوام سے سچی اور عملی وابستگی کو ضروری قرار دیتا ہے۔

؎ آسمانوں کی طرف مت دیکھو
تم زمیں پر ہو تو اس تک حدِ امکانِ رسائی پھیلاؤ
اس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں، دماغوں میں، دلوں اور
ضمیروں میں کئی رنگ کے افلاک لیے پھرتی ہے
انھی افلاک کو چھونے کا کوئی چارہ کرو
اپنی بھرپور توانائی کو
آسمانوں کے سرابوں میں نہ آوارہ کرو ‏ ‏ ‏ (افلاکِ زمینی)

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

وہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ جب کبھی کوئی عوام کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھاتا ہے تو معاشرے کی مفاد پرست استحصالی قوتیں اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کر کے اسے بے اثر بنانے کی مذموم کوشش کرتی ہیں۔

؎ وہ اٹھے قافلہ در قافلہ پورب سے پچھم سے

وہ لپکے کارواں در کارواں اقصائے عالم سے
ملوں سے مرغزاروں سے بنوں سے کوہساروں سے
دکانوں سے گھروں سے علم ودانش کے اداروں سے
مرا فن ان کی عظمت کا جب استقبال کرتا ہے
تو استحصال مجھ پر کفر کا الزام دھرتا ہے

(ادب وسیاست)

محنت کش عوام سے اس کی سچی کومٹ منٹ اس کے سارے کلام میں ایک فعال اور متحرک رو کے طور پر جگہ جگہ اپنا احساس دلاتی ہے۔

میں تمہارا ہوں
تم میں سے ہوں
آج سے زندگی کا پجاری ہوں
محنت کشوں کی جبینوں کی تابندگی کا پجاری ہوں
میں زندگی کے لیے اپنے فن کا فسوں نذر لایا ہوں
تابندگی کے لیے اپنا خوں نذر لایا ہوں
رخشندگی کے لیے اپنا سوزِ دروں نذر لایا ہوں (میں تمہارا ہوں)

وہ عوام کی اجتماعی قوت وتوانائی کو انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد گردانتا ہے اور محض ادبی وفنی حوالے سے اپنی برتری کے زعم میں مبتلا اصحابِ فن پر زندگی کو اپنی محنت اور عمل سے آگے بڑھانے اور سنوارنے والے صاحبانِ عمل کو فوقیت دیتا ہے۔

ندیم جن کے ارادوں میں ڈھل رہی ہے حیات
ہم ایسے فن کے اماموں سے وہ عوام بھلے

ندیم کی عوام دوستی اپنی فکری وتہذیبی روایت کی اعلیٰ ترین فضیلت یعنی ''عدل ومساوات'' کو عملی اور حقیقی طور پر جیتی جاگتی زندگی میں کارفرما دیکھنا چاہتی ہے۔

کوئی سورج سے پوچھ عدل کیا ہے حق رسی کیا ہے
کہ یکساں دھوپ بٹتی ہے صغیروں میں کبیروں میں

معاشرے میں عدل ومساوات کی قدروں کی پامالی دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ جرأت وبے باکی سے جبرو استحصال کی ذمہ دار بالادست قوتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

مال چوری کا جو تقسیم کیا چوروں نے
نصف تو بٹ گیا بستی کے نگہبانوں میں

اس اندازِ اظہار پر استحصالی قوتوں کی برہمی لازمی ہے اور وہ ایسی آواز کو دبانے کے لیے ہر طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں سے کام لیتی ہیں۔

ندیم ہم کو تو اس جرم کی ملی ہے سزا — کہ عدل مانگنے کو ہاتھ کیوں اٹھا بیٹھے
حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم — زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے

مگر ندیم کی حق پرستی کسی طرح جبر واکراہ کو خاطر میں نہیں لاتی اور اظہار و بیان پر پابندیوں کے زمانوں میں بھی وہ سچ کہنے کا کارِ خیر انجام دینا ضروری جانتا ہے۔

اک بشارت ہے ایک نیکی ہے
جس میں موجۂ ہوا ہونا

ندیم کی شعری واردات کی ایک نہایت اہم جہت اس کی سچی اور مستحکم پاکستانیت ہے۔ وطنِ عزیز سے اس کی گہری اور عاشقانہ محبت کا اظہار اس کے کلام میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ پاکستان اس کے لیے محض زمین کے ایک ٹکڑے کا نام نہیں۔ یہ اس کے آدرش اور خوابوں کی علامت ہے۔ وہ اپنے فکری و تہذیبی تشخص کی سلامتی کے ساتھ نہ صرف قومی سطح پر اسے حسن و خیر کے سپنوں کی تعبیر بنانا چاہتا ہے بلکہ عالمی تاریخی عمل میں بھی اپنے عظیم نصب العین کے حوالے سے اس کے بامعنی اور نتیجہ خیز کردار کے درخشاں امکانات کا ولولہ انگیز یقین رکھتا ہے۔ پاکستان کے یوم آزادی کے حوالے سے اس کے ذوق و شوق اور جذبہ و جوش کی ایک جھلک ملاحظہ کریں۔

مجھ کو اس دیس کی ایک ایک گلی پیاری ہے — مجھ پہ اس دیس کا احسان بہت بھاری ہے
میں تجلی کا پیامی ہوں جلاؤ شمعیں — آج ہر طاق پہ ہر گھر میں جلاؤ شمعیں

(جشنِ چراغاں)

دیکھیے ایک دعائیہ نظم میں گہرے جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ ساتھ پاکستانی تشخص کے خصوصی خدوخال کس خوبصورتی سے اجاگر ہوئے ہیں اور اس کے بین الاقوامی کردار کو کیسے نمایاں کیا گیا ہے۔

یارب مرے وطن کو اک ایسی بہار دے — جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے
ہر فرد میری قوم کا اک ایسا فرد ہو — اپنی خوشی وطن کی خوشی پر جو وار دے
یہ خطۂ زمین معنون ہے تیرے نام — دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

(دعا)

ندیم نے تحریکِ پاکستان میں عملی طور پر جس جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور اقبال اور قائداعظم کی مسلم لیگ کے لیے دن رات جس تندہی سے کام کیا وہ ایک الگ تفصیلی جائزے کا موضوع ہے۔ قائداعظم نے کہا تھا، پاکستان اسی روز بن گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ ڈاکٹر کنیز یوسف کے منہ سے اسلام آباد تھنکرز فورم کے ایک اجلاس میں پاکستان کی تاریخی و تہذیبی اہمیت کے حوالے سے دریا کو کوزے میں بند کرتا ہوا ایک ایسا ہی پُر مغز اور بلیغ جملہ ادا ہوا۔ انہوں نے کہا ''تشکیلِ پاکستان، چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں کی دوسری بڑی کامیابی ہے۔'' بے شک تخلیقِ پاکستان تاریخی و تہذیبی معنویت کے اعتبار سے ایک بے مثال جوہری پیش رفت ہے لیکن حصولِ پاکستان کے عظیم مرحلے کے سر ہو جانے اور قائداعظم کے آنکھیں بند کر لینے کے بعد جس طرح اصل مقاصد سے روگردانی کی گئی اور ملک میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، اس دکھ کو ہر دردمند شاعر نے شدت سے محسوس کیا اور اس صورتحال کے حوالے سے صرف فیض نے ہی یہ کہہ کر اپنی تشویش اور اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

بہت سے دوسرے معتبر شاعر بھی اس صورتحال سے اپنے عدم اطمینان کو سامنے لائے۔ اور تو اور ہمارے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری نے اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا۔

اب تو کچھ اور بھی اندھیرا ہے   یہ مری رات کا سویرا ہے
قافلہ کس کی پیروی میں چلے   کون سب سے بڑا لٹیرا ہے

ان حالات میں ندیم کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اپنے اسلوب خاص میں صورتحال پر یوں تبصرہ کیا۔

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے   ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر   آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

مگر جس طرح فیض نے دل شکستہ ہونے کی بجائے وطن عزیز میں امن و محبت اور عدل و مساوات کے حصول کی جدوجہد جاری رکھنے کا پیغام دیا۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اسی طرح رجائیت کے پیکر ندیم نے بھی وطن عزیز میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کو اپنی قلبی گہرائیوں سے محسوس کر کے اپنے پرخلوص اور دردمندانہ سروکار کا ثبوت دیا ہے کیونکہ اس کے نزدیک ملکی حالات نادرست ہونے کے باوجود

بے زار ہے جو جذبۂ حب الوطنی سے
وہ شخص کسی سے بھی محبت نہیں کرتا

ستمبر ۱۹۶۵ء میں برپا ہونے والی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں پاکستانی شاعروں نے بہت کچھ لکھا۔ اس دوران تخلیق ہونے والے رزمیہ نغموں، غزلوں اور نظموں میں پاکستان کا قومی تشخص اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا اور اس ہنگامی نوعیت کی شاعری میں بھی اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل بہت سی ایسی تخلیقات سامنے آئیں جو ہمارے شعری ادبی سرمائے کا مستقل حصہ بن گئیں۔ اس وقت ندیم نے شاعری کے ساتھ ساتھ اپنے کالموں اور دیگر نثری تحریروں میں بھی اپنے جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار کر کے دفاع وطن میں فعال کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ اس نے ریڈیو پاکستان کے ذریعے بھارتی شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے خطاب کیا اور کشمیر پر بھارت کے ناجائز قبضے کے حوالے سے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ ان دنوں ندیم نے پرخلوص حب الوطنی اور جذبہ و جوش میں ڈوبی ہوئی جو شاعری اس میں اس کی نظم ''چھ ستمبر'' تو زباں زد عام ہو کر ہمیشہ کے لیے لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہو گئی۔

چاند اُس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود
ایسے خوں رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش

ایسے بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش

اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اتر آئی تھی
اپنی سنگینیوں میں اس رات کی سفاک سپاہ
دودھ پیتے ہوئے بچوں کو پرو لائی تھی

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں اُجالا ہوں سحر ہوں میں حقیقت ہوں میں
میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں افلاک کی دہشت ہوں میں

پھر ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے المیے کے حوالے سے اس نے جہاں اپنے نثری اظہاریوں میں امریکہ کے ساتھ ساتھ روس کے پاکستان دشمن کردار کی بھی مذمت کی وہاں اس دلدوز سانحے پر وطن کے حضور اپنے اشعار میں خون کے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔

میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن میں روتا ہوں
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزت، باعصمت ماں
تیرے دامانِ دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت وغم میں دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن میں روتا ہوں

(میں روتا ہوں)

اور خدا کے حضور گڑگڑاتے ہوئے اپنے جذبہ واحساس میں تمام ہم وطنوں کو یوں شامل کیا۔

شاید اس نظارے سے ربِ دوجہاں چونکے
آؤ اپنے ملبے پر بیٹھ کر دعا مانگیں

مگر یہ ندیم کی ناقابل شکست رجائیت کا کمال ہے کہ غم واندوہ کے اتنے سیاہ بادلوں میں بھی وہ آفتابِ امید کی جھلک دکھائے بغیر نہیں رہتا اور اہلِ وطن کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے
جہاں سے پھول ٹوٹا تھا وہیں سے کلی سی اک نمایاں ہو رہی ہے

جہاں بجلی گری تھی اب وہی شاخ نئے پتے پہن کر تن گئی ہے
خزاں سے رک سکا کب موسمِ گل
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

(اگر ہے جذبہ تعمیر زندہ)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کیمپوں میں زندگی گزارنے والے بہاری پاکستانیوں پر عالمی ریڈکراس والوں نے یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ اپنے عزیز و اقارب کو پچیس الفاظ سے زیادہ عبارت کے خطوط نہیں لکھ سکتے۔ انسانی دکھ ہڈیوں کے گودوں تک محسوس کرنے اور کروانے والے ندیم نے جس شدتِ احساس سے پچیس پچیس الفاظ کی بہت سی نظمیں لکھ کر ستم زدہ بہاریوں کے درد و کرب میں شرکت کی اس سے اردو شاعری میں ایک نئی صنف متعارف ہوگئی۔ اس سلسلے کی دو نظمیں دیکھیے۔

۔ شہرِ ٹیگور کے ایک بازار میں
تین سو میری عصمت کی بولی پڑی
آخری بولی جس شخص نے دی
وہ ٹیگور کا کتنا ہم شکل تھا

۔ بھیا جب تم مجھ کو لینے آنا
اردو کا اک لفظ نہ کہنا
چپکے رہنا
مجبوراً کچھ کہنا پڑے تو اتنا کہنا
''میں گونگا ہوں'' (۲۵۔الفاظ)

قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ اس کی معنوی گہرائی تک پہنچنا تو کجا دنیا بھر کی قومی آزادیوں کی تحریکوں پر نظمیں لکھ کر اظہارِ یک جہتی کرنے والے ہمارے بیشتر شاعروں نے تحریکِ آزادیِ کشمیر کو لائق اعتنا نہیں جانا اور اس جدوجہد میں لاکھوں جانوں اور ہزاروں عصمتوں کی قربانیوں نے ان کے دلوں میں کوئی درد نہیں جگایا۔ ندیم نے جس جس طرح اس تحریک کو اپنے فن کا موضوع بنایا، اقوامِ متحدہ کے مجرمانہ کردار کو بے نقاب کیا اور پاکستانی موقف کو شعری قالب میں ڈھالا ہے، اس سے بھی اس کی مثالی پاکستانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھیلا ہوا ہاتھ برہمن کا اس چاند کا مستقل گہن ہے
جلتے ہوئے گھر سنے ہوئے کھیت ہر شخص وطن میں بے وطن ہے
سنتے ہیں سمندروں کے اس پار اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق ظالم ہے وہی جو خستہ تن ہے

آج اس کی بلند مسندوں پر ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
سچ کہتی ہیں غریب قومیں یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے
(کشمیر)

پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے تعیش اور مفادات کی خاطر وطن عزیز کو معاشی اعتبار سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ خود انحصاری کی طرف قدم بڑھانے کی بجائے ہمیں دوسروں کا محتاج بن کر جینے پر مجبور کر دیا گیا۔ جو کوئی بھی برسرِ اقتدار آیا اس نے کشکول توڑ دینے کے دعوے تو بہت کیے مگر عملی طور پر ملک کو پہلے سے بھی زیادہ مقروض کر دیا۔ ایسے میں ندیم نے شدتِ کرب سے مجبور ہو کر حکمرانوں کے گھناؤنے کردار کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہِ جامۂ بانات چھپا رکھا تھا
اور جھرے پہ اناتھی
جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی

لاکھ انکار کرو لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے (بھیک)

عالمی سامراجی قوتوں نے نام کی آزادی حاصل کرنے والے ممالک کو جس طرح سیاسی، معاشی اور عسکری لحاظ سے اپنا دست نگر بنا رکھا ہے ندیم کے نزدیک یہ بھی غلامی ہی کی ایک شکل ہے۔ دیکھیے تضحیک و بے چارگی کا یہ دکھ اس کے ایک مشہور شعر میں کس طرح دلدوز چیخ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے بیڑیاں ہیں پاؤں میں

اور عالمی سامراج کے شیطانی مقاصد کی تکمیل میں معاون آمریتوں کی طرف سے اظہار و بیان پر لگائی جانے والی قدغنوں سے قوم کے تہذیبی جسد میں جو زہر پھیلتا ہے، اس کے احساس سے ندیم کی روح تڑپ اٹھتی ہے اور وہ کہتا ہے:

خدا نہ کردہ کسی قوم پر وہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

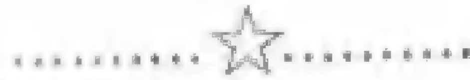
ندیم کی شاعری میں پاکستان کی روح بولتی ہے۔ یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مجید امجد کی نسبتاً پیچیدہ دانشورانہ شاعری کو چھوڑ کر پاکستانی قوم اور معاشرے کی روزمرہ عوامی زندگی سے لے کر اس کے فکری و تہذیبی جوہر تک کی جتنی موجود اور امکانی صورتیں جس تنوع، وسعت، گہرائی اور سہولتِ ابلاغ کے ساتھ ندیم کے ہاں منعکس ہوئی ہیں، کسی دوسرے شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتیں۔

احمد ندیم قاسمی کو قدرت نے لمبی عمر عطا کی۔ کئی ایک شعبوں میں امتیازی صلاحیتوں اور توانائیوں سے نوازا۔ اس کی تخلیقی و تحریری سرگرمیوں کا دورانیہ پون صدی پر محیط ہے۔ اس کی شاعری، اس کے افسانے، اس کے تنقیدی و تجزیاتی مضامین، اس

کے کالم، اس کے اداریے اور اس کا حسنِ ادارت، سب میں فکر و احساس کی وحدت موجود ہے اور یہ وحدت دراصل اس کی مرکزی شعری واردات ہی کی دین ہے۔ شعر و ادب اور اظہار و بیان کے اتنے منطقوں میں ایسے عمدہ معیار کا اتنا بہت سا کام کر جانے والا شخص بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ

ایک دیا ہوں جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے اب میں چلتا ہوں

(ترمیم و اضافے کے ساتھ)



''ندیم نام''

۔ یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے، کہ ندیم میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

والدین نے احمد شاہ نام رکھا۔ ادبی نام احمد ندیم قاسمی طے کیا۔ ہمارے یہاں علامہ اقبال کے بعد ندیم کا نام ایسا ہے جسے اکثر والدین نے اپنے بچوں کے لیے پسند کیا۔ جبکہ بقول جمیل یوسف ''احمد ندیم قاسمی کے نام میں ایک طرح کی موسیقیت ہے۔''

ڈاکٹر مسرور احمد زئی لکھتے ہیں:

''احمد شاہ ایک فرد کا نام ہے۔ اس نے ذکاوت سے، ذہانت سے اور استقامت سے کام لے کر احمد ندیم قاسمی کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ جو کسی فرد کا نہیں بجائے خود ادارے کا، دبستان کا، نظریے کا اور فکری منزل کا نام ہے۔ اَسّی سال میں اس فرد نے ادارہ بنتے بنتے اپنے نقوش ادب و معاشرت سے لے کر صحافت و سماج تک جس طرح مرتسم کیے، وہ ایسے ہیں جن کی قدر کی جائے، جنہیں فروغ دیا جائے اور جن کی پاسداری کی جائے۔''

ڈاکٹر صابر آفاقی کا کہنا ہے:

''بابا ندیم قاسمی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تحریک کا نام ہے۔ اس نے دنیا بھر کے مظلوموں، غلاموں اور پسے ہوئے لوگوں کے حق میں آواز اُٹھائی...... اپنی مٹی سے پیار ندیم کے خمیر میں شامل تھا...... قاسمی محبت کا نام تھا۔''

اور افضل توصیف یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں کہ:

''ایک خوب صورت نام، لاہور کے بڑے ناموں میں ایک نام، اس نام کے ساتھ کتنے اور نام جڑے ہوئے ہیں۔ کتنی ہستیاں اور حیثیتیں لے کر چلتا تھا، یہ نام کہ ایک شاعر تھا، افسانہ نگار، کالم نویس، دانش ور اور ایڈیٹر اس نام کے ساتھ جڑے تھے۔ کئی اور نام اور تاریخ کے کئی اور باب، گئی زمانے اس نام کو لکھ چکے، اپنے اپنے ورقوں پر۔ اُردو ادب، پاکستانی ادب اور بیسویں صدی کا ادب جہاں دیکھو کئی بڑے ناموں کی سنگت میں ایک چمکیلا معتبر نام احمد ندیم قاسمی! کتنا لکھا، کتنے برس لکھا اور کتنے لکھنے والے پیدا کیے۔ ان کی زندگی وقت کے کئی ادوار سے گزری۔ بہت کچھ بنایا، اک پورا جہان آباد کیا۔ اس جہان کی اپنی تہذیب تھی، اپنا قرینہ تھا، اپنی خوشبو تھی، اپنا ہی رنگ و آہنگ''

(ندیم نگار: ڈاکٹر ناہید قاسمی کی کتاب ''احمد ندیم قاسمی: شخصیت و فن'' سے اقتباس)

منٹو فحش نگار یا طنز نگار

ڈاکٹر جمال نقوی

زبان اور اخلاق کے معیارات وقت اور جگہ کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب اور اخلاق کو معیار سمجھا جاتا تھا مگر ان مقامات پر بھی مغلوں سے پہلے اور ان کے بعد ان معیارات میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد تو معیارات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور ان کے جانے کے بعد بھی وہ اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان یہاں جن لوگوں کے سپرد کر گئے انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھا۔ انگریزوں کے سدھارنے کے بعد یہاں کے کالے انگریز اس خطے کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انہوں نے معاشرے کی اقدار میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں اور پھر گاہے بگاہے اپنے آقاؤں کی سلام گزاری کے لیے ان کے دیس جاتے رہے۔ اپنے بعد فرمانبردار غلاموں، غلاموں کی نئی نسل کی تربیت کے لیے وہ اپنے بچوں کو بھی تعلیم کے نام پر اسی طرح مغربی ممالک بھیجنے لگے جیسے ایک زمانے میں لکھنؤ میں تہذیب، اخلاق اور زبان سیکھنے کے لیے بچوں کو بالا خانوں پر بھیجا جاتا تھا۔

انسانی جذبات اور جنسیات تو فطری عمل ہیں مگر ابتداء میں ہمارے خطے کی تہذیب و معاشرت برسرِ عام ان کے اظہار کو برا سمجھتی تھی۔ گھریلو تربیت کی وجہ سے مسلم خواتین صرف پردے کی پابند ہی نہیں تھیں بلکہ نامحرموں کے کان ان کی آواز کو بھی ترستے تھے جس کو زنان خانے سے مردان خانے تک پہنچنے ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ ویسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا اور سسی پنوں کی لازوال محبت کی داستانیں اس وقت بھی دلچسپی سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی معاشرے میں عشق و عاشقی کا درپردہ کھیل بھی جاری تھا جس کا تذکرہ شاعروں اور داستان گوئیوں کی زبانی تہذیب یافتہ سوسائٹی سے لے کر غریب بستیوں تک پہنچ رہا تھا۔

ماہرین نفسیات کے مطابق فطری خواہشات کی تشنگی بڑی خرابیوں اور برائیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے، لہٰذا ہر معاشرے میں اس پیاس کو بجھانے کے لیے ہیرا منڈیاں، چوک اور چکلے شہری آبادی سے دور قائم کیے جاتے تھے جہاں ضرورت مند اور شوقین حضرات راگ و رنگ کی محفلوں سے لطف اندوز ہوتے اور ان کی پیاس کو بجھانے کا انتظام بھی ہوتا تھا۔

مذہبی کتابوں سے بھی جہاں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا علم حاصل ہوتا ہے وہیں جنس جیسے اہم پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے۔ مفسرین نے اس کی وضاحتیں بھی کی ہیں مگر ہماری تہذیب میں ہو تو سب کچھ رہا تھا لیکن اس پر گفتگو کرنے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی عورتوں اور بچوں کے درمیان خصوصاً بھری محفل میں۔ اشاروں اور کنایوں میں اس پر گفتگو کرنا اور اسے ضبطِ تحریر میں لانا نازک مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔

ہاں! بچیوں کی شادی کے موقع پر مولانا اشرف علی تھانوی کی ''بہشتی زیور'' دے کر یہ معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں اور اس ذمہ داری سے سبک دوش ہوا جاتا تھا۔ نوجوانوں میں بہت سی خرابیوں اور بیماریوں کا سبب یہی لاعلمی رہی ہے جس سے بازاری اور عطائی طبیب آج تک فائدہ اٹھارہے ہیں اور جعلی دواؤں کی فروخت سے بہت سی بیماریاں اور نفسیاتی الجھنیں پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

میڈیکل سائنس نے بھی بہت سی جنسی بیماریوں میں اسی لاعلمی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اسی وجہ سے آج کے ترقی یافتہ دور میں ان معلومات کی فراہمی کو تعلیم کا حصہ بنانے کی سفارش کی جارہی ہے۔ متعلقہ چیزوں کے بے باک اشتہارات تو اب میڈیا کے ذریعہ گھروں میں چھوٹے بڑے سب تک پہنچ رہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا اپنے اشتہارات اور ڈراموں کے ذریعے زندگی کے ان حقائق اور رازوں کو سب کے سامنے بھری محفل میں بتا اور دکھا رہا ہے۔ گویا ''بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی'' اور اسے بے ادب بھی نہیں کہا جاتا، نہ کوئی شرماتا اور غصہ کرتا ہے۔ تہذیب اور شرافت کے ٹھیکیدار اس پر احتجاج بھی نہیں کرتے۔

بس! زمان و مکان کا یہی فرق تھا جس میں آزادئ فکر، اخلاقی ہمت اور کردار کی پختگی رکھنے والے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے حقائق پر مبنی کہانیاں لکھیں اور وہ موردِ الزام ٹھہرایا گیا کیونکہ یہ باتیں اس نے اس وقت کیں جب سماج کا شعور ابھی اتنا بلند نہیں ہوا تھا۔ اس کے خلاف سماج کے ٹھیکیداروں اور کم شعوروں نے احتجاج بھی کیا اور مقدمات بھی قائم کیے لیکن وہ ہر مقدمے سے باعزت طور پر بری ہوا۔ چونکہ اس کی نیت صاف تھی، اس نے گناہ کی ترغیب نہیں دی، وہ ان سے کوئی تلذذ پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا جو کہ وہیم دواہنوی وغیرہ کی کہانیوں کا مقصد تھا، جن کو چھپ کر سب ہی پڑھتے اور لذت حاصل کرتے تھے۔ اسی لیے وہ بے خوف حقائق تحریر کرتا رہا، معاشرے پر طنز کرتا رہا اور جبہ و دستار میں چھپے ہوئے درندہ صفت انسانوں کو ننگا کرتا رہا، طوائف بننے پر مجبور کی جانے والی خواتین کی دکھ بھری داستان بیان کرتا رہا، شرافت کے جھوٹے ٹھیکیداروں کی بیہودگیوں اور خرافات کو پیش کرتا رہا، ان کے خلاف لکھتا رہا اور نام نہاد اخلاف کے جاموں کو تار تار کرتا رہا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ لکھا:

> ''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے...... مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں...... میری تحریر میں کوئی نقص نہیں ہے۔ جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے...... میں ہنگامہ پسند نہیں۔ میں لوگوں کے خیالات و جذبات میں ہیجان پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تہذیب و تمدن کی اور سوسائٹی کی چولی کیا اُتاروں گا جو ہے ہی ننگی...... میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ میرا کام نہیں ہے، درزیوں کا ہے...... لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں، لیکن میں تختۂ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا۔ سفید چاک استعمال کرتا ہوں کہ تختۂ سیاہ کی سیاہی اور بھی زیادہ نمایاں ہو جائے...... یہ میرا خاص انداز، میرا خاص طرز ہے جسے فحش نگاری، ترقی پسندی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ کہا جاتا ہے...... رہا ترقی پسندی کا سوال تو منٹو بھی انسان ہے اور ہر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔''

ترقی پسندی کے انگارے نے پگھلا کر منٹو کو ایک آئینہ بنا دیا تھا جس میں سماج کو اپنی اصل صورت نظر آتی ہے۔ جسے دیکھ کر ہمیں شرم آنے کی بجائے غصہ آتا ہے، ہم اپنے آپ کو سدھارنے کی بجائے آئینے پر خفا ہوتے ہیں اور اسے ہر طرح کی

گزند پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ''ہتک'' کی سوگندھی اور ''کالی شلوار'' کی سلطانہ کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے اور ان کی خوبیوں کو بھی سامنے نہیں آنے دیتے۔ کیچڑ میں کھلے ہوئے ان پھولوں کی خوشبو کو تو برباد ہونے سے بچا لینا چاہیے۔ یہی منٹو کا پیغام ہے جس کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ ان تلخ حقائق کو ذہن کی طہارت کے ساتھ سمجھنا اور معاشرے کو ان سے پاک کرنا چاہیے۔

عمل و خیال کی آزادی اور انسانی معاشرے کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی پر سعادت حسن منٹو کی جرأت مندی کا ذکر کرتے ہوئے معروف نقاد ڈاکٹر حنیف فوق نے اپنے ایک مضمون میں یوں تحریر کیا:

> ''منٹو کے بیشتر افسانوں مثلاً کھول دو، ممی اور ٹھنڈا گوشت وغیرہ میں بیمار ذہن اور معاشرے کی تنقید کرتے ہوئے انسانی معاشرے کا احترام جھلکتا ہے اور جہاں ان کے بعض افسانے ایک خاص عمر یا گروہ کو پیش کرتے ہوئے افراد کی نفسیات کو زیادہ پیش نظر رکھتے ہیں مثلاً ''پلاؤ''، ''دھواں'' اور ''کالی شلوار''۔ وہاں بھی اسفل سطح کی گدگداہٹ کے بجائے ان میں فنکارانہ جسارت کا احساس ہوتا ہے۔ ''بابو گوپی ناتھ'' میں انسانی تعلق سے جنس کی بالاتر سطح کا احساس ہوتا ہے تو ''پڑھیے کلمہ''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''سوگینڈل پاور کا بلب'' اور ''سڑک کے کنارے'' انسان کی انسان سے بد تعلقی کی وجہ سے جنسی اور جذباتی تشدد کا حال سناتے ہیں، جب کہ ''بو'' میں فطری خواہش کو تصنع سے مبرا اور فطرت سے قریب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ منٹو کے اس نوع کے افسانے جنس سے تعلق رکھتے ہوئے بھی بدن سے نہیں بلکہ سماجی نظر سے تعلق رکھتے ہیں، اگر چہ کہ ان میں سیاست کا بھی ایک رُخ ہے اور انہیں جمہوری کاوش ترقی کا ایک حصہ بھی کہا جا سکتا ہے۔''

منٹو کے افسانوی کردار سماجی انسان ہیں جو سماجی علائق کو پیش کرتے ہیں، جنس یا سیاست براہ راست موضوع نہیں بنتے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سیاست اور جنس کے افسانہ نگار نہیں بلکہ بنیادی طور پر ایک صاحب طرز عظیم طنز نگار ہے جسے منافقت اور ریا کاری نہیں آتی۔ جرأت و صداقت اس کی پہچان ہے۔ اسی لیے اس کا فن زندہ ہے اور زندہ رہے گا کیونکہ ''فن صداقت کا امیں ہو، تو نہیں مر سکتا۔'' میری بات کی گواہی احمد ندیم قاسمی نے بھی دی ہے جنہوں نے سعادت حسن منٹو پر جنس نگاری فحش نگاری کے لگائے جانے والے الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''جب تک الزام لگانے والوں کو منٹو کے افسانوں میں پھیلی ہوئی بد اخلاقی کی دھند میں اخلاق کا وہ چمکتا ہوا تارا نظر نہیں آئے گا جس کی دریافت نے منٹو کو بڑا، سچا اور نڈر افسانہ نگار بنایا، اس وقت تک منٹو کے فن کے جائزے اور اس کے کرداروں کے تجزیے ادھورے ہی رہیں گے۔''

..........☆..........

امجد اسلام امجد صرف محبت کا شاعر نہیں ہے

بیدار بخت

کوئی پچیس تیس برس پرانی بات ہے۔ میں کسی کو کراچی میں فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گھنٹی بجتی سنائی دیتی تھی مگر کوئی فون نہ اٹھاتا تھا۔ عاجز آ کر میں نے آپریٹر سے رابطہ کیا، اس نے بتایا کہ صاحب اس وقت ٹی وی پر سیریل ''وارث'' دکھایا جا رہا ہے۔ اس وقت کوئی فون نہیں اٹھائے گا۔ ایسا کون سا ٹی وی شو ہو سکتا ہے جو سارے شہر بلکہ پورے ملک کی توجہ کو اس طرح حراست میں لے لے؟ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ''وارث'' امجد اسلام امجد کا لکھا ہوا ہے اور خواص و عوام دونوں میں بے حد مقبول ہے۔ میں موصوف کو شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ ان کی نظمیں جستہ جستہ رسالوں میں دیکھی تھیں۔ ان کے دو دیوان بھی میرے پاس تھے: ''برزخ'' اور ''ساتواں در''۔ یہ دونوں کتابیں میں نے تین ایسے شاعروں کی وجہ سے خریدی تھیں جن کی شاعری بھی مجھے پسند ہے اور ان کی رائے پر بھی بہت اعتماد ہے۔ ''برزخ'' کے گرد پوش پر منیر نیازی نے تعریفی الفاظ لکھے تھے اور ''ساتواں در'' کے فلیپ پر فیض احمد فیض اور ضیا جالندھری کی آرا رقم تھیں۔ کتابیں خریدنے کے باوجود میں نے انہیں صرف سرسری دیکھ کر رکھ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ دونوں مجموعے حمد اور نعت سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ فرض کر کے یہ شاعر ضرور پرانی وضع کے شعر لکھتا ہوگا اور مجھے صرف ان شاعروں کے کلام میں دلچسپی تھی جو نئی شاعری کرتے تھے۔ میں نے کتابوں کو غور سے نہیں پڑھا۔ بعد میں احمد ندیم کے رسالے ''فنون'' میں امجد اسلام امجد کی کئی نظمیں اور غزلیں دھیان سے پڑھ کر میں چونکا کہ یہ شخص تو پرانی ڈھب کا شاعر نہیں ہے۔ پھر ''برزخ'' اور ''ساتواں در'' لفظ لفظ پڑھ کر میں ان کی شاعری کا گرویدہ ہو گیا۔

آگے چلنے سے پہلے اس مضمون کے لکھنے کی وجہ بتا دوں۔ حال ہی میں مَیں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے لیے امجد اسلام امجد کے کلام کا ایک جامع انتخاب ان کے بارہ مجموعوں سے مرتب کیا ہے جس میں اردو کلام کے ساتھ ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہے جو میں نے اپنی دوست مری این ایرکی کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ جو انگریزی میں ہے، میں نے سوچا کہ پہلے اپنے خیالات کو اردو میں ایک مضمون کی صورت میں یکجا کر لوں۔ پھر اس مضمون کو بنیاد بنا کر انگریزی کا پیش لفظ لکھوں گا۔

ذاتی گفتگو اور مراسلوں میں مَیں امجد اسلام امجد کو ''امجد صاحب'' کہہ کر خطاب کرتا ہوں مگر اس مضمون میں انہیں صرف امجد کہوں گا کہ ادبی مضامین میں صاحب کا لاحقہ غیر ضروری ہے۔ ویسے بھی اخلاقی طور پر مجھے اس جرأت کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ میں عمر میں ان سے کچھ سال بڑا ہوں۔

روزی روٹی کمانے کے لیے میں ریسرچ انجینئرنگ میں کام کرتا ہوں۔ اس مضمون میں مقالے بھی لکھتا ہوں۔ اپلائڈ سائنس (Applied Science) میں مقالہ لکھنے میں مجھے سب سے زیادہ دشواری نقطہ ہائے آغاز اور انجام تلاش کرنے میں ہوتی ہے۔ اگر یہ دونوں نقطے سوجھ جائیں تو بیچ کا مواد خود بخود ذہن میں آتا جاتا ہے، اس لیے کہ دونوں نقطوں کے بیچ کا سفر تقریباً ایک رخا ہوتا ہے۔ یہ سہولت اردو کے مضمون میں لکھنے میں نہیں ملتی اور خاص طور سے جب مضمون امجد جیسی متنوع شخصیت اور ان کے کلام کے بارے میں ہو تو مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ (ان کی متنوع شخصیت کا ذکر آگے آئے گا) لکھنے کی کاوش کو آسان کرنے کے لیے پہلے تو میں سلسلہ وار اس سفر کا ذکر کرتا ہوں جو میں نے اس انتخاب کے لیے ان کے شعری مجموعوں کے مطالعے میں کیا۔ واضح رہے کہ میرے انتخاب میں نہ تو امجد کا حمدیہ اور نعتیہ کلام ہے اور نہ ہی ان کے گیت۔

ایک بات اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں امجد سے کئی بار ٹورونٹو اور لاہور میں مل چکا ہوں مگر ہماری ملاقاتیں ہمیشہ رسمی سی رہیں اور ان کی مجموعی معیاد چوبیس گھنٹے سے کم ہی ہوگی۔ شاید ہی کبھی ان سے اکیلے میں ذاتی باتیں ہوئی ہوں۔ ان کے بارے میں میری معلومات کا منبع صرف ان کا کلام ہے اور ان کے اور دوسروں کے چھپے ہوئے حروف۔

امجد کا پہلا مجموعۂ کلام ''برزخ'' کے نام سے پہلی بار ۱۹۷۴ء میں چھپا۔[1] گرد پوش، یعنی فلیپ جواب لغت میں شامل ہو کر اردو کا لفظ بن چکا ہے، پر منیر نیازی اور صلاح الدین محمد کی توصیفانہ تحریریں ہیں۔ منیر نیازی نے لکھا کہ ''امجد کی جدیدیت محض عمر کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک نئے طرز احساس کی وجہ سے ہے۔ جس احساس میں میں بھی شامل ہوں۔'' کتاب کا انتساب فردوس کے نام ہے جو اشاعت کے وقت امجد کی منگیتر تھیں اور کتاب کی اشاعت کے کوئی ایک سال بعد ان کی بیوی بنیں۔ دیباچہ خود امجد نے لکھا جس میں انہوں نے اس کتاب کو اپنے ''عہد جوانی'' کی داستان کہا۔ کتاب ایک نعت، حمد اور سلام سے شروع ہوتی ہے۔ یہ سب بالترتیب ہیں تو اللہ، رسولؐ اور حسینؓ کی مدح میں مگر عزیز وارثی یا اور ان جیسے دوسرے شاعروں کی طرح روایتی نہیں ہیں۔ حمد میں خالق کی مدح تو کرتے ہیں مگر یہ پوچھنے سے بھی نہیں چوکتے:

مجھے بتا ان گرسنہ نسلوں کا جرم کیا ہے
یہ کس سے اپنے گناہ پوچھیں
جو اپنے رستے سے بے خبر ہیں
وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں

لفظ ''برزخ'' کثیر المعنی ہے۔ ترقی اردو بورڈ کی لغت میں اس کے سات معنی لکھے ہیں جن میں سے پہلے معنی یہ ہیں: ''وہ چیز جو دو مخالف چیزوں کے بین بین کی ہو اور جو نہ اس جیسی ہو نہ اُس جیسی بلکہ درمیانی حالت میں ہو۔'' دوسرے معنوں میں ''موت سے قیامت تک کا زمانہ'' اور ''خیالی صورت'' وغیرہ بھی ہیں۔ خدا جانے امجد نے اپنے پہلے مجموعے کا نام کن معنوں میں رکھا تھا۔

احمد ندیم قاسمی نے ''برزخ'' کے بارے میں اچھا لکھا ہے: ''اس نے ایک ابتدائی نظم میں کہا ہے، سوچ کے بخت میں اظہار کا لمحہ کب تھا۔ میں کہتا ہوں کہ گہری سوچ کے بخت میں رسیلے اظہار کا یہ پیمبرانہ لمحہ اس وقت وارد ہوا تھا جب امجد اسلام امجد ''برزخ'' کی نظمیں لکھ رہا تھا۔''[2]

''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' جیسی نظموں نے شاید امجد کو ''محبت کا شاعر'' کہلوایا ہوگا۔ یہ نظم قدرے طویل ہے اور

شروع اس طرح ہوتی ہے کہ نظم کے ہیرو نے بچھڑنے کے دن کی یاد میں رات جاگ کر کاٹی اور ختم ہوتی ہے ان مصرعوں پر:

پانچویں سالگرہ آج جدائی کی مناؤں شب بھر
شام فرقت کی طرح، اشک بہاؤں شب بھر
پھر ایئر پورٹ کی ریلنگ پہ ٹکا کر کہنی
تیری رخصت کا سماں، دھیان میں لاؤں شب بھر
تو جو روتی ہوئی آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے

ضروری نہیں کہ شاعر کا ہر شعر ذاتی تجربوں پر مبنی ہو مگر مجھے کرید ہوئی کہ دیکھوں کہ یہ نظم تجربے پر مبنی ہے کہ مشاہدے پر۔ ''برزخ'' میں امجد نے ہر نظم کے نیچے ایک تاریخ لکھی ہے جو غالباً نظم ختم کرنے کی تاریخ ہے۔ زیر نظر نظم کے نیچے ۱۹ مئی ۱۹۷۲ء کی تاریخ ہے۔ ''برزخ'' کی ایک نظم ''بازگشت'' کے نیچے لکھی تاریخ ۱۹ مئی ۱۹۶۷ء لکھی ہے جو ''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' کی تاریخ کے ٹھیک پانچ سال پہلے کی ہے۔ اس نظم کے شروع کے مصرعے شاید اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دونوں نظمیں ایک ہی تجربے پر مبنی ہیں:

ایسی ہی سرد شام تھی وہ بھی
جب وہ مہندی رچائے ہاتھوں میں
سرخ آنچل میں منہ چھپائے ہوئے
اپنے خط مجھ سے لینے آئی تھی

''ایسی ہی سرد شام تھی وہ بھی'' سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نظم اور شاید بعد کی نظم لاہور کی مئی کی گرمی میں نہ لکھی گئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے دونوں نظمیں شاعر نے اس وقت لکھی ہوں جب تجربہ ایک یاد بن گیا ہو۔ جدائی کا سال ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء ہوگا۔ شاعر شاید اپنی اولیں محبت کا ذکر کھلے لفظوں میں نہ کرنا چاہتا ہو مگر اس نے اپنی کتاب میں اتنے اشارے چھوڑ دیے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو اسے ڈھونڈ بھی سکتے ہیں۔ اس محبت پر امجد کی اور نظمیں بھی ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''برزخ'' کی ۵۷ نظموں میں سے صرف ۲۲ نظمیں ایسی ہیں جنہیں محبت کی نظمیں کہا جا سکے۔ باقی نظموں کا تعلق زندگی کی دوسری جہات سے ہے۔ مثلاً نظم ''سوال'' میں انسانیت کے لیے امجد کا درد جھلکتا ہے۔ نظم شروع اس طرح ہوتی ہے کہ زمین گنگ ہے، وقت سوگ میں ہے، خواب تک بند پلکوں تک نہیں آتے، مگر آسمانوں سے کوئی بشارت بھی نہیں آتی۔ سب اچھی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایسے حالات میں آسمان سے نبی یا تباہی زمین کی طرف بھیجے جاتے ہیں:

مگر ان کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے
نبی اب نہیں آئیں گے

''برزخ'' میں صرف نظمیں ہیں، کوئی غزل نہیں ہے۔ اس سے اگر قاری کو یہ خیال آئے کہ امجد، اختر الایمان اور منیب الرحمن کی طرح غزل سے پرہیز کرتے ہیں تو یہ خیال غلط ہوگا۔ امجد غزلیں خوب کہتے ہیں۔ کسی وجہ سے انہوں نے ''برزخ'' میں وہ غزلیں شامل نہیں کیں جو ''برزخ'' کے کلام کی تصنیف کے دوران لکھی تھیں۔ یہ غزلیں ان کے دوسرے مجموعے میں شامل ہیں۔

امجد کا دوسرا مجموعۂ کلام ''ساتواں در'' کے نام سے پہلی بار ۱۹۷۸ء میں چھپا۔[۳] اس کتاب کے فلیپ پر فیض احمد فیض اور ضیاء جالندھری کے توصیفی کلمات ہیں۔ فیض نے لکھا کہ: ''امجد صاحب نے مطالب و معانی کا ایک متنوع ذخیرہ تالیف کیا ہے لیکن یہ تنوع محض طبع آزمائی یا مضمون آفرینی کی خاطر نہیں ہے، فکر و خیال اور جذبات و تجربات کی مناسبت اور ان کے تقاضوں سے مطابقت کی خاطر سے ہے جو شعری پرکھ کا مسلمہ معیار ہے۔'' ضیا نے کہا: ''امجد کو اظہار پر غیر معمولی قدرت ہے۔'' کتاب کا انتساب احمد ندیم قاسمی کے نام ہے اور دیباچہ خود امجد نے لکھا۔ دیباچے کے آخیر میں لکھا ہے: ''یہ کتاب میری سوچ اور خوابوں کا آئینہ ہے۔'' لفظ ''خواب'' خاص توجہ کا حامل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ امجد کی شاعری کی اساس میں خوابوں کی بہت اہمیت ہے۔ یہ کتاب بھی نعت، حمد اور ایک دعا سے شروع ہوتی ہے جس میں امجد یہ دعا مانگتے ہیں کہ:

میں ایسے لفظ لکھوں گا جو سب کے دل میں ہیں
فقط وہ بات کروں گا جو سب سمجھتے ہیں
اور ایسے رنگ چنوں گا جو میری گل میں ہیں

اوپر لکھے ہوئے دوسرے مصرعے سے یہ بات ظاہر ہے کہ امجد نئی بات اس انداز سے کہنا چاہتے ہیں کہ سب اسے سمجھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری میں بھی خواص و عام میں یکساں مقبول ہیں۔

کئی دیومالائی کہانیوں میں ہیرو کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ اپنے سفر کے دوران وہ چھ در تو کھولے مگر ساتواں در نہ کھولے کہ اس کے پیچھے بڑی مشکلیں ہیں۔ ''ساتواں در'' کو ادبی استعارے کا درجہ میرے خیال میں انتظار حسین نے اسی عنوان کی ایک کہانی میں دیا تھا۔ یہ کہانی ان کی کہانیوں کے مجموعے ''کنکری'' میں شامل ہے جو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں چھپا تھا۔ میرے پاس اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔[۴] ناصر کاظمی نے بھی ''ساتواں در'' اپنے ایک شعر میں برتا ہے:

آج کی رات نہ سونا یارو
آج ہم ساتواں در کھولیں گے

ناصر کاظمی کا یہ شعر ان کے مجموعے ''دیوان'' میں شامل ہیں جس میں ۱۹۵۷ء کے بعد کا کلام ہے۔ میرے پاس اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن ہے[۵] جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مجموعے کے پہلے ایڈیشن کا سال اشاعت کیا تھا مگر یہ بات تو طے ہے کہ اوپر لکھا ہوا شعر انتظار حسین کی کہانی کے بعد لکھا گیا۔ شہریار کے دوسرے مجموعۂ کلام کا عنوان بھی ''ساتواں در'' ہے جو ۱۹۶۹ء میں یعنی امجد کے مجموعے سے نو سال پہلے چھپا تھا مگر میرا خیال ہے کہ دو کتابوں کا ایک عنوان ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انتظار حسین کی کہانی میں ساتواں در کے پیچھے جنس کا پہلا شعور ہے، ہوسکتا ہے کہ امجد کے ساتویں در کے پیچھے ان کے وہ خواب ہوں جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے اور شہریار کے ساتویں در کے پیچھے ان کے سراب ہوں یا راتوں کی تاریکی جو انہیں سخت ناپسند ہے:

ایک ہی دُھن کہ اس رات کو ڈھلتا دیکھوں
اپنی ان آنکھوں سے سورج کو نکلتا دیکھوں

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، امجد کے ''ساتویں در'' میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ فیض کا خیال تھا کہ امجد کا جدت پسند ذہن غزلوں سے زیادہ نظموں کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ غزل میں ایجاد و اختراع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔[۶] امجد نے خوب اور اچھی غزلیں لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ غزل کی صنف پر بھی ان کی دسترس کم نہیں ہے۔

''ساتواں در'' کا زمانہ (۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۸ء) پاکستان میں گزشتہ اور آئندہ کئی زمانوں کی طرح بحران کا زمانہ تھا۔ امجد کو فکر تھی کہ ان کے ملک کے عوام کو ان کے خوابوں کی تعبیر کیوں نہ مل سکی۔ وہ اپنی نظم ''ایک سوال'' میں یہ پوچھتے ہیں کہ:

کب تک اس مٹی کے بیٹے ہوں گے یوں بے حال
کب تک ہم کو بننا ہوگا نیلامی کا مال

پھر وہ اپنی ایک اور نظم ''عکس کا خوف'' میں خود ہی گویا جواب بھی دیتے ہیں۔ یہ نظم شروع اس طرح ہوتی ہے کہ نظم کا واحد متکلم رات کو کتوں کے بھونکنے سے اس لیے ڈرتا ہے کہ خود اس کے اندر کا لالچ، وہم اور خوف کا کتا بھی جاگ اٹھتا ہے مگر:

باہر بھونکنے والے کتے تھک جاتے ہیں
پر یہ اندر بھونکنے والا کتا جاگتا رہتا ہے

کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ سماج کو سدھارنے سے پہلے اپنے آپ کو سدھارنا چاہیے۔

امجد کی محبت صرف صنف مخالف کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے۔ انہیں انسانیت سے بھی محبت ہے جس میں بچوں کی محبت بھی شامل ہے۔ اپنی پہلی بیٹی روشین پر ان کی نظم ''میرے گھر میں روشن رکھنا یہ معصوم ہنسی'' کا عنوان ہی ممتا سے لبریز ہے۔

میری اطلاع کے مطابق ''ساتواں در'' کی اشاعت تک امجد نے کوئی ڈراما نہیں لکھا تھا مگر پوت کے پانو پالنے ہی سے نظر آنے لگے تھے۔ نظم ''زمستاں مرے جسم میں موجزن ہے'' اس کی اچھی مثال ہے۔ اگر آپ کبھی لاہور یا دتی میں جاڑوں میں باہر گھومیں تو آپ کو اس نظم کے یہ مصرعے مجسم ہوتے دکھائی دیئے ہوں گے:

کوئی بات کہہ کے
میں جب اپنی سانسوں کو کہرے میں لپٹی ہوئی
شاہراہوں پہ چلتے ہوئے دیکھتا ہوں

اس طرح کے مصرعے صرف وہ شخص ہی لکھ سکتا ہے جو اپنے مشاہدے کو ایک منظرنامے یعنی سکرین پلے میں منتقل کر سکے۔

امجد کی بے مثال نظم ''محبت کی ایک نظم'' اسی شعری مجموعے میں ہے۔ اس نظم کے آخری حصے سے کچھ مصرعے ذیل میں درج ہیں۔

اگر کبھی میری یاد آئے تو......
تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا
میں گرد ہوتی مسافتوں میں تمہیں ملوں گا
کہیں یہ روشن چراغ دیکھو تو سوچ لینا
کہ ہر پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکا ہوں

یہ نظم جمیل الدین عالی کو بھی بہت پسند ہے۔ انہوں نے اس نظم کے لیے زرین الفاظ میں لکھنے کے قابل جملہ لکھا ہے۔ (۷) ''یا خدا یہ کتنی خوبصورت، کتنی بڑی نظم، کتنی اعلیٰ شاعری ہے۔'' برسبیل تذکرہ عالی جی کے دوہوں اور غزل کے شعروں کے انتخاب اور ترجمے کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ انتخاب دونوں میں میرا تھا اور انگریزی ترجمے میں نے مری این ایرکی کے اشتراک میں کیے تھے۔ (۸،۹)

ن۔م۔راشد کی ایک نظم ''اندھا کباڑی'' ان کے مجموعے ''گمان کا ممکن'' میں شامل ہے جو پہلی بار ۱۹۷۶ء میں چھپا تھا۔ (۱۰) نظم کا واحد متکلم اندھا کباڑی ہے جو شہر کے گوشوں میں بکھرے ہوئے پاشکستہ، سر بریدہ خواب جمع کرتا ہے، انہیں اپنے دل کی بھٹی میں تپا کر چکا تا ہے اور بازار میں بیچنے کے لیے صدا لگاتا ہے: ''خواب لے لو خواب''۔ جب شام تک کوئی خواب نہیں بکتا تو وہ پھر صدا لگاتا ہے: ''مفت لے لو، مفت یہ سونے کے خواب''۔ لوگ مفت خواب اس لیے نہیں لیتے کہ ڈرتے ہیں کہ اس میں کوئی چال نہ ہو۔ تھک تھکا کر اندھا کباڑی گھر آتا ہے اور بڑبڑاتے ہوئے سو جاتا ہے: ''یہ لے لو خواب اور مجھ سے ان کے دام بھی لے لو۔'' ''ساتواں در'' میں امجد کی ایک مختصر نظم ''چن لو اپنے اپنے خواب'' شامل ہے۔ کچھ مصرعوں کو حذف کرنے کے بعد نظم یوں ہے:

چن لو اپنے اپنے خواب
اب ڈھیر لگا ہے خوابوں کا
مہتابوں اور گلابوں کا

یہ شام سمے کا دھندا ہے
اس وقت یہاں پر مندا ہے
ایمان کی قیمت دو آنے

توقیر ملے گی دو آنے

ہر خواب کی قیمت دو آنے
ہر خواب کی قیمت دو آنے
دو آنے بھئی دو آنے
دو آنے بھئی دو آنے

راشد اور امجد کی نظموں میں مماثلت صرف اتنی ہے کہ دونوں میں سستے داموں میں خواب بیچنے کی بات ہے مگر یہ مماثلت یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اپنی نظم کے بارے میں راشد نے خود لکھا ہے: ''اندھا کباڑی ایک ایسا فنکار ہے جو یہ جانتا ہے کہ اس کی تخلیقات Rehashed ہیں لیکن سمجھتا ہے کہ ان کی اب بھی لوگوں کو ضرورت ہے۔ لوگ اس قدر اندھے ہیں کہ اس کے خوابوں کی اہمیت کو نہیں پا سکتے...... یہ المیہ تنہا فنکار کا نہیں بلکہ ہر فلسفی اور ہر پیغمبر کا بھی ہے۔ لوگ ان شخصیتوں کو ہمیشہ اندھا اور دیوانہ سمجھتے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اندھے اور دیوانے ہیں۔'' (۱۱) ظاہر ہے کہ راشد کی نظم ایک ایسے فنکار کے متعلق ہے جس کے فن کو عوام نے نہ پہچانا ہو مگر امجد کی نظم کا پہلو سماجی اور سیاسی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ لو گو تم اپنے وہ خواب بھول گئے ہو جو تم نے اپنے ملک اور سماج کے لیے دیکھے تھے، آؤ میں تمہیں خواب اسی قیمت پر بیچتا ہوں جو تمہارے ایمان اور توقیر کی ہے، یعنی کوڑیوں کے مول بیچتا ہوں۔

''ساتواں در'' کی اشاعت کے کوئی دو سال بعد امجد کا تاریخ ساز ٹی وی سیریل ''وارث'' ۲۳ قسطوں میں نشر ہوا۔ اس نے کامیابی کے سارے گزشتہ ریکارڈ توڑ دیے۔ اس پر امجد کو خصوصی پریذیڈنٹ انعام ملا۔ چین میں یہ پورا ڈرامہ چینی زبان میں ڈب ہوکر نشر ہوا اور نہ صرف ڈرامہ نگار امجد، بلکہ شاعر امجد کی مقبولیت کا گراف بھی ایسی تیزی سے بڑھا کہ جس کی مثال اردو شاعری میں ملنی مشکل ہے۔

۱۹۸۲ء میں امجد کا تیسرا شعری مجموعہ ''فشار'' کے نام سے شائع ہوا۔ (۱۲) اس مجموعے اور آئندہ شعری مجموعوں کے لیے اب فلیپ پر کسی رائے کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ امجد کا نام اب سکۂ رائج الوقت ہو چکا ہے۔ ''فشار'' کا انتساب عطاء الحق قاسمی کے نام تھا اور دیباچہ ہمیشہ کی طرح خود امجد کا تھا اور خود اعتمادی سے لکھا ہوا تھا۔ پرانے اور ہر آئندہ مجموعے کی طرح کتاب شروع ہوتی ہے حمد اور نعت سے۔ میرا خیال ہے کہ اس مجموعے کی نظم ''اس رات آسمان پہ تارے تھے اس قدر'' ان خود سوانحی نظموں کے سلسلے کی ہے جس میں نظم ''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' ہے۔ ''فشار'' کی نظم ''اے شام گواہی دے'' اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ صنفِ مخالف سے امجد کی محبت ہمیشہ افلاطونی نہیں ہوتی۔

بوسوں کی حلاوت سے جب ہونٹ سلگتے ہوں
سانوں کی تمازت سے جب چاند پگھلتے ہوں
اور ہاتھ کی دستک پر
جب بندِ قبا اس کے، کھلنے کو مچلتے ہوں
عشق اور ہوس کے بیچ کچھ فرق نہیں رہتا
(کچھ فرق اگر ہے بھی، اس وقت نہیں رہتا)
جب جسم کریں باتیں، دریا بھی نہیں بہتا
میں جھوٹ نہیں کہتا
اے شام گواہی دے

''عشق اور ہوس کے بیچ کچھ فرق نہیں رہتا'' جیسا مصرعہ اردو شاعری میں کم ہی ملتا ہے۔

''فشار'' کو نیشنل ہجرہ (اقبال) ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اب امجد ہندوپاک کے ان معدودے چند شاعروں میں شامل ہو گئے ہیں جن کے شعری مجموعوں کے ایڈیشن ان کی زندگی میں ہی ایک کے بعد ایک چھپتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہمارے زمانے میں یہ سعادت امجد کے علاوہ صرف فیض احمد فیض، احمد فراز اور پروین شاکر کو ملی ہے۔

''فشار'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۸۴ء میں امجد پہلی بار ہمارے شہر ٹورونٹو آئے، جب میں ان سے پہلی بار ملا۔ ان کے ساتھ جمیل الدین عالی اور پروین شاکر تھے۔ امجد ان دنوں نجی محفلوں میں بات بات پر لطیفے سناتے تھے۔ خوب زور زور سے باتیں کرتے تھے اور شور کر کے ہنستے تھے۔ ان کے لطیفے بازی کی باتیں کئی ادیبوں نے لکھی ہیں۔ پروین شاکر نے ایک محفل میں تقریر کرتے ہوئے شفیق الرحمٰن کا ایک پُرمزاح جملہ دہراتے ہوئے کہا: ''پیارے بے مثل مزاح نگار شفیق الرحمٰن کا قول فیصل ہے، بلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پروں کو نکال دیا جائے تو کچھ زیادہ بلبل نہیں بچتی۔ امجد اسلام امجد میں سے اگر لطیفے نکال دیئے جائیں تو کچھ زیادہ امجد باقی نہیں بچتا لیکن جو بھی بچتا ہے وہ ایسا ہے کہ اسے بچا بچا کے رکھا جائے۔'' (۱۳) یہ جملہ

مزے کا ہے اور تقریر کے لیے مناسب ہے مگر سنجیدہ تحریر میں نامناسب ہے، اس لیے کہ بقول بانو قدسیہ، امجد اپنے اور دوسروں کے درمیان لطیفوں کی ایک ایسی رنگ برنگی چلمن لٹکائے رکھتے ہیں کہ جس کے پار دیکھنا محال ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے اصلی چہرے کی تلاش میں نکلیں اور ان کی شاعری کے بطن سے شاعر امجد کو برآمد کریں۔[۱۴] شمیم کرمانی کا ایک شعر نہ جانے ذہن کے کن گوشوں میں چھپا بیٹھا تھا:

جو خود کو محوِ تبسم زیادہ رکھتے ہیں
وہ دل میں غم کے تلاطم زیادہ رکھتے ہیں

امجد کی شاعری میں جو کرب ہے، وہ لطیفہ باز امجد اپنے دل میں چھپائے رکھتے ہیں، چہرے مہرے سے عیاں نہیں ہونے دیتے۔

امجد کا چوتھا شعری مجموعہ ''ذرا پھر سے کہنا'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں چھپا۔[۱۵] اب تک امجد اور فردوس کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا روشین امجد، تحسین امجد اور علی ذیشان امجد ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا انتساب ان تین بچوں کے نام تھا۔ کتاب کا نام شاعر کی اس غزل سے لیا گیا تھا جس کی ردیف ہے ''ذرا پھر سے کہنا''۔ اس غزل کا یہ شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

اے کے سمندر، کہا تو نے جو بھی، سنا، پر نہ سمجھے
جوانی کی ندی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہنا

نظم ''خزاں کے آخری دن تھے'' بھی مجھے اسی سلسلے کی نظم لگتی ہے جیسی کہ ''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' ہے۔ امجد نے کتاب کے دیباچے میں اشارہ کیا ہے کہ ان کی نظم ''ابھی کچھ دنوں میں'' ایک خود سوانحی نظم ہے جو انہوں نے اپنی چالیسویں سالگرہ کے حوالے سے لکھی ہے۔ دیباچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ زندگی کے چالیس سال گزرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اور اب اس کے بعد کا سارا سفر دوسری طرف اترنے کا ہے مگر دھند اس قدر ہے کہ کسی بھی طرف کا رستہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دیتا۔'' اس بیان اور اوپر لکھے ہوئے شعر سے یہ خیال آتا ہے کہ امجد نے قبل از وقت اپنے اوپر بڑھاپا طاری کر لیا ہے۔ وہ ۱۴؍اگست ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے ''ذرا پھر سے کہنا'' کی اشاعت کے وقت وہ کوئی چوالیس سال کے ہوں گے اور یہ عمر ایسی نہیں ہوتی کہ آدمی اپنے آپ کو بوڑھا سمجھنے لگے۔

اردو میں ایم اے کرنے کے بعد امجد لاہور کے ایم اے او کالج میں پڑھانے لگے جہاں وہ ۱۹۹۷ء تک رہے۔ نظم ''ایک کمرۂ امتحان میں'' ان کے تدریسی زمانے کی ہے۔ یہ دلچسپ نظم ایک امتحان گاہ کے منظر سے شروع ہوتی ہے جہاں کچھ طالب علم جواب نہ جاننے کے باوجود کاپی پر حاشیے لگاتے ہیں، انگلیوں سے دائرے بناتے ہیں جیسے ان کو جواب معلوم ہے اور جواب ہی لکھ رہے ہیں مگر جب وقت کی عدالت میں شاعر کو خود ایک ایسا سوالنامہ دیا جاتا ہے جس کے سب سوال لازم بھی ہیں اور مشکل بھی تو:

بے نگاہ آنکھوں سے دیکھتا ہوں پرچے کو
بے خیال ہاتھوں سے
ان بنے سے لفظوں پر انگلیاں گھماتا ہوں
دائرے بناتا ہوں
یا سوالنامے کو دیکھتا ہوں

نظم ''ہوا سیٹی بجاتی ہے'' شروع اس طرح ہوتی ہے:

خزاں کی بالکونی سے

ہوا سیٹی بجاتی ہے

خزاں میں جب پتے درختوں سے ٹوٹ کر گرتے ہیں تو ہوا کے بہاؤ میں ایک پتہ شہر کی بے مدعا سڑکوں پر آ کر نظم کے واحد متکلم کے پاؤں سے لپٹ جاتا ہے، تب اسے زندگی کی بے ثباتی یاد آتی ہے، خیال آتا ہے کہ خزاں کی ہوا بلاوا دینے آئی ہے:

چلو چلنے کا وقت آیا

منیب الرحمن جو فیض اور راشد کے ہم عصر ہیں، مدت سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ نابینا ہو گئے ہیں، اس لیے اب پڑھ نہیں سکتے۔ شعر اب بھی کہتے ہیں مگر اندازے سے لکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے امجد کی یہ نظم کبھی نہ پڑھی ہوگی مگر ان کی ایک نظم کا مضمون تقریباً وہی ہے جو امجد کی نظم کا ہے۔ فرق اتنا ہے ان کا بلاوا موسم بہار کی ہوا کا ہے۔ نظم کا پہلا اور آخری دو مصرعے اس طرح ہیں:

کل رات بادلوں کو اڑا لے گئی ہوا

تھی اس سے گرچہ میری ملاقات مختصر

کب آؤ گے، یہ کہہ کے بُلا لے گئی ہوا

امجد قدرتی طور پر شاعر بھی ہیں، ڈرامہ نگار بھی اور افسانہ نگار بھی۔ مثلاً زیر نظر مجموعے میں ان کی نظم ''وقت بھی کتنا ظالم ہے'' میں ان کے افسانہ نگاری کے اوصاف صاف نظر آتے ہیں۔ دو بچھڑے ہوئے بہت عزیز محبوب اچانک ملتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں مگر صرف رسمی باتیں کرتے ہیں۔ ملنا چاہتے ہیں مگر وہ کہتی ہے ''اب میں چلتی ہوں''۔ نظم کا واحد متکلم کہتا ہے:

''میں شام سے ہر روز یہاں پر آتا ہوں

جب وقت ملے تم آ جانا

اس وقت مجھے بھی جلدی ہے، اب چلتا ہوں''

یہ وقت بھی کتنا ظالم ہے

آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ شاعر نے کچھ نہ کہہ کے بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، امجد نے افسانے نہیں لکھے مگر مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اس میدان میں اترتے تو پالا جیت کر جاتے۔

امجد کے دو چار مجموعے پڑھ کر جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، مجھے خیال آیا کہ اس شاعر کا اردو کلام ان تک بھی پہنچانا چاہیے جو اردو نہیں پڑھتے۔ اسی خیال کے تحت میں نے ان کی نظموں اور غزلوں کا ایک مختصر سا انتخاب کیا اور اپنی دوست لیزلی لاوین کے ساتھ مل کر انگریزی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمے اصل اردو کلام کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں چھپے۔[۱۶]

امجد کا پانچواں شعری مجموعہ ''اس پار'' کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۹۲ء میں چھپا۔[۱۷] انتساب امجد کے بھائیوں محسن

اسلام اور احسن اسلام کے نام ہے۔

جب ایک مباحثے میں امجد سے پوچھا گیا کہ ان کی ترجیحات اور خواہشات کیا ہیں تو یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ خدا نے ان کی محنت کا صلہ ان کی خواہش سے بڑھ کر دیا ہے، امجد نے کہا، انہیں ملال یہی ہے کہ: ''میرا معاشرہ، میرا ملک، میری قوم جس کی خوبصورتی کے لیے میں نے بے پناہ خواب دیکھے تھے، اتنا خوبصورت نہیں ہے جتنا میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اسے میرے خوابوں جیسا خوبصورت بنا دے اور مجھے بھی توفیق دے کہ میں اس کے حسن کو سنوارنے میں بھرپور کردار ادا کر سکوں۔'' (۱۸) میرے خیال سے اسی جذبے نے امجد سے ''اس پار'' میں شامل نظم ''اب تم میرے نہیں رہے'' لکھوائی۔ نظم کے شروع کے تین مصرعے یوں ہیں:

میں جس شہر میں رہتا ہوں
وہ کہتا ہے
''اب تم میرے نہیں رہے۔''

اور نظم ان چار مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

میرے شہر! اے مرے پیارے
اتنے کڑوے بول یہ تو نے
کیسے سوچے! کیسے کہے!
''اب تم میرے نہیں رہے''

امجد کی قدرے طویل نظم ''آبِ حیات'' کے دو حصوں میں سے پہلا حصہ نیچے درج ہے۔

آتے جاتے موسموں کی لوح پر
لکھے ہواؤں نے
بہت سے لفظ ایسے
جن کے معانی اب کسی کو بھی نہیں آتے
کہ وہ گزرے زمانوں کے کسی انجان دوراہے پہ
رستہ بھول بیٹھے ہیں
نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ماضی میں تو زندہ ہیں
مگر کچھ اس طرح جیسے
مشینوں کے توسط سے کوئی ''کومے'' میں زندہ ہو
کچھ ایسے لفظ بھی اس لوح پر لکھے ہوئے ہیں
جن کے معنی اب نہیں ظاہر
مگر اک وقت آئے گا
کہ یہ مفہوم کی پوشاک پہنیں گے

بلند آواز میں بولیں گے اور باتیں کریں گے

دوسرے حصے میں ضیا جالندھری کے الفاظ میں نظم یہ کہتی ہے کہ "جب یہ لفظ اس لوح پر اپنی جگہ کا تعین کر لیں گے یعنی ان کا ابلاغ ہو جائے گا تو آج کے انسانوں کو لوح پر خالی جگہوں پر کچھ اور الفاظ کے اضافے کی توفیق ہوگی اور اگر وہ اپنی مختصر سی مہلت کے دوران عہدِ رفتہ کے نیم زندہ لفظوں کے مطالب تک پہنچ کر اپنے لفظ کو بھی ان میں شامل کر دیں تو انہیں بھی دوام حاصل ہوگا۔"(۱۹) بلاشبہ اس نظم کا شمار امجد کی بہت اچھی نظموں میں ہونا چاہیے۔

"چلیں ہم فرض کرتے ہیں" پڑھ کر بہت سے لوگ امجد سے اس کے "محبت کا شاعر" ہونے کا سرٹیفکیٹ واپس لینا چاہیں گے۔ اس نظم میں اس تلخ حقیقت کا بیان ہے کہ جسموں کی محبت، جسے امجد نے ہوس کا مترادف بھی کہا ہے، جسموں کی خوبصورتی کی طرح دائمی نہیں ہوتی۔ کسی ایسے شخص کو جو ہماری زندگی سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا، ہم رنگوں کی ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لاتے ہیں، مگر ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ گوہر یکتا ہمارے شکنوں بھرے بستر کے ایک کونے میں ہونے کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ ہم سے ہزاروں میل دور ہو۔ پھر ہم خود کو سمجھاتے ہیں کہ جس گھر میں ہم رہتے ہیں، وہاں کچھ خوبصورت خواب بھی آباد ہوتے تھے:

چلو ہم فرض کرتے ہیں
یہ سب کچھ اک کہانی ہے
مگر کتنی پرانی
ہے

"اتنے خواب کہاں رکھوں گا" نام کا دیوان امجد کا چھٹا شعری مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۹۴ء میں چھپا۔(۲۰) انتساب محمد اشرف نسیم کے نام ہے۔ کتاب کا نام اسی عنوان کی ایک نظم سے لیا گیا ہے جس کے شروع کے تین مصرعے نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

اتنے خواب کہاں رکھوں گا
آنکھوں کے بازار میں تو اب تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے
اتنے خواب کہاں رکھوں گا

امجد نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں خوابوں سے زیادہ حقائق کا دور دورہ ہوتا ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اتنے خواب جمع ہو چکے ہیں کہ پچھلی پانچ کتابوں میں درج ہونے کے باوجود کم ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ جس طرح امجد کو محبت کا شاعر کہا جاتا ہے اسی طرح انہیں خوابوں کا شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ سید عبداللہ نے تو امجد کے دوسری شعری مجموعے کی اشاعت پر انہیں "خواب کا مسافر" کہہ دیا تھا۔(۲۱) محمد علی صدیقی امجد کی شاعری کو محبت، خواب اور شکستِ خواب کی شاعری کہتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امجد کی شاعری کا "اہم پہلو اپنی نسل میں شکستِ خواب کی فزوں تر احساس کی ترجمانی ہے۔"(۲۲)

ابھی تک امجد کے گیتوں کی بات نہیں ہوئی۔ انہوں نے اتنے گیت لکھے ہیں کہ صرف گیتوں کے تین مجموعے اور ایک کلیات ہے۔ گیتوں کے مجموعوں کے نام ہیں "آنکھوں میں ترے سپنے"(۲۳)، "سپنے کیسے بات کریں"(۲۴) اور "سپنے بات نہیں کرتے"۔(۲۵) اور گیتوں کے کلیات کا نام ہے "سپنوں سے بھری آنکھیں"۔(۲۶) آپ نے دیکھا کہ سب گیتوں کی کتابوں میں لفظ سپنا یعنی خواب آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ امجد کی نظموں کے کلیات کے نام میں بھی خواب کا لفظ آتا ہے: "میرے بھی کچھ

خواب ہیں''۔ (۲۷)

محبت اور خوابوں کی طرح امجد کو بارش سے بھی بہت رغبت ہے۔ ''اس پار'' میں ایک نظم ''بارش کی آواز'' کے عنوان سے ہے۔ نظم شروع ان مصروں سے ہوتی ہے:

بارش کی آواز کو سن کر
پیڑوں کی آغوش میں سہمی شاخیں جھومنے لگتی ہیں
گردِ ملال میں لپٹے پتے جاگ اٹھتے ہیں
اور ہوا کی پینگوں میں سرگوشیاں جھولنے لگتی ہیں

امجد نے اپنے ساتویں شعری مجموعے کا نام ''بارش کی آواز'' رکھا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۷ء میں چھپی۔ (۲۸) انتساب محمد انور مغل کے نام ہے۔ کتاب کے دیباچے میں امجد نے لکھا ہے کہ: ''زندگی کی طرح بارش کے بھی بے شمار روپ ہیں۔ میں غالب کی طرح گردشِ سیارہ کی آواز تک تو رسائی حاصل نہیں کر سکا مگر بارش کی مختلف آوازوں نے زندگی بھر مجھے اپنے جادو کا اسیر رکھا ہے۔ یہ آوازیں اور ان کے سُر جب اندر کے موسموں سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو زندگی اپنے کچھ ایسے اسرار سے پردہ اٹھاتی ہے جنھیں صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ کیفیات کے اظہار میں لفظ بعض اوقات گونگے کے اشاروں سے بھی زیادہ مبہم ہو جاتے ہیں۔'' دیباچے میں امجد نے یہ بھی لکھا ہے کہ پروین شاکر کو بھی بارش بہت پسند تھی۔ امجد پروین کو بہن کہتے تھے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کی بے وقت موت پر امجد نے ایک ماتمی نظم ان کے اکلوتے بیٹے شاکر علی عرف گیتو کے لیے لکھی۔ نظم کا عنوان ہے ''پروین کے گیتو کے لیے'' اور وہ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

ہاں مری جان، مرے چاند سے خواہر زادے!

نظم ختم ان مصرعوں پر ہوتی ہے

کس کو معلوم تھا ''خوشبو'' کے سفر میں جس کو
مسئلہ پھول کا بے چین کیے رکھتا تھا
اپنے دامن میں لیے
کو بکو پھیلتی اک بات شناسائی کی
اس نمائش گہِ ہستی سے گزر جائے گی
دیکھتے دیکھتے مٹی میں اتر جائے گی
ایسے چپ چاپ بکھر جائے گی

آپ کو یاد ہوگا کہ ''خوشبو'' پروین کا پہلا شعری مجموعہ تھا اور ''کو بکو پھیلتی اک بات شناسائی کی'' پروین کے اس غزل کے شعر سے ماخوذ ہے جو ''خوشبو'' میں شامل ہے۔

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

''بارش کی آواز'' میں امجد کی مقبول ترین نظم ''تمھیں مجھ سے محبت ہے'' شامل ہے۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا پہلا

مصرعہ ہر نئی اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے کو یاد ہوگا: ''محبت کی طبیعت میں یہ کیسا بچپنا رکھا ہے قدرت نے''۔ ظاہر ہے کہ ''محبت'' تو ایک غیر مرئی چیز ہے، نہ اس کی کوئی طبیعت ہوتی ہے، نہ اس کی طبیعت میں کوئی بچپنا مگر غیر اردو داں بھی یہ سمجھ کر محظوظ ہوتے ہیں کہ یہاں ''محبت'' سے مراد ''محبت کرنے والی'' سے ہے۔ عجب نہیں کہ خواتین اس نظم کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔

پیرزادہ قاسم کی طرح [۲۹] مجھے بھی امجد کی ''سیلف میڈ لوگوں کا المیہ'' پسند ہے۔ خدا جانے انہوں نے عنوان کے لیے انگریزی کی ترکیب کیوں چنی جبکہ اردو میں اس کی متبادل ترکیب ''خود ساز آدمی'' موجود ہے۔ ویسے یہ بات تو میں بھی ماننے کو تیار ہوں آج کل کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر انگریزی ترکیب زیادہ چڑھی ہوئی ہے۔ یہ نظم میرے خیال میں ایک حد تک سوانحی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود اپنے ایک مصاحبے میں کہا تھا کہ ان کا خاندان متوسط طبقے کا تھا اور سیالکوٹ میں ان کے بزرگ دستکار تھے۔ [۳۰] امجد کو ماشااللہ اب جو توقیر اور خوشحالی ملی ہے وہ صرف اور صرف ان کی اپنی محنت اور ہنر کا نتیجہ ہے۔ ''سیلف میڈ لوگوں کا المیہ'' میں یہ اعتراف ہے کہ ایسے لوگوں کو ان کی محنت کا اجر مل تو جاتا مگر دیر سے۔ نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

فصلِ گُل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں
ان کے صحن میں سورج دیر سے نکلتے ہیں

امجد کا آٹھواں شعری مجموعہ ''سحر آثار'' کے نام سے پہلی بار ۱۹۹۸ء میں چھپا۔ [۳۱] انتساب ملک مُصیب الرحمٰن کے نام ہے۔ میرے خیال میں امجد نے کتاب کا نام ان معنوں میں رکھا ہے کہ نئی صبح آنے والی ہے اور دنیا بدلنے والی ہے۔ امجد نے شاعری میں کسی کی شاگردی نہیں کی۔ چاہے وہ احمد ندیم قاسمی کے شاگرد نہ رہے ہوں مگر ان کے شاگردِ معنوی ضرور ہیں۔ قاسمی صاحب کے ''ترقی پسند'' ہونے پر کسی کو شک نہیں۔ امجد خود بھی کہتے ہیں کہ وہ ترقی پسند ہیں، مگر وہ اس ترقی پسند تحریک کے حامی نہیں ہیں جسے ہدایت سوویت یونین سے ملتی تھی۔ [۳۲] ''سحر آثار'' میں ان کی نظم ''ہم لوگ'' اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ سکہ بند ''ترقی پسندوں'' سے بہت خوش نہیں ہیں۔ اس تین بند کی نظم کا پہلا اور آخری بند حسب ذیل ہیں۔

دائروں میں چلتے ہیں
دائروں میں چلنے سے
دائرے تو بڑھتے ہیں
فاصلے نہیں گھٹتے

......

صبح دم ستاروں کی تیز جھلملاہٹ کو
روشنی کی آمد کا پیش باب کہتے ہیں
اک کرن جو ملتی ہے، آفتاب کہتے ہیں
دائرہ بدلنے کو انقلاب کہتے ہیں

''سحر آثار'' کی نظم ''میں نے اسے دیکھا'' امجد کی ان نظموں میں سے ہے جن میں ان کا ڈرامہ نویسی کا ہنر صاف عیاں ہوتا ہے۔ نظم کیا ہے، ایک فلم کا منظر نامہ ہے۔ نظم کا واحد متکلم ایک کھانے کی دعوت میں ایک خاتون کو دور سے دیکھتا ہے جو وقتاً فوقتاً میز کی آڑ میں اپنی نازک کلائی پہ باندھی ہوئی گھڑی دیکھتی ہے، جیسے آگے چل کر...... یہاں ڈرامہ نویس بات بدل کر ایک

سسپنس پیدا کرتا ہے: ''مگر یہ تو سب بعد کے واقعے ہیں۔'' خاتون سے کچھ باتیں ہوتی ہیں۔ ''میں نے اس سے کہا.....'' ایک بار پھر یہ کہہ کر سسپنس پیدا کیا جاتا ہے: ''اوخدا! یہ تو پھر بعد کی بات ہے۔'' ''بعد کی بات'' کبھی بتائی نہیں جاتی مگر پوری نظم ایک اچھی تجریدی فلم کی سی کیفیت ذہن پر چھوڑ جاتی ہے۔ جدید اردو ادب میں امجد کے علاوہ صرف ایک شاعر اور ہیں جو فلموں کے ڈائیلاگ اور منظر نامے بھی لکھتے تھے اور وہ تھے اختر الایمان۔ ان کی نظموں میں بھی امجد کی نظموں کی طرح ڈرامائی عنصر پایا جاتا تھا۔ ان کی کچھ نظمیں مثلاً ''بازآمد، ایک منتاج''، ''کل کی بات'' اور ''ڈاسنہ اسٹیشن کا مسافر'' اب اتنی مشہور ہو گئی ہیں کہ یہاں ان کے درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مغرب میں ایسے شاعر کی مثال فرانس کا شاعر ژاک پریویر (۱۹۰۰ء تا ۱۹۷۷ء) تھا، جس نے مشہور فلم "Les Enfants du Paradis" (بہشت کے بچے) کا منظر نامہ لکھا تھا۔ اس کی ایک نظم ''صبح کا ناشتہ''(۳۳) کا لغوی ترجمہ براہِ راست فرانسیسی سے نیچے درج ہے۔ یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس ترجمے میں میری مدد ہماری بیٹی نتاشہ بخت نے کی جس کی فرانسیسی میری فرانسیسی سے درجہا بہتر ہے۔

اس نے اپنے پیالے میں
کافی انڈیلی
اس نے کافی میں
دودھ ڈالا
اس نے دودھ والی کافی میں
ایک چھوٹے سے چمچے سے
چینی ڈالی
اور اسے گھلانے کے لیے چمچہ ہلایا
اس نے دودھ والی کافی پی
اور پیالہ واپس رکھ دیا
مجھ سے بولے بغیر
اس نے ایک سگریٹ سلگایا
اور دھوئیں کے چھلّے اڑائے
راکھ ایش ٹرے میں جھٹکی
مجھ سے بولے بغیر
میری طرف دیکھے بغیر
باہر جانے کو اٹھا
اس نے برساتی پہنی
کہ بارش ہو رہی تھی
اور بارش میں باہر چلا گیا

بغیر کوئی بات کیے
بغیر میری طرف دیکھے
اور میں
میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں لیا
اور رونے لگی

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ امجد کی تمثیلی نظموں کی طرح پریویر کا شاہکار بھی نظم کی نظم ہے، افسانے کا افسانہ اور منظر نامے کا منظر نامہ۔

امجد کا نواں مجموعہ ''ساحلوں کی ہوا'' کے نام پر پہلی بار ۲۰۰۰ میں چھپا، انتساب شاہد نسیم، زاہد نسیم اور مجاہد نسیم کے نام ہے۔ ساحلوں کی ہوا سے امجد کی رغبت بہت پرانی ہے۔ پہلی بار یہ ترکیب ان کی نظم ''ایک لڑکی'' میں آئی جو ان کے پہلے مجموعے ''برزخ'' میں شامل ہیں۔ نیچے لکھے ہوئے پہلے مصرے میں وہ لڑکی کہتی ہے:

''میں ساحلوں کی ہوا ہوں نیلے سمندروں کے لیے بنی ہوں''
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
جو راہ چلتی تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اتر رہی ہو

امجد کے ایک گیت میں بھی یہ ترکیب استعمال ہوئی ہے:

میں ترے سنگ کیسے چلوں ساجنا
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

گیت اوپر لکھے ہوئے مصرعوں سے شروع ہوتا ہے اور ''آنکھوں میں ترے سپنوں'' نام کی کتاب میں پہلی بار چھپا تھا۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ کتاب ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تھی، گویا زیرِ نظر مجموعے کی اشاعت سے نو سال پہلے۔ گیت کے مصرعوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''ساحل کی ہوا'' کو امجد نے کسی ایسے لاابالی شخص کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو کبھی بندھ کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ سمندر بیچارہ تو اپنے کناروں میں محدود رہتا ہے مگر ساحل کی ہوا تو کبھی بحر سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے، کبھی بر سے۔

''ساحلوں کی ہوا'' میں امجد کی شفیق الرحمٰن کی وفات پر لکھی ہوئی ایک مختصر مگر پُر اثر نظم شامل ہے:

بہت عجیب شخص تھا
تمام عمر جس قلم سے دوسروں کے واسطے
لکھے تھے اس نے قہقہے
اسی قلم سے اپنا کوئی دکھ نہ لکھ سکا
بہت عجیب شخص تھا

میرے عہد کے نوجوانوں کو شفیق الرحمٰن بہت پسند تھے۔ آج بھی ان کی شگفتہ تحریریں اداس لمحوں کو خوشگوار بنانے میں اکسیر کا اثر رکھتی ہیں۔ ان کے نام سے امجد کی ایک اور جہت یاد آتی ہے۔ نظموں، غزلوں، گیت اور ڈراموں کے علاوہ انہوں نے سفرنامے بھی لکھے ہیں اور ایسے لکھے ہیں کہ ایک دفعہ شروع کرو تو کتاب چھوڑنے کو جی نہیں کرتا۔ شفیق الرحمٰن نے امجد کے

سفرنامے ''ریشم ریشم''،(۳۴) پر تبصرہ لکھا ہے۔(۳۵) تبصرہ شروع ہی شفیق الرحمٰن کے بے مثال جملے سے ہوتا ہے: ''ریشم ریشم کا نام شاہراہِ ریشم سے لیا گیا ہے جو چین کی طرف جاتی ہے اور واپس بھی آتی ہے۔'' امجد کے سفرنامے کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''امجد اس سے پہلے بھی شاعری، ڈرامے اور تنقید میں اپنے قلم کے جوہر دکھا چکے ہیں، سفرنامہ ان کی تازہ جولانگاہ ہے۔ وہ بات سے بات نکالنے کا ہنر جانتے ہیں اور پڑھنے والوں کو لبھانے کے قائل ہیں۔'' یہاں شفیق الرحمٰن سے سہو ہوا ہے۔ امجد کا پہلا سفرنامہ ''شہر درشہر''،(۳۶) تھا۔ وہ بھی بہت مقبول ہوا۔

''ان کھیلی بازی کی ہار'' ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہے:

تینتیس برس پہلے
ایسی ہی کسی رُت میں
دو خواب سی آنکھوں نے اک بات کہی مجھ سے
اُس بات کے مطلب کے
اُڑتے ہوئے رنگوں کا مفہوم سمجھنے میں
کیا شام وسحر گزرے!

آپ کو یاد ہوگا کہ ''برزخ'' کی نظم ''جدائی کی پانچویں سالگرہ'' کے سلسلے میں اس مضمون کے شروع میں ''جدائی'' کا سال ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء طے ہوا تھا۔ اگر ۱۹۶۷ء میں ۳۳ جوڑے جائیں تو ۲۰۰۰ کا سال نکلتا ہے جو ''ساحلوں کی ہوا'' کی اشاعت کا سال بھی ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم بھی اسی پرانی افلاطونی جدائی کے بارے میں ہے۔

''ساحلوں کی ہوا'' کی آخری نظم ''محبت ایسا نغمہ ہے'' امجد کی بہت مشہور نظم ہے۔

محبت ایسا نغمہ ہے
ذرا بھی جھول ہونے میں
تو سُر قائم نہیں ہوتا

''محبت کے شاعر'' امجد کے محبت کے نغمے اتنے مقبول ہیں کہ اسی عنوان سے ان کی ایک کتاب چھپی ہے جس میں صرف محبت کی نظمیں ہیں۔(۳۷) سنہرے حاشیوں کے ساتھ یہ کتاب اتنی خوبصورت چھپی ہے کہ اردو میں اس کی بہت مثالیں نہیں ملیں گی۔

امجد کا دسواں شعری مجموعہ ''پھر یوں ہوا'' کے نام سے ۲۰۰۳ء میں چھپا۔(۳۹) انتساب امجد کی بیٹی تحسین ناصر اور ان کے شوہر ناصر حنیف قریشی کے نام ہے۔ اس مجموعے کی وہ نظم جو انہوں نے اپنے بیٹے علی ذیشان کے لیے لکھی ہے، خاص توجہ چاہتی ہے۔ اس نظم میں شاعر کو اپنے بیٹے سے وہی شکایت ہے جو ان کے والد کو خود ان سے رہی ہوگی کہ وہ اپنے والد کے خوابوں کے سہارے اپنی زندگی نہیں گزارنا چاہتے تھے۔ نظم ختم اس پیشین گوئی پر ہوتی ہے کہ جب عرفان کا لمحہ بیٹے تک پہنچے گا تو اسے بھی اپنے بیٹے کو یہی قصہ سنانے میں یہی دشواریاں پیش آئیں گی:

کہ وہ بھی تو کچھ اپنی بات کہنا چاہتا ہوگا
نئی دنیا، نئے منظر میں رہنا چاہتا ہوگا

بس اپنی ذات کی مستی میں بہنا چاہتا ہوگا

''پھر یوں ہوا'' کی دو نظمیں ''چند غیر مربوط منظر'' اور ''زوم اِن'' ایک طرح سے لفظی مرقعے ہیں۔ پہلی نظم کے چار بندوں سے پہلا اور آخری بند حسب ذیل ہے۔

چیڑ کے درختوں کی
بے لباس شاخوں پر
کوکتی ہوئی کوئل
تھک کے بیٹھ جائے گی

......

آندھیوں کے پس ماندہ
نیم وا دریچے میں
ایک بیل باقی ہے
وہ بھی ٹوٹ جائے گی

الفاظ سے مرقع سازی شاید اور اردو شاعروں نے بھی کی ہو مگر میرے مطالعے میں امجد کے علاوہ صرف محمد علوی ہی اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں۔ اس ضمن میں علوی کی ایک مختصر سی نظم ''رستے میں ایک گاؤں'' پیش خدمت ہے۔

چھ یا سات پرانے گھر آپس میں مل کر بیٹھے تھے
اک ٹوٹے پھوٹے چھکڑے میں اک دو کتے اونگھ رہے تھے
پیپل کے اک پیڑ کے نیچے کچھ بھینسیں خاموش کھڑی تھیں
دو چیلیں سوکھے کھیتوں پر پَر پھیلائے تیر رہی تھیں
دھول اڑائے جاتا تھا رستہ کچا
کار کے پیچھے بھاگ رہا تھا اک بچہ

امجد کی نظم ''جنگل مجھ سے بات تو کر'' نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ نظم کا واحد متکلم ایک پرانے منظر کو یاد کرتا ہے جب وہ اپنے محبوب کے ساتھ اس جگہ آیا تھا، ایک پیڑ پر نوجوانوں کے انداز میں اپنے نام بھی کھودے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ نظم بھی ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء کی جدائی کے سلسلے کی ہوگی، مگر اس نظم کے دو مصرعوں میں یہ درج ہے کہ واقعہ ''تین برس اور سولہ دن'' پہلے کا ہے یا تو شاعر ہمیں بہکانا چاہتا ہے یا یہ کوئی اور قصہ ہے۔

امجد کا گیارھواں شعری مجموعہ ''یہیں کہیں'' جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا[۴۰]، اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ان کی شعر گوئی کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کتاب کا انتساب ''ن۔م۔راشد، فیض صاحب اور مجید امجد'' کے نام ہیں جنھوں نے ''اردو آزاد نظم کو وقار و اعتبار بخشا''۔ یہ کتاب اتنی خوبصورت چھپی ہے کہ کسی بھی کافی ٹیبل کی زینت بن سکتی ہے۔ اب اردو ادب میں امجد کے شعری مجموعے اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ لوگ اپنے اچھے ذوق کی نمائش کے لیے غالب اور میر کے

دیوانوں کے ساتھ امجد کا دیوان بھی اپنی کافی ٹیبل پر رکھ سکیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ امجد اس کتاب کے دیباچے میں اعتراف کرتے ہیں کہ حسن کا ہر روپ انہیں اب بھی اچھا لگتا ہے مگر ان کی آنکھیں اب اس سے آگے، اس کے پار اور اس سے ماورا بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔

''یہیں کہیں'' کی نظم ''دیر آید'' میں جسمانی محبت کی بے ثباتی کی طرف اشارہ ہے۔ نظم کے کچھ بند نیچے درج ہیں۔

وہ بھی دن تھے کہ کبھی سرسری سی باتوں میں
تمہارے جاگتے، مہکے ہوئے بدن کی صدا
ہزاروں میل سے ایسے سنائی دیتی تھی
کہ جیسے یہ مرے اپنے بدن سے آئی ہو
یہ دن بھی ہیں مرے سینے سے لگ رہے ہو تم
تمہارا جسم مرے بازوؤں میں لپٹا ہے
مگر عجیب تماشا ہے ایسے لگتا ہے
کسی نے بیچ میں دیوار سی اٹھائی ہو

......

ہمارا ساتھ ہے دریا کے دو کناروں کا
کہ جن کے بیچ سدا فاصلے نے رہنا ہے
کریں تو کیسے کریں یہ ادق معمہ حل
سمے نے رکنا نہیں، پانیوں نے بہنا ہے

امجد بول چال کی وہ زبان بھی اپنے شعروں میں استعمال کرتے ہیں جس سے اردو شاعر عام طور پر گریز کرتے ہیں۔ مثلاً اوپر لکھے ہوئے مصرعوں میں ''فاصلوں نے رہنا ہے''، ''سمے نے رکنا نہیں'' اور ''پانیوں نے بہنا ہے'' بول چال میں تو ضرور آ جاتے ہیں مگر تحریر میں کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں مگر امجد تو قیود کے پابند ہی نہیں ہیں۔

زیر نظر مجموعے کی نظم ''کڑوا سچ'' جو صرف گرد پوش پر چھپی ہے، مجھے پسند ہے۔

ہے یہ بھی سچ کہ ترے سامنے مجھے برسوں
کوئی رفیق کوئی کام بھی نہ یاد آیا
پہ جھوٹ یہ بھی نہیں ہے، تجھے جو کل دیکھا
تو کتنی دیر ترا نام بھی نہ یاد آیا

وقت ایسا ظالم ہے کہ پیارے رشتوں کو بھی ذہن سے محو کر دیتا ہے۔

امجد کا بارہواں اور اب تک کا آخری شعری مجموعہ ''نزدیک'' کے عنوان سے ۲۰۰۹ء میں چھپا، انتساب اپنے بیٹے علی ذیشان امجد اور اس کی بیوی رابعہ علی کے نام ہے، اس دعا کے ساتھ کہ ان کے آنے والا کل ہمارے آج سے زیادہ خوبصورت ہو۔ (۴۱)

"نزدیک" کی ایک غزل کا شعر "ساحلوں کی ہوا" کے بارے میں اوپر لکھے ہوئے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔

کناروں سے نکلنا چاہتا ہے
سمندر رقص کرنا چاہتا ہے

چالیس سال سے زیادہ عرصے تک متواتر شعر کہنا، بارہ مجموعے تالیف کرنا وہ بھی بغیر معیار کے گرائے ہوئے اور بغیر تکرار کے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ صرف وہ شاعر ہی کر سکتا ہے جو ہمیشہ اپنے علم و ہنر میں مطالعے اور مشاہدے سے اضافہ کرتا رہے۔ امجد نے نہ صرف اپنے عہد کے اردو شاعروں کو تفصیل سے پڑھا ہے بلکہ اپنے پرانے شاعروں کو بھی پڑھا ہے اور دوسری زبانوں کا ادب بھی ان کے زیر مطالعہ رہا ہے۔ ان کی کتاب "نئے پرانے"[۴۲] اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اردو کے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ سرسری نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا شمار اردو کے گنتی کے معتبر ترین نقادوں میں ہوتا ہے۔ امجد کی اس کتاب کے بارے میں ان کی رائے مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔

> "نئے پرانے" نے میرا دل بطور خاص موہ لیا کہ میں بھی گزشتہ کئی برسوں انہی لوگوں سے الجھتا رہا۔ تم نے انتخابات عمدہ کیے ہیں اور مضامین خوب لکھے ہیں۔ خاص کر مصحفی، غالب اور میر پر تم نے بہت اچھا لکھا ہے۔ کوئی جدید کلاسیکی شعرا کو جی لگا کر پڑھے اور ان کو نکھار چمکا کر نئے انداز میں لائے، یہ میری شدید تمنا تھی۔ اس تمنا کو تمہاری کتاب نے ایک حد تک پورا کیا ہے۔ خوب، بہت ہی خوب! تمہاری شاعری کا بھی پرانا مداح ہوں۔"[۴۳]

امجد کی دو کتابیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انہوں نے غیر ملکی ادب کا مطالعہ بھی غائر نظر سے کیا ہے۔ پہلی کتاب ہے "عکس در عکس"، جس میں فلسطینی شعرا کے مزاحمتی کلام کا ترجمہ اردو میں براہِ راست عربی سے کیا گیا ہے[۴۴] اور دوسری کتاب ہے "کالے لوگوں کی روشن نظمیں"۔ اس کتاب میں افریقی امریکن اور افریقی شاعروں کے کلام کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔[۴۵] ہمارے عہد کے اچھے جدید اردو شاعروں میں میرا جی، ن۔ م۔ راشد، شمس الرحمان فاروقی، فہمیدہ ریاض اور امجد کے علاوہ اور کوئی شاعر نظر نہیں آتا جس نے اوروں کی شاعری کے ترجموں کی کتاب چھپوائی ہو۔ واضح رہے کہ راشد، فاروقی اور فہمیدہ کے ترجمے فارسی شاعری کے ہیں۔ یوں تو خیام اور حافظ کے کلام کے ترجمے بہتوں نے کیے ہیں مگر شاید ان دوسرے مترجمین کو "اچھے جدید شاعروں" کی فہرست میں نہ رکھا جائے۔

امجد کے ہم عصر اردو ادب کے مطالعہ کے ثبوت میں ان کے تبصروں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ایک زمانے میں وہ احمد ندیم قاسمی کے رسالے "فنون" کے لیے لکھا کرتے تھے۔ مثلاً "فنون" کے ایک ہی شمارے میں انہوں نے سات کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔[۴۶] ایک کتاب مظہر السلام کی "لوک پنجاب" ہے، دوسری اور تیسری مسعود مفتی کے افسانوں اور رپورتاژ "ریزے" اور "لمحے" چوتھی اکرام اللہ کا ناول "گرگِ شب" پانچویں محشر بدایونی کا دیوان "غزل دریا" چھٹی حفیظ تائب کی نعتوں کا مجموعہ "صلو علیہ وآلہ" اور ساتویں عرش صدیقی کے افسانوں کا مجموعہ "باہر کفن سے پاؤں"۔ لطف یہ ہے کہ اسی شمارے میں امجد کا ایک مضمون، ایک نظم اور دو غزلیں بھی ہیں۔۔ ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

یہی نہیں بلکہ امجد "جنگ" اخبار میں باقاعدہ کالم بھی لکھتے ہیں اور اب تک اتنے کالم لکھ چکے ہیں کہ ان کے کالموں کے کم از کم پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اگر آپ کو پہلے سے نہیں معلوم تھا تو اوپر کی تحریر سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ امجد صرف محبت

کے شاعر نہیں ہیں، ان کی شاعری کی اور بھی جہتیں ہیں اور یہ بھی ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ امجد صرف شاعر نہیں ہیں، ڈرامہ نگار بھی ہیں، سفرنامہ نگار بھی، مترجم بھی، کالم نگار بھی اور نقاد بھی۔ ان کی متنوع ادبی شخصیت پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے اردو کے معتبر ترین نقادوں میں سے ایک اور نقاد، گوپی چند نارنگ کی رائے کافی ہو گی۔

> ''ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ منہ کا ذائقہ بدلنے کو ادھر اُدھر منہ مار لیتے ہوں لیکن ایسا عجوبہ بہت کم ظہور پذیر ہوتا ہے کہ کوئی شخص جس بھی میدان میں قدم رکھے، اس کو مار رکھے اور جدھر بھی قلم بکف (شمشیر بکف) نکلے، فاتح کہلائے۔
>
> ہمارے امجد اسلام امجد ایسے ہی مستثنیات میں سے ہیں۔ غزل، نظم، ڈرامہ، سیریل، اسکرین پلے، تنقید و تحقیق، فکاہیہ، صحافت، کالم نگاری کوئی ایسا علاقہ نہیں جس میں انہوں نے کامیابی کے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ فقط جھنڈے ہی نہیں، اعزاز و اکرام و ایوارڈ و تمغات سے بھی نوازے گئے ہیں...... کونسا ایوارڈ ہے جس نے ان کے نام نامی سے مل کر اپنی توقیر نہ بڑھائی ہو۔
>
> کوئی پوچھے کہ شاعر بڑے ہیں یا سیریل رائٹر تو جواب آسان نہ ہو گا لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہم یہ سوال پوچھیں ہی، کیوں نہ ہم وہ مان لیں جو زمانہ جانتا ہے اور مانتا ہے، یعنی کی ان کی نظیر دوسری نہیں۔'' (۴۷)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، فیض کا خیال تھا کہ امجد کا جدت پسند ذہن غزلوں سے زیادہ نظموں کے لیے موزوں ہے کہ غزل میں ایجاد و اختراع کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اپنے غزلوں کے کلیات ''ہم اس کے ہیں'' (۴۸) کے دیباچے میں امجد نے انکسار سے کہا ہے کہ ''میں اپنے آپ کو اس میدان (یعنی غزل) کی پہلی صف کا آدمی نہیں سمجھتا کہ غزل گو شاعروں کی پہلی صف میں داخل ہونے کے لیے جس غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہے، وہ مجھے اپنی غزل میں نظر نہیں آتی۔''

مجھے خیال آ رہا ہے کہ یہ مضمون کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے۔ میری عافیت اسی میں ہے کہ امجد کے انکسار سے صرف نظر کر کے اب میں امجد کی غزلوں کے شعروں کا ایک چھوٹا سا انتخاب اس انتخاب سے لے کر پیش کر کے اپنے آپ کو رسوا کروں جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی کتاب کے لیے میں نے کیا ہے۔ یہ وہ شعر ہیں جو وقت بے وقت میرے ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ ذہن میں گونجنے کے لیے غزل کے شعر طویل نظموں سے زیادہ مناسب ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجیے کہ امجد غزل کے میدان میں صفِ اول کے شاعر ہیں یا نہیں۔

افق کے ہاتھ پہ تاروں کا خون تھا امجد
میں کور چشم اسے بھی سحر ہی جانا تھا

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اتر جانا ہے

کہاں پہ کھوئے تھے امجد کہاں کھلی آنکھیں

گماں قفس کا ہمیں اپنے بام و در سے ہوا

میں وہ رستے کی سرائے ہوں جسے
ہر کوئی چھوڑ کے جانا چاہے

بچھڑ کے تجھ سے نہ جی پائے مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے داستاں کیا کیا

اس کے بندِ قبا کے جادو سے
سانپ سے انگلیوں میں چلنے لگے

اس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتھر نہ ہوئے

اس نے آہستہ سے جب پکارا مجھے
جھک کے تکنے لگا ہر ستارہ مجھے

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دنیا بھر کے افسانے
بہت سے لفظ ایسے ہیں جو دریا میں نہیں رہتے

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اس دریا میں پانی بھی نہیں

پتھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی
امجد جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

وہ جو اوپر ہے بیٹھا ہوا اور ہے
میری بستی کا شاید خدا اور ہے

میں ساحل ہوں امجد اور وہ دریا جیسا
کتنی دوری دونوں میں، قربت کتنی ہے

کچھ ایسی اس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا
ہم نے تجھے بھلانے کا وعدہ نہیں کیا

کہتے تھے ایک پل نہ جئیں گے ترے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وہ وعدہ نہیں رہا

یہ اہل وفا ہیں عجب بہار پرست
سروں کے پھول فصیلوں پہ دھرتے جاتے ہیں

یہ شعر مجھے مجروح سلطانپوری کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے جس کا مضمون تو امجد کے شعر سا ہے مگر انداز دونوں کا منفرد ہے:

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

سارا فساد بڑھتی ہوئی خواہشوں کا ہے
دل سے بڑا جہان میں امجد عدو ہے کون

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے

ہم کو گھر چاہیے مکان نہیں

خود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن
یوں ہے کہ تجھے بھول کے دیکھیں گے کسی دن

ہم ہیں دو مختلف کناروں پر
بیچ میں وقت کی روانی ہے

تماشا ایک ہے روزِ ازل سے
فقط آنکھیں بدلتی جا رہی ہیں

امجد نے تقریباً انہیں الفاظ میں یہ مضمون اپنی ایک نظم ''علی ذیشان کے لیے'' جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ایک نظم میں استعمال کیا ہے۔

اٹھائے پھرتا ہوں اس دشتِ بے کنار میں مَیں
اک ایسا غم کہ جو مجھ پر بھی آشکار نہیں

لبِ دریا جلے خیمے وہی قصہ سناتے ہیں
ہے دریا آج بھی پیاسا، ابھی موسم نہیں بدلا

گرمی مرے شعور کی دیتی ہے مجھ کو شکل
قسمت کے سرد ہاتھ کا لکھا نہیں ہوں میں

اس آخری شعر پر مجھے جمیل مظہری کا ایک شعر اچانک یاد آیا:

یہ مہر تاباں سے جا کے کہہ دو کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ امجد کا تخلیقی ذہن اب بھی چاق و چوبند ہے۔ میری دعا ہے کہ ان کا قلم سالوں یونہی رواں دواں رہے۔

حواشی:

(۱) برزخ، مکتبۂ فنون، لاہور اشاعت اول، اکتوبر ۱۹۷۴ء۔
(۲) امجد الاسلام امجد کے فکر و فن کا تدریجی ارتقاء، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، فن اور شخصیت، مرتبہ، زاہد حسن، گورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۶ء، صفحہ ۳۰۔

(۳) ساتواں در، گورا پبلشرز، لاہور، اشاعت اول، ۱۹۷۸ء۔
(۴) کنکری، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۷ء۔
(۵) دیوان، ناصر کاظمی، طبع ششم، مکتبۂ خیال، لاہور، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۶۸۔
(۶) ساتواں در، فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد، فن اور شخصیت، مرتبہ، زاہد حسن، گورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۲۔
(۷) محض حرفے چند، جمیل الدین عالی، ستارے میرے ہم سفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۵۹۔
(۸) Destination beyond destinatio, Pakistan Writers' Co-operative Society, Karachi, 1997.
(۹) Calm under the whirpool, Royal Book Company, Karachi, 2003.
(۱۰) گمان کا ممکن، ن۔م۔راشد، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۷۶ء۔
(۱۱) خط بنام آغا عبدالحمید، نیا دور، ن۔م۔راشد، نیا دور، راشد نمبر، کراچی، شمارہ ۷۱۔۷۲، صفحہ ۱۸۸۔
(۱۲) فشار، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۲ء۔
(۱۳) امجد بھائی، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، فن اور شخصیت، مرتبہ زاہد حسن، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۱۱۶۔
(۱۴) امجد اسلام امجد، بانو قدسیہ، ستارے میرے ہمسفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۶۷۔
(۱۵) ذرا پھر سے کہنا، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
(۱۶) In the last days of Autumn, selection of poems of Amjad Islam Amjab, tr. by Baidar Bakht and Leslie Lavigne, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 1991.
(۱۷) اس پار، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔
(۱۸) براہ راست، گلزار جاوید کا امجد اسلام امجد سے مصاحبہ، چہار سو، راولپنڈی، مارچ، اپریل ۱۹۹۸ء، صفحہ ۲۱۔
(۱۹) امجد اسلام امجد کی نظم ''آبِ حیات'' پر ایک نظر، ضیا جالندھری، ستارے میرے ہمسفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ قطر، ۲۰۰۴ء، صفحے ۱۳۰ تا ۱۳۲۔
(۲۰) اتنے خواب کہاں رکھوں گا، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۴ء۔
(۲۱) ساتواں در، خواب کا مسافر، سید محمد عبداللہ، ستارے میرے ہم سفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحے ۴۳ تا ۴۵۔
(۲۲) امجد اسلام امجد، ایک کامیاب تمثال ساز شاعر، محمد علی صدیقی، ستارے میرے ہمسفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحے ۴۳ تا ۴۵۔
(۲۳) آنکھوں میں ترے سپنے، امجد اسلام امجد کے گیتوں کا مجموعہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء۔
(۲۴) سپنے کیسے بات کریں، امجد اسلام امجد کے گیتوں کا مجموعہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء۔
(۲۵) سپنے بات نہیں کرتے، امجد اسلام امجد کے گیتوں کا مجموعہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء۔
(۲۶) سپنوں سے بھری آنکھیں، امجد اسلام امجد کے گیتوں کا کلیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔
(۲۷) میرے بھی کچھ خواب ہیں، امجد اسلام امجد کی نظموں کا کلیات، جہانگیر بک ڈپو، اہور، ۱۹۹۹ء۔
(۲۸) بارش کی آواز، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۷ء۔
(۲۹) امجد اسلام امجد کی شاعری، پیرزادہ قاسم، ستارے میرے ہمسفر، فن و شخصیت امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۶۹۔
(۳۰) امجد کی گفتگو امجد راؤ خان کے ساتھ، ستارے میرے ہم سفر، فن و شخصیت امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۳۵۰۔
(۳۱) سحر آثار، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔
(۳۲) ایک ملاقات اختر سعیدی، ستارے میرے ہم سفر، فن و شخصیت امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۳۱۵۔

(۳۳) Jacues Prevert, Anthologie Prevert, Methen Educational Ltd. London, 1981, P-61.

(۳۴) ساحلوں کی ہوا، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

(۳۵) ریشم ریشم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع ۱۹۹۳ء۔

(۳۶) ریشم ریشم (سفرنامے) پر شفیق الرحمن کا تبصرہ، فنون، لاہور، جنوری، اپریل ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۳۵۔

(۳۷) شہر در شہر، قوسین، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

(۳۸) محبت ایسا نغمہ ہے، جہانگیر بک ڈپو، لاہور طبع ۲۰۰۴ء۔

(۳۹) پھر یوں ہوا، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، جہانگیر بک ڈپو، لاہور طبع ۲۰۰۳ء۔

(۴۰) یہیں کہیں، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

(۴۱) نزدیک، امجد اسلام امجد کا شعری مجموعہ، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

(۴۲) نئے پرانے، امجد اسلام امجد کا کلاسیکی شعراً کا انتخاب اور اس پر تنقید، التحریر، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

(۴۳) شمس الرحمٰن کے ایک خط کا اقتباس، ستارے میرے ہم سفر، فن و شخصیت، امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحے ۴۵۶، ۴۵۷۔

(۴۴) عکس، امجد اسلام امجد کے جدید عربی نظموں کے منظوم ترجمے، مجلس ترقی ادب، لاہور طبع ۱۹۷۶ء۔

(۴۵) کالے لوگوں کی روشن نظمیں، امجد اسلام امجد کے ترجمے، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۰ء۔

(۴۶) فنون، لاہور، شمارہ ۱۱، مارچ، اپریل ۱۹۷۹ء، صفحے ۳۰۲ تا ۳۱۱۔

(۴۷) آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری، گوپی چند نارنگ، ستارے میرے ہمسفر، فن و شخصیت امجد اسلام امجد، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ، قطر، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۳۶۔

(۴۸) ہم اس کے ہیں، امجد اسلام امجد کی غزلوں کا کلیات، جہانگیر بک ڈپو، لاہور، اشاعت کی تاریخ نہیں ہے۔



نظم:

”دعوت“

اے میری پرستشوں کی حق دار
آ، مَیں ترے حُسن کو نکھاروں
چہرے سے اُڑا کے گردِ ایام
آ، مَیں تری آرتی اُتاروں!
تُو میری زمیں بھی، آسماں بھی
مَیں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

(احمد ندیم قاسمی)

فلسفہ مابعد ارسطو...... تلاشِ ذات میں سرگرداں

ظفر سپل

ارسطو دانشِ یونان کا آخری تابندہ ستارہ ہے!

فلسفہ مابعد ارسطو نے رواقیت، اپی کیوریت، تشکیک اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد نو فلاطونیت کی صورت میں کچھ تحریکوں کو جنم دیا مگر وہ کسی بڑے نظامِ فکر کو پیدا کرنے میں ناکام رہیں۔ یہ محض فلسفیانہ رجحانات تھے جو سقراط، افلاطون اور ارسطو کے فلسفے سے قوتِ پرواز مانگتے تھے۔

اب اگر اس وقت کے عسکری، سیاسی منظرنامے پر نظر ڈالیں تو ہماری ملاقات ارسطو کے شاگرد سکندرِ اعظم (Alexander the Great) سے ہوتی ہے جس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں دنیا کو سیاسی اور ثقافتی طور پر بدل کر رکھ دیا۔ سکندرِ اعظم (وفات ۳۲۳ ق۔م) مقدونیہ سے اٹھا اور ایشیائے کوچک، شام، مصر، عراق، ایران، سمرقند اور پنجاب تک مار کرتا چلا گیا مگر معاملہ صرف سیاسی فتوحات کا نہیں ہے۔ اپنے وقت کی سپر پاور ایران کی تباہی و تسخیر کا بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ دنیا کو ثقافتی طور پر بدلنا چاہتا تھا۔ سو، اس نے مصر و ہندوستان تک مشرق کو ایسی تہذیب کے ساتھ جوڑ دیا جس میں یونانی تہذیب و ثقافت اور زبان نے قائدانہ کردار ادا کرنا تھا۔ یہ ایک نئے عہد کی شروعات تھیں جسے تاریخ میں ''یونانیت'' یا ''ہیلنی عہد'' (Hellensitic Period) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''یونانیت'' ایک ''عہد'' بھی ہے اور ایک ''ثقافت'' بھی۔ جو اگلے چار سو سال تک یونان، شام اور مصر میں پوری قوت سے رائج رہی۔ (اس کے کمزور ہوتے ہوئے اثرات اس وقت تک محسوس کیے جا سکتے ہیں جب سن ۴۰۰ عیسوی میں قرونِ وسطیٰ کا آغاز ہو رہا تھا) اور وہ یوں کہ اگرچہ ۵۰ ق۔م یا حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پچاس سال پہلے روم کو سیاسی اور عسکری طور پر یونانیوں پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یونانی دنیا کی تسخیر سے پہلے خود روم یونان کا ایک صوبہ تھا۔ یوں، مٹتا ہوا یونانی، ثقافتی اثر و رسوخ اگلی کئی صدیوں تک اپنا کردار ادا کرتا رہا۔

دنیا کے ایک بڑے حصے کو ایک ثقافتی رنگ میں رنگنا ایک خوش کن خیال لگتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ مختلف ملکوں اور ان کی ثقافتوں کے مابین حد بندیوں کی دیواریں گر گئیں۔ گویا انسان کے تحیر نے گاؤں سے ایک بڑے شہر میں قدم رکھ دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب ''قومی'' سرحدیں ٹوٹتی ہیں اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے تو نئے تجربے کے ساتھ ساتھ شک اور بے یقینی کا پرندہ بھی سر اٹھاتا ہے اور یہی کچھ ہوا بھی۔ مسلمات نے بے یقینی کا روپ دھارا اور فکری، ثقافتی اور مذہبی خیالات کی شکست و ریخت ہوئی اور لوگ اپنے اپنے وراثتی فلسفۂ زندگی کے بارے میں تشکیک کا شکار

ہو کر سوال کرنے لگے۔

ایک غیر محسوس فکری انتشار (Disallusion) تھا جو ہر گزرتے دن کے ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ اب کوئی افلاطون یا ارسطو نہیں تھا جو سوالوں کے جواب دیتا اور فرد کے درون کی حفاظت کو فرد اور معاشرے کی جڑت کے ساتھ مشروط ٹھہراتا۔ یہ واضح طور پر فکری دور انحطاط کا آغاز تھا اور اب فلسفے میں انتہا درجے کی فردیت (Individualism) اور موضوعیت راہ پا رہی تھی۔ اس تناظر میں رواقیہ اور اپی کیوریہ سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ سعادت، سلامتی اور خوشی کو اپنی ذات کے اندر تلاش کرنا چاہیے اور وہ اس لیے کہ اگر سیاسی اور سماجی حالات اور بیرون کی دنیا بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو پھر کم از کم اپنی ذات اور نفس پر تو ہمیں قدرت حاصل ہے اور اب فلسفے کا مطمع نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ذات کو رنج والم سے بالاتر کرے۔ سو، اب فلسفے کی ماہیت محض علمی ہونے کی بجائے عملی اور اخلاقی ہوگئی اور فلسفی فلسفے کے طبعی اور منطقی مسائل کو صرف اس حد تک شامل بحث کرنے لگے جہاں تک اس کا معاملہ اخلاقیات سے جڑتا تھا۔ اب فلسفے کا بنیادی مسئلہ انسانی ذات کا مسئلہ تھا اور صاف نظر آتا ہے کہ پہلے رواقی سے آخری نوفلاطونی تک کسی فلسفی نے فلسفے کے آفاقی مسائل کو خیال کی جولان گاہ نہیں بنایا۔

پھر وہی ہوا جو دور انحطاط میں ہوتا ہے...... فلسفی اپنی اپنی پناہ گاہوں میں سمٹ گئے اور اس ورثے کو سینے سے لگا لیا جو انہیں ان کے ماضی نے ودیعت کیا تھا۔ رواقیہ نے اپنے نظریے کو کلبی اخلاقیات کی بنیادوں پر استوار کیا اور اپی کیوریہ سیرینہ کو سرچشمہ خیال بنانے پر مجبور ہو گئے۔ یاد رہے کہ دونوں مکتب فکر، کلبی اور سیرینہ (Cynic & Cyranic) سقراط کے اخلاقی نظام فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہوئے تھے۔

ہاں تو اب فلسفے کا بنیادی مسئلہ انسانی ذات کا مسئلہ تھا کہ اسے کیسے رنج والم سے نجات ملے۔ اس قدر مشترک کے ساتھ کہ انسان کو غم سے بے پروا ہو جانا چاہیے، رواقی اور اپی کیوریہ دونوں دو مختلف نسخے تجویز کرتے تھے۔ رواقی خوشی کے حصول کے لیے جذبات کو مار دینے کے حق میں تھے اور اپی کیوریہ احساسِ لذت کو پیدا کرے۔ ایک ہی منزل کی تلاش میں اپی کیوریہ اور رواقیہ کے دو متضاد راستوں نے ایک نئے فلسفیانہ رجحان کی راہ ہموار کی۔ یہ ''تشکیک'' کے رجحان کی نقشہ بندی تھی مگر یہ بھی کوئی نیا نظام فکر نہیں تھا۔ سوفسطائی یہ کارنامہ پہلے ہی انجام دے چکے تھے۔

اب ایک لمبے تاریخی وقفے کے بعد یونانی فلسفے کے دبستان کا وہ آخری رجحان سامنے آیا جس نے یونانی فلسفے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ یہ ''نوفلاطونیت'' جو افلاطون کے نظامِ فکر کے صرف متصوفانہ عقائد سے قوت نمو حاصل کرتی تھی، دور انحطاط کی ایک لازمی شرط کے طور پر نوفلاطونیت نے عقل و حکمت کو اس نکتے کے ساتھ خیرباد کہا کہ حقیقت اس قدر بلند ہے کہ اس تک منطقی فکر کے ذریعے رسائی ناممکن ہے۔ یہ صرف حالت سکر اور تو، باطن ہے جو ذات احد اور حقیقت تک آگہی عطا کرسکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اگلی سطور و صفحات میں پیچھے ذکر کردہ ہر تحریک ور جحان کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے۔

رواقیت (Stoicism)

رواقیت کا بانی زینو (۳۳۴ق۔م۔۲۶۲۔ق۔م:Zeno) یونانی النسل نہیں ہے۔ وہ قبرص سے تعلق رکھنے والا ایک تاجر پیشہ شخص تھا۔ ایک تجارتی سفر میں اس کا جہاز ڈوب گیا اور تقدیر اسے ایتھنز لے آئی۔ یہاں ایک کتب فروش کی دکان پر زینوفن (Xenophon) کی کتاب میں سقراط کے حالات زندگی پڑھ کر اسے فلسفیوں سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا اور اس نے دکاندار سے پوچھا کہ ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟ اتفاق سے اس وقت ایک کلبی ادھر سے گزر رہا تھا۔ دکاندار نے اس کا تعارف

زینو سے کروا دیا۔ اس طرح زینو کلبی مکتب فکر میں شامل ہو گیا، اگر چہ بعد میں وہ اس سے متنفر ہو گیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ''کلبیت'' نے اس کا پیچھا ساری عمر نہیں چھوڑا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ کلبیت (Cynicism) پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، مگر اس سے بھی پہلے ایک کہانی سنیے:

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز سقراط ایک ریہڑھے کے قریب سے گزرا، جس پر دنیا جہان کی چیزیں برائے فروخت سجی ہوئی تھیں۔ سقراط کافی دیر کھڑا انہیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ آخر کار اس کی زبان سے نکلا:

''یہاں کتنی چیزیں ایسی ہیں، جن کی مجھے ضرورت نہیں۔''

یہی وہ فقرہ تھا جس کو سقراط کے ایک ہونہار شاگرد اینٹس تھینیس (Anti sthenes) نے ماٹو بنا کر ایک نئے مکتب فکر ''کلبیت'' کی بنیاد رکھی۔ یونانی زبان میں ''کلب'' کے معنی ''کتا'' کے ہیں اور اس تحریک کو یہ نام غالباً ''کلبی مرد'' فلسفی دیو جانس (Diogenes, The Cynic) سے ملا جس نے کتے کی مانند بے سروسامان زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ بلاشبہ اس کی شہرت اس کے استاد اینٹس تھینیس پر غالب آ گئی۔ وہ ایک بدنام زمانہ مہاجن کا بیٹا تھا جسے جعلی سکے بنانے کے جرم میں سزا بھی ہوئی تھی۔ شاید اسی وجہ سے ابتداء میں اینٹس تھینیس اس کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن دانش کے طلب گار دیو جانس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور استاد سے وہ سب کچھ حاصل کر کے رہا، جس کی اسے طلب تھی۔

معروف روایت کے مطابق دیو جانس نے اپنی پوری زندگی ایک ٹب یا مدور پیپے (Barrel) میں گزار دی مگر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ روایت مفروضہ ہے اور وہ ہندوستانی فقیروں یا بدھ بھکشوؤں کی مانند بھیک مانگ کر گزارہ کرتا تھا اور جانوروں کو بھی انسانوں کی طرح اپنی برادری سمجھتا تھا۔

خیر، ہم ذکر کر رہے تھے، زینو اور اس کی رواقیت کا۔ کلبیت سے جدا راستہ اختیار کرنے کا عندیہ دینے کے باوجود رواقیت ہمیشہ اس کے زیر سایہ سفر کرتی رہی۔ سقراط کو رواقین کی تاریخ میں ولی کا درجہ حاصل رہا۔ دراصل سقراط کی جسمانی آرام و آسائش سے بے پروائی، خوراک اور لباس کے معاملے میں سادگی، گرم و سرد موسم سے بے نیازی، مقدمے کے دوران اس کا پروقار رویہ، اس کا جیل سے فرار ہونے سے انکار اور موت کا جرأت اور سکون سے سامنا...... یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنہیں رواقین نے خفی قلم سے اپنے پرچم پر درج کر لیا تھا۔

رواقی یا Stoic یونانی لفظ Stoa سے مستعار ہے۔ دراصل زینو اپنے پیروکاروں کو ایک برآمدے یا پورچ یا Portico میں اکٹھے کر کے درس دیا کرتا تھا اور Portico یونانی لفظ Stoa ہی کا ہم معنی ہے۔

زینو کی موت خودکشی سے ہوئی اور اس کی جگہ ''کلین تھس'' (Cleanthes) نے لی اور ''کلین تھس'' کا جانشین ''کریسی پس'' (Chrysippus) بنا۔ کریسی پس کے بعد ''پانی ٹی اس'' (Panaetius) اور ''پوزی ڈونی اس'' (Posidonius) سامنے آئے۔ رومی شہنشاہ سسرو ''پوزی ڈونی اس'' ہی سے متاثر تھا اور رومیوں میں رواقیت کے پھیلاؤ کا ذمہ دار بھی۔ بہر حال ''کریسی پس'' کو رواقیت کا سب سے اہم نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

رواقین حسّی ادراک کو علم کا ذریعہ جانتے ہیں در صداقت کو موضوعی قرار دیتے ہیں۔ وہ مادے کو کائنات کی اصل مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ روح اور مادہ کی تفریق ہی کے قائل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ روح مادہ ہی کی ایک صورت ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

جو تعلق انسانی روح کا انسانی جسم سے ہے، وہی تعلق خدا کا کائنات سے ہے۔ گویا کائنات خدا کا جسم ہے۔ اس طرح رواقیوں نے ایک قسم کے ''مادی وحدت الوجود'' کی خبر دی۔ مادے کو کائنات کی اصل قرار دینے والے رواقی آتش یا آگ کو مادے کی اصل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آتشِ کُل یعنی خدا سے کائنات کی تکوین ہوتی ہے۔ عالم کو بنانے کے لیے خدا نے اپنے آتشی بخار کو ہوا میں تبدیل کیا اور پھر پانی میں۔ اس پانی میں وہ بطور قوتِ صانع موجود رہا جس سے مٹی وجود میں آئی۔ تکوین کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہر شے دہکتی ہوئی عالمگیر آتش میں بدل جائے گی اور اس آتش سے ایک بار پھر عالم نو وجود میں آئے گا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لیے کہ جبری میکانیت کا یہی اصول ہے۔

رواقی اپنے فلسفہ اخلاق میں علم کو نیکی کا درجہ دیتے ہیں مگر وہی علم جو عملی زندگی میں ممد و معاون ثابت ہو۔ ان کے یہاں جذبات و خواہشات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ غم و الم سے نجات کے لیے چاہتے ہیں کہ جذبات و خواہشات کو سرے سے ختم کر دینا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''زندگی فطرت کے مطابق بسر کرو۔'' اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ زندگی عقل کے مطابق بسر کرو۔

اس سے قبل کلبی بھی غم سے نجات کے لیے خواہشات سے نجات کا نسخہ تجویز کرتے تھے مگر انہوں نے انسان کی داخلی آزادی کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے معاشرتی زندگی کے تمام بندھنوں سے انکار کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ تمام معاشرتی قوانین غیر فطری ہیں۔ اس طرح انہوں نے اجتماعی زندگی سے کٹ کر خالصتاً انفرادیت کا پرچم بلند کیا۔ یہ ایک ایسی صورتحال تھی جس نے کلبیوں کی زندگی میں سے گہرائی کو ختم کر دیا تھا اور ان کے غرور و تکبر میں اضافہ کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے سقراط نے ایک بار اینٹس تھینس (Antis Thenes) کو پھٹا ہوا کوٹ پہنے دیکھ کر کہا تھا کہ تمہارے پھٹے ہوئے کوٹ کے سوراخوں سے تمہارا غرور چھلک رہا ہے۔

رواقین کلبیت کے زیر اثر ضرور رہے تھے مگر انہوں نے فرد کی داخلی آزادی کے لیے معاشرتی بندھنوں سے اس قدر انحراف نہیں کیا، اس لیے جب وہ یہ کہتے تھے کہ ''زندگی فطرت کے مطابق بسر کرو'' تو وہ انسان کی انفرادی فطرت کی بات نہیں کر رہے ہوتے تھے بلکہ اس سے ان کی مراد چاروں طرف پھیلی عمومی اور الوہی فطرت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام انسان عمومی فطرت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ یہ عالمگیر برادری کی تشکیل کا خواب تھا جس میں رنگ نہیں تھا، نسل نہیں تھی، قوم نہیں تھی، ملک نہیں تھا۔ گویا وہ ایک کاسموپلیٹن شہر (Cosmopolitan City) کا تصور پیش کر رہے تھے۔

رواقین تقدیر پرستی میں ایک قدم آگے نکل گئے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں دنیا میں جو ناانصافیاں نظر آتی ہیں، وہ اس کا عیب نہیں بلکہ یہ نغمۂ ازلی کے زیر و بم ہیں۔ سو نوشتہ تقدیر سے نالاں ہونا یا اس کا شکوہ کرنا عبث ہے۔ مردِ کامل وہی ہے جو دنیا کے آلام و مصائب پر صابر و شاکر رہے۔

تو یہ تھے رواقی مفکرین! اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ انہوں نے پرآشوب اور اخلاقی گراوٹ کے دور میں اخلاقی اقدار کی حفاظت کی اپنی سی کوشش ضرور کی۔

اپی کیوریت (Epicureanism)

سقراط کا طریقہ کار سوال اٹھانا تھا۔ سو، اس نے سوال اٹھا دیا کہ انسان اچھی زندگی کس طرح گزار سکتا ہے۔ کلبیوں اور رواقین نے اس کا حل یہ پیش کیا کہ دکھ اور تکلیف کو برداشت کیا جائے اور ہر قسم کی مادی تعیشات سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

صرف دو سال بعد ایتھنز میں اپی کیورس نے ایک اور نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ مطمع نظر قدغنوں سے نجات اور حواس کے ذریعے ارفع ترین لذت کے حصول سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے...... یہ تھے اپی کیوریت کے بانی اپی کیورس (Epucurus)۔

اپی کیورس (۳۴۲ ق۔م۔ ۲۷۱ ق۔م) ایتھنز کی نو آبادی جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں ایک دنیا دار، شیخی باز، اور چلتر عورت تھی جو پرو ہتانی اور روحانی معالج ہونے کی دعویدار تھی۔ وہ گلی گلی پھیرے لگا کر پاکیزگی عطا کرنے والی دعائیں پڑھتی اور منتروں اور جادو ٹونے سے لوگوں کا علاج کرتی۔ اپی کیورس کو اپنی ماں سے شدید محبت تھی۔ وہ بھی اپنی ماں کے ہمراہ رہتا اور ان مقدس فریب کاریوں میں اس کی مدد کرتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اوائل ایام ہی سے نفسیاتی طور پر اس کے دل میں ضعیف الاعتقادی، اوہام پرستی اور جھوٹے مذہبی تقدس کے خلاف ردعمل پیدا ہو گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ لڑکپن ہی سے اسے فلسفے سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

ایک روز اس وقت جب کہ اس کی عمر صرف بارہ سال تھی، اس کے استاد نے تخلیقِ کائنات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہر شے بدنظمی سے پیدا ہوئی ہے۔

یہ اپی کیورس کے دل کو لگنے والی بات تھی۔ اس لیے اس نے استاد کی بات سن کر کہا ''مگر یہ بھی تو بتائیے کہ خود یہ بدنظمی کہاں سے پیدا ہوئی ہے؟''

اب استاد اس سوال کا جواب کہاں سے دیتا۔ اس نے کہا ''اپی کیورس! اس سوال کا جواب تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔''

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایتھنز آیا۔ یہ شور و فساد کے دن تھے اور ایتھنز میں اسکندر اعظم کا مقرر کردہ حاکم ایک مثالی آمر کی طرح تھا۔ اپی کیورس کا باپ اپنی بیوی کے برعکس ایک مختلف آدمی تھا۔ وہ ایتھنز کے ایک سکول میں پڑھاتا تھا۔ ایک ایسا ٹیچر جسے آمریت سے نفرت تھی مگر شہر کے حاکم نے وہی کیا جو کسی آمر کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے اس جیسے باغیانہ خیالات رکھنے والے تمام افراد کو وہاں سے نکال دیا اور مقدونیہ کے آباد کاروں کو ایتھنز لے آیا۔ سو، اپی کیورس کے گھرانے کو ایتھنز چھوڑ کر ایشیائے کوچک میں پناہ لینی پڑی۔

اب مقام عافیت ایک ہی تھا اور وہ تھا اس وقت کا سکہ رائج الوقت یعنی فلسفہ۔ اپی کیورس نے فلسفے کے دامن میں پناہ لے کر زندگی کے عذاب کو بھولنا چاہا۔ اسے زندگی کے ابتدائی ایام کا سوال ابھی تک یاد تھا کہ بدنظمی کا منبع کیا ہے؟ اور اب اس میں یہ خواہش بھی شامل ہو گئی تھی کہ اس سے نجات پانے کا طریقہ کیا ہو۔

ایک مشکل زندگی گزارنے کے بعد ایک بار پھر جب وہ ایتھنز آیا تو زندگی آسان کرنے کا نسخہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ شہر کے نواح میں اس نے ایک گھر خریدا اور ایک باغ۔ ۳۱۱ ق۔م۔ میں اس نے اپنے مکتب کی بنیاد رکھی جس کی پیشانی پر درج تھا:

''اجنبی! تم یہاں بہت اچھی زندگی گزارو گے۔ یہاں لذت اعلیٰ ترین اچھائی سمجھی جاتی ہے۔''

اس اکیڈمی کے ممبر صرف فلسفے کے طالب علم نہیں تھے۔ ہر طبقے کے مرد و زن پر اس کے دروازے وا تھے۔ حتیٰ کہ غلام اور طوائفیں بھی اس کی ممبر بن سکتی تھیں اور یہاں مخلوط طرزِ تعلیم رائج تھا۔

''باغ والوں'' کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اپنے اصولوں کے باعث بھی اور مالی معاملات کی تنگی کی وجہ سے بھی۔ ان کی عمومی خوراک میں روٹی اور پانی شامل تھا اور کبھی کبھار شراب کے چند قطرے مگر وہ اس پر بھی مطمئن تھے۔ پنیر کو عیاشی کا درجہ حاصل تھا جو انہیں خاص خاص موقعوں پر نصیب ہوتا۔ ایک بار اپی کیورس نے اپنے ایک دوست کو لکھا:

''مجھے تھوڑا سا پنیر بھیج دو، تا کہ ہم ذرا جشن منا سکیں۔''

ایک اور دوست کو اس نے لکھا:

''اپنے اور اپنے بچوں کی طرف سے نذرانہ بھیجیں تا کہ ہماری مقدس برادری قائم رہ سکے۔''

ان تمام معاملات کے باوجود وہ خوش تھے اور مزے میں۔ وہ ایک اور جگہ لکھتا ہے:

''میں اپنی روٹی اور پانی پر خوش ہوں اور تعیشات زندگی پر تھوکتا ہوں۔ خود ان کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے استعمال سے پیدا ہونے والی تکالیف کی وجہ سے۔''

یہ سب کچھ تو ایسے ہی تھا مگر ہمیشہ کی طرح لوگوں کی زبانوں کو کون روک سکتا تھا...... شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور طرح طرح کے افسانے گھڑے جانے لگے۔ وہ انہیں پیٹو سمجھتے تھے اور باغ میں مفروضہ ''رنگ رلیوں'' اور ''جنسی عیاشیوں'' کے متعلق گپیں ہانک کر اپنا دل خوش کرتے تھے۔

اپی کیورس کائنات کی حقیقت کی تشریح کے حوالے سے ڈیموکرائیٹس (Democritus) کے زیر اثر تھا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ کائنات کی ہر چیز سالمات (Atoms) یا مادی ذرات سے بنی ہے مگر اس نے ڈیموکرائیٹس سے انحراف کرتے ہوئے کہا کہ ان سالمات کا اجتماع کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہے۔ یہ اجتماع اتفاقی بھی ہو سکتا ہے جبکہ ڈیموکرائیٹس مکمل میکانکی جبریت کا قائل تھا۔

اسی طرح اس نے زندگی کے معاملات میں بھی جبریت سے انحراف کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کسی ایک حکمران یا خدا کے تصرف کے تحت کام نہیں کر رہی بلکہ انسان کی مصیبتوں کا سب سے بڑا سبب ہی یہی ہے کہ اس نے اپنے گرد خدا کا خوف، جنت و دوزخ اور جزا و سزا کے تصورات کا غیر حقیقی ہالہ بنا ہوا ہے۔ اگر کائنات کو چلانے والا انصاف پسند خدا ہوتا تو پھر ان مصیبتوں، آفتوں اور بدبختیوں کا کیا جواز ہے جنہوں نے انسان کو روزِ اول سے رنج والم کا شکار بنایا ہوا ہے...... دراصل وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کاروبارِ جہاں میں کسی حکیم و دانا ہستی کا کوئی دخل نہیں بلکہ ہنگامۂ وجود صرف مادی سالمات کے اتفاقی اور ہنگامی اتفاق و انتشار کی وجہ سے ہے۔

اپی کیورس روح کی مستقل حیثیت کا بھی انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے اگر ایسا ہوتا تو اس وقت جسمانی وزن میں کمی واقع ہو جاتی، جب کوئی جاندار مر جاتا ہے اور پھر روح کو اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو یاد ہونا چاہیے تھا اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روح محض سالموں کے خاص نظم وضبط کا نام ہے۔ جب موت کے وقت یہ نظم وضبط ٹوٹتا ہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ یہ بات ضرور مانتا ہے کہ عالمِ بے ہوشی، نیند اور بیداری میں روح کی کیفیات مختلف ہوتی ہیں۔

موت کے بارے میں اپی کیورس نے سادگی سے کہا ''موت ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس لیے کہ جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو موت نہیں ہوتی اور جب موت آئے گی تو ہم نہیں ہوں گے۔ سو، موت کا فکر اور خوف جہالت ہے۔

آئیے اب اپی کیورس کے معروف نظریہ ''لذت'' کا جائزہ لیں:

اپی کیورس کے نزدیک لذت سب سے بڑی اخلاقی فضیلت ہے اور جہاں کہیں بھی ہو، قابل آرزو ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اصل مطمع نظر تو دکھ والم سے نجات ہے۔ سو، وہ ایسی ہنگامی اور وقتی لذتوں کو قابل آرزو نہیں سمجھتا جو بالآخر غم واندوہ کا سبب بنتی ہوں۔ اس کے برعکس ایسی تکلیف جو بالآخر خوشی ولذت کا باعث بن سکیں، قابل آرزو ہے جیسا کہ عمل جراحی۔

اپی کیوریہ بنیادی طور پر غم سے نجات کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اس لیے ان کا نظریہ لذت دراصل روحانی اور قلبی خوشی اور سکون کا نظریہ ہے اور وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ اصل لذت خواہشات کے تعاقب میں مارے مارے پھرنے کی بجائے ان سے پیچھا چھڑانے اور جسم و ذہن کو ان کے اثرات سے نجات دلانے سے حاصل ہوتی ہے۔

اپی کیوریہ کے نزدیک لذت کے بعد سب سے بڑی اخلاقی فضیلت دوستی ہے۔ اس لیے اپنے ''باغ بہشت'' میں وہ تمام...... سب عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے...... دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ باقاعدہ استادی شاگردی کا کوئی معاملہ نہیں تھا، ہاں اپی کیورس ان سب میں سب سے زیادہ قابل احترام تھا۔

بعد میں آنے والے اپی کیوریہ نے لذت پرستی پر ضرورت سے زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ ان کا ماٹو تھا ''صرف زمانہ حال میں زندہ رہو۔'' اس لیے آج اپی کیوریت کی اصطلاح منفی معنوں میں صرف ''لذت پرستی'' کے فلسفے کے طور پر جانی جاتی ہے۔ آپ اگر کسی مستند انگریزی اردو لغت میں ''اپی کیورین'' کا مطلب دیکھنا چاہیں تو یہی لکھا ہوگا ''عیاش، عشرت پسند، نفسانی خواہش کا بندہ، شکم پرور وغیرہ۔''

اپی کیورس تمام عمر صحت کی خرابی کی اذیت میں مبتلا رہا لیکن اس نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ اپنے آخری خط میں وہ اپنے ایک دوست کو لکھتا ہے:

> ''آج میں اپنی زندگی کی سچی خوشی کے دن جب کہ عین قریب الموت ہوں، تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میرے معدے اور پتے میں شدید تکلیف ہے، جو ختم ہونے کو نہیں آ رہی لیکن اس تمام کے باوجود میں تمہارے ساتھ بات کرتے ہوئے دل میں بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

وہ اس وقت بھی اپنے ایک مرحوم شاگرد کے بچوں کے بارے میں فکر مند تھا، اس نے اسی خط کی اگلی سطروں میں لکھا:

> ''بچپن سے تمہیں میرے اور میرے فلسفے کے ساتھ جو محبت ہے، اس حوالے سے میں تم سے توقع کرتا ہوں کہ تم میٹروڈورس کے بچوں کا ضرور خیال رکھو گے۔''

یہ اس دانا کی آخری تحریر ہے، تاریخ فلسفہ میں جس سے زیادہ کسی فلسفی کو غلط نہیں سمجھا گیا۔

تشکیک (Scepticism)

تاریخ فلسفہ میں سب سے پہلے سوفسطائیوں نے یہ کہہ کر تشکیک کے رجحان کی تشکیل پذیری کی کہ ''حقیقت کے متعلق جو نظریہ، جو شخص بھی، قائم کرے گا، وہ اس کے لیے سچ ہوگا۔''

بعد میں ایک ہی وقت میں موجود دو مکاتب فکر...... رواقیت اور اپی کیوریت...... نے غم و الم اور مصائب سے نجات کے لیے دو مختلف راستے تجویز کر کے ایک بار پھر نظریہ تشکیک کے ابھار کے لیے راہ ہموار کر دی۔

پرہو (Pyrrho) یونانی تشکیک کا بانی ہے۔ ۳۶۰ ق۔م۔ میں پیدا ہونے والا پرہو سکندر اعظم کا دوست تھا اور نظریات کی کھوج میں سکندر کی ہندوستان پر لشکر کشی کرنے والی فوج میں بھی شامل تھا۔ پرہو کی تشکیک بھی علمی نہیں بلکہ عملی نوعیت کی تھی اور مطمع نظر وہی ایک تھا کہ انسان کو مصائب و آلام سے نجات کیونکر حاصل ہو۔

پرہو کا خیال تھا کہ انسان کو نہ تو کسی نظریے کی حمایت کرنی چاہیے اور نہ مخالفت بلکہ خاموشی اختیار کرنا چاہیے کیونکہ پس پردہ حقیقت ہم پر کبھی منکشف نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریے کا متبادل نظریہ یا رد موجود ہے۔ چنانچہ علم مطلق کا حصول

ناممکن ہے۔

داستان فلسفہ میں تشکیک سے کلیتاً بری افلاطون کی اکیڈمی کو بھی آخر کار تشکیک نے اپنی زد میں لے لیا۔ آرسسی لاس (Arcesilaus) اکیڈمی کا پہلا سربراہ ہے جو تشکیک سے عملاً متاثر ہوا اور اکیڈمی کا نام ''جدید اکیڈمی'' (The New Academy) پڑ گیا۔

آرسسی لاس کے بعد کارنیاڈس (Carneades) اکیڈمی کا سربراہ بنا اور وہی جدید اکیڈمی کا قابل ذکر نمائندہ ہے۔ وہ ایک فطین شخص تھا اور ایتھنز کی طرف سے روم کو بھیجے جانے والے تین فلسفیوں کے سفارتی مشن میں بھی شامل تھا۔ سفارتی مشن کے معاملات نبھانے کے ساتھ ساتھ اس نے روم میں کچھ لیکچرز دینے کا بھی اہتمام کیا۔ وہ نوجوان جو یونانی ثقافت اور فکر و فلسفہ کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب تھے، جوق در جوق شامل ہوئے۔ اس نے پہلے دن جو لیکچر دیا وہ افلاطون اور ارسطو کے نظریہ عدل کے حق میں دلائل پر مبنی تھا۔ لوگ بے حد متاثر ہوئے مگر جب وہ اگلے دن لیکچر دینے کے لیے اسی سٹیج پر کھڑا ہوا تو اس نے اس دفعہ پھر دلائل کے ساتھ ہی ایک دن پہلے بیان کیے گئے نظریات کی دھجیاں اڑا دیں۔ مقصد صرف ایک تھا...... نظریہ یقین کامل کی تردید اور نظریہ تشکیک کی پشت بانی۔

خود پرہو کی ذاتی زندگی اسی تشکیک اور ذہنی تعطل کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے کے باوجود یہ سوچ کر پرے نہیں ہٹتا تھا کہ شاید گاڑی آ بھی رہی ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کے دوست تھے جو ایسے موقعوں پر اس کی جان کی حفاظت کرتے رہے۔

بادی النظر میں تشکیک ایک آسان راستہ تھا جو ان ''دانشور نما'' لوگوں کو ''دانا'' بنا کر پیش کرتا تھا جنہیں یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں تھا کہ ''کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی جان سکتا ہے۔'' جبکہ ایک سچا اور حقیقی دانا زیادہ سے زیادہ اتنی بات کہنے کی جرأت کرتا تھا کہ ''میرے خیال میں یہ بات ایسے ہی ہے، اگرچہ مجھے اس کا مکمل علم نہیں۔''

نوفلاطونیت (Neoplatonism)

نوفلاطونیت دانشِ یونان کا آخری مکتب فکر ہے اور نوفلاطونیت کا بانی فلاطینوس یا ''پلوٹی نس'' (Plotinus) یونان کا آخری عظیم فلسفی۔ اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رواقیت، اپی کیوریت اور تشکیک کے بعد ابھرنے والے اس مکتب فکر میں تقریباً پانچ سو سال کا وقفہ ہے...... نوفلاطونیت مٹتے ہوئے عظیم یونانی فلسفے کی آخری منزل ہے۔ اس کے بعد مدرسیت (Schoolisticism) کا دور آتا ہے جس میں فلسفے اور عقلی استدلال کو محض مذہبی عقائد کے جواز کے لیے استعمال کیا گیا۔

خیر، فلاطینوس ۲۰۵ عیسوی میں مصر کے شہر ''لائی کوپولس'' (Lycopolis) میں پیدا ہوا۔ وہ نسلاً رومی تھا۔ بچپن ہی میں اس کے والدین نے حصول تعلیم کے لیے اُسے اسکندریہ بھیج دیا۔ یہاں اس نے ''اموینس ساکاس'' (Ammonius Saccas) سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ ساکاس جوانی میں عیسائی تھا مگر بعد میں عیسائیت کے خلاف تقریریں کرنے لگا۔ یہی کچھ اس نے اپنے شاگردوں کو ورثہ کیا۔ کچھ مورخین فلسفہ ساکاس ہی کو نوفلاطونیت کا بانی لکھتے ہیں۔ اس لیے کہ ساکاس اپنے نظریات کو قلم بند نہیں کرتا تھا۔ یہ کام اس کے شاگرد فلاطینوس نے سرانجام دیا اور وہی نوفلاطونیت کے پہلے مبلغ کے طور پر سامنے آیا۔

بعد میں فلاطینوس نے روما میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آئے دن بیمار رہنے والے اس فلسفی کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی اور گفتگو میں بے پناہ تاثیر۔ اس کی زندگی عملاً سادہ تھی۔ وہ کم گو اور تنہائی پسند شخص تھا۔ اس کا زیادہ وقت عالمِ استغراق

میں گزرتا۔ اسی عالم استغراق نے اس کے فلسفے کو تصوف کا چولا پہنایا۔

اب اگر ہم فلاطینوس کے خیالات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک قسم کی ''تثلیث'' کا قائل ہے اور یہ خدا، روح اور عقل کی تثلیث ہے، اس تثلیث میں سب سے پہلے ذات احد (The one)، پھر عقل یا ناوس (Nous) اور آخر میں روح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذات احد سے ''ناوس'' کا صدور ہوتا ہے اور ناوس سے روح کائنات (World Soul) کا۔ اب روح کائنات سے متعدد منفرد ارواح کا صدور ہوتا ہے جو کہ مادہ سے مل کر مختلف ذی روح مخلوقات کی حیثیت سے عالم رنگ و بو میں پھیل جاتی ہے۔ اشیاء کا ہیولیٰ مادہ سے تیار ہوتا ہے اور روح اسے صورت عطا کرتی ہے۔

فلاطینوس خدا اور موجودات کے تعلق کو بیان کرنے کے لیے کسی فلسفیانہ تشریح میں نہیں پڑتا بلکہ شاعرانہ پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کائنات کو نہ تو عدم سے تخلیق کیا گیا ہے اور نہ اس کا ارتقاء ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اپنی ذات میں اس قدر مکمل ہے کہ اس کا جمال اور کمال ''چھلک'' پڑتا ہے اور کائنات پیدا ہو جاتی ہے..... ایسے ہی جیسے پھول سے خوشبو، سورج سے روشنی اور آگ سے حرارت۔

یاد رکھنا چاہیے کہ فلاطونیت کی تشکیل میں فلو یہودی (Philo, The Jew) اور اسکندر افرودیسی (Alexnder Aphrodite) کے نظریات نے قابل قدر کردار ادا کیا۔

فلو یہودی (۳۰ ق۔م۔ ۴۰ عیسوی) تورات کو تمام یونانی فلسفے کا منبع سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نہ صرف یہ کہ افلاطون اور ارسطو حضرت موسیٰ کے پیروکار تھے بلکہ تمام یونانی فلسفیوں نے حضرت موسیٰ کی تعلیمات سے استفادہ کیا۔ وہ فلسفہ یونان اور یہودیت میں تطابق پیدا کر کے یہودی مذہب کی سچائی اور عظمت ثابت کرنے کے لیے جتن کر رہا تھا۔

فلو یہودی کے تصورِ الٰہ کے مطابق خدا اس قدر بلند اور لامحدود ہے کہ عقل نہ تو اس تک رسائی حاصل کر سکتی ہے اور نہ اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ اس تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے صوفیانہ واردات یا وجدان۔

۱۹۸ عیسوی میں ایتھنز میں درس وتدریس میں مصروف نظر آنے والے اسکندر افرودیسی کو دنیا ارسطو کے شارح کے طور پر جانتی ہے، مگر اس نے ارسطو کے تصورِ خدا اور دوسرے نظریات کو مذہبی رنگ میں پیش کیا اور بلاشبہ نوفلاطونیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

نوفلاطونیت کے مکتب فکر کی بنیاد رکھنے والے فلاطینوس اور افلاطون میں بڑا فرق ہے۔ افلاطون حکیم ہے جو عقل و حکمت کو خدا تک پہنچنے کا راستہ قرار دیتا ہے جبکہ فلاطینوس صوفی ہے جس کے نزدیک تلاشِ حقیقت کے سفر میں عقل گرد راہ بن کر بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور یہ نورِ باطن ہے جو ذات حق سے وصال کے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

تو پھر فلاطینوس کی تعلیمات کو ''نوفلاطونیت'' کا نام کیوں دیا گیا اور یہ کیوں کہا گیا کہ فلاطینوس کی صورت میں افلاطون نے دوبارہ جنم لیا؟

یہ بات اس طرح سمجھ آنے والی ہے کہ جس طرح رواقیت اور اپی کیوریت کی جڑیں سقراط کی تعلیمات میں پیوست ہیں، اسی طرح نوفلاطونیت نے افلاطون کے چشمہ علم سے فیضان حاصل کیا، گو اس نے افلاطون کے فلسفے کے صرف انہیں پہلوؤں کو قابل توجہ سمجھا، جن میں تصوف کا رنگ غالب تھا اور فلاطینوس نے انہیں کو افلاطون کے نظریات کے طور پر پیش کیا۔ اور بات یہ بھی درست ہے کہ خود افلاطون کے آخری ایام کے تصورات میں فیثاغورثی تصوف کے رنگ ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔

اور پھر فلاطینوس کی سوانح اور خیالات کو عربوں تک پہنچانے والے اس کے شاگرد ''فارفریوس'' یا ''پارفری'' (Porphyry) کو نہیں بھولنا چاہیے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ فارفریوس اپنے استاد فلاطینوس اور افلاطون کی نسبت فیثا غورث کا کہیں زیادہ عاشق تھا۔ اس لیے اس نے فلاطینوس کے خیالات کی تدوین کرتے ہوئے ان پر فیثا غورثی تصوف کا رنگ چڑھا دیا۔ یہ کہانی بھی بیان کی جاتی ہے کہ خود فلاطینوس تاریخ فلسفہ یونان میں پہلا شخص ہے، جس کو اپنی زندگی میں کئی مواقع پر ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی روح ذاتِ الٰہی میں مدغم ہو گئی ہو۔

نوفلاطونیت کے ساتھ ہی دانشِ یونان کا چراغ گل ہو گیا۔ پھر یہ عظیم ورثہ مدتوں تاریخ کے تہہ خانے میں دفن رہا۔ پانچ صدیوں بعد یہ مسلمان تھے جنھوں نے اس خزانے کو اس کے مدفن سے نکالا، جھاڑا، پھونکا اور اسے اسلام کے زندگی بخش فلسفے کی حرارت اور توانائی عطا کی مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ابتدائی ایام میں مسلمانوں نے ارسطو کو اسکندر افرودیسی کے تراشے ہوئے بت میں دیکھا اور فارفریوس کی پیش کردہ متصوفانہ نوفلاطونیت کو افلاطون کا فلسفہ سمجھتے رہے۔



نظم: ''دو شکنجے''

کیا کروں چاند کی گردش پہ خیال آرائی
کہ مرے سامنے انسان کی تقدیر بھی ہے
کہکشاں میرے خیالوں کو لبھاتی ہے، مگر
میری نظروں میں روایات کی زنجیر بھی ہے

مجھ کو ازبر ہیں محبت کے کئی افسانے
لیکن احساس کے زخموں کو چھپا لوں، تو کہوں
وہ حکایت جو ستاروں نے سنائی مجھ کو
اپنی محفل کے چراغوں کو جلا لوں، تو کہوں
مُدعا ذہن میں محفوظ کیے بیٹھا ہوں
سننے والوں کو خماروں سے جگا لوں، تو کہوں
راز معلوم تو ہیں مجھ کو شہنشاہوں کے
ہم صفیروں کے دماغوں میں سما لوں، تو کہوں
شوکتِ گنبد و مینار سے آگاہ ہوں مَیں
لیکن ایوان کی بنیاد اُٹھا لوں، تو کہوں

ذوقِ پرواز بھی ہے، حسرتِ پرواز بھی ہے
ساتھ دینا ہے، مگر مجھ کو تھکے ہاروں کا
میرے قدموں کو شکنجوں میں جکڑ لیتا ہے
تیز غوغا یہ بھٹکتے ہوئے بازاروں کا
کیسے لپکوں کہ چلا آتا ہے دامن تھامے
ایک انبوہ، سسکتے ہوئے بیماروں کا
برق گامی کے میں قربان، ذرا تھم کے چلو
قافلہ رینگتا آتا ہے دل افگاروں کا

ہمسفر چُور ہیں، تم دُور اُڑے جاتے ہو
یہ رویہ تو مداوا نہیں آزاروں کا

(۱۹۴۴ء)
(''جلال و جمال''۔ احمد ندیم قاسمی)

عشق کی سات وادیوں کا سفر شیخ فریدالدین عطار کے ساتھ

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

هفت شهر عشق را عطار گشت

ما هنوز هم در خم یك کوچه ایم

چلتے ہیں اس راز کی جانب جسے رومی نے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ عشق کے وہ کون سے سات شہر ہیں جس کی سیر کرنے کی حسرت رومی جیسی ہستی کو بھی رہی اور عطار ان سات شہروں یا وادیوں سے گزر بھی گیا۔ ان سات وادیوں کی سیر کرنے کے لیے ہمیں عطار کی معروف ترین کتاب ''منطق الطیر'' کی سیر کرنی ہوگی جو کہ مرحلہ وار ان سات وادیوں سے سالک کو گزارتی ہے۔ ویسے تو عطار کی تمام کتابیں اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ ''خسرو نامہ'' کے علاوہ تمام کی تمام عشق و عرفان (تصوف) کے حوالے سے ہیں لیکن ''منطق الطیر'' کا بیان اور چاشنی کچھ اور ہے۔ اگرچہ ''تذکرہ اولیاء'' کا اپنا لطف ہے لیکن وہ نثر میں ہے۔

عطار کا نام محمد اور لقب فریدالدین تھا اور آباؤ اجداد کے پیشہ عطاری سے منسلک تھے۔ (یہاں عطاری سے مراد طلب) ان کی ولادت وشہادت کی تاریخوں میں بہت اختلاف ہے۔ کچھ ایسی تاریخیں ہیں جن سے ان کی عمر ۱۱۴ سال تک پہنچتی ہے لیکن قدرے مستند اور بہتر تاریخ پیدائش ۵۴۰ھ کہلاتی ہے لیکن مقام پیدائش میں کوئی اختلاف نہیں، نیشاور کا ایک قصبہ ''کدکن'' ہے۔ اس طرح ان کی تصانیف کی تعداد میں بھی اختلاف ہے جبکہ عطار کے تصوف کی جانب مائل ہونے اور ان کی موت کو بھی گوناگوں واقعات سے منسلک کیا جاچکا ہے۔ یہاں ہم ان مباحث میں پڑے بغیر عطار کے ایک مختصر تعارفی خاکے کے بعد ''منطق الطیر'' کی جانب جاکر عطار کی ان سات وادیوں کی سیر پر نکلیں گے جس کی طلب ہر صوفی و سالک کو رہی ہے۔ عطار اپنے وقت کے معروف طبیب تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ

به دار و خانه پانصد شخص بودند

که در هر روز نبضم می نمودند

یعنی میرے دارو خانہ میں روز پانچ سو افراد آتے اور مجھے اپنی نبض دکھاتے۔

عطار کے آثار میں ان کے نثری شاہکار ''تذکرہ اولیاء'' کے علاوہ باقی تمام شعری تصانیف ہیں جن میں ان کی مثنویاں ''منطق الطیر''، ''الٰہی نامہ''، ''مصیبت نامہ'' اور ''اسرار نامہ'' شامل ہیں جو بلا کسی شک وشبہ کے عطار ہی کی ہیں جبکہ ''پند نامہ'' کی بھی بہت حد تک تصدیق ہوئی ہے لیکن خسرو نامہ، اشتر نامہ، جواہر الذات کو عطار کی دیگر مثنویوں کے برابر مضامین اور اسلوب کے

فرق کی وجہ سے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ مظہر العجائب، لسان الغیب، کنز الاسرار، مفتاح الفتوح اور وصیت نامہ کے بارے میں اکثر محققین کی رائے ہے کہ یہ مدتوں بعد ان سے منسوب کی جا چکی ہیں۔ بہر حال اس بحث کو کسی دوسری فرصت کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ عطار کا قصیدہ اور غزل پر مشتمل دیوان بھی موجود ہے اور ایک مجموعہ رباعیات بھی ''مختار نامہ'' کے نام سے عطار کا عطیہ ہے۔

عطار کی مثنویوں کا انداز بیان قصص و حکایات پر استوار ہے جن میں موضوعات اور عنوانات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے لیکن منطق الطیر کی جانب بڑھنے سے پہلے ایک آدھ افسانوی قصے جو عطار کی زندگی سے منسوب ہیں۔

کہتے ہیں کہ عطار اپنے دواخانے میں علاج و معالجہ کے کام میں مصروف تھا کہ اس دوران ایک فقیر داخل ہوا لیکن عطار نے بے اعتنائی برتتے ہوئے اس کو توجہ نہیں دی تو فقیر نے پوچھا: ''تم کس طرح جان عزرائیل کے حوالے کروگے؟''

عطار نے جواباً پوچھا: ''تم کس طرح جاں دوگے؟''

فقیر کے ہاتھ میں گدائی کا جو کاسہ تھا، اسے سر کے نیچے رکھ کر رو بہ قبلہ ہو کر کہا: ''اس طرح۔'' اور جان دے بیٹھا۔

یہی لمحہ تھا کہ عطار کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ اپنی متاع، فقیروں اور محتاجوں کے حوالے کرنے کے احکامات جاری کرتے ہیں اور خود خانقاہ رکن الدین اکاف میں جا پہنچتے ہیں۔

جبکہ ان کی موت کے واقعہ کو دولت شاہ سمرقندی وغیرہ یوں بیان کرتے ہیں کہ نیشاپور میں مغلوں (چنگیز خاں) کے قتل عام کے دوران ایک سپاہی عطار کو گرفتار کیے لے جا رہا ہوتا ہے کہ راستہ میں ان کا ایک مرید انہیں پہچاننے کے بعد سپاہی کو رقم کی پیشکش کر کے بدلے میں عطار کو طلب کرتا ہے لیکن عطار فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ ''میری قیمت یہ نہیں ہے۔'' سپاہی عطار کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور کچھ فاصلے پر ایک اور شخص بھی عطار کو پہچان کر سپاہی کو رقم کی پیشکش کرتا ہے لیکن عطار دوبارہ کہہ اٹھتے ہیں ''میری قیمت یہ نہیں ہے۔'' سپاہی پھر آگے بڑھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک دیہاتی گدھے پر گھاس پھونس یا بھوسہ لادے آ رہا ہوتا ہے۔ عطار کو پہچان کر سپاہی سے ان کی رہائی کی درخواست کرتا ہے۔ سپاہی بدلے میں مال طلب کرتا ہے تو دیہاتی کہتا ہے کہ گھاس کا یہ بستہ دوں گا تو عطار فوراً سپاہی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ''بیچ ڈالو کہ میری قیمت یہی ہے۔'' سپاہی طیش میں آ کر تلوار کے وار سے عطار کی گردن اڑاتا ہے تو اسی لمحے عطار اپنا سر مٹی سے اٹھاتے ہوئے گردن پر رکھ کر چند شعر کہتا ہوا چل پڑتا ہے۔ جب وہ منظومہ ''بی سرنامہ'' ختم ہوتا ہے تو عطار گر کر جان دے بیٹھتا ہے۔

اگرچہ ان واقعات پر زیادہ تکیہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہاں صوفیا کی اختیاری موت اور زندگی کی ایک طویل فہرست اور تاریخ کی جانب دھیان چلا جاتا ہے۔ عطار کی شہادت یا موت کی نسبتاً درست تاریخ ۶۱۸ ہجری بتائی جاتی ہے۔

منطق الطیر تقریباً ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل مثنوی ہے جسے ''حماسہ عرفانی'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ فارسی کے معروف ترین شاہکاروں میں سے ایک ہے۔ جس میں عطار پرندوں کی زبانی عرفان و تصوف کے مراحل کی تفصیل بیان کرتے ہیں جس میں پرندے آپس میں بیٹھ کر اپنے بادشاہ یا سردار کی طلب پر گفتگو کرتے ہیں اور بالآخر طے پاتا ہے کہ اس بادشاہ کی تلاش میں نکلا جائے۔ بادشاہ کا پتہ ''ہدہد'' بتاتا ہے جو ایک جہاندیدہ پرندہ ہے اور کہتا ہے کہ ہم سب کا بادشاہ ''سیمرغ'' ہے جو کوہ قاف میں سکونت پذیر ہے اور ان تک پہنچنے کے لیے ہمیں سات وادیوں یا سات مقامات سے ہو کر جانا ہوگا جہاں راستے میں ہر طرح کے مصائب و آلام کا سامنا ہوگا اور ان سات وادیوں کی ترتیب یوں ہے۔ (۱) طلب (۲) عشق (۳) معرفت (۴) استغناء

(۵) توحید (۶) حیرت (۷) فقر و غنا۔

ان مراحل کا ذکر صوفیا کی دیگر کتابوں میں آتا ہے لیکن کہیں کہیں ذرا مختلف ہے۔

جبکہ اس مثنوی میں فارسی ادب کی اساطیر کے اثرات بھی نظر آتے ہیں جیسے ''ہفت خواں رستم'' یا ''سیمرغ اور کوہ قاف'' جو ہمیں ابن سینا اور شیخ اشراق شہاب الدین سہروردی کے ہاں بھی نظر آتے ہیں جبکہ منطق الطیر کا خاکہ اس علامتی قصے سے ماخوذ لگتا ہے جو محمود اور احمد غزالی سے روایت کیا جا چکا ہے جبکہ قرآن کا بھی واضح اثر حضرت سلیمان کے قصے کی شکل میں نظر آتا ہے جہاں ہدہد کا کردار اہم تھا اور حضرت سلیمان پرندوں کی بولی جانتے تھے جبکہ خود منطق الطیر قرآن کے (سورہ ۲۷/۱۶) سے اقتباس شدہ ہے۔

کوہ قاف کو پہلے کوہ البرز کہا جاتا تھا۔ اس پہاڑ نے پورے عالم کا احاطہ کر رکھا ہے اور زمرد سے بنا ہے۔ آسمان کی رنگت اسی سے منعکس ہے۔ اس پہاڑ میں چاند، سورج اور ستارے نہیں ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر اسے نویں آسمان سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کیونکہ نویں آسمان نے بھی سارے عالم محسوس کا احاطہ کر رکھا ہے اور دیگر آسمانوں کے مقابلے میں وہاں بھی ستارے نہیں ہیں۔ سہروردی کوہ قاف کو یوں پیش کرتے ہیں کہ ''کوہ قاف جہاں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور گیارہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ جب تم (سالک) بند سے رہائی پاؤ گے تو وہاں پہنچو گے کیونکہ تم وہیں سے لائے گئے ہو.....''

کوہ قاف کی اس انتہائی مختصر وضاحت کے بعد سیمرغ کو بھی اجمالی طور پر دیکھتے ہیں کہ کیا شے ہے۔

سیمرغ ایک اساطیری کردار ہے جو اوستا، شاہنامہ فردوسی اور رسالۃ الطیر غزالی کے بعد عرفانی ادب میں راہ پاتا ہے جبکہ غزالی اور نصر اللہ مجلسی نے عربی سے ترجموں میں ''ہما'' کو سیمرغ لکھا ہے۔ یہ پرندہ مابعد الطبیعی صفات و کیفیات رکھنے کے باعث عالم کی بالاترین اور بلند ترین قوت گردانا جاتا ہے۔ سہروردی کے بقول وہ عالم افلاک میں خلیفہ خدا ہے اور دوسرے پرندے بھی مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے خود کو اس کے مرتبہ تک پہنچا سکتے ہیں۔ شاہنامہ کے مطابق اس کا آشیاں کوہ قاف کے ایک درخت پر ہے۔

ہم منطق الطیر کی ہفت وادیوں کی سیر کا ذکر کر رہے تھے جہاں ہدہد کی تقریر کے بعد اکثر پرندے سفر کی صعوبتوں اور سختیوں کا ذکر سن کر اس سفر سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر بیٹھتے ہیں۔ ہدہد ایک ایک کو قائل کرتے ہوئے تیار کرتا ہے اور یوں لاکھوں پرندوں کا قافلہ تشکیل پاتا ہے لیکن یہاں سے سیمرغ تک کا سفر کس کی رہبری میں طے ہو، اس سوال کے حل کے لیے قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور قرعہ فال ہدہد کے نام نکل آتا ہے جو انسان کے اس قرعہ سے بے حد مشابہت رکھتا ہے جس کا ذکر قرآن میں صریحاً آیا ہے جس کے بارے میں حافظ یوں فرماتے ہیں کہ

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اور پھر یہ قافلہ سیمرغ کی جانب عازم سفر ہو جاتا ہے لیکن سفر ہے کہ کٹتا ہی نہیں، جتنا جتنا سفر طے ہوتا ہے مشکلات بڑھتی جاتی ہیں۔ پرندے سیمرغ سے پوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ ابھی تو اول سفر ہے۔ چلتے چلتے پرندوں کے حوصلے پست ہوتے ہیں اور ان کے دل میں خوف و ناامیدی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ابھی سیمرغ کی کوئی خبر نہیں تھی۔

راہ می دیدند پایان نا پدید

درد می دیدند درمان ناپدید
چون بتسر سیدند آن مرغان زراہ
جمع گشتند آن همه یك جایگاہ

یعنی انہوں نے جب راستے کے اختتام کے آثار نہیں دیکھے تو اکٹھے ہو کر ہد ہد کو کہا کہ ذرا ہمارے حوصلے بڑھانے کے لیے تقریر کرو۔ ہد ہد نے کسی بھی اچھے برے مرحلے کو چھپائے بغیر ایک دلپذیر گفتگو کی اور

گفت مارا هفت وادی در رہ است
چون گذشتی هفت وادی درگه است
وانیامد درجهان زین راہ کس
نیست از فرسنگ آن آگاہ کس

یعنی ہمیں سات وادیوں کا سامنا ہے، ان سے گزرنے کے بعد سیمرغ کی درگاہ ہے لیکن کسی کو بھی ان راستوں کے مراحل اور فاصلوں کی خبر نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی کبھی وہاں سے لوٹ کر نہیں آیا جو احوال بتاتا۔

لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس وادی میں بلائیں بہت ہیں۔ طوفانی سمندروں اور شعلے بھڑکاتے صحراؤں سے سامنا ہوگا جس میں بھوک، پیاس، گرمی، سردی یعنی ہر طرح کے رنج سہنے ہوں گے۔ بے شمار ایسے ہیں جو ان وادیوں میں کھو چکے ہیں اور ان کی خبر تک نہیں۔ (یہ اپنی جگہ ایک عرفانی بحث ہے جس کی تفصیل میں یہاں نہیں جایا جا سکتا) اس کے بعد ہد ہد ان سات وادیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے:

پہلی وادی:

چون فرو آئی به وادیؔ طلب
پیشت آیدهر زمانی صد تعب
صد بلا درهر نفس این جا بود
طوطی گردوں مگس اینجا بود
ملك اینجا بایدت انداختن
ملك اینجا بایدت درباختن

طلب تصوف میں پہلا گام اور وہ کیفیت جو سالک کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسے معرفت کی جستجو پر اکساتی ہے جبکہ مندرجہ بالا اشعار میں ہد ہد کہتا ہے کہ جب تو طلب کی وادی میں اتر آئے تو ہر لمحے تیرا سامنا مشکلات اور سو طرح کی بلاؤں سے ہوگا، یہاں پر ملک و مال سے دستبرداری اولین شرط ہے۔

دوسری وادی:

بعد ازین وادی عشق آید پدید
غرق آتش شد کسی کانجا رسید
عاشق آن باشد که چون آتش بود

گرم رو سوزندہ و سرکش بود
عاقبت اندیش نبود یک زمان
درکشد خوش خوش بر آتش صد جہان

اس کے بعد عشق کی وادی آئے گی جہاں پہنچ کر آگ میں یوں مستغرق ہونا پڑتا ہے کہ سالک بذات خود گرم رو، جلا دینے والا اور سرکش (آلائش دنیوی کے مقابلے میں) ہوگا اور کسی بھی خطرے انجام و نتیجے کی پروا کیے بغیر اپنا سب کچھ پھونک ڈالے گا۔

تیسری وادی:

بعد ازان بنمایدت پیش نظر
معرفت را وادی بے پا و سر
چون بتابد آفتاب معرفت
از سپہر این رہ عالی صفت
ہریکی بیناشود بر قدر خویش
باز یابد در حقیقت صدر خویش

اس کے بعد تمہاری آنکھوں کے آگے ایک نئی بے سر و پا وادی ہوگی جسے معرفت کہتے ہیں۔ وہاں آگاہی اور شناخت کے سورج کے طلوع کے ساتھ سالک ایک حقیقی بینائی پا جائے گا اور اپنی صلاحیت سے روشناس ہوگا اور اس کے بعد

چوتھی وادی:

بعد ازین وادی استغنا بود
نہ درو دعویٰ ونہ معنا بود
ہشت جنت نیز اینجا مردہ ایست
ہفت دوزخ ہمچویخ افسردہ ایست
گردرین دریا ہزاران جان فتاد
شبنمی در بحر بے پایان فتاد

اس کے بعد بے نیازی کی وہ وادی آئے گی جہاں کوئی ''معنی'' اور ''توئی'' کے دعویدار نہیں ہوں گے، نہ ہی جنت اور دوزخ کے سود و زیاں کا حرص و طمع کا شائبہ ہوگا اور جو یہاں پہنچے گا وہ اپنے آپ کو سمندر میں قطرے سے زیادہ محسوس نہیں کرے گا یعنی ایک ایسی بے نیازی کہ جس میں سالک کی اپنی ذات کو ہدف بنایا جائے گا۔

پانچویں وادی:

بعد ازین وادی توحید آیدت
منزل تفرید و تجرید آیدت
روی ہا چون زین بیابان در کنند
جملہ سر ازیک گریبان بر کنند

گر بسی بینی عدد کراندکی
آن یکی باشد در این ره دریکی

اس کے بعد توحید کی وادی کا سفر درپیش ہوگا جہاں تفرید وتجرید اصل ہوں گے۔ تفرید وہ صوفیانہ اصطلاح ہے جہاں یگانگت آتی ہے اور حق تحقق کی تلاش کی محنت درپیش ہوتی ہے اور یوں جیسے حق سالک کے عین قوی میں ڈھل جائے جبکہ ''تجرید'' صوفیاء کی اصطلاح میں قلب سالک کا غیر خدا سے یکسر خالی ہونے کا مرحلہ ہے۔ اس بیابان کا سفر طے کرنے کے بعد کثرت وحدت میں بدل جائے گی۔ اعداد جتنے بھی ہوں گے وہ سب ایک ہی نظر آئیں گے۔

چھٹی وادی:

بعد ازین وادی حیرت آیدت
کار دائم درد و حسرت آیدت
مرد حیران چون رسد این جایگاه
در تحیر مانده و گم کرده را
هرچه زد توحید برجانش رقم
جمله گم گردد ازوگم نیرهم

حیرت صوفیاء کی اصطلاح میں وہ مرحلہ ہے جب عرفا کے قلوب پر حضور وتفکر کی حالت منکشف ہوتی ہے اور وہ اس وادی میں اتر کر ایک گم کردہ راہ کی مانند سب کچھ میں تحیر دیکھتا ہے اور راہ بھٹکوں کی طرح سرگردان وحیران اپنے داخل کی وادی میں پھرتا ہے اور توحید سے جو بھی اس پر اترے گا، وہ آن ہی میں اس کی حیرت کا لقمہ ہو کر گم در گم والی کیفیت بنا تا رہے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر سالک خود کی نفی کا سودا لے کر بیٹھ جاتا ہے اور خود کو کہیں نہیں پاتا، بجز حق کے اور منصور بن حلاج والے انکشافات کے جانب بڑھنے لگتا ہے، اگرچہ ایک نہ ہونے کا درد بھی کھائے جاتا ہے۔

ساتویں وادی:

بعد ازین وادی فقر است و فنا
کئی بود اینجا سخن گفتن روا
عین وادی فراموشی بود
لنگی و کری و بی هوشی بود
صد هزاران سایۂ جاوید تو
گم شده بینی زیك خورشید تو

اب ہدہد انہیں منزل کا نشان بتانے لگتا ہے یعنی اس کے بعد آخری وادی فقر وفنا کی وادی آ پہنچے گی جو نزدیک ترین اصطلاحیں ہیں، فنا تو واضح ہے یعنی اوصاف مذمومہ کی نابودی لیکن فقر سے بات مزید واضح ہو جاتی ہے جو صوفیا کے نزدیک اسی ''فنا فی اللہ'' والے مرحلے کی اصطلاح ہے یعنی سالک ظاہری ہستی سے نیستی کی جانب جاتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی صفات سے باہر نکل آتا ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے جہاں پیر کامل یا مرد کامل کی اصطلاح نظر آتی ہے۔ عطار یہ بات ہدہد کی زبانی دہراتا ہے کہ اس وادی میں

بولنا منع ہے (کیونکہ بولنا "میں" کی علامت ہے) یہ خود فراموشی کی وادی ہے۔ با اصطلاح یہاں بے چارگی و بے بسی (ظاہری و مادی، فردی وجود کی) ہی اصل سالک ہے۔ یہاں لاکھوں جانوں کی فنائیں ہوں گی جیسے سورج کی روشنی میں سایوں کی نابودی۔ اور جو ہوگا وہ وہی ایک، وہی اصل، وہی "ہو"۔

ان تمام مراحل سے گزرتے گزرتے ان لاکھوں پرندوں میں سے، ہر وادی پر کچھ نہ کچھ پرندے بھٹکتے، پلٹتے، مرتے اور پشیمان ہوتے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے ہر آنے والی وادی میں تعداد کم ہو جاتی ہے اور پھر

از همه مرغ اندکی آنجا رسید
از هزاران کس یکی آنجا رسید

بالآخر کیا دیکھتے ہیں کہ صرف چند تھکے ماندے بے بال و پر اور نجور پرندے کوہ قاف تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سوائے خیرہ کرنے والی روشنی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پرندے آس پاس دیکھتے ہیں تو کوئی سیمرغ، نہ سیمرغ کا نام و نشان نظر آتا ہے تو

جمله گفتند آمدیم این جایگاه
تابود سیمرغ مارا پادشاه
ما همه سر گشتگان درگه یم
بی دلان و بی قراران رهیم
مدتی شد تادر این راه آمدیم
از هزاران سی به درگاه آمدیم
بر امید بادشاه از راه دور
تا بود مارا درین حضرت حضور

سب نے کہا کہ ہم تو اپنے بادشاہ سیمرغ کی طلب میں یہاں تک آئے ہیں۔ ہم سب اس کی درگاہ کے دیوانے اور بے قرار ہیں۔ ایک مدت کے طویل سفر کے بعد ہزاروں میں سے صرف تیس پرندے یہاں پہنچے ہیں تاکہ بادشاہ کے حضور حاضر ہوں۔ مزید انتظار کا فائدہ نہیں تھا، سیمرغ کا نام و نشان بھی نہیں ملا۔ پرندوں پر مایوسی اور تھکن کی حالت میں نیند کا سا غلبہ ہوا اور اسی حالت میں آواز آئی کہ تم "سی مرغ" ہی دراصل ہی مرغ ہو۔ وہ خوشی سے مچل گئے اور ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی۔

چون نگه کردند آن سی مرغ زود
بی شك این سی مرغ آن سیمرغ بود
در تحیر جمله سر گردان شدند
باز از نوعی دگر حیران شدند
خویش را دیدند سیمرغ تمام
بود خود سیمرغ سی مرغ تمام

تب کیا دیکھا کہ وہ "سی مرغ" ہی دراصل "سیمرغ" ہیں۔ تمام ایک نئی حیرت میں مبتلا ہو گئے یعنی ان کو از سر نو ایک ایسی تشکیل ملی جس میں اب وہ خود ہی سیمرغ بن کر ایک تھے۔

اس قصے کو یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ہر ایک وادی میں بلا کے معنی خیز اشعار ہیں، جن کے لیے ایک مقالے کا دامن انتہائی تنگ ہے اور منطق الطیر کا شاید دو تہائی حصہ دیگر ایسی حکایات پر مشتمل ہے جن کا براہ راست کوئی تعلق اس قصے سے نہیں بنتا۔ ہر ایک جداگانہ دریائے معنی لیے ہے جن کی فہم کے لیے اور طیور کے قصے سے بھی پوری طرح بہرہ ور ہونے کے لیے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں، سوا اس کے کہ ''منطق الطیر'' کا مطالعہ کریں۔ یہاں ایک عام حکایت بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔

گفت چون آتش درو افروختند
جسم آن حلاج کلی سوختند
عاشقی آمد مگر چوبی بدست
برسر آن مشت خاکستر نشست
پس زبان بگشاد همچون آتشی
باز می شورید خاکستر خوشی
وانگهی می گفت بر گوید راست
زانکه می زد او انا الحق او کجاست؟
آنچه گفتی و آنچه بشنیدی همه
وانچه دانستی تو و دیدی همه
آن همه جز اول افسانه نیست
محو شو چون جای این ویرانه نیست
اصل باید اصل مستغنی و پاك
گر بود فرع و اگر نبود چه باك؟
هست خورشید حقیقی بر دوام
گو نه ذره مان، نه سایه والسلام

کتابیات:

۱۔ منطق الطیر، بہ اہتمام: دکتر احمد رنجبر، انتشارات اساطیر تہران، چاپ دوم، زمستان ۱۳۶۹ شمسی۔
۲۔ منطق الطیر، با مقدمہ و تصحیح حمید حمید، نشر طلوع، تہرن بونت چاپ سوم، تابستان ۱۳۸۱ شمسی۔
۳۔ با کاروان حلہ، دکتر عبدالحسین زرکوب، انتشارات علمی، تہران، چاپ نہم، پائیز ۱۳۷۴ شمسی۔
۴۔ شعر صوفیانہ فارسی، یوھانس ذوبروین، ترجمہ دکتر مجد الدین کیوانی، نشر مرکز، تہران، چاپ اول ۱۳۷۸ شمسی۔
۵۔ رمز و داستانہای رمز در ادب فارسی، دکتر تقی پور نامداریان، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران چاپ چہارم ۱۳۷۵ شمسی۔
۶۔ فرہنگ کاربرد آیات و روایات در اشعار عطار نیشاپوری، تالیف: دکتر رضا اشرف زادہ، ادارہ کل فرہنگ ارشاد اسلامی، خراسان، چاپ اول، زمستان ۱۳۷۳ شمسی۔

..........☆..........

آصف ثاقب کی غزل

ہارون الرشید

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مشترکہ کلچر وجود میں آیا۔ اس تہذیب کی سب سے بڑی دین اردو زبان ہے۔ اس کی ترقی اور فروغ میں ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگوں کی کاوشیں شامل ہیں۔ غزل اردو ادب کی سب سے بڑی اور مقبول ترین صنف ہے۔

نظم اور نثر عموماً پڑھے لکھے طبقے تک محدود رہتی ہے لیکن غزل نے مشاعروں، فلموں، ڈراموں، موسیقی کی محفلوں، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے جس تیزی کے ساتھ کروڑوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں سے بے بہرہ لوگ بھی اس کے شیدائی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ لوگ بھی اردو شاعری سے محبت کرتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ برصغیر کی تمام زبانوں کے اصناف ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت اردو غزل کو حاصل ہے۔ یہ بھی نہایت دلچسپ امر ہے کہ اس خطے میں کوئی ایسی زبان نہیں ہے جس نے اس صنف میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ بقول رشید احمد صدیقی ''غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔''

غزل محض شاعری تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماری تہذیب اور زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، اسے محض حسن و عشق کی کہانیوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا، اس نے ہر عہد کی تہذیب اور اس کے عمومی مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ہماری پچھلی تین چار صدیوں کی تہذیبی زندگی کے ارتقاء کے گہرے نقوش اردو غزل میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ ہماری غزل میں حسن و عشق کے نازک جذبات کی نیرنگیاں بھی نظر آتی ہیں اور سیاسی و سماجی حالات کے انتشار کی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ہماری غزل میں سرمایہ داری اور سامراجیت کے خلاف بھی مزاحمت موجود ہے اور حب الوطنی کی گہری جڑیں بھی موجود ہیں۔ ہماری غزل میں فردا کے حوالے سے بھی بشارتیں دی گئی ہیں، یہی وسعت اور ہمہ گیریت غزل کی مقبولیت کا راز بھی ہے۔

جب پاکستان ۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر ابھرا تو اردو ادیبوں اور شاعروں کو ایک نئے سیاسی نظام کے لیے جدوجہد کرنا تھی مگر بدقسمتی سے سیاسی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر علاقائی تضادات بڑھتے گئے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس سے قبل فسادات کی المناک صورتحال اور مذہبی منافرت کی بنا پر قتل و غارت نے پاکستانی شعراء کے شعور اور جذبات کو متاثر کیا۔ قومی سطح پر مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں کے اثرات سے بھی پاکستانی غزل کو نیا موضوعاتی سرمایہ ملا۔ سیاسی حوالوں سے مسئلہ افغانستان، بھارت کے ساتھ کشیدہ تعلقات اور کئی دوسرے قومی اور بین الاقوامی مسائل آج بھی ہمارے لیے دردِ سر بنے

ہوئے ہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایسے میں شعرا کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے؟

ممتاز نقاد سعادت سعید اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "۱۹۴۷ء کے بعد سے لے کر آج تک پاکستانی شاعروں نے جو کچھ دیکھا اور جو سنا، اسے افسانہ نہیں سمجھا، حقیقت جانا اور اسے لکھا۔ انہوں نے وداعِ وطن کے گیت گائے۔ انسانی عظمت کی بحالی کے خواب دیکھے، سماجی سیٹ اپ کو بدلنے کے لیے قلمی کوششیں بھی کیں، اقتصادی ناہمواریوں کے خاتمے کے لیے شور بھی مچایا۔ آزاد اور تازہ ثقافت کی تشکیل کی تمناؤں کا اظہار کیا۔ شکستِ ذات سے لے کر شکستِ تمنا تک انہوں نے کئی قسم کی شکستوں کا سامنا کیا۔ ویت نام، کوریا، فلسطین، افریقہ، کشمیر اور لاطینی امریکہ میں ہونے والے مظالم ان کی ذات کا حصہ بنے۔"

ایک اور جگہ پر وہ کہتے ہیں کہ "بے اعتقادی، تشکیک اور آزاد خیالی کے رویے پاکستانی غزل کا حصہ بنے۔ صنعتی اخلاقیات کے پھیلاؤ کے نتیجے میں ان کی غزلوں کے معنوی منظرنامے تبدیل ہوئے۔ تنہائی، انفرادیت پسندی، خود غرضی اور سرمایہ پرستی کے رجحانات کو فروغ ملا۔ اقدارِ اعلیٰ سے روگردانی وغیرہ کے رویوں سے اردو غزل مملو ہوئی۔ حزن و ملال اور درد و غم کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہمارے بعض غزل گو شعرا کے ہاں سماج کی تبدیلی کے خیالات بھی قلم بند ہوئے۔ غزل ہماری ادبی تاریخ کا نوادرات سے مزین ایسا عظیم خزینہ ہے جس کے ایک ایک چمکتے گوہر کے بطن میں زندگی اور انسانی لاشعور کے لازوال نقوش پوشیدہ ہیں۔ آزاد نظم کے پرستاروں اور مغربی شعری جمالیات و اصناف کے رسیا نقادوں نے اسی "وحشی" پر بلند و بالا مچانوں پر سے تیر چلائے، سنگ باری کی، کارتوس داغے مگر آخر انہیں اپنی ناکامی کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ "وحشی" آج بھی تازہ دم ہے۔ ہمارے ادبی رمناؤں اور میدانوں میں آزاد گھوم ہی نہیں رہا، روز بروز طاقت بھی پکڑ رہا ہے۔"

برصغیر کی تقسیم کے بعد کئی اہم شعرا نے اردو غزل کے کارواں کو متحرک رکھنے اور آگے بڑھانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور ظلم و جبر کی طاقتوں کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ ان شعرا کے کلام میں حوصلہ مندی، جرأت، جدوجہد کا جذبہ اور آزادی کو برقرار رکھنے کی تڑپ کے عناصر کلاسیکی انداز میں نظر آتے ہیں۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی کے بعد غزل کے منظرنامے پر شکیب جلالی، ظفر اقبال، احمد مشتاق، سلیم احمد، اقبال ساجد، تنویر سپرا، ثروت حسین، خالد احمد اور جمال احسانی جیسے شاعر نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی غزل سے ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔

۱۹۶۳ء میں "فنون" کا آغاز ہوا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک ایسے علمی و ادبی جریدے کی داغ بیل ڈالی جس نے پچھلے پینتالیس برسوں میں نہ صرف بے شمار غزل گوؤں کو متعارف کروایا بلکہ ان کے فن کو مسلسل آگے بڑھا کر ان کے لیے شہرت کے دروازے کھولے آج کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، موجودہ دور کے اکثر غزل گو شعرا کو نام دینے میں "فنون" کا کردار نہایت کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ "فنون" نے طویل عرصے کی ریاضت کے بعد لکھنے والوں کی جو نسل تیار کی ہے، اس کا کریڈٹ یقیناً اکیلے احمد ندیم قاسمی کو جاتا ہے۔

ستر کی دہائی کے دوران "فنون" میں باقاعدگی سے چھپنے والوں میں غزل کا ایک اہم نام آصف ثاقب بھی ہے جو پچھلے پچاس سال سے غزل کی آبرو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی غزل میں کلاسیکی رنگ بھی نظر آتا ہے اور جدید عہد کی بوقلمونیاں بھی اپنی چھب دکھلاتی ہیں، آصف ثاقب کی غزل کے متعلق ان کے شعری مجموعے "ورکنار" میں ایک مضمون میں احمد ندیم قاسمی رقمطراز ہیں:

"ہزارہ کے آصف ثاقب کی غزل پڑھیے، نظم پڑھیے، نثر پڑھیے۔ مجال ہے جو ان کی ادبی تخلیقات میں کسی بڑے

غزل گو، کسی بڑے نظم نگار کے اثرات کا دور دراز کا سراغ مل سکے۔ ان کی تخلیق اپنے دور کے ایک ہزار اہل قلم سے بھی الگ پہچانی جا سکتی ہے۔'' وہ آگے کہتے ہیں ''آصف ثاقب غزل کی صرف مثبت روایات کا احترام ہی نہیں کرتے بلکہ عصری تقاضوں کے آئینے بھی جا بجا سجا دیتے ہیں۔ وہ اردو کے ایک ایسے بالغ نظر شاعر ہیں کہ نہ انفرادیت کے اظہار سے ڈرتے ہیں اور نہ پرانی لفظیات کے دائروں میں گھومنے کے قائل ہیں۔ وہ آج کل کی عام روش سے سراسر مختلف اور مثبت طور پر مختلف شاعر ہیں۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ان کے اشعار کی گہرائی میں جائیں اور ان کے اشعار کی معنویت اور وسعت پر غور کریں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے قرار واقعی مختلف اور الگ مزاج رکھتے ہیں۔

لکیروں میں خیالوں کی نئی تشکیل ہے ثاقب
سنا ہے سوکھے پتوں پر ترا دیوان لکھا ہے

مطالعے میں جہاں درد کا اثر آیا
لہو کتاب کے اوراق پر اتر آیا

دریا کی ہر سوج کے اوپر میرا سر ممتاز ہوا
چاروں طرف طوفاں کی موجیں، پرچم لے کر نکلی ہیں

آصف ثاقب کی غزل دیکھنے میں بڑی آسان اور سہل لگتی ہے مگر ایسی ہے نہیں، اس کی پرتیں کھولنے کے لیے خاصی مشقت کرنا پڑتی ہے۔ میں پچھلے کئی برسوں سے بڑی احتیاط سے ان کی غزلیں دیکھ رہا ہوں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی ہر غزل کا اپنا ایک انداز اور نشہ ہے۔ بعض اوقات میں ان کے اشعار کی گہرائی دیکھ کے ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہوں۔

ان کا اولین شعری مجموعہ ''در کنار'' جو آج سے تقریباً تین برس پہلے منصۂ شہود پر آیا، اس میں ان کی صرف ۵۳ غزلیں شامل ہیں جو کما حقہ، ان کی غزل کے مزاج کا اجمالی احاطہ بھی نہیں کرتیں اور میرے جیسا طفل مکتب جسے ان کی ہر غزل بے حد عزیز ہے، اس الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ ان کی غزل کے شعری نظام کو کس طرح صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا جائے۔ آصف ثاقب اب تک بقول ان کے ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ غزلیں کہہ چکے ہیں۔ وہ زود گو ہیں مگر اس کے باوجود ان کی غزل کا معیار متاثر نہیں ہوتا۔ آصف ثاقب کی تقریباً سو کے قریب غزلیں ''فنون'' کی زینت بن چکی ہیں۔ علاوہ ازیں شاید ہی کوئی ایسا ادبی جریدہ ہوگا جہاں وہ نہ چھپتے ہوں۔

آصف ثاقب ضلع ایبٹ آباد کے ایک چھوٹے سے نہایت خوبصورت پہاڑی گاؤں ''بوئی'' میں رہتے ہیں جہاں کا سفر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر مقیم ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار میں Nature کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ٹھنڈیانی اور نتھیا گلی جیسے قدرتی مناظر سے آراستہ اور دیودار کے درختوں سے اٹے ہوئے علاقے ان کے گاؤں کے عقب میں واقع ہیں اور وہاں کا قدرتی حسن ان کی شاعری میں اکثر مقامات پر چھب دکھلاتا ہوا ملتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی ''در کنار'' میں ان کی شاعری پر لکھے ہوئے مضمون میں کہتے ہیں ''مقامیت سے حاصل کردہ الہامی

کیفیت آصف ثاقب کی غزلوں اور نظموں میں بکھری ہوئی ہے اور یاد رہے کہ مقامیت ہماری پہچان ہے۔'' ان کی غزلوں میں مقامیت کا رنگ تقریباً ہر دوسری غزل کے ایک آدھ شعر میں ملتا ہے۔

یہ خشک پتے تو گھر میں اترتے رہتے ہیں
فلک سے مجھ پہ صحیفے اترتے رہتے ہیں

پرکھوں کے سارے پیڑ ضرورت سے کٹ گئے
پتوں کا رنگ میری حویلی پہ آ گیا

اپنا احوال درختوں ہی سے کہہ ڈالوں گا
کون آتا ہے یہاں پوچھنے والا بن کر

آصف ثاقب کا شعر و سخن سے اخلاص اور محبت مثالی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ایک ایسے مقام پر رہ کر ادبی سرکٹ میں اپنے آپ کو مسلسل متحرک رکھنا جہاں کا سفر کرنے کے لیے ایک گاڑی بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود وطن عزیز میں چھپنے والا ہر طرح کا ادبی اور علمی لٹریچر ان تک پہنچتا ہے۔ جدید الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی سہولتوں سے محروم ہونے کے باوجود تازہ ادب ان کے پاس موجود ہوتا ہے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور اسی وسیع مطالعے کا عرق ان کی غزلوں میں بھی لہریں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ آصف ثاقب عموماً مطالعے میں مصروف ہوتے ہوئے بھی ملنے والوں سے شگفتہ باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔

بڑی محتاط ہے اس کی طبیعت
مکاں سے پہلے دروازہ بنائے

بے دلی بے حسی کے پیکر ہوں
جگ میں شاعر نہ ہوں تو پتھر ہوں

آصف ثاقب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ شاعری کے علاوہ وہ موسیقی، کھیلوں اور فنون لطیفہ پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ کتابوں اور جرائد کے ساتھ ساتھ وہ روزاخبار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی سطح پر رونما ہونے والے حالات وواقعات کے بارے میں انہیں بخوبی علم ہوتا ہے۔ دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیاں بھی ان سے مخفی نہیں ہیں۔ وہ انہیں بھی بغور دیکھتے ہیں، اس لیے ان کی غزل میں ہر قسم کے موضوعات کے حوالے سے اشعار بآسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ امریکہ اور استعماری طاقتوں کی مسلسل مداخلت اور دراندازی سے ہمارا خطہ جس عدم استحکام کا شکار ہے، اسے بھی انہوں نے نہایت دردمندی سے محسوس کیا ہے۔ ایک شاعر ہی ظاہر ہے سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔

مرے مکان میں بھونچال آتے رہتے ہیں
تمہارے قصر کا لوہا پگھل گیا کیسے

بڑھے آتے ہیں لشکر ہاتھیوں کے
مرے مولا! ابابیلیں کہاں ہیں

مرا پڑاو ہے پھر دشمنوں کے لشکر میں
پھر ایک سجدہ ہو اور کربلا کا منظر ہو

ان دنوں وطن عزیز جس آزمائش اور ابتلا میں مبتلا ہے، آصف ثاقب اس پر نہایت رنجیدہ رہتے ہیں۔ انہیں اپنی خاک وطن سے بے پناہ انس ہے۔ اپنے ہر خط کے ٹائٹل پر پاکستان ہی پاکستان لکھنے والے آصف ثاقب کی رگوں میں اس زمین سے والہانہ عشق کی لہریں ہر وقت کروٹیں لیتی ہیں۔ انہوں نے جس ملک کا خواب دیکھا تھا اس کی الٹی تعبیر دیکھ کر انہیں بے پناہ دکھ ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ اس حوالے سے نہایت جذباتی ہو جاتے ہیں اور زندگی سے مایوس بھی ہو جاتے ہیں۔

رہنماؤں کا اٹھائے کون احسانِ سفر
چل پڑے اس سمت ہم جس سمت رستہ لے گیا

سفینے باندھ کے رکھتا ہوں میں دریچوں سے
کہ میرے صحن سے دریا گزرتے رہتے ہیں

کیسی تعمیر ہوئی میرے مکاں کی ثاقب
ایک ایک اینٹ تھی دیوار سے بچھڑی بچھڑی

نئی اڑان کی تدبیر سوچتا ہوں کوئی
پرانے ڈھیر سے چڑیوں کے پر اٹھاتا ہوں

آصف ثاقب کے ہاں نادر تراکیب، استعاروں اور علامتوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کو غزل بنانے میں کڑی ریاضت کی ہے۔ انہوں نے اساتذہ کی کلاسیکی شاعری کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ وہ علمِ عروض کے ماہر ہیں اور اردو دنیا میں اس حوالے سے ان کی رائے مستند سمجھی جاتی ہے۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ عروضیوں کے بارے میں عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ اچھے شاعر نہیں ہوتے لیکن انہوں نے اس تاثر کو غلط ثابت کیا ہے اور ایک اہم غزل گو کے طور پر اپنی ایک مضبوط شناخت کروائی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں سہل ممتنع کے حوالے سے نہایت عمیق اور فکر انگیز اشعار ملتے ہیں۔

اپنی آنکھوں کو کہاں لے جاؤں
تجھ کو دیکھوں تو نظر لگتی ہے

زندگی جس کو ترستے گزری
بند آنکھوں سے وہ منظر دیکھا

خوش گمانی میں ہم چلے آئے
عین ممکن ہے آپ گھر پر ہوں

چاہِ دنیا کی اسیری میں مجھے
وسعتِ غارِ حرا یاد آئے

آصف ثاقب کی غزلوں کے فکری نظام میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی پرچھائیاں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو ہمیشہ تفکر میں مبتلا رکھتے ہیں۔ ان کی علمی وسعت، ان کی شاعری میں ہر موڑ پر اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ ایک میٹھا میٹھا درد ان کی غزل کے ایک ایک شعر سے ٹپکتا ہے۔

پناہ لینے کو آتی ہے میری کٹیا میں
خبر نہیں یہ ہوا کس کے ڈر سے آتی ہے

میرا دل رکھنے کو ثاقب مشکلوں میں ہنس پڑے
صبر کے میداں میں بازی میرا بچہ لے گیا

لوگ سڑکوں پر بزرگوں کی کتابیں بیچیں
اس طرح عظمتِ افکار نہ بک جائے کہیں

آصف ثاقب ستر کے پیٹے سے آگے نکل چکے ہیں لیکن ان کا انداز اور اسلوب نوجوان شاعروں کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں وقار اور متانت تو ہے ہی لیکن ان کے ہاں شوخی بھی کم نہیں ہے۔ نجی محفلوں میں وہ جس طرح شوخی اور بذلہ سنجی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بھرپور قہقہے لگاتے ہیں، شاید اس سے اہلِ سخن کا ایک بڑا طبقہ بے خبر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جس محفل میں موجود ہوتے ہیں اسے چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ان کی رومانی گفتگو بڑے بڑوں کو دانتوں میں انگلیاں دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ اشعار رنگِ غزل کی عمدہ مثال ہیں۔

اسی خیال سے تیری گلی میں ہم آئے
یہ سر رہے نہ رہے عاشقی تو کرنی ہے

یہ آرزو ہے کہ دل تم کو ٹوٹ کر چاہے
پھر اس کے بعد کوئی اور آرزو نہ کرے

تمام شہر میں دھومیں مچیں گی قاتل کی
ہمارا کیا ہے ہمارا تو سر ہی جائے گا

ان کی غزل ہمیشہ ایک نئے اور تازہ ذائقے سے آشنا کرتی ہے۔ ان کی غزل کا کینوس اور موضوعات نہایت وسیع ہیں اور ان پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن میں نے اپنے آپ کو ان کے پہلے شعری مجموعے ''در کنار'' تک ہی محدود رکھا ہے۔ حالانکہ ''در کنار'' سے آگے ان کی غزل کچھ اور ہے اور وہاں تک کا سفر خاصا مشکل ہے۔ میں اکثر ان کی غزلوں کے حصار میں رہتا ہوں۔ ان کے اشعار کو دیکھتا ہوں اور ان سے حظ اٹھاتا ہوں۔ غزل بڑی عجیب شے ہے، اصل میں یہی ہماری اصل شاعری ہے۔ اس کا سحر کسی کو اپنی چار دیواری سے نکلنے نہیں دیتا اور کون کافر ہے جو اس سے نکلنا چاہے گا۔

غزل جوانی کے موسم میں کچھ اور ہوتی ہے، ادھیڑ عمری میں اس کا رنگ بدل جاتا ہے اور پیری میں اس کی لذت اور انوکھی ہوتی ہے۔ آصف ثاقب کی غزل کے طویل مطالعے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کر سکا ہوں۔

..........☆..........

''ندیم کے افسانوی کردار'':

''پرمیشر سنگھ''

اپنی تمام تر محبت کے باوجود بھی جب پرمیشر سنگھ اختر کو سکھ نہیں بنا پاتا تو اوپر تلے دو واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اختر کو اس کی ماں کے پاس بھیج دے گا......

اختر کا کردار اس افسانے میں ایک معصوم بچے کا کردار ہے جو اگرچہ بہت چھوٹا بچہ ہے مگر سکھ اور مسلمان کے فرق کو سمجھتا ہے۔ اس کی ماں نے اُسے قرآنی آیات بھی یاد کروائی ہوئی ہیں اور رات نیند نہ آنے کی وجہ سے وہ تین بار قل ھو اللہ پڑھ کر خود کو پھونک مارتا ہے اور سو جاتا ہے۔ ایک مسلم گھرانے میں پرورش پانے کی وجہ سے، اس کے اندر ایک مسلمان ہونے کا احساس پوری طرح جاگزیں ہے اور اسے جب معلوم پڑتا ہے کہ وہ سکھوں کے گھر آ گیا ہے تو وہ ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیتا ہے......

افسانے کی نمایاں خصوصیت اس کی معتدل فضا ہے۔ کرداروں کے اندر ایک توازن ہے اور مجموعی طور پر کسی مذہبی تعصب کی بُو نہیں ملتی۔ بال برابر پل پر سفر کرنا بڑا حوصلے اور سلیقے کا کام ہے۔ اور ندیم صاحب نے اس افسانے میں اس حوصلے اور سلیقے کو بڑے کامیاب انداز سے استعمال کیا ہے۔''

(ندیم نگار: غافر شہزاد)

ترجمے کا فن

ڈاکٹر خالد ندیم

تاریخ عالم بتاتی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے علوم وفنون سے اخذ وقبول کا سلسلہ کم وبیش ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ بالعموم یہ آسان نہیں ہوتا کہ کوئی قوم دیگر زبانوں یا تہذیبوں سے بالکل بے نیاز ہوکر ترقی کی منزل طے کر لے، چنانچہ تہذیبی و ثقافتی اور علمی وادبی لین دین اور تعامل میں ترجمہ بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ترجمے کے عمل کو دو زبانوں کے مابین ایک پُل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ترجمہ ایسا دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں۔ [1] گویا دو لسانی گروہوں کے درمیان باہمی مکالمے کی صورت ترجمے (یا ترجمان) ہی کے ذریعے ممکن ہے۔

علمی وادبی اعتبار سے ترجمہ کسی زبان پر کیے گئے ایسے عمل کا نام ہے، جس میں کسی ایک زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کا متبادل متن پیش کیا جائے۔ [2] تاہم مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ عربی تعریف کے مطابق ترجمہ ''نقلِ کلام'' ہے جو نقلِ مطالب یا نقلِ معانی نہیں۔ نقلِ کلام کا تقاضا یہی ہے کہ کلام جس زبان میں نقل ہو جائے، اُس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا ہو جیسا اصل زبان میں ہوا تھا۔ [3] یعنی ترجمہ متبادل متن ہی کا مطالبہ نہیں کرتا، متبادل تاثر وکیفیت کا بھی متقاضی ہے۔ گویا ترجمے کا عمل ایک علمی وادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں دکھانا ہے اور وہ بھی اس احتیاط وخوبی سے کہ اس کا ڈیل ڈول، شکل و شباہت، ناز وانداز اور جزئیات وخیالات پورے طور پر منتقل ہو جائیں۔ [4] چنانچہ ڈاکٹر سید عابد حسین کے مطابق ترجمے کو ادبی قدر وقیمت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب ورنگ، وہ چاشنی، وہ خوشبو، وہ مزہ بھی آجائے جو اصل عبارت میں موجود تھا۔ [5]

ترجمے کے باب میں یہ ساری خواہشات نہایت ہی مستحسن سہی لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی ترجمہ آج تک اس معیار پر پورا اتر سکا ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ترجمے کو تخلیق کی کمتر یا دوسرے درجے کی علمی وادبی سرگرمی قرار نہ دیا جاتا۔

جب بات شاعری کی ہو تو مطالبات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ ترجمہ تو خود ایک پیچیدہ عمل ہے اور شاعری کے سلسلے میں رابرٹ فراسٹ کے خیال میں جو چیز ترجمے میں آنے سے رہ جاتی ہے، وہی دراصل شاعری ہوتی ہے۔ سحر انصاری کے مطابق کسی نے ییٹس سے کہا ''آپ کی فلاں نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' تو انہوں نے جواب دیا ''اگر آپ یہ چاہتے کہ جو الفاظ میں نے نظم میں استعمال کیے ہیں، ان کے علاوہ دوسرے لفظوں میں اس بات کو بیان کروں تو آپ سخت غلطی کر رہے ہیں۔'' شاعری کے ترجمے کے بارے میں ایک اور قول بھی بہت مشہور ہوا ہے کہ شاعری کا ترجمہ اس محبوبہ کی طرح ہے جو

خوبصورت ہو تو وفادار نہیں ہوتی اور وفادار ہو تو خوبصورت نہیں ہوتی۔ (۶)

ترجمے کا عمل کسی فن پارے کو پورے طور پر کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہے جبکہ بعض اوقات ترجمے کی پیچیدگیوں، تصنیفی ضروریات یا طباعتی مشکلات کے پیش نظر مکمل ترجمے کے بجائے کسی تصنیف کے مکمل یا جزوی نظریات وافکار سے کام لینے میں سہولت محسوس کی جاتی ہے اور مترجم فن پارے سے اپنے مقصد ومطلب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ، ترجمہ نہیں رہتا بلکہ اخذ وتالیف یا تلخیص کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ترجمے کا بنیادی تقاضا کسی تصنیف کے خیالات وافکار کے ساتھ ساتھ اس تصنیف میں پوشیدہ تمام تر تہذیبی وثقافتی رویے، مذہبی وسیاسی نظریات، معاشرتی ومعاشی تصورات، لسانی واسلوبیاتی خصوصیات حتیٰ کہ مصنف کے طرز احساس کی منتقلی ہے۔

چونکہ ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کا کردار ادا کرتا ہے اور بعض اوقات ترجمہ ہی کسی تہذیب یا قوم کے علوم سے شناسائی کا واحد ذریعہ ہوتا ہے جس طرح بعض ناپید یونانی کتب کا نام محض اپنے عربی تراجم کی بدولت ہی زندہ ہے، اس لیے مترجم کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔

مترجم کے لیے تصنیف اور ترجمے کی زبان پر یکساں عبور ضروری ہے۔ مصنف کے خیال کو گرفت میں لا کر اسے اپنی زبان کے تمام تر امکانات کے مطابق زیب قرطاس کرنے میں ہی اس کا کمال ہے۔ اگر وہ مصنف کے الفاظ کے پس منظر میں پوشیدہ روح کو نہ پا سکے یا متن کی روح کو سمجھنے کے بعد ترجمے کی زبان میں نہ لا سکے تو وہ کامیاب مترجم نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح جب تک کوئی شخص متواتر اور پے در پے زبان کی نزاکتوں اور اسلوبیاتی نظام پر غور نہیں کرتا اور جب تک اپنے افکار کو مختلف اور گوناگوں انداز سے لفظوں کی معرفت سامنے لانے کی مشق ومزاولت بہم نہیں پہنچاتا، اس وقت تک وہ ترجمے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ (۷) چنانچہ مترجم کے لیے اسی پائے کے علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کتاب اور فن پارے کے مصنف کا ہو۔ اصل مصنف کے انداز بیان اور لسانی خصوصیات کے علاوہ اگر اس کے تعلیمی معیاروں، اس کے عام حالات زندگی اور اس سے متعلق اس کے نقطۂ نظر اور عصری تقاضوں سے جس قدر واقفیت ہوگی، اس کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔ (۸)

بقول مظفر علی سید، ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دُہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے، اُس موضوع سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنفِ ادب یا شاخ علم سے بھی جس سے متن پیوست ہے، مترجم کو پیوستگی حاصل ہو، تب شاید ترجمہ چالو معیار سے اوپر اٹھ سکے۔ (۹)

یہ حقیقت ہے کہ مترجم جب کسی کتاب کو ترجمے کے لیے منتخب کرتا ہے تو لاشعوری طور پر وہ اس زبان، اس کتاب اور اس کے افکار ونظریات کو اپنی زبان اور اپنے ادب سے برتر تسلیم کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات، علمیت اور اپنے خیالات وتصورات پر مصنف کو فوقیت دیتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ اچھا ترجمہ اسی وقت وجود میں آ سکتا ہے جب مترجم نے نیک نیتی کے ساتھ اپنی شخصیت کو کھو کر مصنف کی شخصیت تلاش کرنے کی کوشش کی ہو۔ اپنی ذات کی نفی اور اپنی شخصیت سے انکار ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے۔ (۱۰)

چنانچہ مترجم کو اصل کی نقل کرنے میں ایک مصور اور اداکار کی طرح مصنف کے ساتھ ہلاک ہونا پڑتا ہے، اس کے ساتھ تالیاں بجانا، قہقہے لگانا اور کراہنا پڑتا ہے اور یہ سب کر لینے کے باوجود پوری طرح سنجیدہ اور لیے دیئے رہنا پڑتا ہے۔ تب جا کر ایک آرٹ بنتا ہے اور تخلیقی درجہ حاصل کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔[11] اس کے باوجود کسی اچھے سے اچھے ترجمے کو بھی تصنیف کا قائم مقام سمجھنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ مظفر علی سید کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف ادوار میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے کے نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں (مگر) کسی بھی ترجمے کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔ ان ترجموں کو بھی نہیں جن کو اپنے زمانے میں تخلیق سے بہتر خیال کیا گیا ہو۔[12]

کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ مترجم کی حیثیت مصنف کے مقلد کی ہے اور مصنف کے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں ہی مترجم کی کامیابی ہے یعنی مترجم کی حیثیت ایک تخلیق کار سے کمتر درجے کی ہے۔ اکثر ناقدین کے ہاں مترجم کے بارے میں یہی رویہ ملتا ہے بلکہ ایک یونانی مقولے کے مطابق ترجمہ ایک بھنی ہوئی سٹرابری کی طرح ہے، یعنی بھننے کے عمل سے سٹرابری کا ذائقہ جس حد تک تبدیل ہو جاتا ہے، کسی تصنیف میں ترجمے کے بعد اس حد تک تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں اسے طبع زاد ادب کے مقابلے میں دوسرے درجے کی چیز شمار کیا جاتا ہے۔[13]

تاہم اس نوعیت کی رائے کا اظہار کرنے والے تخلیقی ترجمے کے پیچھے کارفرما روح کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مرزا ادیب کے خیال میں ہر ادب پارے کی اپنی بو باس ہوتی ہے۔ یہ بو باس اس فضا میں رچی بسی ہوتی ہے۔ جس میں ایک مصنف سانس لیتا ہے۔ یہ بو باس ایک خاص خطہ ارض میں بسنے والے لوگوں کی زندگی سے متعلق اجتماعی رویئے سے پھوٹتی ہے۔ یہ رویہ معاشرتی زندگی کے خاص تجربات اور مشاہدات سے بروئے کار آتا ہے اور جب ایک مترجم کسی مصنف کی تحریر کو ان عناصر کے ساتھ اپنی زبان میں لے آتا ہے تو اس کی یہ کوشش ثانوی درجے سے بلند ہو کر تخلیقی ادب کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔[14] اسی لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے دوبارہ تخلیق (Re-creation) کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔[15] چنانچہ ایک اچھا ترجمہ ہمیشہ تخلیقی ہوتا ہے، اس لیے کہ ترجمہ سے متبادل اور مترادف الفاظ کی تلاش کرنا نہیں، بلکہ ان افراد کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے جو دوسری زبان کو نہیں جانتے۔[16]

یہ مترجم کی بدنصیبی ہے کہ ایک طرف اس کی جانکاہی کو تخلیق کے برابر نہیں سمجھا جاتا تو دوسری جانب ترجمہ کرتے ہوئے اسے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی زبان کے الفاظ اور لسانی تشکیلات میں پوشیدہ مفہوم اور تجربے تک پہنچنا اور پھر اس کی روح کو زندہ رکھتے ہوئے اسے کسی دوسری زبان کے پیکر لفظی میں ڈھالنا اتنا آسان نہیں ہے، جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ یہ فن اس لیے بھی مشکل ہے کہ دوسری زبان کے نامانوس مزاج، عجیب لہجے اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جملوں کی نئی ترکیب اور ساخت سے آشنا ہو کر اسے اپنے مزاج میں ڈھالنا، اپنے لہجوں سے ہم آہنگ کرنا اور پھر لفظوں کا اصل لباس اتار کر نئے ماحول اور نئی زبان کے الفاظ کا لباس پہنانا کہ قلب ماہیئت مضحکہ خیز بھی نہ بن جائے اور مسخ بھی نہ ہو، کوئی آسان کام نہیں۔ پھر اصل مصنف کے مزاج، لب و لہجے اور طرز احساس کو سلامت رکھ کر اس طرح ترجمہ کرنا کہ اجنبیت کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ واقعی مشکل مرحلہ ہے۔[17] چنانچہ مترجم، جسے ایک وقت تک ''نمک حرام''، ''غدار'' اور ''منحرف'' قرار دیا گیا۔ اپنے کام کی بدولت بین الاقوامی اور بین التہذیبی روابط میں اہم مقام کا مستحق ہے۔ علمی، ادبی اور لسانی اعتبار سے وہ مختلف مراتب کا حامل ہو سکتا ہے لیکن اپنے کمال کے ساتھ وہ آج بھی علم و ادب کا اہم رکن تصور کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تہذیبی و علمی میدانوں میں ترجمے کی اہمیت و کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل انسانی تہذیب کی ترقی کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں۔ اس کی ترقی مجموعی انسانی ترقی ہے اور اس ترقی میں ترجمے کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ غلام ربانی آگرو کے خیال میں تراجم کے ذریعے زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر دوسری لسانی برادریوں کے ساتھ مفاہمت، افہام و تفہیم، یگانگت اور اتحاد کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ (۱۸)

یہ بھی ہے کہ جب کسی قوم کا تخلیقی عمل سست روی کا شکار ہو اور نئے نظریات اور جذباتی پیرایوں کی تشکیل و تدوین کی اہلیت کسی قدر سلب ہو چکی ہو تو اس وقت خیالات کی ترویج اور نظریات کی تشکیل غیر ملکی ادب، فلسفہ اور دیگر شعبہ ہائے تخلیقات کے ذریعے متواتر تراجم کی ضرورت نہ صرف ایک اجتماعی تقاضے کی سطح پر ابھرتی ہے بلکہ ادبی اور علمی سطح پر بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ (۱۹) ایسے دور میں قوم کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے، قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور آہنگ سجائیں گے۔ (۲۰)

اس سے نہ صرف یہ کہ خیالات و افکار میں تازہ جھونکے محسوس ہونے لگتے ہیں بلکہ زبان و بیان کے پر تعفن تالاب میں تازہ پانی کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ترجمے کے ذریعے زبان کئی اعتبار سے پھلتی پھولتی ہے۔ ترجمہ جہاں الفاظ اور زبان کی نشو و نما کے ذریعے انسانی علوم میں اضافے کا باعث بنتا ہے، وہیں ذہنی سرحدوں کو بھی کشادگی بخشتا ہے۔ زبان کی سطح پر ترجمہ خیالات و جذبات کی ہر ہر کروٹ کو سمونے کی خاطر نت نئے اسالیب بیان سے متعارف کرواتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت جہاں نئے الفاظ، استعاروں کے روپ میں جنم لیتے ہیں، وہیں پرانے اور برتے ہوئے الفاظ کو آکسیجن مہیا ہوتی ہے۔ نئے محاورے اور نئے محاکات کے جنم کے ساتھ نئے علوم و فنون سے آشنائی ہوتی ہے۔ ہمیشہ نئی اصناف ادب کا ورود ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہو سکا ہے۔ (۲۱) چنانچہ احیائے علوم کی تحریکوں کے پیچھے یا کسی قوم کے فکری اور شعوری ارتقاء میں ہمیں ترجموں کا کردار بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں یونانی علوم کے تراجم، یورپی احیائے علوم کی تحریک کے پس منظر میں اسلامی علوم کے تراجم، ہر دو صورتحال اس بات کا ثبوت ہیں کہ فکر و شعور کی بلندی اور تہذیبی تحریک میں ترجمے خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ (۲۲)

ادبیاتِ عالم کا ارتقا بڑی حد تک تراجم ہی کا مرہونِ منت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کے خیال میں جس طرح دیے سے دیا جلتا ہے، اسی طرح علوم سے علوم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کو ٹٹولا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی نشو و نما کے مختلف مرحلوں میں دوسری زبانوں کے اثر کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ (۲۳) چنانچہ تراجم کے زیر اثر زبانیں اور تہذیبیں پہلے سے زیادہ باثروت اور وسعت پذیر دکھائی دینے لگتی ہیں اور ان میں اظہار کے نئے نئے وسائل جنم لینے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود تیسری دنیا میں جہاں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے، ترجمے کو اب تک حقارت کی نظر سے ہی دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ''حقیر'' کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے۔ انگریزی میں چوسر سے لے کر ڈرائیڈن، پوپ، کولرج اور براؤننگ تک اور بیسویں صدی میں لارنس، ییٹس، پاؤنڈ، ایلیٹ، آڈن اور بیکٹ تک نے یہ کام کیا ہے۔ بیسویں صدی کے اردو ادب میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے نثری ادب کا ترجمہ کیا اور اقبال سے لے کر فیض، راشد، فراق، میراجی، مجید امجد اور شان الحق حقی

جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم کیے۔ ان میں کون ہے، جس نے کسی بھی دوسری شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق ادب کے مقابلے میں ترجمے کا کام نفی خودی کا مظہر ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ کام اثبات خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا! شاید اس لیے کہ اسرارِ خودی سے ہی نہیں رموزِ بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔[۴۴]

اقبال سمیت دنیا کے عظیم فنکاروں کا ترجمے کی طرف رجحان جہاں ترجمے کی وقعت کو بڑھانے کا باعث بنا ہے، وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ تخلیق کے میدان میں ترجمے کی اہمیت تخلیق سے کمتر نہیں بلکہ تخلیق کے ساتھ ساتھ ہے، تاہم اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مترجم کو متعلقہ زبانوں کے اصول، قواعد، محاورات، مقامی لفظیات، تراکیب، تشبیہ واستعارات، علائم ورموز، اصطلاحات، متروکات، محاسن ومعائب سے خوب آشنائی ہو۔ چونکہ ہر تصنیف اپنے ترجمے کے لیے مختلف رویے کی متقاضی ہے، اس لیے مترجم پر فرض ہے کہ وہ علمی، ادبی اور صحافتی ترجمے میں امتیاز قائم رکھ سکے۔

علمی تراجم میں سائنسی علوم وفنون اور غیر ادبی تصانیف شامل ہیں۔ ایسے تراجم میں لفظ واصطلاح کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور مترجم کی کوشش ہوتی ہے کہ اصطلاحات وتراکیب میں یکسانیت قائم رہے اور وہ مسلمہ اصولوں کے مطابق ہوں۔ ادبی تراجم میں شعر وسخن اور افسانوی نثر شامل ہیں۔ ان تراجم میں خیال کی درآمد کے ساتھ ساتھ مصنف کی روح اور زبان وبیان کی خوبیوں کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے۔ صحافتی ترجمے میں وقتی ضرورتوں اور فوری ابلاغ پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس میں زبان وبیان کی نزاکتوں کی جگہ خبر میں موجود معلومات کو قاری تک پہنچانے کو اولیت حاصل ہے۔

علمی، ادبی اور صحافتی تقسیم کے علاوہ زبان وبیان کے اعتبار سے بھی ترجمے کی تین اقسام ہیں یعنی لفظی ترجمہ، آزاد ترجمہ اور معتدل ترجمہ۔ لفظی ترجمے کی بہترین مثال قرآن پاک کا اولین اردو ترجمہ ہے جسے اہل نظر نے لفظی، بے محاورہ اور دشوار قرار دیا ہے۔[۴۵] تاہم علوم وفنون میں لفظی ترجمے کو ہی ترجیح دی جائے گی۔ ہلال احمد زبیری کے خیال میں یہاں تو اصل کے ہر لفظ کے معنی اور اس کی اہمیت ترجمے میں حتی الامکان پوری طرح منعکس ہونی چاہیے ورنہ مصنف نے دلائل وشواہد پیش کرکے جو نتائج اخذ کیے ہیں اور اظہار وبیان کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے، ترجمہ ان کا آئینہ دار نہیں ہوگا۔ علمی کتابوں کے مترجم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے فکر کو اصل مصنف کے فکری قالب میں ڈھال کر ہی اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر زور دیا جاتا ہے کہ علوم کا ترجمہ ہر صورت میں لفظی ہونا چاہیے۔[۴۶] داستانوں، افسانوں، کہانیوں، خاکوں اور ہلکی پھلکی نگارشات کے ترجمے کے لیے آزاد ترجمہ بہت موزوں تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے تراجم میں عام طور پر مصنف کے خیالات مترجم کی فنکاری کی نذر جاتے ہیں اور ترجمے میں مصنف کے افکار کے علاوہ سب کچھ موجود ہوتا ہے، چنانچہ مظفر علی سید کے الفاظ میں عام قسم کا لفظ ترجمہ، جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہہ در تہہ معنویت قربان ہو جائے، فنِ ترجمہ کی مشکلات سے ناآشنائی یا دانستہ گریز کا مظہر ہے۔[۴۷] تاہم معتدل ترجمہ ہی وہ منزل ہے، جہاں ایک مترجم نقال سے بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور وہ مصنف کے افکار ونظریات سے صرفِ نظر کیے بغیر ترجمے میں فنی ولسانی خصوصیات کا التزام کرتا ہے اور یوں اس کا ترجمہ تخلیق کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ (ترمیم واضافہ کے ساتھ)

حواشی:

(۱) پروفیسر رشید امجد، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۳۲۔
(۲) عطش درانی، فنِ ترجمہ ...... اصول و مبادیات، مطبوعہ اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۵ء، ص ۳ تا ۸۔
(۳) فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۱۔
(۴) دلشاد کلانچوی، ترجمے کا فن ...... نظری مباحث ۳۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۔
(۵) مشمولہ بیاضِ مبارک، مرتبہ سید ذوالحسین زیدی، ص ۵۲۔
(۶) ڈاکٹر اختر حسین اور ترجمے کا فن، مشمولہ افکار، نقد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ص ۱۷۱۔
(۷) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۳۸۔
(۸) ڈاکٹر غلام علی الانہ، افتتاحی اجلاس، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۲۔
(۹) فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۳۷ تا ۳۸۔
(۱۰) تنقید اور تجربہ، ص ۱۲۵۔
(۱۱) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۳۹ تا ۴۰۔
(۱۲) فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۳۵۔
(۱۳) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۵۔
(۱۴) مرزا ادیب، کچھ ترجمے کے بارے میں، مطبوعہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء۔
(۱۵) آل احمد سرور، نظر اور نظریے، ص ۲۵۰۔
(۱۶) سید غفران الجیلی، فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات، مطبوعہ اردو نامہ (سال نامہ) لاہور، مارچ ۱۹۸۲ء۔
(۱۷) پال گرے، تحسینِ شعر (ترجمہ: ڈاکٹر روبینہ ترین)، بحوالہ مغرب سے نثری تراجم از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص ۲۴۔
(۱۸) ترجمے کا فن ...... نظری مباحث، ۳۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۷ء
(۱۹) انیس ناگی، تصورات، ص ۲۲۔
(۲۰) مولوی عبدالحق، مقدمہ تاریخ یونان، (ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی) ص ۳۔
(۲۱) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص ۱۶۔
(۲۲) ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات، مطبوعہ روداد سیمینار، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸۔
(۲۳) مقدمہ مغربی تصانیف کے اردو تراجم از مولوی میر حسن، ص ۵۔
(۲۴) مظفر علی سید، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۱۲۔
(۲۵) نثار احمد قریشی، اردو نثر میں تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ، مطبوعہ ترجمہ ...... روایت اور فن، ص ۵۔
(۲۶) ترجمے کا فن ...... نظری مباحث ۳۶ ق م تا ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲۔
(۲۷) مظفر علی سید، فنِ ترجمہ کے اصولی مباحث، مطبوعہ روداد سیمینار ...... اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، ص ۴۰۔



فیض احمد فیض (درد اور درماں کا شاعر) ایک مطالعہ: ڈاکٹر محمد علی صدیقی

جاوید اختر بھٹی

ہندوستان میں روشن خیالی کی بنیاد ''نگار'' نے رکھی۔ اس روشن خیالی کی سزا اس کے مدیر نیاز فتح پوری کو ملی۔ اس کی زد میں ایک معروف ادیب مرزا عظیم بیگ چغتائی بھی آئے لیکن ''نگار'' روشن خیال ادیبوں کی کوئی جماعت قائم نہ کر سکا۔ دوسرا اردو میں فکشن لکھنے والے سیاست سے بہت دور تھے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ سیاسی شعور سے دور تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ادب کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

۱۰۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو اردو ادب میں ایک نیا دن طلوع ہوا۔ جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس رفاہ عام ہال لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ''نگار'' نے روشن خیالی کا آغاز کیا تھا۔

ہندی ادب لکھنے والے پہلے سے سیاسی اسرار و رموز سے واقف ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک میں بہت سے ہندی ادیب شامل ہوئے۔ انہوں نے ان نظریات کو اپنے قریب پایا۔ ۱۰ اپریل کی کانفرنس میں پریم چند کا خطبۂ صدارت ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے جس کے بعد اردو ادب نئی کروٹ لیتا ہے۔ اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

> ''حضرات! یہ جلسہ ہماری ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔ ہمارے میلوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اردو کا لٹریچر موجود ہے۔ اس کا منشا خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں، بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کر لے، اس میں خیالات و جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا، اس کے لیے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔''

ترقی پسند تحریک کو ابتداء سے ہی قد آور ادیب، شاعر اور نقاد میسر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ مضبوط بنیادوں پر ترقی پسند تحریک کی عمارت تعمیر کی گئی۔ بیسویں صدی کے ادب کا ہم ترقی پسند تحریک سے قبل اور بعد کے زمانے کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ وہ لوگ جو اس تحریک سے اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ شاعری اور فکشن کے موضوعات

تبدیل ہوتے گئے اور پڑھنے والوں نے محسوس کیا کہ ادب میں ان کے مسائل کو سامنے لایا جارہا ہے، وہ اپنے دکھوں کو ادب میں پڑھنے لگے۔

ادب تبدیل ہوا تو تنقید میں بھی تبدیلی آئی اور تنقید نے تو یوں سمجھئے کہ نیا جنم لیا اور تحریک نے بڑے ناقدین پیدا کیے۔ اس وقت ڈاکٹر محمد علی صدیقی سب سے قد آور ترقی پسند نقاد ہیں۔ ان کے مضامین اور کتابیں ان کی وابستگی کی روشن مثال ہیں۔ ''توازن''، ''نشانات''، ''مضامین''، ''اشارے''، ''تلاش اقبال''، ''جہات''، ''سرسید احمد خاں اور جدت پسندی''، ''جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ'' کے بعد ''فیض احمد فیض ...... درد و درماں کا شاعر'' منظر عام پر آئی۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سات مضامین شامل ہیں۔۱: فیض شناسی، ۲: فیض احمد فیض اور روایتی شعری زبان، ۳: فیض اور مارکسی تنقید ...... حقائق کی روشنی میں، ۴: فیض احمد فیض ...... شاعر یا جادوگر، ۵: غالب، جوش اور فیض ...... تین آوازیں، تین لہجے، ۶: اقبال اور فیض ...... حسن و بصیرت کے داعی، ۷: برصغیر، امن اور فیض ...... دوسرے حصے میں فیض کے تمام شعری مجموعوں کا مطالعہ شامل ہے۔ تیسرا حصہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے۔۱: باتیں فیض سے (اہم مسائل پر انٹرویو) ۲: تقریر، لینن امن کے موقع پر، ۳: فن کار کا دائرہ وجود، ۴: ادیب کا کردار، ۵: قومی تشخص کی تلاش (پاکستانی ثقافت پر ایک یادگار تحریر) یہ فیض کی تحریروں کا انتخاب ہے اور آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فیض کا زندگی نامہ مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے فیض کی شاعری میں تصوف تلاش کر لیا۔ وہ ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

> ''فیض صاحب کی شاعری میں جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا درد، متاعِ درد، شہرِ درد، درد کا شہر، اہل درد، درد کا شجر، دردمند غرضیکہ متعدد بار درد کے لاحقے اور سابقے استعمال ہوئے ہیں۔ فیض صاحب نے میرے خیال میں درد کا استعارہ صوفی شعرا سے لیا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کو فیض کی شاعری پڑھتے ہوئے بلھے شاہ، حضرت تخی سرور، حضرت خواجہ فرید یاد آتے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب فیض کو ترقی پسند صوفی کہہ رہے ہیں۔ فیض میں دو خوبیاں تو نمایاں ہیں۔ ایک اعتدال پسندی اور دوسرا درد۔ لوگوں کے لیے درد ...... یہ فیض کے قابل قدر رویے ہیں جن کے ساتھ وہ لوگوں کے دلوں میں اتر گئے۔ آگے چل کر ڈاکٹر صاحب ایک وضاحت کرتے ہیں: ''بعض غیر ترقی پسند ادیبوں نے فیض احمد فیض کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا ہے کہ وہ صرف ترقی پسند تھے، کمیونسٹ نہیں تھے۔ یہ خیال غلط ہے۔ فیض ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی پہلی سینٹرل کمیٹی کے رکن تھے۔''

فیض کی اعتدال پسندی کچھ ادیبوں کے دلوں میں نرمی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ فیض کو ترقی پسند تو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن کمیونسٹ نہیں کہتے۔ یہ بھی ان کی فیض سے محبت ہے ورنہ حقیقت وہی ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مابعد جدیدیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''...... مابعد جدیدیت کا فلسفہ اس وجہ سے بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ اب ترقی پذیر ممالک کے پاس اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دینے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ مابعد جدیدیت نے آج کی دنیا کے لیے جو فکری پروگرام مرتب کیا ہے، اس کے اہم نکات بالکل واضح ہیں۔ ان کی وجہ سے غریب ممالک میں ترقی پسند افراد پر اپنی قومی خودمختاری کا دفاع ضروری ہو جاتا ہے۔ چونکہ مغربی ممالک کے غالب معاشی طبقے نے ترقی پذیر دنیا کے وسائل پر حق تصرف حاصل کر لیا ہے۔ اب ترقی پذیر ممالک

چاہیں تو اپنے قومی وسائل پر مغرب کے حق تصرف ہبہ کر کے خود کو "شریف اور مہذب" کہلوا سکتے ہیں ورنہ وہ "بدمعاش" قرار دے دیے جائیں گے۔" (فیض شناسی)

فیض کی ایک اور خوبی ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں:

"فیض نے اردو کی شعری روایت کے خلاف جو معرکہ سر کیا ہے، وہ ان حضرات سے بھی توجہ اور داد چاہتا ہے جو ان کی سیاسی فکر سے اتفاق رائے نہیں کرتے۔ صرف اسی طرح فیض کی اس سائنسی بصیرت کا اعتراف ہو سکے گا جس کا مقصد اردو زبان کی شعری روایت کا دفاع تھا۔ فیض کی شعری لغت کا جائزہ لیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ہم خالصتاً جاگیرداری دور میں سانس لے رہے ہیں۔"

فیض کی شاعری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آئی ہے۔ فیض ایک کمیونسٹ تھے۔ ایسے کمیونسٹ جنھوں نے پنڈی سازش کیس کا سامنا کیا۔ کمیونسٹوں کو وطن دشمن اور غیر مسلم قرار دیا گیا۔ ان کا محاصرہ کیا گیا۔ ان کے لیے زندگی تنگ کر دی گئی۔ ان حالات میں فیض نے عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل کی۔ مجبوراً بہت سے ناقدین کو ان کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ فیض اس ہنر سے واقف تھے کہ پاکستان میں کس طرح زندگی بسر کی جائے۔ جب وہ زیادہ گھٹن محسوس کرتے تھے تو اس ملک سے چلے جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انقلاب کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں آ چکی ہیں۔ ان کے آخری دور میں ضیاء الحق ملک میں قابض ہو کر مسلسل جھوٹ بول رہا ہے اور ترقی پسندوں کو ایک بار پھر عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دور میں ترقی پسند گیارہ برس سرکاری اداروں کی سخت نگرانی میں رہے۔ بہت سے جیل گئے۔ افغان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر فروغ پا رہا تھا۔ سوویت یونین کے ساتھ امریکہ کے تعاون سے جہاد جاری تھا اور ترقی پسندوں کی تضحیک کی جاتی تھی۔ انہیں خوفزدہ کیا جاتا تھا۔

"فیض احمد فیض کی شاعری، اپنی مخصوص انفرادیت کے ساتھ، نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ جدید اردو شاعری کے ان بانیوں میں سے ہیں جنھوں نے شاعری کی دیوی کا "پجاری" بننے کی بجائے اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہ فن اور نظریہ ادب کے بہت سے معرکوں میں اس قدر ثابت قدم رہے ہیں کہ وہ اب محض اپنے رنگ ہی کی وجہ سے مثالی شخصیت نہیں بلکہ اپنی فکر کا فنی روپ اور قابل تقلید روپ بن چکے ہیں۔" (فیض احمد فیض...... شاعر یا جادوگر؟)

"باتیں فیض سے...... ایک انٹرویو"

فیض سے گفتگو کرنے والوں میں صفدر میر، اشفاق احمد، سعادت سعید، حسن رضوی، فارغ بخاری، قتیل شفائی، جیلانی کامران اور اجمل نیازی شامل تھے۔ اس میں انہوں نے بہت سی باتیں کھول کر بیان کیں۔ یہ نہایت اہم زمانہ تھا۔ نفاذ اسلام کے نام پر ضیاء الحق حکومت کر رہا تھا۔ وہ قوم کو مسلسل دھوکہ دے رہا تھا۔ دوسری طرف جہادی ایک مضبوط قوت بن رہے تھے۔ (آج بھی اس زمانے کا تسلسل قائم ہے) دوسری طرف انقلاب ایران کا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔

فیض کی زندگی کا سفر ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو شروع ہوتا ہے ۱۹ نومبر ۱۹۸۴ء کو ختم ہوا۔ اس میں وہ تقریباً پانچ برس جیل میں رہے اور لوگوں کی بے پناہ محبتیں حاصل کیں۔ فیض نے لینن انعام ۱۹۶۲ء میں حاصل۔ ماسکو کی ایک پروقار تقریب میں اردو میں خطاب کیا اور آخر میں فرمایا:

"مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمن سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی، اب بھی فتح یاب

ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است''

ڈاکٹر محمد علی صدیقی، فیض کے پسندیدہ نقادوں میں شامل تھے۔ اس اعزاز کا اظہار پیش لفظ میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''چند برسوں سے یہ خیال تھا کہ فیض احمد فیض کے شعری مجموعہ کا ترتیب وار مطالعہ کیا جائے لیکن دیگر مصروفیات نے موقع نہیں دیا۔ پھر ۲۰۱۱ کا سال آیا اور ایک دوست نے یاد دلایا کہ یہ فیض کے جشن صد سالہ کا سال ہے، میرے دوست نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا کہ فیض احمد فیض کے پسندیدہ نقاد ہونے کی وجہ سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ تم غالب، اقبال اور جوش کے بعد فیض صاحب پر کتاب لاؤ، خواہ مختصر کیوں نہ ہو، میں نے حامی بھر لی۔''

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ان ناقدین کا بھی ذکر کیا ہے جو فیض کی ترقی پسندی کی نفی کرتے ہیں اور انہیں رومانی شاعروں میں شمار کرتے ہیں اور ناقدین کے خاص طبقے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل اور مابعد جدیدیت'' کے وکلاء کی طرح مصنف نے اپنے خیالات کی صحت کے سلسلے میں فیض کے جن اشعار کو پیش کیا ہے وہ واقعتاً فیض کی شاعری کے اس اسلوب نگارش کا خاصہ ہیں جو مابعد الطبیعی اور ترقی پسندانہ فکر کے حامل قارئین کی یکساں طور پر تشفی کرتا ہے۔ اس لیے یہ اشعار ان کے لیے ان کے نقطۂ نظر اور میرے نقطۂ نظر کی یکساں طور پر تشریح اور وضاحت کرتے ہیں۔''

فیض نے ایک نظم میجر اسحاق کی یاد میں کہی تھی۔ میں اس کا ایک شعر فیض کی یاد میں دہراتا ہوں۔

ہر خار رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور

فیض نے ترقی پسند شعور دیا اور یہ بتایا کہ انقلاب سے پہلے زندگی کو کیسے بسر کیا جائے۔ ہر چند کہ زمانہ پہلے سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ حالات بے قابو ہیں اور کسی عظیم انقلابی شخصیت کے انتظار میں ہیں۔ انقلاب کی ضرورت تو گزشتہ ۶۴ برس سے ہے لیکن راستے کی رکاوٹیں بڑھتی ہی چلی جارہی ہیں۔ ترقی پسند کی ایک خوبی ہے کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے تفہیم فیض کے سلسلے میں ایک اعلیٰ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد مجھے درد کے ان رشتوں سے آشنائی ہوئی جنہیں فیض نے منظوم کیا۔ یہ ایک لازوال شاعر کے روشن پہلو کا تذکرہ ہے۔

بہت ملا نہ ملا زندگی سے، غم کیا ہے
متاعِ درد بہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

..........☆..........

طاہر نقوی کے افسانے

ڈاکٹر یونس حسنی

طاہر نقوی صاحب سے میری ملاقات کئی سال قبل ایک ادبی محفل میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے اپنا افسانہ ''افسانہ نگار کی اپنے کردار سے آخری ملاقات'' پڑھا تھا اور میں نے اس پر تبصرہ کیا تھا۔ کیا تبصرہ کیا تھا، مجھے مطلق یاد نہیں۔

اب کئی سال بعد وہ اپنے افسانوں کے نئے مجموعے ''کووں کی بستی میں ایک آدمی'' کی رسم اجرا کے موقع پر میری شرکت کی دعوت لے کر آئے اور فرمایا کہ چند سال قبل تم نے میرے افسانے پر جو تبصرہ کیا تھا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم افسانے کو کس طرح سمجھتے اور اس کے ایک اچھے ناقد ہو۔ میں افسانے کا اچھا ناقد تو کیا اچھا قاری بھی نہیں ہوں۔ افسانہ میں ضرورتاً پڑھتا ہوں۔ تدریسی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے ادب کی تازہ ترین صورتحال سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ افسانے کے مطالعے کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔

اس وقت اُن کے افسانے پر میں نے کیا تبصرہ کیا تھا، وہ مجھے یاد نہیں۔ البتہ اس مجموعے کا پہلا افسانہ جو اس مجموعے کا نام بھی ہے، ہاتھ آ گیا ہے اور وہ بڑا جاندار افسانہ ہے۔ وہ لفظ جو کھو گیا ہے اور تخلیق کار جس کی تلاش میں ہے، معاشرہ اس تلاش پر خندہ زن ہے مگر تخلیق کار کو اس کے بغیر قرار نہیں آتا۔ یہ لفظ ہے جو سچا ہے، جو جرأت کی علامت ہے اور تخلیق کی صداقت ہے مگر وہی کھو گیا ہے، اسی پر پہرے لگے ہیں اور اسی کو استعمال کرنا جرم ہے۔

دوسرا افسانہ وہی ہے جس سے میں پہلے سے واقف ہوں۔ یہ وہ کردار ہے جسے تخلیق کار تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ کردار خود خالق کے ذہن میں کلبلاتا ہے اور مرغی کے بچے کی طرح خود انڈے سے برآمد ہونا چاہتا ہے۔ تخلیق کار اس میں خیانت کا مرتکب نہیں ہو سکتا ورنہ کردار خود بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو تخلیق کرا کے چھوڑتا ہے۔ بعض دوسری خوبیوں کے علاوہ اس افسانے کی ایک خوبی اس کے کاٹ دار جملے بھی ہیں جو زندگی کے تجربات کا حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً کردار افسانہ نگار سے کہتا ہے:

''لفظی (Cosmetics) سے کام مت لو۔''

میں اگرچہ اردو تحریر میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو مزاجاً ناپسند کرتا ہوں لیکن اس فقرے میں لفظ کے ساتھ Cosmetics اپنے تمام حسن و جمال کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور ہماری مجبوری پر خندہ زن ہے۔

''عورت جس مرد کو چاہتی ہو، اس سے شادی نہ ہو سکے تب بھی پیدا ہونے والے بچے اُسی کے ہوتے ہیں۔''

''بستر پر اس کے ساتھ شوہر ہوتا ہے مگر ذہن میں وہی مرد بیٹھا ہوتا ہے۔''

یہ ایسے تجربے ہیں جو ہوتے ہر ایک کو ہیں مگر لفظی اظہار کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔

''ابال'' میں بھی ایسے فقروں کی کمی نہیں۔''ابال'' بڑا بامعنی افسانہ ہے۔ پورا افسانہ پڑھا ہو تو ان آخری فقروں ''بھلا بیوی تیرے جیسی ہوتی ہے؟''

''اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور دھیمے لہجے میں صرف اتنا پوچھا ''تو اور کیسی ہوتی ہے۔'' کی معنویت سمجھ میں آتی ہے۔ پورا افسانہ ان دو فقروں میں اپنی معنویت چھپائے ہوئے ہے۔ افسانے کے فن میں یہ ہنر کیا کہلاتا ہے، یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر ایسی ہنرمندی سے ہی افسانے میں جاذبیت اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔

''اکیلا'' بھی ایک ایسا افسانہ ہے جو افسانہ نگار کی عینیت پسندی کا آئینہ دار ہے۔ طاہر نقوی صاحب خود بھی اکیلے ہیں اور ایسے ہی کردار تخلیق کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جو اکیلے ہوں۔ جو اچھے بھی لگیں تو نظر کی کمزوری کی ہی صورت میں کیونکہ اچھے وہ اس وقت لگتے ہیں جب وہ دوسروں سے مطابقت پیدا کرسکیں۔

''بے بس'' کا اختتام اسی انداز کا ہے جیسا منٹو کے یہاں ہوتا ہے۔ قاری کو اختتام پر ایسا ذہنی جھٹکا لگتا ہے کہ افسانہ ذہن پر ثبت ہو کر رہ جاتا ہے۔ افسانہ کی تکنیک میں اختتام کا یہ انداز ہمیشہ اثر انگیز ہوتا ہے۔

''مسئلہ''، ''امرجنسی''، ''آزمائش'' ایسے افسانے ہیں جو انسانی زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو بڑی چابکدستی سے بے نقاب کرتے ہیں اور ہمیں اپنی طرف متوجہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ ہر افسانے کا اختتام حیرت و استعجاب ہے جو ہماری زندگی کا حاصل ہے۔

۱۶۰ صفحات کی اس کتاب میں ۳۲ افسانے ہیں جو سب مختصر ہیں۔ کوئی افسانہ چار پانچ صفحے سے زیادہ کا نہیں۔ مختصر مختصر افسانے کی یہ خوبی ہے کہ وہ مختصر ہو۔ اس کا اختصار ہی اس کی خوبی ہوتا ہے مگر یہ خوبی افسانہ نگار اپنے فن سے پیدا کرتا ہے۔ طاہر نقوی صاحب کو یہ فن آتا ہے، اس لیے ان کے افسانے خوشگوار بھی ہیں اور اثر انگیز بھی۔

ان کے افسانوں میں کہیں علامتی رنگ ہے اور کہیں بیانیہ، ان کے علامتی افسانوں میں علامت قابل فہم ہے۔ ہمارے عہد میں علامتی افسانے کی علامات قاری کے لیے ناقابل فہم ہو کر رہ گئی ہیں اور اس لیے افسانے کی تفہیم دشوار ہو گئی ہے۔ قاری اور افسانہ نگار مدمقابل کھڑے ہیں۔ خالق کا اصرار ہے کہ اس نے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس تک قاری کی رسائی نہیں ہو پا رہی۔ قاری کا شکوہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا انداز ہی نرالا اور ناقابل فہم ہے۔ اس کیفیت نے وہی صورتحال پیدا کردی ہے جو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکالنے میں پیدا ہوتی ہے۔ طاہر نقوی صاحب نے علامت نگاری کے اس اسلوب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ ان کی علامتیں عام قاری کے لیے بھی قابل فہم ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں کی تفہیم بھی آسانی سے ہو جاتی ہے اور ان سے لطف اندوز بھی ہو جا سکتا ہے۔ ان کی زبان سادہ، اسلوب واضح اور تجربے قابل تسلیم ہیں۔ وہ ایک ماہر لکھاری ہیں اور افسانے کی تکنیک اور اس کی دوسری فنی ضروریات کو برتنے پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔

چلتے چلتے طاہر نقوی صاحب سے ایک بات! وہ لفظ جو کھو گیا ہے اور جسے مقید کر کے تخلیق کار سے دور کر دیا گیا تھا، وہ یوں ہی مقید رہے گا اور صرف وہی فنکار زندہ رہیں گے جو اس گم شدہ لفظ کی تلاش کے کھکو سے بچ کر آزادانہ تخلیق کے بزم خود عادی ہوں گے۔

..........☆..........

ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب شناسی

محمد سعید

تخلیق اور تخلیقی شخصیات کا تجزیاتی مطالعہ نفسیاتی تنقید کا محبوب موضوع ہے۔ اردو میں جس تخلیقی شخصیت کو سب سے پہلے نفسیاتی تنقید کا موضوع بنایا گیا وہ غالب ہے۔ غالب کی شخصیت اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر ابتداء ہی سے نفسیاتی تنقید کا موضوع بن جاتی ہے۔ [1] رشید احمد صدیقی کے بقول ہم ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کو غالب کا پہلا نفسیاتی تجزیہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ بجنوری کی ''محاسنِ کلام غالب'' کے برسوں بعد ۱۹۴۴ء شیخ اکرام کی کتاب ''آثارِ غالب'' [۲] شائع ہوئی۔ غالب پر یہ پہلی ایسی کتاب ہے۔ جس میں باقاعدہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ غالب کی زندگی اور تصانیف کا مطالعہ علم نفسیات کی روشنی میں کیا جائے گا۔

شیخ اکرام اس کتاب میں نفسیات کے سارے اصولوں کے تحت غالب کی شخصیت و شاعری کا مطالعہ پیش نہیں کر سکے اور غالب کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی بجائے اسے ماہر نفسیات ثابت کرتے رہے ہیں لیکن انہوں نے فرائیڈ، ایڈلر اور ولیم جیمز جیسے ماہرین نفسیات کے نظریات سے استفادہ ضرور کیا ہے۔

اس کتاب کے ''حیاتِ غالب'' کے حصے میں شیخ اکرام نے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے پیدا کی جانے والی انفرادیت کے بارے میں لکھا ہے جس میں انسان یا تو حد سے بڑھ کر کسر نفسی کا اظہار کرتا ہے یا پھر بھرپور ظرافت کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مداحین غالب کے مقابلے میں انہوں نے غالب کی محبت کو خالص ذہنی محبت قرار دے کر بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''فرائیڈین سوچ'' کا مظاہرہ کیا ہے۔ غالب کی شخصیت کے نفسیاتی تجزیے وہ جس قدر پیش کر سکتے ہیں، وہ اپنی اولیت کی بنا پر اور بھی اہم ہو جاتے ہیں اور اردو میں نفسیاتی تنقید کی عمر کو پیش نظر رکھتے ہوئے بارش کے پہلے قطرے سے بڑھ کر اہم اور مفید ثابت ہوتے ہیں۔

ان کے بعد ۱۹۶۵ء میں محمد موسیٰ خان کلیم کی ''مقامِ غالب'' [۳] شائع ہوئی۔ انہوں نے غالب کی شخصیت کے کئی نفسیاتی محرکات کی طرف توجہ دلائی۔ موسیٰ کلیم نفسیاتی نقاد کے اس منصب سے آگاہ ہیں کہ اسے فنکار کی زندگی میں پیش آنے والے حوادث کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ''مقامِ غالب'' میں شخصیت کی تعمیر کے عنوان سے انہوں نے غالب کی شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ غالب کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف واقعات اور حوادث کو آٹھ عنوانات کے تحت درج کر کے پھر ان سے نفسیاتی نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان اہم واقعات کو وہ غالب کے تحلیل نفسی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

ان آٹھ واقعات میں بچپن میں والد کی وفات، ننھیال کی خوشحالی، نواب الٰہی بخش معروف کے گھر رشتہ، پنشن کا قضیہ

اور سفر کلکتہ، قید کی سزا، دربار سے تعلق، سانحۂ غدر اور قاطع برہان کے قضیے کو بنیاد بنا کر انہوں نے غالب کی شخصیت میں دو صفات کی نشاندہی کی ہے۔ شیری اور روباہی۔ ان کے مطابق ان میں سے کچھ واقعات غالب کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں اور کچھ برتری کا احساس دلاتے ہیں جس سے غالب کی شخصیت میں شیری اور روباہی کے عناصر پیدا ہوئے اور غالب کی طبیعت اجتماع ضدین بن گئی۔ سوسی کلیم نے نفسیات کی بنیادی اصطلاح شعور، تحت الشعور اور لاشعور کے ذریعے دو غزلوں کا تجزیہ بھی کیا ہے جو ایک نئی چیز ہے۔

اس سلسلے میں سلام سندیلوی کی کتاب پہلی ہے جس کا نام ہی یہ رکھا گیا ہے ''غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ''(۴) یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ دیباچے میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کوئی ماہر نفسیات نہیں ہیں اور یہ مطالعہ محض اتفاقی امر ہے لیکن ایک محتاط انداز ے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نفسیات کے تمام اسالیب کی اصلاحات بیان کر دی ہیں جس میں تقریباً ہر معالجاتی ماہر نفسیات کا نظریہ شامل ہو گیا ہے۔ غالب کے ہر شعر کو انہوں نے کسی نہ کسی اصطلاح کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک تلاش کیا ہے نفسیاتی مطالعے میں یہ انتہا پسندی کی مثال ہے۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ غالب ایک احساسِ کمتری کا مارا ہوا ذہنی مریض، جنونی، پاگل اور بزدل قسم کا انسان بن کر رہ گیا ہے۔ سلام سندیلوی کی کوشش رہی ہے کہ غالب کی شخصیت یا شاعری کی کوئی خوبی نہ بیان ہونے پائے۔ معلوم نہیں غالب بیچارے کو ایسے نفسیاتی نقادوں نے کس غلطی کی سزا دی ہے اور وہ کیا انسانی حرکت کر بیٹھا تھا جو یہ فرشتے نہیں کرتے ہیں۔

سلیم احمد کی کتاب ''غالب کون؟''(۵) غالب کے نفسیاتی تجزیے پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب غالب کے نفسیاتی مطالعے میں بڑی اہم ہے۔ خاص طور پر سلیم احمد کے غالب کے بارے میں سخت تنقیدی رویئے نے اس نفسیاتی مطالعے کو اور بھی تقویت دی ہے۔ سلیم احمد نے پہلے حصے میں شخصیت اور شاعری کے باہمی تعلق پر بحث کی ہے۔ شخصیت اور انا کے نزاعی فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے جو نتائج اخذ کیے ہیں، دوسرے حصے میں ان نتائج کی روشنی میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ پیش کیا ہے جسے غالب کا نفسیاتی تجزیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرائڈ کے نظریہ جنس کو چھوڑ کر باقی سب نظریات سے اس تجزیے میں استفادہ کیا گیا ہے۔ سلیم احمد کو غالب میں رئیس زادگی کا زعم بھی نظر آتا ہے، شاعری اور انسان سے محبت کا زعم بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک غالب احساسِ کمتری میں بھی مبتلا ہے اور اسی وجہ سے وہ مفرس لکھتا ہے۔

احساسِ کمتری کے علاوہ سلیم احمد کو غالب منفیت کا حامل، غیر متوازن اور مریض بھی نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس سے پہلے لکھی جانے والی کتابوں سے کہیں زیادہ اس کتاب میں غالب کا نفسیاتی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ غالب پر اسی نوع کے لکھے جانے والے مختلف مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل کے دو مقالے ''غالب کا ذوق سفر'' اور ''غالب خستہ'' بڑے اہم ہیں۔ ڈاکٹر محمد اجمل ژونگ کے اجتماعی لاشعور کے زیادہ قریب ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے غالب کے نفسیاتی مطالعے میں بڑے دلچسپ اضافے کیے ہیں۔ اسی طرح ابن فرید اور سید شبیہ الحسن نے غالب کو زیادہ تر فرائڈ کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ابن فرید کے دو مقالے ''غالب کی شاعری میں تسکین ضمیر'' اور ''غالب کی شاعری میں شخصی کشمکش'' اور شبیہ الحسن کا مقالہ ''غالب اور اندیشہ ہائے دور دراز'' اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اختر اورینوی کا مضمون ''غالب کا فنِ شاعری اور اس کا نفسیاتی پس منظر'' ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا ''غالب کی جمالیات'' ڈاکٹر

آفتاب احمد کا ''غالب کی عشقیہ شاعری'' ڈاکٹر وحید قریشی کا ''غالب اور اس کا ماحول'' جاوید وشِشٹ کا ''غالب کی حیات اور شاعری کا جنسی پہلو'' سید محمد عارف کا ''غالب حریفِ لذتِ آزار'' باقر مہدی کا ''غالب اور خوف'' حفیظ صدیقی کا ''غالب کے غم کا نفسیاتی پہلو'' اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مضمون ''غالب کا نفسیاتی مطالعہ'' غالب کے نفسیاتی مطالعے میں اہم مقالات ہیں۔ان مقالات کے ذریعے غالب کے ہر نفسیاتی پہلو پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ان مقالات کے جستہ جستہ نفسیاتی موضوعات کی کڑیوں کو ملایا جائے تو غالب کا ایک ہمہ جہت نفسیاتی مطالعہ مرتب ہو جاتا ہے۔

غالب کے نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں یہ تمام کوششیں ۱۹۸۴ء سے پہلے کی ہیں۔ان کا یہاں ذکر اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی تھی کہ وہ غالب کے پہلے نفسیاتی تجزیہ نگار ہیں۔ گو ڈاکٹر صاحب نے غالب کے نفسیاتی تجزیوں کا ۱۹۶۶ء میں آغاز کر دیا تھا لیکن ان کے ایسے مضامین کتابی صورت میں ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے۔کتاب کی اشاعت پر احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈاکٹر جلیل اشرف کی آرا سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے کتابی صورت میں غالب کے نفسیاتی تجزیے پیش نہیں کیے گئے۔ حالانکہ ایسا دعویٰ ڈاکٹر سلیم نے بھی کہیں نہیں کیا۔غالب کے بارے میں مذکورہ نفسیاتی تجزیوں کو دیکھا جائے تو ڈاکٹر سلیم اختر سے بہت پہلے نہ صرف غالب کے نفسیاتی مطالعہ کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا بلکہ چند ایک مثالوں کے علاوہ بہت سے موضوعات کو سنجیدگی سے زیرِ بحث لایا جا چکا تھا۔فرائڈ، ایڈلر اور ژونگ کے نظریات کو بہ آسانی اور کھلے دل سے غالب کی شخصیت اور شاعری پر آزمایا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی عظمت اور فضیلت اس بات میں نہیں ہے کہ وہ غالب کے پہلے نفسیاتی نقاد ہیں اور انہوں نے غالب کا نفسیاتی مطالعہ پہلی بار کتابی صورت میں پیش کیا بلکہ ان کا امتیاز اور اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے سنسنی خیزی سے ہٹ کر نفسیات کو غیر معالجاتی اور خالص علمی و ادبی انداز سے استعمال کیا۔انہوں نے نفسیات کی خشکی، تلخی اور کرختگی کو دور کیا۔نرم اور لطیف بنا کر نفسیاتی تجزیات میں ادبیت کا رس گھولا اور نفسیاتی تنقید کو ادبی تنقید کے قریب تر کر دیا۔یہ بات ان سے پہلے کے نفسیاتی تجزیات میں کم نظر آتی ہے۔اس طرح نفسیات ان کی روح میں حلول کر گئی ہے اور اردو ادب میں نفسیاتی تنقید ہی ان کی پہچان ہے لیکن انہوں نے کبھی نفسیاتی تنقید کو اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا بلکہ جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں استعمال کرتے ہیں۔نفسیات ان کی اجازت کے بغیر ان کی تحریروں میں نہیں در آتی۔یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے خود نفسیاتی تنقید کو اپنی پہچان بنا رکھا ہے۔ انہوں نے اردو میں نفسیاتی تنقید کو جو معیار اور مرتبہ بخشا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر بنیادی طور پر نفسیاتی نقاد ہیں۔ان کے نفسیاتی تجزیات میں غالب کے نفسیاتی مطالعے کو مرکزی اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ان کی غالب شناسی کا جائزہ لیتے ہوئے غالب پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی ان کی کتاب ''شعور اور لاشعور کا شاعر...... غالب'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب میں مختلف نفسیاتی نظریات کے تحت غالب کی شخصیت کو ان کی شاعری اور خطوط کے آئینے میں دیکھا گیا ہے جو ایک مکمل نفسیاتی تجزیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اصل میں ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب کے حوالے سے ایک یہی کتاب ان کو اپنے عہد کے غالب شناسوں میں شامل کرتی ہے۔اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے غالب پر لکھی جانے والی تنقید کی چند بہترین اور معیاری کتابوں میں اس کا شمار

ہوتا ہے۔ اس میں مقالات زمانی ترتیب سے شامل نہیں ہیں بلکہ غالب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کی منطقی ترتیب دی گئی ہے۔ غالب پر ڈاکٹر سلیم اختر کا پہلا مضمون ''مردِ عاشق کی مثال — غالب'' ہے جو پہلی بار فروری ۱۹۶۶ء میں ''ماہِ نو'' (کراچی) میں شائع ہوا۔ کتاب کی فہرست میں یہ پانچویں نمبر پر درج ہے۔ غالب پر ان کا دوسرا مضمون ''غالب کی نرگسیت'' ہے۔ یہ ''ماہِ نو'' (کراچی) کے فروری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں پہلی بار شائع ہوا۔ پھر اس کے بعد ''غالب خطوط کے آئینے میں'' یہ کراچی سے رسالہ ''سیپ'' کے شمارہ نمبر ۳ میں شائع ہوا۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''نگاہ اور نقطے'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی تو یہ تینوں مقالات اس میں شامل ہوئے۔

۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے غالب پر بہت سی تنقیدی و تحقیقی کتب اور مقالات قلم بند کیے گئے۔ اس دوران میں غالب پر جہاں غیر نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ لکھا گیا وہاں نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی بہت اضافے ہوئے۔ غالب پر نفسیاتی تجزیات کی غرض سے لکھے جانے والے چند ایک کے سوا تمام مقالات اسی دوران میں شائع ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے غالب پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے متعدد مقالات بھی اسی دوران میں لکھے گئے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو غالب کے نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں بجنوری اور شیخ اکرام کی ابتدائی کاوشوں کو چھوڑ کر ڈاکٹر سلیم اختر ان اولین نفسیاتی ناقدین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر خاص توجہ دی۔ ان کے یہ پانچ مقالات معیار و مقدار کے لحاظ سے اور اپنی ادبیت اور عالمانہ مباحث کی بنا پر تو انہیں اور بھی منفرد بنا دیتے ہیں۔ موسیٰ کلیم کی ''مقامِ غالب'' اور سلام سندیلوی کی ''غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ'' اول تا آخر نفسیاتی مباحث پر مشتمل نہیں بلکہ غالب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ان میں نفسیاتی تجزیات کے ساتھ ساتھ غیر نفسیاتی مباحث بھی ملتے ہیں۔ یہی حال اس دوران میں لکھے جانے والے دوسرے متعدد مقالات کا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے سب مقالات ایسی بے ربطی سے پاک ہیں اور اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے خالص نفسیاتی تجزیے ہیں جن میں ادبیت اور عالمانہ استدلال کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

کتاب میں موجود مضامین کی ترتیب کے مطابق پہلا مضمون ''غالب کا نفسیاتی مطالعہ'' ہے۔ اس میں انہوں نے غالب کا نفسیاتی مطالعہ کرنے کی وجہ بیان کی ہے کہ غالب جیسی بھرپور تخلیقی شخصیت کے کلام میں ایسے اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں جن سے غالب کے نفسیاتی رجحانات یا میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے نفسیاتی نقاد کے منصب اول پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اسے نفسیات کے محدودات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس طرح یہ مضمون اس کتاب کی بنیاد اور تمہید کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرے مضمون ''شعور اور لاشعور کا شاعر'' کو اس کتاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی مضمون کتاب کا عنوان بنا ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے تو فلسفی، صوفی اور شاعر کے سفر اور عمل کو واضح کیا گیا ہے کہ فلسفی عقل و استدلال کو رہنما بنا کر حقیقت کا ادراک حاصل کرتا ہے اور صوفی کشف و وجدان کے ذریعے حقیقت تک پہنچتا ہے اور ان دونوں کا طریقہ اپنی ذات سے فرار کا ہے۔ ان کے برعکس شاعر داخلی خلاء میں سفر کرتا ہے اور اس میں پیش آنے والی ہر داخلی و خارجی مصیبت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرح یہ زندگی کے قریب ہوتا ہے اور اسی میں حقیقت کو تلاش کرتا ہے۔

اس مضمون کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس میں غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دیا ہے۔ غالب کی اس خصوصیت

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''غالب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ بیک وقت شعور کا شاعر بھی ہے اور لاشعور کا شاعر بھی۔ دوسرے لفظوں میں اس کے ہاں عقلیت اور نفسی واردات بھی ہے۔ عقل کا اظہار اس کے شعور سے ہوتا ہے جبکہ نرگسیت، رشک اور ایذا پرستی جیسے رجحانات لاشعوری محرکات کے زیر اثر قرار دیے جا سکتے ہیں۔''(۶)

غالب کی شاعری سے اخذ ہونے والے نفسیاتی میلانات کی یہ تقسیم بڑی معنی خیز ہے۔ نفسیات ہر تخلیق کو لاشعوری عوامل کا ثمر قرار دیتی ہے۔ اس کے برعکس غالب کی شاعری میں شعوری دسترس کی کارفرمائی کی نشاندہی کر کے ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی تجزیات میں ادبیت پیدا کی ہے اور اپنے اس نظریے پر کہ ''انہوں نے نفسیات کو کسی اندھے کی لاٹھی نہیں بنایا'' قائم رہنے کا ثبوت دیا ہے۔

انہوں نے صرف غالب کو غیر نفسیاتی انداز سے شعور کا شاعر ہی نہیں قرار دیا بلکہ اس کے لاشعوری اشعار میں بھی غالب کی ہوش مندی اور فن پر دسترس کا اعتراف کیا ہے اور اسی کو غالب کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''غالب کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس نے شعور ہو یا لاشعور ان کی ترجمانی میں فنکار غالب کو بے بس نہیں ہونے دیا۔ اس لیے ان کے شعور کی شاعری محض فلسفہ نہیں اس نے نیوراتی بنے بغیر لاشعور کی شاعری کی۔''(۷)

غالب کے نفسیاتی تجزیے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا نقطۂ نظر، غالب کے دوسرے نفسیاتی ناقدین میں انہیں نہ صرف منفرد بلکہ ممتاز بھی بنا دیتا ہے۔ غالب کی شعوری شاعری میں تصورِ غم کے اشعار اور پھر غالب کے غم کی نوعیت اور اس کے ارتقاء کی وضاحت اور پھر شعور کی شاعری میں غالب کا نرگسی میلان، رشک اور ایذا پرستی کے میلان کی وضاحت کے ساتھ ساتھ غالب کی فن پر دونوں صورتوں میں دسترس کا اعتراف اس مضمون کے مباحث میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ نفسیاتی تنقید میں اسے ڈاکٹر سلیم اختر کی اعتدال پسندی اور بالغ نظری کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ڈاکٹر سلیم اختر کی اس خصوصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''نفسیات کا علم استعمال کرنے کے لیے ڈاکٹر سلیم نے کہیں بھی نفسیات کو زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جہاں کہیں نفسیاتی عمل کی ضرورت محسوس ہوئی وہیں پر ہی نفسیات کی دھار استعمال کی۔''(۸)

یہ مضمون ڈاکٹر سلیم اختر کے تنقیدی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لیے بہت اہم ہے اور اسی بنا پر ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ادب کے مطالعے اور تجزیے میں نفسیات کے اصولوں کو بھی برتا ہے لیکن ادبیت کو کہیں نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے نفسیات کو ادب میں جذب ہو جانے کے قابل بنایا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کی۔ نفسیات اور ادب کا حسین امتزاج ان کے ہاں نظر آتا ہے اور بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نفسیاتی ادب لکھا ہے۔

''غالب خطوط کے آئینے میں'' اس سلسلے کا تیسرا مضمون ہے۔ اس کے شروع میں مولوی عبدالحق کی، خطوط کی اہمیت کے بارے میں رائے پیش کر کے خطوط کی اہمیت اور اس سے جس طرح ایک شخصیت کے بارے میں نفسیاتی میلانات واضح ہو

سکتے ہیں ان کا ذکر کیا ہے، پھر غالب کے مختلف خطوط کے مجموعوں کا ذکر ہے جو تمام مجموعوں کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس کے بعد غالب کے مختلف خطوط کے اقتباسات دے کر اس کی تحلیل نفسی کی گئی ہے۔ مثلاً غالب کی رجائیت اور ظرافت کو وہ نفسیاتی اصطلاح میں دفاعی عمل سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک، غالب کا اپنے خطوط میں احساس برتری کا احساس دلانا اور انفرادیت کا اظہار کرنا بھی اس کے احساس کمتری کا ردعمل ہے۔ اگر غالب قرض خواہوں کے تقاضے پر خود کو برا بھلا کہتے ہیں تو یہ بھی نفسیاتی اصلاح میں وہ صورتحال ہے جب انسان دوسروں کو برا بھلا کہنے سے پہلے خود کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔ اپنی ناتمام آرزوؤں پر تھک ہار کے غالب کا صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کرنا نیز ناقدری زمانہ کا رونا خود کو منحوس کہنا اور موت کا شدت سے انتظار، یہ سب اس کے نفسی میلانات ہیں۔ بے شک نفسیات کی اصطلاحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے ہی تجزیات برآمد ہونے تھے لیکن اگر ایک احتیاط اور کر لی جائے تو ان میں اور زیادہ ادبیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً غالب نے خطوط جن جن لوگوں کو لکھے ان کے مزاج اور مقام و مرتبے کو پیش نظر رکھا جائے کہ وہ کس سطح کے لوگ تھے۔ ظاہر ہے شاگردوں، عام لوگوں، بے تکلف دوستوں اور سنجیدہ و برگزیدہ دوستوں کے نام خطوط کے لہجے میں فرق ہے۔ غالب اس انداز سے اکثر خطوط اپنے مداحین کو لکھتے تھے اور ان کو اپنی مدد پر اکساتے تھے اور ان کے سمند شوق کو تازیانہ دینے کے لیے اپنے بارے میں ایسے الفاظ لکھتے تھے۔ اس انداز نظر سے غالب کے خطوط کے سلسلے میں یقیناً نئے مباحث سامنے آ سکتے ہیں اور نفسیاتی تجزیات میں بھی علمیت اور ادبیت پیدا ہو سکتی ہے۔

''غالب کی نرگسیت'' میں پہلے انہوں نے مختصراً ردیف و قافیہ کی پابندی اور ''تنگنائے غزل'' کی نفسیاتی اہمیت واضح کی ہے کہ ردیف، قافیہ، تلازم خیال کی کڑیوں کو ملاتا ہے جسے تخلیق کار کا ذہن بھی قبول کرتا ہے۔ پھر انہوں نے نرگسیت کو واضح کرنے کے لیے تخلیق کار کے تخلیقی عمل کے مشکل مرحلے سے گزرنے کا ذکر کیا ہے اور پھر اس کے صلے میں فنکار کو نرگسیت کا خواہاں قرار دیا ہے۔ غالب کے نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں غالب کی انفرادیت، رجائیت، ظرافت، جدت پسندی اور خودنمائی کے ایسے دوسرے حربوں کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے ہوتا رہا ہے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے پہلی بار ان تمام جذبوں کے لیے اردو میں غالب کے لیے ''نرگسیت'' کی اصطلاح وضع کی۔ اس مضمون میں بطور خاص خطوط اور شاعری دونوں کے حوالے سے غالب کے نرگسی میلانات کی وجہ بیان کی گئی ہے اور پھر ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نرگسیت کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر نے جذبہ رشک کو شدید مریضانہ جذبہ کہا ہے۔ ڈاکٹر معراج نیر زیدی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سلیم اختر اپنے اس نظریے کا تانا بانا غالب کے روایتی اور غیر روایتی اشعار کے ذریعے بُنتے ہیں اور بہت سے ایسے اشعار کا ڈھیر لگا دیتے ہیں جن میں کسی نہ کسی رنگ میں تعلّی اور نرگسیت کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب کی یہ نرگسیت اکثر مقام پر مریضانہ رشک کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بعض دفع ذات کی آسودگی کے لیے اعلیٰ اور ارفع علامت۔''(۹)

''مرد عاشق کی مثال ... غالب'' اس کتاب میں پانچواں مضمون ہے۔ غالب کے مطالعے کے سلسلے میں یہ مضمون ڈاکٹر سلیم اختر کا پہلا مضمون ہے جو ۱۹۶۶ء میں لکھا گیا۔ اس ضمن میں انہوں نے غالب کو ایسا مرد عاشق قرار دیا ہے جو یکطرفہ محبت کا قائل نہیں ہے۔ غالب کی خود پسندی اور انفرادیت پر ڈاکٹر سلیم اختر اس میں دو نفسی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں، ایک اذیت پرستی اور دوسرا رشک۔ پھر ان دو رجحانات کے نفسیات کی اصطلاح میں نفسیاتی محرکات بیان کرتے ہیں۔

''غالب کی شاعری میں جنس'' خاصا نزاعی مضمون ہے اور عنوان کی حد تک سنسنی خیز بھی ہے۔ اس مضمون میں سب سے پہلے تو اردو شاعری میں جنس کی کارفرمائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے دکن، لکھنؤ اور دہلی کے بیشتر شعرأ کی مثالیں دی ہیں۔ پھر غالب کی شاعری میں جنسی میلانات کی نشاندہی کا جواز پیش کیا ہے کہ وہ بھی ایک مرد تھا۔ اس سلسلے میں اس کے دو نفسی رجحانات کو اہمیت دی ہے۔ کمزوری کا احساس کہ وہ مختلف بیماریوں کا مجموعہ تھا۔ دوسرا نظارہ پرستی سے تسکین یعنی غالب کی جمالیاتی حس۔ اس طرح غالب کے محبوب کے تصور اور اس کی پابوسی وغیرہ کو غالب کا جنسی محرک بتایا ہے۔

یہ بات تو مسلّم ہے کہ ہر انسان میں برتری کا احساس اور کمزوریوں و خامیوں کو چھپانے کی حس، نہ پوری ہونے والی آرزوؤں کی افراط، ان کے نہ پورا ہونے پر اپنی بے اختیاری و بے بسی کا اظہار، جنسی جذبہ، نان ونفقہ کی فکر، اپنے کارہائے نمایاں کا بیان کرنا اور پھر ان کی داد طلب کرنا، داد نہ ملے تو ناقدریٔ زمانہ کا شکوہ، یہ سب چیزیں ہر سطح کے انسان میں کم یا زیادہ موجود ہوں تو پھر ایک انسان میں ان کی نشاندہی کرنے یا اس کی وجوہات بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان بہت پیچیدہ ہے۔ اس کی کئی سطحیں ہیں، یہ ہر وقت ایک حالت میں نہیں رہتا۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ یہ تضاد کائنات کی ہر شے میں موجود ہے، اسے سمجھنا ضروری ہے۔ جنس انسانی فطرت ہے اور جو چیز انسان کی فطرت میں شامل ہے، وہ اس کی تحریر میں کیونکر نہ ہوگی۔ اس طرح دیکھیں تو ہر ادیب و شاعر کی تحریر یا شاعری میں ہر غیر ادیب و شاعر کی گفتگو اور ہر نقاد کی تنقید میں ایسے رجحانات کم یا زیادہ مل جاتے ہیں اور اگر ایک نقاد یا ادیب کا موضوع ہی جنس ہو تو اس سے جنس کی جانب اس کے اپنے قوی میلانات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سنجیدگی اور شرافت کی اوڑھنیوں سے اسے کیموفلاج کر لیا جائے۔

''غالب مکتبِ غم دل میں'' والے مضمون میں تصورِ غم کو غالب کے اشعار کی روشنی میں دیکھا ہے اور مجموعی طور پر، پُر مزاح خطوط سے اور خود پسند و جدت پسند شاعر کے کلام سے جو شخصیت سامنے آتی ہے جسے حالی نے ''حیوانِ ظریف'' کہا ہے۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے غالب کو دکھی اور غمزدہ انسان قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ تجزیہ اس صورت میں زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ ایک تو انہوں نے غالب کو غمزدہ ثابت کرنے کے باوجود اسے غم کے ہاتھوں مجبور ہوتا نہیں دکھایا۔ دوسرا یہ کہ انہیں احساس ہے کہ ایسے غم تو ہر ایک کو ہوتے ہیں، پھر غالب ہی کا ذکر کیوں۔ اس کا جواب انہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جو واقعتاً غالب کی شخصیت سے مطابقت رکھتا ہے کہ غالب نے جس کمالِ نظری سے اس غم کو محسوس کیا اور برتا ہے یا اس سے نپٹے ہیں، قابلِ داد ہے۔

''غالب آتشِ زیرپا'' اس کتاب میں آٹھواں مضمون ہے اور غالب کے نفسی میلانات اور رجحانات کی منطقی وضاحت میں آخری کڑی ہے۔ اس مضمون کے بہت سے مباحث پچھلے مضامین میں بھی آ چکے ہیں لیکن اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں غالب کے خطوط اور اشعار کی روشنی میں اس کے بہت سے نفسی عوامل کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یہ مضمون واقعی اچھوتا ہے۔ اس کے جو مباحث پہلے کسی مضمون میں آئے ہیں، وہ ابتدائی صورت میں ہیں۔ مثلاً غالب کی مزاح نگاری کی بحث اس سے پہلے ''غالب خطوط کے آئینے میں'' اور ''غالب مکتبِ غمِ دل میں'' آ چکی ہے لیکن یہی موضوع اس مضمون میں اپنی مکمل نفسی کیفیت سے بیان کیا گیا ہے اور غالب کی ظرافت کو نہ صرف کیموفلاج کہا ہے بلکہ اسے ''سیاہ ظرافت'' قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نفسیاتی تجزیے کی آخری حدوں سے بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انہوں نے اس میں ان اشعار اور خطوط سے اقتباس بھی دیے ہیں جن میں غالب نے ظاہر داری نہیں برتی بلکہ کھلے

بیدل اپنے غم دوکھ اور محرومیوں کا اظہار کیا ہے۔ اس وجہ سے غالب میں تنہا پسندی پیدا ہوئی۔ اس کی بھی انہوں نے مثالیں پیش کی ہیں اور یہ فرق واضح کیا ہے کہ غالب اگر تنہا پسند ہے تو وہ زندگی سے فرار نہیں چاہتا بلکہ افراد سے فرار چاہتا ہے۔

غالب اگر آتش زیر پا رکھتا ہے تو مقصود صرف جلتے رہنا نہیں یا جلنے کی تمنا نہیں وہ اس سے تخلیق کے چراغ بھی فروزاں کرتا ہے۔ اس کی محرومیوں کی جلن استعارے بن کر اشعار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ غالب کی ایک خصوصیات کا اعتراف ڈاکٹر سلیم اختر کی تجزیہ نگاری کا خاص امتیاز ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب کا طویل ترین مضمون ہے۔

"بیاض غالب کا تجزیاتی مطالعہ" اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے۔ اس میں انہوں نے "بیاض غالب بخط غالب" کی روشنی میں غالب کے انیس سالہ شاعرانہ ارتقاء اور اس کے نفسیاتی میلانات کا تجزیہ کیا ہے۔

اس مضمون کے شروع میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بیاض کا مختصر تعارف کروایا ہے اور پھر غالب کے شاعرانہ ارتقاء میں پہلے بیدل، پھر میر اور درد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ بیدل کے اثرات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ نیز غالب کے اشعار میں تبدیلیوں کی بھی کئی مثالیں دی ہیں۔

انہوں نے غالب کی جدت پسندی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ غالب اپنے اشعار میں جدت کی غرض سے اور خوب سے خوب تر کی جستجو کی غرض سے آخر تک تبدیلیاں کرتے رہے۔ اس کے علاوہ غالب کی ابتدائی شاعری کے موضوعات رشک، خود پسندی، یاسیت، محبوب کا تصور، المیہ اور مزاحیہ کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

"غالب اور چغتائی کے ذہنی رابطے" اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ مصور مشرق عبدالرحمن چغتائی نے غالب کے اشعار کے چند مرقعے بنائے تھے جو انہوں نے "مرقع چغتائی" کے نام سے شائع کیے۔ انہوں نے ہر تصویر پر غالب کا ایک شعر درج کیا ہے اور ساتھ انگریزی میں عنوان بھی جو بقول سلیم اختر بعض اوقات شعر سے زیادہ تصویر کی وضاحت کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے اس مضمون میں اٹھارہ مرقعوں کا تجزیہ کیا ہے لیکن ان تجزیوں سے پہلے جو انہوں نے بنیادی باتیں بتائی ہیں، وہ زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور اس مضمون کو سمجھنے میں زیادہ مدد دیتی ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے بتایا ہے کہ چغتائی نے اگر غالب کے شعور کو سامنے رکھ کر مرقعے بنائے ہیں تو کیا واقعی یہ غالب کے تخیل تک پہنچ پائے ہیں۔ اس کا جواب انہوں نے خود مرقعوں کے تجزیئے میں پیش کیا ہے۔ چغتائی کے یہ مرقعے بعض اوقات تو شعر کی صحیح عکاسی نہیں کر پاتے اور بعض اوقات شعر سے بھی زیادہ بلیغ طور پر شعر کی عکاسی کر جاتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنا ڈاکٹر سلیم اختر کا خاص امتیاز ہے۔ غالب کا تخیل، پھر چغتائی کا تخیل، پھر دونوں کا موازنہ اور ان میں ہم آہنگی اور امتیاز کو واضح کرنا، بہت محنت طلب اور عرق ریزی کا کام ہے جس کی اپنی اہمیت ہے۔

اس مضمون کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ لفظوں کے پیکر تراش کر تصاویر کی جس طرح تشریح کی گئی ہے اور اس کے ایک ایک جز کے حرکت و عمل اور تاثر کو بیان کیا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے بلکہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ایک مرقعے کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> "تصویر میں لبادے کی اڑتی ہوئی تہوں اور بنتے ہوئے دائرے سے حرکت کا احساس کرانے کی سعی ملتی ہے۔ عورت کے سر کے گرد جیومیٹری کی اشکال سے ترتیب پانے والا دائرہ ہے اور اس تناسب کی برقراری کے لیے اس کے پاؤں بھی ایک دائرے میں ہیں...... ایک پاؤں دائرے میں ہے اور دوسرا

رقص میں اٹھا ہے۔ بازو چنیا کے متوازی اور کمر کے پیچھے ہے جبکہ دوسرا کانوں پر ہے، چہرہ یک رخی ہے مگر آنکھوں سے سوچ مترشح ہے۔"(۱۰)

مضمون کے شروع میں ادب اور مصوری یا فنون لطیفہ کے ذرائع اور مواد کا فرق واضح کیا ہے اور اس فرق کو مدنظر رکھ کر چغتائی کے مرقعوں کا تجزیہ کیا ہے۔ پھر غالب کی شاعری اور چغتائی کے مرقعوں کی بنیادی خصوصیت ایشیائی فضا کو قرار دیا ہے اور اس پس منظر میں پھر ان مرقعوں کا تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے اگر ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب شناسی کا جائزہ لیا جائے تو چند موضوعات سامنے آتے ہیں جو غالب کے نفسیاتی مطالعے میں انہوں نے پیش کیے ہیں:

۱۔ غالب بیک وقت شعور اور لاشعور کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری صرف لاشعوری محرکات کا نتیجہ نہیں بلکہ اس نے شعور اور تعقل کی شاعری بھی کی ہے اور جو لاشعور کی شاعری ہے اس میں بھی غالب بے بس یا مدہوش نہیں ہو جاتا۔ فن پر اس کی دسترس اور گرفت بہت مضبوط رہتی ہے۔

۲۔ غالب کی شاعری میں رجائیت اور ظرافت کا عنصر اس کا دفاعی ردعمل ہے جو وہ اپنے غم کو چھپانے کے لیے استعمال کرتا ہے جس کا اظہار خطوط میں کھلے بندوں ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اشعار میں بھی۔

۳۔ غالب غمزدہ ہے اور اپنے غم کو چھپاتا بھی ہے، اظہار بھی کرتا ہے لیکن غم کا اسیر نہیں ہوتا یا اس کو ذہن پر سوار نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کو اپنی شخصیت اور فن میں سمو دیتا ہے جس کا اظہار اس کے اشعار میں ہوتا ہے۔

۴۔ غالب اگر اپنی شاعری میں برتری کا احساس دلاتا ہے یا نرگسیت کا اظہار کرتا ہے تو یہ اپنی احساس کمتری کو چھپانے کے لیے ہے۔

۵۔ غالب مرد عاشق ہے۔ محبوب کی پابوسی کرنے کے باوجود یکطرفہ محبت کا قائل نہیں اور محبوب کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکتا۔

۶۔ غالب کا رشک شدید مریضانہ صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔

۷۔ غالب کو خفقان بھی ہے اور گل کی شاخیں اسے افعی بن کر ڈراتی رہتی ہیں۔

غالب کے نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کے یہ تجزیات زیادہ تر فرائیڈین نقطۂ نظر کے تحت ہیں۔ صرف نرگسیت والا تجزیہ ایڈلر کے نظریے کے تحت ہے۔ ان میں کہیں کہیں ایک آدھ جھلک ژونگ کی بھی مل جاتی ہے۔ غالب کے نفسیاتی مطالعے کے حوالے سے ایسے موضوعات ڈاکٹر سلیم اختر سے پہلے بھی کسی قدر پیش کیے جا چکے ہیں۔

ہر عہد کے بدلتے حالات، ادبی ذوق، نئے علوم و فنون اور نئی تحقیق و تجزیات کے زیر اثر غالب کے فکر و فن اور شخصیت کو بھی نئے زاویوں سے دیکھا جاتا رہے گا اور ان اضافوں پر اضافے ہوتے رہیں گے لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے نفسیاتی تجزیے سے غالب کے مطالعے کو جو تکمیل کی صورت ملی ہے، اپنے مخصوص موضوع کے حوالے سے اس کا اپنا امتیاز و اعجاز ہے۔ قتیل شفائی شاعر ہیں لیکن خود کو اس دلچسپ تنقیدی کتاب کو پڑھنے پر مجبور پاتے ہیں:

"غالب پر ان کے مقالات کا مجموعہ "شعور اور لاشعور کا شاعر غالب" میرے مطالعے کا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ مجھ ایسا سہل پسند قاری بھی یہ تحریریں پڑھنے پر مجبور پاتا ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب شناسی میں ان کی کتاب "شعور اور لاشعور کا شاعر...... غالب" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے

بلکہ یہی ایک کتاب انہیں غالب پر درجنوں کتابیں لکھنے والے غالب شناسوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

''شعور اور لاشعور کا شاعر ــ غالب'' خالص نفسیاتی اصولوں کے تحت لکھی گئی ڈاکٹر سلیم کی ایک مستند کتاب ہے۔ گو اس کا ہر مقالہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن غالب کی شخصیت، شاعری اور خطوط کے پس منظر میں انہوں نے جو نفسیاتی نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی منطقی ترتیب ایک مکمل نفسیاتی تجزیے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کتاب میں اس شرح و بسط سے یقیناً پہلی بار غالب کو اس کی شاعری اور خطوط کے آئینے میں رکھ کر اس کی شخصیت کے نفسی میلانات سے پردے اٹھائے گئے ہیں اور اس کے لاشعور سے ہم کلام ہونے اور مصافحہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب اپنی انفرادیت کی وجہ سے نہ صرف غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے بلکہ اردو ادب میں خاص طور پر نفسیاتی تجزیات میں اس کتاب کو ایک منفرد اور اہم مقام حاصل ہے۔ غالب کے نفسیاتی تجزیات میں یقیناً یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

غالب پر انہوں نے ایک کتاب مرتب بھی کی ہے جو رسالہ ''نگار'' میں ''ذخیرۂ غالبیات'' کے جائزے اور قابل قدر مقالات کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں معروف ناقدین اور محققین غالب کے ۳۵ منتخب تنقیدی اور تحقیقی مقالات شامل ہیں۔ مرتب نے ان مقالات کو موضوع کی نسبت سے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ''نگاہ نیاز'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں صرف نیاز فتح پوری کے ساتھ مقالات درج ہیں جن سے نیاز کی غالب شناسی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسرے حصے کے سولہ مقالات ''قدر و معیار کی جستجو'' کے عنوان کے تحت ہیں۔ اس ذیل میں مالک رام، امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سید معین الرحمن، آل احمد سرور اور خلیق انجم جیسے نامور ناقدین و محققین غالب کی تنقیدی و تحقیقی کاوشیں خاصے کی چیز ہیں جو ''غالب شناسی اور نیاز و نگار'' کے نگار خانے کا معیار بلند کیے ہوئے ہیں۔ تیسرے حصے ''غالب اور روسی مستشرقین'' میں سات روسی غالب شناسوں کے آٹھ مقالات شامل ہیں۔ یہ سب ''نگار'' کے ستمبر ۱۹۸۲ء کے ایک ہی شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ ان مقالات کے انتخاب سے روس میں غالب شناسی کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ آخری حصہ ''شخصیت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں چار مقالات ہیں جو صرف غالب کی شخصیت سے متعلق ہیں۔

کتاب کے آخر میں رسالہ ''نگار'' کے ''ذخیرۂ غالبیات'' کا ''اشاریہ'' دیا گیا ہے لیکن اس میں بعض مقالات کا اندراج نہیں ہو سکا۔ مثلاً ڈاکٹر احسان الحق نے اپنے ایک مضمون [۱۲] میں نشاندہی کی ہے کہ اس اشاریے میں غالب پر نیاز فتح پوری کے پانچ مقالات اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے آٹھ مقالات کا اندراج ہونے سے رہ گیا ہے۔ مشمولات میں اس کتاب کے مرتب کا نو دس صفحات کا پیش لفظ ایک مقالے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ صرف اس کتاب کا تعارف ہی نہیں بلکہ اس میں غالب کی فکری جہات کے بارے میں بھی انہوں نے رائے دی ہے جو خالص حوالے کی چیز ہے۔

اس کتاب کے علاوہ بھی ڈاکٹر سلیم اختر نے غالب پر چند ایسے مقالات قلم بند کیے ہیں جو اپنی نوعیت میں اس لیے منفرد ہیں کہ ان میں عام روش سے ہٹ کر غالب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے غالب پر ایسے غیر مدون مقالات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ دیوان غالب کی تقریب رونمائی (مزاحیہ)

۲۔ غالب کا حامی مقلد۔ غلام رسول مہر۔

۳۔ کیا آج غالب کی ضرورت ہے؟
۴۔ غالب اور انقلاب ستاون از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (تبصرہ)
۵۔ غالب اکیسویں صدی میں۔

یہ پانچ مضامین مختلف رسائل میں متعدد بار شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی کتاب ''نفسیاتی تنقید'' کا ایک باب ''نفسیاتی ناقدین کا محبوب موضوع...... غالب'' اور ''غالب شناسی اور نیاز و نگار'' کا طویل دیباچہ بھی دو الگ الگ مضمون تصور کیے جا سکتے ہیں۔ ان تحریروں کی بنیاد پر غالب سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر کا ایک نیا مجموعہ صورت پذیر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے غالب پر بہت زیادہ نہیں لکھا لیکن جتنا لکھا ہے، اپنے خاص نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ مجموعی طور پر ان کی غالب شناسی کی چند اہم خصوصیات میں سے پہلی اور بڑی خوبی تو یہ ہے کہ نفسیاتی تجزیات میں ڈاکٹر سلیم اختر کا اپنا ایک نقطۂ نظر ہے کہ ''میں نے کبھی نفسیات کو اندھے کی لاٹھی نہیں بننے دیا۔'' اس کی مثال ان کا غالب کو شعور اور لاشعور کا شاعر قرار دینا ہے کیونکہ نفسیات تو ہر تخلیق کو لاشعوری محرکات کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔

ان کی غالب شناسی کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نفسیات تقریباً ہر تخلیقی شخصیت کو کسی نہ کسی مرض میں مبتلا سمجھتی ہے اور اس کے جذبوں کو مریضانہ کہتی ہے۔ انہوں نے بھی غالب کے رشک کو شدید مریضانہ کہا ہے اور اس کی ظرافت کو ''سیاہ ظرافت'' کہا ہے لیکن غالب کے نفسیاتی مطالعے میں اعتدال کی راہ ان کی اہم خصوصیت ہے۔

ان کے مباحث میں منطقی ربط اور عالمانہ استدلال ہے۔ ہر بات کا جواز پیش کرتے ہیں۔ ہر تجزیے میں غالب سے پہلے کی شاعری میں اس موضوع کا سراغ لگا کر اسے پس منظر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل وسعت مطالعہ کی دلیل ہے۔

نفسیاتی تجزیات میں عام ناقدین کی طرح یہ سنسنی خیزی سے بچ کر چلتے ہیں اور ان تجزیات کو خالص علمی و ادبی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مضامین میں ''شعور اور لاشعور کا شاعر...... غالب''، ''مکتبِ غمِ دل میں''، ''غالب آتش زیرِ پا'' اور ''غالب اور چغتائی کے ذہنی رابطے'' خالص ادبی نوعیت کے ہیں۔

ہر نئی بات شروع کرنے سے پہلے ان کا اس کے بارے میں سوال کرنا، ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سوالیہ انداز سے یہ قاری کو متوجہ کرتے ہیں اور اس کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ پھر بعد میں خود جواب مہیا کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً ''غالب اور چغتائی کے ذہنی رابطے'' میں سب سے پہلے تو یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا چغتائی غالب کے تخیل تک پہنچ پائے ہیں اور پھر باقی تمام مرقعوں کے تجزیات میں اس بات کا جواب پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے مضمون ''کیا آج غالب کی ضرورت ہے؟'' میں تو یہ انداز اپنے عروج پر ہے کہ بات بات پر سوالیہ انداز اور پھر خود اس کا مدلل جواب مہیا کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کا یہ انداز بہت نمایاں اور منفرد ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کے اسلوب کی ایک خصوصیت اپنی تحریروں میں مصرعوں کا استعمال ہے۔ پورے شعر یا ایک مصرعے یا آدھے مصرعے کا استعمال بھی ان کا خاص امتیاز ہے، اس طرح اپنے بیان میں اختصار اور جامعیت اور بلاغت کی خصوصیات پیدا کر لیتے ہیں۔ آج ڈاکٹر سلیم اختر کی غالب شناسی کی عمر پورے چھیالیس برس ہو چکی ہے۔ غالب پر ان کا پہلا مضمون فروری

۱۹۹۰ء کے ماہِ نو کراچی میں شائع ہوا تھا۔ اب تک ان کا آخری مضمون بھی کراچی ہی سے "قومی زبان" کے تازہ شمارہ فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ان کا یہ تازہ مضمون اکیسویں صدی میں غالب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی غالب شناسی کے نئے لہجے کا بھی پتا دیتا ہے۔

حواشی:

۱۔ عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر: محاسنِ کلامِ غالب، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، ۱۹۲۱ء
۲۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: غالب نامہ، بمبئی، تاج آفس محمد علی روڈ، ۱۹۳۴ء
۳۔ محمد [illegible]: مقامِ غالب، پٹنہ، ادارۂ تحریر، نومبر ۱۹۶۵ء
۴۔ سلیم صدیقی، ڈاکٹر: غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۹ء
۵۔ سلیم احمد: غالب کون؟ کراچی، مکتبہ المشرق، ۱۹۷۱ء
۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، لاہور، فیروز سنز، س ن، ص: ۲۱
۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، ص: ۲۷
۸۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر: نوائے وقت، لاہور، ۱۳ اگست ۱۹۸۵ء
۹۔ معراج نیر زیدی، ڈاکٹر: راوی، لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۷۷
۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: شعور اور لاشعور کا شاعر غالب، ص: ۱۷۱
۱۱۔ قتیل شفائی، بحوالہ: ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت و تحقیقی شخصیت، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، گورا پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص: ۲۷۵
۱۲۔ احسان الحق، ڈاکٹر محمد: تحقیق نامہ، شمارہ ۹۱ ـ ۷، لاہور، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۷ ـ ۱۹۹۸ء، ص: ۱۲۵



ندیم غزل:



میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر — ریت پہ بیٹھا پھول بناتا رہتا ہوں
میں، میرے نقاد بہت ہی بُرا سہی — اتنا برا نہیں ہوں جتنا اچھا ہوں
رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیمؔ — شام کا پہلا، صبح کا آخری تارا ہوں
پاس رہے جس کو آدابِ عداوت کا — میں دیوانہ اُس دشمن پر مرتا ہوں
شاید مستقبل کا مؤرخ ہی سن لے — پتھر کی دیوار پہ دستک دیتا ہوں

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیمؔ
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں

("لوحِ خاک" احمد ندیم قاسمی)

’’گناہ کی مزدوری‘‘ --- اور مرزا حامد بیگ کے افسانے

نصر عباس نقوی

مرزا حامد بیگ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ’’گناہ کی مزدوری‘‘ ستمبر ۱۹۹۱ء میں سامنے آیا تو مجھے یونان کے مشہور ڈرامہ نگار یوری پیڈیس (Euripides) (۴۰۶ق۔م تا ۴۸۰ق۔م) کا ڈرامہ ’’میڈیا‘‘ (۴۳۱ق۔م) کا خیال آ گیا جس کی غیب گو کاہنہ، اپالو دیوتا کے مندر میں بیٹھ کر غیب کی خبریں بتایا کرتی۔ جو کوئی بھی اس سے مستقبل کے متعلق سوال کرتا تو پہلے وہ کوئی نشیلا شربت پیتی، پھر لوبان سلگا کر اس کا دھواں سونگھتی اور پھر سوالی کو علامتی انداز میں اُس کے سوال کا جواب دیتی۔ مرزا حامد بیگ بھی پیشگوئیاں کرتا ہے لیکن لوبان کا دھواں سونگھ کر نہیں۔

لووَل کا کہنا ہے کہ کسی ملک کی حکومت کو جاننے کے لیے صرف اس کے اداروں کی ظاہری شکل وصورت دیکھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ پورے نظام پر کس طرح سے عمل ہوتا ہے اور وہ عوامل کون سے ہیں جن کے تحت وہ حکومت چل رہی ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عوام الناس کے کردار، عادات اور سابقہ روایات پر گہری نگاہ ڈالی جائے۔[1] چنانچہ ’’گمشدہ کلمات‘‘ افسانوی مجموعے کے کرداروں کا جائزہ لیتا ہوں تو یہ سارے کردار مجھے جبر برداشت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہونٹ کسی قسم کی فریاد اور احتجاج سے محروم ہیں۔ شاید اس کی وجہ مرزا حامد بیگ کے مغلیہ خاندان کا وہ تاریخی خوف ہے کہ دارا شکوہ کی طرح کہیں اُس کی بھی آنکھیں نہ نکال دی جائیں۔ چونکہ اس کی تاریخ ایک لہو بھری داستان ہے، لہٰذا وہ جگہ جگہ بلکہ بار بار اپنے تاریخی خوف اور خون آلودہ خاندانی کہانیوں کی وجہ سے مغل تلازمے استعمال کرتا ہے۔ درحقیقت مغل تہذیب کسی سماجی، مذہبی یا معاشی انقلاب کی مرہونِ منت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے برصغیر کے سماج میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ البتہ مغلوں نے اس زمینی سماج اور تہذیب کو ضرور اپنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا حامد بیگ میں اپنے پرکھوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی مضطربانہ آرزو ملتی ہے۔

’’گمشدہ کلمات‘‘، ’’تار پر چلنے والی‘‘ یا ’’گناہ کی مزدوری‘‘ ان تین افسانوی مجموعوں کے زیادہ تر افسانے ’’ذات‘‘ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذات سے میری مراد ہمارا اپنا جسم ہے جس کا کچھ حصہ آسانی سے ہمارے مشاہدے میں آ جاتا ہے اور کچھ حصہ اوجھل رہتا ہے۔ پانی میں تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح یا گرہن لگے چاند کی مانند ... ایک آوارہ بادل کے ٹکڑے جیسا۔

ایسے میں وہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ اس کا ماضی اسے واپس کر دیا جائے۔ وہ ماضی جو کفن کی طرح سادہ ہے لیکن اس کا ماضی اس سے بہت دور ہے۔

''وہ ازل سے اداس اور اکیلا تھا۔ اپنے آپ میں گم اور اکیلے پن میں مگن۔ اس نے دنیا کی طرف سے آنکھ بند کر لی تھی۔''

(افسانہ: ''ایک خاکی کا معراج نامہ'' مجموعہ:''تار پر چلنے والی'')

یہ ازلی اکلاپا جو مرزا حامد بیگ پر مسلط ہے، اسے خود کلامی پر مجبور کر دیتا ہے۔ یونان کے سات دانشوروں میں سے ایتھنز کے دانشور سولن (Solon) کا کہنا ہے کہ ''اپنے آپ کو پہچانو'' لیکن اپنی پہچان اسی وقت ہو سکتی ہے جب قلم کار کسی عظیم تجربے سے گزرتا ہے۔ مرزا حامد بیگ طبقاتی نظام کے اس تجربے سے گزر کر انسان کے وجود کا احساس کرتا ہے اور اپنے آپ کو پہچان کر فرد کے احساس کو بھول جاتا ہے۔ امراءالقیس جب اپنے باپ حجر بن عمرو کندی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یمن سے نکلا تو اس نے رسم کے مطابق تین تیر توڑ کر استخارہ کیا مگر ہر دفعہ یہی استخارہ نکلا کہ انتقام ترک کر دو۔ اسے دیوتا پر سخت غصہ آیا اور تیروں کے ٹکڑے دیوتا کے منہ پر مار کر بولا ''لعنت ہو تجھ پر۔ اگر تیرا باپ قتل ہوتا تو تو مجھے ہرگز منع نہ کرتا۔'' لیکن چونکہ اس میں لڑنے کی طاقت نہیں تھی، لہٰذا وہ بدلہ لینے میں ناکام رہا۔ ہماری نسل بھی باپ کا بدلہ لینے میں ناکام ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام روزانہ حسین کو قتل کرتا ہے اور روز نئی کربلا بناتا ہے۔ اسی لیے مرزا حامد بیگ کے ہاں آرزوؤں کے مرگھٹ میں اکیلی لاش کے جلنے کا احساس نظر آتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے بازو طاقتور نہیں جن سے وہ نئی دنیا تعمیر کر سکے۔

آج اگرچہ سرد جنگ کا اختتام ہو چکا ہے، دنیا میں طاقت کے سیاسی توازن ختم ہو چکے ہیں لیکن ہمارا معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام کی آغوش میں گر رہا ہے۔ ریاست پر سرمایہ داری کے تفوق نے مزاجِ شاہی کی رعونت میں مزید اضافہ کیا ہے اور ان جذبات کا خاتمہ کر دیا ہے جس کی نقیب انسانیت دوستی ہے۔ افسانہ ''بات'' اسی افسرانہ بیوروکریسی کے شاہانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے بے بس اور پسے ہوئے طبقے کی ادھوری خواہش کے بے کفن ادھورے لاشے ہیں جن کی ہڈیاں ذرا سی جنبش سے رخ بدل لیتی ہیں۔ سڑکوں پر آڑھی ترچھی لاشوں سے کھچی ہوئی لکیریں جن سے مرزا حامد بیگ زمین کے ننگے سینے پر نئی کہانی بُن رہا ہے یہ ان گنت لکیریں جو اپاہج انسانوں کا اثاثہ ہیں جو ''نیند کے ماتے'' کی طرح فراق میں نڈھال، دکھی ہر طرف اداسیاں بانٹتے پھرتے ہیں اور امن امن پکارتے ہیں۔

افسانہ ''گناہ کی مزدوری'' کا کردار ایک انوکھی سچائی ہے۔ ایک ایسا کردار جو زندگی کے اداس لمحوں کی آہٹ سے شکست خوردہ خواب لے کر نئی تمناؤں کو حوصلہ دیتا ہے اور ازل سے گردن میں طوق پہنے مسافروں کی سیاہ قسمت کی مانگ بھر کر راستہ دکھاتا ہے لیکن یہ وہ راستہ ہے جس پر سنگریزے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسے سنگریزے جن کی نوکیلی کرچیاں برہنہ پاؤں کو ڈستی ہیں۔

نسلی، لسانی، معاشی، معاشرتی اور طبقاتی نظامِ سیاست نے ہماری ہر تمنا کو نگل لیا ہے۔ مذہبی تعصبات نے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو غیر اہم بنا دیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو مذہبی روایات کا امین سمجھتے تھے، بے گناہوں کو کانٹوں کا تاج پہنا کر خوش ہو رہے ہیں۔ منصور حلاج کے ٹکڑے کر رہے ہیں لیکن اُن کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ اس لیے کہ وہ متبرک لوگ ہیں۔ ''گناہ کی مزدوری'' ایسے ہی ماحول کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

''حاکم نے لوگوں کے روبرو اپنے دونوں ہاتھ تسلے کے پاک پانی میں دھوئے اور کہا لواب میں

اس راست باز کے خون سے پاک ہوا..... تم جانو اور تمہارا ایمان، میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔''

پروہت یک زبان ہو کر بولے: ''اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد پر۔''

(افسانہ ''گناہ کی مزدوری'' مجموعہ ''گناہ کی مزدوری'' مطبوعہ: ۱۹۹۱ء)

''گناہ کی مزدوری'' کے افسانے ایک بے نام سے احساس کی ایسی چیخ محسوس ہوتے ہیں جسے مرزا حامد بیگ اپنے سینے میں دبا کر رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ چیخ ان گنت لمحوں کے ایک کربِ مسلسل کو لیے نئے نئے چہروں ''سانڈنی سوار''، ''جنم جوگ''، ''اندھی گلی'' اور ''لاکرز میں بند آوازیں'' میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ ماضی کا آئینہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس آئینے کی کرچیں اُس کی آنکھوں میں کھب کر اس کی بینائی کو پی جاتی ہیں اور اپنی مجروح زبان اور بے بصر آنکھوں کو ساتھ لیے اس احساس کے تحت زندہ رہتا ہے کہ شاید اسے جینے کی اجازت مل جائے۔ ''پھول بانٹنے والا'' ایک ایسی تمنا کی کہانی ہے جو سسکتے نغموں کی آہ بن کر چشم گہر کے دامن میں چھپ گئی ہے۔ یہ حسین جذبوں کی آندھیوں کو موت دینے کی کہانی ہے۔ سہانے سپنوں اور خوش کن آرزو کو شکست دینے کی واردات ہے۔ مرزا حامد بیگ سوچتا ہے کہ کاش وہ بند دروازے کے پیچھے قید رہنے والے وجود سے بے خبر ہی رہتا اور اپنی نوکِ زباں سے صبحوں کے گرد پھیلی طویل راتوں کی تیرگی کو پی لیتا لیکن سماج کی وہ صدائیں جو بھیڑیے کی غراہٹوں میں بدل چکی ہیں، انھیں اپنی محبت کی نغمگی میں بدل دیتا تا کہ جبر کا طلسم ٹوٹ جائے لیکن جب وہ اس کے اظہار کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی زبان پر خنجر کی نوک اور دہن پر ایک پاسبان کھڑا ہے۔ اس کے باوجود اس کا تصور صداقتوں کی گواہی کے لیے سب کچھ نظر انداز کر دیتا ہے۔

''اندھی گلی'' زندگی کی کشمکش کا افسانہ ہے جس سے وہ باہر نکلنا چاہتا ہے لیکن عصرِ حاضر کے مسائل اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی مخصوص فضا میں رہ کر حقائق بیان کرے۔ یہ افسانہ زندگی کا وہ المیہ ہے جس کی اذیت سے مرزا حامد بیگ کا شباب دوچار ہے۔ ''اندھی گلی'' کے کرداروں کی روح پر چھایا ہوا مہیب سناٹا اسے نغمۂ آلامِ جاں سناتا ہے جس کے زہر کی حدت سے وہ پگھل کر یادوں کے پُرہول طلسم میں ڈوب جانا چاہتا ہے لیکن سماجی تعلقات اس کے بدن میں ہر لمحے نیا درد پیدا کر رہے ہیں، واقعات کا دُہراوا اسے نہ تو تاریکیوں میں چین لینے دیتا ہے اور نہ ہی اجالوں میں اسے سکون کا کوئی گوشہ میسر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے افسانوں میں وہ معصومیت نہیں رہی جو قدیم افسانوں کا خاصہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پرانے افسانہ نگاروں کے اذہان میں مستقبل کا کوئی مکمل نقشہ نہیں تھا۔ حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر ڈھکے چھپے انداز میں تنقید کی جاتی تھی لیکن اس تنقید کے لیے عام طور پر مذہب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ ادیب، شاعر یا مفکر حکمرانوں کو ایک بہت بڑا مصلح بنا کر پیش کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ کوئی سماجی تبدیلی آنا ناممکن ہو جاتی۔ قدامت پسندی اور حصولِ معاش کے لیے زمین سے گہری وابستگی ہمارے ادباء کو مفلوج کر دیتی جبکہ موجودہ دور کا ادیب اگرچہ اپنی زمین سے وابستگی تو رکھتا ہے لیکن وہ اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے دکھوں کی نمائندگی کرتا ہے، زمین کے غم کا اظہار نہیں کرتا، زمین پر رہنے والے انسانوں کے غم کا اظہار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کے اس اظہار نے ہمارے افسانے سے معصومیت چھین لی ہے اور وہ ان سچائیوں کی پہچان بن گیا ہے جو اپنے اندر خطرناک حد تک زہر رکھتے ہیں۔ اُس کی دعائیں تیرہ بخت، اس کے سجدے بیکار اور اس کے سرمدی نغمے ایک سراب نظر آتے ہیں۔ اس کے آئینے ان تمناؤں کا مداوا کسی صورت نہیں بن سکتے اور وہ خدا سے سوال کرتا ہے کہ وہ کہاں جائے؟

مرزا حامد بیگ کے لیے ''اکیلے پن'' کے زندان اور مہیب دیواروں سے باہر آنا ممکن نہیں لیکن اس کی تنہائی ایک ذات ہے جو نئی معنویت سے مشروط ہے۔ وہ حقائق اور صداقت کی جستجو کے لیے کوشاں ہے کیونکہ وہ پھر سے اپنی ذات کو متشکل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ہی کہانی اور اپنے اندر کے جہنم کی کہانی سے نبرد آزما ہے۔ اپنی اکیلی قوت مدافعت کے بل پر اپنا راستہ آپ تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ وہ اپنے مقدر کا خود مالک بننا چاہتا ہے۔ آج دنیا کی بساط سیاست میں تبدیلیاں آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ مختلف ریاستیں اور غلام قومیں آزادی حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ جب بھی کوئی شخص ان حالات کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ ان تمام دلچسپیوں کو خارج کر دیتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ اجتماعیت کی بات کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے صرف تجربہ نہیں بلکہ سوچے سمجھے تجربے ہیں۔ اس کا تخیل، تخیل نہیں بلکہ سچائی ہے۔ وہ خود دیکھتا ہے، سوچتا ہے اور پھر مشاہدہ کر کے لکھتا ہے:

> ''تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور اسے بستی سے دو کوس باہر کھلے میدانوں تک نکل جانا تھا۔ وہ راستے میں ہی ہانپ گیا۔ وہ کھلے میں رک گیا، اس کی دائیں ہتھیلی ابھی تک کان پر جمی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں ہر طرف کچھ تلاش کرتی تھیں۔ وہ اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیوں پر بار بار گھومتا، چند قدم چل کر رک جاتا اور اس کی آنکھوں میں پتلیاں پھیل سکڑ رہی تھیں۔ وہ ایک جگہ چند ساعتوں کے لیے بیٹھ گیا۔
>
> ہر طرف چپ چڑا تنگ تھی
>
> ...... کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ گھر سے نکلے ہی نہ؟''

(افسانہ: ''سونے کی مہر'' مجموعہ ''گمشدہ کلمات'' مطبوعہ جنوری: ۱۹۸۱ء)

مرزا حامد بیگ یونانی دیومالائی کردار ایکٹی آن (Actaeon) کی طرح ہے جس نے آرٹیمس (Artemis) کو ننگا دیکھ لیا ہو اور جس نے غصے میں آکر اس کے پیچھے شکاری کتے لگا دیے ہوں جو اسے شکار کرنے کے لیے ہر لمحے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حامد بیگ نے بھی سماج کو اس کی فطری حالت میں دیکھ لیا ہے اور اس کے منافقانہ روپ کا اظہار کیا ہے۔ ماحول کی گھٹن، زندگی کی تلخیاں، تمدن میں تخریب کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہمارے عہد کی ایسی خصوصیات ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنوں پر قبضہ جما لیا ہے جس سے روشنی ختم ہو گئی ہے۔ مکر وریاکاری نے ہماری زندگیوں کو پُر فریب بنا دیا ہے۔

> ''حضور مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے سچ مچ بھیڑیے اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لیے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ آپ کے نقصان کی تلافی ہو۔''

(افسانہ: ''مغل سرائے'' مجموعہ ''گمشدہ کلمات'')

آئی۔ اے۔ رچرڈز نے کہا ہے کہ ''ہر طرف تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نئی تشکیل کریں گی۔''(۲) مگر تیسری دنیا میں یہ تبدیلیاں نئے انداز سے وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ خلیج کی جنگ کے بعد امریکہ نے یہ چاہا کہ دیگر علاقائی قوتیں بھی ختم کر دی جائیں تاکہ کوئی بھی اس کے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ وہ

تیسری دنیا کے ممالک کے اندر مختلف گروپوں کو اسلحہ پہنچا رہا ہے جس کے نتیجے میں غیر مستحکم حکومتیں اپنے استحکام کے لیے مختلف غیر انسانی حربے اختیار کر رہے ہیں۔ بے جرم و بے خطا انسانوں کو دار و رسن کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ احساسِ محرومی سے آبِ حیات کی تشنگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے سماجی نظام کی بنیاد ناانصافی بن گئی ہے۔ چنانچہ مرزا اپنے افسانوں میں مخصوص تہذیبی، سماجی اور ثقافتی پس منظر میں انسانی المیوں کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اگرچہ اندھیروں میں رہ رہا ہے لیکن یہ اندھیرے داخلی اور خارجی دونوں کیفیات کا مظہر ہیں۔ موجودہ دور کے مخصوص نظامِ حیات نے افراد کو اجتماعی نقطۂ نظر سے محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے بغاوت کی روایت پیدا ہو گئی ہے۔ نئی نسل کو ہولناک سماجی جرائم، اربابِ بست و کشاد کی چیرہ دستیاں اور ظلم و ستم کی کہانیاں ''داستان گو کیا کہتا ہے'' کے حوالے سے مرزا حامد بیگ اپنے افسانوں میں بیان کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ ذرے کہیں ستاروں سے انتقام نہ لینے لگ جائیں۔

پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے ''خودکلامی'' (Soliloquy) کا انداز رکھتے ہیں۔ یہ Soliloquy دراصل تنہائی کے عذاب سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ مرزا حامد بیگ کے اپنے اندر اور اس کے زندہ ماحول پر تاریکی مسلط ہو چکی ہے، لہٰذا وہ اس مجبوری کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اس طرح اس کے ہاں ''خودکلامی'' کا انداز خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس کی بدولت سوتے جاگتے کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ نتیجتاً وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حالات نے زندگی اور اس کے وسائل کو مخصوص طبقے کے چند افراد تک محدود کر دیا ہے۔ اس کیفیت کو بدلنے کے لیے وہ انسانیت کی بنیادوں پر ایک نئے نظام کی تعمیر چاہتا ہے۔ چنانچہ اس رجحان کے تحت لکھے گئے افسانوی مجموعے ''تار پر چلنے والی'' میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔

بے شک جو چیز ہماری موجودہ نسل کی روح کو مردہ بنا رہی ہے، وہ بے حسی ہے۔

مرزا حامد بیگ اس بے حسی کو شدت سے محسوس کرتا ہے کہ قاتل کے ہاتھ میں خنجر ہے لیکن ہر طرف ایک سناٹا:

''میں تاریک سناٹے میں بھورے رنگ کے مسالے کے تڑخنے کی آواز سنتا ہوں جس سے اینٹیں ایک ہیں۔ آخر یہ ٹوٹ پھوٹ کب تک چلے گی...... ایک وقت آئے گا جب...... میں اس سے آگے سوچتا ہوں، ایسے لمحات میں میری بے نور پتلیوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔''

(افسانہ: ''واپسی'' مجموعہ ''تار پر چلنے والی'')

موجودہ دور میں اگر کوئی ملک یہ چاہتا ہے کہ وہ مقامی وسائل پر بھروسہ کر کے ترقی کر لے تو ایسا ناممکن ہے کیونکہ مقامی وسائل سے بھوک تو مٹائی نہیں جا سکتی چہ جائیکہ ترقی جبکہ پیداواری قوتوں کا مالک ایک مخصوص طبقہ ہے اور یہی طبقہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ہی لوگوں میں بھوک تقسیم کر رہا ہے۔

''تار پر چلنے والی'' مجموعہ کے افسانہ ''رہائی'' ایسے ہی حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ کیا ہم واقعی اپنی شناخت کھو بیٹھے ہیں؟ کیا ہمارے سر ہمارے جسموں سے اتار لیے گئے ہیں یا ہمارے آقا نے لوہے کا طوق ہمارے گلے میں ڈال کر ہم پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اگر ان سوالات کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کا اثبات میں جواب ملے گا، من حیث القوم سرمایہ دارانہ نظام نے ہمارے سر جھکا دیے ہیں، ہم سے ہماری پہچان چھین لی ہے اور ہم سپر پاور کا طوقِ غلامی پہن کر فخر محسوس کر رہے ہیں:

''میں کیسے پہچانتا، تمہارے سر جو نہیں تھا۔'' سو میں نے تمہیں وہیں رہنے دیا اور ایک بار پھر نکلا اس

وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہوا بہت سرد تھی۔ ایک جگہ منہ کے بل گرا ہوا ہوں اور جب کیچڑ صاف کیا تو پتہ چلا، میرے چہرے کا ناک نقشہ وہیں کیچڑ میں رہ گیا۔"

(افسانہ: "رہائی" مجموعہ "تار پر چلنے والی")

مرزا حامد بیگ کے افسانے انسانی دکھوں کا اظہار ہیں۔ اس کے ہاں رجائیت یا امید نظر نہیں آتی اور نہ ہی وہ صراطِ مستقیم دکھاتا ہے۔ وہ نظام کو بدلنا تو چاہتا ہے لیکن اس کے ہاں طریق کار مفقود ہے۔ اس کے ہاں زخم بند نہیں ہوتے، گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ہاں حقیقت کی تلاش وحشت کی دریافت ثابت ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے "ہراکلس" (Heracles) کی طرح ہے جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ باوجود کوشش کے پرومتھیس (Prometheus) کو رہائی نہیں دلا سکا لیکن اس کی قید پر افسوس ضرور کرتا ہے۔

مرزا کے افسانوں میں "زندگی" موت کی نفی نہیں کرتی بلکہ موت زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ بعد موت زندگی کا تصور اس کے ہاں افسانوی مجموعہ "گناہ کی مزدوری" کے صرف ایک افسانے "چھیری والا" میں ملتا ہے ورنہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا آفتاب دوبارہ طلوع نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں ظلم کو برداشت کر لینے کا تصور ملتا ہے۔ ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور نہیں ملتا، زیادہ سے زیادہ اس کے کردار دبی دبی صدائے احتجاج بلند کر لیتے ہیں۔ وہ صرف گزرے ہوئے اس "کل" کا نوحہ پڑھتا ہے جو اسے طرح طرح کے عذاب دے گیا ہے، اس سے حقیقتیں چھین کر جھوٹے خوابوں میں مبتلا کر گیا ہے۔ اس کے گلستانوں کے غنچے پژمردہ، اس کے نغمے روح سے خالی اور اس کے کردار موت سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ مجموعی طور پر مرزا حامد بیگ کے ہاں زندگی کی نوید نہیں ملتی۔ گزرے زمانے پر پچھتاوا ملتا ہے، بشارتیں نہیں ملتیں۔

حواشی:

۱۔ "Continental Government and Parties" P.1-2 از لوول

۲۔ "Science and Poetry" از آئی اے رچرڈز

☆

قیصر نجفی کی نعت گوئی

پروفیسر حسن سجاد

کہتے ہیں کہ ایک بڑھیا سوت کی انٹی لے کر حضرت یوسف کی قیمت لگانے مصر کے بازار میں جا پہنچی تھی۔ اسے حضرت یوسف تو نہ ملے مگر اس کے جذبے کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ معلوم ہوا کہ اگر آپ اپنے مطلوب و مقصود کے لیے اپنے دل میں جذبۂ بے اختیار شوق رکھتے ہیں تو طالب و مطلوب کے درمیان حیثیتوں کا تفاوت ختم ہو جاتا ہے۔ پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں آپ اور کہاں وہ ذاتِ بلند و برتر، یہ وہ مقام ہے جہاں کھنچنے والے کا صرف جذبہ دیکھا جاتا ہے۔ یہی حال حضور پاکؐ کی مہجوری میں تڑپنے والے عاشقانِ زار کا ہے کہ وہ اپنی ہیچ مدانی اور کج بیانی کے باوجود اپنے جذبات کا نذرانہ لے کر دربار رسالت پناہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

قیصر نجفی کا شمار بھی انہی آشفتہ نواؤں میں ہے جو یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرکارِ ختمی مرتبت کی حمد و ثنا کرنا قل ہو اللہ کا جواب لکھنے کے مترادف ہے۔ یہ وہ کوچہ ہے جس تک پہنچتے پہنچتے فکرِ انسانی ہانپنے لگتی ہے اور تخلیقی جوہر کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ قیصر نجفی اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے اپنے شاعرانہ قد و قامت سے شرمائے بغیر اپنے عجزِ بیان کا اعتراف کرتے ہیں:

ہو بہو عشقِ محمدؐ کی کوئی کیفیت
لاکھ چاہے کوئی تحریر نہیں ہو سکتی

سخن کا کون سا طے ہم سے مرحلہ نہ ہوا
تری ثنا کا مگر پھر بھی حق ادا نہ ہوا

نعت وہ واحد صنفِ سخن ہے جو رسمی شاعری کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ غزل گو شعراء نے اپنی کلیات کی ابتداء میں حمد و نعت کو جو جگہ دی، اس کی حیثیت محض رسمی و تقلیدی تھی۔ جن لوگوں نے محض عقیدت کی بنا پر اس فن کو اپنایا، انہوں نے بھی مشکل ہی سے اس میں کوئی شاعرانہ کمال پیدا کیا۔ شاعری، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، شاعر سے جذبے کی شدت اور خیال کی رفعت کا مطالبہ

کرتی ہے۔ جس نسبت سے شاعر کا جذبہ سچا اور گہرا اور اس کی فکر توانا ہوگی، اسی نسبت سے اس کی شاعری موثر اور دلنشین ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ میر کی غزلیں جذبے کی شدت اور غالب کا کلام رفعت تخیل کی بدولت ارفع واعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ فکر کی گہرائی اور جذباتی صداقت کے بغیر محض منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں نہیں آسکتی اور نعتیہ شاعری تو خاص طور پر علم وفکر کے ساتھ ساتھ شاعر سے اس کی شیریں دیوانگی کا ایک ایسا ارتعاش چاہتی ہے جسے اس کے تار رگِ جاں نے چھیڑا ہو۔ قیصر نجفی نے بھی جو کچھ کہا وہ ان کے دل کی آواز ہے جس میں کوئی کھوٹ، کوئی بناوٹ، کوئی تصنع اور کوئی لفظی بازیگری نہیں۔ اسی طرح ان کا نعتیہ کلام رکی اور روایتی نعت گوئی سے بلند ہو کر ایک سرشار مودت کا بے ساختہ اور فطری اظہار بن جاتا ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے:

جب بھی دل نے کہا، لکھی میں نے
نعت رسماً نہیں کہی میں نے

ہے محمدؐ لکھا ہوا دل پر
بیش قیمت ہے یہ خذف میرا

قیصر نجفی یوں تو تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں اور انہوں نے نعت گوئی میں تغزل کی روایات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ فن غزل کا نبض شناس ہونے کی وجہ سے انہوں نے غزل کی رمزیت وایمائیت کو نعت میں اس طرح سمویا ہے کہ ان کی نعتوں کا حسن کچھ اور نکھر آیا ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ کسی خیال کو جب ایک جمالیاتی سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو اس کی رعنائی وزیبائی دوچند ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار دیکھیے:

تو گزرتا ہے مرے دل سے صبا کی صورت
اور یہ ممکن نہیں دیکھوں میں صبا کا چہرہ

جو بھی سوارِ رخشِ ثریا دکھائی دے
تیرے وہ زیرِ نقشِ کفِ پا دکھائی دے

دستِ ہوا پہ رکھا ہوا اک دیا ہوں میں
سرکار کا کرم ہے کہ لو دے رہا ہوں میں

ہوں سنگِ آستاں مرا رتبہ تو دیکھیے
کس شان سے حضورؐ کے در پر پڑا ہوں میں

دیکھوں کبھی جو مصحفِ سرکار خواب میں

میں بھی کروں تلاوت قرآں نگاہ سے

شہرِ نبیؐ کی پہنچے نہ ہم تک اگر ہوا
پھر تو یہی کہیں گے کہ کنجِ قفس میں ہوں

اس دھوپ میں رحمت کا تری چاہیے سایہ
بے فائدہ ہے سایۂ دیوار میں ہونا

راس آئی ہوں جس کو ترے صحرا کی فضائیں
اُس کو ہے قیامت کسی گلزار میں ہونا

امتِ مسلمہ نے سرورِ کائنات، فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک کے ایک ایک لمحے کو محفوظ رکھنے میں جو کوشش و کاوش کی ہے، اس کی کوئی مثال کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔ آپ کی سیرت و کردار کا مکمل خاکہ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ خاص طور پر مسلمان شعراء نے نعتیہ کلام کے ذریعے آپ کی ہر ہر ادا کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور ابتدا ہی سے ثناخوانِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ کے حضور گلہائے عقیدت نذر کرتے رہے ہیں۔ مدحتِ رسولؐ وہ چمن ہے، جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ قیصر نجفی نے بھی اس چمن کی آبیاری میں نہ صرف حصہ لیا ہے بلکہ اپنی فکر کے نوبہ نو گلہائے رنگیں سے اس کی خوش نمائی میں اضافہ بھی کیا ہے۔ ان کی نعتوں میں اس عقیدے کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے کہ حضورؐ ہی کی ذاتِ بابرکات زندگی کی تاریکیوں میں سراجِ منیر ہے۔ آپ ہی کے فیوضِ باطنی سے نوعِ انسانی قعرِ مذلت سے نکل کر بامِ عروج تک پہنچی اور عرب کے صحرانشیں جہاں بان و جہاندار و جہاں آرا بن گئے۔ آپؐ ہی ہمیں زوال سے عروج، پستی سے بلندی، تاریکی سے روشنی اور موت سے زندگی کی طرف لائے۔ اسی عقیدے کی وجہ سے قیصر نجفی کا نعتیہ کلام ایک ایسا آئینہ بن گیا ہے جس میں حضورؐ کی روحانی صفات اور اخلاقی کمالات کا عکس صاف دیکھا جاسکتا ہے۔

تاریخ ہے منور کردارِ مصطفیٰؐ سے
تہذیب ہے معطر کردارِ مصطفیٰؐ سے
بدلی گئی کسی سے کب نفسیاتِ انساں
لو درس رہ نماؤ کردارِ مصطفیٰؐ سے
حسنِ سخا تو یہ ہے لوگو کبھی سوالی
خالی نہیں گیا ہے دربارِ مصطفیٰؐ سے

یہ رخ بھی عجب ہے تری سیرت کا یا نبیؐ
واقف کبھی رہا نہ کسی بددعا سے تو

زخم کھائے اور دعا دے کب کوئی
تجھ سا ہے عبدِ خدا، ربّ آشنا

کائنات بوریہ کا تذکرہ
اک خدائے سادگی کی بات ہے

عدو ٹھہرائیں جس کو اپنا منصف
وہی انساں زمانے میں بڑا ہے

قیصر نجفی کی نعت گوئی کا سب سے نمایاں وصف جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے، یہ ہے کہ ان کی نعتوں میں ایک حکیمانہ سوچ ملتی ہے۔ حضورِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس محض ایک ذات نہیں بلکہ ایک فلسفۂ زندگی، ایک نظامِ فکر اور ایک طرزِ حیات کا استعارہ ہے۔ قیصر نجفی کی نعت، محض آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کا بیان نہیں۔ وہ آپؐ کے حسنِ سیرت کا رشتہ اس پورے نظامِ حیات وکائنات سے جوڑتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ تمام اقدارِ عالیہ جس نکتے پر آ کر اپنی منزل کو پالیتی ہیں، وہ نکتہ آپؐ ہیں۔ زندگی سے کفر و شرک، ضلالت و گمراہی، ظلم و ستم اور بے انصافی کی نفی کر کے ایمان، خیر، سچائی اور عدل و انصاف کا علم بلند کرنے کے لیے انسانیت کو آپؐ ہی کے کردار سے کسبِ فیض کرنا پڑے گا۔ اسی طرح آپؐ کا ذکرِ جمیل محض ایک فردِ واحد کی مدح و ثنا تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس فردِ واحد کے حوالے سے پوری زندگی کی کہانی بن جاتا ہے۔

نبیؐ کی ہر نشانی لکھ رہا ہوں
حدیثِ زندگانی لکھ رہا ہوں
لکھی تھی سب سے پہلے جو خدا نے
وہ اک سچی کہانی لکھ رہا ہوں

اٹھتی ہے جب بھی کوئی جہاں میں صدائے حق
ہم کو سنائی دیتے ہیں ہر اس صدا میں آپؐ
پھر سے خدا کو کرنی تھی تہذیبِ زندگی
آخر میں اس لیے تھے صفِ انبیاء میں آپؐ

بظاہر اے جہاں والو محمدؐ کی گلی میں ہوں
حقیقت میں خدا شاہد ہے کوئے زندگی میں ہوں
شعورِ زندگی، عشقِ محمدؐ کی جنوں خیزی

خوشا اک عمر سے میں اس حصارِ آگہی میں ہوں

قیصر نجفی جدید حسیت کے شاعر ہیں۔ وہ اس بات کا پورا شعور رکھتے ہیں کہ زندگی کوئی جامد شے نہیں بلکہ ایک تیز رفتار دھارے کی مانند مسلسل رواں دواں ہے اور حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ صرف ایک عہد سے متعلق نہیں بلکہ آنے والے تمام زمانوں پر سایہ فگن ہے۔ آج کے عہد میں سانس لیتے ہوئے قیصر نجفی جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کی پس ماندہ اقوام اور بالخصوص مسلمان ممالک، بین الاقوامی نظامِ زر کے شکنجے میں سسک رہے ہیں۔ کشمیر ہو یا فلسطین، عراق ہو یا افغانستان سب کے دامانِ شب و روز بے گناہوں کے خون سے رنگین ہیں۔ ہر طرف بے یقینی، انتشار، اضطراب اور ہیجان برپا ہے۔ انسانیت، بھوک، افلاس اور بیماریوں کے طوفانوں میں گھری ہوئی ہے۔ چہار جانب سے تاریکیاں یلغار کر رہی ہیں اور چشم انسان خون کے آنسو بہانے پر مجبور ہے تو وہ بے ساختہ فریاد کناں ہوتے ہیں۔

کب ختم ہوں گے ان کے یہ سرکارؐ
رنج و غم و آلام
سرکارؐ کڑا وقت ہے
ان پر یہ کڑا وقت ہے سرکار
مانا کہ بہت ہم ہیں گنہ گار
مانا کہ بہت ہم ہیں خطا کار
طالب ہیں مگر درگزر و عفوِ خدا کے
اور لطف و کرم کے ترے سرکارؐ
ہم پر یہ کڑا وقت کڑا وقت ہے سرکارؐ
کڑا وقت ہے سرکارؐ
کڑا وقت ہے سرکارؐ

(فریاد)

لیکن جب مایوسیوں کے اندھیرے گہرے ہونے لگتے ہیں تو قیصر نجفی حالات کے سامنے بے بس ہونے کے بجائے اپنے دل کے نہاں خانے میں جھانکتے ہیں۔ ایسے میں ایک ندیم چہرہ، یاس و ناامیدی کی تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر ابھرتا ہے اور زندگی کی شاہراہ پر اعتماد کے ساتھ گامزن رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

یہ آدمی، آدمی سے خائف
یہ زندگی کے بجائے جاری
ہر ایک لب پر
اجل کے صبح و مسا وظائف
بلکتی انسانیت بہر سو
یہ چشمِ انساں میں لرزاں ہر دم

لہو کے آنسو
مجھے اندھیروں میں، ظلمتوں میں دھکیلتے ہیں
مرے تصور میں یہ سیاہی انڈیلتے ہیں
پر ایسے عالم میں، مجھ کو آ کر
سنبھالتا ہے
مرا تصور اجالتا ہے
مجھے اندھیروں سے، ظلمتوں سے
نکالتا ہے
ندیم چہرہ

(ندیم چہرہ)

اس طرح قیصر نجفی کی نعت، عصری آگاہی کی ایک ایسی دستاویز بن جاتی ہے جس میں ہر درد کا درماں اور ہر زخم کا مرہم، صرف اور صرف سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی اور آپ کا حسنِ کردار قرار پاتا ہے۔

..........☆..........

ندیم نعت گوئی:

"اُن کے ہاں اپنے دین اور اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے گہرا لگاؤ بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب کے قلم سے ایسی ایسی خوبصورت اور روح پرور نعتیں تخلیق ہوئی ہیں جو قلوب واذہان کو ایک نئے انداز کی تازگی اور سرمستی عطا کرتی ہیں۔"

(الطاف حسن قریشی)

"احمد ندیم قاسمی، اس عہد کے صاحبِ فکر شاعر ہی نہیں، صاحبِ علم انسان بھی ہیں۔ یہ کوشش، سعیِ مسلسل اور جہدِ پیہم پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ان کو زندگی میں جو کچھ بھی ملا ہے، انعام کے طور پر ملا ہے اور جو کچھ عطا ہو رہا ہے فضل کے سہارے عطا ہو رہا ہے۔ علم اور سخن اور دین اور سائنس کی دنیا میں تحفوں کی تقسیم ہوتی ہے اور اوپر سے ہوتی ہے اور جس کی آرزو بڑی اور پھیلی جھولی وسیع ہوتی ہے، اس کو ویسا ہی تحفہ مل جاتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ نعت لکھنے یا نعت کہنے کی سعادت بھی اوپر ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

صاحبِ حال ہوئے بغیر، خواہ وقتی طور پر کیوں نہ ہو، نعت نہیں کہی جا سکتی...... قاسمی صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جو نعت کے حصول کے لیے دل کا دامن پھیلا کر بار بار Vally of Mystery اُس وادیٔ سربستہ میں داخل ہوتے ہیں اور اپنے مراد کی مراد پاتے ہیں۔"

(اشفاق احمد)

ایک سفری یادداشت کی جمال آفرینی اور غلام رسول زاہد

ڈاکٹر نثار ترابی

کوسوو شمال مشرقی یورپ میں بلقان کی سرزمین پر واقع ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے اس خطے کے شمال مغرب میں مونٹیگرو، شمال اور مشرق میں سربیا، جنوب میں مقدونیہ اور جنوب مغرب میں البانیہ واقع ہے۔ تقریباً ۳۰ لاکھ کی آبادی پر مشتمل اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو البانوی کہلاتے ہیں۔ یہ عددی تناسب کے اعتبار سے کل آبادی کے ۹۰ فیصد ہیں جبکہ ۸ فیصد سرب عیسائی ہیں۔

کوسوو سربیا کا ایک خودمختار صوبہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں اعلان آزادی کے بعد سے سربیا کی مسلم کش جارحیت کا شکار ہے جسے روکنے کے لیے نیٹو افواج کو مداخلت کرنا پڑی۔ اقوام متحدہ کے زیر انتظام اس ریاست کو فلسطین، کشمیر اور بعض دوسری مظلوم ریاستوں کی طرح ایک لمبے عرصے تک غلامی میں رہنا پڑا۔ کوسوو کو بالآخر آزادی کی نعمت میسر آئی جسے ابھی بمشکل ایک سال ہونے کو ہے۔ سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے اقوام متحدہ کو ''کوسوو مشن'' کے لیے سرگرم عمل کیا تو مشن کے تحت کوسوو پولیس سروس کی بنیاد پڑی۔

اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد دنیا بھر میں موجود ہے جنہیں گاہے گاہے مختلف علاقوں میں امن مشن کی غرض سے اقوام متحدہ کی ہی ہدایت پر روانہ کیا جاتا ہے۔ امن مشن پہ بھیجے جانے والے ممالک میں چونکہ پاکستان بھی شامل ہے، لہٰذا زیر نظر سفرنامے کے خالق اور معروف شاعر و ادیب غلام رسول زاہد کو بھی پاکستان کی جانب سے شعبہ پولیس کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے امن مشن کے لیے دنیا بھر سے انتخاب کیے جانے پر پولیس افسران کی صف میں شامل کیا گیا۔ فاضل سفرنامہ نگار نے اپنے مشاہداتی اور محسوساتی زاویۂ نگاہ کو سفری یادداشتوں کا حصہ بناتے ہوئے ایک ایسی مربوط تحریر کو حتمی انجام دیا جسے ہم بلاشبہ سفرناموں کی جدید کہکشاں میں شامل کر سکتے ہیں۔

کوسوو جو کبھی یوگوسلاویہ کا حصہ تھا، یورپی ممالک میں شامل ہے اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سفرنامہ نگار کو سینئر پولیس افسر کی حیثیت سے ایک سال کے لیے امن مشن پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس ایک سال کے دوران مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کو محض شخصی اظہار کے طور پر نمایاں کرنے کی بجائے دردمند انسانی رویئے اور اجتماعی تہذیبی پس منظر کی شکل میں دیکھا اور محسوس کیا۔

سفر معلوم سے نامعلوم کی طرف ہو تو نئے عقدوں کی کشائی کا لمحہ بنتا ہے۔ ذات سے کائنات کی طرف ہو تو علوم و

[illegible] ظاہر سے باطن کی طرف ہوتا اور اسرار و رموز کی کائناتوں کے در وا ہوتے ہیں۔

[illegible] کے آباد روشن جہان کے جاننے والے جب کسی امر کے پابند ہو کر عازم سفر ہوتے ہیں تو ان [illegible] جاتے دنوں کی یادیں اس طرح سے مرتسم ہو جاتی ہیں کہ جن سے ان کے دل و نگاہ آباد ہو جاتے ہیں۔ [illegible] روز و شب کا احوال جب سینۂ قرطاس پہ لوٹ دیئے گئے تو سفرنامہ وجود میں آتا ہے۔

اردو میں [illegible] ایک باوقار تسلسل کے ساتھ ہمارے علم و ادب کا حصہ ہے۔ منظوم اور منثور دونوں طرح کے سفرناموں کی روشن دنیا [illegible] کے احوال و آثار روا کرتی ہیں۔ یہاں لکھنے والے کے مطالعے اور مشاہدے کے ذریعے ہم اس جہان [illegible] قلب و نظر پر حسن تمام کی صورت اترتا دیکھتے ہیں۔ غلام رسول زاہد کا نام بھی انہی سفرناموں [illegible] ہمیں اپنی انفرادیت سے متاثر کرتا ہے۔ ان کا سفرنامہ "کوسوو میں ایک سال" جہاں [illegible] مصروفیات اور ذمہ داریوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے وہیں ان کے مشاہدے کی بدولت ہمیں اس دھرتی پہ بسنے والے [illegible] رنگ، لوگوں کے طرز زندگی اور معاشرے کی منظر بہ منظر پوری آئینہ داری کرتے ہوئے جہان نو سے آگہی کا فیضان بھی بخشتا ہے۔

غلام رسول زاہد زیر نظر سفرنامے کے خالق ہونے کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجے کے حامل ایک قابل تحسین شاعر بھی ہیں جن کا اولین شعری مجموعہ "حرف شوق" کے نام سے چند برس قبل شائع ہو کر ادب کے سنجیدہ حلقوں میں اپنے حصے کی داد وصول کر چکا ہے۔

شاید اسی سبب سے ان کے ہاں لفظ کے صوتی اور معنوی نظام کی رعایت سے اپنے بیان کی خوبی کو چمکانے میں ایسی طلسم کاری بھی سامنے آتی ہے کہ بعض اوقات کوئی سطر شعر کے ایک مکمل مصرعے میں ڈھل جاتی ہے۔ جیسے سفر کے آغاز میں کوسوو میں پڑنے والی سخت ترین سردی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف یوں رقم طراز ہے:

"گویا ہم تابستان سے عازم زمستان ہو رہے تھے۔"

مذکورہ سفری یادداشت کی جمال آفرینی میں چھپی شعریت کی مزید دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

"انس اور وابستگی کے رنگ و خوشبو نے سفر کو حضر، کاروں کا شہرستان، سرائے کو محل اور گامزنی کی مشقت کو قیام گہی کی راحت میں تبدیل کر دیا۔"

"دل کی بادشاہی میں خلوص کی جہانگیری اور سچائی کی جہاں بانی کو دوام ہے۔"

اسی طرح باہمی انسانی رشتوں کی بازیافت کا مرحلہ ان کے ہاں شاعر ہونے کے ناطے سے احساس و فکر کی فطری پناہ گاہوں میں جاگتا رہتا ہے اور جہاں کہیں بھی ان کی بازیافت کا لمحہ آتا ہے یہ چنگاری کی طرح سلگ اٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوسوو سے واپسی کے مرحلے پر جب مصنف ایئرپورٹ لاؤنج کی طرف بڑھتا ہے تو خدا حافظ کہنے کی غرض سے ایک بارہ سالہ معصوم بچی کے ننھے ننھے اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے اسی عمر کی حامل اپنی حقیقی بیٹی احمرین یاد آ جاتی ہے۔ ایسے میں اس کی آنکھیں پدرانہ شفقت کے احساس کی حدت سے پگھل کر نم آلود ہو جاتی ہیں اور وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ اپنے وطن سے رخصت ہو رہا ہے اور اس کی اپنی بیٹی اسے الوداع کہہ رہی ہے۔

ان کے ہاں دلبری اور رعنائی کے حسن جب مجسم ہو کر الفاظ کا روپ دھارتے ہیں تو ہمیں بیگانگی کی جگہ اپنائیت کے

دلنشین احساسات کی کہکشاں سی اترتی دکھائی دیتی ہے۔ان کے مطابق:

''میرا سفر بنیادی طور پر سرکاری فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں تھا لیکن اس میں دوسرے عناصر بھی شامل ہوتے چلے گئے۔نصف صد ممالک کے پولیس افسران کے ساتھ مل کر اس بلقان میں کام کرنا ایسا بین الاقوامی تجربہ تھا جس نے میرے فکری اور جذباتی آفاق کو وسیع تر کر دیا۔کتاب فطرت کے ساتھ ساتھ انسان دوستی اور تاریخ شناسی کے صحائف پڑھنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔''

ہمیں یہ پیراگراف ان کے پیشہ ورانہ فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے اور مطالعے کی سرحدوں کی وسعتوں کا غماز بھی دکھائی دیتا ہے۔اپنے آغاز ہی میں ان کے احساسات انسانی دردمندی کے جذبے سے یوں لو دینے لگتے ہیں کہ ان کے ترنم خیز لہجے میں درد کی کسک ابھر آتی ہے:

''مسافرت کے اجزائے ترکیبی میں اضطراب اور کسک اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ سفر و حضر کبھی بھی یکساں نہیں ہو سکتے۔اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا ملال، وطن سے دوری کا احساس اور اجنبیت کے درپیش اندیشے دراصل انسان کی باطنی کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔جدائی کا عنصر سفر کو ایک جذباتی جہت دے دیتا ہے۔''

ہمیں یہ اندازہ ہی بتا دیتا ہے کہ لکھنے والا احساس کی دولت سے کس قدر مالا مال ہے۔اس کے اندر کیسے جذبوں کے زیر و بم طن اور جدائی کی کیفیت سے دوچار ہیں اور یہی جذبہ تو ہے جو ہمیں سفروں میں امید و بیم اور حزن ملال کے رنگوں سے آشنا ذائقوں سے لبریز رکھتا ہے۔

غلام رسول زاہد کے ہاں منظروں کی جھلک اپنے ساتھ وابستہ ماضی کی تہذیبی قدروں کے مطالعے کے ساتھ اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ بظاہر وہی منظر ہوتا ہے جو آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے لیکن اس کے باطن میں ایک پورے عہد کا مطالعہ بھی پڑھنے والے کے روبرو آن موجود ہوتا ہے۔

''یہ دبئی ایئرپورٹ ہے۔طلوع آفتاب کے قریب ہمارا جہاز دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہ اترا۔شب بیداری کی خستگی ہم سب پہ طاری تھی۔دبئی عہد جدید کا ایک مثالی پرتعیش شہر شمار ہوتا ہے۔ایئرپورٹ کی زیب و زینت اور چکا چوند دیکھ کر فوری تاثر ایک ایسے نو دولتیے کا پیدا ہوتا ہے جسے یک بیک دولت قارون ہاتھ لگ گئی ہو۔اس کے مقابل میں استنبول کا بین الاقوامی ایئرپورٹ ایک ایسے خاندانی رئیس کی جھلک پیدا کرتا ہے جس کا ماضی اس کے حال سے کہیں زیادہ بہتر اور تابناک تھا۔''

پوری دو تہذیبوں کے ماضی اور حال اس کے ظاہر اور باطن کے آئینہ دار ہیں۔اس طرح سے جھلکتے اس تحریر میں موجود ہیں کہ ہم اس پورے شکوہ کے منظر اور پس منظر میں خود کو آتا جاتا دیکھتے ہیں اور یہ ایک ایسے مشاق مشاہدہ کار کی دروں بینی ہے جسے تہذیبوں کے مال اور اندمال میں جھانکنے کی ہی نہیں بلکہ اسے پیش کرنے کی بھی صنعت گری حاصل ہے اور یہ رنگ اس وقت تو اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب سفرنامہ نگار بحیرہ مارمورا کے شفاف پانیوں کو دیکھتا ہے:

''جب میں بحیرہ مارمورا کے نیلے شفاف پانی دیکھ رہا تھا تو میرے ذہن کے نہاں خانوں میں وہ سنسنی خیز مناظر ابھر آئے جب سلطان محمد فاتح اور اس کے پراسرار لشکر نے چند سو سال قبل (۱۴۵۳ء)

میں دیکھتا، اس ناقابلِ تسخیر شہر کو فتح کرنے کے لیے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ بحری جہازوں کو زمین
سے خشکی پر رواں کر دیا تھا۔ جب مدائن فتح کرنے والے اسلامی لشکر کے شہ سواروں نے ٹھاٹھیں مارتے
ہوئے دجلہ کو اپنے گھوڑوں پر عبور کیا تو رستم اور فیل تن کے فرزند دیواں آمدند، دیواں آمدند کہتے ہوئے
جان بچا کر بھاگے ہوئے تھے۔ میں سمندر کے کنارے کھڑا سوچ رہا تھا جب صبح کی پہلی کرن کی روشنی میں
بازنطینی تہذیب قسطنطنیہ کے مغرور اور بزعم خود غلط سورماؤں نے شہر کی فصیل کے ساتھ محمد فاتح کے جنگی جہازوں
کے سر بلند بادبان دیکھے ہوں گے تو ان کے حوصلے کی پستی کا کیا عالم ہوگا اور انھوں نے تئیس سال اس
نوجوان عثمانی سلطان کے سرفروش ساتھیوں کو کس نام سے پکارا ہوگا۔"

ہمیں غلام رسول زاہد کا یہ مشاہدہ اور صدیوں کے آر پار کا مطالعہ اپنے زریں عہد سے نہ صرف ہم کلام کراتا ہے بلکہ ہم آمیز کراتے ہوئے اس عہد میں یوں لے جاتا ہے کہ ہم خود کو اس کی فوجوں کے ایک سپاہی کی حیثیت سے جلوہ گر دیکھتے ہیں اور فتح ہماری راہ دیکھتی دکھائی دیتی ہے۔

غلام رسول زاہد کے ہاں تقابلی انداز سے مقامات کو دیکھنے کی یہ صلاحیت ہمیں یہ باور کرانے کے لیے بہت کافی ہے کہ وہ اس کی بدولت موجود اور ناموجود کے درمیان تطابق کو بخوبی برت لیتے ہیں۔ ایک مقام کے حسن دل آرا کو دیکھتے ہوئے کسی دوسرے مقام کی دلبری کو اس سے ہم آہنگ کر لینے کی بخوبی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے ان کی اپنے مادر وطن سے محبت کا ایک لمحہ دیکھ کر بڑی خوشگوار خوشی ملی ہے۔

"کوسوو جغرافیائی اعتبار سے پاکستان کی سطح مرتفع سے ملتا جلتا ہے۔ سرسبز و شاداب پہاڑوں اور دلفریب وادیوں کی وجہ سے اس کے اکثر مقامات اسلام آباد، مارگلہ اور گلیات سے مشابہ ہیں، تاہم پرسٹینا کا عمومی تاثر جدید دور کے ایک روایتی یورپی شہر کا ہے۔"

اپنے مادر وطن کے حسن اور جمال کو یوں کسی اور مقام کے حسن میں جلوہ گر دیکھنے کو قطرہ میں دجلہ دیکھنے کا فن کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ جب وہ اس اتنے سے منظر میں اپنے پورے وطن کے جمال کو دیکھیں گے تو پھر اسی محبت اور وفور کی لے سے ہم احساس رہ کر "وصل و ہجراں بہم ہوئے ہیں اتنے" کی لذت سے ضرور شاد کام ہوں گے۔ سفرنامے میں کئی ایسے مقامات آئے ہیں جہاں سفرنامہ نگار کا جذبہ حب الوطنی ایک دردمند پاکستانی اور سچے انسان دوست کے روپ میں اپنی پہچان مکمل کرتا ہے۔ جب ہی تو ان کا تحریر کردہ ایک اور پیراگراف اپنے مادر وطن کے صحت مند سپوتوں کی تندرستی اور فربہی کے راز کو لیے یوں اپنی معنوی صورت گری کرتا ہے۔

"تفنن برطرف۔ کوسوو کی سرسبز و شاداب سرزمین کی ایک اہم سوغات یہاں کا عمدہ دودھ اور معیاری ڈیری مصنوعات تھیں جیسے مکھن، پنیر، دہی...... ہمارے کچھ ساتھیوں نے تو چائے پینا چھوڑ دی تھی تاکہ یہاں کے عمدہ اور خالص دودھ کی لذت اور توانائی سے بھرپور فیض اٹھا سکیں۔"

لیکن اس حسن جہاں کے یہ لاڈلے بیٹے اپنے وطن اور وطن سے دور قائم کردہ نظام کے تقابل کے ذریعے بھی اپنے ہاں کے نظام اور اس کے ماحصل کو دیکھتے ہیں۔ تب ان کی یہ بات بڑی وزن دار ہو جاتی ہے کہ اے کاش اس طرف بھی کوئی اصلاحِ احوال کی صورت پیدا ہو جائے۔

''کیا ستم ظریفی ہے کہ یہی پولیس آفیسر جب پاکستان میں سرگرم عمل ہوتے ہیں تو عامۃ الناس سے لے کر اخبارات، چوراہوں، عدالتوں اور حکومتی ایوانوں تک سب جگہ ہدف ملامت اور نشانِ تضحیک بنتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ یہاں اپنی کامیابیوں اور سرخروئیوں کی بدولت سبقت لے جانے والوں اور عزت پانے والوں میں سے تھے۔ دراصل بدقسمتی سے وطن عزیز میں کسی شعبۂ حیات کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ بہترین افرادی سرمایہ بھی ایک بگڑے ہوئے نظام میں کوئی نتیجہ خیز اور ثمر آور کارکردگی نہیں دکھا سکتا۔ ہمارے پولیس آفیسر ہی نہیں زندگی کے تمام شعبوں سے وابستہ افراد جیسے ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، ماہرین تعلیم، دوسرے ممالک میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں لیکن گھر کے فاسد و جامد نظام میں زنگ آلود اور کند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے پولیس آفیسر محض اوسط درجے کی قابلیت کے مالک تھے لیکن ایک شفاف اور مستعد نظام کے کل پرزے ہونے کی وجہ سے انہیں اپنا کردار ادا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ہمارا ملک خداداد صلاحیتوں کے لحاظ سے خالص سونے کی وہ نایاب کان ہے جس پر کوئلوں کے دلال مسلط ہیں۔ دلدل کی رن وے پر تیز ترین ہوائی جہاز کم گہرے پانیوں میں بہترین بحری جہاز محض دھات کے میلے اور لکڑی کے پہاڑ رہ جاتے ہیں۔''

ہمارے سفرنامہ نگار کے ہاں زندگی کے رنگ اور روپ میں گھر اور خاندان کی حیثیت لازمی حیثیت رکھتی ہے لیکن کیا کریں کہ یہ سفر اپنے ابتدائی ڈیڑھ ماہ بیوی بچوں کی مہک اور دلداری سے خالی تھا۔ شگفتگی کا ایک رنگ اس دوری اور مجبوری میں یوں دیکھنے کے لائق ہے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ اور اہلیہ کی یاد کس طرح یکجا ہوئے اور جب اہل خانہ آجاتے ہیں تو یہ رنگ کیسا روپ بھرتا ہے۔

''ہم اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ کوسوو آمد کے ڈیڑھ ماہ بعد ہمارے اہل خانہ بھی چند دنوں کے لیے یہاں آ گئے۔ ہماری تنہائی اور افسردگی رونق اور ہنگاموں میں بدل گئی۔''

ان ہنگاموں کے حسن کا ایک رنگ کچھ اس طرح سے دیکھنے کو بھی ملتا ہے کہ ہم سفرنامہ نگار کو مسکراہٹ اور تحیر میں گھرے لحہ بہ لحہ دیکھتے ہیں۔

''کوکب اور بچے پرسٹینا پہنچنے پر بہت جوش و خروش میں تھے۔ اگلے روز صبح سویرے ہمارے فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا تو ہمارے گھر کے عین نیچے واقع سٹور کی جواں سال مالکہ سامنے کھڑی تھی۔ ''اوئی اوئی'' وہ ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔ کوکب کے لیے یہ منظر حیران کن تھا۔ ایک سفید فام البانوی خاتون کا اس طرح بار بار مجھے ''اوئی اوئی'' کہنا، ان کے لیے یقیناً حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی کا باعث بھی ہونا چاہیے تھا۔''

''حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ البانوی میں پانی کو ''اوئی'' کہتے ہیں۔'' میری وضاحت سے کوکب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

غلام رسول زاہد کی ان سرکاری ذمہ داریوں کی دیانتدارانہ بجا آوری کے ساتھ ساتھ کوسوو کے بارے میں ان کی جانکاری ہمیں جا بجا بڑے مرصع انداز میں نئی صبح نئی شام سے آشنا کرتی ہے اور قاری ان کی پیش کردہ معلومات کے سحر میں خود کو

زندہ اور دھڑکتا محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ اس لمحے کا خود بھی حصہ بن جاتا ہے۔

''اہل کوسوو کو فٹ بال کے کھیل سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے۔ پڑوسی ملک کے ساتھ ان کا ایک زوردار میچ تھا۔ نیشنل تھیٹر کے عین سامنے سڑک بلاک کر کے ایک بہت بڑی سکرین پر یہ میچ براہ راست دکھایا جا رہا تھا۔ قریب ہی سکندر بیگ کا مجسمہ تھا جس میں اسے گھوڑے پہ سوار دکھایا گیا تھا۔ ہمارے بچوں نے بھی وہاں کھیلنا شروع کیا تو کچھ البانوی بچے بھی ان کے ساتھ مل کر کھیلنے لگے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ زبان، تہذیب، ثقافت اور رہن سہن کی سرحدیں بچوں کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ ساری دنیا کے بچے ایک طرح روتے، ایک طرح ہنستے اور ایک طرح کھیلتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا تھا کہ بچے بہت اچھے ہوتے ہیں، بس ان میں ایک خرابی ہوتی ہے کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔''

غلام رسول زاہد چونکہ پولیس سروس سے متعلق ہیں، اس لیے ان کی پاکستانی پولیس کے مسائل پہ گہری نظر ہے جس کا کئی مقامات پر تذکرہ بڑی فرحت آسا حیرت کا بھی باعث بنتا ہے۔ جب وہ کوسوو میں اپنی ذمہ داریوں اور چھٹیوں کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''مشن میں ہفتہ وار تعطیل کا تصور نہیں تھا۔ ہر افسر پانچ دن کام کے عوض ایک چھٹی کا حق دار ہو جاتا تھا۔ اس طرح ایک مہینے میں چھ چھٹیاں جمع ہو جاتیں۔ اس کے علاوہ ہر ماہ ڈیڑھ چھٹی سالانہ رخصت کے نام سے دی جاتی تھی اور ان جمع شدہ چھٹیوں سے کسی بھی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔''

تو ہم ان کے اس سفرنامے میں رقم اس واقعے کو پڑھ کر حیرت اور خوشی کی ایک سی کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں:

''وطن عزیز میں پولیس کا محکمہ چونکہ سال کے بارہ مہینے اور مہینے کے تیس دن ہنگامی حالت میں ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہاں چھٹی حاصل کرنے کے لیے ماتحت اہلکاروں کو بڑے بڑے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ کئی ایک تو اپنے نہایت قریبی عزیز و اقارب کو بلا مبالغہ دو دو تین تین مرتبہ فوت کر کے چھٹی حاصل کر چکے ہیں۔ صرف یہ لکھ کر چھٹی مانگنا کہ مجھے ضروری کام ہے، کوئی قابل اعتنا جواز نہیں سمجھا جاتا۔ پولیس میں میرے آغاز ملازمت کے دن تھے، میرے ایک اردلی نے اپنی دادی جان کے انتقال کی خبر سنا کر مجھ سے رخصت چاہی۔ میں نے ازراہِ ہمدردی چھٹی کے ساتھ ساتھ اسے جیب خرچ اور زادِ راہ بھی مرحمت کر دیا۔ اس پر مستزاد کہ تعزیت کے نیک ارادے سے اس کے گاؤں بھی پہنچ گیا۔ وہاں جاڑوں کی چمکیلی دھوپ میں چارپائی پہ بیٹھ کر گنا چوستی اس کی مرحومہ دادی جان نے بتایا کہ وہ دیگر پسماندگان اور لواحقین کے ہمراہ پڑوس کے گاؤں میں میلہ دیکھنے گیا ہوا ہے۔''

کوسوو کا یہ سفرنامہ جہاں ہمیں سفرنامہ نگار کی شبانہ روز سرکاری فرائض سے اخلاص صفت بجا آوری کا دورانیہ دکھاتا ہے، وہاں ہمیں کوسوو کے تاریخ، جغرافیہ اور موجودہ سیاسی صورتحال کی آئینہ داری بھی کراتا ہے۔ کوسوو کی تاریخ اور عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کو غلام رسول زاہد نے اس محبت سے رقم کیا ہے کہ یہ محض تاریخی شواہد کی کتاب نہیں بن جاتی بلکہ بہ نفس نفیس ان تاریخی ادوار سے دھیرے دھیرے گزرتے آج کے سفاک ماحول میں لہولہو کوسوو دیکھتے ہیں۔

جب سفرنامہ نگار اپنے خاندان کے ہمراہ چھٹیوں پہ مقدونیہ کی سیر کو جاتا ہے تو ہمیں توقع ہوتی ہے کہ سکندر اعظم جس نے آدھی

دنیا فتح کی ہے، اس کی یادگاروں کا ذکر ضرور آئے گا لیکن ہمارے سامنے کیا آتا ہے اور اس طرح آتا ہے۔ اس کے تیور ملاحظہ ہوں۔

''لفظ مقدونیہ کے ساتھ ہی ذہن سکندر اعظم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے سکندر مقدونی بھی کہا جاتا ہے۔ گویا اس خطے سے سکندر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑھتا ہوا برصغیر تک پہنچا تھا۔ اس لیے ہمیں یہاں کا قومی عجائب گھر دیکھنے میں خصوصی دلچسپی تھی لیکن وہاں پہنچ کر ہمیں بے حد مایوسی ہوئی۔ ایک چھوٹی سی عمارت جس میں بہت سے پرانے برتن، کچھ ثقافتی نمونے، گنتی کے چند ہتھیار اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں پڑی تھیں جو کسی بھی طرح فاتح عالم کے وطن مالوف کا عجائب گھر کہلانے کی مستحق نہیں تھیں۔ معلوم ہوا کہ سکندر اعظم والا مقدونیہ اس وقت یونان کا حصہ تھا جس کے صدر مقام ''تھیسا لونکی'' میں شہر کی سب سے نمایاں جگہ پر سکندر کا اسپ سوار اور شمشیر بکف مجسمہ پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ تاریخی شعور سے مالا مال ہمارے فاضل سفرنامہ نگار نے کس طرح سے عام منظر، نظارے اور تاریخ کے پس منظر کو یکجائی دے کر قرطاس کی زینت بنایا ہے۔ تاریخ شناسی اور داستان طرازی کے حسین امتزاج کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جو آپ پر غلام رسول زاہد کے اسلوب نگارش کی انفرادیت کو عیاں کرے گی۔

''اگلے دن صبح سویرے ہم نے اُحرد جھیل کا رخ کیا۔ شہر جھیل کے شمال مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ جب ہم اس جھیل کے سب سے ہر دلعزیز مقام پر پہنچے تو پہلی نظر میں ہی اس کے حسن اور دلآویزی نے ہمارے دلوں میں گھر کر لیا۔ گہرے نیلگوں پانی اور تاحد نظر پھیلی ہوئی سطح آب کے ساتھ یہ جھیل ایک سمندر کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کسی نے بالکل ٹھیک تبصرہ کیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سمندر کا ایک وسیع و عریض ٹکڑا موجود ہے جسے قدرت کی مافوق الفطرت قوت نے کسی بحر اعظم سے الگ کر کے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان رکھ دیا ہے۔

اس جھیل کو آب تازہ کا سمندر بھی کہا جا سکتا ہے۔ یورپ کی یہ قدیم ترین جھیل دنیا کی سب سے پرانی جھیلوں میں سے ایک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس لاکھ سے ایک کروڑ سال کے درمیان ہے۔ مقدونیہ اور البانیہ کی سرحدوں کو چھوتی اس جھیل کا دو تہائی حصہ مقدونیہ کے علاقے میں جبکہ ایک تہائی البانیہ کی حدود میں واقع ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی منفرد جھیل ہے کہ اس کا تمام تر پانی چشموں اور زیر زمین منبعوں سے آتا ہے۔ دراصل یہاں سے ڈیڑھ سو میٹر کی بلندی پر ایک اور جھیل موجود ہے جس کی مسام دار سطح سے بہت سے چشمے اُحرد جھیل کے کناروں کے ساتھ ساتھ پھوٹتے ہیں۔ چالیس کے لگ بھگ سوتے جو شدید بارشوں اور برف پگھلنے کے دوران خوب بھر جاتے ہیں۔ اسے پانی فراہم کرتے ہیں۔ یہ جھیل ساڑھے تین سو مربع کلومیٹر کا علاقہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی گہرائی دو سو نوے میٹر تک جبکہ اس کی وسعت پندرہ کلومیٹر کے رقبے پر محیط ہے۔''

جھیل کے پورے منظر کو جس عمدگی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے کہ اسے ایک کردار کی طرح ہماری نظروں کے روبرو کر دیا۔ ہم اس جھیل کے وسیلے سے جس قسم کی معلومات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک ایسے جہاں میں لے جاتی ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے متمنی ہو جاتے ہیں اور یہ ہی ایک کامیاب سفرنامہ نگار کی تحریر کی بنیادی خوبی کہلاتی ہے کہ وہ اپنے قاری کو

حیرت اور جستجو کے مابین رکھتے ہوئے ایک ایسے مقام پہ لے آتا ہے کہ جس کا خیال کر کے منیر نیازی نے کہا تھا:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

یہ اسلوب کی دلکشی ہمیں باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ ہمارا سفرنامہ نگار ایک ایسا ساحر قلم کار ہے جس کی جادو بیانی حسن سے حسنِ نظر اور پھر نقطۂ نظر تک اپنا کام کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر بننے کے لیے جو محنت درکار ہے، ہمیں وہ ان کی زندگی کے تمام ایام پر یوں دمکتی دکھائی دیتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ایسے کندن ذہن والے قلم کار کے اور بھی سفرنامے منظرِ عام پر آئیں۔

اپنے سفرنامے میں سفرنامہ نگار کوسوو پولیس سروس کے حوالے سے اپنے انتظامی تجربے سے ہمیں کوسوو کے بارے میں بڑا معنی خیز تجزیہ پیش کرتا ہے۔ یہ تجزیہ فقط اپنے پورے دور کی ہی عکاسی نہیں کرتا بلکہ کوسوو کے لوگوں کی مکمل طرزِ زندگی کا عکاس بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کوسوو کی موجودہ سیاسی صورتحال بھی بین السطور میں اس طرح سے جھلکتی ہے کہ ہم کوسوو امن مشن کی ضرورت اور اہمیت سے باخبر ہو جاتے ہیں۔

''بدقسمتی سے عالمی طاقتوں کی مداخلت، اندرونی خانہ جنگیوں، بیرونی تاخت و تاراج، قبائلی بغاوتوں اور نسلی آویزشوں نے صدیوں سے اس علاقے کا امن غارت کر رکھا ہے۔ دو عالمگیر جنگوں اور بلقان کی لڑائیوں نے یہاں تباہی مچائی ہے۔ عالمی سیاست کے خود غرض شاطروں نے ملکوں اور علاقوں کی جو بندر بانٹ کی اس کی وجہ سے مہاجرین کے مسائل اور باہمی تنازعات کے کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلے شروع ہو گئے۔ روس کے اشتراکی بلاک کے خاتمے کے ساتھ بہت سی اہم سیاسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ بوسنیا میں بھیانک اور بے رحمانہ طریقے سے مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی۔ ان بیچاروں کے پاس تو کوئی ایسا ہمدرد پڑوسی ملک بھی نہیں تھا جہاں مہاجرین کو قدم رکھنے اور سر چھپانے کی جگہ مل جاتی۔ کوسوو میں سربوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر لاکھوں البانوی مسلمان ترکِ وطن کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالات بہتر ہونے پر ان کی واپسی عمل میں آئی۔ خود مغربی ذرائع کے مطابق شہید اور لاپتہ ہونے والوں کی تعداد دو لاکھ ۸۷ ہزار بتائی جاتی ہے۔ بے گھر ہونے والے افراد ۱۳ لاکھ سے بھی زائد تھے۔ آج تک اجتماعی قبریں دریافت ہو رہی ہیں۔''

معلومات، حقائق اور کوسوو کے شب و روز کے حسن کو سمیٹے یہ سفرنامہ جب اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے تو غلام رسول زاہد کے ہاں ایک خاص قسم کی ایسی اداسی دکھائی دیتی ہے جو محبوب سے وقتِ رخصت آنے پر طاری ہوتی ہے۔

''میں جس سرزمین سے ارضِ وطن کی طرف رختِ سفر باندھ رہا تھا ایک سال پہلے میرے لیے دیارِ غیر تھی لیکن اب میرے لیے اس مٹی میں اپنائیت کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ روح اور بدن کے تعلق میں تیسری جہت دھرتی کا بندھن ہے۔ شاید میرے وجود کی تخلیق میں ایک مشتِ غبار جزیرہ نمائے بلقان کے اس خاکدان سے بھی لی گئی تھی۔ سارے منظر اور سب چہرے میرے اپنے تھے۔''

تعلق کی خوشبو میں لپٹی اداسی اور فرقت کی یہ گھڑیاں جس طرح نو بہ نو منظروں، مکانوں، سڑکوں اور دوستوں کے ذکر کے تناظر میں اس سفرنامے میں عود کر آتی ہے۔ اردو ادب میں اس کی مثالیں ذرا کم کم ہی ملتی ہیں۔

اس سفرنامے کے تکمیلی لمحوں میں حساس قاری جس طرح کی اداسی اور دل گرفتگی سے گزرتا ہے اس کے سحر سے نکلنے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن یہ حقیقت بھی پوری طرح کھلتی چلی جاتی ہے کہ یہ سفری یادداشت فکری اور تاریخی جمال آفرینی کا منظر نامہ ہے۔ یہ دراصل اپنی فنی حیثیت میں براعظم یورپ کے اس دلفریب خطے کا سفرنامہ ہے جہاں تاریخ کے جبر کا شکار ایسی مسلمان قوم آباد ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے اپنی بے بسی کے خون آلود افق پہ آزادی کی روشن صبح کی منتظر ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے پرچم تلے پچاس ممالک کے باعث، مہم جو پولیس افسروں کے اس منفرد امن مشن کی ایک دلچسپ سرگزشت ہے۔ جس میں اجنبی سرزمین کی سحر طرازیوں اور انوکھے تجربات کی قصہ آفرینیوں کے ساتھ ساتھ وقت کے پھیلے ہوئے آفاق پر انسان اور تاریخ، محبت اور جنگ، تہذیب و تمدن اور حسن و حزن کی آمیزش اور آویزش دونوں کے رنگ لہراتے ہماری آنکھوں کی جاگیر بنتے ہیں۔ سفرنامہ نگاری میں منظر آرائی کی یہ ہنروری کچھ ہمارے سفرنامہ نگار غلام رسول زاہد ہی کے قلم کا اختصاص ہے۔

..........☆..........

ندیم غزل:

O

کسی کی چاپ نہ تھی، چند خشک پتے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گل پہ روئے تھے

ابھی ابھی تمہیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

تمام عمر وفا کے گناہ گار رہے
یہ اور بات، کہ ہم آدمی تو اچھے تھے

ہمارے ذہن پہ پتھراؤ بے سبب تو نہ تھا
کہ ہم نے تیرہ دلوں سے ستارے مانگے تھے

یہ فخر بھی تو بہت تھا، کہ جو ہنسے ہم پر
وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

اب ایک شخص جو خوش ہے فقط وہی خوش ہے
وہ درد مند کہاں، جن میں درد بٹتے تھے

یہ ارتقاء کا چلن ہے، کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیم جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

(''محیط'' احمد ندیم قاسمی)

شہزاد نیرّ کے شعری مجموعے ''برفاب'' کی سرد گرم بھاپ

ضیاء حسین ضیاء

مشہور و معروف فرانسیسی شاعر میلارمے کی نظموں کا جب فرائی نے انگریزی میں ترجمہ کیا تو میلارمے کی شاعری کی باطنیت کی روح کو سمجھتے ہوئے اور اس کے ذوقی عروج کو پیش نظر رکھتے ہوئے محمد حسن عسکری نے ایک مضمون میں اس پر رائے دیتے ہوئے کہا کہ:

''جو شخص میلارمے کی نظمیں قافیوں کے بغیر ترجمہ کر ڈالے وہ نیک نیت تو ضرور ہے میلارمے کی شاعری کو نہیں سمجھتا ہے، اس ترجمے میں شعروں کا مطلب تو ضرور آ گیا ہے۔ شاعری کو فرائی صاحب نے میلارمے کے پاس ہی رہنے دیا ہے۔''

فرائی کے ترجمہ کی ماہیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے جب میں میلارمے کی اس نظم کو دیکھتا ہوں جو انہوں نے ادیبوں کے ایک اجتماع میں پڑھی تھی تو مجھے ایک بڑے اور سچے شاعر کے اس خزانہ عامرہ کا نقشہ نظر آتا ہے جسے میں اپنے تئیں ''تخلیق کا سرچشمہ'' کہتا ہوں...... میلارمے کی اس نظم کا نام ہے ''سلام'' (Salutation)۔ نوجوان ادیبوں کا جام صحت پینے کے لیے میلارمے جب کھڑا ہوا تو اس نے اپنی نظم کی پہلی سطریں یوں کہیں کہ:

یہ تو کچھ بھی نہیں
پیالے جھاگ ہیں
اور ایسے ہی میرے یہ شعر

دراصل فنی تخلیق کے سارے جہانوں اور سارے آسمانوں پر شاعرانہ تحیر پردازی کرتے ہوئے ہر بار جب شاعر اپنے جذبات اور اس کے ردعمل میں تراشیدہ شعری چوکھٹوں کو دیکھتا ہے تو بہت مطمئن ہو کر بھی اسے بہت کہیں اپنے ''اندرونے'' میں سے یہ آواز سنائی دیتی ہے ''یہ تو کچھ بھی نہیں''...... یہ ایک ایسی جذباتی ترسیل ہے جس میں اگر خارج کی شہادتیں داخل نہ ہوں تو صرف باطن کی اثباتیت ہمیشگی کے ساتھ محکم نہیں رہ سکتی۔ یہ ''محکم تر'' نہ ہونے کی روایت ہر سچے شاعر کے ہاں موجود ہے۔ خصوصاً ان شاعروں کے ہاں تو اس کو کثرت کا درجہ حاصل ہے جن کے ہاں جذباتی علامتوں کی واقفیت کا علمی اور نفسیاتی ادراک بھی شامل ہے۔ ہر آنے والی نئی صبح کو پہلی صبحوں سے مختلف اور ممتاز کرتے چلے جانا ہی شعری صداقت اور شعری وجدان کے استحکام کا باعث ہے۔ شاعری کھیل بھی ہو تو ''فنی تیقن'' سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی پرتوں، اپنے بطونِ ذات میں بہت محیر العقول ہے اور

''جذباتی منطق'' پر ایمان لائے بنا شاعری کے صنم خانوں میں آنا خت بے ادبی ہے۔

شہزاد نیرّ کی جذباتی ترسیل میں عقلی منطق نہیں، جذباتی منطق ہے۔ جذباتی منطق خود میں کوئی اصطلاح نہیں کہ منطق کے قوانین عقلی میزان پر اٹل، ٹھوس اور تبحر ہوتے ہیں۔ شماریات میں آخری حد تک وہ قابل استفادہ ہیں۔ اقبال کے ایک مشہور شعر کا پہلا مصرعہ ہے

ع جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

عقاب کے لیے حسی اور جبلتی بہادری کا ایک آئینہ بنا کر پیش کیا گیا ہے لیکن شعری فضاؤں میں جذبہ و خیال اور فکر کے دور پرواز پرندوں کو شکار کرنے کے لیے شہزاد نیرّ مجھے اقبال کے شاہین کے مصداق نظر آتے ہیں۔ شہزاد نیرّ کی نظموں میں ہنرمندی اور شعری ریاضت کے باوجود ان کے مشاہدات و تجربات کی بے قراری، یقین کی تہوں میں بھی مجھے مذکورہ مصرعے ہی کی تصویر نظر آتی ہے۔ شہزاد نیرّ فطرت کی کروٹوں کا مشاہدہ اور پھر فطرت کی کروٹوں میں پڑی سلوٹوں میں اپنے جذبات اور شعر کا گھڑا فکر کے ڈھاک پر جمانے کا آرزومند ہے۔ وہ ایک تنومند مشاہدہ کار اور اصیل فکر آزمودہ شاعر ہیں۔ اصیل یوں کہ شہزاد کے ہاں زندگی کے بنیادی موضوعات فطرت، محبت اور موت کے مناظر مختلف شکلوں کے پیراہن فنی آسودگی اور وجدانی تمامیت کے ساتھ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ شہزاد نیرّ کے فکر کے پاتال میں اتر کر دلیل لاتے ہوئے اس کی نظم'' چاہے جانے کی آرزو'' بہت توجہ طلب نظر آتی ہے۔

وہاں نادیدہ منظر کی بہت ویران آنکھیں تھیں
ڈھلانی پھول کھلتے تھے۔
مگر حیرت کی بارش کی ترستے سوکھ جاتے تھے
ہوا کا لمس بادل کی نگہ کافی نہیں ہوتی

آگے چل کر شہزاد جب کہتا ہے......

کسی کی آنکھ میں آئے بنا ہوتے چلے جانا
بڑی بھاری اذیت ہے
(ذرا پہلے یہ اس مخفی خزانے نے بھی سوچا تھا)

تب شہزاد نیرّ محبت کی تجریدیت اور محبت کی واقعیت اور اس کے عملی قد و قامت پر ہر رنگ میں ملبوسات کی تزئین کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مثبت اشارے کرتا نظر آتا ہے...... محبت کی'' حکیمانہ چال'' وہی ہوتی ہے جب وہ غیر مرئی سطح پر اپنے اثبات کے حکم لگاتی چلی جائے اور یہ اثبات بھی پھر جمالیات کے لب و رخسار کے ذریعے سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ خواہ یہ خدوخال تکوینی ہوں تشریعی ہوں یا جذباتی مگر تینوں مقامات میں سے'' قلب'' سب سے بہترین مرکز ہے مگر اس کا جوابی ردعمل بھی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیرت کو کشش کر دینے والا کردار بھی قلب کو اپنی ان خیالی پیش رفت اور جذباتی جھکاؤ سے موڑنے کی روایت پیدا نہیں کرتا۔ شہزاد نیرّ کی شاعری میں حیرت کا اپنا کوئی لباسِ ذاتی نظر نہیں آتا بلکہ حقائق فطرت اور انسانی

کردار کے تناسب اور تخالف کو ڈھونڈتے ہوئے جہاں بھی کوئی مرقع خوشنمائی ملتا ہے، شہزاد کے ہاں وہ شب حیرت کا مظہر بن کر اس کی شاعری میں جگہ پاتا نظر آتا ہے۔ اس ذیل میں شہزاد کی اس نظم کو دیکھیں۔ اپنی نظم ''ہائبرنیشن'' میں اس کی تخلیقی صلاحیت اپنی حیرتوں کو یوں یکجا کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ آدمی کو سوچنا پڑتا ہے کہ مشاہدۂ ذات کی یہ کون سی جہت ہے؟؟

بدن کے اسی غار میں نیم مردہ
مری ذات ہے، لمبے عرصے کی قیدی!
بدن میں جونہی سانس رکنے لگے
میں سسکتے سسکتے ان آنکھوں کے روزن تک آتا ہوں
اور ڈرتی ڈرتی نگاہوں سے چوگرد پھیلا سماں دیکھتا ہوں
نہیں...... بل کے باہر کا موسم
ابھی سازگاری پہ مائل نہیں ہے
ابھی ایسا سورج جہاں کے افق پر نمودار ہونا ہے
جو میری پسلی میں کرنوں کا نیزہ چبھو کر کہے
اٹھ کھڑا ہو!!

کشمکش اور داخلی اضطراب ہی شاعری کا راس المال ہوتا ہے۔ عدل نہ تو خالی زہد و تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے اور نہ خالی فسق و فجور کے اجتناب سے بلکہ ان دونوں کی جنگ فنکار کے لیے مفید رہتی ہے۔ شہزاد نیر کے ہاں داخلی نفسیات کی یہ جنگ ایک آہنگ سے نظر آتی ہے۔ وہ محض ایک کیمرہ مین فنکار نہیں اور اس کا مقدمہ صرف حیرت سامانی پیدا کرنا نہیں بلکہ ''غیور نظر مبصر'' کی طرح وہ ہونے والی تبدیلیوں، خارجی تغیرات اور تہذیب مسلسل کے عمل کو ناروا روکنے والوں کو اپنی شاعری میں جگہ جگہ شناخت کرتا نظر آتا ہے۔ اعتراف کی یہ شناخت متنوع صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ خود ان کی نظم ''اعتراف'' اس ضمن میں کشاف اور فتاح وجدان کی خبر دیتی ہے۔

ہمارا دیکھنا کیا ہے
نظر ٹکنے نہیں پاتی
کہ ہر منظر بدلتا ہے
اگر منظر ٹھہر جائے تو
آنکھیں وہ نہیں رہتیں

(اعترافیہ)

اس ضمن میں یہ شعر بھی قارئین کے لیے خوش سوادی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا

حیرت کا جواز نکلے یا نہ نکلے مگر شاعر اپنے وجدان سے ''مک مکاؤ'' نہیں کر سکتا۔ یہ فن اور سچائی سے اصولی مفاہمت

ہے۔ مندرجہ ذیل نظم میں شہزاد نیر اسی کیفیت سے گزر رہا ہے۔

بس خبر اتنی زماں گردش میں ہے
گردش میں ٹوٹے خواب ہیں
خوابوں کی بکھری کرچیاں ہیں
کرچیوں کی تیز دھاروں پر
مجھے لکھنا نہیں آتا

دعائے استقامت ہو
میں لفظوں کی لگن لے کر چلا ہوں
اور زمانے میں چلن تو ہندسوں کا ہے

(اعتراف)

سانسوں کی اترائی میں اور زخموں کے ناپ لیتے ہوئے دیدہ زیب شعری ملبوس سینا پہننا آسان نہیں ہوتا مگر شہزاد کی کئی نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ نشیب میں دوڑتے ہوئے اپنے زخموں اور اپنے اردگرد پر اچھا ''شاعرانہ حکم'' لگا سکتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''ہم فراموش'' میں اس منظر نامہ کو ملاحظہ کریں:

زندگی یاد کر
ہم وہ بے پیرہن
جن کے کورے بدن سے
اشارے سے ملبوس چھینے گئے
ننگے پیروں جنہیں حکمِ ہجرت ہوا
اشک توشہ ہوئے

دردورثہ ہوا
سانس پائی تھی
صرف ندامت ہوئی
رینگنے کی سزا زیب قامت ہوئی

ایک بات طے ہے کہ نظم گو شاعر آشوب مکانی اور شورش زمانی میں ہی صحیح طور پر پل سکتا ہے۔ ''برفاب'' میں شامل نظموں کے پس منظر میں ایک سایہ نظر آتا ہے جو کبھی کبھی ''کہربائی لباس'' بھی پہن لیتا ہے اور کبھی اندھیرے اور ظلمت کی چادر میں در و دیوار پر پھیلی ہوئی اداسی کی پھیکی مسکراہٹ بن جاتا ہے اور ایسے میں جب شہزاد جیسے حساس شاعر کو باطنی جذب حال اور محبت کے قرینوں کی خیاباں خیاباں کیاریوں میں سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ ذات کی تجرید یا محبت کی تحقیق کے ردعمل میں بے لباسی کا عجیب سا لباس پہن لیتا ہے۔ وہ ہر منتظر کی آنکھوں کی بصارت اور نظارت کا بوسیدہ ناظر بن جاتا ہے مگر خود اس پر اطراف کی یلغار نئی آگہی کھولتی چلی جاتی ہے۔

اپنے من کے اندر چھپ کر
جب بھی تم سے ملنے نکلوں
باتیں کرتی ہوا سے مل کر
شاخیں شور مچاتی ہیں
سڑکوں کی دورویہ آنکھیں روشن ہوتی جاتی ہیں

(رستہ سہل نہیں)

شہزاد نیّر نے افکار کی لامتناہی بادشاہت میں قدم رکھتے ہوئے بھی جسم کی جسمانیت اور حسایت کا نقشہ ترک نہیں کیا۔

میں بدن کے تومند گھوڑے پہ بیٹھے ہوئے
جھلملاتی انا کی چمکتی ہوئی تیز تلوار
پہچان کے تیز رنگوں کی دستار باندھے ہوئے
(میرے اجداد کا امتیازی نشاں)
اپنے ہونے کے نشے میں ڈوبا ہوا
جسم وادی میں چلتا رہا
جسم مسکن میرا
میری پہچان تھا!!

(غائب)

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ شہزاد نیّر نے اپنی باطنی حدتوں کو محسوس سطح پر ''برفاب'' کا نام کیوں دیا تو برفاب کی مشمولہ منظومات میں ایک کثیر تعداد ہمیں اس ضمن میں رہنمائی کرتی نظر آتی ہے مثلاً ''ہائبرنیشن، کبھی سورج بھی نکلے گا، سیاچن، گلیشیئر، منجمد، خواب، کارگل، صدائے منجمد، دھرتی یکساں کانپ رہی تھی، آتش اور اس کے علاوہ دیگر نظموں میں بھی برفابی یخ بستہ خیال کا ردوقبول موجود ہے۔ میری نظر میں شہزاد نیّر ایک جینوئن تخلیق کار ہے اور جینوئن تخلیق کار کو شعوری یا لاشعوری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دکھ، غم، ہجر وفراق اور نوحہ وزاری اور الحاح وتضرع اگر چہ اپنے فکر چوکھٹے میں ایک حدت اور الاؤ کے دریا کا نام ہیں مگر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آتش اور آگ کا دریا بھی تپش کا ہی ایک بہاؤ ہوتا ہے۔ سیلان اور آب استعارہ ہے۔ خواہ آنکھیں آنسو روئیں یا منجمد آتشِ غم کے جریان اور تسلسل میں دیکھنا چاہیں...... یا اس حالت میں لے جانا چاہیں جہاں حالات کا سورج اپنی تمازت میں دھڑکے تو بشر کے غم خانہ کی آگ پگھل کر ''برفاب'' کا استعارہ بنتی چلی جائے۔ مذکورہ بالا نظموں کے داخلی عنوانات اور موضوعات کچھ بھی ہوں اور زمینی حقائق سے جڑے کیوں نہ ہوں مگر آفاقی سطح پر شہزاد نیّر کی زندگی کی مئے خبریت کو ''برفاب'' کرنے میں لطف آتا ہے اور ایسا کرنے میں اس کے پاس درجۂ انجماد پیدا کرنے والا تخلیقی ''درجۂ حرارت'' موجود ہے۔ لفظ اور معنی کے دروبست کی چوکھٹوں کا رنگ وروغن موجود ہے۔ شہزاد کو اس کے الفاظ ومفردات یوں آگے بڑھ کر سہارا دیتے نظر آتے ہیں جیسے کسی دولہا کو گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے اس کے دوست سہارا دیتے ہیں۔ شہزاد کے ہاں مفردات میں ڈھلتے چلتے، پھرتے پیکر ایک ایسی ''تمثالی محاکات'' کی خبر دیتے ہیں کہ ہم بلامبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ شہزاد بلاغت اور صراحتِ جذبات کے امیر

ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ کسی بھی نظم میں ان کو باب مشقت بند کرنے میں کوئی دلچسپی ہے نہ عجلت۔ وہ ایک مفہوم میں زندگی کی عبارتوں کے منجمد مضامین کو ٹھنڈے سے کے ادراک میں بیٹھ کر جان گئے ہیں۔ ان کی طویل نظم ''خاک'' ایسی ہی نشستوں اور نکاریوں کا حاصل ہے۔

مقام شکر ہے کہ مقامات آہ و فغاں اور آشوب گاہ کون و مکاں کی حیرتوں اور بجھارتوں میں شہزاد نیرّ کا کردار اول و آخر ایک ''شاعر'' ہی کا ہے اور جہاں بھی وہ زیادہ بے قرار ہوا ہے وہ اپنے ''خدا'' ہی کی جانب پلٹا ہے۔ یہ اس کی تربیت میں کہیں تہہ در تہہ سکون کی تمہید کا کرشمہ ہے اور واقعات اور حیرت کے مدار پر جہاں اس کی چیخ نے آواز اور احتجاج کے نئے مدار دریافت کیے ہیں، وہ اس کی شاعرانہ بات کے زمرے میں آتا ہے۔

غربت، عقیدت سے لبریز بستی
اندھیرے میں گرتی تھی
لیکن دمکتے ہوئے
رنگ روغن کی پوشاک پہنے
چمک دار معبد کے اونچے
منارے پہ کرنوں کا میلا تھا
کچے گھروندوں کی دیواروں نے
اپنے حصے کی کرنیں
خدا کی رہائش کی خاطر
اُساری گئی پختگی پر الٹ دی تھیں
پکے منارے سے پکی سماعی میں آواز اتری:
خدا لامکاں ہے!!

(بے نیاز مکاں)

شہزاد نیرّ کی اپنی ذات کی قوسوں میں ایک عجیب سا ابہام نظر آتا ہے۔ ایسا ابہام دراصل آگے کے ردو قبول پر سوچنے کا صلہ ہوتا ہے۔ دریا کی لہروں کے شور میں اس کشتی کا مرثیہ بھی شہزاد نے خود پڑھنا واجب کر لیا ہوا ہے جو ابھی طوفان آشنا ہی نہیں ہوئی اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ انسانوں کے مستقبل پر جو ''غرقاب کشتیوں'' کے مسافروں کے نصیب میں آتا ہے اور مزید یہ کہ غرقاب انسانوں کی ''آب خوردہ میتوں'' پر بھی شہزاد نیرّ بہت گہرائی اور کرب سے سوچتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ ہونے کی ''حماقت'' ہے یا نہ ہونے کا سنہری رنج۔ جب کہانی کو اپنے تارو پود بکھرنے پر اعتراض نہ ہو تو۔ اس افسانہ نگار کی بُنت جاننا مشکل ہو جاتی ہے جو کہانی کے عنوان سے لپٹا سسکتا اور تخلیق سہلاتا جاتا ہے۔ بس ایسا ہی طلسمی ذات کے رنگوں کا تماشا ہے شہزاد نیرّ کی شاعری میں۔ ایسے شاعر دنیائے وجدان میں کم کم دیکھنے میں آئے ہیں جو اپنے ہاتھوں سے چاک پر مٹی کی مورتیں کاڑھتے ہیں مگر پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے ہاتھوں پر کوزہ ساگر کی ہیئتیں اور شکلیں اُگ آئی ہیں۔ تب کوزہ گر کا چاک حرکی مشقت سے گزر کر ایک ایسے معبد میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں پر بھگوان کی مورتیں اور ذات کی سایوں میں پلتی اپسرائیں ایسے ہی اشلوک پڑھتی ہیں جن

کا خلاصہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ:

اسیرِ ساعت یہ پوچھتا ہے
کہ وقت کی قید کب تلک ہے
زماں کو یہ اختیار کیوں ہو
کوئی بھی لمحہ
کسی کی بے وقت زندگی کو
گھڑی کی رسی میں باندھ ڈالے
اور اک سرا دستِ وقت میں دے کے
دوسرا بخت کو تھما دے
دمِ اسیری سبیل کیا ہو
کہ اب مکاں بھی
زماں کی پہلی گرفت میں ہے

(اگر یہ سچ ہے)

شہزاد نیرّ کے ''گوتم'' سے مصافحہ کرتے وقت ایسی کئی معرفت آثاریاں میری آستیں سے چپک گئی ہیں۔ دراصل شہزاد نیرّ کو رقت کے ساتھ پڑھنا مشکل ہے۔ شہزاد کی شاعری پڑھتے ہوئے خود بھی قاری کا وجدان اپنا شعری کرب اُگل سکتا ہے۔

آشوبِ ذات ہدف نہیں ہوتا، افتاد ہو سکتا ہے۔ ذات کی آگہی مراعات نہیں کہلاتی۔ یہ مشکل نصاب ہے جس کا امتحان بھی ہر اس گھڑی متوقع رہتا ہے جس میں انسان کو انسان ہونے پر کوئی مظہرِ غرور میں لپٹا ہوا اُکساتا ہے۔

جب ہم کسی شاعر کے اندر رہنے، بسنے اور شعری خمار اٹھانے والے گوتم سے مصافحہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے بات کرنے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر کے موضوعات کا چناؤ اور انتخاب کس قسم کا ہے اور دوسرا یہ کہ اپنی موضوعاتی نظروں کے تالاب میں شاعر کس قسم کی تخلیقی پیرا کی کا لباس زیبِ تن کیے ہوئے اترا ہے۔

اس کے ماسوا یہ دیکھنا بھی ایک اشد تنقیدی اشارت ہے کہ شاعر کے ہاں استعاراتی اور تلمیحی نظام کیا ہے اور یہ بھی کہ فکری منظر ناموں میں شاعر کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ یا اطراف میں پھیلے پتھروں سے نکلنے والا آتش فشانی لاوا اور اس کا بہاؤ کیسا ہے؟ اس کے علاوہ بھی بڑی بات کہنے والے شاعر کے ہاں اس کی ''شاعریت'' کا ایک پُراسرار سرخ خیمہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا سامانِ طرب، لوازمِ کرب اور معاشرتی حرب وضرب لے کر جلسۂ استراحت مناتا ہے۔ یہ وہ اصل ماحول ہے جس پر نقاد کے لیے بھی پردہ ہے اور خود شاعر کے اپنے اوپر بھی ایک حجاب اور غیاب ہے۔ ایک ایک قدم پر شرط لگا کر راستہ جیتنے کا میلہ ہے۔ یہ ایک ایک سطر پر کتاب کا دیباچہ رقم کرنے کا عمل ہے۔ سچی شاعری کا یہ ہی خزانہ کسی شاعر پر نعمتِ کم بہا نہیں ہوتا۔ جس شاعر کے پاس یہ ''بہا'' جتنی زیادہ ہے وہ اتنی بڑی شعری سلطنت کو تشکیل دینے پر قادر ہے۔

شہزاد نیرّ ان خوش قسمت اور معدودے چند شعرا خصوصاً نظم گوؤں میں سے ہیں جن کے ہاں جذبوں، قدروں اور جذباتی جغرافیہ کو وجدانی اور تاریخی میراث بننے میں بڑا دعویٰ اور کمال ہے۔ میری بات کی تائید کے لیے شہزاد نیرّ کی ان سطروں پر غور کیجیے:

امیدیں اور سگرٹ ختم ہو جائیں
تو سب بے جان ہاتھوں سے
شکن اندر شکن لپٹی گزشتہ شام کھاتے ہیں
اور آنکھوں میں یہ دکھ لے کر
گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
کہ ان کا کوئی بھی آقا
نوید بندگی لے کر نہیں آیا
(کبھی سورج بھی نکلے گا)

شہزاد نیرؔ کی نظم "سیاچن" حسیاتی مزاج کی سرزمین پر فکری کدال کی ایسی کھدائی ہے جس کے نتیجے میں حرف آشوب اور اطراف کے دکھ منجمد ہو سکتے ہیں یا کسی لحہ اعجاز میں پگھل سکتے ہیں مگر شہزاد نیرؔ کو اپنا کرب اپنی جبلّی طہارت کے ساتھ جننے میں ایسی جلدی، فرصت اور طمانیت ہے کہ جیسے آسمان سے ایک ہی لمحے میں کسی نے اس کے سینے میں پوری کتاب اتار دی ہو اور ساتھ میں اسے مہلت بھی دی ہو کہ تم سانس در سانس ہدایت کشید کر سکتے ہو۔ اس شرط پر کہ تم کو خطِ مستقیم کے درمیان میں چلنے والے مضطرب نقطوں کو اپنی نظروں میں منتقل کرتے چلے جانا ہے۔ کرب اور اضطراب کا شہود دیکھنے کا جو متمنی ہو، شہزاد کی ان سطروں میں بال کھول کر بین کرے۔

جہاں میں ہوں
وہاں تصویر کا چہرہ سوالی ہے
نمودِ فن سے خالی ہے
وجودِ زن سے خالی ہے
جہاں بچوں کی باتوں کا کوئی جھرنا نہیں بہتا
جہاں بوڑھوں کی لاٹھی کی کوئی ٹک ٹک نہیں سنتا
جہاں میلوں مسافت تک
کوئی بستی نہیں بستی
(سیاچن)

شہزاد نیرؔ کی شاعری میں ایک مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ سراسر توفیقی ہے۔ اب اسے افتاد کہہ لیں یا رنجِ طبع زاد۔ وہ یہ کہ شہزاد کی شاعری پڑھتے ہوئے آپ اس کی کسی نظم کو آوارہ نہیں کہہ سکتے۔ شہزاد کا ادراک اور جذب و سلوک نظامِ شمسی کی طرح باقاعدہ ہے مگر اس کے ماہ و آفتاب اور سیارگانِ خیر و شر کا اپنا تخلیقی ملبہ بہت پر اسرار ہے۔ ان کے رنگ عجیب و غریب ہیں۔ شہزاد کی شاعری میں پر اسرار اقلیم اور مقدس اقلیدس کے سارے اصول اور ضابطے انتہائی قوی اور منضبط ہیں۔

شہزاد نیرؔ کی نظم "گریزاں" میں جو خطاب اور تکلم ہے اور گرفت اور نارسائی پر برف کی سلیٹ پر لیٹ جانے اور دونوں بازو پھیلا کر اپنا نتیجہ گرم کرنے کا کامیاب عمل ہے۔ وہ شہزاد نیرؔ کی اپنی مسرت اور انبساط ہے مگر اس کے پڑھنے والوں کو جو پیغام (Message) ہے، وہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس پیغام کو روزن سے ہی دکھنا چاہیے۔ پورا منظر پوری آنکھ کو کھا سکتا

ہے اور شاعروں کی آنکھوں کو محفوظ رہنا چاہیے کہ ان سے بڑا کائنات اور بوطنِ ذات کے منظروں اور وارداتوں کا شاہد و ناظر کوئی اور نہیں۔

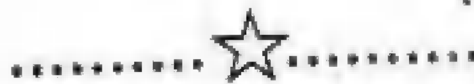
یہ دنیائیں ہمارے درمیاں ٹھہری ہوئی ہیں
یوں گزر جائیں
کہ ہم دامن پہ ان کی گرد بھی پڑنے نہ دیں
آگے نکل جائیں

(ٹھہری ہوئی ساعت)

شہزاد نیر کی ''برفاب'' میں شعلوں کی یہ موجودگی کسی خرقِ عادت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ شہزاد کی تمام نظموں میں سب سوالوں کی طرف لوٹ جانے والے شکوؤں اور سوالوں کی طرف سے حقیقتوں کی زمین پر اترنے والے عساکر کی مسلسل آمد و رفت ہے۔ شہزاد نیر زندگی کی ایسی حقیقتوں کا شاعر ہے جہاں پورا دہی بلو کر پوری لسی اور پورا مکھن نکالنے والے کو زندہ وجدان شاعر کا لقب ملتا ہے۔ شہزاد کی کرب شناسی اگر اس کا نظریاتی اور جذباتی راس المال ہے تو الفاظ کے تاروں سے اپنی نظموں کا آسمان روشن اور تابندہ کرنا بھی اس کا ایک فن ہے۔ شہزاد کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک بند اور دوسری کھلی۔ کھلی آنکھ سے وہ اپنے اطراف ردو قبول کا مشاہدہ کرتا ہے اور بند آنکھ سے وہ اپنی انجذابی فطرت پر وجدان کا ڈھتا ہے۔ یہ غیر معمولی صورتحال ہے مگر میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ شہزاد ان وارداتوں کا شریک ہے۔ ذات کے جلے خیموں کا عینی شاہد ہے اور دستورِ طرب لوٹنے والے قزاقوں کی غارت گری کا عینی شاہد۔ اس سب کے باوجود ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ ایک شاعر ہے اور بس مگر شہزاد کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہ ایک جذباتی مورخ بھی بن گیا ہے۔ وہ ہم پر زندہ ہونے کا اطلاق ہے اور اپنی اپنی وجدانی سرزمینوں میں ہم اسے پاسکتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں میں اپنے اس مضمون کا خاتمہ شہزاد کی نظم ''ہم فراموش ہیں'' کے اس بند پر کروں:

زندگی کیا وہ ہم ہی نہیں
خاک داں کے مکیں
جو ہوا کی ہنسی میں اڑائے گئے
آندھیاں جن کے تنکے اڑاتی رہیں
اور مٹی بھرے گیت گاتی رہیں
دشتِ نامصرفی کی حدوں میں گھرے
گرد بادوں کی گردش کا حصہ ہوئے
خاک ہوتے رہے
چاک پر گھومتے، چاک ہوتے رہے



شاہنواز زیدی

عملِ چغتائی

مجھے دیکھو
وہ مصور ہوں کہ محبوب نہیں سامنے
اور حسنِ دو عالم کی جھلک مجھ کو دکھائی ہے
مجھے چاندنی کی شکل بنانی ہے
بنانی ہیں وہ آنکھیں
کہ جو خیام کے مے خانے ہوں
جمشید کے پیمانے ہوں
افسانے ہوں جو پریم کے
غالب کی غزل ہوں
مجھے خط کھینچنے ہیں ایسے
جو پیکر کا بدل ہوں

وہ پچوں رنگ دھنک سے
جو بہیں اور ملیں اور بہیں
اور نئے رنگ بنائیں
نئے آہنگ بنائیں
کبھی ایسے لگیں جیسے کہ منقش ہو
ستاروں سے بھری رات کا آنچل
کبھی ایسے کہ ہو برسات میں اڑتا ہوا
گھلتا ہوا بادل

وہ بدن میں ہو حرارت کہ نگاہیں لگیں جھکنے
وہ کھنچاؤ ہو، بناؤ ہو، لگاؤ ہو، تناؤ ہو
کہ سانسیں لگیں رکنے
میں تخیل ہی سے تخلیق کروں وہ پری پیکر
کہ جو تصویر کا معیار ہو
آفاق کا جھومر

سو دعا کر کے
بہت شکر ادا کر کے
سب اوصاف جمع کر کے

میں بیٹھا تو یہ دیکھا
دمِ فرقت، میں اسے سوچنا آسان ہے
دشوار ہے تصویر بنانا
گو میں عاشق ہوں پرانا

ہوں دِوانہ
غمِ الفت کا نشانہ
میں بہانہ نہیں کرتا
میں محبت سے، لگاوٹ سے، مشقت سے
کسی سے نہیں ڈرتا

پہ کروں کیا
جو میں اُس نقش کو کھینچوں
تو کھنچے جاتے ہیں مژگان
تنے جاتے ہیں ابرو
تری آنکھوں کا یہ جادو
مرے آتا نہیں قابو
میں اگر ہاتھ کو روکوں
وہیں رک جاتا ہے گردوں
گری زلفیں
جنہیں خود میں نے بنایا ہے
سنوارا ہے
بکھیرا ہے بنا کر

انہی زلفوں کے خم و پیچ نے
اب دام میں کچھ ایسے لپیٹا ہے
کہ خط کھینچنا دشوار ہوا ہے

نہیں معلوم یہ کیا ہے
یہ تخیل ہے، حقیقت ہے
ستارا ہے کہ جگنو
یہ سرِ دشت تمنا
جو گھڑی بھر کو رکا ہے
وہ حسینہ ہے کہ آہو
یہ تیرے نین، ترے نقش
ترا رنگ ترا روپ
تری لطف و عنایت
ترے آداب و روایت
ترا اسلوبِ محبت
انہیں دیکھوں کہ چھپاؤں
یہ بڑھے جاتی ہے دھڑکن
اسی خواہش کے الاؤ میں جلا جاتا ہے تن من
دلِ خوش فہم کو
بس ایک ہی دُھن ہے
ترا دامن، ترا دامن، ترا دامن

نہ تصور میں ہے طاقت
نہ مرے ہاتھ میں دم ہے
کہ ترا نقش ابھاروں
کہ تری زلف سنواروں
کہ ترا روپ نکھاروں

یہ بتا دے
سرِ قرطاس پہ کس طرح اتاروں
تری آنکھوں کا خمار
اور ترے رخسار کی حدت
ترے چہرے کا پگھلتا ہوا سونا

وہ اجازت دے
تو میں اُس کے کرم سے
کسی امکان عدم سے
کروں پیدا
ترا ہونا

ابھی اثبات میں سر تو نے ہلایا تھا
تو کانوں میں ترے چاند سا چمکا
ترا جھمکا
متلاطم ہوا سینے پہ دمکتا ہوا زیور
یہاں بھاری
وہاں ہلکا
جو کہے تُو، تو ہٹا دوں
ترے چہرے سے وہ آنچل
جو ابھی تک نہیں ڈھلکا
مری محبوب
مرے خواب کی تعبیر
مرے فن کی صداقت
جو میں جلتا ہوں تری دائمی فرقت میں
تجھے پانے کی حسرت میں
محبت میں
تو معلوم ہے، مجھ کو
کہ جدائی میں مری تو بھی تڑپتی ہے
سسکتی ہے
تجھے بھی کسی طاقت نے
کسی دیو نے
رکھا ہوا ہے دامِ قفس میں
مگر افسوس
کہ تصویر کے پردے سے نکلنا
نہیں بس میں ......

قیصر نجفی

میری ماں!

(ماں کی یاد میں جن کی وفات کی خبر بروقت نہ مل سکی)

میں بے خبر تھا
کہ موت کے دستِ بے اماں نے
مری تو دنیا اجاڑ دی ہے
اجل کے قزاق نے مری زندگی کی پونجی
سب ایک بار آ کے لوٹ لی ہے

میں بے خبر تھا
کہ کنجِ غربت
میں بد نصیبی کی چیرہ دستی
نے مجھ کو قلاش کر دیا ہے
وہ تارِ اُمید و بیم قائم
تھا سلسلہ جس سے میری سانسوں کا
کٹ گیا ہے
وہ سائباں جس کا سایۂ جاں فزا سدا سے
مرے لیے تھا
گرا ہوا ہے
وہ آئینہ جس میں نورِ لطف خدا کا دیکھا تھا عکس میں نے
چٹخ گیا ہے

وہ جسم سارے
جہاں کے پھولوں کی جس میں خوشبو
تھی خاک میں خاک ہو چکا ہے

وہ چہرہ جس کا
ہر ایک موسم
بہارِ جاں کا
امیں تھا بے رنگ ہو گیا ہے
وہ ہونٹ جن میں
محبتوں چاہتوں کی پاکیزہ آگ تھی سرد ہو چکے ہیں
وہ ابرو جن کی
ہر ایک جنبش
میں شفقتوں کے پیام تھے موت کے دھندلکوں
میں کھو چکے ہیں
وہ دوست آنکھیں
سدا کی میری رفیق ڈھلتے
تھے جن میں مہر و وفا کے مہتاب بجھ گئی ہیں
وہ پلکیں جن کی
تمام صبحیں تمام شامیں
میری خوشی کے ہی خواب بُنتی
تھیں گردِ مرگِ الم نشاں میں اٹی ہوئی ہیں

وہ ہاتھ ایک ایک لمس میں جن
کے حدتیں چارہ سازیوں کی
بھری تھیں، بے جان ہو چکے ہیں
وہ پاؤں جن کے
تلے مری جنتوں کے ان مٹ نشاں تھے
مرقد میں کھو گئے ہیں

میں بے خبر تھا

کہ مجھ سے آ کر
کسی نے ہولے سے یہ کہا کچھ خبر ہے تجھ کو
وہ جس کا دھڑکا سا تیرے دل کو لگا ہوا تھا
وہ جس کے ڈر سے وجود تیرا لرز رہا تھا
بڑی شقاوت سے وہ قیامت
تو جانے کب کی گزر چکی ہے
مسافرت میں ہی روتے روتے
سنا ہے ماں تیری مر چکی ہے

سنا ہے ماں تیری مر چکی ہے

سنا ہے ماں تیری مر چکی ہے

یہ وہ گھڑی تھی
زمیں سے تا آسماں ہر اک شے
فغاں کی تصویر بن گئی تھی
میں رو رہا تھا
کچھ اس طرح میری ساری ہستی پگھل رہی تھی
وجود میں زلزلہ تھا ایسا
کہ روح میری لرز اٹھی تھی
چٹان اندر کے حوصلوں کی
زمین دل پر تڑخ رہی تھی
کبھی زمیں کو کبھی میں سنگ فلک کو حسرت سے دیکھتا تھا
فضا کی پہناؤں میں ماں کے شفیق چہرے کو ڈھونڈتا تھا
وہ ماں جو میرے
سفینۂ جاں کی ناخدا تھی
کیا تھا تخلیق جس کے دستِ دعا نے مجھ کو
مری خدا تھی!
مری خدا تھی!!
مری خدا تھی!!!

(فراز کی نظم ''ندیم چہرہ ندیم آنکھیں'' سے استفادہ کیا ہے۔)

صفدر ہمدانی

○

اے ارض وطن شرمندہ ہیں!

ہم پاک وطن کی گلیوں سے بازاروں سے شرمندہ ہیں
رونے والی ماؤں سے غمخواروں سے شرمندہ ہیں
خون کے چھینٹے جن پر ان دیواروں سے شرمندہ ہیں
اے ارض وطن سچ پوچھ ترے معماروں سے شرمندہ ہیں
شرمندہ ہیں اپنے وطن کی بیٹیوں، بہنوں، ماؤں سے
شرمندہ ہیں شہروں، گلیوں، بازاروں سے، گاؤں سے
شرمندہ ہم ہرے بھرے اشجار سے ان کی چھاؤں سے
شرمندہ ہم روح سے اپنی، جسم سے، سر سے، پاؤں سے
شرمندہ ہم آس، امید سے، خون بھری آشاؤں سے
اے ارض وطن شرمندہ ہیں ہم تیرے گلوں سے گلشن سے
شرمندہ ہیں سرو و سمن سے کوہساروں کے دامن سے
شرمندہ ہیں گھر سے گھر کی چھت سے گھر کے آنگن سے
اے پاک وطن شرمندہ ہیں ہم بادل، بارش، ساون سے
اے ارض وطن شرمندہ ہیں
اے پاک وطن شرمندہ ہیں
شرمندہ ہم خوشبو سے ہیں شرمندہ ہم پھول سے ہیں
مندر و مسجد سے شرمندہ، شرمندہ اسکول سے ہیں

شرمندہ مٹی سے تیری سڑکوں کی اس دھول سے ہیں
لعنت تیرے ہر قاتل پر شرمندہ مقتول سے ہیں
یہ خودکش کس مٹی سے نکلے
کس بستی سے آئے ہیں
کس نے ان کی فصل اُگائی
کون انہیں یاں لائے ہیں
کون خدا کے بندوں کے ان قاتلوں کا رکھوالا ہے
کون ان کے خوں رنگے ہاتھوں پہ
بیعت کرنے والا ہے
کس نے میرے گھر آنگن میں رہا خون اچھالا ہے
کس نے ان سانپوں کو سائیں دودھ پلا کے پالا ہے
یہ کیسے ظالم قاتل ہیں
جو خود کو کلمہ گو کہتے ہیں، کلمہ گو کو مارتے ہیں
دن میں سو سو بار یہ اپنے سامنے خود ہی ہارتے ہیں
کس ظالم نے ہنستے بستے شہر مرے برباد کیے
کس نے ہر اک شہر کے اجڑے قبرستان آباد کیے
کس نے پھول سے چہرے خون کے غازے سے
ناشاد کیے
کس نے یہ انسان کے دشمن خودکش سب آزاد کیے
کس نے اپنی آگ ہمارے گھر میں آن لگائی ہے
کس نے خون کے دیے جلا کر اپنی شام سجائی ہے
کس نے میرے دروازے پر موت کی شکل بنائی ہے
کس نے گل رخ بچوں کے دامن کو آگ دکھائی ہے
کس نے یہ بارود کی بارش دن دیوے برسائی ہے
کملی والے مدد کو آؤ، حسن حسین دہائی ہے
اے ارض وطن شرمندہ ہیں
اے پاک وطن شرمندہ ہیں
شرمندہ ہیں ان سے جن کے گھر میں ماتم داری ہیں
شرمندہ ہیں ان سے جن کی گلیوں میں بے زاری ہے
شرمندہ ہر شخص سے جس نے جان کی بازی ہاری ہے
شرمندہ اس باپ سے جس نے اپنے کڑیل بیٹے کی
قبر میں لاش اتاری ہے
شرمندہ اس ماں سے جس کی آنکھوں سے خوں جاری ہے
شرمندہ بیٹے سے جس پر سانس بھی لینا بھاری ہے
شرمندہ اس بہن سے جس کی قسمت میں غم خواری ہے
شرمندہ اس بیٹی سے جو باپ سے کٹ کر زندہ ہے
شرمندہ اس قوم سے جو فرقوں میں بٹ کر زندہ ہے
شرمندہ ملت سے جو مرکز سے ہٹ کر زندہ ہے
شرمندہ ہیں پاک وطن ہم آنے والی نسلوں سے
شرمندہ ہیں کھیتوں سے کھلیانوں سے اور فصلوں سے
اے ارض وطن شرمندہ ہیں
ہم پاک وطن کی گلیوں سے بازاروں سے شرمندہ ہیں
(لندن)

اقتدار جاوید

کھڑکی سے

باورچی خانے کی کھڑکی سے
کیسے
ستاروں بھرا،
دودھیا راستوں سے مزین
فلک
دیکھ لیتی ہو
باورچی خانے سے
کھانے کے کمرے تلک
کتنے
دریاؤں کو پاٹتی ہو
کنارے سے
کشتی کو
گہرے سمندر کے اندر
کہیں ڈوبتے دیکھتی ہو
کسی طرح
ساحل پہ کشتی
پہنچنے کی امید میں

کھانے کی میز پر بیٹھ جاتی ہو
لقمے کو چکھتی ہو
ہونا کہاں تم نے تھا
کس جگہ خود کو رکھتی ہو
تم
کس طرح جان لیتی ہو
گہرے سمندر میں طوفان
تھمتا ہے
گمبھیرتا پھیلتی ہے
جہاں
ایک ہیبت جگاتا سمندر
تھا
صحرا وہاں پر ابھرتا ہے
کشتی کی صورت اترتا تھا
صحرا میں اک کارواں
کارواں والے سے
ایک جیون میں
صحرا نہیں پار ہوتا

بہت تلخ کامی کا
جب
گھونٹ بھرتی ہو

گہرے سمندر کے نیچے
اترتی ہو
ٹیرس پہ
کچھ دیر کے واسطے
بیٹھ جاتی ہو
آگے جہاں پر
نگاہیں تمہاری لگی ہیں
تو
بازار سرشار ہوتا
وہاں
تم ذرا دیر رکتیں
سیہ بدلیاں
نیچے
جھکتیں!

خدا میرا کرتا
اگر
اک تمنا بھی پوری
وہاں ایک گلزار ہوتا
جہاں تم مہکتیں
وہ بازار ہوتا
جہاں
ساڑھیوں، تنگ پاجاموں
اور
ہینڈ بیگوں کا انبار
ہوتا
اگر
تم وہاں سے گزرتیں
خموشی بھری رات میں
لائٹ کو آف کرتے ہوئے
تم کہاں پر
نگاہیں جھکائے کھڑی ہو
اندھیرے سے آگے
کسی اور دنیا میں
اک اور سیارے پر
ایسے
روتی ہوئی
اس اندھیرے سے ہوتی ہوئی
کس طرح
مجھ تلک دیکھ لیتی ہو!!

عامر سہیل

سو گیا اک عہد مٹی کے تلے

(نذرِ احمد ندیم قاسمی)

نیم شب برآمدوں میں
گفتگو کرتے ہوئے افسانوی کردار
غزلائے گئے
رہ گئے جانے ادھورے کتنے کام
کون محرابوں کی زد میں
آ گیا ماہِ تمام!
میگھ کوترسی زمیں پر
کس نے کھولی ہیں طنابیں ابر کی
کس صدا نے صبر کی مٹی سے
گوندھے ہیں یہ افسردہ وجود
سب خس و خاشاک
اپنی آوازوں کی کھونٹی پر ٹنگے

عشق جن کے حاشیہ بردار
کب کے اُٹھ چکے
آئینوں کے آئینے منکر
کہ کچھ دِکھتا نہیں اپنے سوا
جرعہ جرعہ آنسوؤں کے بیچ
لودیتی ہوئیں
نقرئی سطریں، سنہری آیتیں
بے نمو صبحیں، برہنہ مہلتیں
کون چولستان کی مٹی سے
کرتا تھا تیمم، شب گئے
کس کے لفظوں کا ترنم
ریت سے صبحیں اٹھاتا تھا
وہ صبحیں جن پہ شب کے
آئینوں کا عکس بھی ممنوع تھا
جس کا نالہ حجرۂ افلاک میں
مسموع تھا!
سورجوں کو رات پڑتی تھی
تو وہ حرفوں سے بُنتا تھا نجوم!
سو گیا اک عہد مٹی کے تلے
تیرتے ہیں صفحۂ آبِ تہی پر
زرد پڑتے ہم مناجاتی مجسم آبلے!

پھر شبانی کو میسر جانے کب ہو
کوئی ہُود!
پھر بنے گی کب سحر وہ جسم جس کی روح
بلّوریں نسب!
ناک پر عینک لگا کر
ایک سنجیدہ ادا سے
جستہ جستہ پیکرِ خستہ سے پڑھتا
آسمانوں کی، جہانوں کی چمکتی
ہفت رنگی تختیاں

اب بھی یہ لگتا ہے جیسے
وہ ابھی بستر سے اُٹھے گا
اور اُٹھ کر پھر اُلٹ دے گا
زمینوں کے ورق!
اپنی لانبی، حیرتی سی اُنگلیوں کو
ایک جنبش دے گا اور پھر
کھول دے گا کائناتوں کا حجاب!!
خواب اندر خواب
اندر.....خواب.....خو.....ا.....ب.....!

(بشکریہ ''معاصر'')

احمد ندیم قاسمی

لالۂ صحرا

عصرِ حاضر کی تہذیب کے دُور تک پھیلے صحراؤں میں
آندھیاں چل رہی ہیں
اس کی تاریخ، ٹیلوں کی صورت، یہاں سے وہاں، سر پٹختی نظر آ رہی ہے
اور ہوا، ریت کے تند چھینٹے اُڑاتی
مرے خیمۂ دل کے چاروں طرف
اِک بھنور سا بنانے میں مصروف ہے
یہ وہ خیمہ ہے
جس کی طنابوں پہ جھونکے قیامت کی شدت سے جب ٹوٹ پڑتے ہیں
چیخوں کی آواز آتی ہے
جیسے بہت سے فرشتے
فلک سے اُترتے ہوئے، رو رہے ہیں!
مگر میری نظریں فقط ایک نقطے پہ جم سی گئی ہیں
وہاں ایک لالے کا پھول
ایک عجب جرأت و بے نیازی سے
ایک ایک پتی سنبھالے ہوئے
سر اُٹھائے ...... کھڑا ہے!

(''بسیط'')

آفتاب اقبال شمیم

ممنوعہ مسافتیں

رات کی منزلِ ماہ پر رُک کے جو خواب
دیکھا تھا، اُس خواب کو
واقعے کے بھنور نے نگل بھی لیا
حوصلہ پھر بھی ٹوٹا نہیں
اور پھر آج وہ اور میں
دن کی وسعت میں پھیلے ہوئے روشنی کے سمندر میں
اک پھول سی موج کو
اپنے دامِ تمنا میں لانے کی دُھن میں
سفر گیر ہیں
یہ گزرتے ہوئے وقت کی ریزشیں ہیں
کہ اُن خاص لمحوں کا جھرمٹ ہے جو
آنکھ کے پیش منظر سے گزرا نہیں

دور سے دیکھتا ہوں تو اک اوڑھنی
جس پہ ابرق کی افشاں چمکتی ہے، جو
لہریے سے بناتی ہوئی
اُس کا چہرہ دکھاتی نہیں، اور وہ
ایک وعدے کی دوری پہ موجود ہے
کیا پتا یہ تخیل کی بے داد ہو
چاہنے سے ہے کیا!
کیا پتا
میری مٹی کے سَت اور امکان کے
حوصلے میں اُسے دیکھنے کی سکت ہی نہ ہو
ناگہاں اور مٹی کے اپنے ارادے ہیں
میں کون ہوں
ایک اسرار جو ماورا ہے، اُسے جاننے کا
تقاضا کروں
جانتا ہوں کہ میں پیکرِ خاک
ہستی کے دربار میں اُس ازل بخت
مٹی کا مندوب ہوں
خوب ہوں اور نا خوب ہوں!
اک پیامِ مسلسل مجھے
ناگہاں اور مٹی کی ترکیب سے ملتا رہتا ہے
میں وہ وجود آشنا ہوں جسے
اپنی غایت کا، اپنے مراتب کا ادراک ہے
اس رواں داستاں، واقعوں وارداتوں
کے مرکز کا کردار ہوں

میری پہچان گزرے ہوئے نور کے
حافظے میں رقم ہے
اسے لَوٹ کر میرے ہونے کی
تائید کرنی تو ہے
اب، کہاں، کس جگہ یہ زماں
میری مٹی کو مجھ پر
مجھے میری مٹی پہ ظاہر کرے گا
مجھے کیا پتا!

امجد اسلام امجد

نارسائی

قوسِ قزح سے لے کر، رنگوں کے سب خزانے
میری نظر سے تم کو، دیکھے یہ سب خدائی
سو زاویے بدل کر، اپنے ہنر کے بل پر
دیکھو تمہاری میں نے، تصویر ہے بنائی!

"سینے پہ ڈھلکا آنچل، گیسو کھلے کھلے سے
جھکتی ہوئی نگاہیں، آہو، ڈرے ڈرے سے
کیسی ہے پیش قدمی؟ کیسی گریز پائی!

ساری کشش بدن کی پیروں میں آ گئی ہے
اک اجنبی سی مستی جادو جگا رہی ہے
اس کیفیت سے میری پہلی ہے آشنائی

ہونٹوں پہ جھلملاتا موہوم سا تبسم
رخسار پر پسینہ، پھولوں پہ جیسے شبنم
جوبن کی پیرہن میں دشوار ہے سمائی!

آنکھوں میں مسکرانا، سائے سے اپنے ڈرنا
رُک رُک کے بات کرنا، اُٹھتے ہوئے سنبھلنا
رفتار میں عجب سا اک نازِ دل رُبائی

اک آنچ سی ہے لرزاں، شاخوں کی انجمن میں
شعلے سے جاگ اٹھے، کلیوں کے تن بدن میں
صحنِ چمن میں تم نے کیا آگ ہے لگائی!

خوشبو سی ہر مسافت، خوابوں سا ہر علاقہ
ٹھہری نظر جہاں بھی، میں نے جہاں بھی دیکھا
نکلی بیاں سے باہر، منظر کی خوش نمائی"

ہر نقش بھی تمہارا دل پر ہے نقش میرے
ہے عمر بھر کی میری رنگوں سے آشنائی
دیکھا نہیں جہاں نے شہکار اس طرح کا
ایسا نہیں مصور! کہتی ہے سب خدائی
لیکن ہے یہ حقیقت جتنے حسین ہو تم!
مجھ سے تمہاری ویسی تصویر بن نہ پائی

گلزار

اِک نظم مِری چوری کر لی کل رات، کسی نے

اِک نظم مِری چوری کر لی کل رات کسی نے
یہیں پڑی تھی بالکنی میں،
گول تپائی کے اُوپر تھی!
وِسکی والے گلاس کے نیچے رکھی تھی،
شام سے بیٹھا،
نظم کے ہلکے ہلکے سِپ مَیں گھول رہا تھا ہونٹوں میں،
شاید کوئی فون آیا تھا......
اندر جا کے، لوٹا تو پھر نظم وہاں سے غائب تھی!

اَبر کے اُوپر نیچے دیکھا
سُرخ شفق کی جیب ٹٹولی
جھانک کے دیکھا پار اُفق کے
کہیں نظر نہ آئی، پھر وہ نظم مجھے......!

آدھی رات آواز سنی، تو اُٹھ کے دیکھا
ٹانگ پہ ٹانگ رکھے، آکاش میں
چاند ترنم میں پڑھ پڑھ کے
دنیا بھر کو اپنی کہہ کے نظم سُنانے بیٹھا تھا!

(ممبئی)

سرحد پر یہ سکتہ کیوں ہے؟

سرحد پر یہ سکتہ کیوں ہے؟
اس برفاب سی خاموشی سے ڈر لگتا ہے!

خاموشی مکّار بہت ہے،
ایک ٹانگ پر کھڑے کھڑے بھی،
ایک آنکھ سے دھیان لگائے،
دُوجی آنکھ کھلی رکھتی ہے

جب بھی کوئی ہلچل ہو تو،
سرحد کے دونوں جانب ہی،
کانٹے دار آوازوں کے کچھ کیکٹس اُگنے لگتے ہیں!!

سرحد کے ریگستانوں میں،
سانس دبا کر چلتی ہے خاموش ہوا
ریت، زمیں سے گردن گھس کر اڑتی ہے،

سرحد پہ سکتہ طاری ہے
سرحد کی برفاب سی اِس خاموشی سے اب ڈر لگتا ہے!!

(ممبئی)

گلزار

آپ گئے کہ آنکھیں دو بے نور سے لینسیز لگتی ہیں

آپ گئے کہ آنکھیں دو بے نور سے لینسیز لگتی ہیں
کس منظر سے اب ان کو بہلاؤں میں......
جاگتی ہیں تو خالی خالی پنّے دیکھتی رہتی ہیں
ورنہ اُدھڑی اُدھڑی نیندیں اوڑھ کے دونوں......
پھیکے سپنے چاٹ چاٹ کے، رات گزارا کرتی ہیں

کیا ہوگا اِن دو لا وارث آنکھوں کا......
آپ گئے کہ بے مقصد، بے نور سے شیشے لگتی ہیں!

(ممبئی)

فِضا یہ بوڑھی لگتی ہے

فِضا یہ بوڑھی لگتی ہے
پرانا لگتا ہے مکاں......

سمندروں کے پانیوں سے نیل اب اُتر چکا
ہوا کے جھونکے چھوتے ہیں تو کھردرے سے لگتے ہیں
بجھے ہوئے بہت سے ٹکڑے آفتاب کے
جو گرتے ہیں زمین کی طرف تو ایسا لگتا ہے
کہ دانت گرنے لگ گئے ہیں بڈھے آسمان کے!

فِضا یہ بوڑھی لگتی ہے
پرانا لگتا ہے مکاں......!

(ممبئی)

عبداللہ جاوید

رایگاں

ہر طرف پھیلی ہوئی
بدصورتی کے درمیاں
آج کے انسان کو جینا
اور
مرجانا بھی ہے
جیتے جی یاں
اپنے پیاروں کے لیے
جو بنے
جیسا بنے
کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
اپنی محنت سے
پسینے سے، لہو سے
اپنے پیاروں کے لیے

ہر طرف پھیلی ہوئی
بدصورتی کے درمیاں
خوبصورت خواب لانا
اور دکھلانا بھی ہے

آج سے پہلے کبھی
زندگی
اتنی بے معنی نہ تھی

جبر کے پھیلے ہوئے جنگل میں
یہ جکڑی زمیں
یہ زماں

آدمی
کیڑے مکوڑے
رینگتی مجبوریاں
دیو ہیکل، دیو قامت
مالکوں کے ہاتھ میں

اپنی اپنی گردنوں کی
ڈوریاں
دے کر مگن اور شادماں

اک رواجی اور مشینی زندگی
جینا
عبث
کارزیاں
رایگاں
سب رایگاں
سب رایگاں!!!

(کینیڈا)

ماں زمیں

میں ارضِ آدم کو گھر سمجھتا ہوں آدمی کا
میں ارضِ آدم کو چاہتا ہوں،
نباہتا ہوں
میں ارضِ آدم کو ماں برابر بھی
مانتا ہوں
میں ارضِ آدم کی ماتا کی سبھی اداؤں کو
جانتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ میری ماں بھی
تھی ارضِ آدم کی ایک بیٹی
مگر تمہیں کیا؟

مگر تمہیں کیا؟
تمہیں تو دُھن ہے کہ ارضِ آدم
تمہارے پیروں تلے بچھی ہو......
تمہارے بوٹوں کی خاک بن کر
یہاں پڑی ہو، وہاں پڑی ہو،
خود اپنی اولاد کے لہو سے
درندگی کو خراج دیتی!!

(کینیڈا)

ستیہ پال آنند

دانیال آئے کوئی، ممکن نہیں ہے

چاہیے کیا؟
پوچھتی ہے قبر سے کھودی گئی اک لاش جو
اب پیڑ سے لٹکی ہوئی ہے
اور آخر چاہیے کیا؟
پوچھتا ہے اک بریدہ پاؤں
جو کل شام افطاری کی خاطر
روٹیاں لانے کو اپنے گھر سے نکڑ تک گیا تھا
کچھ تو بولو، چاہیے کیا؟
جا بجا مسجد میں بکھری
خون میں رنگی ہوئی کچھ ٹوپیاں
کپڑوں کی الجھی دھجیاں، دریاں لہو میں تربتر
بھیگی زباں میں پوچھتی ہیں

دانیال آئے کوئی انصاف دینے
حق درستی کے لیے کیا؟

غیر ممکن!
آج کے اس دور میں اک خوابِ خوش گزراں
بعید از عقل و امکاں!!

یہ تو رّع، زہد کب تک ساتھ دے گا؟
روزے رکھ کر اور افطاری میں سوکھی روٹی کھا کر

تم سمجھتے ہو کہ تم نے
اس جہاں سے ہاتھ دھوئے ہیں تو اپنی عاقبت کو
ایک بہتر شکل دی ہے؟
عاقبت کی بات وہ دھوکا ہے، وہ فرضی چھلاوہ
جس سے سارے حکمراں رعیت کو بہلاتے رہے ہیں

دیکھتے بھی ہو کہ یہ خونخوار ویمپائر ہمیشہ
جبر سے یا قہر سے
یا پیار سے دھوکے سے پھسلا کر کبھی
بس خون پیتے ہیں تمہارا
مگر تم خاموش بیٹھے ہو
کہ کوئی دانیالِ عصر آئے
اور اپنے ساتھ تم کو بھی بچا لے جائے
خونی شیر کے پنجے سے؟ پر اتنا سمجھ لو
ایسے ناممکن کو ممکن کر دکھانا دانیالِ عصر سے ممکن نہیں ہے!

(کچھ مضامین یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اسطورہ سے ماخوذ استعارے کے باوجود انہیں عام قاری کے لیے ترسیل کی سطح پر ناقابل اخفا زبان میں نظم کیا جائے۔ یہ نظم استعارے اور علامت کی زبان سے مبرا ہے۔)

ستیہ پال آنند

فصل تو اب پک گئی ہے

(بچوں کے لیے ''قصہ طوطا مینا'' کی ایک کہانی۔ عصر حاضر کے ''بڑوں'' کے تناظر میں)

باجی مینا نے کہانی یوں سنائی......

''......کیا ثمر تھا
اولیں غنچہ، شگوفہ نخستیں کا
ماحصل تھا فصل کے بونے سے پکنے تک کی محنت کا
حفاظت جس کی بے حد لازمی تھی

ایک معمولی تنازعہ تھا فقط املاک کی موروثیت
یا کھیت کے احقاق و دعویٰ پر، مگر
اک وارثِ مابعد جیسے وارثِ مطلق کی صورت بن گیا
(اور تا قیامت خود کو موروثی سمجھ کر)
اس پہ قابض ہو گیا تھا
دوسرے منہ دیکھتے ہی رہ گئے

صاحبِ املاک، طاقت کے نشے میں چُور تھا ہی
کھیت سارے سستے بھاؤ ''نام کے پٹے'' پہ
اک شہزور منصب دار کو بیچے، تو پھر بے فکر ہو کر
یوں پھنسا لہو و لہب میں
بھول بیٹھا، کاشتکاری پیشۂ آبا تھا اس کا

اگلی سے اگلی فصل کے وعدوں پہ
قرضوں کی ادائی میں ملوث کر دیا سب آنے والی
پیڑھیوں کو!''

یہ کہانی تو ادھوری رہ گئی ہے'' مینا باجی بول اٹھی......
''طوطے بھائی
اس برس بھی فصل تو تیار ہے، پر
منڈیوں کے سارے ساہوکار کوے
کائیں کائیں کر رہے ہیں، کھیت پر منڈلا رہے ہیں
دانہ سب چُگ جائیں گے، تو......؟''

''تم بتاؤ۔ مینا باجی!'' طوطا بولا۔
''کوئی منصوبہ کہ جس سے اس برس تو
فصل بچ جائے کسانوں کی، انہیں کچھ فائدہ ہو!''

مینا بولی ''بھائی طوطے، سب مدبر کہہ گئے ہیں
فصل جب پکنے کو ہو تو چند کوؤں کو پکڑ کر
الٹی ہانڈی کے بجوکوں کی طرح
بانسوں پہ لٹکانا ضروری ہے، کبھی تو جانتے ہیں!''

امین راحت چغتائی

احمد ندیم قاسمی

(۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء۔ ۱۰ جولائی ۲۰۰۶)

وہ لوح و قلم لے کر
آیا جو سرِ محفل
حسن اپنی جگہ مہکا
عشق اپنی جگہ چہکا
احوالِ بشر اُس کے جب زیرِ قلم آئے
انسان سے انساں کی پہچان ہوئی آساں،
وہ عظمتِ آدم تھا
توقیرِ ہنر اُس سے
تدبیرِ ہنر اُس سے
وہ امن کا متلاشی
زنداں کے اندھیرے بھی
مرعوب نہ کر پائے
اُس نور کے خوگر کو
ایقانِ سحر اُس کے
افکار کا محور تھا،
اغیار کے طعن، اُس کو
بھٹکا نہ سکے راحت
اُس منزلِ ہستی سے
جو مہرِ درخشاں کا مطلع بھی ہے، مامن بھی،
جو اُس کا بھی ایماں تھی
جو میرا بھی ایماں ہے

خروشِ مستاں

یہ ضربِ مستاں سے قلب اپنی کثافتیں
اِس طرح سے دھوئے
کہ مدعا کوئی پھر نہ اُبھرے
کوئی تمنا نہ رنگ بن بن کے
چشمِ منظر سرا میں اترے

یہاں عروج و ثبات کیا!
زماں تغیر گزیدہ کب سے
جلالِ ثروت کو آب دے کر
بقا کا مژدہ سنا رہا ہے
غبارِ ایام سے اٹے راستے کو منزل بتا رہا ہے
کوئی نہ جانے کہ ساعتیں اب سمٹ رہی ہیں
نہ بے بقا عصر کے سرابوں میں کوئی جھانکے۔
ہوس کا کہرام سوچنے بھی نہ دے کسی کو
مسائلِ مفتیاں کا شور و شغب الگ ہے

خروشِ مستاں میں فکرِ درماں
ہے ترکِ رغبت سکونِ باطن
ہے سازِ فطرت بھی اس میں مضمر
ذرا سا مضراب سے تو چھیڑ دو
سنو گے نغماتِ سرمدی میں
پیام، ارض و سما کے سارے

نصیر احمد ناصر

ابد کے پرندو!

ابد کے پرندو!
مری چھت پہ بیٹھو
اُتر آؤ نیچے
کہ اتنی بلندی پہ اُڑنے کا حاصل فقط لازمیں ہے
دیکھو
یہی دوربینی ہے
نیچے اتر کر فلک سے
مری چھت سے جھانکو زمیں پر
مری بالکونی میں چہکو
مرے گھر کے پیڑوں پہ اچھلو
ہر اک پھل کا رس چوس لو، خوب چونچیں بھی مارو
مرے ساتھ کھیلو!
مرے لان میں کرسیاں ہیں
ابھی گھاس بھی سبز ہے اور تازہ تراشی ہوئی ہے
مگر بیٹھنے والے سب جا چکے ہیں
میں خود بھی کھڑا ہوں،
ابھی چل پڑوں گا
تمہارے پروں کی ہری پھڑ پھڑاہٹ سنوں گا
تو کچھ دیر رک رک کے دیکھوں گا
پودوں کو، پھولوں کو، مہکے ہوئے منظروں کو
انہی منظروں میں کہیں میں بھی تھا، تم بھی تھے
زندگی تھی ——

ابد کے پرندو!
مرے پاس آؤ
نہیں تو مجھے پاس اپنے بلا لو
مجھے اپنے اُجلے پروں کی ابد خیز چھایا بنا لو
مجھے اپنے کایا بنا لو
تمہیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں
میں اُڑنے لگا ہوں!!

ڈسٹ بن سے موت جھانکتی ہے

تمہارے لیے میں خوشی کو تلاشوں گا
ڈھونڈوں گا غم کو
انہی ٹین ڈبوں میں، کچرے کے ڈھیروں میں
ٹوٹی ہوئی بوتلوں، شاپروں میں
کئی میلے کچیلے زمانوں کے آدرش ہوں گے
یہیں پر کہیں زندگی کی دھنک رنگ ساعت بھی ہوگی
یہیں پر کہیں ہم کو گڑیا کی آنکھیں ملیں گی
پھٹے سرخ ملبوس، سلمہ ستارے ملیں گے
تمہارے زمیں بوس ماتھوں پہ بچو!
یقیناً کسی دن کبودی فلک کے کنارے ملیں گے
یہیں شاعری کی پرانی کتابوں کے اوراق ہوں گے
محبت کے جذبات، نفرت کے چقماق ہوں گے
گلے پھل، سڑی باسی روٹی کے ٹکڑے
کبھی کچھ ملے گا
اسی ڈسٹ بن میں
کئی کائناتوں کے پھینکے ہوئے خشک و نم دار فضلے
یہیں پر اداسی کا ملبہ پڑا ہے
یہیں چھوٹی موٹی سی بے کار چیزوں کے نیچے چھپی دیکھتی ہے
المناک راتوں کی تنہائی ہم کو
یہیں پر دنوں کا اجالا بھی ہوگا
یہیں خواہشوں کے غبارے اڑائیں گے
کاریں، ٹرینیں بھگائیں گے
سورج کو فٹ بال، تاروں کو گیندیں بنائیں گے
کھیلیں گے مل کر
مگر تم نہ چھیڑو! خدا کے لیے مت اٹھاؤ!!
غلاظت کے انبار میں گپت ہوتے کھلونا نما ایک خودکار بم کو!!

نصیر احمد ناصر

تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے

کہانی مرے دل پہ آ کر رکی ہے
میرا دل چلے گا
تو آگے بڑھے گا یہ قصہ زمین و زماں کا!

مرا دل تو تم کو پتہ ہے
ازل ہی سے ٹوٹا ہوا ہے
خود اپنی ہی دھڑکن سے روٹھا ہوا ہے
مرا دل کہ جس نے ہر اک دل کا دکھ درد بانٹا
ہر اک دل مرے دل سے پھر بھی گریزاں
مرا دل ہر اک دل کا کانٹا
زمانہ
مرا دل مٹانے کے درپے ہے
دنیا مری لاش اٹھانے، مری خاک اڑانے کے درپے ہے
تم کو خبر تک نہ ہوگی
کہ تاریخ گمنامیوں کا صحیفہ ہے
پڑھتے ہوئے کس کو معلوم ہوگا
کہ کیسے کوئی اپنے اندر کے گہرے گپھاؤں، طلسمی
بلاؤں سے لڑتا رہا ہے
خود اپنی صداؤں سے لڑتا رہا ہے
کہاں کوئی مارا گیا تھا
کہاں کوئی زندہ تھا، زخمی تھا
کس نے ابھی اور جینا تھا
کب کوئی مرحوم ہوگا
کہاں پیاس دریا سے چپکا کنارا بنی تھی
کہاں بادلوں کا ٹھکانہ تھا، بارش کہاں پر ہوئی تھی
کہاں برف باری،
کہاں کوئی یخ بستہ ظالم ہواؤں سے لڑتا رہا ہے
مرے دل میں کیا ہے کہاں نقش ہوگا
کہاں کس ورق پر مرا خوابِ بے چشم مرقوم ہوگا!

مرا جرم یہ ہے
کہ میں نے کسی کو بھی اپنے مقابل نہ سمجھا
یہی وہ تمنا ہے جس کو مرا دل نہ سمجھا
کہانی مرے دل پہ آ کر رکی ہے
مرا دل چلے گا
تو یہ وقت آگے بڑھے گا
یہ تاریخ بھی استعارہ بنے گی، اشارا بنے گی
کسی داستاں کا
کسی سرزمیں کا، کسی آسماں کا ستارا بنے گی
مگر کیا کروں میں، میرا دل بضد ہے
یہیں رک کے دیکھے گا انجام مرگِ تہاں کا
کہانی مرے دل پہ آ کر رکی ہے......!!

کرامت بخاری

کہاں ہوتم

کہاں ہوتم ؟
مری نم دیدہ آنکھوں کی نمی تم تک پہنچنے ہی نہیں پاتی
کسی سے کیسے پوچھوں میں، کہاں ہوتم، نگاہوں سے
نہاں ہوتم
نہ جانے کون ہیں وہ لوگ جن کے درمیاں ہوتم
ذرا سوچو
پلٹ کر پھر وہی موسم وہی پھولوں کا موسم آ گیا ہے
ہمیں پھر سے وہی خوشبو کے خوابوں کا نگر آباد کرنا ہے
دلوں کو شاد کرنا ہے
کہاں ہوتم
مری نم دیدہ آنکھوں کی نمی تم تک پہنچنے ہی نہیں پاتی
تمہی ہو جو مری مجبوریوں کو بھی سمجھتے ہو
کہ تم تو جانتے ہو میں،
بہت سفاک لمحوں میں مقید ہوں
تمہیں معلوم ہے یہ بھی، تمہارے بن مجھے راحت نہیں ملتی
کہیں چاہت نہیں ملتی
کہاں ہوتم ؟

خواہش

جانے کب وہ بادل برسے
جو میری آنکھوں کا ساتھی بن جائے اور روئے
جانے کب ہو بارش ایسی
جو میرے اس شہر کے منہ سے خون کے دھبے دھوئے
جانے کب برسات ہو ایسی
جو اپنے بھیگے دامن میں دل کا بھید سموئے
جانے پھولوں جیسا موسم
کب میری بستی پر اُترے، سکھ کے ہار پروئے
خوشیوں کی یہ خواہش اکثر
میرے گھر کی تنہائی میں چپکے چپکے روئے

شوکت مہدی

وہی اب......

کلیجہ منہ کو آنے کی بابت سن تو رکھا تھا
کہ یہ بیماریٔ دل کی علامت ہے
وہی ہشاش انساں،
حال سے بے حال دِکھتا ہے
عجب اک اضطراری کیفیت سے وہ گزرتا ہے
فلک کو گھورتا ہے
اور خلا میں دائرہ در دائرہ آگے سرکتا ہے
اچانک گاہ رو دینا
اچانک گاہ ہنس دینا
پھر انجانے میں وہ دروازہ خود پر بند کر لینا
جہاں آویزاں اس کے نام کی تختی ابھی تک ہو
کلیجہ منہ کو آنے کی بابت سن تو رکھا تھا
کلیدِ حرزِ جاں جس کو بنایا تھا
اُسی سے قفل کھلنے میں نہیں آتا
وہی اب گومگو میں ہم کو رکھتا ہے

اے ہمزاد

زمانے اے زمانے
چند لمحوں کو ٹھہرنے دے
پسرنے دے
کہ میں بے خانماں ہوں اور مجھے چھت کی
ضرورت ہے
مری وابستگی
مٹی سے بھی ہے اور تم سے بھی
ترا برتاؤ مجھ سے
ناشناسوں کی طرح اچھا نہیں لگتا
مجھے پہچان
میں تم سے ہی بچھڑا ایک لمحہ ہوں
میں دانستہ جدا تم سے ہوا تھا
کچھ نیا سا دیکھنے کو
رونما ہونے کو اے ہمزاد
مجھ پر اور کیا کیا ہے
زمانے اے زمانے
چند لمحوں کو ٹھہرنے دے!

طالب انصاری

ہجر کی بارش میں بھیگتا وصل

بارش تھم جانے پر
سیلی سیلی گلیوں میں جب دھوپ پڑا کرتی تھی
نانک شاہی اینٹوں والی دیواروں پر
صدیوں پرانی کائی کیسی بھلی لگتی تھی
سوندھے سوندھے کمروں میں ہم
جانی پہچانی خوشبو میں سانس لیا کرتے تھے
لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی میں
بھیگا بھیگا منظر تکتے تکتے
اُکتا جاتے تو
ہم چھت پہ چلے جاتے تھے
آدھی دھوپ اور آدھی بارش
کھٹے میٹھے بیروں جیسا مزہ دیتی تھیں
قوسِ قزح کے رنگ افق سے اتر کر
تیرے گالوں پر کھلنے لگتے تھے

جانے کیسی قیامت تھی وہ
تیرے رویے میں تبدیلی
کتنا بڑا طوفاں لائی تھی
اک دن تو نے
اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا تھا
مجھ کو اب اس تنگ گلی کی
پیرانہ سالی سے ڈر لگتا ہے
پچھلی بارش میں
چھجو پانوں والے کے گھر کا چھجا
ٹوٹ گرا تھا
ٹیڑھی میڑھی ان گلیوں سے باہر
دنیا کتنی حسیں ہے
خیر ترے دن
تیرے خوابوں کے مطابق بیت گئے
فرصت ہو تو آ کر دیکھو
میرا اک اک لمحہ اب بھی
لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی میں
ٹھہرا ہوا ہے

اقتدار جاوید

چوک

گفتگو کو
درمیاں میں ختم کر کے
چیر کر دبیز خاموشی
میں
عین آدھی رات کو
نکل پڑا ہوں اپنے آپ سے
کسی طرف تو موڑنا تھا
اپنے آپ کو
کبھی تو چھوڑنا تھا اپنا آپ!

رات کے لباس میں
وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی رس بھری
بہت تھا گرم سانس رس بھری کا
اک ردائے خاص سے
ڈھکا ہوا تھا روئے پاک
کہہ رہی تھی
لوٹنا ہے
رات کا خمار ٹوٹنے سے قبل
صبح پھوٹنے سے قبل
اے چہار سوق
جس جگہ پہ ہے
اتنے راستے نکل رہے ہوں
اُس جگہ پہ
اپنا آپ روکنا ہے امتحانِ اصل!

سن رہا تھا
اور ڈولتا تھا
ایسے لگ رہا تھا
کوئی مجھ میں بولتا تھا
خود کو خود سے جوڑ کر
میں سارے رشتے توڑ کر
میں اپنے آپ سے نکل پڑا
ابل پڑا

وہ کہہ رہی تھی
تیز ہوتی نیند میں
کوئی تو ایسی بات کر
کہ جس کو سن کے مسکرا سکوں
کوئی تو ایسی رات ہو بہم
کہ جس میں ہم ہوں اک جگہ پہ
مجتمع!

نہ ایسا ہو
کہ دونوں اپنے آپ سے نکل پڑیں
اک اشک کی تلاش میں
ہم
ایک دوسرے کی آنکھ سے اُبل پڑیں!!

اقتدار جاوید

زنبور خانہ

زنبور،
زنبور خانے سے باہر نہ آنا!!
زمانہ تو پھولوں سے
اور شہد سے میٹھے
لوگوں سے لبریز ہے
اونچے پیڑوں کی
پھل دار شاخیں جھکی ہیں
فضا میں بہت دور
تم سے بہت دور
بادل کے ٹکڑے رُکے ہیں
وہ ٹکڑے کئی نعمتوں سے
لبالب بھرے ہیں
کہیں دور، تم سے کہیں دور
چشموں پر رنگیں پرندے اترتے ہیں
منقاریں بھرتے ہیں
اڑتے ہیں، مڑتے ہیں
تتلی پروں کو ہلاتی ہے
صد رنگ منظر بناتی ہے
تتلی کے کومل پروں پر
کئی تل ہیں
تل جیسے خواہش بھرے دل ہیں!

زنبور
زنبور خانے سے باہر نہ آنا
نہ نکلنا
بھلا کس طرح پیڑ پھلتا ہے
پتھر پگھلتا ہے
اندر سے جلتا ہے
باہر سے پھلتا ہے
پھل والا آتا ہے
سیڑھی لگاتا ہے
پھل لے کے جاتا ہے
زنبور،
زنبور خانے سے باہر نکلتے ہو
خورشید کی طرح
اپنی ہی آتش میں جلتے ہو
ایسے دہکتے ہو
تندور جیسے دہکتا ہے
گھر والی کہتی ہے
ریشم کے لچھے ہو
پھولوں سے کومل ہو
پھولوں سے اچھے ہو
ذی روح کے جسم میں
نیش بوتے ہو
نایاب ہو، زہر آمیز ہو
زہر سے کتنے لبریز ہو!!

احمد فقیہہ

نرمان

(افتخار نسیم کے لیے)

ہم ادھورا ہی لکھیں
حرف کا ظرف ادھورا ہو تو
کیا پورا لکھیں!
مصحفِ وقت پہ دو حرف جو ہم لکھتے ہیں
درد ہی ان کے مصنف کا ادھورا ہو تو پھر
کون لکھ پائے گا وہ نظم جسے
خالقِ وقت نے خود آپ ادھورا لکھا
وہ جو لکھتا ہے زمانے میں مکمل نظمیں
اس نے خود آپ نہ اس نظم کو پورا لکھا!
ہم ادھورا ہی لکھیں
تیرا دکھ یہ تھا کہ ہم پورا لکھیں
پر تیرا دکھ تو صحیفوں نے نہ پورا لکھا
ہر زمانے میں تجھے سب نے ادھورا لکھا
تیرا دکھ وہ تھا کہ جس دکھ کی زباں کوئی نہ تھی
نفسِ تہذیب میں اس دکھ پہ
اماں اتری محبت کی اذاں کوئی نہ تھی!
تیرا دکھ بحرِ توازن میں نہ تھا
دیدۂ عقل تو کیا عشق کے باطن میں نہ تھا
سو تیرے دکھ پہ غزل کون شعوری لکھتا
کون اسے خامۂ تقلید سے پوری لکھتا!
تیرے دکھ پر تو غزل اس نے ادھوری لکھی
وہ جو لکھتا ہے زمانے میں مکمل نظمیں
ایک مصرع کی یہ نظم اس نے نہ پوری لکھی!
کون لکھتا وہ غزل درد کے پیرائے میں
ہم! ہم جو خود آپ ادھورا لکھیں
کون سے حرف سے اس درد کو پورا لکھیں
جس کے باطن کا ہمیں جنموں سے وجدان نہیں
جس کے مبداء کا حکیموں کو بھی عرفان نہیں!
تجھ کو وجدان تھا نرمان ہے تو
اپنے بے پیر قبیلے کا سلیمان ہے تو
ایک طوفانِ حقیقت جو اسیرِ ذم ہے
بندگی جس پہ مقدم تو محبت کم ہے!
تو ادھورا تھا مگر کون مکمل ہے یہاں
کوئی بتلائے کہ اک نقش بھی پورا ہے کہاں!
حیف! پر دنیا کو اس درد کا وجدان نہیں
کاٹ لیتی ہے جو چپ چاپ ادھورے پن میں
قبر کی خاکِ شکیبا کی مثال
کوکھ میں اس کی ہو مہتاب کہ تیزاب کوئی فرق نہیں
خوف کی اندھی روایت میں یہاں کون ہے جو غرق نہیں
تو مگر صاحبِ ادراک تھا
بے باک تھا اتنا کہ وظیفے کی طرح
عمر بھر لکھتا رہا ان کی جگر پاشی پہ پوری نظمیں!
جس قبیلے کی مذمت پہ لکھیں سب نے ادھوری نظمیں!!
(سویڈن)

شہاب صفدر

احوال

آگ ہی آگ چار جانب ہے
کیا بہشتِ وطن کا حال لکھوں
کچھ نہیں میری دسترس میں اور
آرزو ہے چمن کا حال لکھوں

کیوں وہ پھولوں کے سہرے مرجھائے
کیوں خزاؤں نے ڈیرے ڈالے ہیں
روح فرسا نسیم کے جھونکے
غم فزا پنچھیوں کے نالے ہیں

سوچتا ہوں تو جان جاتی ہے
کل یہاں کیا تھا اور اب کیا ہے
پیار تھا صحبتیں تھیں میلے تھے
تھے مگر اب نہیں، سبب کیا ہے

کن بلاؤں میں گھر گئے ہیں ہم
کون خوں خوار حملہ آور ہیں
کہیں لٹکے ہیں سر بغیر بدن
کہیں زنجیر بے بدن سر ہیں

موت کا راج ہر طرف ہے اور
زندگی مقدرت نہیں رکھتی
بے حسی نے لگا لیے خیمے
رہبری معرفت نہیں رکھتی

رہگذاروں پہ سوگ سایہ فگن
منزلوں ماتمی قناتیں ہیں
دھند میں کچھ پتہ نہیں چلتا
یہ جنازے ہیں یا براتیں ہیں

ناامیدی کی تیز بارش میں
بھیگتی ہر دعا، خدا حافظ
جا رہا ہوں خدا کے گھر لیکن
اے یقین خدا، خدا حافظ

حسن عباسی

Still we miss u

جب سے
ہم نے سنا ہے
وہ جو بچے رب کو پیارے ہو جاتے ہیں
نیل گگن کے تارے ہو جاتے ہیں
میری طرح سب گھر والے بھی
رات کو سو نہیں پاتے ہیں
چپکے چپکے
باری، باری
چھت پر آ جاتے ہیں
خاموشی سے تارے دیکھتے رہتے ہیں
بوجھل دل اور بھیگی آنکھوں سے ہم
ان تاروں میں
ایک ستارہ ڈھونڈتے رہتے ہیں
کوئی کہتا ہے
وہ دیکھو!
وہ جو سب سے دور الگ اِک
ننھا منا سندر تارا ہے
وہ ریمی ہے

میں کہتا ہوں
وہ تو اتنی چھوٹی سی تھی
چل نہیں پاتی تھی
اتنی دور وہ کیسے جا سکتی ہے
کوئی کہتا ہے
وہ دیکھو!
اُس بدلی کے پیچھے ایک ستارا ہے
اس کا چہرہ بالکل ریمی جیسا ہے
میں کہتا ہوں
وہ تو اپنے چہرہ پر، آنچل بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی
رو پڑتی تھی
کالی بدلی اوڑھ کے چپ بیٹھی ہو
کیسے ممکن ہو سکتا ہے

کوئی کہتا ہے
وہ دیکھو!
چاند کے پہلو میں جو سب سے مدھم تارا ہے
وہ ریمی ہے
میں کہتا ہوں
ہاں اُس کو تاریکی سے ڈر لگتا تھا

پھر ہم سب
روشن چاند کے پہلو میں
اپنی ریمی دیکھتے ہیں

حسن عباسی

ماں کے لیے ایک نظم

دہشت گردی سے دنیا کو کیا خطرہ ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو اپنے گھر کے بارے جانتی ہے
وہ تو اتنا جانتی ہے
مینہ برسا تو
کمرے کی بوسیدہ چھت گر جائے گی

جب روپیہ سستا ہو تو
ڈالر مہنگا کیوں ہوتا ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو اتنا جانتی ہے
کپڑے، برتن کیسے دھوتے،
جھاڑو کیسے دیتے ہیں

وقت کے بارے
آئن سٹائن کی تھیوری کیا ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو دن بھر خاموشی سے
کپڑے سیتی رہتی ہے

میری ماں کو بس پہ چڑھنا
اور سفر کرنا
اچھا نہیں لگتا ہے
لیکن جب بھی
بیٹی کے گھر جانا ہو
یا میرے بچوں سے ملنے آنا ہو
پھر وہ بس میں شوق سے جا کر بیٹھتی ہے
پھر تو اس کو سارے سفر اچھے لگتے ہیں

میری ماں کو
کرکٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے
لیکن میرا چھوٹا بھائی
جب بھی اپنے میچ کا حال سناتا ہے
تو وہ اس کی ساری باتیں شوق سے سنتی ہے

میری ماں کو شعر و سخن سے کیا مطلب
لیکن جب میں اپنی کوئی نظم سناتا ہوں
اس کی خالی آنکھوں میں
آنسو تیرنے لگتے ہیں

شہزاد نیّر

مجھ کو بڑا نہیں ہونا تھا

کسی غلیل کے غلّے سے جب
چڑیا کا پر ٹوٹا تھا تو
مرا دل بھی ٹوٹا تھا
سردی سے تتلی مرتی تھی
پہروں بیٹھ کے میں روتا تھا
چوزہ نالی میں گرتا تو اسے نکال کے
دھو کے پونچھ کے
فوراً دھوپ میں رکھ آتا تھا
چابک گھوڑے کو لگتی اور ایسے لگتا
میری پیٹھ پہ لاس پڑی ہے

میں طوطے کی لاش کو اُس دن
مٹی میں دفنا کر خاک پہ بیٹھ گیا تھا
آنسو بہتے چلے گئے تھے!

بے حس وقت نے اتنا بے حس کر ڈالا ہے
خود کو دیکھ کے دکھ ہوتا ہے
سوکھی آنکھوں سے دیکھا تھا
آج سڑک پر گرا ہو وہ انساں
جس کے زخمی سر سے خوں بہتا تھا!
شاید وہ ویگن سے گرا تھا
چیخ رہا تھا
کیسی سخت اذیت میں تھا......
اور میں ایسی جلدی میں تھا
میں نے کار نہیں روکی تھی!

کاش میں چھوٹا بچہ رہتا!
کاش کبھی بھی بڑا نہ ہوتا!

انیل چوہان

رواداری

یہاں پہلے کبھی ایسا نہ ہوتا تھا
یہاں پر زندگی بس کھلکھلاتی تھی
محبت کے گلوں سے دل مہکتے تھے
درختوں پر پرندے امن کی خوشبو کی آوازیں
سماعت میں جگاتے تھے
دلوں کی دھڑکنیں اک تھیں
بدن میں دوڑتا بہتا لہو اک تھا
خدا اک تھا، رسول اک تھا، کتاب اک تھی
یہاں پہلے لبوں کی مسکراہٹ نوچنے والا
خوشی کا قہقہوں، لاشوں کا سوداگر نہ ہوتا تھا
سبھی نے مل کے آزادی کو پایا تھا
سبھی نے ماں سی اس دھرتی کو اک جنت بنایا تھا
نہ جانے نفرتوں کی زہر آلودہ ہوائیں
چل پڑی ہیں کیوں
کہ اب ماں کی دعا زیب بدن کر کے بھی نکلیں تو
کہیں جائے اماں ہم کو نہیں ملتی
دکھوں کی زرد شامیں، خوف کے تاریک لمحے ہی
فقط ہم پر مسلط ہیں
کہ آؤ پھر سبھی مل بیٹھ کر اب امن کا سوچیں
رواداری کو اپنائیں
یہ ممکن ہے
عقائد کی، زبانوں کی، علاقوں کی بنا پر جاری
اس غارت گری کا حل نکل آئے
دلوں کی قبروں سے شاید محبت ہی نکل آئے
ہمارے اور تمہارے جینے کی صورت نکل آئے

صوفیہ انجم تاج

گزری صدی کی سرگوشی

یہاں ڈیرا جمائے خستگی کچھ ایسے قابض ہے
نشاں گزری صدی کی پختگی کے مٹ رہے ہیں اب
قطاریں ننھی اینٹوں کی
جو آرائش کی خاطر صحن کے مشرق میں بیٹھی ہیں
مگر تھک ہار کے مایوس سی اب آہیں بھرتی ہیں
وہیں اک ہشت پہلو طاق کی ٹوٹی ہوئی محراب ہے جیسے
کسی کی یاد میں بہتا ہوا اک زخم رِستا ہے
لہو سے لکھ رہا ہو اک پرانی داستاں جیسے
یہ کیا تصویر ہے...... خاتون کوئی سات پردوں
میں چھپی آ کر
چمکتے سرخ چھلوں سے مزین انگلیوں سے طاق
کی مشعل جلاتی تھی
کبھی دھیمے سُروں میں بین کرتی تھی
در و دیوار پر کچھ لفظ اپنا خوں بہاتے تھے
مکاں کے صدر دروازے کی کھڑکی
بائیں جانب باغ میں کھلتے ہوئے
معصوم روحوں کو نیا احساس دیتی تھی
کہ باہر بھی ہے اک آزاد دنیا جو انہیں اکثر بلاتی ہے
سہاگوں کی نشانی، خوشبوئیں صندل کی، ابٹن کی
وہ اپنے جسم میں جیسے سمو کر تھرتھراتی تھی
خود اپنے آپ کو بانہوں میں بھر کر مسکراتی تھی
سبھی جانب سے تکتی ہیں وہ بے در جالیاں جن کو
سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آخر یہ ہیولے میٹھی یادوں کے
(ہوا میں تیرتے پلو، لچکتی شاخوں سی بانہیں)
حقیقت ہیں کہ ماضی کے فسانوں کے چھلاوے ہیں
در و دیوار، روشن داں، دریچے، کھڑکیاں
یک و تنہا کھڑی ہیں کتنے برسوں سے
بھٹک کر بھی مگر کوئی نہیں آیا ہے اس جانب
ستونوں سے گھرے اس تین در کے سامنے گویا
کسی بے آسرا خاتون کا اک نور افشاں، پھول سا چہرہ
ابھر آیا ہے، جیسے مجھ سے ملنے کی تمنا ہو
وہ عورت، جانی پہچانی سی جیسے میرا ہی اپنا ہیولیٰ تھی
مجھے ایسا لگا، میں توڑ کر اپنی فصیل جسم
اس گزری صدی کی روح میں پیوست ہو جاؤں
ہوا کے ساتھ اڑتی منتشر ہو کر
فضا میں تیرتی جاؤں
کھنڈر کو چومتی جاؤں
وہیں معدوم ہو جاؤں

ندیم احمد صدیقی

دوہا مسدّس

کیا بولے ہے ڈگڈگی بول جمورے بول

جیون بس ہے چاب لے، یا پی لے تو گھول
بات کسی مت آئیو، رکھ دے گا وہ رول
اندر سے ہے کھوکھلا، جس کے اوپر خول
اچھے لاگیں دور سے، کیا دنیا کیا ڈھول
روک مداری ہو سکے، کھولوں تیرے پول
کیا بولے ہے ڈگڈگی، بول جمورے بول

زہریلی ہر چاشنی، شہد بھرا ہر مار
پیٹ لکیر نہ سانپ کی، ڈس لیتی ہے یار!
کھیل تماشا چال ہے، ہر کرتب ہتھیار
توڑ کرے تو جیت ہے، ورنہ ذلت ہار
مت کھو دینا آبرو، عبرت لو بے مول
کیا بولے ہے ڈگڈگی، بول جمورے بول

میں داسی ہر داس کی، بجنا ہے ہر حال
کھانا ہو جب مانگ کے، ماس ملے یا دال
بولے باندی پیٹ کی، کال کٹے نا کال!
بات کھری کیا کر سکے، جس کی ٹپکے رال
میت نہ رکھیو بھول کر، بات کرے جو گول
کیا بولے ہے ڈگڈگی، بول جمورے بول

ثروت زہرہ

گھوم چرخڑا گھوم

زمانہ نئے آسمانوں کے
آنگن کا چرخہ
جہاں وقت کی پھرکیوں پر زماں
ڈالیوں سی لچکتی چمکتی ہوئی
رقص کرتی ہوئی دھڑکنوں پہ مرے دل کے دھاگے
بُنے جارہا ہے
زمانہ جسے جھریوں نے چھپایا
کہیں سوختہ ہڈیوں نے ڈرایا
مگر
وہ جوانی کی بے درد بے لوچ مٹی
میں پھر ایستادہ نظر آرہا ہے
زمانہ مرے آسمانِ گماں کو مظاہر کے
تاروں سے روشن کیے جارہا ہے
مرے گہرے زخموں کو
جذبوں کی اس راکھ سے سبز کرتا چلا جارہا ہے
سفر جو مرے درد کو آزماتا ہوا گھومتا جارہا ہے
زمانہ مری مٹھیوں پر لکھا جبرِ ادراک تھا
زندگی کے سمندر کا تیراک تھا
اب مرے وقت کی چکیوں کی گراری میں نمو پارہا ہے
مرا سوت بنتا چلا جارہا ہے
زمانہ چلا جارہا ہے

دھماکے سے ذرا پہلے

ابھی کچھ دیر پہلے
اس جہاں کی زندگی تابندگی
سب دیدنی تھی......
چھتوں سے دمدماتے قمقموں کی باڑ
جلنے اور بجھنے کی حرارت سے پرے
شعلوں سے الجھی ہے
گلابوں سے بھرے گلدان کی اُجلی مہک
جلتے ہوئے زخموں میں لپٹی ہے
زمیں پر ٹاملوں کے آئینے
اب راکھ کے رنگوں سے گھائل ہیں
گلاسوں میں پڑے مشروب ہونٹوں کے
ملائم لمس سے عاری ہیں
گم سم ہیں!
پلیٹوں میں ادھورے ذائقے
اپنے مہربانوں کی ساکت خون آلودہ
زبانوں سے تو نالاں ہیں
مگر ادراک دوراں ہیں
بجھے سارنگیوں طبلوں پہ رکھے ہاتھ
اپنی چپ میں ڈوبے ہیں
جلی ہارمونیم کی لے
دھماکے کے کسی پل سے
ابھی تک ایک ہیبت ناک سر میں
ہوکتی روتی سسکتی ہے
گویے موت کے اک سُر میں گاتے میں ہیں
سوئمنگ پول کا شفاف پانی
آگ کے شعلوں کی
حدت سے پریشاں ہے

یہاں کی زندگی پہ موت حیراں ہے

عنبرین صلاح الدین

اگر رستے نہیں ہوتے!

اگر رستے نہیں ہوتے
تو اپنے اس جہاں میں
یہ بہت سے کام نبٹائے نہیں جاتے

اگر بچپن کے قصوں کی طرح
اپنی کہانی بھی
بہت معصوم سی ہوتی
کسی سادہ زمانے کی میں شہزادی
جسے ملنے کی خواہش میں
تم آنکھیں بند کرتے
اور پہنچ جاتے!

اگر رستے نہیں ہوتے
بہت سے کام نبٹانے نہیں ہوتے
تو میرے دل کو بہلانے کے یہ
انداز کب ہوتے
''ابھی رستے میں ہوں
اور راستہ مشکل بہت ہے!''
کبھی آتے، کہیں جاتے
یہی دو چار جملوں کا ادھورا رابطہ،
''کوئی ہماری بات نہ سن لے''
''ابھی پوچھو نہیں مجھ سے!''
''یہاں پر لوگ اتنے ہیں، بھلا
اظہار کیسے ہو!''

اگر رستے نہیں ہوتے تو شہزادے
تم آنکھیں بند کرتے
اور مجھے ملنے پہنچ جاتے!
ہماری اور تمہاری اس نئی دنیا میں
اب رستے بہت ہیں
منزلیں کم ہیں!

کہیں ایسا نہ ہو ہمدم
ہماری یہ محبت راستوں میں ہوتے
کاموں کی طرح
نبٹاتے نبٹاتے بکھر جائے!
اور ایسا ہو کہ ہم بھی بس
کبھی کل اور کبھی پرسوں پہ ٹالیں
اس ضروری کام کی فائل بنالیں
ہماری بے سبب رنجش، غلط فہمی
انا کی گرد میں چھپتی چلی جائے
ہمیں اس کی خبر نہ ہو......

سنو اے میرے شہزادے!
وہ ساعت آ نہ جائے
یوں کرو
رستے مٹا ڈالو
یہ دیواریں گرادو
پھر ذرا آنکھوں کو میچو
دائیں ایڑی پر ذرا سا گھوم جاؤ
اور بہت تیزی سے بہتے وقت کے
دریا کو ٹھہرادو،
مجھے ملنے چلے آؤ!!

عنبرین صلاح الدین

آنکھ مچولی

کاش یہ میرا بچپن ہوتا
تم نے بس یہ بولا تھا
آؤ کھیلیں!
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی!

شام کے اونچے پیڑ کی آخری شاخ
کے پیچھے
سرخ شگوفے کی نرمی تک چھو آتی ہیں
تم نہ ملتے!
رات کے آنگن میں بجلی کے کوندے ملتے
بادل کی غراہٹ کانوں کو کھا جاتی
بارش کی دستک کی نرمی من مہکاتی،
بوندوں کی گہری چادر کی اوٹ ہٹاتی،
تم نہ ملتے

صبح کے پنچھی کمرے کے روشن دانوں
پہ پنکھ ہلاتے
سورج کی کرنوں میں آنکھیں
کھول نہ پاتی
پیر پٹختی اور جھنجھلاتی
تم نہ ملتے!

سایہ بن کر میرے پیچھے پیچھے چلتے
میرے ساتھ ہی شام کی اُلجھی دھند سے
صبح کا نکھرا منظر لاتے
لیکن سامنے تم نہ آتے
تھک کے، ہار کے
اپنی گڑیا کے گھر کو اوندھا کر دیتی
بچپن میں رو دینے کا ہر ایک بہانہ
کتنی آسانی سے مل ہی جاتا ہے!
جب میں آنسو کی ٹپ ٹپ سے
آنگن میں اک جھیل بناتی

اُس میں پورا چاند اترتا
تم آ جاتے!

نہ تم سوری کرتے مجھ سے
نہ میں تم سے جھگڑا کرتی
کاش ہمارا بچپن ہوتا

اب بھی دونوں آنکھ مچولی کھیلتے ہیں، پر
اب ایسا ہے
ریت پرانی بھول گئے تم!
میں تو شام کی تنہائی
اور صبح کی وحشت کھوج چکی ہوں
کب تک سایہ بن کر یوں چھپتے جاؤ گے؟
میرے لفظوں میں گاؤ گے؟
آنکھوں میں تارے لاؤ گے؟
لیکن سامنے کب آؤ گے؟
آنسو کی اس جھیل کے گدلے پانی میں
کب چاند کھلے گا
آنگن میں تارے چمکیں گے
سایہ تن سے آن ملے گا!

سلمیٰ افتخار صدیقی

رنگین لفافوں میں سمٹی دنیا

دفتر، پیسے، کار، مقدمہ، چار لفافے
لال، گلابی، نیلا، پیلا
الگ الگ رنگوں میں، تاکہ، جب بھی کوئی درکار ہو فوراً
میں اس کو پہچان سکوں
یہ ساری چیزیں سوچوں کا اور پہچان کا ذریعہ
دنیا کے دھندوں کا وسیلہ

ایک لفافہ ذاتی بھی تھا
گھر میں رکھا ہے
میرے ڈیسک کے سب سے اوپر والے شیلف کے
بائیں گوشے میں
ٹوٹے ہوئے اک ڈیکوریشن پیس کے نیچے
ایسا نہیں کہ میں اس کو شیلف میں رکھ کر
بھول گئی ہوں
ایک وہی تو ہرا ہے اب تک!!

زاہد نبی

"The Page Cannot be displayed"

مری درخواست اپنے منطقی انجام کو پہنچی
جہاں منظر اُبھرنا تھا
وہاں پُرشور تصویریں ہیں لفظوں کی
کسی دیوار کی مانند......
رستہ روک کر بیٹھی ہوئی مجھ سے یوں گویا ہیں......
تم اپنے ربط کا ٹانکا کہیں سے توڑ بیٹھے ہو
کسی کا پاس رکھنا تھا
کوئی اک لفظ بھرنا تھا
کوئی حرفِ مقدم ہے جسے تم چھوڑ بیٹھے ہو
مراسم کا کوئی ساریشمی زینہ پریشاں ہو گیا شاید
یا ممکن ہے کہ اس کی ڈور میں الجھاؤ آیا ہو
بہت کچھ اور بھی ممکن کی حد میں ہے
مگر چھوڑو...... ہُوا جو بھی اسے چھوڑو
نئی کوشش جو واجب ہے، وہ کر دیکھو
چلو کھولو......
یہی کھڑکی کسی خستہ تعلق کی
اسے پھر سے کوئی تازہ ہدایت دو
سپردِ محویت کر دوں نگاہوں کو
کہ شاید اب کوئی منظر رسائی دے
تجھے پھر سے کہیں پر وہ دِکھائی دے!

بہزاد برہم

مخزن

دولت پہنے
اور ان پہناووں پہ اور بھی دولت چھڑکے
دولت سے معمور سراپے
اک دولت کو دے کر
مول لیے جاتے ہیں
دوسری دولت
ان چلتے پھرتے گنجینوں کے سینوں سے
خارج ہوتے
گرم انفاس کی بھاپ نے جیسے
شاپنگ مال کی
سب شیشے کی دیواروں کو
چاندی کے جگمگ کرتے
تاباں ذرّوں سے پوت دیا ہے
بیش بہا فانوسوں کی کرنوں میں سب کچھ چمک رہا ہے
لیکن اطمینان سے پُر
ان آنکھوں کو خبر نہیں ہے
اندر کا یہ نور
درخشاں فانوسوں کا ثمر نہیں ہے
ان آنکھوں پر
بھاپ زدہ شیشے کا پردہ پڑا ہوا ہے
ان آنکھوں کو علم نہیں
کہ اس دھندلائے سے شیشے کے دوسری جانب
روشنی کے اصلی مخزن ہیں
دو ننھے منے ہاتھوں کی اوک میں رکھے
جھلمل کرتے
دو پُر شوق دیئے روشن ہیں......

حسن رحمان

آج کا بونا

سچائی اچھی ہوتی ہے
اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ
ایسا بھی کچھ کام کریں ہم
جس کو ظالم سب کہتے ہیں
اُس کو ہی بس طعن کریں ہم

لیکن سچ تو یہ ہے کہ خود میرے بھائی کا بازو
ظلم کی فصلیں کاٹ رہا ہے
میرے باپ کا ہاتھ بھی جبر کی فصلیں بیج رہا ہے
مرا قبیلہ جہاں جہاں ہے
اپنے حرف سے بھی اور اپنی خاموشی کے ذریعے بھی
قاتل چور کے ساتھ رہا ہے
اس سب کچھ کے ہونے پر بھی ہم خاموش رہے ہیں
ظالم کی اصلی پہچان پہ
جب تک سب کا اتفاق نہیں ہوگا
تب تک سب خاموش رہیں گے
اور خاموشی سے اس خاموشی پر داد دیئے جائیں گے

اپنے سچ کو جوتے کے ڈبے میں چھپا کر
الماری کے سب سے نچلے خانے میں محفوظ کریں ہم
بوند پڑے تو بہہ نہ جائے
دھوپ لگے تو پگھل نہ جائے
"مصلحت" اور "حکمت عملی" ایسی ہو جب
میرا سچ تو اک کمزور سا بونا ہوا نا!

نیّر حیات قاسمی

سفرِ شبِ آخر

سُرمئی رات کے سفینے پر
اجنبی منزلوں کے راہی ہم
اُن ستاروں کی راکھ پر اُترے
جن ستاروں کے راستے میں پھر
کوئی بھی کہکشاں نہیں آتی

آؤ ٹھہرو یہاں، جہاں پر ہیں
سب نشاں آخری کناروں کے
ریشمی، صندلی نظاروں کے
میں دِکھالوں تو آگے چلتے ہیں
اُس نگر کو جہاں پہ ہر لمحہ
ٹُوٹے تاروں سے خواب اُگتے ہیں
شام کی چادروں کے سائے میں
سانچے کتنے ہی آفتابوں کے
جلتے ہیں اور بجھتے جاتے ہیں
اک دعا ہے کہیں بھٹکتی ہے
وہ بھی شاید یہیں پہ آ نکلے
ایسے میں گر وہ مجھ کو لگ جائے
میری پہچان ہی بدل جائے
تب کہیں آسماں کے کونے پر
گھنی تاریکیوں کے بیچوں بیچ
تم بھی دیکھو گے میرا نظارہ......
میں بھی بن جاؤں گا پھر اِک تارہ!!

کوما

گھیرے ہوئے مجھے چار طرف سے
اِک خاموشی کا گنبد تھا!

نہ کوئی حرف کا قطرہ ٹپکا اور نہ جھونکا ملا صدا کا
ایک طویل سی یخ خاموشی اور گہرا سناٹا
پھیل رہا تھا
زندگی یوں بھی تھم ہی چکی تھی
موت سے شاید ایک برس پہلے ہی سے......
تجھ سے ابھی مجھے کہنا بہت تھا
پر میں کیسے کہہ پاؤں!
میری ساری ان کہی باتیں
میری بند آنکھوں کے پیچھے صحراؤں میں بھٹک رہی ہیں
میری حیات کے معنی کھوجنے
گونج گونج کی خاموشی میں اُتر رہی ہیں!

ایسے میں جو کہیں سے تُم پکار بھی لو تو
لمحہ بھر کو پلک سے پلک جدا ہوتی ہے
اور جیون کی گم گشتہ سی اندھی راہیں
پھر سے تیرے نور کے اس ہالے میں
ایک گھڑی کو دمکتی ہیں
چند یادیں سی ابھرتی ہیں
اور خاموشی کے گنبد میں
گونج گونج لہراتی ہیں

فالتو

احمد ندیم قاسمی

حبیب احمد کی شادی کے دسویں دن بعد ایک دوپہر کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا باپ سر پر دو کھٹولے رکھے اور قدم قدم پر بجتے ہوئے کڑے والا ایک صندوق بغل میں مارے، ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا لمبی گلی سے نکلا جا رہا ہے۔ ایکا ایکی وہ پلٹ کر پکارا۔ ''ایڑی اُٹھا کر چل نیکاں۔''

لوگوں نے گھوم کر دیکھا تو لمبی گلی کے سرے پر نیک بخت سر پر ایک گٹھڑ اُٹھائے آ رہی تھی۔

''یہ میاں بیوی کہاں چلے!'' لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ پھر ایک بوڑھے نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر بولا ''کیوں بھائی پیر بخش، کدھر جا رہے ہو؟''

''کھیتوں پر۔'' پیر بخش نے فوراً جواب دیا مگر لہجہ ایسا سوکھا تھا کہ بوڑھے کو دوسرا سوال پوچھنے کے لیے ایک پل رُکنا پڑا۔

''کھاٹ کھٹولے سمیت؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''یعنی اب وہیں رہو گے؟''

''ہاں۔''

''یعنی گاؤں چھوڑے جا رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''بس۔'' پیر بخش یہ لفظ یوں بولا کہ بوڑھے کے سوالوں کا خزانہ یکا یک ختم ہو گیا۔

اتنے میں نیک بخت بھی آ پہنچی۔ اس کے گھٹنوں، ہاتھوں اور ہونٹوں پر رعشہ طاری تھا اور آنسو اس کی ایک ایک جھری میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ گھبرا کر پیر بخش کو دیکھنے لگی مگر دیکھتے ہی بلبلا کر رو دی۔ گٹھڑ کی میلی چادر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے اور مروڑتے ہوئے اس نے بھرائی اور بھنچی ہوئی آواز میں کہا ''ہم سے مت پوچھو۔ جاؤ جیبے سے پوچھو جس نے......''

پیر بخش بیچ میں بول پڑا ''گھر چھوڑنے سے پہلے چھت پر چڑھ کر ہوکا کیوں نہ دے دیا کہ یوں جگہ جگہ ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہ پڑتی۔''

''چل وے چل۔'' نیک بخت، پیر بخش کی طرف اپنا ایک ہاتھ خنجر کی طرح بڑھا کر بولی اور چل پڑی۔

لمبی گلی کے نکڑ تک لوگ انہیں دیکھتے رہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں گھوم گئی کہ شادی کے چوتھے ہی دن بعد حبیب کی دلہن اور حبیب کی ماں کی آپس میں ٹھن گئی۔ نیک بخت اپنے بیٹے کی موجودگی میں دلہن کے جہیز کے برتن آلوں اور پڑچھتیوں پر سجاتی پھر رہی تھی کہ شیشے کا ایک گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چینی کی ایک پلیٹ پر گرا اور دونوں ٹوٹ گئے۔ دلہن جو ساتھ والے کوٹھے میں لڑکیوں میں گھری بیٹھی تھی، چھنا کا سن کر اٹھی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اور زیور چھنچھناتی آئی۔ ایک پل کھڑی ٹوٹے ہوئے برتنوں کو گھورتی رہی اور پھر اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار بلند آواز میں بولی ''ماسی یہ تو میرے میکے کے برتن ہیں۔''

''تیرے میکے کے ہیں تو میرے بیٹے کے بھی تو ہیں۔'' نیک بخت نے حبیب احمد کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

حبیب احمد بولا ''میرے بھی ہوتے تو نئے برتنوں کے ٹوٹنے کا رنج تو ہوتا ہی ہے۔''

اور نیک بخت یوں نظر آنے لگی جیسے گلاس اور پلیٹ کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شام کو اس نے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر نے بیٹے سے شکایت کی۔ بیٹا بڑی تیزی سے دلہن کے پاس گیا مگر جانے آپس میں ان کی کیا باتیں ہوئیں کہ واپس آیا تو باپ کے پاس چپکا کھڑا ہو گیا۔

پیر بخش نے ذرا سا انتظار کیا۔ پھر پوچھا ''کیا کہتی ہے؟''

حبیب احمد نے ماں باپ کی طرف دیکھے بغیر کہا ''کہنا کیا ہے بیچاری کو؟''

نیک بخت طنز سے بولی ''نہیں نہیں بیٹا۔ کچھ تو کہتی ہوگی بے چاری۔''

''بے چاری!'' پیر بخش یوں بولا جیسے غور کر رہا ہے۔

یکا یک حبیب احمد آنکھیں نکال کر بولا ''تم کہو تو اسے طلاق دے دوں؟''

''میرے سامنے آنکھیں نہ نکال چیپے۔'' نیک بخت رونے لگی۔ ''کلی کر کے اپنے منہ سے میرا دودھ تو دھو لے پہلے۔'' ماں نے وار کیا۔

پیر بخش بولا ''تیری شادی کے خرچے میں سے چند روپے بچ گئے ہیں۔ سو میں کل قصبے میں جا کر تیری بوہٹی کو شیشے کا گلاس اور چینی کی رکابی لا دوں گا۔ اتنی سی بات ہے نا۔''

حبیب احمد باپ کو گھورنے لگا۔ پھر تیز تیز چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

پانچ دن چپ چاپ گزر گئے۔ بیٹے نے ماں باپ سے کوئی بات نہ کی۔ ماں باپ بھی سہمے سہمے پھرتے رہے۔ وہ آپس میں بھی بہت کم بولے اور جب بولے تو بہت آہستہ جیسے اونچے بولے تو کچھ ٹوٹ جائے گا۔ رات کو جب وہ صحن کے پرلے کونے میں دیوار کے پاس اپنے کھٹولے پر سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلنے اور سو نہ سکنے کے کرب کو دبانے کے لیے چت لیٹے آسمان پر ٹکٹکی باندھے رکھتے تو صرف اُس وقت چولہانے کی حد فاصل سے اُدھر مقابل کی دیوار کے پاس بچھے ہوئے رنگین پلنگوں پر کھسر پھسر کی آوازیں آتیں۔

''باتیں کررہے ہیں۔'' نیک بخت جل کر سرگوشی کرتی۔

پیر بخش خاموش رہتا تو وہ پوچھتی ''جاگ رہے ہو کہ مر گئے ہو؟''

''کیا ہے؟'' پیر بخش اس کی طرف کروٹ بدل کر ناگواری سے پوچھتا۔

''میں کہتی ہوں باتیں کررہے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے کریں۔ آخر میاں بیوی ہیں۔''

''میں کہتی ہوں، آپس میں بولتے ہیں۔ ہم سے کیوں نہیں بولتے؟''

''پہلے آپس میں تو جی بھر کے بول لیں۔''

''سنو'' برتن ٹوٹنے کے پانچ دن بعد ایک رات نیک بخت نے کہا۔ ''جا کے گلاس اور رکابی خرید کر اپنی بہو کے منہ پر کیوں نہیں دے مارتے۔ اتنے دنوں سے سوچ کیا رہے ہو؟''

پیر بخش بولا ''سوچ رہا ہوں کہ بڑی چھوٹی بات ہے۔ خاتون کسی کنگلے گھر کی لڑکی تو ہے نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں تیرا حکم مانوں تو لڑکی عمر بھر ہمیں کمینہ سمجھتی رہے۔ آخر ہمیں اسی گھر میں تو جینا مرنا ہے۔''

''تم مرد لوگ یہ باتیں نہیں سمجھتے۔ بس تم گلاس اور رکابی لے آؤ۔''

''لے آؤں گا۔''

''کل ہی جا کر لے آؤ۔ جب تک نہیں لاؤ گے، مجھے میرا بیٹا بھی غیر محرم لگتا رہے گا۔''

حبیب احمد کی شادی کا دسواں دن تھا جب صبح کی نماز کے بعد پیر بخش قصبے گیا اور دوپہر سے پہلے شیشے کا گلاس اور چینی کی رکابی لا کر نیک بخت کے سامنے رکھ دی۔ وہ دونوں برتن ہاتھ میں لے کر اٹھی اور سیدھی بیٹے کی طرف بڑھی جو چولہانے کی اوٹ میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور دلہن کو دیکھ رہا تھا جو مسکرا مسکرا کر مہندی کے رنگ کو چمکانے کے لیے ہتھیلیوں کو گھی سے چپڑ رہی تھی۔

''یہ لے بہو اپنا گلاس اور اپنی رکابی۔ تیرا میرا حساب ختم۔'' نیک بخت بیٹے کے بجائے بہو کی طرف بڑھی مگر بہو کے بجائے بیٹا اٹھا اور ماں کے ہاتھوں سے دونوں چیزیں چھین کر دیوار پر دے ماریں۔

نیک بخت چکرا کر بیٹھ گئی۔ پیر بخش جلدی سے چولہانے تک گیا مگر فوراً ہی پلٹ گیا۔ بعد میں نیک بخت بھی روتی بلبلاتی اس سے آملی۔ دونوں نے آپس میں کچھ طے کیے بغیر صندوق اور گٹھڑی میں اپنا سامان خوب بجا بجا کر رکھا۔ کھٹولے دیوار سے گھسیٹ کر صحن کے وسط تک لائے اور پھر انہیں اٹھا کر بیٹے اور بہو کے سامنے ہی گھر سے نکل گئے۔

بیٹے نے یہ تو کہا کہ ''یہ تم ٹھیک بات نہیں کررہے ہو۔'' مگر اس نے ماں باپ کے تعاقب میں ایک قدم بھی نہ اٹھایا اور ماں باپ لمبی گلی میں لوگوں کے ہجوم کو پیچھے چھوڑتے دور نکل گئے۔

پیر بخش اپنے کھیتوں میں خود ہی ہل چلاتا تھا تو اس نے کھیتوں کے شمال میں ڈھیری پر ایک کچا مکان ڈال لیا تھا۔ جب کھیت پکتے تو وہ نیک بخت سمیت یہاں آجاتا۔ دونوں کھیتوں کی رکھوالی کرتے اور کھلیان سے فصل اٹھنے تک یہیں رہتے۔ حبیب احمد مدرسے میں پڑھتا تھا اور مدرسہ گاؤں میں تھا۔ اس لیے وہ اسے دو تین مہینے کے لیے اس کی پھوپھی کے ہاں چھوڑ آتے۔ البتہ ہر ہفتے کی شام کو وہ ''ڈھوک'' پر آتا۔ اتوار اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارتا اور جب باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑانے کے لیے

اپنی ماں کے ساتھ اونچے اونچے "ہو ہو" پکارنے لگتا تو پیر بخش کہتا "نہیں بیٹا تو ایسا کہتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔" نیک بخت بھی کہتی "تو میرے ساتھ مت پکارا کر چیبے۔ تُو تو منشی بنے گا۔"

حبیب احمد منشی تو نہ بنا، البتہ دکاندار ضرور بن گیا۔ پہلے نمک مرچ اور گڑ شکر کی دکان کھولی۔ پھر کپڑا لے آیا اور ساتھ ہی شہر سے "ملک حبیب احمد بزاز" کا بورڈ بھی لکھوا لایا۔ تین چار سال کے اندر اُس نے اتنا منافع کمایا کہ گاؤں کے رئیسوں میں گنا جانے لگا۔ پھر رئیسی کو مکمل کرنے کے لیے اس نے باپ کی منت کر کے ہل بیل بکوا دیئے اور زمینیں مزارعوں کے حوالے کر دیں۔ اس کے گھر میں میز کرسیاں آ گئیں۔ وہ ریڈیو کا بیٹری سیٹ بھی خرید لایا اور اس کے مکان کی چھت پر لگے ہوئے ایریل کے بانسوں کو قلعوں پر لہراتے شاہی پرچموں کی سی حیثیت حاصل ہو گئی۔

کھاٹ سے کرسی پر منتقل ہو جانے کے بعد نیک بخت کو حبیب احمد کے لیے ایسے ایسے رشتے پیش کیے گئے کہ وہ لڑکی کے باپ کا نام سنتی تھی تو اسے چکر آ جاتے تھے مگر پھر جب اپنی کرسیوں، میزوں اور پڑچھتیوں پر سجے ہوئے چینی کے برتنوں اور پیتل کے طشتوں کی طرف دیکھتی تھی اور ادھر سے ریڈیو بولتا تھا "ہم لاہور سے بول رہے ہیں" تو نیک بخت نفی میں سر ہلا کر نائنوں سے کہتی تھی "پاگل ہوئی ہو۔ وہاں سے چلی تھیں تو یہ بھی سوچ لیا ہوتا کہ کس کے گھر چلی ہو۔ میں تو کوہ قاف کی پریاں بھی اپنے چیبے پر سے قربان کر دوں۔"

پھر اسے وہ پیغام بھی مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ گاؤں کے سب سے بڑے رئیس نے جس کے کھیتوں میں پیر بخش نے بھی برے وقتوں میں ہل چلایا تھا، ایک روز خود آ کر اس سے بات کی اور جب پیر بخش نے نیک بخت کو بتایا تو اسے مارے خوشی کے غش سا آنے لگا۔ پھر بڑے دھوم دھڑکے سے یہ شادی ہوئی اور شادی کے چوتھے ہی دن نیک بخت سے دلہن کے برتن ٹوٹ گئے۔

اپنی پرانی ڈھوک میں آ کر نیک بخت کوٹھے میں جھاڑو دیتی رہی اور روتی رہی اور کھانستی رہی۔ اور پیر بخش باہر بیٹھا اپنی داڑھی میں انگلیاں ڈالے اپنے قدموں میں بچھے ہوئے ان کھیتوں کو دیکھتا رہا جن کے ذرّے ذرّے کو اس کے ہل کی پھال بیسیوں مرتبہ الٹ چکی تھی مگر اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دیس نکالے کے بعد کسی اجنبی دیس کی سرزمین کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

کسانوں کی ڈھوکیں دور دور بکھری ہوئی تھیں مگر شام تک سب کو پتہ چل گیا کہ پیر بخش اور نیک بخت گاؤں سے اٹھ آئے ہیں۔ دوسرے دن سویرے سویرے ہی ان کے ہاں کسان عورتوں اور مردوں کا ہجوم لگ گیا۔ سب کہتے کہ "ٹھیک ہے شادی کے بعد بیٹے کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور مائیں اپنے پورے پرانے بیٹے کے لیے بانہیں پھیلائے رہ جاتی ہیں مگر شادی کے دسویں دن ہی وہ یہاں کیوں چلے آئے۔ ابھی تو دلہن کی ہتھیلیوں پر مہندی کا رنگ موجود ہوگا۔"

پیر بخش کہتا رہا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ حکیم نے نیکاں کو کھلی ہوا میں رہنے کے لیے کہا ہے۔ کچھ دن یہاں رہیں گے، پھر چلے جائیں گے۔"

نیک بخت بھی پیر بخش کی نصیحت کے مطابق سب سے یہی کہتی رہی مگر جب ان کے دو مزارے آئے اور انہوں نے پوچھا "مارے وس کوئی کام ہو تو بتایئے۔" تو نیک بخت ضبط نہ کر سکی۔ زور سے رودی اور بین کے انداز میں بولی "ہم سے کیوں پوچھتے ہو، جاؤ چیبے سے پوچھو جس نے ماں باپ کو بیچ کر بیوی خریدی ہے۔"

اور جب نیک بخت نے یہ کہہ کر اوپر دیکھا تو اس کے سامنے حبیب احمد کھڑا تھا۔
اس نے کہا ''اماں! کچھ میری عزت کا تو خیال کرلو۔''
نیک بخت جو بیٹے کو دیکھ کر سناٹے میں آ گئی تھی، اس بات پر تڑپ اٹھی۔ ''تیری عزت! اور کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟ کیا اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرح ہم نے اپنی عزت بھی تیری شادی میں اُڑا دی ہے؟ میں تجھے یہاں اپنی کوکھ میں نو مہینے اُٹھائے پھری ہوں۔'' نیک بخت نے زور زور سے ہاتھ مار کر اپنا پیٹ بجایا ''میں نے تجھے جنا ہے لڑکے اور تو میرے سامنے اپنی عزت کا رونا رونے آیا ہے؟''
پیر بخش سامنے آ کر بولا ''پھر وہی ہوکا دینے لگیں؟''
''چل دے چل۔'' نیک بخت اس کی طرف اپنا ہاتھ خنجر کی طرح بڑھا کر بولی اور روتی ہوئی کوٹھے کے اندر چلی گئی۔
''میں تو اماں، تم دونوں کو لینے آیا تھا۔'' حبیب احمد نے جاتی ہوئی نیک بخت سے کہا۔ ''مگر تم نے تو میرے منہ پر جوتے مارنے کے یہاں پورا جلسہ بلا رکھا ہے۔''
''ابھی ہم مرے نہیں بیٹا۔'' نیک بخت دروازے میں سے پکاری۔ ''ہم مرجائیں اور بیوی تمہیں اجازت دے دے تو ہماری لاشیں لے جانا۔ اس سے پہلے تو ہم نہیں آئیں گے۔ جا۔''
''تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔'' پیر بخش ملامت کرتا ہوا بیوی کی طرف بڑھا اور جب پلٹا تو حبیب احمد ڈھیری پر سے تیز تیز اُترا جا رہا تھا۔
چند روز کے بعد نیک بخت بیمار ہوئی تو حبیب احمد بار بار گاؤں کے معتبروں اور ایک بار تو اپنے خسر کو ساتھ لے کر ڈھوک پر آیا کہ ماں باپ کو گاؤں واپس لے جائے مگر نیک بخت برابر انکار کرتی رہی۔ پھر وہ ایک صبح کو مر گئی اور جب حبیب احمد اور دوسرے رشتہ دار اس کی میت کو اٹھا کر گاؤں لے جانے لگے تو پیر بخش بغیر کسی کے کہے چپ چاپ ان کے ساتھ ہولیا۔
نیک بخت کا جنازہ گھر میں داخل ہوا تو اسے اپنی ہی ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ نیک بخت جب جوان تھی اور ذرا ذرا سی بات پر رو دینے میں بہت تیز تھی تو پیر بخش اس سے کہا کرتا تھا ''بس یہی کھل کر رونے والا معاملہ ایسا ہے جس میں عورتیں مردوں سے زیادہ آزاد ہیں ورنہ رونے کو تو مردوں کا بھی جی چاہتا ہے۔'' نیک بخت اس بات پر آنسوؤں میں مسکرانے لگتی مگر اب تو وہ مر چکی تھی۔ اب تو اگر وہ سچ مچ رو بھی دیتا تو اس پر پیار سے مسکرانے والا کوئی نہ تھا۔ پھر اپنی بیوی کی موت پر کبھی کوئی شوہر برسرِ عام رویا ہے کہ پیر بخش روتا۔ البتہ یہ دیکھ کر اسے سکون سا محسوس ہوا کہ چلو حبیب احمد تو رو رہا ہے۔ نیک بخت اگر ایک بیوی تھی تو ایک ماں بھی تو تھی۔ اس کی قبر کا ایک حصہ تو ٹھنڈا رہے گا۔
کفن دفن کے بعد حبیب احمد اور وہ صحن کے ایک طرف جہاں بیٹے کی شادی کے بعد پیر بخش اور نیک بخت کے کھٹولے بچھتے تھے، چٹائیاں پھیلا کر بیٹھ گئے اور فاتحہ خوانوں کی مدارات میں لگ گئے۔ شام کو جب کسی رشتہ دار کے ہاں سے کھانا آیا تو پیر بخش یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے نیک بخت کی موت تک کو بھول گیا کہ اس کا بیٹا کوزہ اٹھا کر اس کے ہاتھ دھلا رہا ہے۔
عشاء کی اذان کے بعد جب ماتم کرنے والی عورتیں چلی گئیں اور پیر بخش اپنے بیٹے اور بہو کے پاس اکیلا رہ گیا تو حبیب احمد اس کے پاس آیا۔ کچھ دیر اس کے پاس چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر رونے لگا اور اس کے گھٹنے پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''مجھے معاف کر دو بابا۔ اماں نے مجھے بتیس دھاریں نہیں بخشیں مگر قیامت کے دن میں اس سے بخشوا لوں گا۔ بس تم من جاؤ تو

اماں بھی من جائے گی۔''

یکا یک پورے دن کا رکا ہوا غبار پیر بخش کی آنکھوں میں سے ایک طوفان کی طرح پھٹ پڑا۔ حبیب احمد بھی اس کے ایک گھٹنے پر ہاتھ رکھے روتا رہا۔ پھر بہت زیادہ رونے کی وجہ سے پیر بخش کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے تو حبیب احمد پکارا ''ادھر آ خاتون۔ بابا کے تلوے مل۔''

نیک بخت کی موت کے بعد خاتون پہلی بار پیر بخش کے سامنے آئی اور پیر بخش نے دیکھا کہ وہ بھی رو رہی ہے۔ پھر وہ اپنے سر کی چادر کا گولا سا بنا کر پیر بخش کے تلوے اس زور سے رگڑنے لگی کہ اس کے کھلے بالوں نے بکھر کر اس کے آدھے چہرے کو ڈھک لیا۔ ادھر حبیب احمد بھی اسی تیزی سے باپ کی ہتھیلیاں مل رہا تھا۔ یکا یک پیر بخش کو محسوس ہوا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین باپ ہے۔ اس نے سکون کی ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگرچہ قبر میں نیک بخت کی یہ پہلی رات تھی مگر پیر بخش بیٹے کی شادی کے بعد پہلی بار آسودگی کی نیند سویا۔

موت کے بعد پہلی جمعرات تک حبیب احمد نے دکان بند رکھی۔ وہ دن بھر گھر میں بیٹھا قرآن شریف پڑھتا رہتا اور باپ کو پانی پینے کے لیے بھی نہ اٹھنے دیتا۔ چار پائی پر ہی وہ باپ کے ہاتھ دھلاتا۔ پھر خاتون کھانا اٹھا لاتی اور ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مکھیاں اڑانے کے لیے وہ اپنی چادر کے پلو سے پنکھا کرنے لگی۔ صحن کے ان گوشوں کو دیکھ کر پیر بخش کا کئی بار رونے کو جی چاہا جہاں نیک بخت نے چرخے کاتے اور اپلے تھوپے تھے مگر بیٹے اور بہو کے سلوک نے اس کے آنسو جذب کر لیے تھے۔ وہ پرانی یادوں پر بس ایک آدھ آہ بھرنے پر اکتفا کرتا تھا اور پھر بیٹے یا بہو سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ ''چولہے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ بیٹی، آنچ سے رنگ جل جاتا ہے''۔ ''جمعے کو دکان ضرور کھول لینا بیٹے، تجھے نقصان ہو رہا ہے۔''

حبیب احمد نے بڑے ٹھاٹھ کی جمعرات کی۔ آدھ گاؤں کھانا کھانے آیا۔ حافظوں نے اٹھارہ ختم مرحومہ کی روح کو بخشے جن میں دو ختم حبیب احمد کے اور دس پارے خاتون کے بھی شامل تھے۔ دور دور سے منگتے آئے اور پیٹ بھرنے کے بعد کھانے سے جھولیاں بھی بھر کر لے گئے۔ پیر بخش صحن کے ایک طرف کرسی پر بیٹھا حقہ پیتا رہا اور نمایاں غرور کے ساتھ سارے کام کی نگرانی کرتا رہا اور ساتھ ہی سوچتا رہا ''کاش اس وقت نیک بخت ہوتی تو بے چاری کتنی خوش ہوتی۔''

صبح کو حبیب احمد دکان پر چلا گیا تو پیر بخش پر پہلی بار اداسی کا دورہ پڑا۔ نیک بخت اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگی اور صحن میں اِدھر سے اُدھر اور یہاں سے وہاں ٹہلنے لگی۔ پیر بخش گھبرا کر گلی میں آ گیا اور موڑ پر بیٹھا لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ بڑی بوڑھیاں اس کے پاس سے گزریں تو چپ چاپ بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر رونے بیٹھ گئیں اور نیک بخت کی خوبیاں گنانے لگیں۔ وہ پھر اندر چلا آیا۔ بہو چولہانے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ پیڑھی قریب لا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا ''بیچاری نیک بخت بھی اسی جگہ بیٹھ کر کھانا پکاتی تھی جہاں تم بیٹھی ہو۔''

خاتون نے گھبرا کر پیر بخش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا مگر پیر بخش ماضی کی سیر میں مگن تھا، بولا ''نیک بخت سے پہلے میری اماں نے اسی جگہ بیٹھ کر چالیس سال تک کھانا پکایا ہے اور میں یہیں بیٹھ کر جہاں اب بیٹھا ہوں، ضد کرتا تھا کہ میرے حصے کے پراٹھے پر میری مٹھی برابر گھی ڈالو ورنہ میں اسے کتے کو کھلا دوں گا۔'' پیر بخش بچوں کی طرح ہنسنے لگا اور اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی کیونکہ بیٹے کی شادی کے بعد اس نے پہلی بار اپنے آپ کو ہنستا سنا تھا۔ ''گھی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔'' اس نے اپنی ہنسی کا جواز پیش کرنا چاہا۔

''مگر بابا، آج کل تو گھی بہت مہنگا ہے۔'' خاتون بولی۔ ''آج کل تو پورا برابر گھی سے پراٹھے پکتے ہیں۔''
''نہیں نہیں بیٹی۔'' پیر بخش نے خاتون کے لہجے میں کھٹکتی ہوئی سوئی کی چبھن محسوس کر لی تھی۔ ''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اب تو میں کچا گھی کھاؤں تو بیمار ہو جاؤں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زندگی کتنی جلدی جلدی کٹ جاتی ہے۔ پرسوں اس چولہے کے پاس میری اماں بیٹھی تھی۔ کل نیک بخت بیٹھی تھی، آج تم بیٹھی ہو۔''

خاتون نے ایک بار پھر گھبرا کر پیر بخش کو دیکھا اور بولی ''تو یوں کہو نا بابا کہ اب تمہیں میری موت کا انتظار ہے۔''
پیر بخش کے سینے پر جیسے خاتون نے گھونسا دے مارا۔ وہ ''ہائیں'' کہہ کر رہ گیا۔ پھر مار کھائے ہوئے بچے کی طرح چپکے سے اٹھا۔ چولہانے کی حد بندی کی اوٹ میں کھڑا سامنے کی دیوار کو یوں دیکھنے لگا جیسے بہت دور دیکھ رہا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا اور اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ ضبط کی اس کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور خاتون کے سامنے اتنے بڑے راز کے فاش ہونے کے ڈر سے وہ پھر گلی میں آ گیا۔ جب حبیب احمد دکان بند کر کے دوپہر کا کھانا کھانے گھر کی طرف آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا چٹکی میں تنکا لیے مٹی پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

حبیب احمد کے ساتھ وہ گھر میں آیا اور جب حسب معمول اس کے ہاتھ دھلائے گئے اور خاتون نے اسی طرح کھانا لا کر اس کے سامنے رکھا تو اس کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ کھانے کے بعد وہ وہیں چارپائی پر بیٹھا حقہ پینے لگا۔ حبیب احمد واپس دکان پر چلا گیا تھا اور خاتون چولہانے میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی جب وہ پکارا۔ ''بیٹی، حقے کے لیے اُپلے کی آگ تو اٹھا لا۔ ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔''

''میں برتن دھو رہی ہوں۔'' خاتون بولی۔
''چمٹے سے اُٹھا لا۔'' پیر بخش نے کہا۔
برتن زور سے بجے جیسے ایک دوسرے پر دے مارے گئے ہوں۔ پھر خاتون چمٹے میں اُپلے کی آگ اُٹھائے، چولہانے میں سے نکلی مگر اس طرح نکلی کہ پیر بخش آگ کے بجائے خاتون کے چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔
خاتون نے آگ کو چمٹے سمیت پیر بخش کے جوتوں کے پاس پھینک دیا اور واپس چولہانے میں گئی تو ایک بار پھر برتن زور سے بجے۔
پیر بخش حقہ پینا بھول گیا۔ آگ وہیں پڑے پڑے راکھ ہو گئی۔
شام کو جب حبیب احمد دکان بند کر کے گھر واپس آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ''دیکھ حبیب۔'' اس نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور دن کے دونوں واقعات سنا دیے۔ حبیب احمد چپ چاپ کھڑا سنتا رہا۔ پھر ہاتھ چھڑا کر تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

پیر بخش خاصی دیر تک وہیں گلی میں کھڑا رہا۔ مدتوں کے بعد اسے اپنی بہن یاد آئی کہ زندہ ہوتی تو یہاں سے سیدھا اس کے پاس چلا جاتا۔ بیٹا بھی اندر جا کر اسے بھول گیا تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ بیٹے کو آزمائے۔ یہیں بیٹھ جائے اور اگر بیٹا اسے بلانے نہیں آتا تو رات بھر یہیں بیٹھا رہے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھا تو اپنے مکان کی چھت پر ایریل کے دونوں بانس اندھیرے آسمان کے پس منظر میں اسے یوں پھیلے پھیلے نظر آنے لگے جیسے خاتون اور حبیب احمد کھڑے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سمٹ کر دیوار میں گھس جانا چاہتا تھا کہ اچانک گلی کے ایک طرف سے اسے دو آدمی

باتیں کرتے ہوئے سنائی دیئے۔ وہ ادھر ہی آ رہے تھے۔ پیر بخش گھبرا کر اٹھا اور تیزی سے گھر کے صحن میں داخل ہو گیا۔ اس وقت حبیب احمد دیوار کے ساتھ سائے کی طرح لگا کھڑا تھا اور خاتون چولہے میں جلتی ہوئی آگ کو گھورے جا رہی تھی۔

پیر بخش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک دیئے ہیں اور ہر طرف پودوں کے ننگے ننجر اُگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے لیے وہ اپنی چارپائی کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا جہاں حبیب احمد کی شادی کے بعد نیک بخت اور اس کے کھٹولے رکھے رہتے تھے اور جہاں فاتحہ خوانوں کے لیے چٹائی بچھی تھی۔

اس رات کھانا بھی کسی نے نہ کھایا۔ پیر بخش قریب قریب ساری رات جاگتا رہا۔ کبھی غنودگی بھی چھائی تو اس کے کان جاگتے رہے۔ وہ بار بار چونک کر یوں سر اٹھا لیتا تھا جیسے چولہانے سے پرے اس نے کسی کی ہنسی کی آواز سنی ہے۔ شروع رات میں خاتون کی چند سسکیوں کی آواز ضرور آئی تھی مگر اس کے بعد ایسی خاموشی چھائی کہ دیر تک کسی آواز کا انتظار کرتے کرتے پیر بخش کو خاموشی سے خوف آنے لگا تھا اور اس نے کھانس کھنکار کر اپنی ڈھارس بندھائی کہ ابھی قیامت نہیں آئی۔ ایک بار اس کا یہ بھی جی چاہا کہ چپکے سے کھاٹ سر پر رکھے اور ہمیشہ کے لیے کھیتوں میں جا بسے مگر اب کھیت بھی تو حبیب احمد کے تھے۔ اور پھر کہیں نکل جانے سے پہلے وہ حبیب احمد اور خاتون کو ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے بھی سننا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بیٹے نے باپ کی شکایت کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور حد یہ ہے کہ اس سے کھانے تک کو نہیں پوچھا تھا مگر آخر حبیب احمد اور خاتون میاں بیوی تھے اور جب میاں بیوی خفا ہوتے ہیں تو انہیں اپنے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ پیر بخش کی بے چینی اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی تھی جب اسے محسوس ہوتا تھا کہ یہ سناٹا اسی نے پیدا کیا ہے۔

ایک بار نیک بخت اس سے روٹھ گئی تھی تو اسے زندگی سے کتنی نفرت ہو گئی تھی۔ اس روز اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ دوپہر تک وہ گلیوں میں بے مقصد گھومتا پھرا تھا۔ پھر وہ بکریوں کے لیے صحن میں اُگی ہوئی بیری کی شاخیں کاٹ رہا تھا کہ اس کی ہتھیلی میں کانٹا چبھ گیا تھا اور نیک بخت کو جو دیوار کے ساتھ لگی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی، نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ پیر بخش کے کانٹا چبھ گیا ہے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ بہر حال وہ ایک دم اٹھی تھی۔ اندر سے سوئی لے کر اس کی طرف لپکی تھی۔ پیر بخش بھی یہ دیکھ کر نیچے اتر آیا تھا اور نیک بخت نے اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لے کر ٹوٹا ہوا کانٹا نکالا تھا اور بولی تھی "جب تجھے کانٹا چبھنے لگے تو مجھے پکار لیا کر کہ میرے ہوتے تیری قسمت کا کانٹا بھی میرے حصے کا کانٹا ہے۔" اس کے بعد دونوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں روٹھیں گے۔ پیر بخش کو یہ واقعہ یاد آیا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بیری کا درخت ہے جس میں پتوں کی جگہ بھی کانٹے نکلے ہوئے ہیں اور اس نے اپنے بیٹے اور بہو کی ہتھیلیاں چھلنی چھلنی کر ڈالی ہیں۔

گھبرا کر اس نے اپنی بانہوں کو ہاتھوں سے رگڑا اور چولہانے کی پرلی طرف سے کوئی آواز سننے کے لیے سر اٹھا لیا۔ مرغے بانگ دینے لگے تھے اور تاروں بھرے آسمان کی سیاہی پھیکی پڑنے لگی تھی۔

مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ وہ کلمہ پڑھ کر اٹھا اور یکا یک اسے محسوس ہوا کہ اس کی تو آنکھیں جل رہی ہیں اور سر گھوم رہا ہے اور دل ٹخنوں اور پیٹ اور کنپٹیوں تک میں زور زور سے بج رہا ہے۔ کوزہ چولہانے کی حد بندی پر رکھا تھا۔ وہ پنجوں کے بل چلتا وہاں تک گیا اور کوزہ اٹھایا تو حبیب احمد کی آواز آئی "اُٹھ گئے بابا؟"

پیر بخش جیسے اچانک پکڑا گیا۔ گھبرا کر بولا۔ "ہاں بیٹا۔"

"کوزے میں پانی ہے کہ بھر دوں؟" اس نے پوچھا۔

پیر بخش نے کوزہ چھلکا کر کہا "ہے۔"
پیر بخش پلٹا تو حبیب احمد نے خاتون سے کہا "سنتی ہو؟ صبح ہوگئی۔"
"میں تو کب کی جاگ رہی ہوں۔" وہ بولی۔
"تو کیا میں سو رہا تھا؟" حبیب احمد بولا۔
پھر جانے حبیب احمد نے خاتون کے گدگدی کی یا کیا ہوا، خاتون دبے دبے ہنسنے لگی اور ایک بار حبیب احمد بھی ذرا سا ہنسا۔

پیر بخش کو میاں بیوی کی اس بات چیت اور اسی ہنسی مذاق کا انتظار تھا مگر اچانک جیسے اس کی بے خبری میں اس کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹا اور اسے اپنے بیٹے پر غصہ آنے لگا جس نے باپ کو طاق پر رکھ کر بیوی سے صلح کر لی تھی مگر کیا دونوں کی لڑائی بھی ہوئی تھی؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کا بیٹا اس کی خاطر اپنی بیوی سے لڑ بیٹھے؟

حبیب احمد اور خاتون باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ آخر وہ اس وقت کیا باتیں کر رہے تھے اور کیوں ہنس رہے تھے! وضو کرتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی جلد کا ڈھیلا ڈھالا پن محسوس کیا اور اسے یقین سا ہونے لگا کہ اس کی بہو اور بیٹا اسی پر اس کے بڑھاپے پر اور اس کے بڑھاپے کی بے بسی پر ہنس رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہی کوزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور ٹوٹ گیا۔ حبیب احمد اور خاتون پلنگوں پر سے کود کر اترے اور ٹوٹے ہوئے کوزے کے پاس ایک مجرم کی طرح بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر واپس چلے گئے۔

اچھا ہوا کہ خاتون خاموش رہی۔ پیر بخش نے سوچا، یہ تو بہت اچھا ہوا مگر حبیب احمد کی خاموشی کا تو یہ مطلب تھا کہ اسے کوزے کا ٹوٹنا برا لگا ہے۔ کوزہ جو آج بھی چار پیسے میں آتا ہے اور جو نیک بخت نے اچھے وقتوں میں ایک لپ باجرہ دے کر خریدا تھا۔

ابھی ایک پاؤں دھونا باقی تھا مگر پیر بخش نے نہ دوسرا کوزہ مانگنے کی جرأت کی اور نہ گھڑے میں سے چلو بھر پانی کٹورے میں نکالنے کا حوصلہ کیا۔ ایک پاؤں پر مسح کر کے اس نے نماز پڑھی اور جب پڑھ چکا تو حیران رہ گیا کہ اسے نہ تو نیت کرنا یاد تھا اور نہ رکوع اور سجدے اور وہ ایک مشین کی طرح نماز کے بعد کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

حبیب احمد کے دکان جانے کا وقت قریب آ رہا تھا مگر اب تک وہ باپ کے پاس کل شام کی شکایت کا جواب لے کر نہ آیا تھا۔ پیر بخش تسبیح پر سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کر رہا تھا اور ایک بار جب سوویں منکے پر پہنچنے والا تھا تو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ حبیب حبیب کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ تسبیح کو جیب میں رکھ کر وہ باہر نکل گیا کہ شاید یہاں گھر میں حبیب احمد اپنی بیوی کے ڈر سے بات نہ کر رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد حبیب احمد دکان جانے کے لیے باہر آیا۔ باپ کو دیکھا اور بولا "بابا۔"
"بیٹا۔" پیر بخش نہایت شوق سے اس کی طرف بڑھا۔
"آج تم نے حقہ کیوں نہیں پیا بابا؟" حبیب احمد بولا۔

پیر بخش اس سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات کہنا چاہتا تھا جس سے شکایت کا کوئی پہلو نکلے اور وہ اپنے کل شام کے گلے کا جواب حاصل کر سکے۔ "تمہیں کیسے خیال آیا میرے حقہ پینے کا؟" پیر بخش نے کہا مگر بعد از وقت کہا کیونکہ حبیب احمد تو اس سے پہلے ہی شاید حقہ تیار کرنے کے لیے واپس گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

پیر بخش بھی اندر چلا آیا۔ اس وقت حبیب احمد چولہانے میں بیٹھا چمٹے کی مدد سے چقے پر آگ جما رہا تھا اور خاتون کہنیوں کو گھٹنوں پر رکھے اور اٹھے ہوئے بازوؤں میں اپنا سر تھامے یوں بیٹھی تھی جیسے جو کچھ اس کا شوہر کر رہا ہے اس سے خود اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

پیر بخش کو ایک ترکیب سوجھی۔ بولا ''بیٹا میرے کپڑے بڑے میلے ہو رہے ہیں۔ دوپہر کو ایک ٹکی صابن لیتے آنا۔ میں کنوئیں پر جا کر دھولاؤں گا۔''

''نہیں بابا۔'' حبیب احمد چونک کر بولا ''کپڑے گھر میں دُھل جائیں گے۔''

پیر بخش کا مسکرانے کو جی چاہا۔ اس نے خاتون کو دیکھا جو اسی حالت میں بیٹھی چولہے کو گھور رہی تھی۔ وہ اسے ایک چھوٹی سی شرمیلی سی لڑکی لگی۔ حبیب احمد نے اسے سمجھا دیا ہوگا۔

پیر بخش نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا، اس لیے سکون سے بیٹھا حقہ پیتا رہا۔ حبیب احمد دکان پر جا چکا تھا اور خاتون چولہانے میں بیٹھی دوپہر کا کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پیر بخش اپنے کوٹھے میں گیا۔ بستر میں سے کھیس نکال کر تہبند کے طور سے باندھا اور چولہانے میں آ کر اپنے میلے کپڑے خاتون کے سامنے رکھ دیے۔

خاتون ایک دم بولی ''میں انہیں کیا کروں؟''

''دھونے ہیں۔'' پیر بخش بولا۔ ''ابھی ابھی حبیب نے کہا تھا نا کہ گھر میں دُھل جائیں گے۔ سو گھر میں حبیب تھوڑی دھوئے گا۔ تمہی دھوؤ گی۔''

''مجھ سے نہیں دُھلتے۔'' خاتون نے ایک کپڑے کو مرے ہوئے چوہے کی طرح چٹکی سے اٹھا کر چھوڑ دیا۔ ''کبھی دھوئے ہوں تو دُھلیں۔''

''تو پھر کون دھوئے؟'' پیر بخش نے پہلی بار آواز میں سختی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''تم دھوؤ، حبیب دھوئے۔ کوئی دھوئے۔ بس مجھ سے نہیں دھلتے۔'' اس نے کپڑوں کو پیر بخش کی طرف کھسکا دیا اور ہنڈیا میں چمچہ چلانے لگی۔

پیر بخش کو غصہ آ گیا۔ اگر حبیب احمد صاف طور سے کہہ دیتا کہ گھر میں دھو لینا تو دوسری بات تھی، مگر گھر میں دُھل جائیں گے کا مطلب تو یہ تھا کہ خاتون دھو دے گی۔ اس معاملے میں اسے اپنے بیٹے کی حمایت کا یقین سا تھا، اس لیے بولا ''تم سے نہیں دھلتے تو مجھ سے بھی نہیں دھلتے۔''

''مجھ سے تو نہیں دھلتے۔'' خاتون نفرت سے بولی۔

''میں جا کے حبیب کو بتا دوں گا۔'' پیر بخش نے دھمکی دی۔

اور خاتون نے یکا یک کھڑے ہو کر ہاتھ کولھوں پر رکھ لیے اور کڑکی ''تو پھر جاؤ، ابھی جا کر بتا دو۔ میں جانتی ہوں تمہارے بیٹے کو۔ زیادہ زبان نہ لڑاؤ ورنہ میرا ابا سارے گاؤں کے سامنے تم دونوں کے جوتے لگوائے گا۔''

''جوتے لگوائے گا؟'' پیر بخش نے یہ الفاظ یوں دہرائے جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے یہی الفاظ سنے ہیں۔ ''میں ساٹھ سال کا ہو گیا ہوں لڑکی اور میں نے جوتے وتے کی بات کسی سے نہیں سنی اور نہ سن سکتا ہوں۔ تیرا ابا تو جب آئے گا، آئے گا۔ میں اس سے پہلے اپنے بیٹے سے تجھے جوتیاں لگواؤں گا۔ بدذات کہیں کی۔''

ایک جھٹکے سے خاتون جھکی اور دھودھا سے بھری ہوئی صحنک اٹھا کر پیر بخش پر دے ماری۔ پیر بخش ایک طرف ہٹ گیا اور صحنک کی ٹھیکریاں ادھر اُدھر بکھر گئیں۔ پھر خاتون چیخ چیخ کر رونے لگی اور روتے ہوئے گالیوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ پھر وہ وہیں ڈھیر ہو کر پاؤں پٹخنے اور ہچکیاں لینے لگی۔

پیر بخش نے میلے کپڑے اٹھائے۔ اپنے کوٹھے میں آ کر انہیں پہنا اور اس تیزی سے گھر میں سے نکلا جیسے کوئی اس کے سامنے آیا تو اسے لتاڑتا ہوا گزر جائے گا۔ وہ اسی تیزی سے حبیب احمد کی دکان میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں گاہکوں کا ہجوم تھا، اس لیے پہلے تو دروازے میں کھڑا ہانپتا رہا اور حبیب احمد کو دیکھتا رہا جو کپڑا ناپنے میں مصروف تھا۔ پھر وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

آہستہ آہستہ اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھلنے لگیں۔ اس کا جڑا ہوا جبڑا ڈھیلا ہو گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے کندھے گر گئے اور جب کافی دیر کے بعد بھیڑ چھٹ گئی اور حبیب احمد نے اس کی طرف دیکھا تو بولا ''ارے بابا۔ تم بھی بیٹھے ہو؟ کب آئے ہو؟ کیا بات ہے؟ کیسے آئے؟''

پیر بخش جواب میں ایک پل تک بیٹے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ''کچھ نہیں بیٹا۔ بس تمہیں دیکھنے آ نکلا تھا کہ تم دکان میں بیٹھے کیسے لگتے ہو۔''

حبیب احمد یوں مسکرایا جیسے شرما رہا ہے۔ پھر وہ حساب کے رجسٹر پر جھک کر کچھ لکھنے لگا۔

(''گھر سے گھر تک'')

..........☆..........

میرا ابلا اسم اسکول

رضیہ فصیح احمد (شکاگو)

جب میں اور حنا چھوٹے تھے، چھوٹے کیا تھے اچھے خاصے آٹھویں نویں کلاس میں تھے تو ماسٹر شفیق صاحب ہمیں پڑھانے آتے تھے۔ میں نے انہیں ان کے سامنے بھی اور پیٹھ پیچھے بھی کبھی ماٹ صاحب کے علاوہ کچھ نہ کہا۔

پڑھانے تو خیر وہ مجھے آتے تھے کیونکہ میں ذرا پڑھائی میں پھسڈی تھا مگر ابا سے کہہ کر حنا نے بھی ان سے پڑھنا شروع کر دیا تھا جبکہ اس کو قطعی ضرورت نہیں تھی۔ وہ توان لڑکیوں میں سے تھی کہ امتحان میں ایک لفظ غلط لکھ آنے کا شبہ ہو تو کہیں گی کہ ''پرچہ خراب ہوا۔''

ماٹ صاحب ہمیں اردو کے ساتھ فارسی اور حساب بھی پڑھاتے تھے۔ حنا کی اردو اور فارسی بہت اچھی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ ہر روز مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ دونوں مضمون پڑھ رہی ہے اور ماٹ صاحب کو بھی مزا آتا تھا ہمیں بے ہنگم ہوم ورک دینے میں۔ ایک دن فارسی کا یہ شعر ترجمہ کرنے کو دیا

~ درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردئی
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

''کل جو شعر میں نے دیا تھا اس کا ترجمہ کر دیا؟'' ماٹ صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں، ماٹ صاحب۔'' میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''بہت مشکل ہے ماٹ صاحب، سمجھ میں نہیں آیا۔''

''تمہیں ہر کام مشکل لگتا ہے۔''

''اور بیٹا تم نے؟'' انہوں نے حنا سے پوچھا۔ حنا نے اپنی کاپی آگے کر دی۔

''بیچ دریا کے مجھے تو نے بٹھایا باندھ کر...... پھر یہ کہتا ہے کہ دامن تر نہ ہو، ہوشیار رہ۔''

''واہ، واہ...... ترجمہ اور وہ بھی شعر میں، کیا کہنا کیا کہنا۔'' ماٹ صاحب نے کہا۔

''یہ ترجمہ کہاں ہے، یہ تو وہی شعر لکھ دیا۔ دامن تر نہ ہو ہشیار۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''ہاں مگر سمجھ کر لکھا نا، اردو میں لکھ سکتے ہیں...... دامن تر نہ ہو...... کوئی حرج نہیں۔ تم سے سیدھا سادا ترجمہ نہیں ہوا اور

اس نے شعر میں کر دیا۔''

بس یہی بات مجھے ماٹ صاحب کی بری لگتی تھی کہ حنا جو بھی کرے اس کی تعریف اور میں جو بھی کروں یا نہ کروں اس کی برائی۔

ماٹ صاحب نے ابا جان سے شکایت کی کہ کریم دل لگا کر نہیں پڑھتا۔ ڈانٹ پڑی تو میں نے امی جان سے جڑ دیا کہ ''وہ مجھے پڑھاتے ہی نہیں، وہ تو بس حنا کو پڑھاتے ہیں۔ اس کی انگلیوں سے کھیلتے ہیں اور اس کے پاؤں پر پاؤں رکھے رکھتے ہیں۔'' وہ یہ سب نہیں کرتے تھے، میں نے ایک افسانے میں پڑھا تھا۔ امی جان نے ابا جان سے کچھ کہا ہوگا، ابا جان نے ماٹ صاحب سے کچھ کہے بغیر ان کی چھٹی کر دی اور یوں میری بھی چھٹی ہوگئی۔

حنا ان کے کئی دن نہ آنے پر پریشان ہوئی۔ جب معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں آئیں گے تو روئی جس پر اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا۔ میں ایک عرصے تک اس شعر کا الٹا سیدھا ترجمہ سنا کر اسے تنگ کرتا رہا۔

اس طرح جھوٹی سچی باتیں بنا کر مجھے اپنا کام نکالنے کی عادت ہوگئی۔

حنا نے ایم اے کیا اور میں نے میٹرک۔ یونیورسٹی میں اول آنے کی وجہ سے اسے وہیں لیکچرر شپ مل گئی اور میں نے گورنمنٹ کے ایک کھاتے پیتے محکمے میں نوکری کر لی۔ میرا ہیڈ کلرک تو دل بھر کے کھاتا تھا، میں البتہ ذرا احتیاط سے لیتا تھا۔ ویسے بھی حکومت کی نوکری میں نوابی ہی نوابی ہے۔ حنا اپنی چھوٹی سی گاڑی میں یونیورسٹی جاتی تھی اور میں بس میں۔ مجھ سے کہتی تھی، ''میں آپ کو دفتر چھوڑ دوں؟'' تو میں نخرے سے کہتا تھا ''میں کیوں خوار ہونے کو صبح صبح اٹھوں۔ میں لاٹ صاحبوں کی طرح دیر سے جاتا ہوں۔ جب جی چاہا کہہ دیا خالہ لندن سے آرہی ہیں۔ انہیں لینے ایئر پورٹ جانا ہے اور چھٹی کر لی۔ جب چاہا اپنی بیماری کا بہانہ کر دیا یا کہہ دیا، اماں کو اسپتال لے کر جانا ہے۔ روکتا ٹوکتا کون ہے بھائی جب سب یہی کرتے ہوں۔ تم جاؤ مغز کھپاؤ لڑکیوں لڑکوں کے ساتھ۔ میں تو سمجھتا ہوں پڑھانے سے برا کوئی کام نہیں۔'' ایسی باتیں میں اکثر کرتا اور حنا مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔

لیکن ایک دن ہیڈ کلرک نے ایک بڑی اچھی بات سجھائی۔ وہ بزنس کے طور پر ایک اسکول کھولنا چاہتا تھا اور اس کو کسی پارٹنر کی ضرورت تھی۔ میں خوشی سے راضی ہوگیا۔ ہم دونوں نے ایک ادھ بنا گھر خریدا، اس کو ٹھیک ٹھاک کرایا اور باہر ''داخلے جاری ہیں'' کا بورڈ لگا دیا۔ ابھی نہ استاد رکھے گئے تھے نہ اور کوئی انتظام تھا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر جا بیٹھتا اور ایک دن میں۔ جب بچے آنے شروع ہوئے تو جلدی جلدی اشتہار دیے اور انٹرویو شروع کیے۔

ایک دن ایک کرسچن عورت آئی، پڑھی لکھی تو وہ میری جتنی تھی مگر اس کی انگریزی تگڑی تھی۔ یہ اتنی بڑی ڈگری تھی جس کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ سو اس کو فوراً پرنسپل بنا دیا گیا۔ ایک زمانے میں اسکول میں ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس ہوتی تھیں مگر اب اس عہدے پر پرنسپل ہوتے تھے اور اسکول پرائمری نہیں بلکہ ایلی منٹری کہلاتا تھا۔ ہم نے اپنے اسکول کا نام رکھا بلاسم آکسفورڈ اسکول۔ مس ڈی سوزا کی پرسنیلٹی اچھی تھی۔ کچھ تجربہ بھی تھا چنانچہ ابتداء سے ہی اچھے خاصے بچوں نے داخلہ لیا۔ فیس بھی ہم نے خوب رکھی تھی تا کہ لوگوں کو اندازہ رہے کہ ایسا ویسا اسکول نہیں ہے۔

ایک مہینے سے بھی پیشتر ہم نے اسکول کے باہر بورڈ لگا دیا۔ ''داخلے بند ہیں'' بس پھر کیا تھا، والدین بچوں کو یوں لے کر آتے جیسے وہاں میلہ لگا ہو۔ خوشامد کرتے کہ ایک بچے کی جگہ تو نکال ہی لیں، یوں سینکڑوں بچے آئے۔ مس ڈی سوزا

غضب کی ایکٹنگ کرتی اور ہر بچے کو ہزار منت سماجت کے بعد داخل کرتی۔ اسی دوران استاد بھی آتے رہے۔ یہ بھی مس ڈی سوزا نے ہی بتایا کہ عالم فاضل استاد مت رکھو، وہ پر اعتماد ہوتے ہیں اور انتظامیہ کو پریشان کرتے ہیں، زیادہ تر اسمارٹ بھی نہیں ہوتے۔ اس لیے بچے ان کا مذاق بناتے ہیں۔ اس لیے استاد کی پرسنیلٹی دیکھنی چاہیے اور ضرورت مندوں کو ملازمت دینی چاہیے جو آسانی سے چھوڑ کر نہ جائیں۔ پڑھائی جیسی بھی ہو استادوں سے زیادہ والدین کو خوش رکھنا چاہیے کہ مٹھی بھر بھر فیس تو وہ دیتے ہیں۔

ہیڈ کلرک تو چاندی بنا رہا تھا، وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی اور اپنے اسکول کا ایڈمنسٹریٹر بن گیا۔ کلاسوں میں استادوں کے لیے کرسی نہیں تھی کہ وہ بیٹھ سکیں۔ ان پر سختی سے نظر رکھتا تھا، ہر کلاس کے سامنے سے دن میں دو ایک بار گزرتا تھا۔ ہوم ورک پر زور دیتا تھا کہ والدین اس سے خوش ہوتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار سب کلاسوں کی کاپیاں آفس میں منگواتا یہ دیکھنے کے لیے استاد ہوم ورک چیک کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ کام بھی مس ڈی سوزا کرتی، میں صرف آخر میں ایک دستخط مار دیتا اور جس ٹیچر نے ہوم ورک نہ چیک کیا ہوتا اس کی آفس میں طلبی ہوتی۔ ان باتوں سے اسکول کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر ہیڈ ماسٹر کی عنایت اور مشورے سے گھر کا جو اسٹور روم گھر سے الگ بنایا گیا تھا، اس میں ایک ٹک شاپ کھول لی جس میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ کاپیاں، قلم رکھے گئے اور چند دن بعد کتابوں اور یونیفارم اور جرسیوں کا اضافہ کر دیا گیا اور یونیفارمیلٹی کے خیال سے یہ بھی لازم کر دیا گیا کہ یونیفارم یہیں سے خریدی جائیں۔ والدین کو بھی ایک ہی جگہ سے ہر چیز خرید لینے میں آسانی تھی۔ ہر چیز ذرا سی مہنگی ضرور تھی مگر والدین کے وقت کی بچت میں اس مہنگائی کی قیمت نکل آتی تھی۔

حنا کو اکثر میں اپنی کارگزاریاں بڑھا چڑھا کر سناتا۔ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ دو بچوں کی ماں تھی مگر اب بھی لشتم پشتم یونیورسٹی پڑھانے جاتی تھی۔

ایک مرتبہ خیال آیا کہ اب اپنے اسکول کو مڈل اسکول بناؤں مگر مس ڈی سوزا نے کہا کہ اس کھڑاگ میں نہ پڑو، مشکلیں زیادہ اور نفع کم، اس لیے بہتر ہے کہ چھوٹے اسکول کھولو۔ آج کل مونٹیسوری اور کنڈرگارٹن کی مانگ ہے۔ مائیں جلد سے جلد بچوں کو اسکول میں پھنسانا چاہتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا، کیا برگد کی شاخیں پھیلتی ہوں گی جو ہمارے اسکول اور اس کی شاخیں پھیلیں۔ میں نے ہیڈ کلرک کو بھی یہ کہہ کر فارغ کیا کہ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ یہ ہماری مرحومہ امی کہا کرتی تھیں۔ حجت بھی ہوئی، میں نے کچھ دے دلا کر اس سے پیچھا چھڑایا، اب میں سارے اسکولوں کا مالک بھی اور ایڈمنسٹریٹر بھی۔ پرانی وفادار ٹیچرز کو میں نئی شاخوں کا پرنسپل بناتا گیا۔

اب ہماری بوڑھی کمزور پرنسپل ڈی سوزا بیمار رہنے لگی تھی اور ریٹائرمنٹ کی بات کرنے لگی تھیں۔ میری کچھ پالیسیوں سے خوش بھی نہیں تھی۔ شاید مجھے اتنی تیزی سے ترقی کرتے دیکھ کر جلنے لگی ہو۔ بہرحال جب وہ زیادہ ناغہ کرنے لگی تو میں نے اسے فارغ کر دیا اور اپنے بلاسم اسکول کے لیے نئے پرنسپل کے لیے اخباروں میں اشتہار دے دیا۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ ماٹ صاحب چلے آ رہے ہیں۔ اسی پرانے حلیے میں، شیروانی اور ٹوپی۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ حیرت یہ کہ وہ بھی مجھے پہچان گئے۔ بولے "اچھا تو یہ سی ڈی احمد آپ ہو۔"

.......☆..........

آدھی رات

رفعت مرتضیٰ (فلوریڈا)

آدھی رات گئے بارش آ گئی تھی۔ سر شام کوثر نے چھت پر بستر بچھائے تھے اور پھر سر اٹھا کر آسمان پر چودھویں کے چمکتے چاند کی طرف دیکھ کر پھر سے اپنی نظریں بستروں پر بچھی سفید چادروں پر بچھا دیں اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا تھا ''چاندنی راتوں میں بستروں پر بچھی سفید چادروں سے مجھے بہت خوف آتا ہے۔'' اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے گھڑونچی پر رکھی کالی صراحی کے گلے میں پڑی موتیے کی مالا کو چھو لیا اور موتیے کی پراسرار اور بھینی بھینی خوشبو ہمارے آس پاس پھیل گئی۔ کوثر نے بے چینی سے مڑ کر صراحی کی طرف دیکھا، پھر حلق سے ایک بے معنی سی آواز نکالتی تیز تیز چلتی پرچھتی کی طرف چلی گئی اور وہاں بچھے خالی پلنگ پر لیٹ کر پائنتی رکھا نیلے رنگ کا کھیس اپنے چاروں طرف اچھی طرح لپیٹ کر اپنے گھٹنے پیٹ سے لگا کر ساکت ہو گئی۔

''پاگل!'' باجی نے آواز میں کہا اور اپنے سفید براق بستر پر لیٹ کر تکیے پر رکھے موتیے کے پھول مٹھی میں لے کر سونگھنے لگیں۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا اور چاند کی گول چمکتی، چاندی کی پلیٹ اس کے بیچوں بیچ رکھی جگمگا رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں آدھی رات میں بادل کہاں سے آئے اور ایسے آئے کہ ابھی پہلے قطرے کے ساتھ پوری طرح آنکھ کھلی بھی نہیں تھی کہ جیسے جل تھل ہونے لگا۔ باجی ایک چھلانگ میں بستر سے اتریں اور برساتی کی طرف بھاگیں، جاتے جاتے ناز کے پلنگ کو زور سے ٹھوکر ماری ''اٹھو ناز، تیز بارش آ رہی ہے۔ دوبارہ اٹھانے نہیں آؤں گی۔''

ناز اپنا بستر لپیٹ رہی تھی کہ ساتھ کی چھت سے کسی کے گانے کی آواز آنے لگی۔ ''دور جان والیا...... مہاراں ہن موڑ وے، کلّی کلّی جان، دُکھ لکھ تے کروڑ وے'' اور ساتھ ہی درمیانی دیوار کے اوپر دو گورے گورے ہاتھ ہوا میں یوں لہرائے جیسے کوئی اپنے اندر کی بے چینی اور بے تابی کا اظہار کرتا ہو۔ یہ پڑوسیوں کا لڑکا فاروق تھا جس کی چھوٹی بہن فریدہ کے ہاتھ ناز کے پاس کئی سلام آ چکے تھے۔ ناز نے ایک نظر ان تڑپتے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر حیران ہوئی مردانہ ہاتھ اتنے گورے اور انگلیاں اتنی پتلی لمبی اور نازک بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر اس کی آنکھیں بھی تو سبز رنگ کی تھیں اور تو اور سرخ رنگ کی قمیض پہننے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ لال قمیض پہنے ان کے گھر آتا تو لال قمیض میں کالر میں بجی اس کی دودھیا گردن، سنہرے بال اور سبز آنکھوں سے ناز کو ایسا خوف محسوس ہوتا کہ وہ فوراً اپنے کمرے میں کسی نہ کسی کام کے بہانے بھاگ جاتی۔ وہ اسے ناز کی بے رخی جان کر بہت رنجیدہ صورت، اٹھ کر چلا جاتا اور اپنے ٹوٹے پھوٹے گراما فون پر بہت اداس گانے لگا کر ناز تو کیا پورے محلے کا آرام حرام کرتا۔ ناز کی نظر کے سامنے پھر اس کا سراپا آ گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔ اسی وقت نیچے دالان میں کسی نے پلنگ کھینچا اور اس

کی آواز جیسے گرداب در گرداب اٹھتی ہوئی اوپر آئی اور چاروں طرف پھیل گئی۔ ناز کے غبار آلود ذہن کو یہ آواز بہت اجنبی، بہت غیر حقیقی لگی۔ اس نے جلدی سے بستر اٹھایا اور تیز تیز سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی۔ سب سے نچلی سیڑھی پر ناصر کمبل میں لپٹا، گولا سا بنا پڑا تھا۔ اُس کے اوپر سے کودنے کے لیے ناز نے جیسے ہی پیر آگے بڑھایا، ناصر نے اس کا پیر پکڑ لیا۔ ڈری ہوئی تو وہ پہلے ہی تھی، ایک دبی دبی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ پھر وہ وہیں سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''شرم نہیں آتی تمہیں؟ ابھی جو میں گر جاتی تو؟''

''مجھے بھی تو نیند نا میں آتی نا۔'' ناصر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تو میں کیا کروں؟ میں نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے تمہاری نیند کا؟''

''ہاں لیا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ارے واہ، مجھے تو آ رہی ہے نا۔ اور پھر میرا اسکول ہے صبح میں۔''

''اسکول نہیں جاؤ تم۔ سب چلے جاتے ہیں۔ ناصر ساتھ کوئی بات بھی نا کیں کرتا۔''

''مگر ناصر تم بات کیا کرو گے آدھی رات کو؟''

''نازی ناصر کو نیند نہیں آتی ناں۔'' ناصر کی آواز میں بچوں والی ضد آ گئی۔

''چلو ناز...... اٹھو سو جا کر۔ اس بدبخت ناصر کو نہ خود نیند آتی ہے نہ کسی اور کو ہی سونے دے گا۔'' نانا نے غصے سے کہا۔

دونوں چپکے ہو گئے۔ ناصر اسی طرح ناز کے پیر کو مضبوطی سے پکڑے لیٹا رہا۔

''اٹھیں کہ نہیں تم؟'' انہوں نے پھر کہا۔ ناصر نے جلدی سے اس کا پیر چھوڑ دیا اور پھر سے کمبل میں منہ دے کر گولا سا بن کر ساکت لیٹ گیا۔

''کمروں میں کتنا حبس ہو رہا ہے بھابھی جان۔'' اماں نے بے چینی سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

''ارے تم لوگ اب سوؤ گے بھی یا نہیں۔'' بابا اپنے کمرے میں زور سے بولے اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف خاموشی چھا گئی جس میں پنکھوں کی گھوں گھوں کی آواز کچھ زیادہ ہی اونچی لگنے لگی۔

اس رات پر سے کئی سال گزر چکے تھے مگر وہ اب بھی ناز کی یاد میں اسی طرح بیٹھی تھی۔ اس سے لگی اور بھی یادیں تھیں جو اکثر سامنے آ کر اسے ماضی کی طرف لے جاتیں اور ہر بار ایک عجیب سے احساس کے ساتھ تنہا چھوڑ کر کسی اور وقت کی طرف نکل جائیں۔ اب اس وقت وہ انگلینڈ میں تھی۔ فیملی پلاننگ کی طرف سے وہ چھ ماہ کی ٹریننگ کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یہاں اس کی رہائش کا بندوبست تھا مگر مہربان اور نور کسی طرح بھی راضی نہیں ہو رہے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ کہیں اور ٹھہرے۔ پھر باجی اور آکا بھائی کے گھرانے بھی قریب تھے، اُن سے ملے بھی تو مدت ہو گئی تھی۔

''ارے اس سے کہو مدت ہوئی مل بیٹھ کر چائے کا ایک کپ ہی پیا ہو یا خاندان کے گڑھے مردے اکھاڑے ہوں۔''
مہربان فون کے پاس آ کر کان پھاڑنے والی آواز میں بولا۔

''مہربان آہستہ بات کرو۔'' نور نے بھی اسی زور و شور سے کہا۔

''تم لوگوں کو ہوا کیا ہے؟ میرے کان کے پردے پھاڑو گے کیا؟'' فون کے اس طرف اسے ہنسی آنے لگی۔

''تو آکا بھائی یہیں قریب ہی ہیں؟''

''تو اور نہیں تو کیا۔'' پھر مہربان کی آواز آئی۔

''او ہو اب تو آنا ہی پڑے گا مگر میں ملنے آؤں گی، رہوں گی نہیں۔''

مگر وہ ورکشاپوں اور سیمیناروں میں یوں الجھی رہی کہ جا ہی نہ سکی۔ اب جب واپسی کے دن قریب تھے تو اس نے ان لوگوں کے پاس ایک دو روز کے لیے جا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی دینے دلانے کے تحفے بھی تو خریدنا تھے جو نور کی مدد سے ہو جائیں گے مگر یہ اس کا خیال ہی تھا۔ نور کو اپنے سوشل ورک سے فرصت نہیں تھی۔ کونسل کے دھندے الگ تھے۔ دوسرے روز ناز نے خود ہی لندن جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مہربان نے سنا تو اسے بھی کوئی کام یاد آ گیا، صرف راستے میں اسے پندرہ بیس منٹ کے لیے ایک جگہ رکنا تھا اور اس کے بعد وہ ناز کے لیے بالکل فارغ اور فری تھا۔ ناز کے خیال میں شاپنگ عورتوں کا محکمہ تھا مگر اس نے کچھ کہا نہیں بس خاموشی سے خود کو وقت کے حوالے کر دیا۔ ویسے بھی وہ مہمان تھی اور موقع اور محل اس کے تابع نہیں تھے۔

طے یہی ہوا تھا کہ ناشتے کے بعد نکل جائیں گے۔ نور نے کھڑے کھڑے چاء کی پیالی ختم کی، توس پر چیز کا ایک سلائس رکھا اور پانی کی بوتل ہاتھ میں لیے، یہ جا وہ جا۔ دس بجے کے قریب ناز اور مہربان بھی لندن کے لیے روانہ ہو گئے۔ پاگلوں کے اسپتال میں مہربان کی ہفتہ وار ڈیوٹی لگتی تھی، وہیں رکنا تھا تھوڑی دیر کے لیے۔ ''یہ لوگ ایسے پاگل نہیں، بس ذرا سے کھسکے ہوئے ہیں۔ تنگ نہیں کرتے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ بس اپنی دنیاؤں میں مگن رہتے ہیں۔'' ہسپتال آیا تو مہربان نے گاڑی عمارت کی ایک سائیڈ میں بنے پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر گیا۔

''زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کا راؤنڈ ہے۔ ایک عورت ہے، نوے برس عمر ہے اس کی۔ وہ کچھ زیادہ ہی بیمار ہے۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔'' اور اسٹیتھو سکوپ گلے میں ڈالا اور سفید کوٹ پہنتا ہوا اندر چلا گیا۔ ناز نے سوچا مہربان کے آنے تک وہ گاڑی سے اتر کر تھوڑا ٹہل کیوں نہ لے۔ پارکنگ لاٹ کو عمارت سے الگ کرتی ہوئی بڑے بڑے سوراخوں والی جالی لگی تھی۔ کسی پاگل سے مڈبھیڑ ہو جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اپنی بات پہ اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ اسی وقت عمارت کا چھوٹا دروازہ کھلا اور دو آدمی اور ایک عورت ایک گارڈ کے ساتھ باہر نکلے۔ گارڈ نے ان لوگوں سے کچھ باتیں کیں، پھر انہیں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ دونوں آدمیوں نے کالے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ایک کی قمیض سفید اور دوسرے کی لال رنگ کے چیک کی تھی۔ لال چیک والے نے ایک بوتل دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے لگا رکھی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر سے یا تو ہنس دیتا یا خوش ہو کر ہوا میں چھلانگ لگا دیتا۔ سفید قمیض والے نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور چاروں طرف سے لاپروا، زمین پر زور زور سے ایڑیاں مارتا، مارچ کر رہا تھا۔ عورت نے نیلے رنگ کا رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں لال رنگ کا پرس، پیروں میں لال ہی رنگ کے جوتے اور سر پر بارش سے بچنے کے لیے پیلے رنگ کی پلاسٹک کی ٹوپی۔

ناز کو اس حلیے پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پتہ نہیں بیچارے اس حال کو کیوں پہنچے...... کیا ہوا ہوگا؟ وہ انہیں کی طرف دیکھنے لگی۔

مہربان کو گئے بیس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ایک آدھ بار اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گاڑی کا سن شیڈ سیدھا کر کے دھوپ سے بچنے کی کوشش کی۔ ایک دو بار پہلو بدلا۔ ایک بے چینی سی رفتہ رفتہ جسم میں رینگنے لگی۔ اچانک چیک قمیض والے کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ لمحے بھر کے لیے وہ ہکا بکا، ساکت، کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر ایک بے معنی سی چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپتا، زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ یوں بیٹھنے سے اس کے دونوں گھٹنے کھلے تو اس نے ان میں اپنا سر ڈال کر انہیں بھینچ لیا اور یوں رونے لگا جیسے کتے سرِ شام بلائیں نازل ہوتے دیکھ کر روتے ہوں۔ ناز سن

رہ گئی..... کون؟؟ اور تیز آنکھوں میں چبھنے والی دھوپ میں بیٹھا روتا وہ شخص..... ایک لڑکا اور بھی تو تھا! کون؟؟ اور ماضی کے پاتال سے تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ناصر اس کے سامنے آ گیا۔ چاند کی مدھم، پھیکی روشنی میں بے بسی سے روتا ہوا ناصر! وہ بھی تو اسی طرح اس کے سامنے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر رو دیا تھا۔

رات میں بارہ وفات کے، عورتوں کے میلاد سے آنے کے بعد، چاند کی روشنی میں، چھت پر بچھے پلنگوں کی سفید چادروں کو دیکھ کر کوثر نے ایک بار پھر جھرجھری لی تھی۔ پھر چاند کی طرف دیکھ کر ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر نصرت سے کہا تھا......

''چلو'' اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے چلی گئی تھی اور ناز چھت پر ناصر کے ساتھ تنہا رہ گئی تھی۔ وہ اپنے پلنگ پر چت لیٹا چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناز اس کے قریب بچھے پلنگ پر لیٹ گئی۔

''تم کیوں میلاد میں نہیں گئے ناصر؟''

''بس نہیں گیا۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ ''آ کا بھائی بولے ناصر منہ بند کرنا نہیں آتا۔ اس کی رال بھی جاتی ہے...... وہ ناصر کو نہیں لے کر جائیں گے۔ شرم آئے گی۔''

ناز زور سے ہنس دی ''آ کا بھائی تو پاگل ہیں بالکل۔ اپنی آنکھوں کو نہیں دیکھتے؟ کیسی گول گول ہیں...... بالکل اُلّو کے جیسی......''

بیس برس کا ناصر اس کی بات پر بچوں کی طرح ہنس دیا۔

''تو پھر تم سارا وقت یہاں اکیلے لیٹے کیا کرتے رہے......''

''پتہ نہیں۔'' ناصر کی ہنسی ایک دم غائب ہو گئی اور وہ پھر سے گم صم ہو گیا مگر پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اپنے پلنگ کی پٹی پر آ گیا اور ناز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

''دیکھو کیسی آواز آ رہی ہے۔''

''وہ کیوں بھلا؟'' ناز نے اس کے دھڑ دھڑ کرتے دل کی آواز سن کر کہا...... ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناصر؟'' وہ پلنگ سے اٹھنے کو ہوئی۔ اس کو ڈر ہوا کہیں ناصر کو دورہ تو نہیں پڑنے والا...... ناصر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تم کو تو کچھ بھی پتہ ہی نہیں۔''

''کیا پتہ نہیں؟'' ناز نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے پھر رکھائی سے کہا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں...... باؤلا کہیں کا!''

''میں کیوں بھا کا بھالا...... تم خود......'' ناصر نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر لگڑ بھگا۔'' ناز نے بے زاری سے کہا۔ نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور اس کو جنت سوجھ رہی تھی۔ ناصر نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ تھوڑی دیر چت لیٹی چاند کی طرف دیکھتی رہی، پھر سو گئی۔

آنکھ کھلی تو چاند دیوار کے اوپر سے ڈھلک کر نیچے جا چکا تھا اور ناصر کا ہاتھ آہستہ آہستہ اس کے سینے پر رینگ رہا تھا۔ وہ ایک چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اور بستر سے اتر کر بھاگنے کو ہوئی تھی کہ ناصر بھی نہ جانے کیسے ایک ہی جست میں پلنگ سے اترا اور اس کو اپنے بے قابو ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے چوم لیا۔ پھر اس کے پیروں میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اسی وقت سیڑھیوں پر تیز تیز چڑھتی ہوئی نانا پہنچ گئیں۔

''کیا ہوا.....کیا ہوا نازو.....؟'' اماں بھی چھت پر پہنچ گئیں۔ ناصر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم نہیں جانتے.....نہیں پتہ۔ ناصر نہیں پتہ۔'' وہ ہکلانے لگا اور ساتھ ہی منہ سے رال بہنے لگی۔ چاند بہت نیچے جا بکا تھا اور چھت پر چھائے دھندلے اندھیرے نے اس کے آنسوؤں کو چھپا لیا تھا۔ پھر وہ جا کر پلنگ پر لیٹا اور چادر میں منہ چھپا کر ساکت ہو گیا۔ وہ نانا سے لپٹی کانپتی رہی۔

''اس پاگل نے کہا کچھ تجھ سے؟'' نانا نے اسے اپنے سے لپٹاتے ہوئے پوچھا۔ ناز نے روتے روتے انکار میں سر ہلا دیا۔

''وہ کیا کہے گا غریب..... اس کو سوتے میں ڈر جانے کی عادت ہے۔ خواہ مخواہ نیند حرام کرتی ہے سب کی.....'' اماں نے کہا۔ پھر نانا اس کو لے کر نیچے چلی گئیں۔

تیسرے روز ناصر ریل کی پٹری پر کچلا پڑا ملا۔ اس کے بیٹھے بٹھائے غائب ہو جانے کے سب عادی تھے۔ کسی نے خیال بھی نہیں کیا، کہاں گیا ہوگا۔ مگر جب آخر کار اطلاع ملی تو بھی کسی کو اس کے مرنے کا غم نہیں ہوا بلکہ شاید ایک ایک نے سکھ کی سانس ہی لی ہوگی۔ جیتا تو بھی کس کام کا تھا۔ نہ ہاتھ پیر سدھے تھے نہ ہی زبان وکلام پر قابو۔ دورہ پڑے تو ہاتھ آئی ہر شے کو توڑ پھوڑ دے اور نارمل ہو تو بھی نارمل نہیں۔ ایسی زندگی سے موت ہی اچھی۔ چودہ برس کی ناز کو مہینے بھر تک کسی نے کچھ نہیں بتایا ورنہ تو وہ ہر تھوڑے دن بعد آ دھمکتا اور اس کے ہاتھ میں کوئی سی بھی کتاب دے کر کہتا ''پڑھو..... میں سنوں گا۔'' کبھی وہ کام کا بہانہ کرتی، کبھی صاف انکار کر دیتی مگر وہ ایک بات نہ سنتا اور اسے کتاب کہیں سے بھی کھول کر سنانی ہی پڑتی۔ ناصر اس کے سامنے بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی دو ہی صفحوں کے بعد ایک آسودہ سانس کے ساتھ کتاب اس کے ہاتھ سے لے لیتا.....''تم کیوں اچھی ہو ناز؟ کوئی اور نہیں.....'' اور کتاب واپس میز پر رکھ کر اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا چلا جاتا۔

ناز نے فیصلہ کیا کہ وہ بڑے چچا کے گھر جا کر ناصر کی خبر لے گی۔ تو ایک روز اسکول سے واپسی پر وہ بڑے چچا کی طرف چلی گئی۔ صحن میں اماں اور نانا بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے جاتے ہی نانا سے ناصر کے بارے میں پوچھا.....

''مر گیا نامراد.....'' انہوں نے بے زاری سے کہا۔

''کیا.....؟'' اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا۔

''کب..... کیا ہوا؟ مجھے کیوں نہیں بتایا کسی نے.....؟ کچھ ہوا ہی نہیں..... کیوں؟''

''ہٹو بی بی..... کیوں شور مچا رہی ہو۔ زندہ تھا تو بھی کس کام کا تھا؟'' نانا نے الجھ کر کہا۔ وہ اسے کبھی ڈانٹتی نہیں تھیں۔ اب کیا ہوا.....؟

''کیا لے رہا تھا وہ کسی کا..... کسی نے بھی اسے کسی قابل نہیں سمجھا؟''

''کیا لے رہا تھا وہ کسی کا؟'' نانا اب واقعی غصے میں آ گئیں۔ ''تم ساری کی ساری چچا تایا کی بیٹیاں یونہی بیٹھی رہ جاتیں..... تم میں سے کسی ایک کی بھی شادی نہیں ہوتی تھی..... یہ میں لکھ کے دیتی ہوں۔ سب طعنہ دیتے تھے کہ ان کے خاندان میں پاگل پیدا ہوتے ہیں..... شکر کرو خدا نے خود ہی مشکل آسان کر دی۔''

''تو پھر پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مار دیا..... اتنے سال بھی کیوں رہنے دیا.....؟''

''زیادہ بک بک مت کر..... بہت بدزبان ہو گئی ہے تو.....'' اماں نے پہلی بار زبان کھولی۔ اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ صرف آنسو پونچھتی چھت پر چلی گئی۔ شام کو اماں گھر جانے کے لیے اٹھیں تو کوثر کو بھیجا اسے بلانے کے لیے۔ کوثر نے جگایا تو وہ

پر چھتی میں ناصر کے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی روتے روتے سو چکی تھی۔

اُسے پھر ایک جھٹکا لگا۔ جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔ بہت دیر سے سو رہی تھی۔ اس نے لڑکے کی طرف دیکھا جس کو وہ نرس سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں اس کی بوتل تھی اور دوسرا لڑکے کے قریب اکڑوں بیٹھا، گھٹنوں میں دبا، اس کا سر اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا آدمی بار بار بوتل اس کے پاس لاتا اور پینے کے لیے کہتا۔ جیسے ہی بوتل لڑکے کے ہاتھ میں آئی، وہ بوتل کو سینے سے لگا کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہنستا ہوا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ دونوں لڑکے کو لے کر جانے لگے تو دوسرا خود ہی ان کے پیچھے چل دیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر نرس نے مڑ کر عورت کی طرف دیکھا اور زور سے کہا...... ''ڈولی...... چلو ہم بھی اندر چلتے ہیں۔'' عورت اسی طرح مارچنگ کرتی رہی۔ نرس نے ایک بار پھر چلنے کے لیے کہا تو عورت نے مڑ کر دیکھا......

''نو......نو، آئی ایم گوئنگ ٹو دی سکول ٹو میٹ مائی لٹل گرل۔'' (I am going to the school to meet my little girl.) اور پھر سے پرس جھلاتی تیز تیز چلنے لگی۔

اسی وقت مہربان بھی واپس آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ایک نظر اس نے ناز کے سفید چہرے کی طرف دیکھا'' کیا ہوا ناز؟''

''کچھ نہیں۔'' ناز نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ تمہاری مریضہ کا کیا ہوا؟'' ناز اب بھی باہر ہی دیکھ رہی تھی۔

''کچھ کہنا مشکل ہے۔ نوے برس کی عمر کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے دس برس اور جی جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ دس دن بھی نہ رہے۔ جب سے آیا ہوں، یہی دیکھ رہا ہوں۔ کوئی صحیح دماغ ہو تو بات میں وزن آ جاتا ہے۔ پاگلوں کا تو یہ ہے کہ کچھ بتائیں بھی تو مدد نہیں ملتی۔''

ناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی تھی جب کوثر برستی چاندنی میں بستروں کی سفید چادروں اور موتیے کی مہک سے خوفزدہ ہو کر پر چھتی پر بھاگ گئی تھی اور باجی اپنے قوس قزح سراپا پر پھولوں کی بارش برسا کر خود ہی ہنستی مسکراتی جانے کیا سوچتی تھیں۔ برستی بارش میں پیاسی زمین سے اٹھتی باس کے جیسی فاروق کی پیاسی آواز اور رات کے اندھیرے میں دیوار کے قریب، اس کی تڑپتی بانہیں...... خود وہ بھی تو فاروق کی ہری آنکھوں سے ڈر کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھی...... پھر ہم میں سے کون ناصر کو یا ان کو اپنے سے کمتر اور کم عقل کہنے میں حق بجانب ہے؟ حدِ فاصل کا فیصلہ کب ہوتا ہے!!

مہربان نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکال کر سڑک کی طرف موڑی۔

''چپ کیوں ہو ناز؟''

''پتہ نہیں......''

''ان پاگلوں سے ڈر گئیں؟ بے ضرر ہیں بے چارے۔''

ناز نے جواب نہیں دیا۔

''ابھی میں جس مریضہ کو دیکھنے گیا تھا، وہ بھی کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی جب یہاں آئی تھی۔ اس کا ایک تھوڑا ابنارمل کزن تھا۔ اسی کے ساتھ کھیل کر بڑی ہوئی تھی مگر اس پاگل نے اس کو ریپ کیا اور پھر کھڑکی سے کود کر جان دے دی۔ یہ عورت،

اتنے برس ہو گئے ابھی......"

"مہربان بس کرو۔ میں نہیں سننا چاہتی یہ سب اور تم مجھے یہاں لے کر بھی کیوں آئے؟" ناز نے ایک دم مہربان کی طرف مڑتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"یہاں کیوں لے کر آیا؟ کیا بات کرتی ہو ناز...... تمہیں یاد نہیں تم شاپنگ کرنے جا رہی ہو......ان نٹ کیسوں کا اثر تم پر بھی ہو گیا ہے شاید......"

"تم ان کو نٹ کیس کہتے ہو؟ میں بہت سے فرزانوں کو جانتی ہوں جو ان سے بڑھ کر بیمار ہیں۔ ذہنی، گھناؤنی بیماریاں ہیں جن کو......"

"اچھا......وہ کون بھئی؟"

"ناصر زندہ ہوتا تو شاید وہ بہتر طور پر بتاتا۔"

"اوہ کم آن......اب یہ ناصر کیوں آ گیا یہاں بھی......اس کے ساتھ کوئی خاص تعلق تھا تمہارا؟" مہربان ہنسنے لگا۔

"ظاہر ہے......تم ہی کہہ سکتے ہو ایسی بات۔ رہی بات تعلق کی تو ہاں...... تعلق تو تھا، کزن تھا وہ ہمارا......تمہارا بھی اور میرا بھی مگر تم اسے دھتکارتے تھے اور میں اس کی باتیں سنتی تھی۔ مثلاً کون کیا کرتا ہے......!"

مہربان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "مجھے نہیں معلوم تم کیا کہنا چاہ رہی ہو ناز مگر ایک بات یاد رکھو۔ صحیح دماغی کا ثابت ہونا یا صحیح دماغ ہونا ثابت کرنے کے کوئی ایسے سکہ بند اصول نہیں ہوتے......تم بھی سوچ سمجھ کر بات کیا کرو۔ فیملی ہسٹری ہے ہماری۔"

وہ چپ رہی۔

"اور یہ بھی یاد رکھو کہ لوگ بغیر کسی وجہ کے بیٹھے بٹھائے پاگل نہیں ہو جاتے......اگر کوئی فیملی ہسٹری نہ ہو تو......"

وہ پھر بھی چپ رہی۔

کار میں خاموشی چھا گئی۔

"او کے۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ موڈ مت خراب کرو ابھی تو شاپنگ شروع بھی نہیں ہوئی۔" تھوڑی دیر کے بعد مہربان نے ماحول بدلنے کی کوشش کی۔

ناز نے کوئی جواب نہیں دیا۔

خاموشی۔

تھوڑی دیر کے بعد ناز نے مہربان کی طرف دیکھا۔

"تو تمہیں یاد ہے......"

"کیا یاد ہے؟"

"وہی......ناصر......تمہارا میرا کزن......تایا گل حسن کا بیٹا۔"

"ہاں بھئی ہاں......لکھوا لو مجھ سے۔ یاد ہے، میں سمجھا تھا بات ختم ہو گئی مگر تم سالے کو پھر لے آئی ہو۔ دفن رہنے دو اسے......مت کھود کھود کر نکالو۔" مہربان نے بیزاری سے کہا۔

"ان لوگوں کو دیکھ کر اس کا خیال آیا تھا......"

''نٹ کیس جو تھا۔ یاد تو آنا ہی تھا۔''

''خیر ایسی بھی بات نہیں تھی۔ صرف بولنے میں مشکل ہوتی تھی اسے۔ سوچ سمجھ صحیح تھی اس کی۔ یہاں ہوتا تو ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہا ہوتا۔ کوئی راستہ ہوتا اس کے پاس۔ زندہ رہنے کی خواہش زندہ ہوتی......'' ناز نے آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے بات کی۔

''مگر وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔ اس لیے جانے دو اس کے ذکر کو۔''

''مگر......''

''کوئی اور بات کرو ناز۔'' اب کے مہربان کی آواز میں تیزی آ گئی۔

''مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔ جب بہت دن نظر نہیں آیا تو میں نے نانا سے اس کا پوچھا، کہنے لگیں مر گیا نامراد۔ جیتا بھی تو کس کام کا تھا۔'' ناز نے آہستہ آہستہ بات مکمل کی۔

''تو کیا غلط کہا انہوں نے؟ اور یہ جو تمہارا خیال ہے کہ اسے عقل اور سمجھ تھی تو یہ بالکل غلط خیال ہے تمہارا۔'' مہربان نے ناز کی طرف دیکھا۔

''نانا نے ہم سب سے کہا تھا اسے ڈھونڈنے کے لیے۔''

''پھر؟''

''پھر کیا...... دیکھا تو ریل کی پٹڑی پر بیٹھا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو یہاں بیٹھے ہوئے...... تو کہتا کیا ہے...... غلطی ہو گئی ہے...... بہت بڑی...... اللہ بھی ناراض ہو گیا ہے......''

''پھر؟'' ناز کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''میں نے کہا تمہیں کیسے پتہ اللہ ناراض ہو گیا ہے تو کہنے لگا ناز کو جو ناراض کر دیا ہے، بس پھر اللہ بھی ناراض ہو گیا اور جب میں نے کہا ناراض ناز کو کیسے کیا؟ وہ تو سہیلی ہے تمہاری تو منہ پھیر کے کہنے لگا اس کا جواب نہیں ہے...... پاگل کہیں کا!! ویسے اب تم بتا دو وجہ کیا تھی ناراض ہونے کی......''

ناز چپ رہی۔ یاد تیز تیز سیڑھیاں اترتی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی تھی جب ناصر اس کے پیروں میں بیٹھ کر رو دیا تھا۔ چھت پر چھائے اندھیرے میں وہ نانا کے سینے سے لگی کانپ رہی تھی۔ اماں نانا کو بتا رہی تھیں کہ ناز کو نیند میں ڈر جانے کی عادت ہے......

''ہاں بھئی...... کیوں ناراض تھیں......؟''

''نوراں دھوبن کی بیٹی رقیہ کی کوئی بات تھی۔ اب یاد نہیں ہے اور جب وہ بتا رہا تھا تو مجھے نیند آ رہی تھی...... خیر تمہیں تو وہ یاد ہو گی......''

''نہیں......'' مہربان کے لہجے سے چونچال پن رخصت ہو گیا۔

کار میں ایک بار پھر خاموشی ہو گئی۔

''تو تم ناصر کو وہیں چھوڑ آئے......'' کچھ دیر بعد ناز نے پوچھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے ناز؟ کبھی ناصر، کبھی نوراں، کبھی اس کی بیٹی...... اور کوئی بات نہیں تمہارے پاس؟'' مہربان کی آواز میں اب غصہ تھا۔

''ایسی کیا بات ہے جس پر ناراض ہو رہے ہو۔ میں نے تو صرف ناصر کا پوچھا ہے۔ نوراں یا اس کی بیٹی کے بارے میں تو کچھ کہا ہی نہیں۔ ناصر تو کزن تھا ہمارا......''

''ہاں تھا کزن اچھا ہوا میں نے اسے ریل کے سامنے کود جانے کے لیے کہہ دیا...... جان چھوٹی سب کی۔ پتہ نہیں کیا کیا بکواس کرتا پھرتا تھا......''

ناز کے سینے میں اس کی سانس رُک گئی۔ پھر رفتہ رفتہ کہی ان کہی باتوں کی پرتیں کھلنے لگیں اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''تو یہ بات تھی۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور کار سے باہر دیکھنے لگی۔

اب وہ مارٹن آرچ پہنچ چکے تھے اور ٹریفک سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم چپ کیوں ہو۔ شاپنگ کا ارادہ گول ہو گیا کیا؟'' مہربان نے ماحول کی سنگینی کو ختم کرنے کے لیے ایک بار پھر چونچال بننے کی کوشش کی۔

''میں تمہیں آکسفورڈ اسٹریٹ پر اتار دوں گا۔ اب تم بتاؤ میں کار پارکنگ میں چھوڑ کر کہاں ملوں تم سے؟''

ناز نے آہستہ آہستہ مہربان کی طرف رخ پھیرا۔ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم مجھے کہیں بھی اتار دو...... اور پھر اس کے بعد میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔''

''ہیں؟ یہ کیا بکواس ہے بھئی؟'' مہربان نے یوں کہا جیسے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

''تم نے ٹھیک سنا ہے۔ بات بہت پرانی ہے اور اس کا کہنا نہ کہنا اب ویسا ہی نہیں رہا۔ کچھ بھی ہو گا نہیں مگر پھر بھی ممکن ہے میں کسی سے کہہ ہی دوں۔ دو گھناؤنے کام...... بلکہ دو جیتے...... ہیں تمہارے نام پر......''

''مجھے لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔'' مہربان نے دانت دبا کر کہا۔

''ناصر یا یہ لوگ جنہیں تم دیکھنے گئے تھے۔ بے ضرر ہوتے ہیں۔ کسی کو بھی جانتے بوجھتے نقصان نہیں پہنچاتے مگر دوسری طرف تم اور تمہارے جیسے لوگ ......'' ناز نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

جوں کی چال چلتی ٹریفک رک گئی۔ سامنے لال بتی نظر آ رہی تھی۔ مہربان نے گاڑی روکی تو ناز گاڑی سے اتر گئی اور سگنل کے انتظار میں رکی گاڑیوں کے بیچ راستہ بناتی سڑک کے دوسری طرف چلی گئی۔

مہربان نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا...... ''یو تو واٹ ناز...... تم بھی کسی نٹ کیس سے کم نہیں۔ ایک وہ تھا الو کا پٹھا ناصر اور اب ایک تم!!''

مگر ناز نے گاڑیوں کے شور میں سنا نہیں اور اگر سنا تو جواب کے قابل نہیں سمجھا۔

آدھی رات کی بارش یا مولود کی آدھی رات گئے ناصر کا اس کے پیروں میں بیٹھ کر بے بسی کے آنسو بہانا اس کی یادوں کی تصویریں تھیں جو شاید کبھی دھندلی تو ہو جائیں مگر مٹیں گی نہیں۔ مگر وہ احساس جرم جس نے زندگی بھر اس کا تعاقب کیا تھا، اس کے کندھوں سے اتر گیا تھا۔

ناز سڑک کی دوسری طرف پہنچ چکی تھی جب بتی ہری ہوئی۔ گاڑیوں کے اس ریلے میں اس نے مہربان کی گاڑی کو تیزی سے آگے جاتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ناز کو یوں لگا جیسے اس نے کسی بوجھ کو گرانے کی کوشش کی ہو یا کسی بات سے بھاگنے کی!

..........☆..........

گمشدہ شہر کا نوحہ

پروین عاطف

باری سال چھاؤنی کے دفتر میں رجمنٹ کا کمانڈنگ افسر کرنل سعد اللہ زخمی گھوڑے کی طرح سر بہوڑائے اپنی کرسی میں یوں گم سُم بیٹھا تھا کہ اُسے یاد ہی نہ رہا کہ قاسم کمپنی کی تباہی کی تفصیلی رپورٹ لے کر آنے والا اس کا وفادار صوبیدار یعقوب اٹینشن پوزیشن میں کب سے کھڑا ہے۔

اپنی بہترین فوجی تربیت کے باوجود، مغربی پاکستان سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش مند باغی گوریلا فوج نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ پچھلی رات قاسم کمپنی تو اس بارڈر کی طرف رواں دواں تھی جہاں سے بھارت آنے جانے میں لوکل آبادی کو بہت کم رکاوٹ تھی اور گوریلا جنگ کی جدید تربیت انہیں صرف بھارت ہی دے رہا تھا۔ بارڈر کے اس حصے کو سیل کرنا از حد ضروری تھا لیکن پچھلی رات قاسم کمپنی، گھروں کی لوکل آبادی کی چھتوں سے برسائے جانے والے ہینڈ گرنیڈوں کے طوفان میں نیست و نابود کر دی گئی تھی۔ کرنل سعد اللہ آدھی رات سے اپنے دفتر میں مٹی کی ڈھیری بنا بیٹھا تھا۔ ''باری سال کی آدھی جیلیں تو مکتی باہنی کے نوجوانوں سے بھر دی تھیں لیکن رات کی تاریکی اترتے ہی مکتی باہنی کے سینکڑوں مزید نوجوان بچھوؤں کی طرح ڈنک کھڑے کر کے زمین کے کونوں کھدروں سے باہر نکلنا شروع ہو جاتے تھے۔ کیا وہ واقعی غدار تھے یا طاقت کے نشے میں مغربی پاکستان نے ان کی کمر میں جبر کا کوئی ایسا خنجر گھونپ دیا تھا کہ اب درد سے بلبلاتے، وہ ہم سے دور اور ہمارے دشمنوں کے پاس بھاگنا چاہتے ہیں، آزادی کی کوئی شندہ شناخت مانگتے۔'' ...... کرنل نے اپنے ذہن میں بھنبھناتے واہموں کو جھٹک دیا...... ''نہیں ہم سب ''ایک پاکستان'' ہیں، بنگال ہمارا بھائی ہے۔ بھائیوں میں ناراضگی تو ہو سکتی ہے، دشمنی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھارتی سازش ہے، میری قاسم کمپنی کی فنا کے ذمہ دار بھارتی گوریلے ہیں، باقی بکاؤ غدار...... لالچی۔''

''چھوٹا کمپنی کمانڈر گوندل چھ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ جب میں لاہور اس کے گھر اس کا بچا کھچا سامان لے کر اس کی والدہ جو میری بیوی کی کزن ہے، کے پاس جاؤں گا تو کیا کہرام نہیں مچے گا؟ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ آخر دم تک کہتی تھی ''بھائی میرا بیٹا مت لے جاؤ۔ میرا دل ہولتا ہے۔'' میری بیوی نسیم نے بھی کہا تھا'' آپا زرینہ کا ایک ہی بیٹا ہے۔ یہ سات سمندر پار کی جنگ ہے۔ وہاں نہ کوئی آئے نہ جائے۔ اسے کسی بہانے یہیں ہی چھوڑ جائیں۔ بہت مہنگا پتر ہے آپا زرینہ کا۔'' میری ماں نے غصے سے کہا تھا، ''چپ کر پتر نسیم، ہمارے فوجی تو ابھی تک ہم پر وہی پرانے طرز کا گورا راج چلاتے ہیں۔ ان کی گردنوں میں بھی وہی فولادی سریا ہے جو گورے ڈی سی کی گردن میں ہوتا تھا۔'' اور اب میری کزن کا مہنگا بیٹا۔ گوندل سچ مچ ہی

سیاست میں پھنسے فوجی حکمرانوں کی پالیسی کی بھینٹ چڑھ گیا ہے تو اب میں اپنی بیوی اور ماں کو اپنی صورت کیسے دکھاؤں گا۔

کرنل سعد اللہ کی سوچیں اس کے وسوسے اس کے دماغ میں زردیلی بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ رہ رہ کر ڈنک مار رہے تھے۔

''سر چائے...... آپ نے منگائی تھی۔'' اردلی نے چائے کا ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اردلی کی آواز پر سعد اللہ چونکا تو اس کی نگاہ اپنے وفادار صوبیدار یعقوب پر پڑی جو جانے کب سے اس کے دفتر میں بیٹھے اکڑائے ''اٹینشن'' کی حالت میں کھڑا تھا۔

کرنل نے دیکھتے ہی اسے سٹینڈ ایٹ ایز (Stand at ease) کا حکم دیا اور لمبا سا سانس لے کر اپنے سینے کی گھٹن کم کرنے کی کوشش کی۔ دریا سے قریب ہونے کی وجہ سے باری سال کا موسم سال کے آٹھ مہینے چپچپا سا رہتا تھا لیکن قاسم کمپنی پر حملے کی خبر کے بعد بارش نے اس تندی سے برسنا شروع کیا کہ شہیدوں کا کفن دفن مشکل ہو گیا۔ صوبیدار یعقوب حملے کے دوران کسی شہید سپاہی کی نعش تلے دب گیا تھا اور مکتی باہنی کے لوگ اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ مکمل سناٹا چھا جانے کے بعد وہ ہزیمت خوردہ بھاگ کر بیرکوں میں واپس پہنچا تھا اور گھٹنوں میں سر دیے کر روتا رہا تھا۔

''کیا خبر ہے جوان، چھاپہ ماروں کی کوئی گرفتاری ہوئی؟''

''سر رات بھر عبدالصمد کے گھر کا پہرا دیا۔ پورے محلے کے گھروں کی تلاشیاں لیں سر! گھروں میں کہیں کوئی مرد موجود نہیں ہے۔ صرف عورتیں اور بچے ہیں جو خوفزدہ ہیں اور ہمیں دیکھتے ہی زور زور سے رونا شروع کر دیتے ہیں۔ ہاتھ جوڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم کچھ نہیں جانتے۔''

''باسٹرڈز...... بھارتی ایجنٹ ہیں سب کے سب۔ عبدالصمد کی تصویریں ہمارے پاس موجود ہیں۔ کہنے کو مسلمان ہے بدبخت وہ۔ تفصیلی رپورٹ کہاں ہے جوان غداروں کی انڈیا کے گوریلا کیمپ میں تربیت حاصل کرنے کی خبر سن کر ہم نے تصاویر کے ذریعے تیار کی تھی۔ فٹ فٹ لمبی داڑھی اور ماتھے پہ محراب۔ منافق ہیں یہ سب لوگ۔ نماز پڑھو اور ہندو سے گوریلا جنگ کی تربیت حاصل کرو ہونہہ!'' کرنل غصے سے غرایا۔ مایوسی اور بے بسی نے پورا ماحول مضمحل کر دیا تھا۔

''شہداء کی صرف لاشیں ملی ہیں وہ بھی کٹی پھٹی۔ ناقابل شناخت۔ بہت ظلم ہوا جناب۔ رجمنٹ تباہ ہو گئی سر۔''

''میرے بھانجے لانس نائیک اسماعیل کا صرف نچلا دھڑ ملا ہے۔'' یعقوب نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''سیڈ ویری سیڈ۔ ہماری انٹیلی جنس کی ناکامی ہے جوان، سراسر ناکامی۔ اسماعیل ایک نڈر سپاہی تھا۔ ایک ٹائیگر تھا۔ پلٹن کا بھاری نقصان ہوا ہے۔''

''لانس نائیک اسماعیل میری بہن کا بیٹا تھا سر۔ میرا سگا بھانجا۔ بچپن سے شہادت کا شوقین۔ شادی کو صرف چھ مہینے گزرے تھے۔ اوپر کا دھڑ کہیں دکھائی نہیں دیا سر۔ پر میں اس کے قد بت کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں بڑا ہوا تھا۔ عبدالصمد اور قدوس تو شہیدوں کے سر لے جاتے ہیں ہندو جرنیلوں کے پاس۔ اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے۔'' صوبیدار کی منقبض فوجی آواز میں ارتعاش تھا اور اس کی سپاٹ آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو چھلک کر اس کی کلف لگی وردی پر گر پڑے تھے۔ ''اس کی بیوی بھی میری ماموں زاد بہن ہے۔ وطن واپس پہنچنے کی ہمت نہیں پڑتی جناب۔ ہم بھی ادھر ہی ختم ہو جائیں تو اچھا ہے۔ قوم کو کیا منہ دکھائے گا۔''

ایک لمحے کے لیے لانس نائیک اسماعیل اور لیفٹیننٹ گوندل کی عبرت ناک اموات نے کرنل کو دہلا دیا تھا۔ پھر جذبات سے عاری فوج کی تربیت اس کے آڑے آ گئی اور اس نے اپنے وفادار صوبیدار یعقوب کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔ ''تم تو خود جانتے ہو شیرا، سپاہی کی زندگی کا اولین مقصد وطن کی حفاظت ہے اور اس کا عظیم ترین انعام شہادت۔ شہید جو کبھی نہیں مرتا۔ ہمیشہ زندہ رہتا ہے خدا کے مطابق۔ دیکھنا جن ظالموں نے ہماری کمپنی کے شیروں کی جانیں لی ہیں...... کتے کی موت مارے جائیں گے ہمارے ہاتھوں۔ ان کے خاندان بھی فنا کر دیے جائیں گے۔ بس ایک بار ان ظالموں کا حدود اربعہ ہاتھ لگ جائے۔ چھپے کہاں ہیں اور نکلتے کیسے ہیں۔ ہمارے لیے تو یہ شہر بھی کوئی اور دنیا کی طرح ہے۔ نہ ہی ان کی زبان کی سمجھ آتی ہے۔'' کرنل نے بے بسی سے کہا۔

سعد اللہ کی پلٹن کو باری سال آئے ہوئے صرف ایک مہینہ ہوا تھا مغربی پاکستان میں، مشرقی پاکستان کے صحیح حالات کا فوج سمیت کسی کو کوئی اندازہ نہ تھا۔

''یہ عبدالصمد، عبدالقدوس اور ان کے باقی ساتھی مکتی باہنی کے بڑے بڑے لیڈران میں گنے جاتے ہیں۔ سر پتا ہے! قدوس کا والد عبدالباسط ۱۹۶۵ء کی پاک و ہند جنگ میں شہید ہوا تھا۔ مرنے کے بعد ستارہ جرأت کا حقدار مانا گیا تھا سر! اس کے محلے کے ایک بزرگ نے بتایا تھا مجھے کہ عبدالقدوس کے دادا عبدالکریم نے بھی جدوجہد آزادی کے دوران انگریز کی دو برس کی جیل کاٹی تھی۔ قائداعظم کا جیالہ تھا۔ زندگی پاکستان کے نام پر قربان کرتا تھا وہ شخص پر بعد از پاکستان ان کی اولاد کا دماغ پھر گیا۔ سب ہندو کافر کی کرتوت ہے جناب! اب تو یہ لوگ ہندوستانی جاسوس ایجنسی کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کے دشمن۔ وقت تبدیل ہو گئے۔ اب ان کو بابا جناح سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔''

''اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ میجر صاحب نے رپورٹ دیکھ کر کیا کہا پوری تفتیش کے بارے میں۔''

''خوش ہیں سر! میرے کام سے خوش ہیں، قدوس اور عبدالصمد تو نہیں ملے۔ ہم اس کے چھوٹے بھائی عبدالمونس کو اٹھا کر لے آئے۔ آپ کے اس معمولی سپاہی کے دو تھپڑ پڑے تو وہ بول اٹھا کہ عبدالصمد، قدوس اور باقی گوریلا جتھے کارروائیاں کر کے کلکتے کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ انڈیا انہیں پناہ دیتا ہے۔ جنگل، دریا سبھی راستوں سے بھاگ نکلتے ہیں راتوں رات۔''

''بارڈروں پہ پٹرول بڑھاؤ اب۔ کیپٹن سلیمان رہیں گے تمہارے انچارج۔ ہر طرف نائٹ واچ بڑھا دو۔ باقی خبر کیا ہے؟''

''شہیدوں کی بچی کھچی لاشیں جامع مسجد میں پہنچا دی گئی ہیں۔ میجر صاحب کا حکم ہے کہ نماز جنازہ عصر کی نماز کے ساتھ ادا کی جائے اور شام کی اذان کے ساتھ جنازے قبرستان روانہ کر دیے جائیں۔''

''بریگیڈیئر صاحب کو اطلاع کر دو۔ دکھ تو یہ ہے کہ واردات کے بعد مکتی باہنی کا کوئی گوریلا گرفتار نہیں ہوا۔ ہماری پروموشن کا بورڈ نزدیک ہے۔ سب کچھ کھٹائی میں پڑ گیا۔ کمپنی کی تباہی کے بعد پوری اے سی آر الٹی ہو گئی۔ جرنیل کی امید پہ پورا نہیں اتر سکے۔''

''نہیں سر۔'' صوبیدار نے تسلی دیتے ہوئے کہا ''آپ نے تو مکتی باہنی کے چھکے چھڑا دیے چھکے۔ جناب جب سے آپ آئے ہیں یہاں۔ باری سال بہتر ہو گیا ہے۔ ترقی انشاءاللہ ملے گی۔''

''مائی فٹ! بورڈ میں جنرل جمشید بیٹھتا ہے آرٹلری کا۔ انفنٹری (Infantry) والوں کو ویسے ہی ماتری کچھ سمجھتا

ہے۔ کچھ کرنا ہوگا خان۔ عبدالصمد، قدوس اور سلیم اللہ کے کٹے ہوئے سر بھی مل جائیں تو پلٹن کی عزت بچ جاتی ہے۔'' کرنل سعداللہ نے بے چینی سے دفتر میں آگے پیچھے چکر لگاتے ہوئے کہا۔

''وطن کے لیے جان حاضر ہے سر! اپنے شہیدوں کی عزت بحال کریں گے انشاءاللہ۔ بھارت بھی یاد کرے گا کہاں ہاتھ ڈال دیا۔ لوہے کے چنے چبوا دیں گے ہم انہیں۔''

جس مارے باری سال میں مشرقی پاکستان کے باقی شہروں کی طرح چپ کی ردا چھائی تھی۔ زمین بظاہر کوے میں تھی۔ سطح کے نیچے برانگیختہ لاوے کا مکمل اندازہ بھارت کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ دنیا چہ میگوئیاں کرتی تھی کہ ایک ہی صدی کے اندر اندر بنگالیوں کو آزادی کی دوسری جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔ اپنے طاقتور جرنیلوں کی ذاتی مفادات پر مبنی پالیسیوں کو الہامی جان کر ان پر عمل کرنا ہی کرنل سعداللہ، کیپٹن سندھیالہ اور میجر چیمہ کی حب الوطنی کا متن تھا۔ ہوٹلوں، دفتروں، کارخانوں، کھیتوں یا گھروں کے بند دروازوں کے پیچھے عزت اور وقار سے جینے کی خواہش مند جنتا، کن تجربات سے گزر رہی تھی، خودمختاری کا حق کیوں مانگ رہی تھی۔ جرنیلوں کو سب کچھ مان لینے کا فوجی کلچر جونیئرز کو یہ سب سوچنے سمجھنے کی کبھی اجازت نہیں دیتا تھا۔ نہ ہی عام شہری کو۔ جب کہ جرنیل ذاتی اقتدار اور مفاد کی پالیسیوں پر فولادی پردہ ڈال کر چلتے تھے۔ سپاہی لاعلم تھا۔ سیاستدانوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

''جانتے ہو صوبیدار..... ہم وہ فوج ہیں جس کے بل بوتے پر انگریز نے ایشیا میں جنگ عظیم لڑی۔ برما، انڈونیشیا، جاپان۔ انگریز کہتا تھا اس خطے جیسا اندر سپاہی انڈیا کے کسی دوسرے علاقے میں پیدا نہیں ہوا۔'' کرنل نے اپنے حوصلے قائم رکھنے کے لیے کہا۔

''یس سر!.....''

....

''تمہارے لیے آدھی رات کو ہمارا آخری حکم کیا تھا جوان؟''

''حاضر ہونے سے پہلے حکم پورا کر دیا گیا تھا سر!''

''تینوں لڑکیاں بند ہیں۔ ہتھکڑیوں میں لائے ہیں ہم ان کو اپنے ساتھ۔ عبدالصمد، عبدالقدوس اور سلیم اللہ کی بیویوں کو قید میں رکھا ہے۔ یہی بتانے حاضر ہوا ہوں۔ تیز لڑکیاں ہیں سر! منہ پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں ہم نے۔ بہت زبان چلاتی ہیں، گالی بھی دیتی ہیں فوج کو۔''

''عبدالصمد کی بیوی اردو بولتی ہے۔ کہتی ہے تم ہمارا دشمن ہے، چور ہے۔ فوج غدار ہے، ہم تم سب کو ابوجہل کی موت ماریں گے۔ تو یہ جناب ہماری طرف ایسا بالی بی کوئی نہیں ہے۔''

''تو پھر تم سب جوان کیا کرو گے ان تیز لڑکیوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے یا عورتوں کی طرح سر ڈال کر سنتے رہو گے۔''

''ختم کر دیتے ہیں سر، زبانیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔ آپ اجازت دیں۔''

''اس سے ملک کو کوئی فائدہ ہوگا؟ بندوبست ایسا ہونا چاہیے جس سے وطن کو فائدہ ہو۔ سٹوپڈ۔''

صوبیدار خاموشی سے اپنے افسر کو دیکھتا رہا۔

''ان کی نسل بدل دو تا کہ آئندہ یہ اپنے جیسا کوئی وطن دشمن انسان کبھی پیدا نہ کریں بلکہ تمہارے جیسے وفاداروں کو جنم دیں۔ بات سمجھ رہے ہو؟؟''

''یس سر! تھینک یو جناب۔ یہ ڈیوٹی سر آنکھوں پر جناب۔''

''ڈیوٹی ڈیوٹی ہے اور اسے ایمانداری سے ادا کرنا چاہیے۔ تھینک یو کی بات ابھی قبل از وقت ہے۔''

''لانس نائیک شیر دل بھی جانثار ہے۔ تم جانتے ہو بہادر سپاہی کو دشمن کی ہر چیز پر مکمل اختیار ہوتا ہے۔ اب ان پر بھی ہے۔''

''حکم کی تعمیل ہوگی سر!'' یعقوب نے واپس اٹینشن پوزیشن میں جاتے ہوئے کہا۔

''ہماری کمپنی کی تباہی کی کچھ قیمت تو اس عبدالصمد کو ادا کرنا ہوگی۔'' کرنل غصے میں پھنکارا۔

''ایک ضروری بات جناب۔ ہماری شادی کو سات برس ہو گئے سر! خدا نے ہماری نسل کو آگے بڑھانے کا کوئی رحمت نہیں برسایا ابھی تک۔ ماں تو ہماری دوسری شادی پر زور دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے عورت بانجھ ہو تو مرد کو فوراً دوسری شادی کر لینی چاہیے۔''

''کبھی ڈاکٹر کو دکھایا اپنی بیوی کو؟''

''دو تین بار ڈاکٹروں کو دکھایا ہے سر۔ سی ایم ایچ میں کرنل ڈاکٹر صاحبہ نے آدھا گھنٹہ لگا کر معائنہ کیا۔ سب حالات دیکھے۔ کہتی ہیں زبیدہ میں کوئی خرابی نہیں۔ ایک دم ٹھیک ہے۔ پھر عجیب بات بولا ہم سے ڈاکٹر صاحبہ نے۔ کہتی ہے بیوی بالکل ٹھیک ہے، تم خود کا معائنہ کراؤ۔ لیکن سر میری بیوی تو مجھ سے مطمئن ہے۔''

''تم تسلی رکھو۔ سب ٹھیک رہے گا۔ اب جاؤ۔''

....

محدود انٹیلیکٹ اور گلوبل تاریخ پہ گرفت نہ ہونے کے باوجود کرنل سعداللہ تنہا بیٹھا حالات کی پیچیدگی، مایوسی اور پس منظر کا تت نکالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اُسے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں سوجھ رہا تھا۔

بالآخر ایک لاکھ فوجی شکست کھانے کے بعد بھارتی جیلوں میں بھر دیئے گئے۔ تین برس کے طویل عرصے میں یہاں ملک میں منتظر فوجی خاندانوں نے زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینے کا چلن سیکھ لیا تھا۔ وہ بھی جن کے پیاروں کو جرنیلوں نے شہیدوں کے یادگار ستونوں پر کندہ کر دیا تھا اور وہ بھی جو بے یقینی میں تھے۔ آخر شکست خوردہ فوجی گھروں کو لوٹ آئے۔ وقت رُکا نہیں، چلتا ہی رہا۔

....

۵ بجے شام لاہور میں ریٹائرڈ کرنل سعد نے اپنی پراپرٹی ڈیلنگ کی دکان بند کر کے گھر جانے کا سوچا ہی تھا کہ ریٹائرڈ صوبیدار یعقوب اپنے دو سالہ بیٹے کو سائیکل پر بٹھا کر کرنل سے ملنے آ گیا۔ ملے دلے کرتے شلوار میں ملبوس یعقوب نے آتے ہی کرنل کو فوجی انداز میں سیلوٹ مارا۔ فوج کی ثقافت کا طویل عرصہ حصہ بننے کے بعد سول میں آ جانے کے باوجود بھی ان کی چال ڈھال، ڈکشن، رویے فوجی ہی رہتے ہیں۔

''ہیلو۔ ہیلو...... کیسے ہو صوبیدار، کہاں ہوتے ہو؟ جنگ کے طوفان میں پتا ہی نہ چل سکا کہ کون کدھر غرق ہو گیا۔ کون کدھر...... پھر قیدی کو تو اپنے کل کی خبر نہیں ہوتی، دوسروں کا حال کیسے جانے؟؟''

''ہم لوگ میرٹھ میں تھا سر۔ آج کل تو ملٹری ڈیری فارم میں ڈرائیور کی ملازمت کرتا ہوں۔ خدا نے ذلت کا دن پورا کر دیا۔''

''گھر میں پیچھے سب لوگ ٹھیک ٹھاک رہے؟؟ اچھا کیا تم نے کہ ملاقات کے لیے آئے۔''

''یہ بچہ کس کا ہے۔'' کرنل نے ایک دو سال کے گول مٹول بچے کو دیکھ کر پوچھا۔

''یہ اللہ کا انعام ہے سر۔ اپنا ہی بیٹا ہے۔ زبیدہ نے ہماری عزت رکھ لی سر۔ بیٹا پیدا کر دیا۔ ہماری ماں کی تسلی کر دی۔ بہت صبر والی عورت ہے زبیدہ۔ اس معصوم بچے نے ہمارا گھر بچا لیا۔ اسے ہی ملوانے کے لیے لایا تھا آپ کے پاس۔ چلو انعام اللہ، سلیوٹ کرو۔ جیسے بتایا گیا تھا گھر میں۔''

''بہت خوبصورت ہے۔ مبارک ہو یعقوب۔''

کرنل نے مبارکباد تو دے دی لیکن وہ فی الفور ڈب جھلکیوں میں پڑ گیا۔ ''بیٹے کی کیا عمر ہو گی یعقوب؟'' دو منٹ چپ رہنے کے بعد اس نے صوبیدار سے پوچھا۔

''دو برس کا ہو گیا سر۔ تین کا ہو جائے تو کسی اچھے سکول میں بھیج دوں گا۔ آپ سے یہی پوچھنے آیا تھا کہ اسے کہاں داخل کرواؤں۔''

کرنل سعد اللہ نے پل بھر کے لیے اپنی سوچ کے کنویں میں دوبارہ چھلانگ لگائی۔

''ہمیں وطن واپس آئے کتنی دیر ہو گئی ٹائیگر؟''

''نو دس مہینے ہو گیا جناب! شکر الحمد للہ!......''

''تو پھر یہ بیٹا تمہاری غیر موجودگی میں کیسے پیدا ہو گیا۔'' کرنل نے حیرانی سے پوچھا۔ ''بچہ تو اب دو برس کا ہے اور تمہیں آئے دس مہینے ہوئے ہیں۔''

''سمجھ گیا کرنل صاحب، سمجھ گیا۔'' یعقوب نے ہنستے ہوئے کرنل کی بات کاٹی۔ ''میں جب واپس آیا ساڑھے تین برس بعد اور ماں نے ایوب کو میری گود میں دے کر کہا، یہ لے مولا کریم کا انعام۔ تیری بے وجہ سزا کا بدلہ مل گیا تمہیں۔ اپنا بیٹا سینے سے لگا لو تو اس وقت میں بھی کچھ دیر آپ کی طرح حیران ہو گیا تھا کہ ساڑھے تین برس کی غیر حاضری میں دو برس کا بیٹا کہاں سے آ گیا۔ دنیا دیکھا ہے جناب۔ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ بچے کا پیدائش کا قانون صرف نو مہینے کا ہے۔ میری دیوانی! اماں نے میری پریشانی دیکھ کر کہا، مالک تو وہ ہے، تم کون ہوتا ہے حساب کتاب سوچنے والا۔ ماں تو سادہ عورت ہے سر! میں زبیدہ کو دھکیل کر کمرے کے اندر لے گیا۔ کھڑے کھڑے اس کا کورٹ مارشل کر دیا سر۔ وہ بالکل چالاک عورت نہیں ہے جناب، بے حد ڈر گئی۔ پھر اس نے خدا کو حاضر ناظر کر کے بولا کہ میرے ڈھاکہ جانے سے کچھ دن پہلے وہ ماں بننے کی حالت میں آ چکی تھی۔ پر ہم سب کو جو اچانک بنگال جانا پڑا تو میری جدائی کے دکھ سے بے چاری زبیدہ کا بچہ زبیدہ کے پیٹ میں ہی سوکھ گیا، کرنگ بن کر رہ گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اسے خود بتایا۔ پھر میرے رب نے معجزہ دکھایا۔ ساس بہو نے بڑے پیر صاحب کے مزار پر دیگ چڑھائی۔ بچہ فوراً ماں کے پیٹ میں ہرا بھرا ہونے لگا۔ اتنی سی بات ہے جناب وہ مالک چاند ڈبا تا بھی خود ہے اور چمکاتا بھی خود، ہم خوش ہیں سر بہت خوش۔'' یعقوب نے بیٹے کو پیار سے کندھوں پر چڑھاتے ہوئے کہا ''جو ہوا سو ہوا، ہماری جھولی میں لعل ڈال دیا۔''

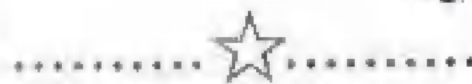
....

''سب کچھ سچ بتا رہا ہوں۔ نجمہ! اس کی بیوی زبیدہ نے صوبیدار کو لیڈی ڈاکٹر کا حوالہ بھی دیا۔ تم یوں مسکرا رہی ہو جیسے میں کوئی من گھڑت طلسماتی قصہ سنا رہا ہوں۔'' کرنل نے گھر آ کر ساری بات اپنی بیوی کو سناتے ہوئے اس کے انوکھے ردعمل پر کہا۔

''میں صرف اس لیے مسکرا رہی ہوں سعد کہ ہمارے لوگوں کی جاہلیت ان کے لیے انتہائی سودمند بھی ہے۔''

''لگتا ہے میرے پیچھے تم کوئی ڈاکٹری پڑھتی رہی ہو بجو! تمہاری تو ہر چیز، ہر بات ہی بدلی ہوئی سی ہے!''

''نہیں کچھ پڑھے لکھے لوگوں سے ملتی ضرور رہی ہوں۔ فوجی سرکل سے نکل کر بھی اپنی وسعت ذہن کی خاطر۔'' نجمہ نے لاتعلقی سے کہا۔ کرنل نے سوچا کہ جب سے آیا ہوں پتا نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ نجمہ وہ نجمہ نہیں جسے میں تین برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ لیکن پچھلے ساڑھے تین برس کی ہزیمت خوردگی نے اندر سے اتنا غیر محفوظ کر دیا کہ اب میں اپنے گرہست کے تحفظ میں کوئی دراڑ نہیں ڈالنا چاہتا...... رات گئی بات گئی۔



پھیڈو

ضیاء بٹ

بے ہنگم طریق سے داڑھی اور سر کے بڑھے ہوئے بالوں اور اپنے ہی خیالات میں گم صم رہنے والا حاجی بھولا اپنی شکل وصورت سے ایک پاگل شخص لگتا تھا۔ وہ بڑا کرخت اور بدلحاظ شخص تھا۔ وہ اپنے ہی خیالات کے سمندر سے اٹھنے والی لہروں کے تھپیڑے سہتا کبھی ڈوبتا اور کبھی ابھرتا رہتا۔ سبک سرانِ ساحل اس کا حال بالکل نہیں جانتے تھے۔ وہ بھی اپنے گردوپیش سے بے نیاز تھا۔ اس نے اپنی علیحدہ دنیا آباد کر رکھی تھی جس کی آبادی دو پھیڈوں پر مشتمل تھی۔ وہی اس کے دوست اور ساتھی تھے۔ وہ انہیں ہاتھ سے نہلاتا دھلاتا۔ دودھ ملا دانہ کھلاتا۔ گرم موسم میں پورا پورا تربوز انہیں کھلاتا۔ شام کو دونوں پھیڈوں کی رسیاں پکڑ کر انہیں سیر کرواتا۔ پھیڈوں کی ورزش کے لیے اس نے اپنی دکان کے پاس ہی لکڑی کا مضبوط تنا زمین میں گاڑ رکھا تھا جس پر وہ ہر وقت ٹکریں مارتے رہتے تھے۔

جہاں وہ ان پھیڈوں کا اتنا خیال رکھتا تھا وہاں اس کی اپنی اولاد چھوٹی چھوٹی جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے باپ کے اچھے موڈ کا ہفتوں انتظار کرتی۔ اس خلل گرفتہ شخص کا رویہ دیکھ کر مجھے اکثر اپنے ایک پروفیسر علم الدین مرحوم کا وہ فقرہ یاد آ جاتا جو طالب علمی کے زمانہ میں ان سے سنا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''مسلمان اولاد پیدا کرتا اور جانور پالتا ہے۔''

حاجی بھولا محلہ میں صرف دو آدمیوں کی عزت کرتا تھا۔ ایک پرویز بٹ جو آٹھویں جماعت تک حاجی بھولے کا ہم جماعت تھا جس نے حاجی بھولے کے حالات تنگ دیکھ کر بارہ سائیکلیں خرید کر دکان کھلوا دی تھی تاکہ انہیں کرایہ پر چلا کر بال بچوں کے لیے روزی کما سکے۔ دوسرا میں، جس کا وہ کرایہ دار تھا۔ دکان کا کرایہ وہ اکثر دو دو، تین تین ماہ لیٹ کر دیتا لیکن میں نے اس معاملہ میں اسے کبھی تنگ نہیں کیا تھا۔

حاجی بھولے کی دکان پر سائیکلوں کی مرمت اور پنکچر لگانے کے لیے رکھا ہوا کاریگر ہر تین چار ماہ بعد بدل جاتا کیونکہ وہ ہر کاریگر کے ساتھ سختی سے پیش آتا اور اس کے کام میں کیڑے نکالتا۔

حاجی بھولے کا اصلی نام ''محمد ریاض'' سے کم ہی لوگ واقف تھے۔ اس کی کیا نفسیات تھیں، کسی کو اس سے کوئی غرض و غایت نہیں تھی۔ عوام اسے بدتمیز ہی سمجھتے تھے۔ میں اتنا جانتا تھا کہ وہ چار بہنوں کے بعد والدین کی آخری اولاد تھی۔ چونکہ اس کی پیدائش حج والے دن ہوئی تھی، والدین نے اسے حاجی کا لقب دے دیا تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو لاڈ پیار سے بھولا کہنا شروع کر دیا۔ آٹھویں جماعت میں پہنچا تو بازار اور اہل محلہ میں ہر کسی نے دونوں القاب اکٹھا کرتے ہوئے حاجی بھولا کا نام دے دیا۔

تین بیٹیوں کی شادی کے بعد باپ کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ مجبوراً حاجی بھولے نے پڑھائی چھوڑ کر ملازمت کر لی۔ وہ ایک ایسی فیکٹری میں ملازم ہوا جو جعلی موبل آئل تیار کرتی تھی۔ چھاپہ پڑا تو مالک فیکٹری اور تین ملازم قابو آ گئے جن میں حاجی بھولا بھی شامل تھا۔ مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ ایک مجسٹریٹ کی عدالت سے مالک فیکٹری اور دو ملازموں کو قید کو جرمانے کی سزا ہو گئی۔ حاجی بھولے کو عدالت میں روتا دیکھ کر اور اس کی کم عمری کا خیال کرتے ہوئے اسے صرف پانچ منٹ ''مرغا'' بننے کی سزا دے کر چھوڑ دیا۔

وہ کئی دن تک گھر میں گم صُم بیٹھا رہا۔ آخر ماں کے سمجھانے پر اس نے جنرل مرچنٹ کی چھوٹی سی دکان کھول لی جس کے لیے ماں نے اپنا آدھا زیور بیچ کر رقم دی تھی۔

چوتھی بہن کی شادی کے بعد ماں بیٹا اکیلے رہ گئے۔ چوتھی بہن کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے مکان کا چھ ماہ کا کرایہ سر پر چڑھ گیا۔ مالک مکان نے زیادہ تنگ کیا تو بھولے نے جنرل مرچنٹ والی دکان کا سامان بیچ کر چھ ماہ کا کرایہ ادا کیا۔ باقی رقم کا اس نے گھر میں راشن ڈال لیا اور خود بیکار ہو گیا۔ تا آنکہ پرویز بٹ نے اس کی مدد کی اور وہ سائیکلیں کرایہ پر دینے لگا۔ گھر کا سلسلہ ٹھیک ہوا تو ماں نے ضد کر کے اس کی شادی کر دی۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہونے کے بعد والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔

حاجی بھولے کے بڑے بیٹے نے دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد بجلی کا کام سیکھا اور باپ کے رویہ سے تنگ آ کر بیرونِ ملک چلا گیا اور ایسا گیا کہ پھر کبھی واپس نہ لوٹا۔

ایک دن میں نے بڑے بیٹے سے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا ''آپ کو نہیں معلوم کہ یونان پہنچنے کے تین ماہ بعد ایک ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا۔''

یہ سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''تمہاری اور تمہارے بیٹے کی قسمت۔ خدائی معاملات میں کون دخل دے سکتا ہے۔'' وہ خاموش رہا۔

حاجی بھولے کے دوسرے بیٹے نے دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد کمپیوٹر کا کام سیکھا۔ ایک دن اس نے باپ سے کہا ''ابا، اسناد کی فوٹو کاپیاں کروانی ہیں ایک جگہ ملازمت کے لیے درخواست دینی ہے۔''

''ابھی دو ہفتے پہلے تمہاری فرمائش پوری کر دی تھی۔'' حاجی بھولے نے جواب دیا۔

''وہاں کام نہیں بنا تھا کوئی سفارشی بھرتی ہو گیا۔'' لڑکا بولا۔

''اب کی بار بھی کوئی دوسرا بھرتی ہو جائے گا۔ ہاں مجھے یہ بھی بتلاؤ کہ جب تم نے کمپیوٹر کا کام سیکھ رکھا ہے تو پھر وہاں جانے کی کیوں ضد کرتے ہو اور خواہ مخواہ فیس کا بوجھ ڈالتے ہو۔''

''ابا پریکٹس لازمی ہے ورنہ آدمی کام بھول جاتا ہے اور غلطیاں کرنے لگتا ہے۔''

''مجھے چکر مت دو۔ سن لو۔ میرے پاس تمہاری فیس اور آئے دن فوٹو کاپی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ تم بھی وہیں چلے جاؤ جہاں تمہارا بڑا بھائی چلا گیا ہے۔'' حاجی بھولے کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔

حاجی بھولے کا بیٹا منہ بسورتا گھر جا رہا تھا کہ راستے میں مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی افسردہ شکل دیکھ کر میں نے اسے روکا اور پوچھا ''بیٹا خیر تو ہے۔'' وہ رونے لگا اور اس نے مجھے سارا واقعہ سنایا۔

میں نے حاجی کے لڑکے کو ساتھ لیا۔ اسناد کی پانچ پانچ فوٹو کاپیاں کروا دیں اور پوچھا کہ کہاں عرضی دینا ہے۔

''واپڈا۔'' اس نے جواب دیا۔

میرے علم میں یہ بات تھی کہ محکمہ کا سربراہ حاجی بھولے کا ماں کی طرف سے نہایت قریبی عزیز ہے لیکن نہ اس نے کبھی حاجی بھولے کی خبر گیری کی تھی اور نہ ہی بھولا اسے کوئی اہمیت دیتا تھا۔ البتہ وہ سربراہ بھولے کی والدہ کی وفات پر ضرور آیا تھا۔

کیسا زمانہ آیا ہے کہ اب یہی راہ ورسم دنیا ہے کہ خون کی بجائے مراتب اور باہمی مفاد کی بنیاد پر رشتے استوار ہوتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے آپ میں گم ہو گیا لیکن جلد ہی حاجی بھولے کے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''عرضی رجسٹرڈ کروا دو۔ اپنے کوائف مجھے بھی دے دو۔ انشاء اللہ تمہیں نوکری مل جائے گی۔ متعلقہ محکمہ کا ایک ڈپٹی ڈائریکٹر میرا دوست ہے۔''

حاجی بھولے کا دوسرا بیٹا ملازم ہو گیا۔ جب وہ پہلی تنخواہ لایا تو حاجی بھولا مٹھائی کا ایک ڈبہ لے کر میرے گھر پہنچا۔ وہ وہ احساسِ احسان مندی سے بچھا جا رہا تھا۔

بیٹے کی تنخواہ آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دکان کے پاس پھیڈوں کی تعداد دو سے بڑھ کر تین ہو گئی ہے۔

اب جھڑکیاں کھانے کے لیے تیسرا بیٹا تھا لیکن اس کا مشکل دور جلد ختم ہو گیا کیونکہ اس کے بڑے بھائی نے منت سماجت کر کے اپنے ہی محکمہ میں میٹر ریڈر بھرتی کروا دیا۔

دو بیٹوں کے ملازم ہونے کے باوجود حاجی بھولے کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

ایک دن دوسری دکان پر پرویز بٹ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں حاجی بھولے سے متعلق بات کرنا چاہ ہی رہا تھا کہ اچانک جاوید پُنّی آ ٹپکا۔ یہ محلّہ میں دوسرا خلل گرفتہ انسان تھا۔ بقول اس کی والدہ مرحومہ وہ اپنی چچازاد سے منسوب تھا لیکن میٹرک کے بعد آوارگی کی وجہ سے اس کے چچا نے منگنی توڑ دی۔ تب سے اس کا دماغ ہلا ہوا ہے۔ جاوید پُنّی حاجی بھولے کے برعکس نہایت صاف ستھرا لباس پہنتا۔ روزانہ شیو کرتا۔ بوٹ پالش کرتا اور صبح ناشتے کے بعد گھر سے پیدل نکل جاتا۔ کوئی کام کاج تو وہ کرتا نہیں تھا لیکن ایسا ظاہر کرتا جیسے وہ بہت مصروف آدمی ہے۔ کئی قومی اور بین الاقوامی ذمہ داریاں اس نے سنبھال رکھی تھیں۔ محلّہ کا ہر چھوٹا بڑا اس سے بڑی محبت سے ملتا اور چائے کی ایک پیالی کے عوض وہ ان میں گھل مل جاتا۔ بعد میں کوئی نہ کوئی اس کی کسی نہ کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتا تو وہ مشتعل ہو جاتا اور فساد پر اتر آتا اور پھر ڈراپ سین ہو جاتا۔ والدین کے مرنے کے بعد وہ بے یارو مددگار ہو گیا۔ پرویز بٹ نے جاوید پُنّی کو یہ کہہ کر کہ تمہارے مشوروں کی وجہ سے میری کمپنی کو بہت فائدہ پہنچا ہے لہٰذا میں نے تمہارا نام رجسٹر میں بطور مشیر درج کرا دیا ہے۔ ہر یکم کو تمہیں تنخواہ مل جایا کرے گی۔ اب وہ اسی تنخواہ پر گزارا کرتا تھا۔ دو وقت کا کھانا بھی پرویز بٹ کے گھر سے آ جاتا تھا۔

جاوید پُنّی نے آتے ہی سلام دعا کے بعد پرویز بٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''بٹ صاحب آج چھبیس تاریخ ہے۔ مہینہ ختم ہونے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ کیا تنخواہ ایڈوانس مل سکتی ہے۔''

''مل سکتی ہے لیکن بتلانا ہو گا کہ کونسی ہنگامی ضرورت آن پڑی ہے۔'' پرویز بٹ نے جواب دیا۔

''بتلاؤں گا لیکن ایڈوانس لینے کے بعد۔'' پُنّی بولا۔

پرویز بٹ نے جاوید پُنّی کو تنخواہ دے دی۔ پرویز بٹ نے دکاندار سے پانی لانے کے لیے کہا۔ دکاندار نے گلاس صاف کر کے پانی پرویز بٹ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ جاوید پُنّی بولا ''یہ نہیں ہو سکتا۔ پانی نہیں بوتل پینی ہو گی۔'' اور زبردستی دکاندار

سے دو بوتلیں کھلوا کر ایک پرویز بٹ اور دوسری میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میری کمائی پر آپ کا بھی حق ہے۔" ہم دونوں جاوید پنی کی اس بات پر مسکرانے لگے۔ دکاندار بھی ہنس رہا تھا۔ جاوید پنی نے گولڈ لیف کی ایک ڈبیا بھی میرے ہاتھ میں تھمادی۔ پرویز بٹ سے ایڈوانس لی ہوئی تنخواہ میں سے ادائیگی کر دی۔

"پنی صاحب آپ نے کہا تھا کہ تنخواہ ایڈوانس لینے کے بعد بتلاؤں گا کہ کونسی ہنگامی ضرورت آن پڑی ہے۔"

"یار معاملہ یہ ہے کہ میرے گھر کے سامنے ایک عورت رہتی ہے۔ جس کے پانچ بچے ہیں۔ خاوند تقریباً نکھٹو ہے۔ جب اسے کام نہیں ملتا گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پچھلے دو دن سے غائب ہے۔ اس کے بڑے بیٹے کو بڑا تیز بخار ہے۔ بیچاری رو رہی تھی۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔" جاوید پنی نے جواب دیا۔

"بئی تم جنتی ہو۔ اس ایڈوانس سے اس غریب عورت کی مدد کرو۔ یکم کو تمہیں تنخواہ مل جائے گی۔" پرویز بٹ بولا۔

"اچھا؟ جو نیکی میں کمانا چاہتا تھا، دولت کے زور پر مجھ سے چھیننا چاہتے ہو۔" پنی نے جواباً کہا...... پھر تینوں کے ایک ساتھ قہقہہ پر بات ختم ہوئی۔

"جاوید پنی میرا بھی ایک معمہ حل کرو۔ تم جہاں دیدہ اور زندگی چشیدہ شخص ہو اور تم ہی اس سلسلہ میں کچھ بتلا سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

جاوید پنی نے یک لخت ایک معتبر کا روپ دھار لیا اور مجھے کہنے لگا "بتلایئے۔"

"بات یہ ہے کہ اگر کسی عالم فاضل کو کسی موضوع پر گفتگو کرنی پڑے تو وہ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے گفتگو کرے گا۔ دو دن ہوئے میں گھر سے کوئی ساڑھے سات بجے صبح دفتر کے لیے نکلا۔ حاجی بھولے کی دکان پر بھولے کے علاوہ دو اور آدمی بیٹھے آپس میں "پھیڈوں" سے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ شام چار بجے جب واپس لوٹا تو ان کی گفتگو اسی موضوع پر جاری تھی۔ کیا پھیڈوں کے معاملات اتنے ہی پیچیدہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے شام چار بجے تک گفتگو جاری تھی۔" میں نے پوچھا۔

میری بات سن کر جاوید پنی مسکرایا، پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو شاہ رگ کے اوپر رکھتے ہوئے کہا کہ "اس سے نیچے نیچے حاجی بھولا ہے اور اس سے اوپر "پھیڈو"۔"

سب سے پہلے دکاندار نے سبحان اللہ بولا اور گولڈ فلیک کی ایک ڈبیا جاوید پنی کو انعام میں دیتے ہوئے کہا "پنی کیا سچی اور کھری بات کہی ہے۔"

یہ اتفاقیہ طور پر منعقد ہونے والی محفل اختتام پذیر ہوئی اور ہم تینوں اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

اگلے دن بھولا میرے گھر آیا اور کہنے لگا "کچھ عرض کرنا ہے۔" میرے اجازت دینے پر وہ کہنے لگا "میرے بڑے "پھیڈو" نے میدان مار لیا ہے۔ مدمقابل پھیڈو وزن میں زیادہ ہونے کے باوجود ستر ٹکریں کھانے کے بعد بھاگ نکلا۔ منصفوں نے میرے پھیڈو کو رستم لاہور کا خطاب دیا ہے۔ اب دس دن بعد ملتان شریف کے ایک میلہ میں رستم ملتان سے مقابلہ ہے۔ لاہور کی عزت کا سوال ہے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"دیکھو حاجی بھولے، ٹکریں تو تمہارے پھیڈو نے مارنی ہیں، میں تو یہ کام کرنے سے رہا۔ دوسری بات یہ ہے ملتان شریف، پاک پتن شریف، گولڑہ شریف، چورہ شریف تو سب کہتے ہیں لیکن میں نے کسی کو لاہور شریف کہتے نہیں سنا۔ حالانکہ لاہور میں بے شمار عالی مرتبہ بزرگان دین، صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ مدفون ہیں کیا تم اپنے پھیڈوں کی جیت کے ذریعے لاہور کو

لاہور شریف میں بدلنا چاہتے ہو۔'' میں نے طنزاً کہا۔

''آپ کی بات ذرا باریک ہے۔ میں اس کا کوئی جواب تو نہیں دے سکتا۔ لیکن عرض کرتا ہوں کہ آپ مزارات پر جاتے رہتے ہیں۔ یقیناً کئی ''اللہ لوک'' سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ براہ کرم کسی نیک آدمی سے کوئی تعویذ لا دیں جسے میں پھیڈو کے گلے میں باندھ دوں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ یوں میرا پھیڈو جیت جائے گا۔ آپ کے پہلے ہی مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ یہ احسان بھی کر دیں۔ ساری عمر یاد رکھوں گا۔''

''اچھا مجھے آرام کرنے دو۔ سارا دن دفتر میں ٹکریں مار کر لوٹا ہوں، کوشش کروں گا۔'' میں نے جواب دیا اور حاجی بھولا ''بڑی مہربانی آپ کی'' کہتا ہوا نیچے اتر گیا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ یہ اجہل میری جان نہیں چھوڑے گا اور وقت بے وقت تنگ کرے گا۔ لنڈا بازار سے ایک پرنٹیڈ تعویذ ایک آدمی سے جو شوکیس سامنے رکھے اسی کام کے لیے زمین پر بیٹھا تھا، لیا اور اسی سے بند کروا کر حاجی بھولے کو لا دیا۔ وہ بہت مشکور ہوا اور اس نے اسی وقت رستم لاہور کے گلے میں باندھ دیا۔

چند دنوں بعد حاجی بھولا دکان سے غائب تھا۔ معلوم ہوا کہ اپنے دو ساتھیوں اور ''پھیڈو'' کو لے کر ملتان چلا گیا ہے۔

واپسی پر وہ مٹھائی کا ڈبہ لے کر میرے ہاں پہنچا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ میری طرف مٹھائی کا ڈبہ بڑھاتے ہوئے بغیر میرے پوچھے روئیداد سنانے لگا:

''رستم ملتان میرے پھیڈو سے چار کلو وزنی تھا۔ دس دس ہزار روپے دونوں طرف سے منصفوں کے پاس جمع کروا دیئے گئے۔ جیتنے والے کو یہ رقم اور ہارنے والا پھیڈو ملنا تھا۔ شرائط طے ہوئیں۔ لوگوں نے بھی لاکھوں کی شرطیں لگا رکھی تھیں۔ منصفین دونوں پھیڈوں کو ان کی رسیاں ہاتھ میں تھامے میدان میں لے آئے۔ عین وقت پر مخالف پارٹی نے تعویذ پر اعتراض کیا اور منصفوں نے تعویذ اتار کر میرے سپرد کر دیا۔ رسیاں چھوڑی گئیں۔ پھیڈو پچھلے قدموں پر آئے، زور سے آگے بڑھے۔ ٹکرائے جس سے دھماکہ پیدا ہوا۔ چھ ٹکروں کے بعد رستم ملتان کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے پیشاب بھی کر دیا۔ سیانوں کا خیال تھا کہ ایک دو مزید ٹکروں کے بعد رستم ملتان بھاگ جائے گا لیکن بدقسمتی سے جب میرا پھیڈو آگے بڑھا تو اپنے ہی زور میں رستم ملتان کے کیے ہوئے پیشاب والی جگہ سے پاؤں پھسلا۔ اتنے میں دوسرے نے ٹکر مار دی جو غلط جگہ پر میرے پھیڈو نے برداشت کی اور اس کا ایک سینگ ٹوٹ گیا۔ میرا دل دھڑکا۔ میرے پھیڈو نے دو مزید ٹکریں برداشت کیں اور پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ رستم ملتان آگے بڑھا لیکن مدمقابل کو بیٹھا دیکھ کر رک گیا۔ پھر پیچھے ہٹا۔ آگے بڑھ کر میرے پھیڈو کے پاس آ کر رک گیا۔ اس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ منصفوں نے فیصلہ دیا کہ چونکہ رستم لاہور میدان میں بیٹھا رہا اور رستم ملتان نے میدان چھوڑ دیا ہے لہٰذا فاتح رستم لاہور ہے۔ بیس ہزار کی رقم اور رستم ملتان میرے سپرد کر دیئے گئے۔ رستم ملتان کے مالک نے پھیڈو کی بجائے بیس ہزار کی رقم دینی چاہی۔ میں نے انکار کیا۔ آخر تیس ہزار میں سودا ہو گیا۔ میرا یقین ہے کہ اگر تعویذ نہ اتروایا جاتا تو میرا پھیڈو مدمقابل کو واضح اور کھلی شکست دیتا۔ بہرحال میں نے تعویذ سنبھال رکھا ہے، پھر کسی وقت کام آئے گا۔''

حاجی بھولا بولتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا کہ ''پچاس ہزار کا کیا پروگرام ہے؟''

''چار ماہ کا کرایہ مکان ذمے تھا، ادا کر دیا ہے۔ دو ماہ آپ کا کرایہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ ایک ماہ کا راشن گھر میں ڈال لیا ہے۔ کچھ رقم زخمی پھیڈو پر خرچ ہو گی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔'' حاجی بھولے نے جواب دیا۔

چند ہفتوں بعد حاجی بھولے نے کاروبار بدل لیا۔ سائیکلیں بیچ دیں سگریٹ، پان اور کولڈ ڈرنک رکھ لیے۔ پہلے دن جب وہ نئی دکان پر بیٹھا تو پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کٹنگ اور داڑھی کا خط بنا ہوا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس کی گفتگو میں بھی نرمی تھی۔ میں نے حال چال پوچھا تو کہنے لگا'' کاریگر سے تنگ تھا۔ بیوی بیمار تھی۔ پریشان تھا۔ دوسرے بیٹے کا بڑے بھائی سے انٹرنیٹ پر رابطہ ہو گیا۔ یہ جان کر کہ والدہ بیمار ہے اور باپ کا ہاتھ تنگ ہے۔ اس نے فوری طور پر پچاس ہزار روپے بذریعہ ہنڈی بھیج دیئے لہٰذا کاروبار بدلنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ شکر ہے خدا کا اب اچھا وقت گزر رہا ہے۔''

''تمہارا زیادہ اچھا وقت گزر سکتا ہے، اگر میری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ دیکھو میرے اندازے کے مطابق تین بھیڈوں کا ماہانہ خرچہ کسی طور بھی دو ہزار سے کم نہیں۔ ان سے جان چھڑاؤ اور یہی پیسے اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔'' میں نے کہا۔

حاجی بھولا فوراً سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا'' آپ کو نہیں معلوم، یہ بے زبان چوپائے کوئی دکھ نہیں دیتے۔ پیار کا جواب خاموش پیار سے دیتے ہیں۔ میں دو پاؤں والے جانور جسے آدمی کہتے ہیں، کا ڈسا ہوا ہوں۔ یہ دنیا غم تو دیتی ہے، شریک غم نہیں ہوتی۔ ماسوائے پرویز بٹ اور آپ کے۔''

''اچھا بھائی اللہ تعالیٰ تم پر مہربانی فرمائے۔'' کہتا ہوا اس سے رخصت ہوا۔

حاجی بھولا دکان کے ساتھ ساتھ تینوں بھیڈوں کا بھی خیال رکھتا۔ خاص کر زخمی رستم لاہور کا۔ فرط جذبات سے کئی دفعہ اس کا منہ بھی چوم لیتا۔ کبھی کبھی تیسرا بیٹا بھی حاجی بھولے کا ہاتھ بٹاتا۔

اس کے بعد میرا تبادلہ ایک سال کے لیے کوئٹہ ہو گیا۔ میں کوشش کر کے آٹھ ماہ بعد واپس آ گیا۔ گھر والوں نے مجھے بتلایا کہ دو ماہ ہوئے ہیں کہ حاجی بھولے نے دکان کی چابی واپس کر دی تھی۔ اس سے پہلے چھ ماہ کا کرایہ اس کے ذمہ واجب الادا ہے۔

شام کو میں نیچے اترا تو میں نے دیکھا کہ دکان کے باہر ہر وقت بندھے ہوئے بھیڈو بھی غائب ہیں البتہ زمین میں گاڑا لکڑ کا تناو ہیں موجود ہے۔ حاجی بھولا سامنے ایک تھڑے پر بیٹھا کسی اوباش قسم آدمی کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ حاجی بھولے کے سر کے بال پہلے کی طرح بے ترتیب اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے جو اس نے پہن رکھے تھے، اچھے خاصے میلے تھے۔ پیشتر اس کے کہ میری آنکھیں چار ہوتیں، میں نگاہیں نیچے کرتے ہوئے آگے نکل گیا۔ میری منزل باغ تھا جہاں میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ جونہی میں باغ میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ حاجی بھولا میرے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا اور بولنا شروع کیا'' آپ کی غیر حاضری میرے لیے بڑی منحوس ثابت ہوئی۔ میری مصیبتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سائیکلوں کی دکان میں نے کاریگروں کی وجہ سے بند کی۔ کولڈ ڈرنک اور پان سگریٹ کا کام شروع شروع میں بہت چلا لیکن ادھار بہت نکل گیا۔ آخر جمع پونجی ختم ہو گئی اور دکان بند کرنا پڑی۔ دونوں بیٹوں کی تنخواہ سے دال روٹی تو چل جاتی ہے لیکن ایک بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے۔ بڑا بیٹا حرامی نکلا اس نے دوبارہ حال نہیں پوچھا۔ اسی پریشانی میں مجھے ایک شخص نے بتایا کہ پیر رونقی کے قبرستان میں ایک مجذوب ہے اگر وہ تمہاری طرف متوجہ ہو گیا تو تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ میں نے اس مجذوب کی بڑی خدمت کی۔ آخر اس نے ایک دن کہا'' کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ کیوں یہاں آتے ہو؟'' میں نے اسے اپنا حال بتایا اور عرض کی کہ اگر ''پھنگوڑے'' (پرائز بانڈ کے پہلے چار نمبر) کا نمبر مل جائے تو میری مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔ وہ مجذوب ہنسا اور کہنے لگا بسم اللہ پوری آتی ہے۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق پوری بسم اللہ سنائی۔ کہنے لگا اسے الٹی پڑھ سکتے ہو۔ میں نے اپنے عجز کا اظہار

کیا۔ اس نے غصے کے انداز میں کہا کہ چلو بھاگو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔ واپس آ کر میں نے سوچا کہ بسم اللہ پوری کا عدد ۷۸۶ ہے، لہٰذا میں نے ۷۸۶ کا پیکٹ (پرائز بانڈ کے پہلے تین نمبر) اور چھ کے بعد زیرو سے لے کر ۹ تک دس پھنگوڑے لگا دیے۔ جب پرائز بانڈ کا نتیجہ آیا تو پہلے تین نمبر ۶۸۷ تھے۔ میری بدقسمتی کہ میں الٹی بسم اللہ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اگر ۶۸۷ کا پیکٹ اور پھنگوڑا کا نمبر آ جاتا تو مجھے تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ روپے ملتے۔ مکان بھی خرید لیتا اور بیٹی کی شادی کا بندوبست بھی ہو جاتا۔ اگلی چاند رات (پرائز بانڈ نکلنے کی تاریخ سے پہلی رات) پھر اس مجذوب کا پاس گیا اور اپنی بدقسمتی کا رونا رویا۔ وہ بولا ''توں چور۔ میں بھی چور۔ دنیا چور۔''

واپس آیا، ایک سیانے سے مشورہ کیا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ چور کے لفظ سے چار کا ہندسہ بنتا ہے تو گویا ۴۴۴ کا پیکٹ بنتا ہے لہٰذا چوتھے نمبر کے لیے پھر زیرو سے نو تک پیکٹ کے ساتھ جوڑ دیے۔ جب نتیجہ آیا تو پیکٹ کا نمبر ۴۰۴ اور پھنگوڑا ۴۰۴۴ تھا۔ نتیجہ آنے پر خیال آیا کہ ہم سے چوک ہوگئی۔ مجذوب نے ''میں بھی چور'' کہتے ہوئے بھی پر زور دیا تھا اور بھی کا ہندسہ زیرو بنتا ہے۔ اصل میں مجذوب کی 'بڑھ' (علامتی اشارہ) سمجھ میں نہیں آتی۔''

''تم یہ فارسی مجھے کیوں پڑھا رہے ہو۔'' میں نے بے زار ہو کر حاجی بھولے سے پوچھا۔

''دیکھئے میں سخت پریشان ہوں۔ آپ کے میرے اوپر بہت احسان ہیں۔ ایک احسان اور کر دیں جس اللہ والے سے میرے بھیڈو کے لیے تعویذ لے کر دیا تھا اس سے مجھے پھنگوڑے کا نمبر لے دیں۔''

یہ سن کر میں نے غصے سے حاجی بھولے کی طرف دیکھا۔ مجھے جاوید پنّی مرحوم کی بات یاد آ گئی۔ حاجی بھولا مجھے سچ مچ ایک ایسا بھیڈو نظر آیا جس کے ایک نہیں دونوں سینگ ٹوٹ چکے ہوں۔

..........☆..........

فٹ پاتھ سے

گلزار (ممبئی)

دگڑو کو پھر اسی کتے نے کاٹ لیا۔ تیسری بار۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے جسم میں ایسی کون سی خوشبو بسی ہے جو ''شینڈی'' کو پسند ہے۔ شینڈی کتے کا نام تھا۔

بہرام نے کہا ''خوشبو نہیں بے، بو آتی ہے اسے۔ جو برداشت نہیں کر پاتا!''

دگڑو نے شکایت کی۔ ''لیکن سوتا بھی تو میرے پاس ہی ہے! لاکھ بھگاتا ہوں، پتہ نہیں رات میں کب آ کے سالا میرے پاس سو جاتا ہے۔''

ہیرا پتہ نہیں کیا سوچ کے زور سے ہنس پڑی۔ بولی ''تین بار بہت ہو گیا!..... اس کے بعد تُو کاٹنا اسے۔''

باندرہ کے اس فٹ پاتھ پر ہیرا سب سے الگ چیز تھی۔ بہت کچھ کر لیتی تھی۔ سورج سے پہلے اٹھتی تھی اور دو گھنٹے میں کھار باندرہ کے آدھے سے زیادہ کچرے کے ڈبے چھان آتی تھی۔ ڈبہ ڈھکن جو ملتا بوری میں ڈال لیتی تھی۔ ایک دو بیئر کی بوتلیں مل جائیں تو اچھے پیسے بن جاتے تھے۔ ورنہ آج کل تو مالک لوگ ردی کے پیپر بھی خود ہی بیچتے تھے۔ یہ اُسی کی کھوج تھی کہ ہسپتالوں کے پھینکے ہوئے انجکشن بھی بکنے لگے تھے۔ بڑی جان تھی ہیرا میں۔ سارا دن کچھ نہ کچھ لگی ہی رہتی تھی۔ ٹریفک جام ہو جائے تو بیوڑے کا کھجلی بھرا بچہ اٹھا کے گاڑیوں میں بھیک بھی مانگ آتی تھی۔ بیوڑا بچے کا کرایہ لے لیتا تھا۔

جب بالو تھا تو رات کو دو اینٹیں رکھ کے، بھیک بھی گرم کرتی تھی۔ بیکری والے سے پاؤ روٹی بھی لے آتی تھی۔ کھاپی کے ایک کٹے، کنستر جیسا پتیلہ تھا، کچھ ایلومونیم کے برتن تھے، پیچھے کھاڑی کے پانی میں دھو کے، اوپر ٹانگ دیتی تھی پیڑ پر! جب سے بالو اسے چھوڑ کر دادر میں ''دوسری'' کے ساتھ جا کر بس گیا تھا، اس نے روٹی ووٹی پکانا چھوڑ دیا تھا، کس کے لیے کرتی؟ بالو سے بہت لگاؤ تھا اسے۔ انہیں دنوں بھیکو کو سونگھ لگ گئی۔ تبھی سے بھیکو اس کے پیچھے لگا تھا، اُس کی ''اپنی'' تو چلنے پھرنے سے بھی لاچار تھی۔ دن رات جھونپڑی میں پڑی رہتی تھی۔

بھیکو دل کا برا نہیں تھا لیکن وہی شینڈی کی دُم کی طرح ٹیڑھے کا ٹیڑھا! اور اسی کی طرح کھجاتا ہوا، ہر دوسرے تیسرے دن آ دھمکتا تھا۔ وہ ماہم والے فٹ پاتھ کا رہنے والا تھا۔ ایک بار بڑی بھاری بارشیں آئیں ممبئی میں۔ سارے فٹ پاتھ بہہ گئے۔ سبھی کو دوسرے ٹھکانے ڈھونڈنے پڑے۔ بھیکو نے بڑا ساتھ دیا۔ تلک برج کے نیچے ایک جگہ بنا دی۔ اس کی ماہم والی جھونپڑی سے بہت دور بھی نہیں تھی۔ بس انہیں بارشوں میں اس نے دو بار کاٹا تھا اسے۔ اچھا ہوا، دو مہینے بعد اپنے آپ پیٹ گر گیا ہیرا کا۔

اور وہ واپس باندرہ والے فٹ پاتھ پر آ گئی۔ ڈگڑو، شینڈی اور بیوڑے کے پاس۔ یہ مرد سب ایک سے ہوتے ہیں۔ کہتا تھا، وارث چاہیے۔ ایک جھونپڑی اور ایک کپڑے تانگنے کی رسی لیے گھومتا تھا اور وارث چاہیے!!

بہرام کی عادتیں فٹ پاتھیوں جیسی نہیں تھی، کم بولتا تھا لیکن اندر بڑے پیچ تھے۔ وہ کار والوں سے بڑے پنگے لیا کرتا تھا۔ موڑ مڑتی کار سے ٹکرا کے ایسے گرتا تھا کہ لگتا تھا جان ہی چلی گئی۔ لوگ جمع ہوتے۔ ہلا مچ جاتا۔ کار والا ہاتھ جوڑ کے پیسے دے جاتا۔ دیر رات کو، ہوٹل کے باہر کسی ایسی گاڑی والے سے پنگا لیتا جو پی کے نکل رہا ہو یا جس کے ساتھ کوئی عورت ہو...... کہتا تھا: ''ایسے لوگ بڑی جلدی ہوہ ڈھیلا کرتے ہیں۔ آسامی چھوٹی ہے کہ موٹی بٹوے سے پتہ چل جاتا ہے۔''

کوئی بہت بڑا ہاتھ لگتا تو بہرام کئی کئی دن اپنے فٹ پاتھ سے غائب رہتا۔ سیدھا سائن کی ''جھگی والیوں'' کے ہاں جا بستا۔ دن بھی وہیں، رات بھی وہیں۔ طبیعت سے بڑا رئیس تھا۔ وہاں اس کی کوئی دل پسند بھی تھی لیکن نام کبھی نہیں بتایا۔ ایک بار اتنا کہا تھا: ''چاندی کے کانٹے بنا کے دیئے۔ ماں قسم کیا لگتی تھی۔''

''شادی کیوں نہیں بنا لیتا؟'' ہیرا نے کہا۔

ذرا مسکرایا۔ بولا ''کمائے گا کون؟''

انہیں دنوں اس نے سنا، بالو ''دوسری'' کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا۔ کہاں گیا، پتہ نہیں۔ ''دوسری'' گنڈاسا لے کر ہیرا پر چڑھ آئی۔

''کہاں ہے کھسم تیرا۔ سالا کتا! ذات پات تو چھوڑی، دھرم شرم بھی چھوڑ گیا۔ ماں بیٹی دونوں کے ساتھ.....'' اور کیا کچھ نہیں کہا اس نے۔ جب بولتی تھی تو لمبے لمبے دانت باہر آ جاتے اور جبڑا پورا کھل جاتا۔ شینڈی کی طرح!

ویسے ہیرا دل میں بہت خوش تھی۔ پر بولی نہیں۔ ایک ہی جھٹکے میں بالوں سے پکڑ کے گرا لیا اُس نے۔ اور اسی کا گنڈاسا گردن پہ رکھ دیا۔

''بہین کی...... بھون کے شینڈی کو ڈال دوں گی پھر کبھی اس فٹ پاتھ پر آئی تو!'' ...... وہ دن اور یہ دن، پھر نہیں آئی بالو کی وہ۔ کیا نام تھا...... دوسری!

بھیکو اس دن بھی آیا تھا۔ ہیرا نے روٹی نہیں ڈالی۔ دل میں غم تو تھا۔ بالو واپس نہیں آیا۔ اب وہ عورت دور ہو گیا تھا۔ بھیکو نے اسی بات کو ہوا دی۔

''مجھے تو معلوم تھا، وہ حرام کا ایسا ہی ہے۔ یاد ہے کیرالہ کی ایک لڑکی آئی تھی فٹ پاتھ پر، تو بالو مجور (مزدور) کلاس میں سونے لگ گیا تھا۔''

ہیرا چپ چاپ سنتی رہی۔ اور وہ بولتا رہا۔

''جہاں ہڈی بوٹی دیکھی، وہیں دُم ہلاتا چل دیتا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، اس چھوکری کے ساتھ رہے گا دیول میں؟''

''کس دیول میں؟''

''کلیان میں! سائیں کا دیول ہے نا!''

ہیرا کو پتہ نہیں کیا سوجھی۔ ایک روز چل دی وہاں۔ اور بھیکو کو ساتھ لے گئی۔ ڈھائی سو سیڑھی چڑھ کے بھی بالو نہیں ملا۔ سارا دیول ڈھونڈا، چوگردہ ڈھونڈا، نو دن رہی وہاں بھیکو کے ساتھ۔ نہ سائیں ملا نہ بالو۔ وہ تیسری بار تھا بھیکو نے کاٹ کھایا۔ اس

بار تو بوٹی ہی نوچ کے لے گیا۔ اگری پاڑے والی دائی نے پیٹ صاف کیا۔ ڈیڑھ مہینہ، نہ بھیک مانگی، نہ اور کوئی دھندہ کیا

بھیکو سے روٹھ گئی وہ۔ تنگ آ گئی اُس سے۔ جب آتا بھگا دیتی۔ بس لات ہی نہیں ماری اس کو......! پھر بھی پتہ نہیں ہر دوسرے چوتھے، رات کے اندھیرے میں آتا، اور اس سے لگ کے پڑا رہتا تھا۔ بدبو آنے لگتی تھی اس سے۔ ویسی ہی جیسی دگڑو کو شینڈی سے آتی تھی۔

اچانک ہی بھیکو کی ''اپنی'' مرگئی۔ مری تو نام بتایا ''سیتا!'' جیسی بھی تھی، بھیکو نے سیوا بہت کی تھی اس کی۔ بہت سمان دیا اُسے۔ پورے پیسے دیئے اور شمشان میں لے جا کر جلایا۔ ہیرا کا دل پسیج گیا۔ کچھ دن کے لیے ماہم والی جھونپڑی میں آ کر رہ گئی۔ ایک بار تو جی چاہا اسی کے ساتھ بس جائے۔ انت تو اچھا ہوگا۔ لیکن سیتا کے مرنے کے بعد سے بھیکو بکھر گیا تھا۔ کہاں تو ہمیشہ رات کو اس کے پاس آ کر پڑا رہتا تھا اور اب رات کو غائب ہوتا تو کئی کئی دن بعد لوٹتا تھا۔ کچھ جادو ٹونے والوں کے پیچھے بھاگنے لگا تھا۔ کوئی تانترک سادھوؤں کی ٹولی مل گئی تھی۔ پتہ نہیں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ سیتا کو بہت یاد کرتا تھا۔

بارہ مہینے کے بعد کی بات ہے۔ پتہ نہیں کیا ہوا، ہیرا اپنے باندرہ والے فٹ پاتھ پر واپس لوٹ آئی۔ دگڑو کی تو ٹانگ ہی ناسور ہو گئی تھی۔

بہرام نے کئی بار کہا تھا: ''ابے مونسپلٹی میں چلا جا، انجکشن لگوا لے۔ نہیں تو کسی دن بھونکتا ہوا اٹھے گا۔''

لیکن دگڑو نہیں گیا۔

ہیرا نے بھی کہا ''چلا جا نہیں تو کسی دن ٹانگ کٹوانی پڑ جائے گی۔''

اور وہی ہوا!

جس دن ٹانگ کٹی، ہیرا ساتھ تھی۔ پہلے تو بے ہوش کیا اسے۔ اور پھر پورا دن لگ گیا ہوش میں آتے۔ جب ہوش میں آیا تو بہت رویا۔ ہسپتال والوں نے پورے پچیس دن رکھا۔ ہیرا بتاتی تھی:

''مان نہ مان، شینڈی پچیس دن تک ہسپتال کے باہر بیٹھا رہا۔''

ہسپتال سے آئی تو ہیرا، دگڑو اور شینڈی کے ساتھ ہی بس گئی۔ ہیرا نے پھر سے المونیم کے کچھ برتن جوڑ لیے۔ ایک کونے میں چار اینٹوں کا چولہا بھی بنا لیا اور دگڑو کے لیے پکانے بھی لگ گئی۔ پھر، سورج سے پہلے اٹھنے لگی تھی۔ اور کھار باندرہ کے آدھے سے زیادہ کچرے کے ڈبے چھان آتی۔

پتہ نہیں کیسے ایک دن، ایک گاڑی نے شینڈی کو اڑا دیا۔ بڑی تکلیف ہوئی دونوں کو۔ ہیرا بھی بہت روئی۔ اس دن بولی ''جب بھیکو مرا تھا گاڑی سے ٹکرا کے، ایسا ہی ہوا تھا۔''

دگڑو نے پوچھا ''کیا ہوا تھا؟''

''رات کو اٹھا تھا پیشاب کرنے کے لیے۔ سڑک کے پار جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کی طرف۔ اُدھر سے ایک کار آئی۔ بہت تیز...... اور اڑا دیا۔ گرا جب اوپر سے نکل گئی۔ روکا بھی نہیں سالے نے! صبح میونسپلٹی کی گاڑی آئی۔ ادھر اُدھر پوچھا۔ میں بولی نہیں۔ کیا کرتی؟ کون جاتا پولیس میں؟ اور پھر لاش لے کر جلاتا کون؟ میونسپلٹی کی گاڑی لے گئی۔ ایسے ہی جیسے شینڈی کو گھسیٹ کے لے گئی! فٹ پاتھ کی زندگی سالی ایسی اچھ ہے!''

..........☆..........

کرسٹل ہاؤس

نیلوفر اقبال

اس جوڑے میں کوئی خاص بات تھی، جو انہیں پہلی نظر دیکھنے میں دوسروں سے کچھ ہٹ کر اور منفرد بناتی تھی...... وہ انسانوں سے زیادہ پرندوں کا جوڑا نظر آتے تھے۔ دونوں کی جسامت ایک جیسی تھی۔ گورے رنگ، اکہرے بدن، کچھ کچھ آگے کو جھکے ہوئے، چہرے نوکیلے اور ناکیں پرندوں کی چونچوں کی طرح سامنے سے جھکی ہوئیں۔ جیسے وہ فرسٹ کزن ہوں۔ ہو بھی سکتے تھے۔ اور نہیں بھی۔ ممکن ہے کہ ہمہ وقت ساتھ رہنے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے سے مشابہت اختیار کر گئے ہوں۔ یہ جوڑا اس لیے بھی سب کی نظروں میں آتا تھا کہ روزانہ ٹھیک شام کے پانچ بجے وہ اکٹھے بلا ناغہ واک پر نکلتے تھے۔ عورت عموماً سفید ٹراؤزر اور پھولدار شرٹ میں ہوتی۔ آدمی بلیک ٹریک سوٹ اور سفید جوگرز میں ہوتا۔ دونوں کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی۔ وہ چھڑی کو ٹیکتے نہیں تھے بس چلتے وقت آگے پیچھے جھلاتے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں اپنے ساتھ چھڑی کیوں رکھتے تھے۔ ممکن ہے ماضی میں کبھی ان پر کسی کتے نے حملہ کر دیا ہو یا جنگلی سوروں کا جتھا کبھی ان کا رستہ کاٹ گیا ہو اور وہ حفظ ماتقدم کے طور پر چھڑی ساتھ رکھتے ہوں۔ بہر حال یہ ان کا سٹائل تھا۔ سلور گرے بال اور چھڑی ان پر خوب جچتے تھے۔

اس پورے علاقے میں ان کا گھر بھی دوسرے تمام گھروں کی نسبت بہت جاذب نظر اور باقی گھروں کی نسبت ممتاز نظر آتا تھا۔ یہ گھر اٹالین طرز تعمیر پر بنایا گیا تھا۔ باہر سے سینڈ سٹون (Sand Stone) سے مزین تھا اور کھڑکیاں کچھ ایسے بنی تھیں کہ اندر سل پر رکھی خوبصورت سجاوٹی اشیاء باہر دکھائی دیتی تھیں۔ اس گھر کی چھت پر سبز کھپریل تھی۔ ایک جانب گھر کی پوری سائیڈ آئیوی (Ivy) سے ڈھکی تھی جسے نفاست سے کھڑکیوں کے چاروں اطراف سے تراش دیا گیا۔ لان کے گرد دیوار بھی آئیوی سے ڈھکی تھی اور اتنی نیچی تھی کہ لان باہر سے پوری طرح دکھائی دیتا تھا اور وہ اس علاقے کا دلکش ترین لان تھا اور مکینوں کے اعلیٰ ذوق کی غمازی کرتا تھا۔ اسلام آباد کا پرانا سیکٹر ہونے کی وجہ سے یہ گھر پرانے اور گھنے پھولدار درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ سبز مخمل کی سی نفیس گھاس کارپٹ کی صورت لان میں بچھی تھی۔ موسمی پھولوں کے علاوہ یہ لان نادر قسم کے پودوں اور پیڑوں سے بھی مزین تھا۔ پھر ایک خاص چیز وہ چھوٹی سی ندی (Stream) تھی جو لان کے ایک طرف بنی ہوئی راکری (Rockery) تک جاتی تھی۔ اس سٹریم کے اوپر پانی لکڑی سے بنا خم کھایا ہوا چھوٹا سا پل تھا۔ اس پل کے پہلو میں ہی سرخ اور سفید دھاریوں والی خوبصورت چھتری کے نیچے چار کرسیوں کا سفید گارڈن سیٹ رکھا تھا۔ اس پر عام طور پر تو کوئی چائے پیتا نظر نہ آتا تھا لیکن کبھی کبھار جب ان کے بچوں میں سے کوئی آیا ہوتا تو لان میں خوب چہل پہل ہو جاتی اور اکثر شام کو یہ لوگ اسی میز پر چائے پیتے نظر آتے۔

اکثر جب ان کی دبئی والی بیٹی آئی ہوتی، لان میں رنگوں کے جھماکے سے ہوتے رہتے۔ اس کی سہیلیاں ملنے آتیں اور وہ لان میں ٹہلتی رہتیں یا چائے پیتیں۔ وہ دور سے بالکل انگریز نظر آنے والی خوبصورت لڑکی تھی جو زیادہ تر جینز اور ٹاپ میں نظر آتی۔ اس کے سنہرے رنگے ہوئے بال لہراتے رہتے۔ فیلپینو میڈ اس کے دو گورے گورے گول مٹول بچوں کے ساتھ لان میں بال کھیلتی یا انہیں ایک طرف نصب جھولوں اور سی۔ سا (See-Saw) پر لے جاتی۔ اکثر وہ بچے لکڑی کے پل پر چڑھتے، اترتے رہتے یا چھوٹے سے سفید Pomeranian کتے سے کھیلتے رہتے۔

کبھی کبھی اس لان میں بہت بڑی گارڈن پارٹی ہوتی۔ پودوں اور پیڑوں کے اندر سے ننھی ننھی بتیوں کی روشنی جھلملاتی۔ راکری میں نصب آبشار چالو کر دی جاتی۔ جس کے نیچے سنگ مرمر کا کائی زدہ Nude مجسمہ خوب مزے لے لے کر نہاتا۔ کیٹرنگ باہر سے کروائی جاتی۔ اکثر بار بی کیو ہوتا۔ پاس پڑوس کے گھروں سے کسی کو مدعو نہ کیا جاتا۔ البتہ بار بی کیو سے اٹھنے والا خوشبودار دھواں ان گھروں میں در آتا اور کراکری اور کانچ کی کھنک اور مہمانوں کے مہذب قہقہے کھڑکیوں کے راستے ان گھروں کے مکینوں تک پہنچ جاتے۔ وہ اپنی کھڑکیوں سے جدید ترین تراش خراش کے ملبوسات اور خوبصورت رنگوں کے جھماکے دیکھ پاتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگ کون ہوتے تھے اور کہاں سے آتے تھے۔ سڑک باہر تک گاڑیوں سے بھر جاتی تھی۔ مہمان آدھی رات کے قریب رخصت ہوتے تھے۔

گو اس گھر میں ان ہمسائیوں میں سے کوئی کبھی بھی مدعو نہ ہوا تھا۔ لیکن ان کے بارے میں ایک ایک بات مع ضروری و غیر ضروری جزئیات ہر ایک کو معلوم تھی اور اس جانکاری کا ذریعہ ڈومیسٹک سٹاف (Domestic Staff) تھا۔ ماسیاں تھیں جو پولن زدہ مکھیوں کی طرح گھر گھر بیج پھینکتی تھیں۔ پھر ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز تھے جو رات گئے مل بیٹھتے اور ہر قابل ذکر یا نا قابل ذکر خبر کا تبادلہ کر لیتے تھے۔ پھر ان کوٹھیوں کی اس لین میں ایک چاک چوبند بوائے کٹ ہیئر سٹائل والی مسز شمسی تھیں جو کسی این جی او سے منسلک تھیں۔ صرف وہی تھیں جو اس کوٹھی کی مالکن خاتون سے تعارف رکھتی تھیں۔ چونکہ وہ خاتون خود بھی اپنے وقت میں باوجود زیادہ وقت دوسرے ممالک میں رہنے کے خواتین کی تنظیموں کی فعال رکن رہ چکی تھیں لہٰذا مسز شمسی کسی نہ کسی طرح ان سے منسلک ہو چکی تھیں اور ان کی ڈنر پارٹیوں کے مدعوین کی لسٹ میں ان کا نام بھی تھا۔ انہی مسز شمسی نے اسی لین کے رہنے والے دوسرے گھروں سے بھی اچھے سوشل مراسم رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کا آنا جانا باقی کوٹھیوں کے فنکشنوں میں بھی تھا۔ جیسے کوئی ون ڈش پارٹی، میلاد یا ختم قرآن، جب میلاد یا ختم قرآن کا اختتام ہو جاتا اور عورتوں کے کھانے پینے کا دور شروع ہو جاتا تو اکثر عورتیں آہستہ آہستہ کھسکتیں مسز شمسی کے قریب پہنچ جاتیں جو کہ اچھی Conversationalist تھیں۔ بات کئی متفرق موضوعات سے ہوتے ہوئے لامحالہ اس کوٹھی کے مکینوں تک جا پہنچتی اور یوں پاس پڑوس والیاں کچھ نہ کچھ کرید لینے میں کامیاب ہو جاتیں۔

مسز شمسی سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ یوں تھیں۔ صاحب خانہ فارن سروس سے ریٹائرڈ تھے۔ سروس کے دوران دنیا کے بیشتر ممالک میں پوسٹنگ کے سلسلے میں رہ چکے تھے۔ لیکن ریٹائرمنٹ سے قبل مستقل رہائش کے لیے انہوں نے اسلام آباد میں یہ گھر تعمیر کروایا تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان سب کو امریکہ اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی تھی۔ اب دو بیٹے امریکہ میں سیٹل تھے۔ بیٹی شادی کر کے دبئی جا چکی تھی۔ بیٹے سال میں ایک بار اکثر کرسمس کے مہینوں میں آتے تھے۔ بیٹی البتہ اکثر آ جاتی رہتی تھی۔ گرمیوں میں یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے جاتے تھے۔ لہٰذا تنہائی ان کے لیے کوئی خاص بڑا

مسئلہ نہ تھی۔ اپنی دنیا اور زندگی میں مگن تھے۔ جب یہ لوگ اپنے بچوں کے پاس رہنے جاتے تھے، آس پاس والوں کو خبر ہو جاتی تھی۔ پورچ میں کھڑی گاڑیوں پر ترپال ڈال دی جاتی، لان میں خزاں رسیدہ پتے ڈھیریوں کی صورت جمع ہونے لگتے اور کبھی زور کی ہوا چلتی تو لمبی ڈرائیو وے پر زرد زرد پتے آپس میں ریس لگاتے۔ دبیز پردوں سے ڈھکی کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا ہوتا۔ صرف سکیورٹی گارڈ کے گیٹ کے ساتھ کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے، بس بتی روشن رہتی۔ موسمِ سرما سے پہلے چہل پہل پھر واپس آ جاتی۔ پورچ میں چم چم کرتی دھلی دھلائی گاڑیاں نظر آنے لگتیں۔ خاکروب چابکدستی سے ڈرائیو وے صاف کرتے۔ لمبی سفید پائپ کی مدد سے گھر کے چاروں اطراف کو دھویا جاتا۔ مالی ہمہ تن لان کی آرائش میں مصروف دکھائی دینے لگتا۔ اس طرح سب کو پتہ چل جاتا کہ صاحب خانہ آنے والے ہیں۔ پھر دو چار دن کے بعد کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے سے جھلکتی روشنی بتا دیتی کہ وہ واپس آ چکے ہیں۔

جس چیز نے اس لین کے دیگر مکینوں کا تجسس اس کوٹھی کے بارے میں بڑھا رکھا تھا، وہ اس کوٹھی کی اندرونی آرائش کے بارے میں داستانیں تھیں۔ ان داستانوں کی راوی مسز شمسی کے سوا کون ہو سکتی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ گھر کیا تھا عجائب خانہ تھا۔ دنیا بھر کے نوادرات خاص کر کرسٹل اس گھر میں جمع تھا۔ کرسٹل کی ایسی ایسی خوبصورت مصنوعات اس گھر میں جمع تھیں جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ فارن سروس میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں خوبصورت اشیاء خاص کر کرسٹل جمع کرنے کا ذوق خبط کی حد تک موجود تھا۔ فرانس، اٹلی، بیلجیم، جاپان غرضیکہ جہاں جہاں پوسٹنگ رہی یا یونہی سیر کے لیے گئے، وہاں سے خوبصورت ترین اور بیش قیمت سجاوٹی اشیاء لائے اور اپنے گھر میں سجائیں۔ کئی شوکیس، میزیں، پیڈسٹل، گھر کے کونے حتیٰ کہ سیڑھیاں بھی ان چیزوں سے مزین تھیں۔ دنیا بھر سے جمع کی گئی پینٹنگز اس کے علاوہ تھیں۔ شوق صرف چیزیں جمع کرنے اور سجا دینے کی حد تک نہ تھا بلکہ ان کی صفائی اور حفاظت بھی بہت لگن اور توجہ سے کی جاتی تھی۔ ایک نوکر دن رات صرف اسی کام کے لیے مامور تھا۔ وہ ہمہ وقت ڈسٹر اور سپرے وغیرہ سے لیس صفائی ستھرائی یا پالش میں لگا رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام اشیاء ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتیں۔

مسز شمسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جس دن گھر میں ڈنر پارٹی ہوتی ہے، اکثر مہمان گھر کا ایک طرح سے گائیڈڈ ٹور بھی لے لیتے ہیں۔ بلکہ جو پہلے بھی دیکھ چکے ہوتے وہ بھی شوقیہ ساتھ ہو لیتے کہ ان اشیاء میں ہمہ وقت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ کچھ چیزیں ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کا سانس اوپر نیچے رہ جاتا تھا۔ خاص کر کونوں میں کھڑے قدِ آدم جاپانی گلدان جن پر بنے خوش رنگ نقش و نگار اور چرند پرند اور مناظر کی دلکش تصاویر انسان کو حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ پھر لکڑی کی مصنوعات، آبنوسی مجسمے، بیمبو کی بنی اشیاء، ہر سائز کی جاپانی گڑیاں، مختلف طرز کے فاؤنٹینز (Fountains) غرضیکہ گھر کیا تھا حیرت کدہ تھا۔ ملنے جلنے والے اسے ''کرسٹل ہاؤس'' کے نام سے پکارتے تھے۔

مسز شمسی کی باتیں سن کر اکثر سننے والوں کا دل چاہتا کہ وہ بھی اس ''حیرت کدہ'' کو اندر سے دیکھ پاتے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کو تو اس گھر میں ہونے والی پارٹیوں میں کبھی ایک بار بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا ان کی عزتِ نفس اجازت نہ دیتی تھی کہ بن بلائے اور بلا تعارف محض گھر دیکھنے پہنچ جاتے۔ اس لیے مسز شمسی سے سنی ہوئی باتوں سے ہی تجسس کی تشفی کر لیتے...... لیکن ایک دن ایسا ہوتا ہے جب بلا مدعو کیے کسی کے گھر بھی جایا جا سکتا ہے اور ''کرسٹل ہاؤس'' میں بھی وہ دن آ گیا۔

موسمِ بہار کا آغاز تھا۔ کچھ دن سے اس کوٹھی کا مالی بڑی مستعدی سے اندر باہر موسمِ بہار کے پھولوں کی ننھی ننھی پنیریاں

تازہ تیار کی ہوئی کیاریوں میں بوتا نظر آ رہا تھا۔ اچانک صبح صبح اس لین کی تمام کوٹھیوں میں خبر پھیل گئی کہ ''کرسٹل ہاؤس'' کے صاحب خانہ کا اچانک رات کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے...... ان کے بیٹوں کی امریکہ سے آمد کا انتظار کیا جائے گا۔ تدفین دو روز بعد اتوار ہو گی۔

اس دن کرسٹل ہاؤس کے باہر لین سے لے کر ڈبل روڈ تک ان گنت گاڑیاں تھیں۔ چند رشتہ داروں نے فوری طور پر انتظام سنبھال لیا تھا۔ اس لیے شامیانہ، کرسیاں، چادریں و دیگر انتظام کر لیا گیا۔ سہ پہر تک ان کی بیٹی بھی دبئی سے آ گئی تھی۔ آج اس گھر میں وہاں کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے لوگوں کے علاوہ آس پاس کی کوٹھیوں میں رہنے والے ہمسائے بھی آنے والوں میں شامل تھے۔ گھر کی مالک سادہ سے سلیٹی لباس میں سیاہ چادر سر کے اوپر اوڑھے لاؤنج میں ایک کرسی پر سر نیہوڑائے خاموش بیٹھی تھیں۔ کچھ ایسے جیسے بیمار پرندہ گردن گرا دیتا ہے، ملنے والیاں اور رشتہ دار خواتین آتیں اور قریب آ کر گلے لگتیں۔ آہ وزاری اور رونے کی کچھ آوازیں بلند ہوتیں۔ پھر آنے والی کوئی نہ کوئی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتی۔ اور خاموشی چھا جاتی۔ یہ سوال ہر آنے والے کے ذہن میں تھا کہ یہ خاتون اتنے بڑے گھر میں اپنے شوہر کے ہمراہ رہتی تھی۔ کوئی تیسرا نہ تھا...... اب یہ کیا کرے گی......!

کچھ پہلی بار آنے والوں کی نظریں گھر میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں...... لیکن گھر اپنی آرائش کی پہلی والی صورت میں تھا ہی نہیں۔ مجسموں اور بڑی بڑی سجاوٹی اشیاء کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پر سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ فرنیچر گھسیٹ کر دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا تھا تاکہ آنے والوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔ لاؤنج کے وسط میں نصب فاؤنٹین بھی بند تھا۔ اس میں کہنی کے بل نیم دراز Nude مرمیڈ (Mermaid) پر کسی نے سفید چادر ڈال رکھی تھی۔ البتہ شوکیسوں میں سجی کرسٹل کی اشیاء بدستور جگمگا رہی تھیں۔ لیکن یہ موقع نہ تھا کہ نظروں سے بھی تحیر اور ستائش کا اظہار کیا جا سکتا۔ اس لیے جنہیں تجسس تھا وہ خاموشی سے اور چپکے چپکے چور نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ پورے ماحول پر اس گردن گرائے پرندہ نما عورت کی دلگرفتگی کا سایہ پڑا ہوا تھا۔ جیسے ہر شے اس کے لیے معنویت کھو بیٹھی ہو۔ کبھی کبھی وہ سر اٹھا کر اچانک سامنے خلا میں دیکھتی جیسے کسی نظر نہ آنے والی شے سے معصوم حیرت کے ساتھ پوچھ رہی ہو...... ''میرے ساتھ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اس لین کی کوٹھیوں میں سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ ''کرسٹل ہاؤس'' بکنے والا ہے۔ ان کے بیٹے پاکستان میں دو ہفتے سے زیادہ نہ رہ سکتے تھے۔ انہیں فوری طور پر اپنی اپنی جاب پر واپس پہنچنا تھا لہٰذا تمام فیصلے بجلی کی سی تیزی سے کرنے پڑے تھے۔ کرسٹل ہاؤس کی مالکن کو اپنے بیٹے کے ہمراہ امریکہ جانا تھا۔ جہاں انہیں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہائش اختیار کرنی تھی جو شادی شدہ تھا۔ چھوٹا بیٹا ہنوز کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور کیمپس میں رہائش پذیر تھا۔ ہر سننے والے کے ذہن میں ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا کہ یا خدا، اتنے ساز و سامان کا کیا ہو گا۔ مسز شمسی روزانہ اس گھر میں آنا جانا کر رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خاتون تو بہت کچھ اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ کارٹن بنا کر Ship کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بیٹے نے سختی سے منع کر دیا کہ وہاں اکوموڈیشن کم ہوتی ہے۔ اس کی امریکن بیوی اتنا Clutter پسند نہیں کرے گی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ اچھی فطرت کی مالک تھی اور اپنے شوہر کی ماں کو تنہا چھوڑنے پر اس کا دل نہیں مانا تھا اور وہ ساتھ رکھنے پر بخوشی تیار ہو گئی تھی...... پھر بھی کچھ یادگار چھوٹی چھوٹی چیزیں انہوں نے بکسوں میں گھسائی تھیں اور ایک آدھ چھوٹا سا کارٹن بھی بنا لیا تھا اور بس......

عورتیں کرید کرید کر گھر کی مالکن کے دل کے اندر کا حال پوچھتی تھیں یا دوسرے الفاظ میں یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آخر اتنے بے پناہ چاؤ اور لگن سے دنیا بھر سے اکٹھی کی ہوئی اشیاء سے جدائی کو آخر وہ خاتون کس طرح لے رہی ہیں۔ وہ اپنے تجسس

کی تشفی چاہتی تھیں۔ بے رحمانہ تشفی جو کہ مسز شمسی نے نہایت تسلی بخش انداز میں کر دی...... ہاں وہ اپنی کسی چیز سے جدا نہ ہونا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ اس کا کوئی ایش ٹرے بھی ایسا نہ تھا کہ جس سے اسے لگاؤ نہ تھا اور جسے وہ بخوشی چھوڑ دیتی۔ وہ تو ہر چیز ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اس پر خاصی بحث ہوئی تھی۔ اس کے بچوں کو اسے بہت سمجھانا بجھانا پڑا تھا...... لوگ تو ایک موت مرتے ہیں لیکن وہ عورت تو کئی کئی موتیں مر رہی ہے...... ہر شے سے تو اسے پیار تھا...... ہائے ہائے......!

کرسٹل ہاؤس کی تمام نادر اور بیش قیمت اشیاء کو نیچے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا تھا۔ ان پر پرائس Tags لگ گئے تھے۔ خود مسز شمسی نے کچھ پینٹنگز، کینڈل سٹینڈ اور کرسٹل کے گلدان خریدے جو تقریباً ایک تہائی قیمت پر بکے تھے۔ پھر انہوں نے فون کر کر کے دوسری کوٹھیوں کی خواتین کو بھی اکسایا کہ وہ اگر کچھ لینا چاہتی ہیں تو آدھی یا ایک تہائی قیمت پر بہت کچھ مل رہا ہے۔ البتہ چند نادر اور قیمتی اشیاء ان کی بیٹی نے چھانٹ کر اپنے ساتھ دبئی لے جانے کے لیے الگ کر لی تھیں۔ انہیں بڑے بڑے کارٹنوں میں پیک کیا جا رہا تھا۔ مسز شمسی کے کہنے پر دوسری خواتین نے بھی ہمت کی۔ کوٹھی کے لاؤنج میں ایک سرخ چہرے والا صحت مند ٹھیکیدار نما شخص ان اشیاء کو دکھانے اور بیچنے کا کام کر رہا تھا۔ چیزوں میں زیادہ قیمتی اور غیر معمولی اشیاء تو ان کی پارٹیوں میں مدعو ہونے والے متمول دوستوں نے ہی خرید لی تھیں۔ آس پاس کی خواتین بھی اب گلدان، ایش ٹرے اور لیمپ وغیرہ جیسی چیزیں اٹھائے کوٹھی کے گیٹ سے نکلتی نظر آتی تھیں۔ پھر بے شمار برینڈڈ امپورٹڈ کراکری تھی جس کا کسی بڑی کراکری شاپ والے نے اکٹھا سودا کر لیا تھا۔ تمام فرنیچر ایک استعمال شدہ فرنیچر میں ڈیل کرنے والے شوروم کے مالک نے اٹھوا لیا تھا۔ گھر والے چونکہ رات کی کسی فلائٹ سے گئے تھے۔ لہٰذا کسی نے انہیں جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چند روز بعد کوٹھی پر پینٹ پالش کرنے والے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے جن کی نگرانی سرخ چہرے والا ٹھیکیدار قسم کا آدمی کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ کرسٹل ہاؤس کے سامنے For Sale کی تختی لٹک رہی تھی...... یہ تھی "کرسٹل ہاؤس" کی کہانی۔

..........☆..........

چڑھاوا

محمد سعید شیخ

سیسل ہوٹل کے رومان پرور ماحول میں سب ٹورسٹس کی توجہ کا مرکز وہ جوڑا تھا جو بظاہر بے جوڑ دکھائی دیتا تھا لیکن جب وہ ڈائننگ ہال میں آتا تھا تو وہاں کی رونقوں میں ایک دم اضافہ ہو جاتا تھا۔ سب کی نظریں ان پر مرکوز ہو جاتی تھیں۔

یہ ہوٹل مری کے اس پرفضا مقام پر رہائش اور سیر کے لیے ایک طرح کا کلاسیکی مقام متصور ہوتا تھا۔ ہائی کلاس جنٹری پنجاب کے میدانوں کی گرمی سے پناہ لینے کے لیے کچھ دنوں کے لیے یہاں آکر ٹھہرتی تھی۔

ہر گرمیوں کے موسم میں دو چار جوڑے یہاں ہنی مون منانے آ جاتے تھے اور یہاں چند دن گزار کر انہیں آئندہ زندگی کی خوشگوار یادوں کا حصہ بناتے تھے۔

مگر وہ جو ایک جوڑا تھا ان کے متعلق وہاں مقیم مہمانوں کا خیال تھا بھلے ہی ان میں بیوی کا رشتہ ہی ایک مناسب رشتہ تھا مگر وہ ہنی من منانے تو نہیں آیا ہوگا۔ ان کی عمروں کا فرق اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ وہ کسی اور غرض سے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، ہنی مون۔ نہیں ان کے متعلق ایسا سوچنا نامناسب سی بات لگتی تھی۔ وہ جو حوا زادی تھی، عورت اور لڑکی کے درمیان کی کوئی شے تھی۔ وہ عورت تھی نہ لڑکی اور نہ ہی ان صاحب کی بیوی۔ عجیب سا رشتہ ہوگا ان کے درمیان۔

تیس بتیس سال اس کی عمر ہوگی اور اس کے ساتھی جسے وہ شاہ جی کہتی تھی، ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ عورت اگر اسے مان لیں تو وہ کمال کی تخلیق تھی۔ سنہری چمکتے رنگ کی جلد سے اس کا وجود منڈھا ہوا تھا۔ آنکھیں براؤن تھیں جو ہر وقت خمار آلود دکھائی پڑتی تھیں اور جب نگاہیں اُٹھاتی تھی تو اسے اپنے بھاری پپوٹے اٹھانے کے لیے کوشش کرنا پڑتی تھی۔ قد بت میں عجیب سا تناسب اور توازن تھا جیسے ہر عضو تول کر بنایا ہو۔ اسے ایک اپنے سے بڑے شخص کا ساتھی ہونے کا کوئی غم نہیں تھا۔ جسے اپنے وجیہہ اور شکیل ہونے کے ساتھ اپنے ماضی پر بڑا مان تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے بادشاہت کے آثار ٹپکتے تھے۔ وہ بھی اس بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتا تھا کہ اس نے اپنی اصل عمر گزار لی تھی اور اب وہ اس عورت کے سہارے زندہ تھا جو اس کی بیوی تھی۔

دیکھنے والوں نے ان کے درمیان یہی رشتہ مانا تھا۔ اور کوئی رشتہ بنتا نہیں تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس کے چہرے مہرے میں اس کی جوانی کے عکس کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ تو یقیناً یہ اس کی پہلی شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بہت سوں نے اندازہ لگایا تھا۔

اگر یہ عورت اس شخص کی بیوی ہے جو اکثر وہیل چیئر پر بیٹھ کر ڈائننگ ہال میں آتا تھا، تو کیا وہ اس سے محبت کرتی ہوگی؟

اس شام انہیں دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا تھا۔

ان کے قریب میں مائرہ کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ہم کئی دنوں سے انہیں اکٹھا دیکھ رہے تھے اور خوش ہوتے تھے اور میں اکثر میٹھی نگاہوں سے مائرہ کو دیکھتا تھا۔

''دیکھو مائرہ وہ کس طرح اس کے کندھوں سے اپنا سینہ لگائے کھڑی ہے اور اس کے چہرے پر اتنی تازگی ہے جیسے اسے کسی خیال نے پریشان نہ کیا ہو۔ ہمیں بھی ایسی محبت کی خواہش رکھنی چاہیے۔''

''کیوں نہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔'' مائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میری نظر بدستور ان پر تھی۔ ''یہ محبت ہی تو ہے جو اس شخص کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ دیکھتی نہیں ہو زندگی کیسے لہروں کی صورت اس عورت کے جسم سے اس بوڑھے کے جسم میں منتقل ہو رہی ہے۔ اس کے چہرے سے اس کا عکس جھلملا رہا ہے۔ بعض بوڑھے صرف جوان اور زندہ رہنے کے لیے جوان لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔''

''تو پھر بے چاری جوان لڑکیوں کو کیوں سزا دی جاتی ہے؟'' مائرہ اب شرارت کے موڈ میں تھی۔

''اس عورت کے چہرے سے تمہیں کیا ایسا لگتا ہے کہ وہ سزا یافتہ ہے؟'' میں نے چبھتی نظر سے اسے دیکھا۔

''میں تو ایسا نہیں کہتی لیکن کیا پتا ہے اس کے دل میں کیا ہے۔ دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔''

باہر بارش شروع ہوگئی تھی۔ ٹین کی چھت پر بارش جلترنگ بجا رہی تھی۔

''سردی بڑھ جائے گی۔ میں بھی آئی شاہ جی۔'' یہ کہہ کر وہ عورت تیز تیز قدموں سے چلتی ڈائننگ ہال سے نکلی اور ساتھ والے برآمدے میں اپنے کمرے سے گرم چادر لائی اور لا کر شاہ جی کے کندھوں پر لپیٹ دی۔

''دیکھو۔ وہ کیسے ماں کی سی توجہ سے اپنے میاں کا خیال رکھتی ہے۔''

''کیوں نہ ہو۔ عورت کا پسندیدہ کردار ماں کا ہی تو ہے۔ وہ تو بچپن سے ہی گڑیاں پالنا سیکھ جاتی ہے۔''

اس عورت نے ہمیں اچٹتی ہوئی نگاہ سے دیکھا جیسے اس نے ہماری بات سن لی ہو۔ میں نے غور سے اس کے چہرے پر کسی مسکراہٹ کے پھیلنے کی توقع میں نظر جمائی۔ اب اس نے اپنے دونوں بازو شاہ جی کے کندھوں پر پھیلا رکھے تھے۔

تین چار جوان جوڑے جن میں ہم بھی شامل تھے، اب بھی ڈائننگ ہال سے اٹھنے کو تیار نہیں تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے مائرہ اس کی عمر کتنی ہوگی؟''

''تیس سال کی تو ضرور ہوگی۔ بتیس کی بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت کے لیے عمر کی قید تو ضروری نہیں۔''

''شکر ہے میں تم سے آٹھ دس سال ہی بڑا ہوں۔'' میں نے مذاق میں کہا۔

''وہ تو تم ہو......!''

''کیا مطلب؟'' میں نے اس کے لہجے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہماری عمروں میں اس سے زیادہ بھی فرق ہو سکتا تھا۔ پھر بھی میں تم سے شادی کر لیتی کیونکہ تم میرے ماں باپ کی پسند ہو۔'' وہ پھر شوخ ہو رہی تھی۔

''چلو۔ پھر ان کی بات کرتے ہیں جو زیادہ دلچسپ موضوع ہے۔''

''اصل میں تمہارا دھیان ہی اس عورت کی طرف ہے۔'' اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

''تمہاری بات ہے تو درست ۔ میں تمہاری ذہانت کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔''

''اچھا۔ پوچھیں۔'' وہ جیسے تیار ہوگئی۔

''وہ دونوں۔'' میں نے آنکھوں سے اس جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ میاں بیوی ہیں جیسے کہ ہم سب شاید یہ مان چکے ہیں۔ تو کیا وہ۔ یعنی اس لڑکی کی شادی اس کی پسند اور مرضی سے ہوئی ہوگی؟''

''مجھے تو وہ خوش نظر آتی ہے۔'' مائرہ نے کچھ سوچتے ہوئے اس عورت کی طرف دیکھا اور بات اپنے منہ سے نکال دی۔

''اس کے چہرے پر ایک ناراض، مجبور عورت کی بے چارگی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنے خاوند سے بندھی ہوئی دکھائی نہیں پڑتی۔''

اب وہ بڑی بے نیازی سے اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی مزے لے لے کر چائے پی رہی تھی۔ چائے کی گرمی اور مٹھاس نے اس کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔ وہ اپنے شاہ جی کی کسی بات پر ہنس رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک پرسکون اور مطمئن عورت کے چہرے سے کم نہیں تھا۔

اور میرا تخیل بھی اپنی کرشمہ سازی پر تلا ہوا تھا۔

''مائرہ۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے شاہ جی کی عقیدت مند ہو۔ ایک طرح کی پجارن جسے اس کے ماں باپ نے اس شاہ جی کو اپنا محسن سمجھ کر چڑھاوے کے طور پر پیش کر دیا ہو۔''

اب کچھ اور لوگ بھی ڈائننگ ہال میں آ گئے تھے۔ ملازموں نے انگیٹھی جلا دی تھی جس کے شعلوں کا رقص بہت خوش کن تھا۔ سب کی نظریں زاویے بدل بدل کر اس جوڑے کو دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ عورت جو ہلکے ہلکے سُروں میں اپنے میاں سے باتیں کر رہی تھی اور ہم سب اس کے متعلق سوچ رہے تھے۔

''تم اس کے لیے رحم دلی محسوس کر رہے ہو دلدار؟'' میری بیوی نے میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ مگر مجھے نسوانیت کا مکمل شاہکار لگ رہی ہے۔ اور تم جانتی ہو میں حسن کے اظہار سے بہت متاثر ہوتا ہوں۔''

''تم کہانی کار جو ہو۔ زندگی کو کہانی کی صورت دیکھتے ہو۔''

''تخلیق، کسی بھی رنگ میں ہو مجھے بہت انسپائر کرتی ہے۔''

''اللہ نے اور بھی تو بہت کچھ پیدا کیا ہے۔'' وہ بولی۔

''ضرور۔ مگر اس وقت تو وہی سامنے ہے۔'' اور پیشتر اس کے کہ وہ جیلس ہونے لگتی، میں نے کہا ''مگر تم بھی اپنی جگہ کم نہیں ہو۔ آخر ہو تو اسی کی ہم زاد۔''

''مگر میں داسی نہیں ہوں۔''

''اور میں ابھی اتنا مالدار بوڑھا بھی تو نہیں ہوا۔'' میں نے بھی ترت جواب دیا۔

اتنی دیر میں وہ عورت اپنے شاہ جی کی وہیل چیئر دھکیل کر سامنے دیوار کے پاس انگیٹھی میں جلتی آگ کے قریب لے گئی تھی اور خود ایک اور کرسی کھینچ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ آگ کے شعلوں کا عکس اس کے چہرے سے جھلکنے لگ گیا تھا۔ اس

کے چہرے پر ایک غیر فطری سا خوابگوں تاثر پھیلا ہوا تھا۔ وہ جیسے مسکرانے پر مجبور تھی۔ شاہ جی نے شاید اسے کہہ رکھا تھا "میرے لیے مسکرایا کرو۔" اور وہ مسکرا رہی تھی اور دیکھنے والی ساری آنکھیں اسے بڑے شوق سے دیکھتی تھیں۔ بیرے چائے پیش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر حرکت کر رہے تھے۔

اور وہ جیسے سب کی نظروں سے بے نیاز اپنے شاہ جی کے لیے مسکرا رہی تھی۔ جو اس وقت اپنی وہیل چیئر پر پوری تمکنت سے بیٹھا تھا جو زندگی پر اپنے اختیار سے مطمئن تھا۔ اس نے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور آہستہ آہستہ اسے سہلا رہا تھا۔

"تمہیں اس کا متبسم چہرہ نظر آتا ہے لیکن کیا تم جانتی ہو اس کے دل میں کیا ہے؟" میں نے مائرہ کی محویت میں دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

"تو تم کیا یہ سوچ رہے ہو کہ وہ اندر سے یقیناً دکھی ہوگی۔ حالانکہ کوئی خیال، کوئی یقین کسی بھی انسان کو خوش رکھنے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ کسی دھوکے میں ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس کے حقیقی ہو۔ اور یہ بھی یاد رکھو دلدار۔ زندگی کھیل کھیل میں بھی گزاری جا سکتی ہے۔ ہر وقت آدمی سنجیدہ بھی تو نہیں رہ سکتا۔"

"ویل سیڈ۔"

پھر اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات پر مسکرا رہا ہوں جیسے میں اسے سنجیدگی سے نہ لے رہا تھا۔

"ویسے بہت سادہ سی بات ہے۔" اب میری بات پر وہ مسکرائی جیسے اسے میری بات کے سادہ ہونے کا یقین نہ ہو۔

"اس عورت کے نزدیک جو شام سے یہاں ہم سب کی توجہ کا مرکز ہے، آخر کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا، اس کے بغیر وہ کیسے اتنے یقین سے اتنے جاندار طریقے سے مسکرا سکتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا وہ کسی دھوکے میں ہے یا وہ کھیل کھیل میں زندگی گزار رہی ہے۔"

جونہی میری بات مکمل ہوئی۔ وہ سپیشل جوڑا اٹھا۔ اب کے عورت نے کرسی کے ساتھ ٹکی واکنگ سٹک اٹھا کر اپنے شاہ جی کے ہاتھ میں تھمائی اور آگے بڑھ کر اپنا کندھا اسے پیش کر دیا۔ وہ مرد اٹھا اور اس کے سہارے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہال سے باہر نکل گیا۔ دوسرے لوگ بھی اس کے بعد باری باری اٹھ کر جانے لگے۔

ہم وہاں سے اٹھ کر برآمدے سے باہر نیچے لان میں آ گئے۔ بارش تھم گئی تھی۔ بادل بکھر گئے تھے اور ٹھنڈی چاندنی گھاس پر برس رہی تھی۔

جوتے ہم نے لان کے کنارے اتار دیے اور ٹھنڈی گھاس میں اتر گئے۔ گھاس اور چاندنی کی خنکی ہمارے تلووں کی راہ جسم کے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی۔

"اُدھر دیکھو۔ کیسے پہاڑ چاندنی میں خاموشی سے بھیگ رہے ہیں۔" مائرہ نے سامنے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں جیسے کسی کا سینہ سانس لیتا ہو۔" اور یہ کہہ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس کے جسم میں سنسنی دوڑتی میرے ہاتھ نے محسوس کی۔

"تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس جگہ کی سب سے بڑی خوبصورتی کیا ہے؟"

"فطرت سے قربت۔" اس نے آنکھوں سے سوچتے ہوئے کہا۔

اور میں نے اس کی آنکھیں چوم لیں جن میں خواہش کی جوت جل رہی تھی۔ "یہاں آ کر میں خود کو ایک نئی مخلوق محسوس

کرتی ہوں۔"

"یہی تو اس جگہ کا حسن ہے۔ مجھے لگتا ہے میں کوئی خواب دیکھتا ہوں۔ جیسے ہم کسی ابد آباد میں آ گئے ہوں۔ مری، میں اسے سکون آباد بھی کہہ سکتا ہوں۔ جیسے ہم کسی جنت میں آ گئے ہوں۔ جیسے ہم کسی تصویر کا حصہ بن گئے ہوں۔"

فضا میں ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ شام اور رات گلے مل رہی تھیں۔ "چلو، تھوڑی دیر کمرے میں چلتے ہیں۔ ایک دوسرے کے جسم سے حدت حاصل کرتے ہیں۔ پھر کھانے کے لیے جائیں گے۔"

"اور جہاں تم پھر اس خوبصورت عورت کو دیکھو گے اور کوئی کہانی سوچو گے۔"

"ہاں۔"

"اور تم سوچتے ہو، وہ عورت حقیقی نہیں۔ کوئی کہانی ہے جسے تم قلم سے کاغذ پر اتار لو گے تاکہ وہ تمہاری ملکیت بن جائے۔" مائرہ نے خوبصورت انداز میں میرے خیال کو مہمیز دی تھی۔

ڈنر پر وہ جوڑا موجود نہیں تھا۔ ان کی غیر حاضری میں مجھے کھانا بدمزہ لگ رہا تھا۔ میں رہ نہ سکا۔ ایک ویٹر سے پوچھ ہی لیا جسے ہم نے شاہ صاحب کے کمرے میں سروس کرتے دیکھا تھا۔

"آج شاہ صاحب اور ان کی بیگم دکھائی نہیں دے رہے؟"

"وہ جی شاہ صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ انہوں نے کھانا بھی کمرے میں منگوایا ہے۔"

ویٹر دوسرے ٹورسٹوں کو سرو کرنے چلا گیا تو میں نے مائرہ سے کہا۔ "کھانے کے بعد تم ذرا شاہ صاحب کو دیکھ آنا۔ آخر تم ڈاکٹر ہو اور وہ ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔"

"ہاں۔ ضرور دیکھ آؤں گی۔ آخر وہ تمہارے پسندیدہ کردار ہیں۔"

"ٹھیک ہے اور میں تمہارا فرسٹ ایڈ کا بکس اٹھا کر ساتھ چلوں گا۔"

"تاکہ تم انہیں قریب سے دیکھ سکو۔ ہے نا!"

"ہاں۔ میں اس عورت کو سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیوں کر اتنے بوڑھے شخص کی اتنی زیادہ دیکھ بھال اور نگہداشت کر سکتی ہے۔ میاں بیوی کے رشتے سے ہٹ کر ان کے درمیان کیا تعلق ہے۔"

"اچھا بابا! تم بھی میرے ہمراہ چلنا۔ ابھی کھانا تو کھاؤ۔ میں نے کباب کھا لیے اور پتا ہی نہیں چلا ان کا ذائقہ کیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

"تم ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔ مری کے موسم کی طرح۔"

"اب مجھے بھی بنانے لگے۔ یہ کیوں بھول گئے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔" اس نے شرارت کی۔

"خدارا! مجھے کبھی بھول جانے دیا کرو کہ تم میری بیوی ہو۔"

اور ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے جسے سن کر کئی لوگوں کے لقمے ان کے ہاتھوں میں اٹھے رہ گئے۔

کھانا اور پھر قہوہ پینے کے بعد ہم اٹھ کر ہال سے باہر آ گئے۔ اپنے کمرے میں آ کر فرسٹ ایڈ بکس اٹھا کر مائرہ نے مجھے تھمایا اور ساتھ والے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

اس عورت نے دروازے کا ایک پٹ وا کیا۔ مائرہ بولی "پتا چلا تھا شاہ صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ میں ڈاکٹر

ہوں۔ سوچا دیکھ آؤں۔ اگر آپ کو ضرورت ہو۔''

''کیوں نہیں۔ مریض کو اور کیا چاہیے اگر مسیحا اس کے پاس چل کر آ جائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اندر کا راستہ چھوڑ دیا۔

ہم آگے بڑھے۔ شاہ جی لیٹے ہوئے تھے۔

''شاہ جی، ہمارے پڑوس میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔''

شاہ صاحب نے اپنا جسم کھینچا اور بیڈ کی پشت سے کمر لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ ان کا چہرہ بخار کے اثر سے سرخ ہو رہا تھا۔ مائرہ نے ان کی نبض چیک کی اور پھر تھرمامیٹر سے ٹمپریچر لیا۔ ''ہلکا بخار ہے۔'' یہ کہہ کر مائرہ نے ان کی چیسٹ اور پھر پشت پر اسٹیتھوسکوپ لگا کر دیکھا۔

''چیسٹ تو کلیر ہے۔ سردی سے پرہیز کریں اور سوپ وغیرہ پینے کو دیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ پیناڈول دو گولیاں فی الحال کافی ہوں گی۔'' اور پھر مائرہ نے فرسٹ ایڈ بکس سے پیناڈول گولیوں کا ایک پتا نکال کر دے دیا۔

''بہت شکریہ۔ کرم فرمائی۔ آپ نے بہت زحمت کی، اور اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو ہمارے ساتھ چائے کا ایک کپ نوش فرمائیں۔''

اتنی دیر میں میں ان کے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ کمرے میں خاص قسم کی مہک تھی جس میں اس کے باسیوں کے ملبوسات کی مہک بھی شامل تھی۔ عندلیب نے ہماری نیم رضامندی بلکہ میری مکمل رضامندی دیکھ کر دیوار پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ ہم دونوں قریب پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ویٹر نے دروازے پر دستک دی۔ بیگم صاحبہ نے اسے تین چائے کا آرڈر دیا۔ ''آپ تو نہیں لیں گے۔'' شاہ جی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاہ جی کا چہرہ آج کچھ مرجھایا ہوا تھا۔ ''ان کے لیے شاید یہاں کا موسم بہت اچھا نہ ہو۔'' مائرہ نے ڈاکٹروں والی بات کی۔

''اصل میں مری کے پہاڑوں کے لیے ان کے دل میں بڑی پسندیدگی ہے۔ ہم ہر سال یہاں آتے ہیں۔ کسی سال نہ آئیں تو شاہ جی کا وہ سال گویا بے مزہ گزرتا ہے۔''

''یہ ٹھیک کہتی ہیں لیکن میرے شوق اب انہیں کے دم سے پورے ہوتے ہیں۔'' شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ میری دوست بھی ہیں۔'' وہ بڑی محبت سے اس کا ذکر کر رہے تھے۔

اتنی دیر میں چائے آ گئی۔ یہ وہی ویٹر تھا جس نے ہمیں شاہ جی کے بیمار ہونے کی اطلاع دی تھی۔

چائے اس محترمہ نے خود بنا کر ہمیں پیش کی۔

جانے کے لیے ہم اٹھے تو اس نے بڑی محبت سے ہماری مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔ جب ضرورت ہو آپ مجھے بلا سکتی ہیں۔''

اس نے ایک دفعہ پھر ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔

''لو بھئی۔ آپ کی اسے قریب سے دیکھنے کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔'' مائرہ نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔

''میری طرف سے تمہارا شکریہ ـــــ اور اب تم کسی بھی وقت اس سے یہ پوچھ سکو گی کہ آخر وہ کیسے اپنی عمر سے دگنی عمر کے شخص سے باندھ دی گئی۔''

''تم اب بھی یہی سمجھتے ہو کہ وہ اپنی رضامندی کے بغیر شاہ جی کے ساتھ بندھی ہے۔''

''ہاں۔ میں اپنی رائے پر قائم ہوں جب تک کہ تم یہ ثابت نہ کر سکو کہ ایسا نہیں۔ ویسے ایسا ہو کیسے سکتا ہے۔'' میں جیسے اس سے شرط باندھنے کو تیار تھا۔

''تم نے دیکھا نہیں شاہ جی جب اپنی پشت کے بل سیدھے ہو رہے تھے تو ان کے منہ سے درد بھری آواز نکل گئی تھی۔''

''بخار تو انہیں زیادہ نہیں تھا مگر وہ مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔'' مائرہ نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ ستر سال کی عمر کے تو ضرور ہوں گے اور ان کی بیگم۔ وہ لڑکی زیادہ سے زیادہ تیس بتیس سال کی ہوگی۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ان کی زندگی اتنی سادہ نہیں۔ اس میں کوئی راز کی بات ضرور ہے اور وہی میں جاننا چاہتا ہوں۔''

اگلے روز وہ اپنے کمرے میں ہی رہے۔ شاہ جی کی بیگم ڈاکٹر کے مشورے پر سختی سے عمل کر رہی تھی۔ شاہ جی کو سردی سے بچا کر رکھ رہی تھی۔

باہر بڑی سنہری دھوپ نکلی تھی۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا جب میں نے شاہ جی کی بیگم کو کمرے سے نکلتے دیکھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ مسکرائی اور میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''شاہ جی کیسے ہیں؟''

''جی بخار تو اتر گیا ہے۔ بس کچھ کمزوری محسوس کر رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ آگے نکل گئی۔ برآمدے سے مڑ کر نیچے لان میں اتر کر ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ اس نے سنہری رنگ کی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی جس کے سر سے سرک جانے سے اس کے چمکدار گھنے بال اس کے کندھوں پر بکھر گئے تھے۔ مجھے تو شروع ہی سے کھلے بال بڑے پرکشش لگتے تھے۔ دھوپ سے ابھی تھوڑی دیر میں اس کا چہرہ چمکنے لگے گا۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں گیا۔ مائرہ نے شب خوابی کا لباس بدل لیا تھا۔

''وہ بیٹھی ہے۔ لان میں اکیلی۔ جاؤ اسے کمپنی دو۔ شاید تمہیں اس سے بے تکلفی سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔''

میں مائرہ کے ذریعہ اس خوبصورتی کے خزانے میں سیندھ لگانا چاہتا تھا تاکہ اس کے اندر سے کسی راز کی جانکاری حاصل ہو سکے۔

مائرہ سمجھ گئی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر لان میں چلی گئی۔ اس نے چائے کا آرڈر کر دیا۔ وہ مائرہ کی احسان مند بھی تھی۔ چائے کے دوران مائرہ نے بڑی احتیاط سے پوچھ ہی لیا۔

''شاہ جی کا آپ کتنا خیال رکھتی ہیں!''

''اصل میں میرا ان سے جسمانی اور روحانی رشتہ ہے۔ میری ماں نے مجھے ان کا خدمتگار بنا کر ان کی نذر کیا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں میں شاہ جی کی دعاؤں کے طفیل ان کی شادی کے دس سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ جب میرے ماں باپ اولاد سے مایوس ہو چکے تھے۔ بعد میں، میرے بعد میری ماں کے دو بیٹے بھی ہوئے تھے۔ شاہ جی کے ہمارے خاندان پر بڑے احسان ہیں۔ ان

کے احسانات کا بدلہ اتارنے کے لیے ہم غریبوں کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ میری ماں نے مجھے ہی ان کو سونپ دیا۔''

''شاہ جی اور آپ کی عمروں کا فرق بہت نمایاں نہیں ہے؟''

مائرہ نے اس خوبصورت عورت سے پوچھا تھا جس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

''ہوگا۔ مگر شاہ جی اپنی محبت اور مہربانی سے اس فرق کو مٹا ڈالتے ہیں اور مجھے کسی شے کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے۔''

مائرہ نے یہ جاننے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اپنی زندگی کی کسی بھی کمی کا ذکر کرے لیکن اس نے کسی محرومی کا ذکر نہیں کیا۔

''تو کیا وہ اپنی قسمت پر خوش ہے؟''

میں اب بھی مطمئن نہیں تھا۔

''اور تمہیں حیرت نہیں ہوئی؟''

''ہوئی تو ضرور لیکن اب میں اس کے دل کا حال تو نہیں جان سکتی۔ ہو سکتا ہے قدرت نے اسے بہت بڑا دل دیا ہو۔ آخر کچھ تو ہوگا اس کے پاس جو اسے خوش رکھتا ہے۔''

چند دنوں بعد وہ لوگ نیچے میدانوں میں اتر گئے اور میں یہ کبھی نہ جان سکا کہ ان کے درمیان رشتے کی بنیاد کس جذبے پر تھی۔



بھرم

نصرت منیر

''ہائے کیسا پیارا خواب تھا۔'' تجو نے کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کھڑکی کھٹکھٹا کر آگے نکل گیا اور تجو رات کے سناٹے میں خوف سے کانپ گئی۔ گرم گرم لحاف سے نکل کر چٹخنی لگانے کے متعلق ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ تیز جھونکے کے ساتھ سوکھے ہوئے زرد پتے خبیث روحوں کی طرح اڑتے ہوئے کمرے میں آ کر ناچنے لگے۔ دن میں یہی پتے صحن میں بکھرے ہوئے دیکھ کر تجو اداس ہو جایا کرتی اور اجڑے اجڑے درخت کی ننگی ٹہنیوں کو دیکھ کر اسے پورے گھر کی فضا پر خزاں کا گمان ہونے لگتا...... آنگن میں لیٹے لیٹے میر کی غزلیں پڑھتے ہوئے جب کبھی کوئی زرد پتہ ہوا میں ڈولتا ہوا اس کے پاس آ کر گر جاتا تو وہ اسے جلدی سے اٹھا کر یوں کتاب میں محفوظ کر لیتی جیسے وہ بھی میر کا ایک شعر تھا جو ذرا سی لاپرواہی پر اسے بھول جاتا......

''بے چارہ پناہ لینے آیا ہے۔'' اور یوں تجو کی کتابیں اور رسالے اس کے اداس ساتھیوں کو سمیٹ لیتے، مگر رات کی گہری خاموشی میں ہوا کی سائیں سائیں اسے بدروحوں کی چیخیں محسوس ہوئیں وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑکی بند کرنے لگی۔

دالان میں ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ جب سے امی کا انتقال ہوا، تجو کی ساری چاہت، خوشیاں اور وابستگی ابو کے ساتھ منسلک ہو گئی تھیں۔ ان کا اترا ہوا اداس اور غمگین چہرہ دیکھ کر اس کا دل ڈوب سا جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ایسے میں رفیق میاں خود کو کوس کر رہ جاتے اور تجو کو یوں ٹوٹ ٹوٹ کر پیار کرتے کہ ان کا اپنا دکھ بھی دو چار آنسوؤں میں بہہ جاتا۔ پھر گھنٹوں وہ اسے اپنے بچپن کے دلچسپ واقعات سناتے، لطیفے چلتے اور ان کی بٹیا چائے بناتے بناتے عاجز آ جاتی۔

دن بھر دفتری کاموں میں جُتے رہنے کے باوجود رفیق میاں پڑھنے لکھنے کے لیے ضرور وقت نکال لیا کرتے...... تجو ان کے رات گئے تک جاگنے پر ہر صبح اعتراض کرتی مگر رفیق میاں ایسی عاجزی سے اپنی مجبوری اور عادت کا اظہار کرتے کہ تجو کو ان پر پھر پیار آنے لگتا...... مگر آج رات دو بجے تک جاگتے رہنے پر اسے ہلکا سا غصہ آ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ابھی ان کے پاس جا کر خوب لڑائی کرے لیکن سرد ہوا کی چیخوں اور تاریکی نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ جانے اور نہ جانے کا ابھی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ ابو ٹارچ لیے آہستہ سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

''ابو...... ابو جان......'' تجو نے زور سے انہیں پکارا۔ ٹارچ بجھ گئی اور ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکیاں اور دروازے بج اٹھے۔ تجو نے سہم کر جلدی سے کھڑکی بند کی اور شیشوں میں سے جھانکنے لگی۔ دو سائے صحن کو تیزی سے پار کر گئے...... اور تجو ''ہائے

چور، ہائے چور...." کہہ کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ رفیق میاں ہڑبڑا کر اٹھے اور دوڑ کر صحن میں چلے گئے۔ اندھیرے میں ان کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا اور وہ دھڑام سے گر پڑے۔ ججو بند کمرے میں دیوانوں کی طرح چلانے لگی۔ آن کی آن میں شور سن کر پڑوسی لٹھ اور ڈنڈے لیے دروازے کھلے دیکھ کر بلوائیوں کی طرح گھر میں گھس آئے...... ڈیوڑھی میں صندوق اور گٹھڑیاں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر چوروں کے آنے کا راستہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ رفیق میاں ہمیشہ سونے سے پہلے خود دروازے بند کیا کرتے تھے اور غلطی کر جانے کا انہیں کسی طرح یقین ہی نہ تھا۔ جلدی میں بھاگتے ہوئے البتہ چور اپنا ایک جوتا بھی وہیں چھوڑ گیا تھا...... لوگ ششدر اور حیران کھڑے تھے۔

"کچھ لے تو نہیں گئے؟" ایک پڑوسی نے للچائی ہوئی نظروں سے سامان کو دیکھتے ہوئے پوچھا...... دیکھتے ہی دیکھتے میں صندوق کھل گئے اور زرق برق کپڑے اور زیورات فرش پر پھیل گئے۔ "پورا جہیز ہے!" ایک نے دوسرے کے کان میں کہا۔

رفیق میاں کے چہرے پر پریشانی کے ساتھ ہی اداسی اور غم امڈ پڑا۔ "کیسی محبت اور چاؤ سے زبیدہ ایک ایک کپڑا خریدا کرتی تھی......" یہ سوچتے سوچتے وہ قبر کی گہرائیوں میں اتر گئے۔

"سب کچھ ٹھیک ہی لگتا ہے، آپ فکر نہ کیجیے۔" رفیق میاں نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو چل پڑے۔

ججو کو تو اب گھر کے ہر کونے میں چور نظر آنے لگے۔ وہ خوفزدہ اور سہمی ہوئی رات بھر ابو سے بے ربط سی باتیں کرتی رہی۔

"صبح آپ دفتر نہیں جائیں گے۔" ججو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"دن میں چور نہیں آتے پگلی!" ابو نے اسے پیار سے ساتھ لپٹاتے ہوئے جواب دیا۔

شام ہونے تک وہ امی کو یاد کر کے کئی مرتبہ رو دی۔ وہ جب تک زندہ تھیں تو کبھی گھر میں کوئی چور نہ آیا تھا۔ تنہائی میں نہ ہی کبھی ڈر آیا اور نہ ہی کبھی وہ ایسی اداس ہوئی۔ پھوپھی جان نے کبھی اتنی سختی سے خشک خشک لیکچر نہ پلائے۔ دن بھر وہ قلانچیں بھرتی رہتی تھی۔ امی کی ڈانٹ میں بھی اتنی ملائمت ہوتی کہ وہ اسے صرف آنکھ بھر کے دیکھتیں اور پھر اس کے کپڑے یوں استری کرنے لگتیں جیسے انہوں نے اسے کچھ کہا ہی نہ ہو، صرف سمجھایا ہو! ابو گھر لوٹتے تو وہ اسکول کی ساری باتیں انہیں اس بے تابی سے سناتی کہ ان کی تھکن اور بے توجہی کا اسے احساس ہی نہ ہوتا۔

"ہاں تو پھر تمہاری مس نارائن داس نے کیا کہا؟" رفیق میاں اطمینان سے بیٹھتے ہوئے پوچھتے۔

"ہائے اللہ، ابو ساری بات تو آپ کو سنا دی۔ کیا آپ سن نہیں رہے تھے؟" ججو ان سے روٹھ جاتی۔ "نہیں بھئی یہ بات نہیں، میں دراصل کپڑے تبدیل کرنے کا سوچ رہا تھا اور تمہاری بات کا کچھ مزہ نہ آیا...... ہاں تو پھر کیا کہا تمہاری مس نے؟" رفیق میاں اسے چمکارتے ہوئے پوچھتے۔

بیس برسوں کی یہ اکلوتی کمائی میاں بیوی کی زندگی میں ایک جہان کی خوشیاں سمیٹ کر لے آئی تھی...... ججو کی چھوٹی چھوٹی باتیں گھنٹوں ان کا موضوع بنی رہتیں۔ اس کی شادی بیاہ کا ذکر آتے ہی زبیدہ بیگم کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں...... "ارے واہ! ہم تو گھر داماد کریں گے۔ بھلا ججو کو سسرال بھیج کر ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟" رفیق میاں بیوی کو تسلی دیتے "ابھی اس کی صرف پڑھائی کی فکر کیا کرو۔" وہ بیوی کو تسلی دیتے اور ججو گلاب کے پودوں میں پانی دیتے ہوئے نئی کونپلیں گننے لگتی۔

ایک روز نجانے کیا اور کیسے ہوا کہ بیٹھے بیٹھے امی کا دل بند ہو گیا ــــ ''ہائے میری مجو تو لٹ گئی، اب امی کسے کہے گی؟''
پھوپھی جان نے بین کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ مجو جیسے ڈراؤنا خواب دیکھ کر چیخ پڑی۔ مگر وقت تو پل بھر کے لیے بھی نہ رکا۔ اچانک اس کی دنیا سونی ہو گئی اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہ گئی...... لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہو گئے اور اس گھر میں اداسی دبے پاؤں ایسی اتری کہ سارا ماحول سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس سناٹے میں مجو کے آنسو آہوں میں تبدیل ہو گئے اور پھر آہستہ آہستہ ابو سارے گھر پر چھا گئے۔ اس کے دل میں چھپا ہوا درد وقت نے نامعلوم سا غم بنا دیا۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے کتابوں کا سہارا لیے گہرائیوں میں اتر گئی۔ رنگ برنگے پھول کھل کر ڈالیوں پر ہی مرجھا جاتے مگر وہ محض انہیں دیکھتی رہتی حتیٰ کہ وہ بدنما داغ بن کر جھڑ جاتے اور وہ فضا میں ایک عجیب سی دکھ بھری ملائمت اور رنگینی کا احساس لیے انگریزی شاعر کیٹس اور شیلے کے ہاتھ تھامے نہ جانے کہاں پہنچ جاتی۔ غالب کا فکر اور میر کا درد اس کی رگوں میں سرایت کر جاتا اور میرا کو پڑھتے پڑھتے وہ ہاتھوں میں اک تارا لیے، بال کھولے، سفید ساڑھی پہنے بھجن گاتی ہوئی جنگلوں میں پہنچ جاتی اور یوں اسے اپنا وجود محض ایک داسی کا سا لگنے لگتا۔

پھوپھی جان اس کے زرد چہرے اور الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر محبت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھتیں ''ماہ جبین بیٹا، تمہارا جی تو اچھا ہے؟'' مجو کے خیالوں کی ڈور ٹوٹ جاتی اور وہ جوگن نجانے فضا میں کہاں تحلیل ہو جاتی۔ پھوپھی واری صدقے ہونے لگتیں اور پھر نصیحتوں کا پلندہ کھول کر بیٹھ جاتیں۔

ولایت سے آتے ہی اطہر نے اچانک مجو سے کچھ اس طرح ٹوٹ کر عشق کا اظہار کیا کہ وہ چونک پڑی..... قوی ہیکل نوجوان اسے ہمیشہ اکھاڑے کے پہلوان لگتے تھے لیکن اطہر تو جیسے اُسی کی خاطر تین برس گھوم گھما کر بغیر کوئی سند لیے یکا یک اس کے گھر میں وارد ہو گئے۔ انہیں اس زرد رو اور بے جان سی لڑکی میں دراصل اپنا چمکدار اور روشن مستقبل نظر آنے لگا..... اتنی جائیداد مل جانے کے بعد بھلا کیسی ڈگری اور کس نوکری کی ضرورت باقی رہتی؟ پھوپھی دم درود پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتیں اور بیٹا رنگ برنگے بے ہودہ سوٹ پہن کر چہل قدمی کیا کرتا۔ رفیق میاں اچانک بھانجے کی آمد سے یوں بے خبر تھے جیسے اس کی موجودگی کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو..... مجو اس کے چوڑے چکلے کندھے، لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں اور تلوار جیسی ناک دیکھ کر خوفزدہ سی ہو جاتی۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں اور سنگھار پٹار تو اسے بہت ہی کھلتا اور وہ اس سے بات بے بات بحث و تکرار کرنے لگتی۔ پھوپھی جان اڑتی چڑیا کے پَر گننے والوں میں سے تھیں۔ انہوں نے فوراً اطہر کو بڑے بیٹے اور بہو کے پاس بھجوا دیا تاکہ کبھی کے پھیرے میں دیدے کا پانی تو باقی رہے......

''ہائے اللہ، تم سے کس نے کہا؟'' پڑوسن نے حیرت سے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔
''اے لو، پورے جگ میں ڈھنڈورا پٹ گیا اور تم بے خبر ہی رہیں؟'' منے کی ماں نے بڑی رازداری سے پڑوسن کو بتایا۔

''پر دیکھا کس نے؟'' پڑوسن نے کھڑکی کا دوسرا پٹ کھولتے ہوئے آہستہ سے پوچھا......
''کیا پوچھتی ہو بہن! زمین میں گڑ جائیں۔ نوج اللہ ماری ایسی لڑکیاں...... موئی اماں کا بھی خیال نہ کیا۔ وہ تو عین وقت پر باپ کی آنکھ کھل گئی اور لاڈلی نے عاشق کو چور چور کہہ کر بھگا دیا...... چلو اچھا ہی ہوا، بہن رفیق میاں کی عزت تو بچ گئی، بے چارے بے حد شریف انسان ہیں لیکن برا تو یہ ہوا کہ کونے میں پڑا ہوا جوتا منے کے ابا نے دیکھ لیا۔ وہی اس کلموہے اطہر کا تھا۔

خالص ولایتی چمک والا...... بھلا بتاؤ کیا چور ایسے چمچماتے جوتے پہن کر ڈاکہ ڈالنے آتے ہیں؟'' منے کی ماں نے ساری گتھی سلجھا دی۔

دوسرا دن تجو کے گھر سے بھاگنے کی خبر ہر دروازے کی دستک بن گئی۔ دادیوں اور ماؤں نے نوجوان لڑکیوں کو گھور گھور کر کھا ڈالا اور ان کے جوان بھائیوں نے جوتے چمکاتے چمکاتے ہاتھ منہ سیاہ کر لیے۔ رفیق میاں نے سسکتی ہوئی ماہ جبین کے سر پر جب ہاتھ پھیرا تو وہ بلک بلک کر رونے لگی ''ارے بیٹا! لوگ تو بکا ہی کرتے ہیں، تم خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتی ہو؟ دیکھنا میں ان سب کو سمجھ لوں گا!''

''مگر ابو! پھوپھو اور اطہر ہرگز ہمارے ہاں اب نہیں رہیں گے۔ مجھے یقین ہے اس ڈرامے کو رچانے میں انہی کا ہاتھ ہے اور یہ کہانی بھی انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ آپ کو نہیں معلوم ابو نہیں معلوم۔ ہائے میں پاگل ہو جاؤں گی۔'' اور تجو ابو سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

گھر کی سب کھڑکیاں اور دروازے بند ہو گئے۔ تجو اداس، چپ چاپ ایک سے دوسرے کمرے میں منڈلاتی رہتی۔ پڑوس کی لڑکیاں چھپ چھپ کر آسیب زدہ گھر میں کچھ ٹٹولنے کی کوششیں کرتیں اور میلے میلے کپڑوں میں بال کھولے ماہ جبین کو دیکھ کر خوفزدہ سی ہو جاتیں......

اطہر وہاں آنے کے لیے نت نئی راہیں نکالتا رہتا اور پھوپھی مایوس ہو کر مری ہوئی بھاوج کو کوسنے دینے لگتیں۔ زبیدہ نے کبھی ان سے دل کی بات نہ کی تھی اور عزت بھرا فاصلہ تا زندگی قائم رکھا اور پھر مرتے مرتے بیٹی کو بھی اپنا سبق پڑھا گئی تھی۔

بیٹی کی چاہت کے سامنے بہن کے پیار کا چراغ بھک سے بجھ گیا اور رفیق میاں کی تنہائی اب پرانے بھولے بسرے دوستوں کی یادوں سے منور ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے وہ ان لمحات کو زندہ کرنے لگتے جو ان کے ذہن کی گہرائیوں میں وقت کے ساتھ کہیں گم ہو چکے تھے۔ ان دوستوں میں سب سے اہم کڑی سجاد تھے، جن کے پیار اور خلوص نے کبھی انہیں اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ ساری دنیا میں ان کی نیکی اور خلوص کے سوا اور کچھ بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ پھر وقت اور حالات نے انہیں اس جذباتی سطح سے بلند کر دیا اور وہ زندگی کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ کبھی کبھار جب ان کا خط آ جاتا تو وہ گھنٹوں ان کی باتیں کیا کرتے۔ پرانی چاہت کاغذوں سے تیر کر ان کے دل میں اتر جاتی اور وہ ان دھڑکنوں میں ڈوبنے ابھرنے لگتے......

سجاد ایک زمانے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں، وجاہت اور متانت کی مثال سمجھے جاتے تھے مگر حالات نے انہیں بھری دنیا میں تنہا کر دیا اور اب ان کے پاس سوائے زندگی کے اور کچھ بھی نہ تھا جسے وہ کندھوں پر اٹھائے منزل بہ منزل، صحرا بہ صحرا گھوم پھر رہے تھے۔ زمانے کی پیہم تلخیوں کا ردعمل ان کے مزاج میں ایک انجانی اداسی اور ملائمت کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ اپنے دکھوں کو بھلاتے بھلاتے سراپا محبت اور خلوص بن گئے۔ ناسازگاری کا جواب مدھم اور میٹھی سی مسکراہٹ بن گیا۔ ان کی شخصیت میں دکھوں نے عجیب سا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنا ہر ذاتی تقاضا اور غرض بھول چکے تھے۔

ایک شام جب وہ اچانک ابو سے ملنے چلے آئے، تو مجو نے انہیں یوں پہچان لیا جیسے وہ انہیں ہمیشہ سے جانتی تھی۔ موٹی سی عینک کے پیچھے اداس سی آنکھیں، بالوں کی سفیدی تیرتی ہوئی کنپٹیوں تک آ پہنچی تھی اور دبی دبی مسکراہٹ نے انہیں بہت جاذب نظر بنا دیا تھا۔ رات دیر گئے تک چائے اور کافی کے دور چلتے رہے۔ بہت دنوں بعد گھر میں ہنسنے بولنے کی آوازوں نے زندگی کے آثار سے پیدا کر دیے۔ رفیق میاں نے پچھلے پندرہ برس کی باتیں ایک ہی ملاقات میں سنا ڈالیں۔ جانے سے پہلے

انہوں نے سجاد سے وعدہ لیا کہ صبح ہوتے ہی فوراً وہ ہوٹل چھوڑ کر گھر چلے آئیں گے۔
سونے سے پہلے مجو کتنی دیر تک لیٹے ہی لیٹے عقبی کمرے کے جالے اور گرد اتارتی رہی۔ پلنگ اور میز کرسیوں کو ترتیب دے کر انہیں مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی اور پھر جاگتے ہی جاگتے خدا جانے کب سو گئی۔
اس مہمان کے آتے ہی گھر کی ساری اداسی اور سونا پن سائے کی طرح غائب ہو گیا۔ چاروں طرف قندیلیں سی جل اٹھیں۔ اب تاش کی بازیاں لگتیں، چائے و کافی کے دور چلتے اور شعر و شاعری ہوتی اور رات گئے محفل ختم ہو جاتی۔ وقت گزرنے کا اب احساس ہی نہ ہوتا۔ رفیق میاں کے قہقہوں میں سجاد تو بالکل ڈوب کے رہ جاتے اور ماہ جبین کو یوں لگتا جیسے ساری دنیا کا درد پگھل پگھل کر ان کی دبی دبی مسکراہٹوں میں بہہ رہا ہو۔ موقع بے موقع ان کا پائپ بجھ جاتا اور وہ راکھ جھاڑتے ہوئے ع آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ گنگنانے لگتے۔ مجو کا انجانا درد بڑھنے لگتا اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس درد کی وہی ذمہ دار ہے۔ اسی کا انتظار کرتے کرتے ان کی کنپٹیوں تک سفید بال جھلملانے لگے ہیں اور سارا دکھ سمٹ کر ان کی آنکھوں میں جا بسا ہے۔ پھر کچھ ہی دیر میں تاش کے پتے بکھر جاتے اور مجو نیند کا بہانہ کر کے کمرے سے اس طرح باہر چلی جاتی جیسے اس نے گھر کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لے لی ہو۔ اک تارا سا بجنے لگتا اور ساری فضا میرا کے بھجنوں کے مدھم سُروں میں ڈوب جاتی۔
دن کے اجالے میں وہ سجاد کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی اور اسے کسی طرح یقین نہ آتا کہ وہ اس کی چاہت سے بے خبر ہیں۔ خوابوں میں کئی مرتبہ ایک پجارن کے روپ میں اپنے آپ کو نظریں جھکائے اس نے ان کے قدموں میں پھول رکھتے پایا اور جب جھکی پلکیں اٹھائیں تو وہ ہمیشہ اسے مسکرا کر دیکھ رہے ہوتے۔ آرتی اتارتے ہوئے تو جب بھی اس نے جھک کر دیکھا تو وہ اسے ایسی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے کہ اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ مگر یہ تو سب خواب کی باتیں تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے نئے سنہرے خواب آگیں سفر پہ چل پڑی تھی ورنہ دن میں تو جب کبھی سجاد اسے اپنے کھدر کے کُرتے میں بٹن ٹانکنے کے لیے بھی کہتے تو اس کے ہاتھ کانپنے لگتے اور سوئی چبھتے چبھتے رہ جاتی۔
''پھول تو جھپ جھپ سجاتی ہو اور ایک بٹن لگانا نہیں آتا؟'' اتنی محبت بھرا طعنہ سن کر مجو کا تاگہ بار بار ٹوٹنے لگتا۔
''ہائے اللہ اگر انہیں میرے دل کی بات کا پتہ چل جائے تو شاید مر جاؤں، وہ کیا سوچیں گے؟ میں ان کی نظروں میں کتنی گر جاؤں گی۔ وہ مجھے کس قدر ذلیل سمجھیں گے۔ ہائے اللہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' یہ سوچتے سوچتے وہ بے حد پریشان ہو جاتی اور پھر ایک انجانا سا خوبصورت احساس اسے تھام لیتا..... تسلیاں دیتا۔
''آج میری شادی کا دن ہے.....'' رفیق میاں نے بہت اداس اور درد بھرے لہجے میں کہا اور آنکھیں بند کیے سینے پر کتاب رکھے آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ ''ہونہوں'' کہہ کر سجاد پائپ سلگانے لگے اور ماہ جبین کو یوں لگا جیسے وہ تو اس بات کو پہلے ہی سے جانتے تھے..... پھر ایک اداس سی خاموشی نے کمرے کی فضا ہی بدل دی۔ شام گہری ہوتے ہوتے سیاہیوں میں ڈوب گئی اور رفیق میاں صبح کے نکلے گھر واپس نہ آئے۔ مجو کھڑکی سے لگی تھک گئی اور سجاد نے سارے گھر کی بتیاں روشن کر ڈالیں لیکن رات کی تاریکی نے ہاتھ بڑھایا اور مجو کی دنیا بالکل اندھیر ہو گئی۔ آدھی رات گئے دروازہ کھٹکا اور اس کا خیال درست نکلا۔ موٹر سے ٹکرانے کے بعد رفیق میاں ہسپتال میں زخمی پڑے تھے۔ مجو کا دل تو شام ہی سے ڈوبا جا رہا تھا۔ غم سے نڈھال، جلدی جلدی آنکھیں پونچھ کر وہ چپ چاپ سجاد کے ساتھ ہسپتال جانے کے لیے چل پڑی۔ رات کے گہرے سناٹے میں تاریک راستوں سے ہوتے ہوئے وہ آخر کار ہسپتال کے وسیع لان میں پہنچ گئے۔ چاندنی میں مجو کے چہرے کا رنگ خوفناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔

حادثے کی تشویشناک خبر کا خیال آتے ہی وہ ٹھٹھک کر وہیں کھڑی ہو گئی اور رونے لگی۔ سجاد نے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''جو کیا تمہیں مجھ پر اعتماد ہے؟'' سجاد نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ جبین کی ویران آنکھیں ایک لمحے کے لیے اٹھیں اور پھر اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''جو، رفیق اچھا ہو جائے گا۔'' سجاد نے یکا یک گھبرا کر کہا۔ ان کے چہرے پر وہی اداس مسکراہٹ، ملامت اور درد تھا جسے وہ بخوبی سمجھ ہی نہیں، محسوس بھی کر سکتی تھی۔ وہ گم صُم بت بنی کھڑی تھی۔ ''چلو ہمت کرو۔'' سجاد نے اسے ہسپتال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے دروازے تک جا پہنچے۔ وارڈ میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ پلنگوں کی لمبی سی قطار اور سفید سفید چادروں میں لپٹے ہوئے مریضوں کو دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے وہ خواب میں قبرستان چلی آئی ہو۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ یکا یک وہ دوڑ کر ابو سے لپٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ سجاد نے آہستہ سے اسے تھام کر الگ کیا تو جو کی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ رفیق میاں درد سے کراہ اٹھے اور وہ چکرا کر فرش پر بیٹھ گئی۔

''سجاد...... '' رفیق میاں نے نحیف سی آواز میں پکارا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ سجاد نے جھک کر بڑی محبت سے ان کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''میری بٹیا، میری جو اب تمہارے حوالے ہے۔''

رفیق میاں ایک لمبی سی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ سجاد گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

''ہائے کیا ہوا؟'' جو چیخ پڑی۔

رفیق میاں نے بے چین ہو کر گہری سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ سجاد نے آگے بڑھ کر فرش پر بیٹھی جو کو سہارا دیتے ہوئے کھڑا کرنے کی کوشش کی اور پھر نہایت شفقت سے اس کے سر پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔

..........☆..........

بند مکان

طاہر نقوی

ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔

میں تھکا ماندہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ذہن اب بھی خالی نہیں تھا کیونکہ دفتر کی سیاست سے نمٹ کر اب گھریلو مسائل سے الجھنا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ اپنی گلی میں مڑتے ہی یکا یک میں حیران رہ گیا۔ محلے کے چند بزرگ اور نوجوان ایک مکان کے سامنے کھڑے چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ پہلے تو میں نے ان سب پر سوالیہ نظر ڈالی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پھر کچھ معلوم کرنے کے لیے وہیں ٹھہر گیا۔ کسی نے مجھ سے سرگوشی کی:

''کوئی ہے!''

یہ سن کر حیرت کے مارے میں اچھل پڑا۔ کئی نے محض گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

''یہ مکان کافی عرصے سے بند ہے۔''

''نہ کبھی کسی کو آتے جاتے دیکھا۔'' کئی نے میری ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہی تو حیرت ہے۔'' ایک بزرگ نے سر کھجاتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''کوئی ہے ضرور۔'' سہمی ہوئی آواز آئی۔

''آخر کون؟'' کئی متجسس آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوال کا جواب نہ ملے تو عجیب سی بے چینی طاری ہو جاتی ہے۔ بے نام خاموشی رہی۔ ہر ایک نے دوسرے کو خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ سب کے چہروں پر شدید بوکھلاہٹ تھی۔ اچانک وہاں کھڑے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر اس مکان کے دروازے سے اپنا کان لگا دیا۔ یہ دیکھ کر وہاں موجود سب کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ نہ جانے اب کیا انکشاف ہو جائے۔ چند لمحے بعد وہ وہاں سے پلٹ آیا۔ پر اشتیاق نظروں نے اسے گھیر لیا۔ ان میں کئی سوال تھے۔ سب نے خاموشی کی زبان میں اس سے تصدیق چاہی۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ محض اثبات میں سر ہلایا۔ اب کوئی انجانا خوف سب کے چہروں سے عیاں تھا۔ گویا کسی بھی لمحے کچھ ہو سکتا ہے۔ کسی نے بڑھ کر اس کے کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

''کچھ بتاؤ۔''

وہ نوجوان تذبذب میں مبتلا تھا۔ شاید وہ اپنی بات کی وضاحت نہیں کر پا رہا تھا۔

''کوئی آواز؟'' کسی جانب سے سوال اچھالا گیا۔

اس نوجوان نے سب کو بے بسی سے دیکھا اور خود سے الجھتے ہوئے بڑبڑایا۔

''نہ...... نہیں...... یا شاید ہاں۔''

اب اعتماد اور عدم اعتماد کے درمیان کھڑے ہوئے لوگوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ بے اختیار کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔

''کیا تمہیں یقین نہیں۔''

''یقین!'' اس نے دہرایا اور مشکوک انداز میں آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ اُس کی خاموشی پر کسی نے سرگوشی کی۔

''تو کوئی ہے!''

''آں ہاں۔'' اس نوجوان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

یہ سن کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کو سہمے سہمے انداز میں دیکھا۔ نوجوان خود بے چین تھا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈول رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کے تیور دیکھتے ہوئے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس کیفیت میں کسی بھی لمحے اس نوجوان کو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ یہ دیکھتے ہوئے وہ سہم کر رہ گیا۔ اب اسے اس مکان سے زیادہ ان لوگوں سے خوف آنے لگا۔

''کوئی ہوتا تو کھٹ پٹ ہوتی۔'' کسی کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ اس بات کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔ کسی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر ناخوشگوار خاموشی رہی مگر سب بے تاب رہے۔ کوئی پیشانی رگڑتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کوئی نہ کوئی ہے۔''

''آخر کون؟'' ایک ساتھ کئی بے قرار آوازیں ابھریں۔ سوال اب بھی کئی تھے۔ ان کے جواب نہیں تھے۔ خاموشی پھر گہری ہوگئی۔ وہ سب ایک دوسرے کو محض تکتے رہے۔ آخر کسی نے گھبرا کر مشورہ دیا۔

''پولیس کو اطلاع......'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کئی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''تھانے جا کر رپورٹ کون کرے گا؟'' فضا میں سوال پھر ابھرا۔

کسی نے نظریں چرالیں اور کسی نے سر جھکا لیا۔ ایک بزرگ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''رپورٹ کرنے والے کو پولیس دھر لے گی۔''

یہ سنتے ہی اپنی ذمہ داری سے بچنے کے لیے وہ سب یک زبان ہوگئے۔ کسی نے بہانہ تراشا۔

''پھر رشوت دے کر پیچھا چھڑانا پڑے گا۔''

ابھرتی ہوئی اس نئی صورتحال میں وہاں موجود کوئی بھی پولیس اسٹیشن جانے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو تو خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہی اب بھی ہوا۔ اس دوران وہاں لوگوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یکایک کسی نئے آنے والے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے۔ یہاں دہشت گرد چھپے ہوئے ہوں۔''

یہ سن کر سب کے چہروں پر خوف کے مارے دہشت سوار ہوگئی۔ کسی نے سرگوشی کی:

''ہاں۔ یہی لگتا ہے۔''

''دہشت گردوں کو چھپنے کی ضرورت نہیں۔'' کوئی اور آواز ابھری۔

جس نے یہ بات سنی، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ہاں میں ہاں ملانے کے عادی تھے۔ سب کے چہروں پر اب ناامیدی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کو لاچاری سے دیکھا۔ کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ اس خاموشی میں صرف دہشت کی حکمرانی تھی۔

''کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔'' کسی نوجوان نے گھبرا کر گویا خود سے کہا۔

قریب کھڑے ایک بزرگ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

''ایسی ویسی حرکت کی تو دہشت گرد دھماکہ کر سکتے ہیں۔''

وہاں موجود لوگ سہم کر رہ گئے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

''سارا محلّہ تباہ ہو جائے گا۔'' لرزتی آواز آئی۔

اب سب کو سانپ سونگھ گیا۔ شاید اُن کی نظروں کے سامنے ہونے والی تباہی کا منظر آ گیا تھا۔ کسی نے اپنا سر تھام لیا۔ کوئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا اور کوئی خوف کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ کئی لوگ بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی سہمی ہوئی آواز نے تسلی دی۔

''یہ ہمارا وہم ہو سکتا ہے۔''

ہر ایک نے دوسرے کو عدم اعتماد سے دیکھا۔ وہ ایسی تسلیوں کے عادی تھے۔ خوف کی کیفیت اسی طرح برقرار رہی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کوئی سر جھٹک رہا تھا اور کوئی پاؤں پٹخ رہا تھا۔ نا جانے اگلے لمحے کیا ہو جائے۔ فضا میں کئی سوال تیر رہے تھے۔ جواب اب بھی کوئی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی چلبلے نوجوان نے آگے بڑھ کر اس مکان کے دروازے کی درز سے اپنی آنکھ لگا دی۔ اسی لمحے اضطرابی کیفیت میں کسی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''کوئی محفوظ نہیں۔''

اس کی بات سن کر کسی بزرگ نے مایوسی سے کہا۔

''ہماری گزر گئی لیکن......''

کسی نے بات کاٹتے ہوئے گویا خود سے کہا۔

''تاریکی ہی تاریکی۔''

آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے یہ سن کر ایک دوسرے کو محرومی سے دیکھا۔ ایک اور بوڑھا جواب تک الگ تھلگ کھڑا تھا، اس نے بتایا:

''اس میں کئی لوگ رہنے کے لیے آئے۔ کسی نے اس کی دیکھ ریکھ نہیں کی۔''

یہ کہہ کر اس نے گردن جھکا لی۔ سناٹا پھر چھا گیا۔ ہر ایک کو یہی خوف تھا کہ وہ نوجوان وہاں سے ہٹ کر نہ جانے کیا خبر دے۔ سب کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نوجوان نے جیسے ہی وہاں سے اپنی آنکھ ہٹائی، سب اس کی طرف لپکے۔ ہر ایک کے چہرے پر حسب عادت کوئی نہ کوئی سوال چسپاں تھا۔ اس نوجوان نے محرومی سے ان سب پر نظر ڈالی اور کچھ بتائے بغیر وہاں سے غائب ہو گیا۔

وہ سب اب بھی اُسی طرح اضطراب میں مبتلا رہے۔

..........☆..........

دانۂ گندم

فرحت پروین

بیگم صاحبہ اور ان کی سہیلی باجی نادرہ کی گفتگو میں اپنا نام سن کر چائے بناتے تاج دین کے ہاتھ رک گئے۔ بیگم صاحبہ اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھیں۔

''ملازم تو ایک چھوڑ کئی مل جائیں گے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہم نے اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھا، ہر طرح سے خیال رکھا اور اسے دیکھو پل بھر میں آنکھیں پھیر لیں..... طوطا چشم۔''

''یہ تو ہونا ہی تھا۔ تم لوگوں نے اسے کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ احسان فراموش ہے کمبخت۔'' بیگم صاحبہ کی سہیلی نے دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں، خیر احسان کی تو کیا بات ہے۔ کام لیتے تھے، دام دیتے تھے۔ مگر میں سچ کہہ رہی ہوں نادرہ، ہم اس کی عزت گھر کے کسی فرد سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اسے اس کا بھی لحاظ نہیں۔'' بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔

''عزت راس نہیں آتی ایسے لوگوں کو۔ انہیں جوتی تلے رکھو تو اپنی اوقات میں رہتے ہیں۔'' باجی نادرہ بولی۔

تاج دین کے دل میں کانٹا سا چبھا۔ ہماری پوری پوری زندگیاں ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت تلے گزرتی ہیں مگر ہم دونوں کی اوقات میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ بالکل سچ کہہ رہی تھیں۔ اس تمام عرصے میں اسے کبھی بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کمتر حیثیت کا شخص ہے۔ کپڑے تو وہ زیادہ تر صاحب کی اُترن پہنتا تھا۔ سو وہ بہت قیمتی اور نفیس سوٹ ہوتے تھے۔ کھانا پینا تو ہوتا ہی اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ سفر میں یا سیر تفریح کے لیے کہیں باہر جاتے تو صاحب بہ اصرار ساتھ بٹھا لیتے۔

اسے خوب یاد تھا، ایک بار منی کی سالگرہ تھی مگر دو روز پہلے ہی کمپنی کے ایک ملازم کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لیے صاحب نے سالگرہ منانے سے منع کر دیا اور صرف گھر کے لوگوں کو ایک بڑے ہوٹل میں کھانے پر لے گئے تو اسے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ بیرا بار بار ڈشیں (Dishes) اس کے سامنے بھی پیش کرتا۔ یہ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا تو بیگم صاحبہ نے مسکراتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا تھا۔

''چلو اچھا ہے۔ کبھی تو کوئی تمہاری بھی خدمت کرے۔ گھبرا کیوں رہے ہو۔''

یہ سب یاد کر کے وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

وہ ٹرالی میں چائے کا سامان اور برتن جمانے لگا۔ اس اونچی شان والی کے لیے جو اسے جوتی تلے رکھنے کا مشورہ دے رہی تھی اور پھر وہ سست قدموں اور جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ ٹرالی گھسیٹتا ہوا لاؤنج میں لے گیا۔ جب وہ لوٹ رہا تھا تو اس نے سنا، نادرہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

''سلیقہ اور تمیز بہت ہے کمبخت میں، یہ ماننا پڑے گا۔''

''پندرہ برس سے ہے ہمارے پاس۔ لڑکا سا تھا جب ہمارے پاس آیا تھا۔ میں نے اسے سب تمیز، طریقہ سلیقہ سکھایا۔ اس نے بھی بڑی محنت اور لگن سے سب کچھ سیکھا۔ ادب آداب، تہذیب گفتگو وہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ ایک ایک کے مزاج سے واقف ہے اور پورے خلوص سے ہر ایک کو سکھ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔'' بیگم صاحبہ کی آواز میں اداسی رچی ہوئی تھی۔

تاج دین کا دل دکھ سے بھر گیا۔ کتنی تکلیف پہنچائی ہے اس نے اپنی فرشتہ خصلت مالکن کو۔ اسے پندرہ سال پہلے کا وہ دن یاد آیا جب وہ اپنے چچا کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کی طرح پہاڑوں سے اتر کر شہر میں اپنی روزی کمانے آیا تھا۔ بڑے بھائی کے صاحب نے اسے یہ کہہ کر اس گھر میں بھیجا تھا کہ ''بڑے اچھے لوگ ہیں، اگر انہوں نے رکھ لیا تو تمہاری قسمت سنور جائے گی۔''

انہوں نے سچ ہی کہا تھا اور واقعی اس کی قسمت سنور گئی۔ اس گھر میں آرام اور سہولت کے ساتھ ساتھ جو عزت اور مان ملا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صاحب اتنے فیاض کہ ہر دکھ درد میں کام آئے۔ اس کی شادی کا سارا خرچ اٹھایا۔ اُس کے گھر والوں کا خیال رکھا۔

پھر صاحب لوگ وطن چھوڑ کر بیرون ملک جانے لگے۔ اس کی تو دنیا اندھیر ہو گئی۔

''صاحب مجھے بھی لے چلیں۔'' وہ کہتے کہتے رو پڑا۔

''واقعی جانا چاہتے ہو؟'' صاحب سنجیدہ ہو گئے۔

''جی صاحب۔'' وہ کھِل اُٹھا۔

''بہت دور ہو جاؤ گے گھر سے۔ یہاں تو ہر مہینے گھر سے ہو آتے ہو۔ وہاں سے سال سے پہلے واپس نہ آ سکو گے، سوچ لو۔''

''دنیا باہر گئی ہوئی ہے صاحب۔ میں بھی چار پیسے زیادہ کما لوں گا تو گھر والے آسودہ ہو جائیں گے۔ بچے پڑھ لکھ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر بلا لوں گا۔''

اور صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ چھ مہینے بعد وہ ان کے پاس تھا۔ سب نے بڑی خوشی سے اس کا استقبال کیا۔ وہ نئے ماحول میں جلد ہی رچ بس گیا اور گھر میں تو اس کے وہی پرانے مہربان لوگ تھے۔ یہاں آئے ہوئے اسے دس سال ہو گئے تھے۔ ریالوں میں ملی ہوئی تنخواہ سے اس کے گھر کے حالات بدل گئے۔ اس کے بیوی بچے قریبی شہر میں اٹھ آئے۔ بچے سکول جانے لگے۔ آمدنی کے ساتھ اخراجات بھی بڑھ گئے تو وہ ہر سال چھٹی جانے کے بجائے دو دو تین تین سال بعد جانے لگا۔ وہ ہر سال اپنی ٹکٹ کے پیسے لے لیتا اور جب چھٹی جاتا تو تینوں برس کی چھٹی اکٹھی گزار کر آتا۔

یہ سب یاد کر کے اس نے لمبی گہری سانس لی اور اپنا سامان سمیٹنے اور باندھنے لگا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور

اسی لیے وہ بہرصورت اس گھر سے جانا چاہتا تھا۔

یقیناً اس میں سراسر قصور وار وہ خود تھا مگر بیگم صاحبہ کو بھی تو کچھ سوچنا چاہیے تھا۔ اب یہ ان سے کون کہے، وہ ٹھہریں سدا کی بے فکری، لاپروا.....

بیگم صاحبہ نے برسہا برس سے کچن تاج دین کے حوالے کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ان سے پوچھتا کہ آج کیا پکانا ہے تو وہ یہ بھی بتانے کی تکلیف گوارا نہ کریں۔

''بھئی کچھ بھی پکالو۔'' جواب ملتا۔

دعوتوں وغیرہ میں بھی وہ صرف اتنا بتا دیتیں کہ کتنے لوگ آ رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ ہدایت کہ مدد کے لیے دفتر والے لڑکے کو بلا لینا اور اگر زیادہ کام ہو تو ایک آدھ چیز باہر سے پکوا لینا۔ چلو چھٹی ہوئی، روپے پیسے کی فکر انہوں نے کبھی کی ہی نہیں تھی۔

مگر ادھر کچھ عرصے سے بیگم صاحبہ کو کھانا پکانے کا شوق چرایا تھا۔ تاج دین لہسن، پیاز، ادرک کاٹ چھیل کر اور گوشت مرغی دھو دھا کر ایک لائن میں سب چیزیں کاؤنٹر پر رکھ کر باہر چلا جاتا تو بیگم صاحبہ پکارتیں اور سرزنش کے انداز میں کہتیں ''تمہیں باہر کام کیا ہے۔ رُکو ادھر، مجھے تمہارے رکھے ہوئے مصالحے نہیں ملتے۔'' وہ بادلِ نخواستہ کچن میں آ جاتا۔

کوکنگ رینج اور سنک کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ کھانا پکانے کے دوران وہ مسلسل کوکنگ رینج اور سنک کے درمیان کسی نہ کسی ضرورت کے تحت حرکت کرتی رہتیں اور وہ اس چند گز کے فاصلے میں فاصلہ رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو ہو جاتا۔

گو کہ وہ حسبِ عادت احتراماً کبھی ان کے سراپے کو نظر بھر کر نہ دیکھتا مگر ان کے بھرے بھرے جسم کی خوشبو اور حرارت اسے پریشان کر دیتی۔ وہ اس سے دھیان ہٹانے کے لیے پھر چپکے سے باہر سرک جاتا۔

بیگم صاحبہ اسے شروع سے ہی بچوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ وہ بھی ان کے لیے ویسے ہی پاکیزہ خیالات رکھتا تھا مگر انجانے میں ہی وہ خوشبو وہ حرارت اس کے حواس پر چھانے لگی۔ اس کا ادراک اسے تب ہوا جب رات کی تنہائی میں بھی اس کا دھیان بھٹک کر پھر وہیں جا نکلتا۔ ذہن میں طرح طرح کی تصویریں ابھرتیں اور وہ پریشان ہو جاتا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ سالہا سال سے اپنے گھر سے دور ہے اور قوانین کی سختی کی وجہ سے عورت کے سائے تک سے دور رہا ہے۔ وہ سوچتا۔ مگر وجہ چاہے کچھ بھی ہو، یہ سب بہت غلط ہے۔ وہ خود کو سمجھاتا۔ آخر اپنے اندر کی جنگ سے تھک کر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب اس گھر میں نہیں رہے گا۔ وہ اس گھر کے آرام دہ ماحول اور مہربان فضا کو چھوڑ کر جھلساتے صحرائی موسموں کی شدت میں خود کو سخت محنت و مشقت کے حوالے کر دے گا کہ یہی اس کی سزا ہے اور یہی اس کا حل۔

اور آخر اس نے ہمت کر کے صاحب سے کہہ دیا کہ وہ گھر پر کام نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اسے کسی اور کام پر لگا دیں۔ صاحب نے حیران ہو کر کہا ''تاج دین، تمہیں معلوم ہے تم غیر تعلیم یافتہ ہو۔ تمہارے پاس کوئی اور ہنر بھی نہیں۔ باہر تو تمہیں علاوہ مزدوری کے کوئی اور کام نہیں دیا جا سکتا۔''

''مجھے معلوم ہے صاحب۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''کوئی شکایت ہے تو مجھے بتاؤ۔'' صاحب نے پوچھا۔

''نہیں صاحب، کوئی شکایت، کوئی تکلیف نہیں۔''

''پھر؟''

''بس صاحب، میری درخواست منظور کرلیں۔'' اس نے بڑے ادب سے مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

صاحب اس کی فرمائش پر حیران تھے۔ وہ اپنی بیگم کے مزاج و عادت سے بھی واقف تھے اور انہیں تاج دین کی وفاداری پر بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ خبر بیگم صاحبہ کے لیے صاحب سے بھی زیادہ حیران کن تھی بلکہ وہ تو ایک طرح سے صدمے کی سی کیفیت میں تھیں۔ انہوں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ ایسی کوئی بات جو تاج دین کی دل شکنی کا باعث بنی ہو مگر انہیں کچھ یاد نہ آیا۔ بیگم صاحبہ اور ان کی سہیلی کے درمیان موضوع گفتگو اب بھی وہی تھا۔

''تم نے پوچھا تو ہوتا کہ کونسی بات شہزادے کے مزاج عالی پر گراں گزری ہے کہ برسوں کی وفاداری اور بنی بنائی عزت پر لات ماردی۔''

''پوچھا تھا نادرہ، یہ تک کہا کہ اگر انجانے میں میری کسی بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہے تو معاف کردو۔''

''تم بھی حد ہی کرتی ہو۔ معافی مانگی اس سے؟'' نادرہ بیگم مارے حیرت کے تقریباً چیخ پڑی۔

''ہاں انسان ہوں۔ غلطی تو مجھ سے بھی ہوسکتی ہے۔'' بیگم صاحبہ کے دھیمے لہجے میں اداسی رچی ہوئی تھی۔

''نمک حرام ہے کم بخت۔'' نادرہ بیگم اکتائے ہوئے زہر آلود لہجے میں بولیں۔

''ہونہہ......'' بیگم صاحبہ نے تائیدی ہنکارا ابھرا۔ جس نے اس کا دل لہولہو کردیا اور یہ لہو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگا۔

اس نے خود کو سنبھالا۔ آنسو پونچھے اور مرے مرے قدموں سے ٹرالی لینے لاؤنج میں چلا گیا۔

لوٹتے ہوئے رک کر اس نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ آہستگی سے کہا۔

''میں نے اپنا سامان باندھ لیا ہے۔ گاڑی آگئی ہے۔ میں برتن دھوکر چلا جاؤں گا۔''

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر گولہ سا اس کے گلے میں پھنس گیا جس سے آواز رک گئی اور وہ دل پر اک بوجھ لیے چپ چاپ پلٹ گیا۔



ایفل ٹاور

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

میری عمر بتیس برس کی ہے۔ پانچ برسوں سے میں اسی موسم میں یعنی ماہ جنوری کے دوسرے ویک اینڈ میں برف سے کچھ نہ کچھ بڑا اور قابل دید بنا رہا ہوں۔ اس برس کی خاص بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا بھائی میرے ساتھ نہیں ہے۔ اس کی کمی کو میرے والد اپنی مرضی اور خوشی سے پوری کر رہے ہیں۔ ہر سال برف سے ہم جو بھی بناتے ہیں دنیا اس کی تعریف کرتی ہے لیکن موم مسکرا کر یہی کہتی ہے "وقت کا ضیاع اور کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ میرے کندھے پر ایک تھپکی دیتی ہے تاکہ میں زیادہ بددل نہ ہو جاؤں۔ پچھلے سال چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر میں نے ایک قلعہ بنایا تھا۔ برف کا بڑا سا آنکھوں میں کھب جانے والا قلعہ۔ وہ کوئی عام سا قلعہ نہیں تھا۔ پہلی نظر میں کسی جن کی کھوپڑی لگتا جس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سوراخ تھے۔ دوسری نظر میں وہ قلعہ دکھائی دینے لگتا۔ یہ فریب نظر قلعے کے پگھل جانے کے بعد بھی دنوں تک لوگوں کا موضوع گفتگو بنا رہا۔ میڈیا نے بھی اس کی مناسب تشہیر کی۔ اس سے قبل ہم دونوں بھائیوں نے اسنو مین بنائے تھے، دیو قامت اسنو مین...... ہم بھائی جو بھی بناتے دیو قامت بناتے۔ برف سے چھوٹی موٹی چیزیں تو بچے بھی بنا لیتے۔ برف کی تعمیرات میں شکل وصورت کے ساتھ قد وقامت کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ہماری کوشش کامیاب گئی تھی۔

لوگ ہر سال ہمارے ہنر، فنکاری اور محنت کی داد دینے کے عادی ہو گئے تھے۔ جب والد صاحب نے اس سال کے لیے پیرس کے ایفل ٹاور کا انتخاب کیا تو میں کچھ دیر کے لیے گنگ رہ گیا تھا۔ پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ میں نے ایفل ٹاور دیکھا ہی نہیں تھا۔ جب میں نے اس موضوع پر والد صاحب سے بات کی تو ان کا رد عمل مجھے عجیب سا لگا۔ انہوں نے کہا:

"تم نے ایف ٹاور نہیں دیکھا تو اس کا مطلب تم پیرس ہی نہیں گئے۔"

"یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔"

"تم آرکیٹیکٹ ہو۔ ہر آرکیٹیکٹ، آرٹسٹ کو زندگی میں ایک مرتبہ پیرس جانا ہی جانا ہے۔"

"لیکن ڈیڈ میں تو ابھی تک نہیں گیا...... اور......"

"اور...... کیا...... تو پھر کب جا رہے ہو۔ میرے خیال میں تم آج ہی نکل چلو پیرس یاترا پر۔"

"پیرس پلگریمج...... اب آپ آگے بڑھ کر اس کو ہولی پلگریمج نہ کہہ دیں (زیارت مقدسہ)"۔ یہ کہہ کر میں ہنس پڑا لیکن جب ڈیڈ کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ جذباتی ہو رہے تھے۔ بھنویں متحرک اور آنکھوں کی پتلیاں رقصاں تھیں، گال اوپر کو اٹھ

آ ئے تھے۔ ناک ابھرے ہوئے گالوں میں دب کر رہ گئی تھی، ہونٹ اپنے کناروں کو اونچا اٹھا کر قوس سی بنا رہے تھے۔ ٹھوڑی کی حسین گولائی اور زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میرے ڈیڈ ایک حسین شخص ہیں...... قطعی طور پر ہینڈسم شخص! ایک اور بات جس کو میں نظر انداز نہ کر سکا تھا کہ وہ پیرس کے عاشقوں میں سے تھے۔ اس وقت میری سمجھ میں یہ نکتہ آیا کہ ہمارے لونگ روم اور ڈیڈ کی اسٹڈی میں ایفل ٹاور کے چھوٹے بڑے مجسمے کیوں بھرے پڑے ہیں۔ سوچ کی اسی موج کے نیچے میرے فیصلے کی ایک زیریں لہر بھی سر اٹھا چکی تھی۔

''ڈیڈ! آپ فکر نہ کریں۔ میں پیرس گیا یا نہیں گیا، میں نے ایفل ٹاور دیکھا یا نہیں دیکھا لیکن اس مرتبہ ہم برف کا ایفل ٹاور بنا کر رہیں گے۔'' میں نے ایک ایک حرف پر زور دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

''سوچ لو، اس میں بڑی مشکل پیش آ سکتی ہے۔'' والد مجھ پر ترس کھانے کے موڈ میں آ گئے تھے مگر میں اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔

''آپ ہیں نا میرے ساتھ...... پھر کیا پریشانی ہے۔ آپ تو پیرس جا چکے ہیں۔ آپ نے تو ایفل ٹاور دیکھا ہے۔'' میں نے ان کو یاد دلایا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پیرس جا چکا ہوں...... سچ تو یہ ہے کہ میں پیرس جا کر آیا ہی کب ہوں......؟ میں تو اس وقت بھی پیرس میں ہوں۔ تم نے کسی گمنام شاعر کا وہ مشہور گیت نہیں سنا......؟

پیرس میرے اندر ہے
پیرس میرے اندر ہے
اے البیلی دوشیزہ
تو اور تیری یہ دنیا
تیرا جیسس، تیرا کلیسا
ہے تو لیکن باہر ہے
پیرس میرے اندر ہے
پیرس میرے اندر ہے۔''

والد نے یہ اشعار اتنے لہک لہک کر سنائے کہ تھوڑی دیر کے لیے میں ان کی شخصیت کے اندر اتر گیا۔ ایک ایسی شخصیت جس سے شاید میں پہلی مرتبہ متعارف ہو رہا تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے والد کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور ان میں تارے چمک رہے تھے۔ اس ساری رات میں نے ہوم ورک کرتے گزار دی۔ پروجیکٹ سے واقف ہوا۔ کاغذی تیاریاں مکمل کیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس عام تعلیم کے زمانے میں میری جہالت کا یہ عام تھا کہ میں یہ بھی نہ جانتا تھا کہ پیرس میں انقلاب فرانس کی صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں بین الاقوامی نمائش ۱۸۸۹ء میں منعقد کی گئی تھی، اس کی یادگار کے طور پر ایفل ٹاور تعمیر کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سات سو نقشے پیش کیے گئے تھے۔ منصفین نے گستاؤ ایفل کے نقشے کو متفقہ طور پر کامیاب قرار دیا تھا۔ اگرچہ اس کے خلاف ۳۰۰ اپیلیں دائر کی گئی تھیں جن میں بعض اپیل کنندگان دنیائے آرکیٹکچر اور آرٹ کے عظیم نام تھے۔ رات بھر کی محنت سے میں ایفل ٹاور سے سر سے پیر تک واقف ہو گیا تھا۔ مجھے تو برف کی مدد سے صرف اس کی شبیہ کھڑی کرنی تھی لیکن میں یہ تک جان گیا تھا کہ ایفل ٹاور میں کون سا لوہا یا فولاد اور کتنی مقدار میں استعمال ہوا تھا۔ اس کو اسٹرکچرل انجینئرنگ کے کن بنیادی اصولوں کے تحت

ڈھالا، جوڑا اور کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پر ۱۸۸۷ء میں کام شروع کیا گیا اور مقررہ وقت یعنی ۱۸۸۹ء میں مکمل کر دیا گیا تھا۔ نقادوں نے اسے وکٹورین اسٹرکچرل ایکسپیریمنٹ کے تحت رکھا۔ جہاں تک اس کی اونچائی کا تعلق ہے یہ ۱۶۵۲ فٹ قد مچوں پر مشتمل عمارت ۱۹۳۰ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت کہلائی جاتی رہی ہے۔ اس کو کسی کوہ پیما نے سر بھی کیا۔ اس پر سے پیراشوٹ کے ذریعہ چھلانگ لگانے کا مظاہرہ بھی ہوا۔ دور بیٹھے بیٹھے میں ایفل ٹاور کو اچھی طرح دیکھ بھی چکا تھا اور جان بھی چکا تھا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی، دن چڑھ چکا تھا۔ والدہ جاب پر جا چکی تھیں۔ پہلے تو میرے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ والدہ کو خوش کرنا، سرپرائز دینا۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ دو مرتبہ پیرس جا چکی تھیں اور مجھے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ وہ ایفل ٹاور پر مرتی تھیں۔ یہ جو گھر کے کونے کونے میں ایفل ٹاور کے نمونے کھڑے ہیں، ماں کے ایفل ٹاور سے لگاؤ کے شواہد ہیں۔ مگر اب جبکہ میں کام شروع کرنے جا رہا تھا، ماں سے بھی زیادہ ڈیڈ میرے خیالوں میں تھے۔ ایفل ٹاور تو ڈیڈ کے اندر تھا، اس گیت والے گمنام شاعر کے پیرس کی طرح۔

ہم نے نیلے ڈبوں سے برف کی تہوں کو جمانے کا کام لیا۔ یہ سب میں نے رات ہی کو طے کر لیا تھا۔ وہ دن اس کام کے لیے بالکل ہی مناسب ثابت ہوا۔ سورج غائب تھا لیکن بارش کے آثار بھی نہیں تھے اور برف نرم تھی۔ اس برفانی ایفل ٹاور کی تعمیر کے لیے ہمیں کہیں دور نہیں جانا پڑا۔ گھر کے سامنے ہی ایک کھلی جگہ موجود تھی، وہی موزوں لگی۔ سب سے پہلے ہم نے نیلے ڈبوں کی مدد سے ایفل ٹاور کی بنیاد تعمیر کی۔ اس کو ممکن حد تک سخت کیا۔ اس پر اپنے نقشوں کے مطابق ایفل ٹاور کھڑا کیا جو سانچے ہم نے تیار کیے تھے، وہ بھی مناسب ثابت ہوئے۔ اس کام میں وقفہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی کہ برف کی فطرت کو ہم خوب سمجھتے تھے۔ وقت کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ برف اور وقت میں ازلی دشمنی تھی اور اگر موسمیات والوں کی پیشن گوئی غلط نکلی اور سورج نے اپنے چہرے پر سے نقاب اٹھا لیا تو دھوپ وقت سے کہیں زیادہ برف دشمن ہے۔ لیکن موسمیات کی پیشن گوئی درست ثابت ہوئی، سورج نہیں نکلا اور ہم نے اپنا یہ اہرامِ مصر طرز کا ایفل ٹاور چار گھنٹوں کے اندر کھڑا کر دیا۔

کام ختم کر کے ہم اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ ہمارا یہ ایفل ٹاور ہمارے گھر کی کھڑکی سے صاف نظر آ رہا تھا۔ دس فٹ اونچا یہ مینار ہماری کامیابی پر بے حد خوش دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ اس سبب سے بھی خوش تھا کہ جو لوگ اس کی تعمیر کے دوران اکٹھے ہونے شروع ہوئے تھے، اب ایک عظیم مجمعے میں بدل چکے تھے۔ ہمارا ایفل ٹاور اس ہجوم کے درمیان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پیرس والا ایفل ٹاور بھی شاید اس وقت اسی طرح مسکرا رہا ہو۔ دروازے کی بجتی ہوئی گھنٹی نے مجھے میری سوچ سے باہر نکالا۔ دروازے کے دوسری جانب میڈیا کی کوئی خاتون کھڑی تھیں۔ اس کے پیچھے کیمرہ سنبھالے ایک فرنچ داڑھی مونچھ والا فوٹو گرافر کھڑا تھا، جس کی ٹانگیں بدن سے کہیں زیادہ لمبی تھیں۔ میری نظریں اس کی داڑھی پر تھیں اور وہ خاتون اپنا تعارف کراتے ہوئے کسی ٹی وی چینل کا کارڈ میری جانب بڑھا رہی تھیں۔ ایسے تجربات سے میں ہر سال ہی گزرتا تھا۔ میں نے والد کو آواز دی، وہ بھی باہر آ گئے۔ ہم دونوں کی برفانی ایفل ٹاور کے ساتھ تصاویر اتاری گئیں اور دونوں سے بات چیت کی گئی اور پھر...... تھینک یو بائی بائی...... اس کے بعد اسی طرح کے اپی سوڈس کئی مرتبہ ہوئے۔ ٹی وی والے، اخبار والے، ریڈیو والے، یہ والے، وہ والے، آتے گئے جاتے گئے...... بونجو...... ہائی...... بائی بائی ٹاٹا...... بڑی سردی ہے تاہم ایک اچھا دن...... آپ باپ بیٹے فرنچ ہیں...... فرنچ نہیں...... کیوبک سے تعلق...... وہ بھی نہیں تو پھر آپ نے ایفل ٹاور کیوں چنا...... بس یونہی...... پھر بھی اس انتخاب کی کوئی وجہ...... کوئی رومانس وغیرہ...... وہ بھی نہیں...... اگر میں کہوں ''والد بول رہے تھے''...... ''فولاد کو پانی کرنا۔''

''او......او......کوئی گہری بات......یو مین......او کے۔''

''کیسی گہری بات۔'' والد پھر بولے۔''پیرس کا ایفل فولاد...... ہمارا ایفل برف...... برف...... برف کب تک؟ آخر پانی......؟''

''فلاسفی...... پیور فلاسفی...... کانگریچولیشن ٹو یو...... ٹو یور ایفل...... پیرس......''

کچھ ہی دیر میں ہم باپ بیٹے تھک گئے۔ اندر جا کر ہم نے ایک نوٹس تیار کیا۔''ڈونٹ ڈسٹرب'' (براہ کرم ہمیں پریشان نہ کریں) اور دروازے پر چسپاں کر دیا۔ کچھ عرصے کے لیے دونوں اندر آرام کرنے لگے...... میں تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا، صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور اس وقت اٹھا جب ماں جاب سے لوٹی۔ اس کے لیے شاید والد نے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے والدہ کو خراب موڈ میں پایا۔ میں نے مسکرا کر ماں کو''ہائی موم'' کہا لیکن اس نے میری مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا اور کرخت لہجہ میں پوچھا...... ''یہ ایفل ٹاور کا خیال کس کا تھا......؟''

''میرا تھا...... آپ دو مرتبہ پیرس گئیں، آپ نے وہاں کی تعریفیں کیں۔ سوچا آپ کو سرپرائز دوں...... کیا آپ کو پسند نہیں آیا؟''

اس تمام دوران وہ سوال تو مجھ سے کر رہی تھیں، لیکن دیکھ ڈیڈ کی طرف رہی تھیں۔ میں نے یہ بھی حیرت سے دیکھا کہ ڈیڈ، موم کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میرے جواب کا نتیجہ اچھا سامنے آیا۔ موم کے چہرے کا فولاد کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔

''پسند آیا...... تم دونوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ باہر بھی سب واہ واہ کر رہے ہیں۔ مبارک ہو تم دونوں کو۔''

چونکہ باہر کے دروازے سے نوٹس ہٹا لیا گیا تھا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے کچھ اور لوگ بھی آئے۔ اب کی مرتبہ میں نے والد کے ساتھ والدہ کو بھی بات چیت اور فوٹو میں شریک کر لیا...... جس طرح ایفل ٹاور نے ہمارے گھر کے باہر ماحول کو خوشیوں کا گہوارہ بنا رکھا تھا، اسی طرح گھر کے اندر کا ماحول بھی اگر خوشگوار نہ بھی ہوا ہو تو نیم خوشگوار ضرور تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ رات کب آئی۔ ڈنر پر گھر کے لوگوں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ ایک جوڑے نے رقص بھی کیا۔ دیر رات تک سونے کا موقع ملا۔

ایفل ٹاور کی تعمیر کے پیچھے میرے اولین مقصد موم کو سرپرائز دینا تھا، اس میں قطعی ناکامی سے دوچار ہوا۔ البتہ اگلی صبح ہمارے لیے ایک سرپرائز لے کر چلی آئی تھی اور وہ بھی ایک زبردست المیہ کی صورت میں۔ ابھی صبح پوری طور پر ہوئی بھی نہ تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے ہم سب کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ دو پولیس افسر باہر کھڑے تھے۔ دو تین پولیس گاڑیاں اور ایک ایمبولینس۔ آگے آگے میں، میرے پیچھے ڈیڈ اور ان کے پیچھے موم...... جلدی میں صرف جیکٹ جسموں پر ڈالے گھر کے دروازے پر پہنچے تھے۔ ہم نے پولیس افسروں کو گھر کے اندر بلا لیا۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے دھماکہ خیز اطلاع سے بات شروع کی۔ رات ایک لیڈی ایفل ٹاور سے لپٹ کر مر گئی تھی۔ ہمیں باہر جا کر اس کی باڈی کو شناخت کرنا تھا۔ ابھی تک اس کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں اس کے مطابق:

مرنے والی کا نام مارتھا فرامرز تھا۔ اس کی عمر ۴۵۔۴۰ برس کی تھی۔ چند ہی دن ہوئے پیرس سے آئی تھی۔ ہم تینوں نے خاموشی سے یہ سب کچھ سنا۔ پولیس افسروں سے اجازت لے کر سردی کا لباس پہنا۔ باڈی کو ہسپتال لے جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہم تینوں کو ایمبولینس میں چڑھ کر اسے دیکھنا پڑا۔ جب ہم نیچے اترے تو پولیس افسر نے ہمارا بیان قلم بند کیا۔ میں نے یہی کہا

کہ مرنے والی کو اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی پیرس جانے کا اتفاق ہوا۔ موم اور ڈیڈ نے کیا لکھوایا، یہ مجھے اس وقت معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اس خاتون کی موت کا سبب میں نے پولیس افسر اور موقع ملنے پر پیرامیڈ سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پولیس والے نے کہا ''سردی..... ایکسپوژر۔'' پیرامیڈ نے بتایا ''نمونیا..... زبردست نمونیا۔'' پھر وہ سب ہسپتال چلے گئے۔ یہ سب بہت جلد ہو گزرا۔ یوں تو پیرامیڈ نے اس کو برقی جھٹکے دے کر حتمی کوششیں کر چھوڑی تھیں لیکن ہسپتال میں بھی پہنچانا ضابطہ کے مطابق ضروری تھا۔

جب میں گھر میں داخل ہوا تو ماحول سوگوار ہونا ہی تھا لیکن قدرے نا قابل فہم ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ موم فیملی روم میں اکیلی بیٹھی تھیں۔ وہ صوفے پر نیم دراز سی تھیں، ان کی آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔ ایک اپنے آپ کو سکیڑنے اور سمیٹنے والی ہستی۔ ضابطے کے اندر رہنے والی ہستی اپنے آپ کو پھٹ پڑنے سے روک رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے پوچھوں، کہیں وہ اس مرنے والی کو جان کر بھی انجان نہ بن رہی ہوں۔ ان سے یہ توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اپنے اندر ان سے سوال کرنے کی ہمت نہ پا کر میں فیملی روم سے نکل رہا تھا کہ موم کے الفاظ میرے سماعت سے ٹکرائے ''اپنے ڈیڈ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ اس کتیا کو یاد کر کے رو رہا ہوگا۔''

میں نے موم کی تاکید ان سنی کر دی اور زینہ چڑھ کر ڈیڈ کے کمرے تک پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ میں نے ناک کیا، کوئی جواب نہیں ملا۔ دو مرتبہ دروازہ ٹھک ٹھک کرنے کے بعد میں کمرے کے اندر دبے پاؤں داخل ہوا۔ میری نیت یہ تھی کہ اگر ڈیڈ کو بستر پر لیٹا پاؤں گا تو چپ چاپ الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤں گا۔ لیکن وہ بستر کے بائیں گوشے میں پڑی ہوئی کرسی پر اس طرح بیٹھے تھے کہ جیسے میز پر جھک کر کچھ لکھ رہے ہوں۔

''تم ہو..... مجھے پتہ تھا تم ضرور آؤ گے۔ تمہاری موم نیچے کیا کر رہی ہے.....''

''میں جانتا ہوں، وہ چھت کا مطالعہ کر رہی ہوگی۔ ایسے وقتوں میں وہ یہی کرتی ہے۔''

میں نے دیکھا، موم کے خیال کے عین مطابق ڈیڈ اکیلے بیٹھ کر رو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا۔

''موم اور ڈیڈ دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک جانتے تھے۔ ایک دوسرے کے ردعمل کے بارے میں دونوں کے اندازے کس قدر درست تھے۔'' میں نے سوچا اور بولا۔

''موم فیملی روم میں بیٹھ کر چھت کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ لیکن آپ..... آپ کیا کر رہے ہیں..... کیا آپ رو رہے ہیں ڈیڈ؟''

''تم سے کس نے کہا؟''

''موم نے۔''

''موم نے اور کیا کہا؟''

''موم کی بات چھوڑیئے..... یہ بتایئے کیا آپ متوفی کو جانتے تھے؟''

''ہاں..... جانتا تھا..... اتنا ہی جتنا میں پیرس کو جانتا تھا..... بھول گئے وہ گیت۔''

''پیرس میرے اندر ہے؟ وہ میرے اندر تھی..... وہی تو تھی میری پیرس..... پیرس میرا نہیں ہو سکا..... وہ میری نہ ہو سکی..... ہم سب کے راستے جدا تھے۔''

''ہم سب کے......؟''

''ہم سب سے مراد، وہ، میں، پیرس اور ایفل ٹاور...... ایفل ٹاور اس کی سائیکی کا ایک حصہ تھا۔ اس نے ایفل ٹاور کے ریستوران میں مجھے ڈنر دیا...... بل آیا تو پتہ چلا...... ایفل ٹاور کا وہ ریستوران دنیا کا مہنگا ترین ہوٹل تھا۔ ایک پاگل ہی وہاں ڈنر دے سکتی تھی۔ اسے عشق تھا ایفل ٹاور سے...... ہر شام وہ سورج ڈھلنے سے کچھ دیر قبل ایفل ٹاور کی چھت پر جا پہنچتی اور پیرس کا نظارہ کرتی۔ پیرس کا نظارہ کرنے کا موزوں ترین وقت...... اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نری پاگل تھی...... اور مری بھی پاگل کی موت۔''

یہ کہہ کر ڈیڈ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ میں نے میز پر سے ٹشو نکال کر ڈیڈ کو دیا اور کمرے سے نکلتے ہوئے دروازہ اچھی طرح سے بند کر دیا۔



ستاروں کی دنیا

نیلم احمد بشیر

حقیقت کیا ہے؟ وہ جو آنکھ دیکھتی ہے، دل محسوس کرتا ہے، دماغ سوچتا ہے یا پھر وہ منظر جو ٹی وی سکرین پہ دکھائی دیتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ کسی کو کیا پتہ کہ کون سا در ایسا ہے جو دِکھتا تو بند ہے مگر در حقیقت کھلا ہوا ہوتا ہے۔ کہاں جا کر شعور کی حد ختم ہوتی ہے اور خواہش کی شروع؟ ہمیں کیا خبر کہ قدرت جب سفاک ہونے پہ آتی ہے تو وہ ہمیں پتہ بھی نہیں چلنے دیتی کہ دراصل وہ ہمارے ساتھ رحمدلی کر رہی ہوتی ہے۔

ماضی کی مشہور پرانی، منجھی ہوئی ٹی وی سٹار ''بانو'' کسی ٹی وی پروگرام میں ایک خوبصورت سے سجے سجائے سیٹ پہ صوفے پر بیٹھی میزبان خاتون کے ساتھ زور زور سے ٹھٹھے لگا رہی تھی، ہنس اور گا رہی تھی، یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، حالانکہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی اس کی زندگی میں بہت کچھ ہوا تھا۔ اس کی مکمل کائنات ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل اور فنا ہو چکی تھی، جس کے بعد لگتا تھا کہ وہ خود بھی فنا ہو جائے گی مگر وہ تو بڑے آرام سے بیٹھی اپنے گزشتہ ایکٹنگ کیریئر اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں یوں گفتگو کر رہی تھی جیسے اسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔

''ہائے آپی، اس کو دیکھو...... کیسے مزے سے باتیں کیے جا رہی ہے۔ شاید اسے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ قدرت نے اس کے ساتھ کتنا بڑا ہاتھ کیا ہے۔'' میری چھوٹی بہن نے سکرین پہ نظریں جمائے ہوئے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔ لگتا تو یہی ہے کہ اس نے اس خوفناک حادثے کو ذہنی طور پہ قبول ہی نہیں کیا بلکہ رد کر دیا ہے۔ بعض اوقات انسان کا دماغی نظام یوں بھی کام کرتا ہے کہ آپ کو زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور تلخیوں کو قبول ہی نہیں کرنے دیتا۔ اچھا ہی ہے اس نے اسے بھلا دیا ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

میں اور میری چھوٹی بہن تو جانتے تھے کہ ابھی چند ہفتے پہلے ہی بانو کی آنکھوں کی روشنی، اس کا لاڈلا، اکلوتا بیٹا رضا قتل ہو چکا تھا اور اس کی لاش ان کی اپنی گلی کی جھاڑیوں میں گری پڑی ملی تھی مگر آج بانو کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اس حقیقت سے بے پرواہ اور بے خبر ہو چکی تھی کہ وہ اب اس پوری دنیا میں مکمل طور پر تنہا ہو چکی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال یا جینے کا سہارا بچا نہیں تھا۔

لگتا تھا سنّی بے خبر کو شعور ہی نہ تھا کہ اس کا شہر بھنبھور لوٹا جا چکا ہے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے۔ ایسی حالت میں تو اسے کپڑے پھاڑ کر، سر میں خاک ڈال کر روتے پیٹتے گلیوں میں بین کرتے نکل جانا چاہیے تھا مگر اسے یہ سب کرنے

کی ضرورت نہ پڑی تھی کیونکہ وہ تو پہلے ہی ہوش وخرد کی دنیا سے بہت دور رہتی تھی۔ اسے حقیقت اور خواب کی دنیا کے بیچ کے پردے کا ادراک ہی نہ تھا کہ شیزوفرینیا کے مریض اپنی ہی تصوراتی دنیا میں رہتے ہیں جہاں کی اپنی حقیقتیں، خیالی خاندان، دوست دشمن ہوتے ہیں اور وہ انہی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

ٹی وی پر انٹرویو لینے والی خاتون کہہ رہی تھی ''دیکھیے بانو کو...... ہنستی مسکراتی، زندگی کی طرف لوٹتی بانو......'' میرے کانوں میں بائیسکوپ والے کی گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی ''بارہ من کی دھوبن دیکھو۔ آگرہ کا تاج محل دیکھو، بلی کے دھڑ والی لڑکی دیکھو۔'' میرا جی چاہا میں دوڑ کر گلی میں جاؤں اور رنگ برنگے شیشوں والے بائیسکوپ پہ اپنی نظریں گاڑ دوں...... مگر یہ جو بائیسکوپ کا تماشا میرے سامنے ہو رہا تھا، کچھ کم دلچسپ تو نہ تھا۔ اب بانو کی پرانی ٹی وی ڈرامہ کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں جن میں بانو دبلی پتلی، صحت مند، جوان، خوبصورت، تروتازہ، فنکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال دکھائی دے رہی تھی اور اب بانو کیا ہوگئی تھی۔ خاک؟ ملیامیٹ، چھپکلی کی سی رنگت والی، ایک بجھی ہوئی عورت۔ اپنے دامن میں مہکنے والے واحد پھول کی خوشبو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا، تنہا، دیوانی سی۔

میری بہن جسے ہم سب پیار سے چھوٹی کہتے ہیں، اکثر بانو کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس جاتی اور آ کر مجھے اور ہمارے سب گھر والوں کو بتاتی رہتی کہ مایہ ناز اداکارہ آج کس حال میں ہے۔ چھوٹی کو ہمیشہ سے ہی اکیلی، دکھیاری، لاوارث عورتوں کو گود لینے کا شوق رہا ہے۔

بانو کو بھی اکثر وہ گھر لاتی، نہلاتی دھلاتی، کھلاتی پلاتی، کھانے کپڑے لتے دے کر پھر اس کے گھر چھوڑ آتی کیونکہ وہیں اسے سکون ملتا تھا۔ وہ اپنے گھر سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی جہاں وہ اور اس کا کتا رہتے تھے۔ یہ کتا بھی اس کے بیٹے رضا کی نشانی تھا کیونکہ رضا ہی اسے گلی میں سے اٹھا کر لایا تھا جہاں وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے خوراک تلاش کرتا چیاؤں چیاؤں کر رہا تھا۔ رضا اسے کھلاتا پلاتا، باہر لے کر جاتا اور ماں کے پاس اس وقت گھر چھوڑ جاتا جب وہ اکیلی ہوتی۔ کتا دونوں ماں بیٹے سے بہت مانوس تھا اور انہی کے ساتھ بستر میں گھس کر سو بھی جایا کرتا تھا۔ ہم دونوں بہنیں سوچنے لگیں ''اب کتے کا خیال کون رکھتا ہوگا؟ بانو کو تو اپنی ہی ہوش نہ رہتی تھی۔ کتے کی بھوک کا کیا بنتا ہوگا؟''

چھوٹی تو اب بانو کی مدرٹریسا بنی تھی مگر میں بانو کو تب سے جانتی تھی جب وہ نئی نئی ڈراموں میں آنا شروع ہوئی تھی۔ ٹی وی کے ابتدائی دن تھے۔ سبھی ہر شام ڈرامے دیکھنے کے لیے باقاعدگی سے ٹی وی کے آگے بیٹھا کرتے تھے۔ بانو کے ڈرامے ہم سب کو بہت بھاتے تھے۔ پھر ایک روز میرے کالج کے بڑے سے آنگن کے بیچوں بیچ لگے پرانے برگد کے نیچے کھڑی ایک معصوم سی لڑکی کو دیکھ کر کسی نے کہا:

''ارے وہ دیکھو، یہ وہی لڑکی نہیں ہے جو ڈراموں میں آتی ہے۔'' ہم سب سہیلیاں اس کی طرف لپکیں اور اسے حیرت واستعجاب سے دیکھنے لگیں یوں جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ ایک شرمیلی سی سادہ کپڑوں میں ملبوس، ہرنی جیسی حیران آنکھوں والی معصوم صورت لڑکی ہاتھ میں کتابیں لیے خاموشی سے اکیلی کھڑی تھی۔

''آپ بانو ہیں نا؟ حیرت کدہ والی؟'' میں نے اسے اشتیاق سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بغیر مسکرائے سر ہلا دیا اور پھر آگے کو چل دی۔ مجھے لگا یہ لڑکی کسی اور سیارے کی مخلوق ہے۔ اس دھرتی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید بھولی بھٹکی کوئی پرانی روح جو کسی کی متلاشی ہے مگر کس کی، یہ اس کو خود بھی خبر نہیں۔

میری اس سے دوستی ہوگئی مگر وہ زیادہ بات چیت نہ کرتی تھی۔ ذہین بہت تھی، کلاس میں پوچھے گئے ہر سوال کا جواب اسے آتا تھا۔ میں چونکہ خود بہت لائق تھی، لہٰذا مجھے وہ اچھی لگنے لگی تھی کہ ذہین لوگ ہمیشہ سے ہی میری کمزوری رہے ہیں۔ ایک دفعہ وہ کئی روز تک کالج نہیں آئی تو میں نے اس سے پوچھا:

''کہاں غائب تھیں بانو پری۔'' میں اسے پیار سے پری کہا کرتی تھی۔

''بیمار تھی۔ بخار ہو گیا تھا۔'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''رات بارش میں بھیگتی رہی نا...... تو بس صبح بخار ہو گیا تھا۔'' اس نے نیچی نظریں اوپر نہ اٹھائیں۔

''رات بھر کیوں! باہر تھی کیا؟''

''ہاں۔ وہ شوٹنگ سے آئی تھی نا تو بارش ہو رہی تھی۔ امی نے اندر سے ہی پوچھا۔ ''چیک لائی ہو؟'' میں نے جواب دیا، ''نہیں پروڈیوسر نے کہا ہے اگلے ہفتے۔ میں نے بہت مانگا پر وہ نہ مانا۔ امی کو غصہ آ گیا، پھر انہوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی گئی۔

''تم نے کہا نہیں کہ کھولیں امی؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بہت کہا۔ گڑگڑائی، رات بھر سردی میں بارش میں بھیگتی رہی۔ مگر صبح ہونے پر ہی انہوں نے دروازہ کھولا تو اندر گئی۔ بس پھر بخار چڑھ گیا۔''

وہ آرام سے یوں بولے جا رہی تھی جیسے کسی ڈرامے کا سین سنا رہی ہو اور اس سین سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے مگر وہ کتابیں اٹھا کر کلاس روم کی طرف چل دی۔

پھر کالج لائف ختم ہوگئی اور ہمارا آپس کا رابطہ بھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی ڈگر پہ چل نکلیں۔ میں سنتی رہی کہ بانو کامیابی کی منازل طے کرتے کرتے بہت بڑی اداکارہ بن چکی ہے۔ اس کی ایک دو شادیاں ناکام بھی ہو چکی تھیں مگر اس کی ماں نے بیٹے رضا کی پیدائش کے بعد رضا کے باپ سے بانو اور رضا کے لیے کم از کم ایک گھر ضرور لکھوا لیا تھا جس کے بعد سے وہ لوگ ہمیشہ اس میں ہی رہتے چلے آ رہے تھے۔

بانو کو اب اسی گھر میں رہتے ہوئے قریباً تیس سال ہو چکے تھے۔ گلبرگ کے اس گھر میں بانو کی جان تھی۔ اب ذہنی مریضہ بن جانے کے باوجود وہ اپنے گھر کو ہی اپنی جائے اماں سمجھتی تھی اور کسی صورت کہیں اور رہنے کو تیار نہ ہوتی۔ پے در پے محرومیوں اور مشکلات نے اس کا ذہن الٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ ہوش و خرد کی دنیا سے بہت دور چلی گئی تھی۔ جب چھوٹی نے یکدم اس کے ساتھ پیار محبت، دوستی کا تعلق پیدا کر لیا اور باقاعدگی سے اس کی خیر خبر لینے جانے لگی۔ بانو کو کئی بار ذہنی امراض کے ادارے والے آ کر لے بھی جاتے رہے۔ اسے داخل بھی کیا جاتا رہا مگر وہ ہر بار وہاں سے رسیاں تڑوا کر بھاگ آتی اور اپنے وحشت کدے میں ہی قرار پاتی۔

آہستہ آہستہ ہم سب گھر والے اس کی ذات، اس کے دکھ، اس کے مسائل میں انوالو ہوتے جا رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتے رہے اور پھر گھبرا کر رہ جاتے کہ یہ اکیلی ذات زندگی کو کیسے برتے گی، کیسے زندہ رہ سکے گی۔ کیا ہوگا اس کا؟ میں ذرا دانستہ طور پر اس کی زندگی سے دور رہتی کیونکہ مجھے ڈر لگتا تھا کہ کوئی بھی اس جیسے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔

وہ مجھے اپنا آئینہ لگتی اور میں اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

اتنی بڑی اور مانی ہوئی مشہور اداکارہ زمانے کے سانٹے کھا کر معدوم ہو سکتی ہے تو میں کیا چیز تھی۔ ایک ذرہ۔۔۔ ایک ہی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو جانے والی کمتر ذات...... ویسے بانو مکمل طور پر اکیلی بھی نہ تھی، اُس کی ماں تو آگ میں جل کر ختم ہو چکی تھی۔ ایک بہن ضرور تھی جو نعت خوانی اور مجالس میں مذہبی کلام پڑھ کر اچھے پیسے کما لیتی تھی مگر اپنے شوہر، بچوں میں اتنی مصروف تھی کہ اسے ذہنی مریضہ بہن کا خیال رکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

جب چھوٹی نے بانو کے بیٹے کے قتل کا بتایا تو میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ سوچا دو دن سے مردار گھر میں بند پڑی ہوگی۔ کچھ کھانے کو نہ ہوگا۔ کیوں نہ اس سے افسوس کروں اور کچھ کھانے کو دے آؤں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے گاڑی اس کی گلی میں موڑ دی۔ گلبرگ کے اس پوش علاقے میں اب رونقیں ہی رونقیں لگی ہوتی ہیں۔ گلی کے آغاز پر ایک جدید ترین کافی شاپ کھل جانے کی وجہ سے شہر کے امراء کے لڑکے لڑکیاں وہاں باقاعدگی سے آتے جاتے ہیں اور آپس میں میل ملاقات کرتے ہیں۔ ایک ہزار روپے کی کافی کا کپ ان کی جیب پر گراں نہیں گزرتا کیونکہ ان میں سے اکثر کے باپوں نے پاکستان کی لوٹ کھسوٹ اور کرپشن میں خوب مال بنایا ہوا ہے جسے ان کے بچے سہولت اور بے دردی سے خرچتے ہیں تو ان کے باپوں کو قطعاً تکلیف نہیں ہوتی بلکہ عین راحت نصیب ہوتی ہے۔

بانو کی بھوک کا خیال آتے ہی میں نے بھی گاڑی کافی شاپ کے باہر روک دی اور اندر جا کر تازہ، مزیدار سینڈوچز، کیک اور کافی پیک کروا کر بیگ بھر لیا۔ کچھ ہی دیر میں میں بانو کے گھر پہنچ چکی تھی۔ میں نے گاڑی پارک کر دی اور پھر متعدد بار بیل بجائی مگر کوئی کھولنے کو نہ آیا۔ ساتھ والے گھر کا ملازم لڑکا باہر آیا اور بڑے آرام سے بولا "بی بی اوپر کی منزل پہ ہوگی، مجھے ابھی نظر آئی تھی۔"

"ہائے اس کا کیا حال ہے؟" میں ملازم سے ہی پوچھنے لگی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس دکھیاری ماں کی کسی طرح سے کوئی مدد کر دوں۔ کچھ کروں اس کے لیے۔

"پتہ نہیں باجی۔ ہم تو انہیں نہیں پوچھتے۔ بیل بجاؤ تو وہ ڈنڈا یا جھاڑو لے کر ہمیں باہر مارنے آ جاتی ہیں اور کئی بار کپڑے بھی نہیں پہنے ہوتے۔" ملازم زیر لب مسکرانے لگا۔ مجھے تھوڑا سا غصہ آیا مگر میں برداشت کر گئی۔ میں نے پھر بیل بجائی تو اوپر چھت سے ایک سفید بالوں والا سر نمودار ہوا۔

"کون ہے؟" بانو نے نحیف آواز میں پکارا اور نیچے جھانکا۔

"بانو میں آئی ہوں۔ چھوٹی کی آپا...... کچھ کھانے کو لائی ہوں تمہارے لیے۔" میں نے اسے بتایا تو وہ نیچے آنے کے لیے سیڑھیاں اترتی دکھائی دینے لگی۔ چند لمحوں کی تاخیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ بانو میرے سامنے کھڑی تھی۔ میلے بے ترتیب کپڑے، الجھے ہوئے بے رنگے بال، ہونق چہرہ، ویران آنکھیں۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر جذبات کا ایک شدید طوفان اٹھا اور میں نے بے اختیار بانو کو گلے لگانا چاہا۔ مجھے اپنی طرف آگے بڑھتے دیکھ کر وہ غصے سے چیخی۔ "کیا کر رہی ہیں آپ۔ میرے اوپر ہی چڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ پیچھے ہٹ کے کھڑی ہوں۔"

میں پل بھر کو چونکی اور اس کی بات سے سبکی محسوس کر کے کچھ پیچھے ہو گئی۔ پھر سوچا یہ پگلی تو جانتی ہی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہو کیا چکا ہے۔ اس کی کسی بھی بات کا کیا برا ماننا۔ سو پھر اسے مخاطب کیا۔

''بانو...... رضا کے حادثے کے بعد سے تم دو دن سے گھر میں بند ہو۔ بھوک تو لگی ہوگی۔ میں تمہارے لیے یہ کھانا لائی ہوں۔'' میں نے پلاسٹک کے فینسی بیگ میں نفاست سے پیک شدہ فائیو سٹار ہوٹلوں جیسا کھانے پینے کا سامان اس کے آگے لہرایا ہی تھا کہ یکدم نہ جانے کہاں سے وہ لمبا چوڑا ہانپتا کانپتا کتا آیا، رالیں بہاتا ہوا۔ بیگ مجھ سے چھینا اور بھاگ گیا۔ میں حیران پریشان رہ گئی۔

''بانو...... یہ کھانا تو میں خاص طور پہ آپ کے لیے لائی تھی۔'' میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دنیا کتوں کی دنیا ہے اور کتوں کو بہت بھوک لگتی ہے۔ یہ رضا کا کتا ہے...... اس سے بچھڑ کر بہت بھوکا ہوگا...... رضا ہی تو اسے کھلاتا پلاتا تھا۔'' وہ میکانکی انداز میں بولتی چلی گئی۔ اسے اپنے پھر سے بھوکے رہ جانے کا قطعاً احساس ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

یکدم ایک گاڑی گیٹ پہ رکی اور اس میں سے ایک خوش لباس، صحت مند خاتون باہر نکلی جس کے ہاتھ میں تھاما موبائل فون، اس کی انگلیوں میں سجی ہیرے کی انگوٹھیوں کے رنگ سے میچ کرتا دکھائی دیتا تھا۔

''بانو یہاں باہر کیوں کھڑی ہے چل اندر۔'' اس نے آتے ہی بانو کو غصے سے ڈانٹا۔

''آپ کون؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''اس کی بہن ہوں۔ دیکھنے آئی ہوں کہ گھر میں بھی ہے یا کہیں سڑکوں پہ ماری ماری پھر رہی ہے۔'' اس نے بڑی بے زاری سے کہا۔

بہن...... میں نے دل میں سوچا۔ کیسی بہن ہے؟ جس کی پگلی بہن کی آنکھوں کا نور، اس کے جینے کا واحد سہارا اس سے چھین لیا گیا ہو۔ اس کے لیے اتنا سخت لہجہ اور کٹھور پن۔ کم از کم اس کے کھانے کے لیے ہی کچھ لے آتی۔ کوئی روٹی سالن، چائے کا سامان، پانی کی بوتل۔ مگر وہ تو خالی ہاتھ آئی تھی اور بانو کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ عجیب بہن تھی۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ بانو کا ایک بھائی انڈیا کا بہت بڑا طبلہ نواز تھا مگر بانو تو اب کسی گنتی یا کھاتے میں ہی نہیں رہی تھی۔

''یہ بھوکی ہوگی۔'' میں کہے بغیر نہ رہ سکی اور اس کی بہن کی طرف بغور دیکھا۔

''ہم کیا کریں۔ بڑا تنگ کیا ہوا ہے اس نے۔ ابھی میں نے اور میرے میاں نے تھانے سے رضا کی لاش چھڑانی ہے۔ اسے قبر میں اتارنا ہے۔ سو کام ہیں، کھپ گئے ہم تو اس کے بکھیڑوں میں۔''

''وہ میں کہنا چاہتی تھی کہ میری چھوٹی بہن نے بتایا ہے کہ اس کے گھر میں گیس چھوٹی ہوئی ہے شاید پائپ لیک کر رہا ہے۔ یہ کسی دن گیس سے......'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں۔ فاؤنٹین ہاؤس داخل کرواؤ تو وہاں سے بھاگ آتی ہے۔ میرے اپنے بال بچے ہیں۔ میرا کام ہے۔ میں اس کا خیال کیسے رکھ سکتی ہوں۔ کسی کی سنتی تو ہے نہیں۔'' بہن جھنجھلا کر بولی۔ ''یہ لے بانو کاغذ سائن کر۔ تھانے والے تیرے سائن کے بغیر لاش نہیں دیں گے۔'' اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ آگے بڑھایا اور پین سے بانو سے سائن کروا لیے۔ بانو بالکل چپ کھڑی اس کا حکم بجالاتی رہی۔ یوں جیسے وہ انسان یا ماں نہ ہو، کوئی بے جان کاٹھ کا پتلا ہو جس میں نہ تو کوئی جذبات ہوتے ہیں نہ احساسات۔ جو بس آگ میں جل کر خاک ہونا ہی جانتا ہو اور اس کے علاوہ اس میں کوئی قابلیت نہیں ہوتی۔

میں بانو کے پیچھے پیچھے اس کے گھر میں داخل ہوگئی۔ کتا لان کے ایک کونے میں بیٹھا مزے سے سینڈوچ اور کیک اڑا

رہا تھا۔ اپنی بدنصیب مالکن کے پیٹ اور دل کے خالی رہ جانے کا اسے کوئی احساس ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔

ایسی ہوتی ہے ستاروں کی دنیا؟ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے ادھر ادھر دیکھا۔

بانو حیرت کدہ ڈراموں میں کام کرتی رہی تھی مگر میں جس گھر میں قدم رکھ رہی تھی، وہ ہی اصل حیرت کدہ تھا۔ چاروں طرف کسی آسیب کا سایہ چھایا محسوس ہوتا تھا۔ یکدم مجھے احساس ہوا جب سب لوگ چلے جاتے ہیں تو لودیے کے تمام دیئے بھی بجھ جاتے ہیں۔ سورج سر نیہوڑائے سوچتا ہے..... اب پنچھی بھی اڑ جائیں گے..... اور رات شاید مستقلاً ٹھہر جائے گی۔

اس گھر میں شاید دن کبھی نکلتا ہی نہ تھا۔ اندھیرے تھے اور گیس کی بدبو..... میں نے حیران ہو کر سوچا۔ یہ عورت کتنی ڈھٹائی سے زندگی بسر کیے جا رہی ہے۔ ٹوٹتی ہی نہیں۔ زندگی اس کے ساتھ شاید دشمنی کیے چلی جا رہی ہے اور یہ ہے کہ ہتھیار پھینکنے کو تیار ہی نہیں۔ جیئے چلی جا رہی ہے۔

''بانو..... میں گیس کا والو بند کر دوں؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے گیس پائپ کی طرف قدم بڑھائے تو وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی ''خبردار جو میرے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔'' وہ یوں چیخی جیسے میں نے اس کے راج محل کی کسی دیوار سے سونے کی ایک اینٹ کھسکانے کا ارادہ کیا ہو۔ میں خاموشی سے پیچھے ہوگئی اور اس کے دہشت زدہ گھر کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگی۔ سارا گھر ٹوٹے پھوٹے سامان، لکڑی کے ٹکڑوں، پرانے کپڑوں، پھٹے ہوئے گدیلوں اور گند بلا سے اٹا ہوا تھا۔ کتے کی غلاظت، کاکروچوں، چوہوں کے مردہ جسموں کے ڈھانچے، فرش سے چپک کر فرش کا حصہ بنتے نظر آتے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔

''بانو یہ کیا ہوا؟'' میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''آگ لگ گئی تھی۔'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا اور بیٹے رضا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر گود میں لے کر ہولے ہولے گانے لگی۔

''جانا تھا ہم سے دور بہانے بنا لیے..... کیوں اتنی دور تم نے ٹھکانے بنا لیے.....''

کس قدر سریلی آواز تھی بانو کی۔ میں سن کر کانپ گئی اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے مگر بانو بے خبری سے گاتی چلی گئی۔ پھر اپنے سوراخوں والے میلے، بدبودار بستر پہ دراز ہو کر اس نے دوسرا گانا شروع کر دیا۔

''زندگی تماشہ بنی..... دنیا دا ہاسہ بنی..... کدی وی نہ پیار ملیا.....''

کون کہتا ہے یہ عورت پاگل ہے۔ اسے حقیقتوں کی سمجھ نہیں۔ میرا دل روئے چلا جا رہا تھا۔ بانو کا دل اتنا چھلا ہوا تھا..... میں اسے پیار کر کے تھپکانا چاہتی تھی مگر وہ تو اس وقت اپنے بیٹے رضا کے ساتھ تھی، میں نے اس کے اور اس کے بیٹے کے تعلق کے بیچ مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر اس حیرت کدے کے دوسرے کمروں کا جائزہ لینے لگی۔ سیلاب بلا کس کے گھر آ پہنچا تھا..... آج معلوم ہو گیا تھا۔

بیٹھک کی دیوار پہ لگے پرانے سے بدوضع آئینے پہ کسی بجھتی ہوئی شمع کی لو سے لکھا تھا ''نسخہ ہائے وفا.....'' ایک پلنگ الٹا کھڑا تھا جس کے اردگرد وی سی آر کی ٹیپوں Taps کے کالے کالے فیتے یوں لپیٹے ہوئے تھے جیسے انہوں نے اس پلنگ پہ لیٹے ہوئے کسی خیالی پیکر کو جکڑ دیا ہو۔

''بانو یہ نہیں؟'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''میرے ڈراموں کی ہیں۔ ذرا دیکھیں تو سہی میں نے کتنے ٹی وی ڈرامے کیے ہیں۔ اس طرح سے میرا کام میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔'' وہ ہنس ہنس کر فخریہ انداز میں بولتی چلی گئی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے مگر ہوتا رہتا ہے۔ تخلیقی ذہن رکھنے والے لوگ اکثر ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مجھے ماضی کی مشہور اور کامیاب ہندوستانی اداکارہ پروین بابی یاد آنے لگی جو شیزوفرینیا جیسے الجھا دینے والے مرض کا شکار ہو کر گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ اس نے بھی اپنے آپ کو اپنے فلیٹ میں تنہا مقید کرلیا تھا اور دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھتی تھی۔

پھر امریکی اداکارہ مارلن منرو کے عروج وزوال کی کہانی سے کون واقف نہیں۔ مارلن کو ایک بار ذہنی امراض کے ہسپتال میں بھی داخل کروایا گیا تھا جہاں وہ مارلن سے نورما جینز (Norma Jeans) (جو کہ اس کا اصلی نام تھا) بن کر وقت گزارتی رہی۔ اس کا بھی اپنی ماں سے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا جس نے اسے ذہنی طور پر کمزور اور ہمہ وقت بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ایسی خواتین اکثر محبت میں بھی ناکام رہتی ہیں اور اس کی تلاش میں کئی ناخوشگوار تجربے کرتی چلی جاتی ہیں۔

ایک دن چھوٹی کو کسی چینل والوں کا فون آیا۔ وہ بانو کو اپنے ایک گرینڈ ایوارڈ فنکشن میں بلانا چاہتے تھے مگر انہیں پتہ تھا کہ وہ اکیلی آنے کے قابل نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے بطور ہمراہی مجھے بھی مدعو کرلیا تھا جس کے لیے وہ لاہور سے کراچی تک کا ہوائی سفر کا ٹکٹ بھی دینے کو تیار تھے۔

میں شش وپنج میں پڑ گئی۔ بانو گو مجھ سے مانوس تھی مگر ذہنی طور پہ اس قابل ہرگز نہ تھی کہ اسے دوسرے شہر کا سفر کروایا جاتا۔ ٹی وی چینل والوں کو ریٹنگز درکار تھیں، لہٰذا ان کے فون پہ فون آنے لگے۔ بانو بھی سن کر مچل اٹھی کہ اسے کراچی بلایا جا رہا ہے۔ اس کا اشتیاق دیکھ کر میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''میں ضرور جاؤں گی۔ کراچی میں میری امی کا شہر ہے۔ ہمارا وہاں فلیٹ بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی میں امی جل کر مرگئی تھیں۔ پھر وہ فلیٹ میری بہن نے لے لیا۔'' بانو اپنی رو میں خاندانی رازوں سے پردے اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس دم مجھے وہ مکمل طور پر ٹھیک اور سمجھدار لگی۔ یوں جیسے اس نے جہانِ دیوانگی میں کبھی قدم تک نہ رکھا ہو۔ کیا دیوانگی اور فرزانگی کی سرحدیں اتنی قریب قریب ہوتی ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ میرا دل بھی پسیج گیا۔ سوچا بچاری جھلی اگر چند لمحوں کے لیے بہل جائے، خوش ہو جائے تو میرا کیا جائے گا۔ میں نے اس کے ساتھ کراچی جانے کی حامی بھر لی۔

فنکشن میں شامل ہونے کے لیے بانو کے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے، نہ سوٹ کیس۔ وہ میلے کچیلے، پھٹے پرانے چند جوڑے ایک ٹوٹے ہوئے بکسے میں ڈال کر ایئرپورٹ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہفتوں یا شاید مہینوں سے نہ نہائی ماضی کی عظیم اداکارہ، اپنے مردہ چھپکلی کے سے رنگ والے چہرے پر سرخ لپ اسٹک لگا کر شانِ بے نیازی سے ایک کالا بیوٹی بکس ہاتھ میں تھا۔ مہ بُت بنی خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھے جا رہی تھی۔

مجھے گلزار کی بنائی ہوئی فلم Sunset Boulevard یاد آ گئی جس میں اس نے اسی طرح ماضی کی عظیم اداکارہ نادرہ کی کہانی دکھائی تھی۔ جو ایام گزشتہ کے عروج کے ختم ہو جانے کے باوجود خود کو حسین، جوان، مقبول اداکارہ سمجھے جانے پر اصرار کرتی کہ حقیقتیں اسے سانپ کی طرح ڈستی رہتی تھیں۔ اف یہ پرانی اداکارائیں...... میرا دل تلخی ایام کی بے درد کٹھنائیوں کے احساس سے بھر آیا۔ کامیابی کتنی بڑی ناکامی اور عذاب ہوتی ہے......

اپنے پاس سے کچھ کپڑے اور ایک بہتر سوٹ کیس دے کر میں اسے لے کر ایئرپورٹ روانہ ہوگئی۔

جہاز میں اس نے وہ بدنما پرانا بیوٹی بکس اپنے قریب رکھ لیا اور پھر فلائٹ شروع ہوتے ہی اسے کھول لیا۔ اس میں ٹوٹے پھوٹے آئینوں اور میک اپ کے سامان کے علاوہ کسی سیپارے کے بوسیدہ پھٹے ہوئے اوراق بھی تھے جنہیں اس نے ہاتھ میں تھام کر اونچی اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔ مسافر اسے پہچان کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ تلاوت کے بعد یکدم اس نے اس گرد آلود کالے بیوٹی بکس کو اٹھایا اور زور زور سے جھاڑنا شروع کر دیا تو جہاز میں دھول پھیلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ ''کالی کتی، کالی کتی'' کہہ کر اس نے باکس کو پاؤں میں پھینک کر کچلنا اور ٹھوکریں مارنا شروع کر دیا۔

جہاز کے سفر کے دوران وہ گندی فحش گالیاں بکتی رہی۔ نہ جانے کون اس کے سامنے تھا جو اسے اتنا ستا رہا تھا۔ رات ہوتے ہی اس نے کھڑکی سے شٹر اٹھا دیا۔ باہر آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ بانو نے اپنے بیٹے رضا کی تصویر کھانے والی ٹیبل پہ سجالی اور چاند سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے وہ رضا ہو۔ اس کا پاگل منوا اور دیوانہ ذہن نہ جانے اس کے ساتھ ساتھ کیا کھلواڑ کرتے جا رہے تھے۔ بار بار ایئر ہوسٹس سے بدتمیزی کرتی، وہ اسے آرڈر پہ آرڈر دیئے جا رہی تھی۔

ایوارڈ کے فنکشن میں اتنا مجمع دیکھ کر بانو جھوم اٹھی اور بیچ میدان اٹھ کر ناچنے لگی۔ بار بار یہی کہتی...... ''چینل والوں نے میرے بیٹے کو کتنا اچھا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میرا بیٹا اسی عزت کا مستحق ہے۔''

ہم دونوں بہنیں اکثر اسے گلبرگ کی سڑکوں پر اکیلی بھٹکتے، اپنے بیٹے کے کپڑے پہنے چلتے پھرتے دیکھتیں تو ہمارا دل پارہ پارہ ہو جاتا۔ بانو نے چھوٹی کو ایک بار یہ بھی بتایا تھا کہ کئی مطلب پرست خونخوار کتے دو وقت کی روٹی کا لالچ دے کر اسے کبھی کبھار ساتھ بھی لے جاتے ہیں یا پھر کھانا لے کر اس کے ہی گھر چلے آتے ہیں۔ چھوٹی یہ سن کر بانو پہ بہت ناراض ہوئی۔ اسے ڈانٹا، سمجھایا مگر اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ بس کھانا کھانے کی خواہش کا ہی اظہار کرتی رہتی یا پھر رضا کی باتیں سنانے بیٹھ جاتی۔ اب وہ بہت دبلی دِکھتی یوں جیسے کوئی کم عمر لڑکی ہو۔ بھوک اور تنہائی کا مہیب دیو اسے دھیرے دھیرے نگلتا جا رہا تھا۔

''آپی اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ زندہ کیسے رہ لیتی ہے؟'' ایک روز چھوٹی آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔ ''سردیوں میں اسے سردی اور گرمیوں میں گرمی تو لگتی ہوگی۔ لوڈشیڈنگ میں اندھیرے سے بھی خوف کھاتی ہوگی۔ اسے ڈینگی کا مچھر بھی تو کاٹ سکتا ہے۔'' چھوٹی فکرمندی سے بولی۔ میں کچھ دیر خاموش رہی، پھر زبان کھولی۔

''اچھا ہو اگر یہ مر ہی جائے۔ اسے ڈینگی کا مچھر ہی کاٹ لے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ قدرت جب سفاک ہوتی ہے تو دراصل وہ رحمدلی کا مظاہرہ کر رہی ہوتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ مجھے یاد آیا اداکارہ پروین بابی ایک روز اکیلی ہی اپنے فلیٹ میں دم توڑ گئی تھی۔ کئی دن تک اس کی موت کا کسی کو علم تک نہ ہو سکا تھا۔

''آپی یہ مر گئی تو کئی روز تک تو کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں چلے گا......'' چھوٹی تڑپ کر بولی۔ ہم دونوں خاموش ہوگئیں۔

''اور اس کے کتے کا کیا ہوگا؟ اسے کھانا کون دے گا؟'' چھوٹی نے سوال کر کے مجھے لاجواب کر دیا۔

شاعر افتخار نسیم کی ایک نظم یاد آنے لگی جس کے آغاز میں اس نے اپنی پالتو بلیوں سے محبت کے بارے میں بتایا تھا اور یہ کہا تھا کہ اسے فکر رہتی ہے کہ اس کی موت کے بعد انہیں کھانا کون دے گا۔

''بانو بھوکی پیاسی کب تک زندہ رہ سکے گی؟'' ہم دونوں سر جوڑے بیٹھی سوچتی رہیں۔

''مگر آپی مجھے تو بانو سے زیادہ اس کے کتے کی بھوک کا خیال آتا ہے۔ بلکہ ڈر لگتا ہے سوچ کر۔'' چھوٹی سہم کر بولی۔
''اور اگر وہ واقعی ایک روز مرگئی تو؟''

افتخار نسیم نے اپنی نظم کے آخر میں لکھا تھا کہ اسے پھر بھی تسلی ہے کہ اگر وہ تنہا اپنے فلیٹ میں مرگیا تو اس کی بلیوں کے لیے کوئی انتظام تو ہو جائے گا۔ وہ اس کے نلکے کے رستے ہوئے پانی کو پی کر اپنی پیاس بجھالیں گی اور اپنے مالک کے مردہ جسم سے خوراک حاصل کرلیں گی۔ میں نظم میں کھوئی ہوئی تھی کہ یکدم چھوٹی کی آواز سے چونک گئی۔

''آپی اگر ایک دن کتے کو شدید بھوک لگی اور باہر سے کچھ کھانے کو نہ ملا تو؟''

''ہاں مگر صوفے پر لیٹی ہوئی زرد زرد نیم جاں کو تو وہ......''

میری بات نے میرے لبوں پر ہی دم توڑ دیا...... میں اپنی بات کو مکمل کرنے کی سکت خود میں نہ پا رہی تھی۔



ندیم افسانہ:

(جنوری ۱۹۳۷ء، (جب ندیم کی عمر بیس، اکیس سال تھی) منٹو کا خط اختر شیرانی کے نام)...... ''رومان کے پرچے باقاعدہ مل رہے ہیں۔ اس شمارے میں جتنے افسانے شائع ہوئے ہیں سب کے سب فنی نقطۂ نگاہ سے معیاری ہیں۔ خاص کر ''بے گناہ'' مجھے بے حد پسند آیا اور یہی وجہ ہے کہ میں اس کے قابل مصنف جناب احمد ندیم قاسمی بی اے سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ براہ کرم ان کے پتے سے بواپسی ڈاک مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔''

(جنوری ۱۹۳۷ء منٹو کا خط ندیم کے نام)...... ''آپ کا افسانہ ''بے گناہ'' واقعتاً میں نے بے حد پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اُردو میں بہت کم شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ Plastic ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کے موضوع کو آپ نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اُس کو چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔ میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آپ میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانے میں Objective ٹچ اور Atmospheris ٹچ بہت پیارے، موزوں و مناسب اور بے حد اچھے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے مختصر افسانے میں دو تین عروجی مناظر بہت Apealing ہیں۔''

(ندیم نگار: سعادت حسن منٹو)

پُھک نہ ویکھے سالنا

سلمیٰ اعوان

''کہیں دل پر تحریریں لکھنا اور انہیں دکھانا ممکن ہوتا تو یقیناً سینہ پھاڑ کر اس کے سامنے کر دیتی اور کہتی کمبخت لے دیکھ لے۔ کچھ ہے یہاں۔ بھلا کوئی بات تھی کہ اڑیل ٹٹو کی طرح اکڑ گئی تھی اور کچھ سننے اور سمجھنے کی کوشش میں ہی نہیں تھی۔ ہزار سمجھایا، لاکھ بار کہا مگر وہاں وہی آنکھوں میں بے اعتباری کا زہر سا گھلا ہوا۔''

سچ تو یہ تھا کہ بات تو کچھ بھی نہ تھی۔ بس ذرا سی، رائی کے دانے جتنی۔

جامعہ پنجاب کے شعبہ کیمیا، میں آل پاکستان لیول پر سیمینار ہو رہا تھا۔ پنڈال طلبہ وطالبات سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ اسلام آباد یونیورسٹی سے میرا عم زاد رجب علی اپنے چند دوستوں کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ وہاں موسم اتنا گرم نہیں تھا۔ لاہور میں باقاعدہ گرمی کا آغاز ہو چکا تھا اور اس وقت باوجود پنکھوں کے طلبہ کے چہرے اور جسم پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ ایک تو گرمی اوپر سے Radio-Activity جیسے موضوع پر غیر ملکیوں کے مقالے۔

کوئی بوریت سی بوریت تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب صبیحہ ڈائس پر آئی۔ یہ فیصلہ کرنا بہر حال دشوار تھا کہ پنڈال میں خاموشی پیدا کرنے میں اس کی شخصیت کے کس پہلو نے زیادہ اثر کیا تھا۔ موٹی ململ کے دوپٹے میں لپٹا اس کا چہرہ جیسے گرما کی چاندنی دھرتی پر اتری ہوئی ہو۔ اس کا صاف ستھرا انگریزی کا لب ولہجہ اور مقالے کے مندرجات فصلوں سے لے کر مچھلیوں اور پھلوں سے لے کر کینسر تک اس نے انسانی زندگی سے متعلق ریڈیو ایکٹویٹی پر خوب بولا تھا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ موزوں تھا۔ بہت سوں نے اسے بغور سنا تھا اور بہت سوں نے صرف اس کے چہرے پر ہی توجہ دیے رکھی تھی اور میرا کزن رجب علی بھی شاید ان میں سے ایک تھا کیونکہ جب میں نے کہا:

''صبیحہ نے مقالہ تیار کرنے میں بہت محنت کی ہے۔'' وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوا اور بولا:

''مقالہ...... وہ تو میں نے سنا ہی نہیں۔''

''تو ہونقوں کی طرح بیٹھے کیا جھک مارتے رہے؟''

وہ ہنسا اور آنکھوں میں خمار سا پیدا کرتے ہوئے بولا۔

''بس گلاب کی دو پنکھڑیوں کو ہلتے دیکھتا رہا۔''

''خیال رہے ان دو پنکھڑیوں کے ارد گرد بڑے نوکیلے کانٹے ہیں۔ ایک بار چبھ جائیں تو جان ہی نکال دیتے ہیں۔''

''مجھے کیا ڈرا رہی ہو؟'' اس نے اپنی گھنی چھوٹی مونچھوں کو انگشت شہادت سے سنوارتے ہوئے کہا۔

میں یقیناً اس کا جواب دیتی پر اس کا ایک دوست آ گیا تھا۔

کھانے کے لیے باہر لگے شامیانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے اسے گھر آنے کا کہا تھا۔

''دیکھوں گا۔'' کہتے ہوئے وہ ہجوم میں گم ہو گیا۔

ہم بہن بھائی اول درجے کے بھانڈ ہیں۔ شام کی چائے پر میں نے سب کو مخاطب کیا اور انہیں رجب علی کے صبیحہ پر عاشق ہونے کی خبر سنائی۔ صبیحہ میری کلاس فیلو ہی نہیں بلکہ دوست تھی۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ بھائی بہن بھی جانتے تھے۔

''کتنا سکوپ ہے بیچارے کا۔'' بڑی باجی نے پوچھا۔

''کمال ہے یعنی جان نہ پہچان اور بی خالہ سلام۔ آپ کی بھی عقل سٹھیا گئی ہے۔ صبیحہ تو نری زہر کی سنڈی ہے۔ جس نے ہاتھ بڑھایا، اس کے سارے شریر میں زہر ہی زہر گھل گیا۔''

جانے کیوں جیسے مجھے امید نہیں یقین تھا کہ رجب علی شام کو ضرور آئے گا اور واقعی وہ آیا۔ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوا تو سارے اس کے پیچھے پڑ گئے۔

''تف ہے اس لڑکی پر۔'' وہ میری طرف غصیلی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''یعنی آپ مجھے کیا ایسا ہی گرا پڑا سمجھتے ہیں۔ بھئی خوبصورت لڑکی ہے۔ ڈائس پر کھڑی بولتی اچھی لگی تھی۔ میں نے تعریف کر دی۔ اب یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس پر عاشق ہو گیا ہوں۔''

رات کا کھانا کھا کر جب وہ جانے لگا۔ ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر ایک لمحہ کے لیے اس نے جیسے مجھ سے سرگوشی کی۔

''کیا تم میری کچھ مدد نہیں کرو گی؟''

اور میں تو جیسے ہکا بکا ہی رہ گئی۔ وہ واقعی سیریس تھا۔

کیفے ٹیریا میں ٹھنڈا کوک اور سموسے کھاتے ہوئے میں نے رجب علی کے بارے میں اس سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ صبح سے میں موقع کی متلاشی تھی مگر وہ غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ نیو کیمپس چلی گئی۔ گیارہ بجے آئی تو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کا اس کے لیے پیغام تھا۔ وہاں سے نکلی تو میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

ٹھنڈا یخ کوک اور گرم سموسے، باہر لوؤں کے جھکڑ اور سامنے بیٹھی صبیحہ، میں نے جی کڑا کر کے ساری بات کہہ دی۔

اس نے سارا سموسہ منہ میں ٹھونس لیا۔ سارا کوک پل بھر میں چڑھا گئی۔ ڈکار لیے۔ کتابیں اٹھائیں اور میں جو اس ساری کارروائی کو احمقوں کی طرح بیٹھی دیکھ رہی تھی، ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورا اور بولی:

''چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ عاشقوں کے سندیسے میرے پاس لاتی ہو۔''

''لیکن......''

''بند کرو یہ بکواس۔'' اس نے فوراً میری بات کاٹ دی۔

''میری ماں ڈیڑھ سال سے مظفر گڑھ کے تھلوں میں اپنی بد دماغ بھاوج کی کھٹی میٹھی باتیں سن رہی ہے۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام کرتی ہے۔ تھلوں کی لو نے میرے بہن بھائیوں کو جھلسا دیا ہے۔ یہ عذاب وہ میری خاطر سہہ رہی ہے کیونکہ

میرے باپ کی تنخواہ میرے اور گھریلو اخراجات اٹھانے کی متحمل نہیں اور میں یہاں عشق کروں۔ چھی چھی۔ تھو تھو۔''

اس نے اتنی نفرت سے یہ سب کہا کہ میری تو سٹی گم ہوگئی۔ ایڑیاں بجاتی وہ پل بھر میں غائب ہوگئی۔

وہ باقاعدہ مجھ سے ناراض ہوگئی۔ بات چیت سب ختم۔ صلح صفائی کی ہر کوشش بے سود۔

''بھاڑ میں جائے رجب علی۔ ارے مجھے کیا باؤلے کتے نے کاٹا تھا جو میں اس جھمیلے میں پڑی!'' میں اپنے آپ کو کوستی۔

اس گھر کی پھٹی پرانی گودڑی میں ایک نہیں کئی لعل تھے۔ چمکتے دمکتے، ہیروں جیسی آنکھوں اور لعلین لبوں والے۔ ملنے جلنے والے رشتہ دار اور عزیز سبھوں کو حیرت تھی کہ صفیہ کے بچے اتنی غربت کے باوجود جتنے حسین ہیں، اتنے ہی ذہین۔ صبیحہ سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی اور تین بہنیں۔ صبیحہ کے والد ایک فرم میں ٹائپسٹ تھے۔ گھر میں سلیقہ تھا۔ قناعت اور سادگی تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ میں گزر بسر ہو رہی تھی۔ صبیحہ بہت چھوٹی سی تھی جب اس کی خالہ نے اپنے بیٹے نعیم کے لیے اسے مانگ لیا تھا۔ دونوں کی عمروں میں یہی کوئی سات آٹھ سال کا فرق ہوگا۔ نعیم کھلے ہاتھ پاؤں کا تیکھے نقش و نگار والا لڑکا تھا۔ پڑھائی میں اوسط درجے کا تھا۔ ایف ایس سی کی تو فوج میں کمیشن مل گیا۔ ماں بیٹے کے شاندار مستقبل سے خوش تھی اور صفیہ کو بیٹی مقدر والی نظر آ رہی تھی۔ نعیم لیفٹیننٹ بن کر ایبٹ آباد پوسٹ ہوا۔ یہاں اس کی ملاقات ایک بڑے کاروباری گھرانے سے ہوئی۔ گھر کے مالک کا کاروبار پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اخلاق اور مروت اس گھرانے کی امتیازی نشانی تھی۔ نعیم ان لوگوں میں بہت جلد گھل مل گیا۔ یہیں اس نے گل رخ کو دیکھا۔ شوخ و چنچل جس نے نعیم کو چاہت کی ڈوریوں میں جکڑ لیا کہ اسے تو کچھ یاد ہی نہ رہا۔ وہ تو یہ بھی بھول بیٹھا کہ ہیروں جیسی چمکتی آنکھوں والی ایک لڑکی اپنے خوابوں میں اسے سجائے بیٹھی ہے۔ نہ ماں یاد رہی اور نہ صفیہ خالہ کی چاہت اور محبت۔

پت جھڑ کے اداس اور ویران سے دنوں میں صبیحہ کو اس دکھ بھرے حادثے کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ اس وقت وہ کچن میں کھانا پکانے میں مصروف تھی۔ چولہے میں دہکتے کوئلے اور ہنڈیا کے تلے کو چاٹتے آگ کے شعلے دفعتاً اسے اپنے کلیجے میں اترتے محسوس ہوئے تھے۔ یہ درست تھا کہ نعیم کا اس کے ساتھ کوئی قول و قرار نہ تھا مگر آنکھوں کے بھرپور اظہار کے بعد بھی کیا زبانی اظہار کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ وہ جب بھی ان کے گھر آیا، اس کی آنکھوں میں محبت و شوق کی دنیا امڈی نظر آتی تھی۔ جب بھی دونوں کا ٹکراؤ ہوا اس نے دل کے سارے پیغام آنکھوں کے راستے صبیحہ کو پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ اور بات تھی کہ صبیحہ کی گھنی پلکیں ہمیشہ ان پیغامات کی وصولی میں پورا تعاون نہ کرتیں۔

یوں بھی کان تو بچپن سے یہ سنتے سنتے پک سے گئے تھے کہ وہ نعیم کی ٹھیکرے کی مانگ ہے۔ ٹھیکرے کی اس مانگ کو توڑنے میں پل بھی نہیں لگا تھا اور وہ چکنا چور کر کے رکھ دی گئی تھی۔

رات کو جب وہ سارے کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو بہت دیر تک جاگتی رہی اور اپنے آپ سے پوچھتی رہی کہ اس نے ایسا آخر کیوں کیا؟ کیا وہ خوبصورت نہیں ہے؟ یہ بات نہیں!۔ اندر سے تردید آئی۔

دولت پر مر گیا؟

''لعنتی کیا اپنے زور بازو پر بھروسہ نہیں تھا۔ ایسا مرد کس کام کا؟'' نفرت کی چنگاریاں جیسے پھوٹ پڑیں۔

چھی چھی۔ تھو تھو۔ اس نے کروٹ بدلی۔ زمین پر تھوکا اور آنکھیں موند لیں، یہ چھی چھی اور تھو تھو جیسے اس کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ مردوں کے لیے دل کا نرم گوشہ پتھر بن گیا۔

میٹرک کا نتیجہ نکلا تو ذہانت اور محنت سامنے آ گئی۔ ٹاپ کر کے اس نے اپنا اگلا راستہ صاف کر لیا تھا۔

''بی جان میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے لیے پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ ہمیں اس پر توکل کرنا چاہیے۔''

ماں کی اجازت سے وہ کالج میں آ گئی۔

ایف ایس سی میں اس نے پھر کالج میں ٹاپ کیا۔ بس ایس سی آنرز کے لیے وہ یونیورسٹی آ گئی۔ موٹی ململ کا لمبا چوڑا دوپٹہ اس نے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ کانوں میں روئی ٹھونس لی اور آنکھوں کو غیر ضروری کھولنے سے پرہیز کیا۔ اس کی شخصیت پراسرار ہو گئی تھی۔ بہت سے لڑکے اس کی طرف بڑھے مگر اس نے نفرت سے منہ پھیر کر تھوکا اور اپنے راستے پر بڑھ گئی۔

اب بھلا فوزیہ کا یہ کزن رجب علی بیچارہ کس گنتی میں شمار ہوتا تھا۔ جب وہ فائنل ایئر سے فارغ ہوئی اور ابھی ڈھنگ سے آرام بھی نہ کر پائی تھی کہ اسے اسلام آباد یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ مرکزی دارالحکومت کی نئی یونیورسٹی سے اساتذہ کا ایک بورڈ پاکستان کے چاروں صوبوں سے قابل طلبہ کو منتخب کرنے نکلا۔ پنجاب سے وہ اکیلی منتخب ہوئی۔ سرحد سے ایک، بلوچستان سے ایک، سندھ سے دو اور اسلام آباد سے ایک۔

اور جب وہ جانے کے لیے بستر بند میں تکیے گھسیٹر رہی تھی۔ ماں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا تک نہیں۔ بس کام میں جتی رہی۔ وہ جانتی تھی ماں اداس ہے اور اپنے آنسو مشکل سے ضبط کیے ہوئے ہے۔ ماں کی خواہش تھی کہ وہ اب پڑھائی کا سلسلہ ترک کر دے اور اپنے شہر میں ہی نوکری کرے۔ اتنا ڈھیر سارا تو پڑھ لیا تھا۔ رات کو اس نے جب بیٹی سے یہ سب کہا تو وہ متانت سے بولی تھی:

''بی جان میں زندگی میں کچھ بننا چاہتی ہوں۔ میرے سامنے ربیعہ، سمیعہ، ذکیہ، ہمایوں اور ٹیپو ہیں۔ آپ جانتی ہی ہیں بی جان آج کل انسان دولت کے ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ جہاں اور جس کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے، وہ بازی جیت لیتا ہے۔''

اسلام آباد یونیورسٹی ابھی زیر تعمیر تھی۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس نے مختلف کوٹھیاں کرائے پر لے رکھی تھیں۔ چھ طلبہ کی اس کلاس نے جس میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، اپنا پہلا دن تعارف میں گزارا۔ رجب علی بڑی شستہ انگریزی بول رہا تھا۔ وقار سے کھڑا تھا اور اپنی غیر نصابی سرگرمیوں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ صبیحہ سر جھکائے سفید نازک ہاتھ کی لانبی پوروں میں قلم پکڑے کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی غیر اختیاری طور پر اس کا قلم رجب علی کے بولتے لفظوں میں سے کوئی لفظ لکھ جاتا۔

گروپ ورک کرتے ہوئے اسے احساس ہوا رجب علی اس پر گہری نظریں ڈالتا ہے۔ ایک دن جب ان میں سے دو غیر حاضر تھے۔ ایک کہیں باہر گیا ہوا تھا اور بقیہ تین صبیحہ، رجب علی اور عائشہ کمرے میں کسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے، رجب علی نے ایکا ایکی کہا:

''میں آپ کی سہیلی فوزیہ جمال کا کزن ہوں اور آپ سے واقف ہوں، البتہ آپ میرے بارے میں نہیں جانتیں۔''

اور جیسے اسے سب یاد آ گیا۔ فوزیہ کے ساتھ اپنی نوک جھونک بھی آنکھوں کے سامنے جلوہ دکھا گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے جو رجب علی سے پوشیدہ نہ رہے۔ عائشہ کام میں مگن تھی جب رجب علی نے آہستگی سے کہا:

''دل کے دروازوں پر اتنے کڑے پہرے بٹھا رکھے ہیں کہ دستک دینا جرم بن گیا ہے۔'' فوزیہ نے ساری بات اسے بتا دی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور بڑے سخت لہجے میں بولی۔

''میں فضول اور واہیات باتیں سننے کی عادی نہیں۔''

رجب علی کا چہرہ ندامت سے سرخ ہو گیا۔

پھر ایک حادثہ ہوا۔ رجب علی کی والدہ اچانک فوت ہو گئی۔ ماں کا لاڈلا اوندھے منہ گرا۔ ایسے کڑے وقت میں صبیحہ کا حوصلہ اور دلاسہ دینا، اکثر کنٹین پر لے جانا ''اچھا چلو میرے ساتھ باتیں کرو۔ بیوقوف مجھے بتاؤ، کبھی کوئی مرنے والے کے ساتھ بھی مرا ہے۔'' جیسے جملے کہنا اسے اس غم کے حصار سے نکالنے میں بہت مددگار ثابت ہوا جس میں وہ اچانک گھر گیا تھا۔

ایسے ہی ایک دن جب اس نے بے اختیار کہا:

''صبیحہ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا جب صبیحہ قلم رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''عجیب ہو تم بھی۔ شکر گزاری والی کیا بات ہے؟''

ایک دن جب وہ اتفاق سے اکیلے تھے۔ انار اور آلوچوں کے پیڑوں کے پاس کھڑے تھے۔ انار کے پیڑ پر بور آیا ہوا تھا اور بھینی بھینی سی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ رجب علی نے اس سے کہا:

''صبیحہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ تمہارے بغیر میں بڑا ادھورا انسان ہوں تو تم میری اس بات پر یقین کرو گی؟''

وہ ذرا سا ہنسی اور رجب علی یہ نہ جان سکا کہ یہ ہنسی طنزیہ ہے یا سادہ۔ وہ پتوں کو توڑتی رہی، مسلتی رہی اور دیر بعد بولی:

''اصل میں کوئی ادھورا نہیں ہوتا رجب علی۔ سب ذہن کی سوچ اور سمجھ کا ہیر پھیر ہے۔''

اتنا دل شکن جواب تھا کہ اس کو مزید بات کرنے کا حوصلہ ہی نہ پڑا۔ اسے یہ ماننا پڑا کہ صبیحہ بہت مختلف اور گہری لڑکی ہے۔

یہ اسلام آباد یونیورسٹی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ یونیورسٹی سائنس مضامین میں ڈاکٹریٹ کروانے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز ذہین ترین طلبہ کے وقت کا ضیاع نہیں چاہتے تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ہر طالب علم کو کسی نہ کسی غیر ملکی یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ سب لوگ اپنی اپنی تھیسس اور مکمل کوائف بھیج کر انتظار میں تھے کہ دیکھو قسمت کہاں کہاں لے جاتی ہے۔

ایسے ہی انتظار کے دنوں میں ایک دن پھر رجب علی نے اس سے کہا:

''صبیحہ تم کنوار کوٹھا تو چھتو گی نہیں۔ میں کیا تمہیں اچھا نہیں لگتا؟''

اور پہلی بار صبیحہ نے قدرے نرم اور بوجھل آواز میں کہا۔

''کچھ چیزیں اچھا لگنے سے روکتی ہیں۔''

''مثلاً؟''

''کندھوں کے بوجھ۔'' صبیحہ نے اٹھ کر جانا چاہا، جب اس نے آنچل پکڑ کر کہا۔

''تفصیلی بتاؤ۔ ایسے نہیں جانے دوں گا۔''

اور جب وہ ساری تفصیل جان چکا تو سنجیدہ لہجے میں بولا:

''مل کر بھی تو یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ میرا دنیا میں کون ہے؟''

''نہیں۔''

اس کا لہجہ اتنا فیصلہ کن تھا کہ رجب علی کو اصرار اپنی حماقت لگا۔

صبیحہ کا نمبر سب سے پہلے آیا، وہ امریکہ کی ریاست نیویارک جا رہی تھی۔ رجب علی کے لیے جرمنی کا شہر ہیمبرگ منتخب ہوا۔ عائشہ اور جاوید فرانس اور انگلینڈ، ریاض اور خالد برلن اور کینیڈا۔

جانے سے قبل صبیحہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس نے دن کا کافی حصہ بھی میرے ساتھ گزارا تھا۔ رجب علی اس کی ساری گفتگو میں صرف ایک بار سرسری طور پر آیا تھا۔ میں نے بھی دانستہ پرہیز کیا۔

امریکہ سے مجھے صرف اس کے گنتی کے چند خطوط ملے تھے جن کا لب لباب کچھ یہ تھا:

''نئی دنیا اجنبی جگہیں میرے سامنے ہیں۔ میں ساڑھے تین سو ڈالر کے وظیفہ پر آئی ہوں۔ ڈیڑھ سو ڈالر گھر بھیجتی ہوں اور ڈیڑھ سو میں گزارا کرتی ہوں۔

ڈاکٹریٹ شاید جلد مکمل ہو جاتی مگر میجر ایڈوائزر جان سمتھ کے مرنے کی وجہ سے مدت طول پکڑ گئی ہے۔

میں نے بی جان کو لکھ دیا ہے کہ لڑکیوں میں سے جس جس کا رشتہ آتا جائے وہ بغیر چھوٹی بڑی کی تمیز کے فارغ ہوتی جائیں اور شاید تمہیں علم ہی ہو کہ ذکیہ اور سمیعہ بہت اچھے گھروں میں چلی گئی ہیں۔ ربیعہ کے لیے بھی اس کے ساتھی کلاس فیلو کا پروپوزل آیا جو بی جان نے منظور کر لیا۔ دونوں بھائی ڈاکٹری کے چوتھے اور پانچویں سال میں ہیں۔''

میری شادی پر اس کا نیک خواہشات سے لبالب بھرا خط بس آخری تھا۔ اب تو عرصے سے خاموشی تھی۔

کوئی پانچ سال بعد مجھے رجب علی کا خط اماں کے ایڈریس پر لکھا ہوا ملا تھا۔ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے میں نے اسے کھولا۔ پڑھتی گئی، پڑھتی گئی اور جب فارغ ہوئی تو حیرتوں کے اتھاہ سمندر میں دھڑام سے گر پڑی۔ صبیحہ اپنے تفصیلی پس منظر کے ساتھ میرے سامنے تھی۔ معاشرتی تہذیب و تمدن کے جس گہوارے میں اس نے آنکھ کھولی اور زندگی کے اکیس سال گزارے، اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل میرے سامنے تھی۔

گھر اس کا گو مشن ہائی اسکول چوک رنگ محل سے ایک گلی چھوڑ کر اگلی میں تھا، پر چوک کی جامع مسجد سے گونجنے والی پنج وقتہ اذانوں کی گونج کا اثر جس کے نتیجے میں بے اختیار ہی ڈوپٹوں کا سروں پر جانا اور مخصوص الفاظ کا زیر لب ورد کرنا بچپن سے ہی ان بہنوں بھائیوں کی سرشت میں کھانے پینے کی ضرورت جیسا ہی رچا بسا تھا۔ اس کا بی اے پاس باپ کہ جس کے لیے شرعی لباس پہننا اور آندھی جائے طوفان آئے جیسی موسمی صورت سے بے نیاز مسجد حاضر ہونا لازمی تھا۔ جمعے کے دن اس کے لباس کا اہتمام کرنا صبیحہ کی ڈیوٹی تھی۔ تڑکے نور پیر کے سمے اٹھنا اور مصلے بچھا کر فرض عبادت کے علاوہ نفلی سلسلوں میں لمبے لمبے سجدے بھی کہیں عادتوں میں شامل تھے۔

شب برأت، عیدین، چلچلاتی گرمیوں کے روزے، سحری و افطار کے مزے، تراویح میں خضوع و خشوع، نفلی روزے سب اس کی گھٹی میں پڑے تھے اور کہیں بغاوت یا سرکشی جیسا کوئی عنصر نہیں تھا۔ سارے رضا و رغبت اور چاہت والے معاملے تھے۔ قناعت، سنجیدگی و متانت بھی ڈھیروں ڈھیر پاس تھی۔

رجب علی کے خط کو ملے آج تین ماہ اور تیرہ دن ہو گئے ہیں۔ پہلی بار خط پڑھنے کے بعد تو مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ میں اس سے بھی کہیں زیادہ الجھاؤ کی دلدل میں پھنسی اس میں دھنستی ہی چلی گئی تھی اور بار بار سوالوں پر سوال کیے جاتی تھی۔

درمیانہ وقت تو یہی کوئی چار پانچ سال کا ہی تھا۔ جب اس یلغار نے مجھے عاجز کر دیا تو اسے چٹھی لکھ بیٹھی کہ اس کا

ایڈریس رجب علی نے لکھ دیا تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ صبحہ کے خط کے انتظار نے شاعروں کے جذبات سے مجھے عملی طور پر آگاہ کر دیا تھا۔ درمیانے وقت میں اکثر رجب علی کا خط دراز میں سے نکالنا اور اسے پڑھنا بھی دوسرے تیسرے دن ضروری تھا۔

''میرے جرمنی آنے سے صبیحہ کہیں اِدھر اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ کمبخت نانجار میرے ساتھ آئی تھی۔ یہ بھی نہیں کہ میں ہیمبرگ میں کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہوا۔ ہوا۔ جینی سے، ریتا سے پر صبیحہ نے درمیان میں اپنا کلّہ ٹھونکنا بند نہ کیا۔

میں خود سے پوچھتا تھا۔ آخر مسئلہ کیا ہے میرے ساتھ؟ کہیں میری میل ایگو ہرٹ ہونے کا تو نہیں۔ کبھی اندر ہاں کہتا اور کبھی ناں۔ بس دل تھا کہ بیچ میں ہی اس کے لیے مچلتا اور ہمکتا رہتا۔ کچھ واضح ہی نہ ہوتا تھا۔ یوں آغاز میں ایک آدھ دفعہ کے میں نے بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پورے پانچ سال بعد میں امریکہ گیا۔ نیویارک میں میرا کزن توصیف مجھے لینے آیا تھا۔ لانگ آئی لینڈ کی ہائی وے پر اطراف کے خوبصورت بلند و بالا صنوبر اور چنار کے درختوں میں سے صبیحہ لشکارے مارتی اور میرے دل کو اتھل پتھل کرتی رہی۔ پتہ تو پاس نہیں تھا۔ ٹامک ٹوئیاں والی بات تھی۔ پر وہ جو کہتے ہیں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تو بھلا صبیحہ نہ ملتی۔

ملی...... مین ہٹن کے ایک اپارٹمنٹ کی بیل پر دروازہ اُسی نے کھولا۔ دوپٹے کے بغیر اس کا چہرہ دیکھنا میرے تصور میں ہی نہیں تھا۔ وہ لمبی سی قمیض نما میکسی پہنے کھڑی تھی۔ سیاہ چمکدار بال کس کر بندھے ہوئے تھے۔ خوبصورت آنکھیں نتھری ہوئی جیسے ابھی ابھی انہیں گلاب کے پانیوں میں غوطے دیتی آئی ہو۔ وہ ویسی ہی خوبصورت تھی بلکہ متانت اور وقار کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کی پہلے لمحے کی حیرت نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ پر اگلے لمحے وہ بشاشت سے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کی دعوت دیتی تھی اور اپنے مزاج کے خلاف ہنستے ہوئے پوچھتی تھی۔

''تم نے مجھے کیسے ڈھونڈ لیا؟''

''لو بندے میں طلب ہونی چاہیے۔''

وہ پھر ہنسی اور بولی ''میرے خیال میں کافی بہتر رہے گی۔ تم ٹھنڈ پھانکتے ہوئے آ رہے ہو۔''

اور جب وہ کچن میں تھی، ایک درمیانی قامت اور سانولی سی رنگت والا مرد اندر آیا تھا کہ بیل کی آواز پر دروازہ میں نے ہی کھولا تھا۔

آنے والے کا انداز صاحب خانہ کا سا تھا۔ عین اسی لمحے صبیحہ چھوٹی ٹرے ہاتھوں میں تھامے نمودار ہوئی اور مسکراتے ہوئے تعارف کے مراحل طے کرنے لگی۔ وہ صبیحہ کا شوہر تھا۔ اشوک ورما۔

میں کوئی متعصب مسلمان ہوں نہ بنیاد پرست۔ پر اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود چکرا کر رہ گیا تھا۔

بہت روکنے کی کوشش کی دونوں نے مگر میرے لیے مزید ٹھہرنا مشکل تھا۔ سچ مانو تو میں ابھی تک اس الجھن سے نہیں نکل پا رہا۔''

اور میں کونسا الجھن میں نہیں تھی۔ اب انتظار میں بیٹھی دن گنتی تھی۔

مہینوں بعد اس کا جواب آیا تھا۔ خط کھولتے وقت اضطراب، تجسس، بے چینی جیسے جذبات سانس پھلائے دے رہے تھے۔ خالی صفحے پر بس یہ کہہ لو میرا منہ جیسے چڑا رہا تھا۔

پھک نہ ویکھے سالنا تے عشق نہ پچھے ذات
نیند نے ستھر ملیا جتھے پے گئی رات

☆

سیٹھ

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

وہ موبائل فون کی دکان کے شیشے سے ٹیک لگائے اخبار کے ٹکڑے میں رکھی ہوئی بریانی کو جو اس کی ماں اس کو دے کر گئی تھی، ایک ہاتھ میں پکڑے، اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر دوسرے ہاتھ سے کھانے میں مصروف تھی۔ پیشانی اور چہرے پر پسینے کی بوندیں جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کے قطرے۔ چہرے پر سرخی شاید بریانی میں مرچیں تیز ہونے کی وجہ سے تھی۔ فٹ پاتھ سے گزرتا ہوا ہر شخص اس پر نظر ڈالے بغیر نہیں گزر رہا تھا۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں بھی بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دکان کے دروازے کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا ہوا محافظ بندوق ہاتھ میں تھامے دکان کی حفاظت کے ساتھ شاید لڑکی کی بھی حفاظت پر مامور دکھائی دیتا تھا۔

بریانی ختم کرنے کے بعد وہ اٹھی، اخبار کے ٹکڑے کا گولہ بنا کر ایک طرف پھینکا، دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کیے، ایک ہاتھ میں تولیوں کا گٹھا اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں تولیے کے چند ٹکڑے پکڑے اور آگے بڑھ کر سگنل بند ہونے کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ اس کے پاس ہی دو آٹھ یا نو سال کے لڑکے پھٹے، میلے کچیلے کپڑوں میں فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ سڑک کے دوسری جانب ایک عورت میلا کچیلا برقعہ پہنے نقاب کھولے کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے نزدیک ہی دوسری عورت چھوٹی سی بچی کو سینے سے چمٹائے دودھ پلانے میں مصروف تھی۔

سگنل بند ہوتے ہی وہ دونوں لڑکے ٹریفک کی طرف بھاگے۔ ''بھوک لگی ہے کھانا کھلا دو، ثواب ملے گا''، ''اپنے بچوں کا صدقہ دے دو''، ''اللہ بھلا کرے غریب کی مدد کردو'' کی صدائیں لگاتے ہوئے بھیک مانگنے لگے۔ برقعے والی عورت نے اپنا تولیے کا گٹھا اٹھایا، چند تولیے کے ٹکڑے دوسرے ہاتھ میں پکڑے اور بیچنے کے لیے سواریوں کی طرف توڑی۔ بچی کو دودھ پلانے والی عورت نے ایک جھٹکے سے بچی کا دودھ چھڑایا، اسے ایک ہاتھ میں دبوچا، اس کے رونے کی پروا کیے بغیر دوسرے ہاتھ میں کٹورا پکڑا اور ایک ایک سواری کے سامنے کٹورا پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنے لگی۔ تولیے والی لڑکی جو سگنل بند ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی، آگے بڑھی، سامنے رکشہ رکا ہوا تھا۔ اپنا تولیے والا ہاتھ بڑھا کر بولی ''پانچ روپے کے دس۔'' رکشے والے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اس کی نظریں پھسلتی ہوئی اس کے سراپا کو گھورنے لگیں۔ وہ اپنے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے بولا:

''چل بیٹھ جا رکشے میں تجھے سیر کراؤں گا۔''

وہ وہاں سے ہٹ گئی اور ایک کے بعد ایک گاڑی، رکشہ، ٹیکسی، موٹر سائیکل سوار کے آگے تولیے والا ہاتھ بڑھا بڑھا کر

بولتی رہی: ''پانچ روپے کے دس لے لو۔''

کسی نے تولیے خریدے، کسی نے آنکھوں کی پیاس بجھائی۔ سگنل کھل جاتا تو سب ایک طرف بیٹھ جاتے اور سگنل بند ہوتے ہی ٹریفک کی طرف دوڑتے۔ روز کا یہی معمول تھا۔ یہ سارا انظام صرف ایک آدمی چلا رہا تھا۔ دن بھر یہ غریب بھاگ بھاگ کر، بھیک مانگ کر، تولیے کے ٹکڑے بیچ کر پیسے کماتے مگر ان کے حصے میں چند پیسوں کے علاوہ کچھ نہ آتا۔

''اماں تو مجھے گھر چھوڑ دیا کر، مجھے اچھا نہیں لگتا اپنا آپ دکھانا۔''

''تجھے گھر چھوڑ دوں تو سیٹھ کو پیسے کون دے گا؟'' ماں غصے سے بولی۔

''اماں عارف اور ذکو بھی تو کام کرتے ہیں۔ پھر تو مجھے کیوں بھیجتی ہے۔''

اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ماں کے نزدیک گئی اور تھوڑا سا شرما کر بولی۔

''اماں وہ کالی گاڑی والا آج پھر روڈ سے گزر رہا تھا۔ اس نے سارے تولیے خرید لیے۔ آج بھی مجھ سے کہہ رہا تھا چل میرے ساتھ تجھ سے شادی کروں گا۔''

''اس کا تو میں دماغ صحیح کروں گی۔ اب کی مرتبہ تو مجھے اشارہ کر دینا۔ میں تیرے آس پاس ہی تو ہوتی ہوں۔ اور ہاں تو کیوں جاتی ہے اس کی گاڑی کے نزدیک، مت جایا کر، مت بیچا کر اسے تولیے۔ چل تو روٹی ڈال تیرا باپ آتا ہوگا۔'' لالی کے چہرے سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ گلابو آٹا گوندھ کر روٹی ڈالنے لگی۔

''اماں وہ فضلو ہے نا سیٹھ کا آدمی، آج میں کھانا کھا رہی تھی تو میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے مجھے گھورتا رہا، پھر بولا تو رمضان کی بیٹی ہے نا۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہا، پھر چلا گیا۔ یہ سنتے ہی لالی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

''تو اب سیٹھ کے آدمیوں کی نظر گلابو پر بھی پڑ گئی۔'' لالی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنی حالت کا اندازہ گلابو کو نہیں ہونے دیا۔ اسے یاد آیا، ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کی بھابھی نے ان سے کہا تھا:

''لالی گلابو کو باہر زیادہ نہ نکالا کر۔ ترنت اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔ سیٹھ کی آدمیوں کی نظر میں آ گئی تو مشکل ہو جائے گی۔''

رات کافی ہو چکی تھی۔ رمضان کھانا کھا رہا تھا۔ دروازے کی کنڈی بجی۔

''اتنی رات کو کون آیا ہے؟'' رمضان کھانا چھوڑ کر یہ کہتا ہوا دروازے پر گیا۔

فضلو...... سیٹھ کا آدمی کھڑا تھا۔

''تجھے جمعہ کے دن سیٹھ نے بلایا ہے...... شام پانچ بجے۔''

''کیا کام ہے......؟ میں نے تو سارے پیسے انور صاحب کو دے دیے ہیں۔''

''تو خود سیٹھ سے پوچھ لینا۔'' فضلو نے پان کی پیک کی پچکاری گھر کی چوکھٹ پر ماری۔ گردن پر پڑے رومال کو باندھا۔ ''شام پانچ بجے۔'' کہتا ہوا چلا گیا۔

''کون آیا تھا؟'' لالی نے پوچھا۔

''فضلو......'' رمضان نے کہا۔

لالی کی آواز جیسے حلق میں بند ہو گئی۔ بڑی مشکل سے بولی:

''اتنی رات کو کیوں آیا تھا؟''

''سیٹھ نے بلایا ہے۔ جمعہ کے دن شام پانچ بجے۔'' رمضان دوبارہ کھانے کے لیے بیٹھتے ہوئے بولا۔

رمضان نہیں سمجھ سکا لیکن لالی سمجھ گئی کہ سیٹھ نے کیوں بلایا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی لڑکی ان کی برادری میں جو خوبصورت ہو، اگر سیٹھ یا اس کے آدمیوں کی نظر میں آ گئی، سیٹھ فوراً اس سے شادی کر لیتا ہے۔ لڑکی کے عوض تھوڑی سی رقم ماں باپ کو دے دیتا ہے۔ پھر ساری زندگی لڑکی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ عرفان کی بیٹی شمو کو مانگا تھا۔ عرفان نے انکار کیا تو سیٹھ کے غنڈے لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے اور عرفان کو اتنا مارا کہ وہ پلنگ سے لگ گیا اور چھ مہینے میں ختم ہو گیا۔ شمو کا آج تک کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے......؟ کیسی ہے......؟ برادری کے سب لوگ واقف تھے لیکن کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ سیٹھ کے آگے اپنی زبان کھول سکے۔

دوسرے دن صبح جب سب لوگ اپنے اپنے اڈوں کی طرف جانے کے لیے نکلے تو لالی نے عارف اور ذکو کو بھی بھیج دیا۔ یہ دونوں بچے سگنل پر بھیک مانگتے تھے۔ رمضان سو رہا تھا۔ وہ تو نشہ کر کے سویا تھا۔ تین چار بجے اٹھے گا، کھانا کھائے گا اور دوستوں کے ساتھ محفل جما کر بیٹھ جائے گا اور جب سب اپنی اپنی کمائی لا کر اس کو دیں گے تو وہ یہ ساری رقم سیٹھ کے خزانچی انور کے ہاتھ پر لے جا کر رکھ دے گا۔ انور رمضان کو ان پیسوں میں سے تھوڑی سی رقم دے کر رخصت کر دے گا اور جو پیسے کم ملے تو انور اس کو سیٹھ کی دھمکی دے گا...... لالی یہ سب سوچتے ہوئے گلابو کو اندر کوٹھڑی میں لے گئی اور آہستہ سے بولی: ''اب اگر وہ گاڑی والا کہے، چل میرے ساتھ تو چلی جانا۔'' گلابو ماں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ لالی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے سے ایک لوہے کا بکس نکالا۔ اپنے ڈوپٹے کے پلو سے بندھی ہوئی چابی سے بکس کا تالا کھولا، اس میں سے ایک گلابی رنگ کا جوڑا نکال کر گلابو کو دیتے ہوئے کہا:

''یہ پہن لے۔'' اور سونے کی ایک چوڑی اس کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے بولی ''یہ چوڑی تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے تیرے لیے بنوائی تھی۔ تیرے باپ سے چھپا کر رکھی تھی۔ اگر اس کو پتہ چل جاتا تو اب تک بیچ کر نشہ کر چکا ہوتا۔''

ماں کو روتا دیکھ کر گلابو بھی رونے لگی۔ لالی نے اس کے آنسو پونچھے، اسے لپٹا لیا اور اپنی ممتا کی ساری محبت اس کے وجود میں انڈیل دی۔ گلابو نے کپڑے تبدیل کیے۔ گلابی رنگ نے اس کے حسن کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑی کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے کوئی سونے کی چیز پہنی تھی اور وہ بھی چوڑی۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

لالی نے گلابو کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیٹی گلابو بہت خوبصورت ہے۔ اس نے اس کے جوان حسن کی دل ہی دل میں بلائیں لیں۔ ایک بار پھر اسے لپٹا لیا اور اپنی طرف سے اسے بدا کر دیا۔ لالی نے ماں کی ہدایت کے مطابق چوڑی اپنی آستین میں چھپا لی اور ماں بیٹی دونوں اڈے کی طرف چل دیں۔

لالی گھر لوٹی تو گلابو پہلے سے موجود تھی۔

''کیا وہ نہیں آیا؟'' لالی نے پوچھا۔

''نہیں۔'' گلابو نے آہستہ سے کہا۔

دوسرے دن بھی وہ نہیں آیا۔ لالی کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ جانتی تھی گلابو اگر سیٹھ کے مانگنے کے بعد غائب ہوئی تو

سیٹھ پورے خاندان کو تہس نہس کر دے گا اور گلابو کو پاتال سے بھی نکلوا لے گا..... کل جمعہ ہے۔ کل پانچ بجے رمضان کو سیٹھ کے پاس جانا ہے۔ اسے یقین تھا سیٹھ گلابو ہی کی بات کرے گا۔ تھوڑی سی رقم گلابو کے بدلے دے دے گا۔ بظاہر اس سے نکاح کرے گا۔ اس کے بعد گلابو کا کچھ پتہ نشان نہیں ملے گا۔ رمضان رقم لے لے گا اور پھر سارے پیسے جوئے میں اڑا دے گا۔ بس آج کا دن..... ایک ہی دن اور ہے..... اگر وہ گاڑی والا آج بھی نہیں آیا تو.....؟ لالی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

رات سب لوگ اپنے اپنے اڈوں سے واپس آ چکے تھے۔ لالی زور زور سے رو رہی تھی۔ سر اور سینہ پیٹ رہی تھی۔ گلابو گھر نہیں لوٹی تھی۔ ساری برادری جمع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے گلابو کی تلاش میں دوڑ لگا دی۔

سیٹھ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے رمضان کے پورے گھر والوں کو بلوا بھیجا..... بچوں تک کو..... بڑی پوچھ گچھ کی..... دھمکیاں بھی بہت دیں..... اور بولا..... ''گلابو کو تو میں نکلوا ہی لوں گا چاہے وہ کہیں بھی ہو۔'' اپنے آدمیوں کو تاکید کی کہ گلابو کے گھر کے تمام افراد پر کڑی نظر رکھیں۔

وہ گاڑی میں پیچھے بیٹھی تھی۔ خوف، گھبراہٹ اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ..... اسے اپنے ماں، باپ، بہن بھائی، سہیلیاں اپنا گھر سب ہی کچھ وہ جو پیچھے چھوڑ کر جا رہی تھی، بہت یاد آ رہے تھے۔

تمام راستہ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اسے شہر سے بہت دور کہیں لے جا رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے وہ ایلیویٹر کی طرف چلا۔ گلابو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ چوتھی منزل پر پہنچ کر دونوں ایک ساتھ باہر آئے۔ اس نے فلیٹ کا تالا کھولا اور دونوں اندر چلے گئے۔ فلیٹ میں اور اس کے آس پاس مکمل سناٹا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت کم فلیٹ آباد ہوں۔

''تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں اور ہاں کھڑکیوں کی طرف ہرگز مت جانا۔ اگر کوئی بیل بجائے تو دروازہ نہیں کھولنا، بس چپ سادھے رہنا۔'' اس نے گلابو کو تاکید کی۔

پہلی بار اس اجنبی نے گلابو سے بات کی اور گلابو کا جواب سنے بغیر دروازہ لاک کر کے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی گلابو نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ دو بڑے بیڈ روم، بڑا سا ٹی وی لاؤنج، کچن بھی اچھا بڑا تھا۔ پورا فلیٹ فرنیچر سے آراستہ اور خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اسے ہر چیز بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے واش روم کا دروازہ کھولا، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں..... اتنا بڑا اور اتنا صاف ستھرا..... اندر جا کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا سراپا دیکھا..... وہ خود ہی شرما گئی۔

پورے فلیٹ کا چکر لگانے کے بعد وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے بہت زور سے بھوک لگ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ اجنبی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلیاں تھیں۔ اس نے تھیلیاں میز پر رکھیں اور بولا ''بھوک لگی ہے.....؟'' گلابو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے میز پر کھانا لگایا اور بولا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''گلابو'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''گلابو آؤ کھانا کھا لو'' وہ میز پر کھانا لگا چکا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بچا ہوا کھانا سلیقے سے فریج میں رکھ کر کہا ''جب بھی بھوک لگے، اس میں سے نکال کر گرم کر کے کھا لینا۔''

جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر اس نے تاکید کی" کھڑکیوں کے نزدیک مت جانا اور چاہے کوئی کتنی بیل بجائے، دروازہ کھٹکھٹائے، ہرگز مت کھولنا۔ میں کام سے جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں کتنے دنوں میں لوٹوں گا...... اور ڈرنا بالکل نہیں، یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔"

جب وہ جانے لگا تو گلابو نے پوچھا" تمہارا نام کیا ہے؟"

" آصف۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ لاک کر کے چلا گیا۔

" آصف۔" اس نے دوہرایا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

شام رات میں تبدیل ہو گئی۔ چاروں اور سے ایک سناٹا اسے گھیرے میں لینے کے لیے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس پر ایک خوف سا مسلط ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ صوفے پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ ٹی وی چلائے لیکن آصف نے منع کیا تھا ٹی وی چلانے کے لیے۔ اسے گھر کی بھی بہت یاد آ رہی تھی۔ " یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" وہ بیٹھی نجانے کیا کیا سوچتی رہی۔ جب اسے بہت نیند آنے لگی تو اس نے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگائی اور منہ تک چادر لپیٹ کر سو گئی۔

جب آنکھ کھلی تو صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے پردوں کے درزوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ حیران ہوئی کہ وہ کہاں ہے...... لیکن دوسرے لمحے ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ تین دن ہو گئے آصف نہیں آیا۔ اسے اب ڈر تو نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ پریشان ضرور تھی کہ وہ اسے قید کر کے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ چوتھے دن وہ آیا، کھانے کی کچھ چیزیں دے کر کہنے لگا" یہ کچھ کھانے کی چیزیں ہیں، سنبھالو اور یہ کپڑے ہیں تمہارے لیے نہا کر بدل لینا...... مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ میں پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ کھڑے کھڑے ہی واپس چلا گیا۔

" اس نے مجھے چھوا بھی نہیں۔" گلابو نے حیرانی سے سوچا۔ ساتھ ہی وہ کسی انجانے خوف سے کانپ بھی۔

سب لوگ گلابو کو تلاش کر کے تھک گئے۔ سیٹھ کے آدمیوں نے بھی بہت ڈھنڈیا مچائی۔ گلابو کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لالی بظاہر رونا پیٹنا مچائے ہوئے تھی لیکن وہ مطمئن تھی۔ اس نے جیسا چاہا ویسا کر دکھایا۔

گلابو کو وہاں رہتے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اسی دن شام میں آصف آیا۔ کہنے لگا" چلو ہمیں کہیں اور چلنا ہے۔" وہ آصف کے ساتھ گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی ایک اور آدمی چلا رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد آصف نے گاڑی رکوائی اور گلابو سے بولا" تم ان کے ساتھ جاؤ، میں وہیں پہنچ جاؤں گا۔"

یوں وہ بازار کا ایک حصہ بن گئی۔ شروع میں بہت روئی دھوئی۔ وہاں سے نکلنے کی بھی بہت کوشش کی۔ بالآخر اسے وہاں کے طور طریقوں کو اپنانا پڑا۔ اس پر آصف کی حقیقت کھل چکی تھی۔ اس کے دل میں آصف کے لیے جو جذبات تھے، اب ان کی جگہ کراہیت نے لے لی تھی۔

" کیا مرد سب ایسے ہی ہوتے ہیں؟" وہ اکثر سوچتی۔

کنول جان کو سب آپا کہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی یہ خاتون اب بھی بے حد حسین تھی۔ اس بازار پر ان ہی کی حکمرانی چلتی تھی۔ لیکن ایک عجیب بات گلابو نے یہ دیکھی کہ وہاں کی سب لڑکیاں کنول جان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ شاید کنول جان یہ بھول نہیں سکی تھیں کہ ایک دن ان کو بھی ان لڑکیوں کی طرح اس بازار میں زبردستی لایا گیا تھا۔ ان کے رویے میں ایک چھپی ہوئی مادرانہ شفقت کا احساس ہوتا۔

''آپا..... وہ جو کل آیا تھا.....'' گلابی..... (گلابو جو اس بازار میں پہنچ کر گلابی بن گئی تھی) ڈرتے ڈرتے کنول جان سے بولی۔

''ہاں ہاں وہ..... وہ جو مہینے میں ایک ہی بار آتا ہے۔ جب اسے تنخواہ ملتی ہے۔'' کنول جان ہنستے ہوئے بولیں۔

''آپا وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔ مجھ سے باتیں کرتا رہتا ہے اور مجھے نیند لگ جاتی ہے تو وہ پیسے میرے سرہانے رکھ کر چلا جاتا ہے۔ کل وہ کہنے لگا، وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' گلابی ایک ہی سانس میں ہمت جٹا کر بول گئی۔

کنول جان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولیں ''بولتے تو سب ہیں لیکن کوئی بھی کوٹھے کی رانی کو اپنے گھر کی ملکہ نہیں بناتا۔''

''نہیں آپا، وہ سب کی طرح نہیں ہے۔ وہ سچے دل سے کہہ رہا تھا۔'' گلابی اس کی حمایت میں بولی۔

کنول جان سنجیدہ ہوگئیں۔ انہوں نے گلابی کو غور سے دیکھا۔ گلابی نگاہیں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ کنول جان نے گلابی کو سمجھایا۔ ''یہ لوگ جو رات کے اندھیرے میں یہاں آتے ہیں، دن کی روشنی میں ہمیں پہچانتے بھی نہیں ہیں۔ ہمیں رسوا اور ذلیل سمجھتے ہیں۔'' ایسا کہتے سے زندگی کی ساری تلخی ان کے لہجے میں سما گئی تھی۔

''آپ اس سے ایک مرتبہ بات کر کے دیکھیں، میں نے اسے کل بلایا ہے۔'' گلابی نے کنول جان کی منت کی اور اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

گلابی کی ضد پر کنول جان نے اس سے بات کی — کیا باتیں ہوئیں — ؟ کنول جان نے گلابی کو نہیں بتائیں۔ البتہ دوسرے ہی دن سب سے چھپ کر انہوں نے گلابی کو برقعہ اوڑھایا اور خود بھی برقعہ اوڑھا اور خاموشی سے اس بازار سے نکل گئیں۔ کنول جان کی گاڑی بھی موجود تھی، ڈرائیور بھی تھا لیکن کنول جان نے رکشہ پکڑا اور عاصم کے بتائے ہوئے پتے کی جانب دونوں روانہ ہوگئیں۔

راستے میں وہ گلابی سے بولیں ''اگر ایڈریس غلط بتایا ہو یا گھر میں تالا لگا ہو تو پریشان مت ہونا۔ ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں..... میں تو تمہاری وجہ سے.....'' پھر وہ خاموش ہوگئیں۔

عاصم ان کے انتظار میں گھر کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دونوں اندر چلی گئیں۔ اندر عاصم کے کچھ دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں قاضی صاحب آ گئے۔ نکاح پڑھایا گیا۔ نکاح نامے میں گلابی..... غزالہ بیگم بنت شیخ رمضان کے طور پر درج ہوئیں اور ان کے شوہر کا نام عاصم احمد ولد ناظم احمد لکھا گیا۔ نکاح نامے کی ایک نقل کنول جان کو بھی پیش کی گئی۔ کنول جان نے گلابی کو سونے کے جھمکے پہنائے، دعائیں دیں اور آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے اکیلی بازار کی جانب لوٹ گئیں..... آج وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھیں۔ جاتے جاتے وہ عاصم کے قریب آئیں اور بولیں ''اگر ممکن ہو تو کسی اور شہر میں..... کہیں دور چلے جاؤ اور اس کا بہت خیال رکھنا۔'' انہوں نے گلابی کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

عاصم احمد ولد ناظم احمد بازار حسن کی بظاہر سخت اور بباطن نرم نائیکہ کنول جان کے مشورے پر عمل درآمد کرتے ہوئے غزالہ بیگم ولد شیخ رمضان کو لے کر غائب ہوگیا۔

بڑی مدت کے بعد رنگین رومال باندھے ہوئے فضلو نے شیخ رمضان کے گھر کے کواڑ بجائے۔ جب رمضان باہر آیا تو فضلو نے پان کی پیک بھرے منہ سے ایک پچکاری دروازے کی چوکھٹ پر ماری اور بولا:

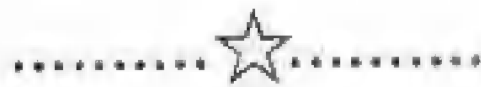
''آج شام سیٹھ کے گھر کوئی تقریب ہے۔ تم سب کا بھی بلاوا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑوں میں آ جانا مغرب کے

بعد......'' جاتے جاتے اس نے چوکھٹ پر ایک پچکاری اور ماری...... سرخ خون جیسی پیک کی۔

رمضان اور لالی سورج ڈوبتے ہی سیٹھ کی کوٹھی پہنچ گئے۔ سیٹھ کی کوٹھی میں برآمدے کے زینے کے نیچے غریب غرباء کا مجمع لگا تھا۔ دونوں ان میں شامل ہو کر بیٹھ گئے۔ فضلوان کو تلاش کرتا ہوا اس طرف آنکلا اور ان دونوں کو اشارے سے بلا کر کہا ''تم دونوں کا اندر انتظار ہے۔'' اور بولا ''رمضان تو باہر مردوں میں شان سے بیٹھنا اور گھر والی کو اندر بھیج دینا۔''

دونوں اندر گئے۔ رمضان مردوں میں وہاں بیٹھ گیا جہاں شریف شرفاء بیٹھے تھے۔ لالی سہمی سہمی اندر زنان خانے میں چلی گئی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس سے ضرور بیگار لی جائے گی اور وہ بھی نہ جانے کیا...... داخل ہونے کے بعد وہ دروازے کے قریب ہی ایک کونے میں کھڑی ہو کر حالات کا جائزہ لینے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ ماحول کو اچھی طرح دیکھ پاتی۔ اندر...... بہت اندر سرخ مخمل سے ڈھکے ہوئے ایک تخت پر لڑکیوں کے جھرمٹ میں اس کی گلابو دلہن بنی بیٹھی دکھائی دی۔ لالی نے اس کے بعد جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا، اسے اس کا ہوش نہیں رہا۔

قاضی آیا۔ نکاح پڑھایا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا اور دیکھا بھی تو نہیں دیکھا...... نکاح نامے میں دلہن کے خانے میں فخر النساء بنت شیخ رمضان لکھوایا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سنا کہ اس کی لاڈلی بیٹی گلابو سے گلابی...... گلابی سے غزالہ بیگم زوجہ عاصم احمد اور پھر...... غزالہ بیگم سے فخر النساء زوجہ سیٹھ ارشد ولد کرم دین کیسے بنی......؟



بجوکا

سید سعید نقوی (نیویارک)

رابعہ بہت دل لگا کر تیار ہو رہی تھی۔ پچھلے سال میلے پر زمیندارنی نے اپنا ایک پرانا ریشمی جوڑا دیا تھا جو رابعہ نے بہت سنبھال کر صندوق میں رکھ دیا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس جوڑے کو صندوق سے باہر کی ہوا دکھائی جائے۔ صبح بہت سویرے باپ کے اٹھنے سے پہلے نہا چکی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد سے جھگی کی ایک تہائی آبادی کم ہو گئی تھی۔ ایسے میں چارپائی کھڑی کر کے رابعہ اس پر چادر تان دیتی۔ عموماً اس وقت نہاتی جب باپ کھیتوں پر ہوتا لیکن آج کوئی کھیتوں پر جانے والا نہیں تھا۔

آج بجوکا کا سالانہ میلہ تھا۔

میلے میں ویسے بھی سب ہاری اور ان کے خاندان اپنے بہترین لباس میں جشن مناتے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ بہترین لباس وہ ہوتا جو اکثر کسی نے بدترین جان کر اپنے جسم سے علیحدہ کیا ہوتا۔ رابعہ کی تیاری کے پیچھے یہ راز بھی تھا کہ میلے میں سب ایسے مصروف ہوتے کہ اس بات پر کوئی نظر نہ رکھتا کہ رابعہ ریشمی جوڑا پہنے کھیتوں میں کیوں پھر رہی ہے۔ نہ ہی کسی کو اس بات کا پتہ چلتا کہ یارو بھی اسی وقت اسی کھیت میں جا گھسا ہے۔ پچاس جھونپڑیوں کے اس گاؤں میں صرف ہاری رہتے تھے یا غربت۔ ایسے میں کسی سے چھپ کر ملنے یا دل کی بات کرنے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ یا تو کسی میلے تہوار کی سراسیمگی کا سہارا لیا جائے یا ایسے وقت ملاقات کی جائے کہ جب باقی دنیا کی آنکھیں بند ہوں۔ یارو کی چھیڑ خانیاں اب بڑھتی جا رہی تھیں۔ ہر ملاقات میں رابعہ کسی نئی انوکھی دھڑکن سے روشناس ہوتی۔ یارو کا ہاتھ روکتے روکتے بھی رابعہ کو لگتا دل ایسی زور سے دھڑک رہا ہے کہ کوئی سن لے گا۔ اسی امید و خوف کے بین بین رابعہ کی تیاری جاری تھی۔ آنکھوں میں زمیندارنی کا دیا کاجل پھیر کے وہ جھگی سے نکل آئی۔

گاؤں میں عید کا سا سماں تھا۔ گلیوں کو رنگ برنگی تکونوں سے سجایا گیا تھا۔ گلی کے ایک نکڑ سے دوسرے نکڑ تک سُتلی کا ایسا بے ہنگم جال بُنا گیا تھا جیسے کوئی لنگڑی مکڑی اپنا راستہ بھول گئی ہو۔ لئی کی مدد سے رنگ برنگی کاغذ کی تکونیں پھر اس سُتلیوں کے جال پر منڈھ دی گئی تھیں۔ گلی کی چھت پر جہاں صرف نیلے آسمان کی راجدھانی ہوتی تھی وہاں اب یہ تکونیں بہار دکھا رہی تھیں۔ کچھ جھگیوں کی باہر سے پتائی بھی ہوئی تھی۔ جھاڑو دے کر گلیوں کو صاف کرنے کی بھی کوشش کی گئی تھی مگر نتیجہ ایسا ہی تھا جیسے زنگ لگی پرانی سینی کو رگڑ رگڑ کے چمکانے کی کوشش کی جائے۔

غربت خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ بجوکا کے میلے سے بہتر کیا بہانہ ہو سکتا ہے۔ ابھی گیارہ کم دو برس ادھر کی بات ہے، جس برس نُبو کے ہاں کالا بچھڑا پیدا ہوا تھا، پے در پے تین فصلیں خشک سالی کی نظر ہو گئیں۔ بارش تو خیر کیا ہوتی، آسمان

جیسے رونا بھی بھول گیا۔ جو ذرا سی فصل اتری بھی تو وہ فاقہ زدہ پرندے چگ گئے۔ گاؤں میں ہاہاکار مچ گئی تھی، وہ زمین جسے ماں سمان سمجھتے تھے، لعن طعن کا شکار ہونے لگی۔ رابعہ کو اچھی طرح یاد ہے تین سال مسلسل زمیندارنی نے قمیض تو کیا شمیز تک نہ دی تھی۔ وہ تو بھلا ہو بڑے زمیندار کا کہ انہوں نے بڑے کھیت کے عین وسط میں بجوکا کو گاڑ دیا۔ لکڑی کے پھٹے سے بندھا تقریباً دو فٹ زمین کے اندر جبکہ چھ فٹ اونچائی زمین کے سینے پر ایک سپاہی کی مانند ایستادہ۔ بجوکا بڑے زمیندار کی حویلی میں ہی تیار ہوا تھا۔ اس کی یہی اہمیت کیا کم تھی کہ زمیندار نے اعلان کر دیا کہ بجوکا کے ڈر سے پرندے بھاگ جائیں گے اور اگر بجوکا خوش ہوا تو بارش بھی برسوا دے گا۔ رب کرے بڑے زمیندار کی عمر میں اور اضافہ ہو، ہوا بھی ایسا ہی۔ اس سال بارش بھی ہو گئی اور پرندے بھی دو تین سال بے یقینی کا شکار رہے۔ پے در پے جو اچھی فصلیں اتریں تو بجوکا کی دھاک بیٹھ گئی۔ رابعہ کیسے بھول سکتی تھی کہ اسی سال یارو نے پہلی بار اس کی کمر میں چٹکی کاٹی تھی۔ بجوکا کے ساتھ بڑے چوہدری کے وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ اب بڑے چوہدری صاحب ہی بتاتے تھے کہ بجوکا کن چیزوں سے خوش ہوگا۔ ادھر دو برس پہلے جب پھر قحط پڑا، نہ بارش ہوئی نہ فصل اچھی اتری تو چوہدری صاحب نے صاف اعلان کر دیا کہ یہ بجوکا کی ناراضگی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اب ہر سال بجوکا کے جنم دن پر گاؤں میں ایک میلہ ہوتا تھا۔ یہ گویا بجوکا کی طاقت اور ہیبت کی سالانہ یاددہانی تھی۔ ہر سال کٹائی کے بعد والی چاندرات کو بجوکا کا میلہ لگتا۔ ساری کٹی فصل میلے سے پیشتر ہی زمیندار کی حویلی میں پہنچ چکی ہوتی۔ جیسے جیسے فصل کٹتی جاتی زمیندار کی توند، تجوری اور حرص میں اضافہ ہوتا جاتا۔ امارت اور قناعت ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ قناعت بھرے گھر میں امارت کیسے پنپ سکتی ہے اور بڑا زمیندار تو پشتینی امیر تھا اور قناعت سے دشمنی بھی پشتینی تھی۔ بجوکا میلے والے دن ہاریوں میں اناج تقسیم ہوتا۔ سارے سال کی محنت، پسینے، گالیوں اور دھکوں کے بعد اناج کی چند بوریاں کما پاتے۔ اناج کی تقسیم کے کئی فارمولے تھے: زمین کے کتنے رقبے پر اس ہاری نے کاشت کی ہے، ہاری کے گھر میں کتنے افراد ہیں اور فارمولے کا سب سے اہم عنصر یہ کہ بڑا زمیندار اس ہاری سے کتنا خوش ہے۔ تقسیم کے بعد یہ ہاری کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ چاہے تو اپنے حصے کے اناج کا کچھ حصہ بجوکا کو نذر کرے۔ اس باج گزاری سے اگلی فصل اچھی ہونے کے امکانات روشن ہو سکتے تھے۔ شاید ہی کوئی ہاری ایسا ہو جو بظاہر اس چھوٹی سی نذر اور قربانی کے عوض اپنے روشن مستقبل کا جوا نہ کھیلتا ہو۔ ہر چڑھاوے سے زمیندار کی حویلی میں ایک اور دیا روشن ہو جاتا۔ زمیندار کے کارندے بیان کرتے ہیں کہ خود زمیندار عقیدت سے بہت بھاری چڑھاوے بجوکا کی نذر کرتا ہے لیکن بڑا زمیندار واقعی اتنا نیک تھا کہ اس کا دایاں ہاتھ دیتا تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہوتی کہ کب کہاں اور کتنا دیا۔

رابعہ نے دائیں بائیں دیکھا تو کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ زیادہ تر مرد زمیندار کی چوپال کے نزدیک جمع تھے جہاں بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ ایک ہاری کے گلے میں نواڑ کی پٹی سے بندھا ڈھول لٹک رہا تھا جسے وہ مستانہ وار بجائے جا رہا تھا۔ درخت کے نیچے لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی گئی تھی جس پر ایک بڑی دیگ میں نجانے کب سے چائے پک رہی تھی۔ ایسے میں کسے فرصت تھی کہ رابعہ کی فکر کرتا۔ رابعہ کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چل پڑی۔ تھوڑی ہی دوری پر درمیان میں ذرا سی جگہ صاف تھی جہاں یارو اس کا منتظر تھا۔ رابعہ کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بے صبری سے ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچ کر اپنے پاس ہی گرا لیا۔

''کیسا بے صبرا ہے تو۔'' رابعہ شوخی سے مسکرائی۔

''اور تو آنے کے لیے بے چین نہیں تھی۔'' یارو نے اسے گدگدایا۔

''آں، آں۔'' رابعہ نے حدود مقرر کر رکھی تھیں اور ان پر سختی سے کاربند تھی۔

''کون ہے یہاں، سب میلے میں مست ہیں۔''

''سامنے دیکھ، بجوکا بابا ہی دیکھ رہا ہے۔''

''بجوکا بابا'' یارو کی ہنسی میں تضحیک تھی۔ چھ جماعتیں کیا پڑھ گیا تھا یارو اپنے آپ کو بہت ہشیار سمجھتا۔ رابعہ کو علم تھا یارو کو بجوکا کی طاقت پر بالکل بھروسہ نہیں تھا جبکہ رابعہ بجوکا کی ان دیکھی قوت کی دل و جان سے معتقد تھی۔ اسے پتہ تھا یارو صرف اس کی محبت میں بجوکا کو کھل کر برا بھلا نہیں کہتا تھا لیکن اکثر یارو اپنے تحفظات کا اظہار کر چکا تھا۔

''دیکھ بجوکا اپنے کاندھے پر بیٹھا کوا تو اڑا نہیں سکتا، فصلوں کا کیسے خیال کرتا۔ یہ افیون ہے جس سے تو اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہے۔''

''یارو، ایسی بات کرے گا تو میں تجھ سے بات کرنا چھوڑ دوں گی۔'' رابعہ سچ مچ ناراض ہو جاتی۔

''بجوکا، بجوکا، بجوکا، بجوکا دیکھ رہا ہے۔'' اس وقت بھی بجوکا ان کے درمیان آ گیا تو الجھ کر یارو نے رابعہ کی نقل اتاری۔

''یارو وقت جا رہا ہے۔'' رابعہ اس تنہائی کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی ''یارو ایک بات بتا، کیا تجھے وقت نظر آ رہا ہے۔''

''نہیں، وقت بھلا کس کو نظر آتا ہے۔'' یارو نے اس کا مذاق اڑایا۔

''تجھے وقت نظر نہیں آتا لیکن اس پر یقین ہے، موت نظر نہیں آتی مگر اس پر بھی یقین ہے۔ میری محبت نظر نہیں آتی مگر اس پر بھی اعتبار۔ بجوکا بابا کی طاقت نظر نہیں آتی تو اس کو کیوں نہیں مانتا؟''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' یارو کو رابعہ کی بات کا جواب نہ بن پڑا تو الجھ کر چل دیا۔

''یارو۔'' رابعہ کی پکار بھی اسے واپس نہ لا سکی۔

''بجوکا بابا کا اپمان کرے گا تو بہت نقصان ہو گا یارو۔'' رابعہ اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو پڑی۔

اب چوپال پر زمیندار کے آنے کا وقت تھا۔ گاؤں کے سب ہاری جمع تھے۔ اناج کی تقسیم کے وقت غیر حاضری ہوتی تو اناج تو دوسرے دن مل جاتا مگر غیر حاضری ٹیکس منہا کر کے۔ اپنی کھال میں مست ہاری رقصاں تھے۔ ڈھول، تاشے، باجے خوش ہونے کے سب ہی بہانے تو جمع تھے۔ زیادہ تر ہاری ننگے پاؤں، ننگی زمین پر براجمان تھے۔ زمین سے رشتہ ایسا مضبوط تھا، ننگا پاؤں ننگی زمین پر جما رہتا، تپتی ریتلی زمین ہو یا برف جیسا سرد پانی، ان کے پاؤں کا زمین سے رشتہ جما رہتا۔ کچھ نوجوان ہاری ایک ڈھول والے کے گرد حلقہ بنائے رقص کر رہے تھے، نواڑ کی پٹی سے بندھا ڈھول بھنگ کی تال پر ان تھک بجے جا رہا تھا۔ حویلی کے دروازے سے داخل ہوں تو ایک بڑا دالان، یوں سمجھئے چھوٹا سا میدان تھا جہاں سب ہاری ایک سا لباس، چہروں پر امید کی یک رنگی کرن لیے حویلی کی جانب رخ کیے بیٹھے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ غربت کا ایک ہی لباس ہے۔ ایک نظر میں دور ہی سے پہچان میں آ جائے۔ دالان میں جس رخ پر حویلی کا دروازہ کھلتا تھا ایک پکا چبوترا تھا جس پر زمیندار کے لیے کرسی منتظر تھی۔ ذرا ہٹ کر پیچھے کی جانب ایک جھلنگا پلنگ پڑا تھا جس پر زمیندار کے جانثار بیٹھتے۔ ابھی یہ جلوس حویلی سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ پیاسے کو ذرا ترسا کے پانی دو تو پانی کی قدر کرے گا۔

زمیندار بہت باوقار اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ صاف ستھرا تہبند، اس پر لمبا ریشمی کرتا۔ سر پر پگڑ، ستاروں سے بھری ٹوپی یا کچھ اور۔ ننگے سر باہر چوپال میں نہیں آتا۔ پاؤں میں بغیر موزوں اور بغیر فیتوں کے جوتے یا کھسے۔ بڑے زمیندار صاحب برآمد ہوئے تو دالان میں شور مچ گیا۔ بھاری بھرکم جسے پر لباس ویسا ہی تھا جیسا کہ متوقع تھا۔ مونچھوں پر ہلکا سا تاؤ دے کر

زمیندار کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیر سامنے پھیلا دیئے۔ پٹواری کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر زمیندار کے دونوں پیر ایک ایک ہاری کے ہاتھوں کی گرفت میں آ گئے۔ تھکے ہارے ہاری تومند کا اس زمیندار کے پیروں سے تھکن نکالنے میں لگ گئے۔

زمیندار نے اناج کے بٹوارے کا اشارہ کیا۔ ایک ایک ہاری آگے آتا، زمیندار کے گھٹنے چھو کر اطاعت کی بیعت دہراتا۔ زمیندار اس کے سر پر ہاتھ رکھتا جبکہ پٹواری کے اس سر پر اناج کی بوری لاد دیتا۔ یہ سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا۔ اب تقریباً سب ہاری فارغ ہو چکے تھے۔ ایسے میں ایک کارندہ کھیتوں کی سمت سے بھاگا ہوا آیا اور زمیندار کے کانوں میں کوئی خبر داغ دی۔ بڑے آدمیوں کے کانوں میں کی جانے والی یہ سرگوشیاں بڑے دوررس نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ کوئی اور بات ہوتی تو زمیندار اپنی رعایا اور اپنے درمیان عبودیت کا یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیتا مگر خبر کچھ ایسی تھی کہ وہ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پیر دبانے والے دونوں ہاری اپنے پیروں کی خیر منانے سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔ پٹواری ہاتھ باندھ کر سامنے آ گیا۔

''حکم ہو بادشاہو۔''

''پٹواری یہ کھیت میں ایک چھوٹا بجوکا کس نے گاڑا ہے۔'' زمیندار کی گرج میں آنے والی قیامت کی خبر تھی۔

''ابھی معلوم کراتا ہوں سرکار۔''

چند ہی لمحوں میں چار پائی پر بیٹھے جانثار یارو کو دھکا دیتے ہوئے سامنے لے آئے۔

پٹواری کی آنکھ کے اشارے کے باوجود یارو زمیندار کے پیروں پر نہیں گرا، سر جھکائے کھڑا رہا۔ یہ جرم کسی اور نا کردہ گناہ سے زیادہ سنگین تھا۔ زمیندار کے رویئے سے بالکل ظاہر نہیں ہوا کہ اسے یہ سرکشی گراں گزری ہے۔ پٹواری کی جہاندیدہ آنکھوں نے ماتھے پر پڑی سلوٹوں میں ایک شکن کا اضافہ دیکھ لیا تھا۔

''کوئی غلطی ہوگئی زمیندار صاحب۔'' یارو نے ہاتھ جوڑ کر زمیندار سے آنکھیں ملائیں۔ پٹواری نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''غلطی؟'' بڑے زمیندار کی آواز پر کسی سانپ کی پھنکار کا گمان ہوتا تھا۔

''غلطی، بجوکا کا اتنا بڑا اپمان۔ اس کے مقابلے میں ایک اور بجوکا لا کھڑا کیا تو نے۔ کیا سمجھتا ہے یہ کوئی بت ہے، کوئی بھی اس جیسا لا کر کھڑا کر دو؟ جانتا ہے اب بجوکا کی ناراضگی ہمیں کتنی مہنگی پڑے گی۔ کتنی فصلیں برباد ہوں گی۔''

یارو کو اپنے سنگی ساتھیوں کی نگاہیں اپنی پشت پر نیزوں کی طرح گڑتی محسوس ہوئیں۔ بغیر اناج کے سب کیسے گزارا کریں گے۔ ہاریوں کے ذہن میں چند برسوں پہلے کا قحط گھوم رہا تھا۔

''سائیں غلطی ہوگئی۔'' یارو نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے زمیندار کے پیر پکڑ لیے۔

''چھوڑو میرے پیر، حرامی، کتے کی اولاد، نجس کر رہا ہے میرے پیر۔'' زمیندار نے لات مار کر اپنے آپ کو چھڑانا چاہا۔ یارو کو پتہ تھا جب تک پیروں میں پڑا ہے امان میں ہے۔ دو جانثاروں نے آگے بڑھ کر یارو کو زمین سے نوچا اور اٹھا کر زمیندار کے سامنے ایستادہ کر دیا۔

''باندھ دو اس بدبخت کو سامنے درخت سے اور جب تک ہمارا حکم نہ ہو، اسے نہ کھولا جائے۔'' زمیندار کے حکم کے بعد تو یارو کی ماں کی بھی ہمت نہ ہوتی کہ یارو کو آزاد کر سکتی، رابعہ کی تو اوقات ہی کیا تھی۔ دل مسوس کر رہ گئی۔ جس طرح یارو بجوکا کی توہین کرتا تھا ایک دن تو کچھ ایسا ہونا ہی تھا۔ یارو اپنی سزا سن کر نیم جان سا ہو گیا۔ اسے پتہ تھا کہ اب تین چار دن درخت سے بھوکا

پیاسا بندھے رہنے کے بعد جب وہ نیم جاں ہو جائے گا تو زمیندار اسے اپنی نجی قید میں چند سالوں کے لیے بیڑیاں کسوا دے گا۔ امکان غالب تھا کہ اب دوبارہ کھلی فضا میں سانس نصیب نہ ہو گی۔

''دیکھو اس کمبخت کی وجہ سے کیا عذاب آتا ہے۔ بجوکا بہت ناراض ہے۔ اس کے حصے کا اناج بھی بجوکا کو باج گزار کرو۔'' زمیندار نے کارندوں کو حکم دیا۔ میلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ دالان میں ایک طرف جو بھنگ گھوٹی جا رہی تھی، وہ بھی زمیندار کے جاںنثار اپنے ساتھ لے گئے۔ درخت سے بندھے یارو سے نظریں چرائے سب ہاری اپنے اپنے دائروں میں قید ہو گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک کوا بجوکا کے کندھے پر بیٹھا اسے ٹھونگے مار رہا ہے۔ جب بجوکا ناراض ہو کر قحط لا سکتا ہے، بارش روک سکتا ہے اور فصلیں خراب کر سکتا ہے تو اس کوے کو کیوں نہیں اڑا سکتا۔ یہ باتیں ہاریوں کی منطقی سطح سے اوپر تھیں۔ سوچ کے پر مستقل کترتے رہیں تو سوچ کی پرواز کوتاہ ہو جاتی ہے۔ ہاری کی سوچ کے پر کتر کے اسے اناج، بارش، فصل، بھوک، زمیندار اور خوف تک محدود کر دیا گیا تھا۔ ہاتھی کے پیر میں رسی کی بیڑیاں ڈال کر اسے لکڑی کے پنجرے میں قید کر دیں تو ہاتھی بیڑیوں کے خوف سے رسی تڑانے کی فکر ہی نہیں کرتا۔ اس کی سوچ گنے، مہاوت اور چیونٹیوں تک محدود ہو جاتی ہے۔

زمیندار کے ڈرانے پر اس سال بجوکا کو بہت چڑھاوے دیے گئے۔ اس سال برسات میں بجوکا پر چڑھا لباس جگہ جگہ سے مسک گیا۔ اس کی کھلی ساخت کیا عریاں ہوئی کہ پرندوں کے غول کے غول آنے لگے۔ بجوکا کا ملمع کیا اترا کہ پرندوں پر اس کا خوف جاتا رہا۔ ٹولیاں اڑ اڑ کر آتیں اور پکی پکی فصلوں سے ایسے سیراب ہوتیں گویا یہ دسترخوان ان ہی کے لیے بچھا ہے۔

''یہ سب اسی حرامی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' زمیندار نے نجی قید میں بند یارو کے مزید پچاس جوتے مارنے کا حکم دیا کہ اس سے شاید بجوکا رضامند ہو جائے۔ بجوکا کے بت پر نیا غلاف چڑھا، کچھ ہاری دن رات بڑے کھیت میں گزارنے لگے کہ شاید اس خدمت سے بجوکا راضی ہو جائے۔ بجوکا راضی ہوا یا نہیں لیکن پرندوں کی یلغار ختم ہو گئی۔ اس کا سہرا یقیناً زمیندار کے سر پر بندھا۔ اس کی مونچھ میں پھر تاؤ آ گیا۔ پگڑی کی کلغی کا کلف کچھ اور اکڑ گیا۔ ہاریوں نے سکھ کا سانس لیا۔ فصل نسبتاً اچھی اتری تو گاؤں پر سے گویا بجوکا کا عذاب ختم ہوا۔ اس سال بڑے زوروں کا میلہ ہوا۔ اس خوشی میں یارو کو بھی آزادی مل گئی۔ اچھی فصلوں کے موسم میں زمیندار اپنے سب سے محنتی ہاری کو قید کر کے کیا کرتا۔

پرندوں کو لیکن بجوکا کی حقیقت پر شک ہو چلا تھا۔ اگلی بوائی پر پھر غول کے غول اترنے لگے۔ اس بار چڑھاوے بھی کام نہ آئے۔ ہاریوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب بجوکا کس بات پر ناراض ہے۔ زمیندار کا کہنا تھا کہ بجوکا کے سب معاملات خود زمیندار کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اک دن چشمِ حیرت نے کیا دیکھا کہ بجوکا کے سر پر ایک پرندے کی گند پڑی ہے جو اس کے سر سے ٹپک کر عین ناک پر جم گئی ہے۔

''یہ بجوکا کا کس نے اپمان کیا ہے؟'' ایک ہاری نے دہائی دی۔ ہاریوں میں خاصی بددلی پھیل گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ بجوکا جو پرندوں کو مار بھگا سکتا تھا، اس کے سر پر بیٹھ کر کوئی پرندہ گند کر جائے۔ اس کے کاندھے پر بیٹھ کر کوئی کوا ٹھونگیں مار سکے۔ بجوکا بیچ کھیت میں کھڑا ہو اور پرندے اس کی موجودگی سے بے پرواہ غول در غول بیج ہضم کر جائیں۔ صبح ہونے سے پہلے بجوکا کے سر اور ناک پر سے پرندے کی غلاظت صاف ہو چکی تھی لیکن اس بے احتیاطی سے صاف کی گئی تھی کہ صاف معلوم ہوتا تھا، کسی نے جلدی میں کپڑے سے رگڑا ہے۔ راتوں رات بجوکا کی عزت بحال کرنے کی کوشش اسے اور ننگا کر گئی تھی۔ رابعہ کے ذہن میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یارو ٹھیک کہتا تھا۔ بجوکا کی عظمت اور طاقت چوہدری کے ذہن کی پیداوار ہے۔ لیکن اپنے خیالات رابعہ

نے اپنے ذہن میں مقید رکھے۔ بات کرتی بھی تو کس سے۔ خود یارو رہائی کے بعد سے اس سے کھنچ گیا تھا۔ رابعہ کی کوششوں کے باوجود اس سے کتراتا تھا۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ یارو اب زمیندار کے جانثاروں میں شامل ہو چکا تھا۔ طاقت نے ایک اور روح مسخر کر لی تھی۔

اسی سال چوہدری کو بیماری نے ایسا گھیرا کہ پلنگ سے لگ گیا۔ اب ہر ہفتے چوہدری اپنی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر شہر علاج کرانے جاتا۔ کبھی کبھی تو علاج کرانے کی خاطر ہفتہ دس دن شہر ہی میں ٹھہرنا پڑتا۔ ایسے میں بڑے چوہدری کا ولی عہد، چھوٹا چوہدری نادر اپنی پوری کوشش کرتا تھا کہ بات بگڑنے نہ پائے۔ بڑے چوہدری کے جانثاروں کی کھسر پھسر سے یہ بات پھیل گئی تھی کہ چوہدری کو جانے کینسر یا اس سے ملتے جلتے نام کا کوئی مرض لگ گیا تھا۔ بہت موذی مرض ہے کہ جو شاید کسی ہاری کی قربانی سے بھی ٹھیک نہ ہو۔

یہ سال بہت خراب گزرا۔ بڑے چوہدری کی بیماری کی وجہ سے بجو کا کا میلہ بھی نہیں ہوا۔ کہتے ہیں پٹواری اور چوہدری نادر تو بہت چاہتے تھے کہ سالانہ میلہ ہے، اس میں کسی سال ناغہ مناسب نہیں مگر بڑی چوہدرائن کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ بڑے سائیں بستر سے لگے ہیں اور تم لوگوں کو میلے کی سوجھی ہے۔ بڑا سائیں ٹھیک ہو جائے تو تم لوگوں کا کیا حشر کرے گا۔ پٹواری اس ڈر سے کہ کہیں واقعی بڑا چوہدری ٹھیک ہی نہ ہو جائے، اچانک میلے کے خلاف اور چوہدرائن کا حامی ہو گیا۔ فصل خراب ہو گئی۔ کسانوں کے ہاں غربت میں فاقے پڑ گئے۔ کہتے ہیں ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے تو یقیناً بڑے چوہدری کی بیماری کا ایک اچھا پہلو یہ نکلا کہ بڑی چوہدرائن نے بیماری کے صدقے ہاریوں میں اناج تقسیم کیا ورنہ بڑے چوہدری کے ساتھ کتنے ہی ہاری مارے جاتے۔ کیا معلوم دیہاتوں میں ستی کی یہ رسم پڑ جاتی کہ زمیندار کے ساتھ کچھ ہاری بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

بڑے چوہدری کا انتقال بڑا المناک تھا۔ چوہدرائن دیواروں سے ٹکریں مار مار کر رو رہی تھی۔ بیماری نے اتنا آناً فاناً گرفت کیا تھا کہ اپنے دل کو سمجھانے کا وقت بھی نہیں ملا۔ ہاریوں میں بھی مایوسی اور دل گرفتگی تھی۔ کیسا بھی تھا اپنا چوہدری تھا۔ ادھر بجو کا بھی مجہول سا اعتقاد کے بانس پر چڑھا ہوا تھا لیکن بجو کا کا خوف اور دبدبہ مٹی ہو چکا تھا۔ جس پرندے کا دل چاہتا ٹھونگا مار دیتا۔ سر، کان، شانے جگہ جگہ پرندوں کی غلاظت پڑی تھی۔ رابعہ یارو سے ملنے بات کرنے کے لیے بے چین رہتی مگر یارو کا زیادہ وقت چوہدری نادر کے ساتھ گزرتا۔ چوہدری کو دفنا کے سب واپس آئے تو سب ہاری حویلی کے دالان میں جمع ہو گئے۔

چھوٹا چوہدری صاف ستھرا تہبند، لمبا ریشمی کُرتا اور پیروں میں کھسے اٹکائے اپنے جانثاروں کے ساتھ باہر آیا۔ ایک شاہ مر گیا، دوسرے کی تاج پوشی ہو گئی۔ سلطنت چلتی رہی۔ چوہدری نادر کو دیکھ کر ہاریوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چھوٹے چوہدری نے کرسی پر بیٹھ کر دونوں پیر آگے کر دیے اور پٹواری کے اشارے پر دو ہاریوں نے آگے بڑھ کر دائیں بائیں اس کے پیر دبانے شروع کر دیے۔

''بڑے چوہدری صاحب مرحوم، اللہ انہیں بخشے۔'' چوہدری نادر نے کہنا شروع کیا۔ ''بجو کا دو سال پہلے ان سے ایسا ناراض ہوا کہ پھر نہ راضی ہوا۔ اپنا پتلا کھڑا چھوڑ کر بجو کا خود دو سال پہلے ہمیں چھوڑ گیا تھا۔ اسی لیے فصل بھی برباد ہوئی اور بڑے چوہدری بھی اپنی جان سے گئے۔'' چوہدری نادر کے اشارے پر یارو ایک نیا بجو کا پہلے سے تقریباً دو گنا بڑا شاندار بجو کا لے کر حویلی سے برآمد ہوا۔ ''اب یہ بجو کا ہم سب کی حفاظت کرے گا۔ اسے بڑے کھیت کے وسط میں نصب کر لو۔ خبردار اس کے چڑھاووں میں کمی نہ ہونے پائے۔''

چوہدری نادر کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سب ہاری خوشی سے نعرے مارتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند ایک نے بجو کا کو یارو کے ہاتھ سے لے کر بلند کر رکھا تھا اور بڑے کھیت کے وسط کی جانب بڑھ رہے تھے۔ باقی کچھ ڈھول، تاشے پیٹ رہے تھے۔ کچھ مست رقصاں تھے، بجو کا واپس آ گیا تھا، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ہاریوں کو مصروف دیکھ کر یارو رابعہ کی جھگی میں جا گھسا۔ چوہدری نادر کا حواری ہونے کے ناطے یارو کا دائرۂ اختیار بڑھ گیا تھا۔ رابعہ جھگی سے نئے بجو کا کا جلوس دیکھ چکی تھی۔

''رابعہ اب ہم ساتھ ہیں، میں نے کتنا تیرا انتظار کیا ہے۔ منحوس بڑے چوہدری نے انتقال میں کتنا وقت لیا، مرتا ہی نہیں تھا بڈھا۔''

رابعہ نے یارو کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی پذیرائی نہیں کی۔

''کیوں ڈر رہی ہے۔'' یارو نے تسلی دی۔

''ڈر نہیں رہی۔ جب تو نے میری آنکھیں کھولیں تو خود اپنی بند کر لیں۔ اب تو بجو کا کا ہاتھ تھام، تو بڑے چوہدری کی طرح مہان ہو گیا ہے۔ میں تیرے قابل نہیں رہی۔'' یارو کو لگا مرنے کے باوجود بڑا چوہدری اس کو سزا دے رہا ہے۔



سعید الظفر صدیقی کی چار کتابیں	
''مہر بہ لب ہونے تک'' (مجموعۂ کلام) ماورا پبلی شرز۔ لاہور	''چوٹ دِل کو دُکھاتی نہیں ہے'' (مجموعۂ کلام) رنگِ ادب پبلی کیشنز۔ کراچی
''درد چھپا کر رکھا ہے'' (انتخابِ کلام) رنگِ ادب پبلی کیشنز۔ کراچی	''ماورائے آب و گِل'' (مذہب اور سائنس کے تقابلی مطالعے کا ایک فکری زاویہ) ماورا پبلی شرز۔ لاہور

میں ہوں مسجد عالمگیر

غافر شہزاد

ہم عمارتیں بھی انسانوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ہماری استقامت بھی زمین کی مضبوطی سے وابستہ ہے۔ جب بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو ہمارے خدوخال واضح ہونا شروع ہوتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں، چھت، قوسیں وجود میں آتی ہیں اور یوں ہمارا شخصی، مادی تشخص مکمل ہو جاتا ہے۔ بالکل انسانوں کی طرح، بس اتنا فرق ہے کہ انسان اپنی نشوونما کے ابتدائی مہینے رحم مادر میں گزارتا ہے جو کہ سوائے ماں کے کسی اور کے احساس سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہماری تشکیل کے ابتدائی مہینے ماہر فن تعمیر کے تخیلاتی ذہن کے پردہ پر بنتے ہیں، جسے وہی دیکھ سکتا ہے، وہی بناتا سنوارتا ہے اور حتمی شکل عطا کرتا ہے۔ باقی کام تو لوہاروں، ترکھانوں اور مستریوں، مزدوروں کا ہے، جو معمار کی نگرانی میں اس تخیل کو معرض وجود میں لاتے ہیں۔

یہ سترہویں صدی کی آخری دہائی تھی کہ جب اورنگزیب عالمگیر، آخری اہم مغل فرمانروا تخت نشین تھا کہ اس کے حکم کے تحت فدائی خان کوکہ جو اورنگزیب عالمگیر کا رضاعی بھائی تھا، کی نگرانی میں میری بنیاد رکھی گئی۔ جس جگہ میں ہوں، یہاں کبھی راوی بہتا تھا۔ اس کی سرکش لہریں قلعہ لاہور کی شمالی دیواروں سے سر ٹکراتی ہوئی گزرتی تھیں۔ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ اورنگزیب عالمگیر نے پہلے تو قلعے کی مشرقی جانب عالمگیری دروازہ تعمیر کروایا اور پھر اس کے سامنے کچھ فاصلے پر مسجد کی تعمیر کا خواب دیکھا۔ جو لوگ عالمگیر کے انداز حکومت سے شناسائی رکھتے ہیں، وہ اس کے بارے میں مختلف آراء رکھتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ سترہویں صدی کے آخری نصف میں بے شمار صوفیاء کے مزارات جن کا تعلق قادری سلسلے سے تھا، تعمیر ہوئے اور پھر مساجد کی تعمیر کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ فتاویٰ عالمگیری کو مدون کرنے کا سہرا سر پر سجانے والا عالمگیر ابھی جوانی کے ابتدائی برسوں میں قدم رکھ رہا تھا کہ جب اس کے والد شاہجہان نے اسے تاج محل کے دورہ کا حکم فرمایا جو کہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ اپنے والد کے حکم کی تعمیل میں اورنگزیب عالمگیر نے تاج محل کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور چند ایسے تعمیری نقائص کی جانب اشارہ کیا کہ دیکھنے والوں کو اندازہ ہو گیا کہ شہزادہ جمالیاتی اور تعمیراتی حوالوں سے بہت باریک بین اور زیرک ہے۔ اپنی بادشاہت کے ابتدائی سالوں اور آخری دہائیوں میں اگرچہ اورنگزیب عالمگیر جنگوں میں مصروف رہا مگر پانچ دہائیوں پر پھیلے عہد حکومت میں اس کو عالمگیری مسجد کی تعمیر کا وقت اور موقع مل گیا اور یوں میری تعمیر و تکمیل کا سہرا عالمگیر کے ماتھے پر اس طرح سجا کہ آج بھی لوگ مجھے مسجد عالمگیری کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بالکل یوں ہی جیسے تاج محل کے ساتھ شاہجہان کا نام ذہن میں ابھرتا ہے۔

جہاں سے دریا گزرتا ہے وہاں زمین نرم اور ریتلی ہو جاتی ہے۔ مسلسل نمی اور پانی کے سرایت کرتے رہنے کی وجہ سے

ایسی جگہ پر تعمیر کا کام مشکل ہو جاتا ہے مگر اس عہد میں چونکہ میری جائے تعمیر نشیب میں تھی، اس لیے پہلے تو اینٹوں کی ڈائیں اٹھا کر ایک بڑا مربع قطعہ اراضی تیار کیا گیا اور پھر میری تعمیر شروع ہوئی۔

مجھ سے پہلے لاہور میں میری تعمیر روایت میں دو مسجدیں موجود تھیں۔ ایک بیگم شاہی مسجد کہ جسے مریم زمانی مسجد بھی کہا جاتا ہے اور دوسری مسجد وزیر خان۔ مریم زمانی مسجد کا سن تعمیر ۱۶۱۴ء ہے جبکہ مسجد وزیر خان کی تعمیر ۳۵-۱۶۳۴ء میں ہوئی یعنی مریم زمانی مسجد، وزیر خان سے بیس برس بڑی تھی اور اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو میرے اور مریم زمانی مسجد کے درمیان ساٹھ سال کا زمانی بعد ہے مگر ان ساٹھ سالوں میں اگر تعمیر مسجد کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تفاوت چھ صدیوں تک پھیل جاتا ہے۔

ہم تین مساجد کے خدوخال اور تناسب میں ہم آہنگی اور مشابہت دیکھنے والوں کو ضرور ملتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے تین نسلوں کے انسان ایک دوسرے سے، خاندانی تواتر کے سبب مشابہ ہوتے ہیں۔ چلیے میں اپنے دعویٰ کی مزید وضاحت کرتی ہوں۔ مریم زمانی مسجد بھی ایک مربع قطعہ اراضی پر ہے۔ اس کے صحن میں بھی طہارت کے لیے ایک مربع تالاب ہے۔ اس کے ایوان کی تعمیر بھی گنبدوں کی بدولت ہوئی ہے۔ اس کے بھی چار مینار ہیں جو کہ ایوان کے چاروں کونوں پر واقع ہیں۔ اس کا تعمیراتی سامان بھی چھوٹی اینٹ، چونے کا مصالحہ اور تزئین و آرائش کے لیے فریسکو، کاشی کاری، پیترا ڈیورا (پچی کاری) پر مشتمل ہے مگر تینوں مساجد اپنے اسکیل اور ہیئت کے اعتبار سے ایک روایتی تسلسل لیے ہوئے ہیں۔ ایوان کا سائز، گنبد کی شکل، میناروں کی قامت، صحن کی کشادگی، اندرونی تزئین و آرائش، داخلی دروازوں کا فن تعمیر، غرض اس طرح کی کئی چیزیں ہیں جو وقت کے ساتھ پنپنے، پھلنے پھولنے والی تعمیری روایت کی تاریخ اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ میناروں کا سطحی پلان دیکھیے مریم زمانی میں مربع شکل ہے، مسجد وزیر خان میں زیریں سطح مربع ہے اور بالائی منزل ہشت پہلو ہے اور مجھ میں یہ بلند قامت مینار سطحی پلان میں صرف ہشت پہلو رہ جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں، مشابہات اور تعمیری روایات کو میں اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ اپنے دعویٰ کی صداقت ثابت کر سکوں کہ جس طرح انسانوں میں تین نسلوں کی وراثت میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہر اگلا تسلسل پہلے سے بڑھ کر اور ارفع و اعلیٰ ہوتا جاتا ہے بالکل ایسا ہی تسلسل آپ میرے تعمیری خدوخال میں تلاش کر سکتے ہیں۔ یہ ساری باتیں تو میں نے نسلی طور سے ایک تسلسل کو بیان کرنے کے لیے آپ کے گوش گزار کی ہیں۔ میری اصل گفتگو کا متن تو یہ ہے کہ جس طرح انسانوں پر موسم اثر انداز ہوتے ہیں، حکومتیں بدلتی ہیں تو فرق پڑتا ہے، ایسے ہی کچھ لمحات ہم عمارتوں پر بھی آتے ہیں اور میں تو ایسے حوادث سے کچھ زیادہ ہی دوچار رہی ہوں۔ اس کی وجہ بہت واضح ہے۔ میری بڑی بہنیں مریم زمانی مسجد اور مسجد وزیر خان گرد و پیش میں ایسی عمارتوں میں گھری ہوئی ہیں جہاں انسان بستے ہیں، لہٰذا وہ محفوظ ہیں۔ میں چونکہ اپنے بڑے بھائی قلعہ لاہور اور شہر کی عمارتوں سے الگ تھلگ رہی ہوں، میری دو جانب دریا بہتا تھا، تیسری جانب حضوری باغ اور چوتھی جانب رہائشی آبادیوں کا سلسلہ، اس لیے شاید مجھ پر حوادث کچھ زیادہ ہی گزرے ہیں۔

جن دنوں میری تعمیر ہو رہی تھی، سینکڑوں لوگوں کو مزدوری مل رہی تھی۔ کئی سال تک لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے رہے۔ یہ جو میرے نام کے ساتھ عالمگیر بادشاہ کا نام جڑا ہوا ہے اور اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود زندہ ہے تو اس کی وجہ میرا وجود نہیں ہے بلکہ میری تعمیر میں اپنا خون پسینہ بہانے والوں کی نیک اور حلال کمائی کا صدقہ ہے جس کا اہتمام اورنگزیب عالمگیر نے اپنے شاہی فرمان میں کیا تھا اور کہا تھا کہ لاہور میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی جائے اور اس کے اخراجات صوبہ کی آمدن سے پورے کیے جائیں جس کا تخمینہ اس عہد میں تیس لاکھ روپے لگایا گیا اور اس کے لیے ملتان کے درجنوں گاؤں کا خراج وقف کیا

گیا۔ یہ بات بہت عجیب ہے کہ ایسی عالیشان اور پروقار مسجد کے ماہر فن تعمیر کا کہیں نام محفوظ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد میں لوگ نام کے لیے کام نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے دلوں میں کام کی لگن، برسوں کی مہارت اور صناعی کے اظہار کی تڑپ ان سے کام کرواتی تھی۔ آج کونوں کھدروں میں، محفلوں میں اکثر یہ سرگوشیاں ابھرتی ہیں کہ ایسے ماہر صناع کیا آج کے عہد میں ختم ہو گئے ہیں یا ان کو اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ تیز رفتاری وقت اور ذمہ داریوں سے مناسب عہدہ برآ نہ ہونے کے رویوں نے ان ماہرین کے ہاتھوں سے ایسی برکت چھین لی ہے۔ وہ روحانی وقلبی کیفیت جو ان صناعوں کے دلوں پر باوضو حالت میں طاری ہوتی تھی، آج کے ماہرین کے دل اس سے عاری ہو گئے ہیں۔ خطاط خوشخطی کے نمونوں اور کتبوں میں معانی وعلامت اور ابدی وروحانی سرور حرفوں وکشوں میں بھر دیتے تھے۔ آج تمام خط اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ کمپیوٹر کی صفر اور ایک کی عددی تراکیب سے ترتیب پانے والے نوری نستعلیق اور کوفی خطوں کے خدوخال کی مشینی یکسانیت نے اس جمالیات اور کیفیت سے ان کو محروم کر دیا ہے۔ یہ مہارت نسل در نسل ہاتھوں اور سینوں سے عمارتوں میں منتقل ہوتی تھی مگر صنعتی ترقی کی سرعت اور تبدیلیوں نے اس روایت کا تسلسل توڑ دیا ہے۔

اے میرے سامعین! خود پر جو بیتی کیا بیان کروں، بس یوں سمجھ لو کہ میرا عروج ہی میرے اور مغلیہ عہد کی صدیوں پر پھیلی حکومت کے زوال کا نقطۂ آغاز بنا۔ ہر عروج راز والے۔ بس دل میں جب اقتدار کی خواہش جڑ پکڑ لے تو استقامت کو دیمک چاٹ لیتی ہے۔ نئے موسم اور نئی روشنی قدامت اور کہنگی کو نیا خون مہیا کرتے ہیں۔

میرے صناع، میرے کاری گر سرخ پتھر کی سلوں کو تراش خراش کر میرے ایوان، برآمدوں اور ڈیوڑھی کو تشکیل دیتے رہے۔ وہ سفید پتھر جو اپنی یخ بستگی کی وجہ سے بے جان اور سرد تھا، جب میرے گنبدوں کی بیرونی سطحوں پر جوڑا گیا تو اسے ایک دائمی حسن اور زندگی مل گئی۔ گنبدوں کو بھی مرمریں حسن عطا ہوا، دیکھنے والوں کی نظریں اس مرمریں سطح سے پھسل پھسل جاتی تھیں۔ ڈیڑھ سو فٹ سے بلند ایستادہ مینار گردن خم کیے بغیر اس مرمریں حسن پر ہمہ وقت نگاہیں جمائے رکھتے۔ راوی کا پانی میرے عکسِ جمیلہ کے رعب کو برداشت نہ کر سکا اور مجھ سے دور تر ہوتا چلا گیا ورنہ بند عالمگیری تو ایک بہانہ تھا کہ اس نے راوی کا رخ موڑ کر شہر سے دور کر دیا ہے۔ یہ وہی دریائے راوی تھا کہ جس میں اکبر کے عہد میں جہاز لنگر انداز ہوئے تھے اور انہوں نے اچ شریف تک کا آبی سفر طے کیا تھا مگر اس راوی کی زمینی سطح بلند کر کے میری تعمیر کی بنیاد رکھی گئی۔ قلعہ میں بیٹھے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے لوگوں کو میرے گنبد اور مینار نظر آتے تھے۔ اس منظر نامہ کی توفیق عالمگیر کو نہ ہو سکی۔ جب ۱۲ ربیع الاول کو وہ ایک جنگی مہم سے واپس آیا تو اس نے شالیمار میں پڑاؤ کیا اور پھر میرے افتتاح کے لیے وہ یہاں سربسجود ہوا۔

مغلوں کو زوال ہوا، ان کے سرکش فاتح گھوڑوں کے سموں کی تال کہیں گردِ زمانہ میں کھو گئی اور منظر پر سکھ عہد کے تین سردار ابھرے۔ لہنا سنگھ، گجر سنگھ اور...... سنگھ۔ انہوں نے اندرون لاہور کو، کہ جو فصیل کے اندر محفوظ تھا، تین حصوں میں تقسیم کیا اور اسے اپنی سلطنت قرار دے دیا۔ قلعہ اور میں دونوں ہی وسیع رقبہ پر ہونے کے سبب گھوڑوں کے اصطبل، دربار اور اسلحہ خانے کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ کیا بتاؤں، شمالی اور جنوبی حجروں میں جہاں حفاظ قرآن وقرأت پڑھتے تھے، وہاں اسلحہ اور گھوڑے باندھ دیے گئے۔ یہ تجربہ بہت ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ گھوڑوں کے سموں کی تال اور گندھک کی بو نے میرے میناروں کو دہلا کر رکھ دیا۔ اس طرح کہ ان کی بالائی دو منزلیں زمین بوس ہو گئیں۔ بظاہر تو یہ وقوعہ زلزلہ آنے کی وجہ سے ہوا مگر صدیوں سے ایستادہ یہ مینار کچھ ایسے کمزور نہ تھے کہ یکدم زمین بوس ہو جاتے۔ ان کے دلوں پر تو بوجھ تھا، جسے وہ سہار نہ سکے۔ پھر رنجیت سنگھ کا

عہد شروع ہوگیا جو چالیس سالوں پر محیط تھا۔ رنجیت سنگھ بھی میرے کشادہ کھلے صحن میں دربار لگاتا تھا۔ یہ تالاب جو صحن کے مرکز میں مسلمانوں کو طہارت اور پاکیزگی عطا کرتا تھا، اس کا پانی گھوڑے پیتے تھے۔ میرے صحن کی چھوٹی اینٹ والے قدیمی خوبصورت فرش پر گھوڑوں کے سموں سے گڑھے پڑ گئے تھے۔ جہاں مسلمان ننگے پاؤں آتے تھے، وہاں گھوڑے اپنی نعل کے ساتھ ہنہناتے پھرتے تھے۔ میرے ایوان کی تزئین و آرائش ماند پڑ گئی تھی۔ میرے گنبد جو دودھیا روشنی میں جگمگاتے تھے، پیلے پڑ گئے۔ میری ڈیوڑھی جو خندہ پیشانی سے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی تھی، کئی دہائیوں تک آنکھیں بند کیے اپنے گردوپیش سے بے خبر رہی۔ کون آیا، کون ٹھہرا، کون گزرا، اسے کچھ یاد نہیں مگر اس کی یادداشت پر صرف سموں کی تال ثبت ہے جو ماند نہیں پڑتی۔

یہ سکھ عہد کے آخری ایام تھے جب میرے نیم بو میناروں کی چوٹی پر توپیں چڑھا کر شیر سنگھ نے قلعے میں محصور مائی جنداں پر گولہ باری کی۔ جہاں سے کبھی پانچ وقت اللہ اکبر کی صدا گونجتی تھی، وہاں سے گولوں کی دھمک پورے شہر کو دہلا رہی تھی مگر میرے میناروں کی بنیادیں اسی طرح قائم رہیں۔ پھر گورے آ گئے۔ مغل شمال مغربی جانب سے دریا عبور کرکے مجھ تک پہنچے تھے۔ گورے کولکتہ کے راستے آئے اس لیے اُنہیں مجھ تک پہنچنے میں وقت لگ گیا۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی تمام مذہبی عمارتیں ان کے زیر تصرف آ گئیں تو میرے بوسیدہ اور زخمی صحن کے سینے پر گھوڑوں کے ساتھ گوروں کی فوج کے بوٹ چلنے لگے۔ میرے وسیع صحن میں پریڈ ہونے لگی۔ بندوقوں کے استعمال سے گندھک کی بو اکثر میری فضاؤں کو متعفن رکھتی۔

سکھ سرداروں کے عہد میں جب لاہور شہر کی تاریخی عمارات سے قیمتی پتھر لوٹا کھسوٹا گیا تو اسے اپنی حویلیوں کی تزئین و آرائش میں استعمال کیا گیا۔ یہ سب میری آنکھوں کے سامنے ہوا مگر جو خلیج انہوں نے حضوری باغ میں بارہ دری کی صورت میرے اور قلعہ کے درمیان حائل کر دی۔ اس نے تو مجھے وقت سے بہت پہلے بوڑھا کر دیا۔ ایک تو قلعہ کے ساتھ میرا بصری رابطہ محدود ہو گیا۔ دوسرا جب بھی میں قلعہ کی جانب نگاہ اٹھاتی، مجھے حضوری باغ کی بارہ دری پر تزئین و آرائش کی شکل میں استعمال کیا گیا آرائشی سامان ان عمارتوں کی یاد دلاتا، جہاں سے اتار کر یہاں آویزاں کیا گیا تھا۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ بارہ دری کی بالائی منزل گر گئی اور مجھے قلعہ کی دیواریں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ وگرنہ میں تو بالکل کٹ کر رہ گئی تھی۔ میرے شمال مشرقی کونے میں سکھ عہد کے ہیرو رنجیت سنگھ کی سمادھ ہے یہ تو خدا کا شکر ہے کہ کبھی کوئی ہندو شہر لاہور پر قابض نہ ہوا وگرنہ میرے جنوب مشرقی کونے میں ضرور کوئی مندر ہوتا۔

گوروں میں کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی تھے جنہوں نے میرے خدوخال کی کہنگی اور کسالت کے باوجود میری قدامت اور عظمت پہچانی۔ انہوں نے اس کی توجہ اپنے حکمرانوں کی جانب دلائی مگر میرے زخموں کی مرہم پٹی اور حوادث زمانہ میں گم میرے جسم کے ٹکڑوں کی پیوندکاری کے لیے جو مہارت اور رقم درکار تھی، وہ انگریزی حکومت کے وسائل اور ترجیحات میں نہ تھی۔ مسلمان نوابوں نے اگرچند ٹکڑے میری جانب پھینکے بھی تو ان سے میری پرشکوہ عمارت کا تشخص بحال نہ ہو سکا۔ لاہور کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر برانڈتھ نے سرکار کو لکھا کہ کیوں نہ مسلمانوں کی مذہبی عمارات ان کے حوالے کرکے اپنا بوجھ ہلکا کیا جائے اور مسلمانوں کے کندھوں کو تشکر کے بوجھ سے لاد دیا جائے۔ سرکار میں منظوری ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے سرکردہ مسلمانوں پر مشتمل کمیٹی بنائی اور مجھے اس کے حوالے کر دیا اور پھر شہر کی دیگر مساجد کے ساتھ میں بھی انجمن اسلامیہ کے زیر تصرف آ گئی۔ آپ کو شاید علم نہ ہو مگر مجھے یاد ہے جب ایک صدی کے بعد میرے ایوانوں اور صحن میں اذان کی صدا گونجی اور بوسیدہ فرش پر سجدہ کیا گیا۔ یہ ایک صدی مجھے یوں لگتا تھا جیسے ایک ہزار سال کے برابر ہو۔ جب صدائے اللہ اکبر گونجی، تو میری رگوں میں جم جانے

والے شان نے گردش پکڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بار پھر زندہ ہوگئی ہوں۔ مجھے قبر سے نکال کر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا گیا ہو۔ مگر میرے استخوان اور اجزا سلامت نہ تھے۔ میری مشرقی جانب کے برآمدے انگریزی سرکار میں گرا دیے گئے تھے۔ شمالی اور جنوبی جانب کے حجرے بھی خستہ اور جزوی طور پر گرے ہوئے تھے۔ میرے میناروں کی بالائی دونوں منزلیں سرے سے غائب تھیں۔ اپنے میناروں کی کوہ قامتی دیکھ کر پہلے میرے چہرے پر بے چارگی کے تاثرات ابھرتے تھے مگر مسلمانوں کی آنکھوں میں اپنا ادھورا عکس دیکھ کر میں لرزہ براندام نہیں ہوئی بلکہ ایک یقین ابھرا کہ میرا تشخص لوٹ آئے گا۔ مگر مفلس مسلمانوں کے پاس اتنی جمع پونجی نہ تھی اور نہ ہی کوئی نواب اپنی دولت مجھ پر خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اگرچہ چند نوابوں نے اس کسمپرسی کی حالت میں میری امداد فرمائی مگر اتنے بڑے قطعہ اراضی پر پھیلے میرے وجود کے لیے ناکافی تھا۔ تب سر سکندر حیات نے مسلمان زمینداروں پر ٹیکس لگایا، اس سے رقم اکٹھا ہونا شروع ہوئی۔ جوں جوں رقم میسر آتی گئی میری تزئین و آرائش اور خدوخال کی بحالی ہوتی گئی اور مجھے موجودہ شکل اختیار کرنے میں بیس سال لگ گئے۔ اس وقت جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ میرا نیا پیرہن ہے مگر اس کی جمالیات اور سامانِ آرائش پرانے جیسا ہی ہے۔ میں اصل نہیں ہوں مگر اصل جیسی ہوں اور اب تو نصف صدی گزرنے کے بعد مجھے دیکھنے کے لیے دنیا بھر سے آنے والوں نے مجھے اس قدر یقین دلا دیا ہے کہ میں خود بھی بھول جاتی ہوں کہ میں اصل ہوں یا اصل جیسے خدوخال اختیار کرتے ہوئے میرا دوسرا جنم ہوا ہے۔ ہاں کچھ تبدیلیاں اس دوران ضرور ہوئیں۔ میرے صحن کا فرش جو کہ چھوٹی اینٹوں کا تھا، اسے ایک سرکاری فرمانروا کے احکامات کی روشنی میں سرخ پتھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ سورج چمکتا ہے تو اس کی کرنیں میرے صحن کے فرش کو اتنا گرما دیتی ہیں کہ مجھے دیکھنے کے لیے آنے والوں کے پاؤں جلنے لگتے ہیں مگر وہ پھر بھی آتے ہیں اور اپنے ذوقِ جمالیات کی آبیاری کرتے ہیں۔ میرے صحن کے شمالی اور جنوبی حجروں کی بیرونی سطحوں پر چونے میں پکا قلعی کا پلستر کیا گیا تھا جسے سنگ سرخ میں تبدیل کر کے مجھے نیا پہناوا دیا گیا ہے۔ مجھے اس پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہے۔ میرے چاروں کونوں پر ایستادہ میناروں کی بالائی منزلیں تعمیر کر کے مجھے میرا اصل تناسب لوٹا دیا گیا بلکہ بعض اوقات تو مجھے گزرا وقت بالکل خواب کی طرح لگتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور دست بردِ زمانہ سے جو میں گزری وہ محض خواب تھا۔ آنکھ کھلی تو سب ختم ہوگیا مگر حقیقت تو حقیقت ہے۔ اس عہد کی آبی رنگوں کی تصاویر اور سفرنامہ نگار چشم دید گواہ ہیں جنہوں نے میری بوسیدگی کو محفوظ کر کے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

جب سے میری رعنائیاں واپس آئی ہیں، لاہور کا دورہ کرنے والی غیر ملکی بے شمار شخصیات میری جلوہ گری دیکھ چکی ہیں۔ تزئین و آرائش کے اکیس سالوں کے دوران ایک مرتبہ پھر میں نے سینکڑوں مزدوروں، مستریوں اور صناعوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو مہیا کیا۔ ان کی لگن، محنت اور دلچسپی نے میرے اندر نئی روح پھونک دی۔ جب سے میرا سراپا لوٹا ہے، میں اب محض دیکھنے کی چیز بن گئی ہوں۔ لوگ پکنک کے لیے آتے ہیں۔ میرے سراپا کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں، گائیڈ ان کو میری عہد گزشتہ کی کہانیاں سناتے ہیں۔ بچے، بڑے بھی میرے صحن میں کھڑے ہو کر تصاویر بنواتے ہیں اور میرے دورہ کے یادگار لمحات کو تصویری شکل میں محفوظ کر کے ساتھ لے جاتے ہیں مگر میرے ایوان میں نماز پڑھنے کے لیے آنے والوں کی ایک صف بھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ تب میں سوچتی ہوں، عالمگیر نے کیوں میرے وجود کو اس قدر بڑا بنایا۔ میں جن صدموں سے گزری ہوں، کیا میرے خالق کو اس بات کا اندازہ تھا کہ جو تخلیق جتنی عظیم، جتنی بڑی ہوتی ہے، اسے دستِ زمانہ سے اتنے ہی بڑے زخم اور تھپیڑے سہنے پڑتے ہیں۔ میں آج بھی لاہور کا حوالہ ہوں، پاکستان کی پہچان ہوں، مغلوں کے ذوقِ جمالیات کا عکس ہوں، میں

تاریخ ہوں، تین سو سال سے زائد عرصہ پر محیط تاریخ مجھ پر رقم ہے۔ یہی میرا فخر ہے۔ یہی میری وجہ موجودگی ہے۔ یہی میرا غرور ہے۔ کچھ ایسے ہی فخر و غرور کے نشہ میں سرشار میں اپنے شب و روز گزار رہی تھی کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن میری دید کی مشتاق ہیں اور اپنے ذوق جمالیات کی تسکین کے لیے بے تابانہ مجھے دیکھنے آرہی ہیں۔ یوں تو کئی ملکوں کے صدور، وزرائے اعظم، وفود میرے صحن میں قدم رنجہ فرما چکے ہیں جن کے نام بتانا ضروری نہیں ہیں کیونکہ سب آپ لوگوں کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔ ایک بڑے ملک کی اہم خاتون کی آمد نے عہد گزشتہ میں تین صدیوں پر پھیلے واقعات کی جزئیات کو میری یادداشت میں زندہ کر دیا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ گزشتہ ساٹھ برسوں سے جس بڑے ملک سے ہمارے ملک کے حکمرانوں کے تعلقات رہے ہیں اور جو قصے مجھ تک پہنچے ہیں، انہوں نے میرے اندر ایک اشتیاق پیدا کر دی ہے۔ میں اس کے ملک جا نہیں سکتی کہ میرے قدم اس زمین کی مٹی میں دھنسے ہوئے ہیں۔ اب اگر وہ خود چل کر میرے پاس آرہی ہے تو کیا مجھے اس کو اپنا اعزاز نہیں سمجھنا چاہیے۔ مگر یہ تو سطحی بات ہے، اصل بات میں آپ کو اس دن ہی بتاؤں گی جب وہ خاتون یہاں آئے گی، آپ بھی سن لیجیے گا۔

یہ ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی صبح کا وقت تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایئرپورٹ سے قلعہ لاہور میں براہِ راست بذریعہ ہیلی کاپٹر اترے گی اور مجھے چند لمحے کی رفاقت دے کر واپس لوٹ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایک بڑی گاڑی میں بیٹھ کر آئی۔ لاہور شہر کی سڑکوں کو روندتی ہوئی، سارا شہر اس دن مفلوج تھا۔ تمام راستے مسدود تھے۔ اس کی حفاظت سیٹلائٹ اور سیکیورٹی افسر کر رہے تھے۔ اس کا اعتماد اور حوصلہ دیکھ کر سچ پوچھو، مجھے بہت خوشی ہوئی اور مجھ پر جمالیاتی سرور طاری ہوا۔ میں نے دیکھا، وہ ایک خوش شکل، ڈھلتی ہوئی عمر کی متناسب خدوخال اور نقوش رکھنے والی خاتون ہے جو بے شمار خطرات اور اندیشوں کے باوجود مجھ تک پہنچی ہے۔

میری نظریں جب اس سے چار ہوئیں تو میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی، پہلے تو وہ چونکی۔ اسے یقین نہ آیا مگر پھر اس نے اپنا گوشِ سماعت میری آواز پر لگا دیا۔ میں نے اسے بتایا ”جب تمہارے ملک کی ریاستیں آزادی کا اعلان کر رہی تھیں، اس وقت میری تعمیر کو چار سال گزر چکے تھے۔“ ہیلری کو یقین نہ آیا۔ میں نے پھر ایک ایک لفظ دہرایا ”میری تعمیر کو چار سال گزر چکے تھے جب تمہارے ملک کی ریاستوں نے اعلانِ آزادی کیا۔ جب لندن کا سینٹ پال کیتھڈرل بنا تو اس وقت میری عمر ایک سو ستائیس برس تھی اور جب امریکہ کا واشنگٹن ڈی سی کا گنبد تعمیر ہوا، میرے گنبدوں کی عمر ایک سو پینتیس برس ہو چکی تھی اور ہاں جب میری تعمیر ہوئی اس وقت کے مغل بادشاہ اورنگزیب کے زیر تصرف رقبہ موجودہ امریکہ کی تمام ریاستوں کا ایک تہائی تھا اور یہاں اس وقت لوگوں کی آبادی موجودہ امریکہ کی آبادی کا نصف تھی۔“

میرا ایک ایک لفظ اس کے کان میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اتر رہا تھا۔ میں نے گفتگو جاری رکھی۔ ”میری تعمیر پر اس وقت سات ہزار دو سو ڈالر خرچ ہوئے تھے مگر جب بیسویں صدی کے نصف میں میری تزئین و آرائش کی بحالی ہوئی تو اس وقت ساٹھ ہزار ڈالر صرف ہوئے۔“

اس کے بعد میں نے ہیلری اور اس کے ساتھ آئے وفد کے اراکین کو تمام عہد گزشتہ کی تاریخ پینتالیس منٹ کے قلیل وقت میں سنا ڈالی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری دیواروں پر سکھ اور انگریز عہد کے کیا کیا واقعات رقم ہیں۔ میں نے اس کو اپنے صحن کے شمالی اور جنوبی جانب واقع حجرے دکھائے اور بتایا کہ یہاں کبھی علماء، اسکالر اور طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ میری

حیثیت ایک مذہبی عبادت گاہ ہی کی نہیں بلکہ درس گاہ کی بھی رہی ہے۔

وہ یہ ساری باتیں سنتی رہی۔ کبھی ایک سنجیدگی اس کے چہرے پر طاری ہو جاتی، کبھی وہ زیرلب مسکرا دیتی۔ اس نے جوتے اتار کر خصوصی جرابیں پہنی ہوئی تھیں اور سر پر ایک شال اوڑھ کر بالوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس وقت جس صحن میں وہ کھڑی ہے، یہ ایک مربع قطعہ اراضی پر مشتمل ہے اور ایک چھوٹا مربع قطعہ تالاب کی شکل میں صحن کے وسط میں واقع ہے اور چاروں کونوں کے میناروں کی چوٹیوں کو اگر بصری تخیل سے ملا دیا جائے تو اس سے ایک بڑا مربع یا مکعب تشکیل پاتا ہے اور اس کی نسبت خانۂ کعبہ کے اس مکعب سے بنتی ہے کہ جہاں ہر سال مسلمان دنیا بھر سے فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حاضری دیتے ہیں۔ ایوان کے تینوں گنبد تین مربع سطحی پلانوں پر ایستادہ ہیں۔ شمالی اور جنوبی برآمدے بھی بے شمار مربع شکلوں کو ایک قطار میں جوڑ کر حاصل کیے گئے ہیں۔ یہ وہی مربع ہے جس کے اضلاع برابر ہوتے ہیں۔ یہی برابری اس کی استقامت اور مساوات کا درس دیتی ہے اور دنیا بھر کے مسلمان اسی مربع کی بدولت جڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی فن تعمیر میں تزئین و آرائش کی تمام جیومیٹری اسی مربع سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ روایت صدیوں پر پھیلی ہے۔ صدیوں پہلے جب مسلمانوں نے تعمیرات کیں تو اس کی ظاہری اور باطنی سطح پر کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔''

وہ میری تمام باتیں سنتی رہی مگر اس کے چہرے سے اس کے اندرونی تاثرات مترشح نہیں تھے پر مجھے بخوبی احساس تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اس وقت کیا چل رہا ہے۔ آخر میں نے سلطنتوں کے عروج و زوال کے کئی مرحلے دیکھے ہیں بلکہ خود ان میں سے گزری ہوں۔

وہ جب میری مشرقی ڈیوڑھی سے گزر کر واپس جا رہی تھی تب تک اس نے اپنا کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ ڈیوڑھی میں رکھی نوٹ بک پر بھی اس نے پہلے سے طے کردہ جملے لکھے کہ یہ اس کے ملک کے ترجمان تھے۔ مگر سیڑھیاں اتر کر اس نے گاڑی کے کھلے دروازے میں ایک لمحہ کھڑے ہو کر میری مشرقی ڈیوڑھی کی پیشانی کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ان آنکھوں میں مجھے جلال و جمال، تحسین و کم مائیگی، حسرت و حیرت کی جھلملتا نظر آئی جسے صرف میں ہی دیکھ سکتی تھی اس لیے کہ میں بلندی پر تھی اور وہ نیچے نشیب میں کھڑی تھی۔ یہ اس لمحے کا محض دسواں حصہ تھا، جو پھیل کر صدیوں پر محیط ہو گیا۔

..........☆..........

جسموں کے چولے

ڈاکٹر نگہت نسیم (سڈنی)

''آہ! کاش اٹھائیس مئی کی تاریخ کسی سال کے کیلنڈر میں نہ ہوتی۔''
''کاش یہ دن کبھی طلوع ہونے کے لیے نہ ہوتا۔''
''کاش اس تاریخ کا سرے سے کہیں وجود ہی نہ ہوتا۔''
اینا کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ دنیا کے ہر کیلنڈر سے اس تاریخ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتی۔
''سنو......! ایسے رونے دھونے سے وقت تھوڑی نہ ٹل جائے گا۔ بلکہ رہی سہی تمہاری ہمت بھی جاتی رہے گی۔'' ڈیوڈ اینا کے آنسو پونچھتے پونچھتے خود بھی رو پڑا۔

ٹی وی لاؤنج میں ایک طرف وہیل چیئر پر بیٹھی اداس سی مسز ولیم اپنی بیٹی اینا اور داماد ڈیوڈ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے انہیں تسلی دیں۔ وہ خود بھی تو اسی کشتی میں سوار تھیں جس میں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دکھ سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ گزشتہ چھ ماہ سے ان کے اپنے ہی بچے اپنی ماں پر قانونی حق داری کے لیے آمنے سامنے تھے اور اب کل یعنی اٹھائیس مئی کو فیصلہ ہونا تھا۔ جو بھی یہ مقدمہ جیتے گا وہی اپنی ماں مسز ولیم کا اصل حقدار ہوگا اور انہیں تادم مرگ اپنے اسی بچے کے ساتھ رہنا ہوگا۔

انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے یہ فیصلہ ہونے جا رہا ہو کہ انہیں اب مزید جینا بھی چاہیے کہ نہیں۔ وہ کب سے دیکھ رہی تھیں، ان کی بیٹی اپنا مقدمہ ہار جانے کے اندیشوں میں گھری گھبرا گھبرا کر کبھی پورے گھر کا چکر لگانے لگ جاتی تو کبھی بے بسی سے رونے بیٹھ جاتی۔ پھر بیٹھے بیٹھے بے تاب ہو کر ان کے پاس آ بیٹھتی اور پیار سے ان کے ہاتھ اور چہرہ چومنے لگ جاتی۔ مسز ولیم جو بیس برسوں سے اینا کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ اس کی اس بے قراری پر بھی خاموش تھیں جیسے انہیں کسی ہار جیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ ان کی مسلسل خاموشی اینا کے مقدمہ ہار جانے کے اندیشے کو یقین میں بدل رہی تھی۔

سچ یہ تھا کہ چوہتر سالہ مسز ولیم اپنی دربدری کی داستان سب کو سنانا چاہتی تھیں پر صدمے نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر سب کو بتانا چاہتی تھیں کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی جنت سے دور نہیں جانا چاہتیں۔ وہ اپنے بچوں کو سمجھانا چاہتی تھیں، ماں سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ اسے بانٹا نہیں جا سکتا۔ کوئی بچہ صرف اپنے حصے کی ماں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ وہ یہ بھی عدالت میں بتانا چاہتی تھیں کہ اینا کے علاوہ ان کے کسی بچے کو ماں پوری کی پوری نہیں چاہیے۔ پر وہ کچھ بھی تو کہہ نہیں پائیں۔ اور تو اور اپنی

بٹی اینا کو بھی نہ سمجھا پائیں کہ فیملی کورٹ کا قانون اندھا ہے۔ بس اس کی سنتا ہے جو زور زور سے بولنا جانتا ہو۔ ٹینا کی کڑک دار آواز کے سامنے اینا کی کانپتی آواز کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ان کے دماغ میں ٹینا کی چیختی ہوئی آواز ابھی بھی ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی، اس کی ماں کی زبان اینا کے خوف سے بند ہے بلکہ تشدد کی وجہ سے ان کی یادداشت کے کھو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ اس نے یہ بھی اپنے بیان میں کہا، اینا ماں کی کفالت کے بہانے خاندان کی ہمدردیوں کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ سے سارے فائدے اور پیسے بھی وصول کر رہی ہے۔ اور جس گھر میں اینا اور ڈیوڈ رہ رہے ہیں، وہ بھی مسز ولیم کا ہے اور وہ سب اس کے برابر کے حصے دار ہیں۔

سچ تو یہ تھا کہ یہ گھر اینا اور ڈیوڈ کا گھر تھا جو انہوں نے مسز ولیم کے تحفظ کی خاطر ان کے نام کر دیا تھا۔ مسز ولیم کی خاموشی اور بہن بھائیوں کے الزامات اینا کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہے تھے۔ ڈیوڈ عدالتی کارروائی کے دوران دکھ سے زرد پڑتی اینا کو دیکھ رہا تھا۔ ٹینا کے ساتھ اس کے سوتیلے بھائی ٹونی اور پال بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے جو امریکہ سے ٹینا ہی کے کہنے پر پہنچے تھے۔ جب مسز ولیم سے وکیل نے پوچھا تو وہ چاہنے کے باوجود عدالت میں کچھ بول ہی نہ پائیں۔ وہ تو یہی گتھی سلجھا رہی تھیں کہ ان کے تینوں بچوں کے دل میں اپنی بہن اینا کے لیے اتنا زہر کیسے بھر گیا۔

وہ حیرت میں تھیں کہ ان کے بچوں کو ماں نہیں بلکہ گھر اور پیسہ چاہیے تھا تاکہ وہ اپنے اپنے قرضے اتار سکیں۔ کیا بوڑھے والدین قرضوں سے نجات کا آسان سا نسخہ تھے..... وہ اپنی ارزانی پر آزردہ تھیں۔ وکیل کے اصرار پر انہوں نے خالی خالی نظروں سے وکیل کو ایسے دیکھا جیسے وہ کسی اور ملک کی زبان بول رہا ہو۔ بے بسی سے اینا کی طرف دیکھا تو اس کی غلافی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور اس کے بیچ و بیچ فغاں وہ سن سکتی تھیں۔ پھر انہوں نے گردن گھما کر مدد کے لیے ٹینا کو دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ چہرے پر مکاری سجائے جیت لینے کے نشے میں چور آنکھیں۔ اف میرے خدا یہ تو میرا کیسا امتحان لے رہا ہے۔ مسز ولیم نے زبان کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ ٹینا میری بیٹی نہیں ہو سکتی جسے صرف ماں جائیداد کے بٹوارے کے میں زیادہ حصہ لینے کے لیے چاہیے تھی۔ مسز ولیم نے ایک آہ بھری۔ ایک بار پھر کچھ کہنے کی ہمت کی، پر ان کی آواز ان کے اندر ہی کہیں گم ہو گئی۔ پھر ان کی یہی چپ اینا کو ہرانے کے لیے بہت بڑا ثبوت بن گئی۔ جج نے اسی دن مسز ولیم کی ذہنی کیفیت کی جانچ کے لیے ان کا کیس نیورو سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر ایڈورڈ کو بھیج دیا۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا طویل نفسیاتی اور دماغی چیک اپ ہوا اور اب ڈاکٹر ایڈورڈ کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے اٹھائیس مئی کو فیصلہ ہونا تھا۔

مسز ولیم کی چپ عدالت سے گھر پہنچ کر بھی نہ ٹوٹی۔ ان کو اینا پر لگائے ہوئے الزامات کا سوچتے ہوئے خود سے ہی گھن آ رہی تھی۔ جس طرح ان کے پاس اینا کے ساتھ گزرے ایک ایک پل کا حساب تھا، اسی طرح سے انہیں اپنی پنشن کی ایک ایک پائی کا حساب بھی ازبر تھا جو ان کے منع کرنے کے باوجود اینا ہر ماہ انہیں دیا کرتی تھی۔ وہ ابھی تک ٹینا کی ہمت پر حیران ہو رہی تھیں کہ اس نے کتنی بے دردی سے یہ کہہ کر اینا کی بات رد کر دی کہ اس نے ماں کو ڈرا دھمکا کر اپنے فائدے کے لیے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔

مسز ولیم بظاہر بڑے سکون سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ پر اینا جانتی تھی کہ اس کی ماں اپنا درد اس سے چھپانے کی خاطر انجان بنی ہوئی ہیں تاکہ وہ بھی یہی سمجھے کہ اس کی ماں کو مسئلے کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ پر اینا جانتی تھی کہ مسز ولیم کو سب معلوم ہے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ اینا ان کے قدموں سے لپٹی ان کے پاؤں دبا رہی تھی اور چپکے چپکے امڈتے

آنسوؤں کو ان سے چھپا بھی رہی تھی کہ کہیں اس کی ماں کا اس کے سامنے بھرم ٹوٹ نہ جائے۔

مسز ولیم نے پچاس سالہ اینا کو ایسے دیکھا جیسے وہ پانچ برس کی ہو اور اسے گود میں بھر کر بالوں کو سہلاتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ ''آج میری بیٹی بہت تھک گئی ہے۔ آؤ تمہیں سلا دوں۔'' انہیں لگا جیسے ان کی وہیل چیئر پرام میں بدل گئی ہو اور وہ اینا کو بہلانے کی خاطر ہر جگہ اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ انہوں نے بڑی محبت سے اینا کو دیکھا اور خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ یہ منظر ان کی آنکھوں میں بس آخری منظر بن کر رہ جائے۔ پر اس ایک منظر میں کئی اور منظر نکل آئے۔ یوں جیسے یادوں نے دھیرے سے کئی کواڑ کھول دیے ہوں۔

نمناک سے جھونکے......

اداس، گداز سے روز و شب......

ہائے کیسے گزر گئے وہ بے ترتیب سے روز و شب......

''آئیے ماں میں آپ کو آپ کے کمرے تک لے چلوں۔'' اینا نے اپنی ماں کی بند آنکھوں کو چومتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں جیسے ابھی ابھی خواب سے جاگی ہوں۔ انہوں نے ہاں یا ناں میں کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔ اینا کے لیے ان کی بیگانگی کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ اکثر شام کو وہ ایسے ہی اداس ہو جایا کرتی تھیں اور کبھی کبھی تو باتیں کرتے کرتے بھول بھی جایا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر مائیکل اس کی وجہ مسز ولیم کی عمر کو بتاتے تھے۔ شروع شروع میں اینا نے انہیں باتوں میں لگانے کی بہت کوشش کی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماں بیٹی دونوں ہی ایک دوسرے کی کیفیت سے واقف ہو گئیں بلکہ ایسی شاموں کی عادی ہو گئیں۔ اس لیے کوئی بھی ایک دوسرے کو بہلانے کی کوشش نہ کرتا اور نہ ہی خاموشی پر ٹوکتا۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اینا نے اپنی ماں کو اداس جان کر تنگ نہیں کیا بلکہ ان کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ جب وہ مسکرا دیں تو وہ خاموشی سے ان کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی ان کے کمرے تک لے آئی۔ حسب معمول انہیں بستر پر لٹا کر ان کا ماتھا چومتے ہوئے گڈ نائٹ کہا۔ نائٹ لیمپ جلایا۔ بے بی مونیٹر آن کیا اور ایک بار پھر پلٹ کر اپنی ماں کو دیکھا جو اس وقت نم آنکھیں موند چکی تھیں۔ وہ کچھ کہے بنا سرخ متورم آنکھیں لیے واپس ٹی وی لاؤنج میں اسی جگہ آ کر بیٹھ گئی جہاں ڈیوڈ نے قد آدم آئینہ بڑے حساب سے نصب کروایا تھا۔ جہاں سے وہ اپنی ماں پر نظر رکھا کرتی تھی اور مسز ولیم اپنی بیٹی کو اسی آئینے میں دیکھتے دیکھتے تسلی سے سو جایا کرتی تھیں۔

میرا یہ گھر میری ماں کے بغیر کیسا لگے گا؟ اینا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ ہائے میں کیا کروں۔ اینا نے سنٹرل ٹیبل پر سے وزیٹنگ کارڈ اٹھا کر ایک بار پھر بے یقینی سے دن اور وقت کو دیکھا جس پر مقدمے کے آخری دن کی کارروائی کی تاریخ درج تھی۔

اٹھائیس مئی......اس نے ایک بار پھر ایسے پڑھا جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہو۔ چوہتر سالہ ماں کو اسی کے جگر کے ٹکڑے کئی ٹکڑوں میں بانٹ رہے تھے۔ دونوں طرف کے بیانات، گواہیاں قلم بند ہو چکی تھیں، ثبوت فراہم کیے جا چکے تھے۔ اینا کو اپنی ہار سے زیادہ اپنی ماں کی خاموشی ہلکان کر رہی تھی۔ جھوٹ سچ کے درمیان لٹکی اس کی ماں کس عمر میں کن اذیتوں سے گزر رہی تھی، یہ سوچتے ہی وہ دکھ سے رو پڑی۔

ماں...... جس طرح آپ میری جدائی کے خوف سے میری شادی کا کارڈ دیکھ کر چھپ چھپ کر رویا کرتی تھیں، آج اسی طرح سے میں یہ وزیٹنگ کارڈ دیکھ دیکھ کر رو رہی ہوں۔ سوچتی ہوں آپ کے رونے میں خوشی اور تشکر کے ساتھ ہجر کا ڈر تھا اور میرے رونے میں حزن اور ملال کے ساتھ آپ کو کھو دینے کا ڈر ہے۔ ماں میری اچھی ماں چپ نہ رہیں۔ بولیں ناں میرے حق میں۔ کچھ تو کہیے۔ ماں! آپ کی چپ مجھے مجرم بنا رہی ہے ماں...... پلیز۔

ماں...... آپ پچاس برس سے میرے ساتھ ساتھ سانس لے رہی ہیں۔ آپ چلی گئیں تو میں کس کے ساتھ اپنی سانسوں کا حساب رکھوں گی۔ آپ ہمیشہ کی طرح ٹینا کو ڈانٹتے نا کہ ایسا کام نہ کیا کرے جس سے کسی کو تکلیف ہوتی ہو۔ اینا کے آنسو ایک تسلسل سے کارڈ پر گر رہے تھے۔ کاش ٹینا نے یہ دعویٰ نہ دائر کیا ہوتا اور نہ ہی مجھ پر جھوٹے الزام لگائے ہوتے۔ ماں کی خدمت کو لالچ کا نام نہ دیا ہوتا۔ کاش ماں کی معذوری کو میری غفلت سے تعبیر نہ کیا ہوتا۔ ایسی ہی لاتعداد باتیں سوچتے سوچتے اینا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ڈیوڈ خاموشی سے اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اینا کا دکھ بہت بڑا ہے اور اس کی تسلی بہت چھوٹی۔

مسز ولیم آئینے کے اس پار سے اینا کو تڑپتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ پر انہوں نے اینا کو کوئی آواز نہیں دی۔ اپنی بیٹی سے جدا ہونے کے لیے انہیں بھی تو وقت چاہیے تھا۔ انہیں بھی تو کل اٹھائیس مئی کے لیے کچھ تیاری کرنی تھی۔ ان کی بے جان ٹانگیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ آنکھوں میں کھارا پانی در آیا تھا۔ انہیں یاد آیا جب اینا کی رخصتی ہو رہی تھی وہ بھی ایسے ہی تڑپ تڑپ کر روئی تھیں اور چرچ سے گھر تک بار بار اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں پونچھتی رہی تھیں۔ انہیں ایسے لگ رہا تھا جیسے گھر کی رونقیں بچھڑ گئی ہوں یا پھر زندگی سے خوشیاں جا رہی ہوں۔ رفاقتیں اپنی قیمتیں لگانا خوب جانتی ہیں۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

اینا بے قرار سی ہو کر دوبارہ مسز ولیم کے کمرے میں چلی آئی۔ آہٹ پاتے ہی انہوں نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کو اینا سے چھپانے کے لیے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ آنسو بوڑھی آنکھوں کی جھریوں سے ہوتے ہوئے کبھی بازوؤں کے نیچے ہو لیتے تو کبھی سفید بالوں میں ٹھہر جاتے اور کبھی تسلسل سے گردن کے دائیں بائیں گر جاتے۔ اینا انہیں سوتا دیکھ کر بیڈ لیمپ کی لائٹ مزید دھیمی کر کے کچھ دیر ان کو دیکھتی رہی۔ پھر سفید بالوں پر ہولے سے ہاتھ پھیرا اور دھیرے سے ان کی پیشانی پر اپنا ماتھا ٹیک دیا اور اتنی آہستگی سے خدا حافظ کہا کہ ان کے علاوہ کسی نے نہیں سنا۔ مسز ولیم کے جسم نے اینا کی گیلی آنکھوں کی ٹھنڈک پر بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ ان کی بیٹی انہیں حسرت سے دیکھتے ہوئے دبے پاؤں کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

مسز ولیم نے اینا کے باہر جاتے ہی آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی سی اتر آئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ زندگی بھی کیا ہے۔ ساری عمر دھوپ ہی دھوپ رہی۔ جب جب ان پر چھاؤں کا وقت آیا تب تب ان کے آسرے چھوٹتے رہے۔ انہیں یاد آیا جب وہ نو سال کی تھیں تو ان کی ماں ایک کار کے حادثے کا شکار ہو گئیں۔ ڈیڈی نے کچھ مہینوں کے بعد دوسری شادی کر لی اور وہ دس برس کی عمر میں پورے خاندان کی نوکرانی بن چکی تھیں۔ پر اس بیگار کے عوض وہ بھوک ننگ سے بچی رہیں۔ ضد کر کے اسکول کی شکل دیکھی تو وہ بھی صرف ایک دن۔ پھر وہ رستہ بھی سب نے مل کر بند کر دیا۔ اگر وہ اسکول جاتیں تو گھر کے کام کون کرتا۔ برتن، جھاڑو، کپڑے دھونے سے استری تک سارے کام کرنا انہی کی ذمہ داری تھا۔ آخر پناہ گاہ کا کرایہ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ پیسے نہ سہی کام ہی سہی۔ رہنے، کھانے کا کرایہ تو چکانا ہی تھا۔ وہ تو شاید ساری زندگی ایسے ہی گزار جاتیں جو چھوٹے چچا کے دوست مسٹر ولیم اپنے دو بچوں کو لے کر گھر رہنے کے لیے نہ آ گئے ہوتے۔ چھوٹے چچا نے بتایا کہ ان کی بیوی ''میری''

سب سے چھوٹے بچے پال کو جنم دیتے وقت مر گئی تھیں۔

وہ تو جیسے ان معصوم بچوں میں کھو سی گئیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر انہیں اپنا بن ماں کا بچپن یاد آ جاتا اور بچوں کو ان کے روپ میں اپنی ماں دکھتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ٹونی اور پال ان سے اتنے مانوس ہو گئے کہ انہیں ''مس کینڈل'' کی بجائے ماں کہہ کر بلانے لگے اور مسٹر ولیم کو ایک نئے گھر کا آسرا ہو گیا۔ ایک سال کے اندر اندر وہ ''مس کینڈل'' سے مسز ولیم ہو گئیں۔ اس بات کے لیے وہ حد سے زیادہ خوش تھیں کہ زندگی میں پہلی بار انہیں کوئی معتبر شناخت ملی تھی۔ مسز ولیم بنتے ہی ان کی زندگی میں خوشیوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ٹونی اور پال کے ساتھ ساتھ اینا اور ٹینا بھی ان کی زندگی میں شامل ہو گئیں۔ انہیں لگا جیسے گھر مکمل سا ہو گیا ہو یا پھر شاید انہیں ہی ایسا لگتا تھا۔

جیسے مسٹر ولیم ہر چھوٹے بڑے کے لیے ''مسٹر ولیم'' تھے، اسی طرح وہ بھی اب صرف ''مسز ولیم'' ہی کہلوانا پسند کرتی تھیں۔ مسٹر ولیم ان کے شوہر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دوست بھی تھے جن سے انہوں نے زندگی کی ہر خوشی پائی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے کہ کسی شخص کی زندگی کا بننا یا بگڑنا اس عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس سے وہ شادی کرتا ہے۔ وہ بہت خوش تھے کہ انہوں نے سلیقہ مند اور ثمر بار عورت سے شادی کی تھی۔ وہ اکثر انہیں یقین دلایا کرتے کہ انہوں نے ان کی اندھیری زندگی میں کینڈل کی طرح روشنی بکھیر دی ہے۔ ٹھنڈی مدھم سی لو جو نازک اتنی کہ تیز سانس سے بھی تھرتھرا جائے اور بہادر اتنی کہ آندھیاں بھی اسے بجھا نہ پائیں۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے کہ انہیں ''کینڈل'' کو ''مسز ولیم'' بنانے کے لیے ایک سیکنڈ بھی نہیں سوچنا پڑا کیونکہ انہوں نے کینڈل میں شفیق، مہربان، شجر سایہ دار ماں دیکھ لی تھی۔ ان کی اسی خوبی نے مسز ولیم کو اپنی ہم عمر لڑکیوں میں ایک الگ سی پہچان دے رکھی تھی۔ مسز ولیم محبت اور تشکر کی تصویر بنی خدا سے راز و نیاز کرتی رہتیں۔ اپنے دل میں عزم لیے اپنے بچوں کے لیے ہر پل دعا گو رہتیں اور سوچتیں، ان کے بچے ان کی طرح جاہل نہیں رہیں گے بلکہ پڑھ لکھ کر ان کے ادھورے خوابوں کو پورا کریں گے!! پر شاید کبھی کبھی خواب دیکھنے والے سب سے بڑے مجرم بن جاتے ہیں اور انہیں ساری عمر خواب دیکھنے کی سزا بھی کاٹنی پڑتی ہے۔ اچانک ہی مسٹر ولیم ایک کار کے حادثے میں اس وقت چل بسے جب ان کی ضرورت مسز ولیم کو سب سے زیادہ تھی۔ اس وقت ٹونی دس برس کا، پال آٹھ برس کا، اینا پانچ برس کی اور ٹینا دو برس کی اور وہ خود صرف ستائیس برس کی تھیں۔

جوان، نازک سی مسز ولیم چار بچوں کو پالنے کے لیے ایک بار پھر سب کے ہاں نوکر ہو گئیں۔ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے کئی سال لوگوں کی ٹھوکروں پر پڑی رہیں لیکن اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا جوان کا خواب تھا، وہ انہیں تھکنے نہ دیتا تھا۔ بچے جوان ہوئے اور جب اپنی منزلوں پر پہنچے تو اس وقت تک وہ خود عمر پا گئی تھیں۔ کالے بالوں کی جگہ سفید بالوں نے لے لی۔ پکے رنگ پر اب وقت نے کچھ لکیریں سی بنا ڈالی تھیں۔ پر جب ٹونی اور پال ان کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے تو جانے انہیں کیوں لگتا جیسے وہ پھر سے جوان ہو گئی ہوں۔ خوبصورت ہو گئی ہوں۔ شاید خود کو محفوظ سمجھ لینے کے تصور سے ہی چہرے پر تازگی اور خوبصورتی آ جاتی ہے۔ صابر و شاکر ملنسار سی مسز ولیم اس عمر میں بھی سب سے الگ لگا کرتیں خاص طور پر جب وہ ہلکے رنگوں میں اسکارف اوڑھتیں، لمبی اسکرٹ پر لمبی سی قمیص پہنا کرتیں۔

انہیں پتہ ہی نہ چلا تھا کہ کب اینا اور ٹینا جوان ہوئیں، کب ان کے کندھوں سے آن لگیں۔ پر وہ خود پر حیران رہتیں کہ چاروں بچوں میں کیوں وہ اینا کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ اس کی گندمی رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، اور ہر پل ہر حال میں مسکراتے

ہوئے لب ان کی ممتا کو ٹھنڈا رکھتے تھے، اسے ہر جگہ ممتاز رکھتے تھے۔ ایناکے چہرے پر ہر وقت ایک روشنی سی رہتی تھی جس سے وہ بے حد مانوس تھیں۔ ایسی ہی روشنی انہوں نے سب سے پہلے مسٹر ولیم کے چہرے پر ہی دیکھی تھی۔ انیس سالہ اینا کتنی پیاری ہے، اس بات کا احساس مسز ولیم کو اس دن ہوا جب ڈیوڈ نے اینا کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی ان سے اجازت مانگی تھی، وہ بھی سب لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر۔ اس دن سنڈے میس کے بعد تقریباً سارے ہی لوگ چرچ کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے حیرانگی سے اینا کو دیکھا جو بظاہر بے نیازی سے اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی تھی، پر اس کا سارا دھیان انہی کی طرف تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اینا اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ ڈیوڈ اسے اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگے۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے ایک بار پھر ڈیوڈ سے پوچھا:

''کیا تم میری اینا کی بات کر رہے ہو؟''

''پلیز ہاں کہہ دیجیے نا۔'' مسز ولیم نے حیرت سے اینا کو دیکھا اور زیر لب دہرایا ''اولو گرل Olive Girl۔'' ''جی جی آپ کی جی اینا کا رنگ ہے نا ایسا۔'' وہ بے تابی سے بولا۔ ''مسز ولیم مجھے اینا بہت پسند ہے۔ اس کا اولو رنگ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پلیز مجھے اسے اپنے ساتھ باہر لے جانے کی اجازت دے دیجیے۔'' مسز ولیم کو ڈیوڈ کی آنکھوں کی چمک نے بے حد فکر مند سا کر دیا تھا۔ انہیں لگا جیسے ان کی اینا ان سے جدا ہونے ہی والی ہے۔

''پلیز.....'' ڈیوڈ کے اصرار پر وہ مسکرا دیں۔ ''اچھا تو تمہیں اینا اتنی اچھی لگتی ہے۔'' مسز ولیم کے پوچھنے پر ڈیوڈ نے بے اختیار ہو کر سر ہلا دیا۔ ''اور اینا کو تم۔'' مسز ولیم کی بات پر ڈیوڈ جھینپ گیا اور دھیمی آواز میں بولا ''جی یہی تو پوچھنا ہے۔'' اس کی معصومیت اور سچائی انہیں بہت اچھی لگی۔ وہ بے اختیار ہو کر مسکرا دیں اور ڈیوڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں:

''بیٹے تم بہت اچھے ہو۔ تم اینا کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی حدود کا خیال رکھو گے۔''

ڈیوڈ کے ساتھ اب اینا بھی مسکرا رہی تھی۔ اینا کی شناسا مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ کچھ ماہ بعد ڈیوڈ کے ماں باپ نے اینا کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا اور انہیں اپنی اینا وداع کرنی ہی پڑی۔ کہنے کو وہ اب بھی اپنے تین بچوں کے ساتھ گھر پر ہی تھیں، پر اینا کے بغیر ان کا دن رات میں نہ بدلتا تھا اور جو رات ڈھل بھی جاتی تو اس کی سحر نہ ہوتی۔ انہیں گھر کے کونے کونے سے اینا کی خوشبو آتی تھی۔ انہیں ہر کونے میں اینا کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ ہر بات میں اینا کا ذکر، کھانے بھی ابھی تک اینا ہی کی پسند کے بن رہے تھے۔ انہیں یاد آیا جب مسٹر ولیم ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے تھے، اس وقت بھی انہیں ایسا ہی لگا کرتا تھا جیسے اینا کے رخصت ہونے کے بعد محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی ایک دن اینا کے مسلسل ذکر پر ٹینا نے اپنا کینے سے بھرا دل ان کے سامنے کھول دیا تھا اور انہیں جتا دیا تھا کہ وہ اینا سے سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔

اور آج اتنے برسوں کے بعد بھی ٹینا کو اپنی ماں سے وہی شکایت تھی کہ وہ اینا کو باقی سب پر فوقیت دیتی ہیں۔ اور ان کا غصہ اینا پر اتار دیا تھا۔ بھری عدالت میں اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ مسز ولیم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بیٹی ٹینا اتنی بدگمان اور کینہ پرور بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس کی وجہ خود کو ہی سمجھ رہی تھی کہ وہ شاید دونوں کی پرورش میں توازن نہ رکھ سکی تھیں۔ پھر بے یقینی سے سوچتیں، کہیں اس کی دوستوں کا اس پر اثر نہ ہو۔ مسز ولیم اپنے واہموں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھیں۔ انہیں یاد آیا، اینا کی شادی کے کچھ برس بعد ہی ٹونی اور پال بھی شادی کرنے کے بعد امریکا جا بسے تھے۔ بھائیوں کی دیکھا دیکھی بدگمان سی ٹینا بھی لندن چلی گئی اور وہیں بن بتائے اپنے کولیگ سے شادی بھی کر لی۔ پھر پلٹ کر کسی نے ان کی خبر نہ لی۔ مسز ولیم بھرے گھر

میں تنہا رہ گئی تھیں۔ بڑی منت اور سماجت کے بعد اینا اور ڈیوڈ انہیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ ویسے بھی مسز ولیم کے پاس تھا ہی کیا۔ کرائے کا گھر جو مکینوں کے جانے کے ساتھ ساتھ سامان بھی خالی ہوتا گیا۔ آخر میں سمیٹنے کو اچھی بری یادیں ہی رہ گئی تھیں جو گھر کے ہر کونے میں بکھری پڑی تھیں۔ بس چلتے وقت وہی اپنے ساتھ لے آئیں۔

اینا کو بھی پہلے سے زیادہ اپنی ماں سے پیار ہو چلا تھا۔ ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ جاب پر جانے کے باوجود کبھی انہیں اکیلا نہیں رہنے دیتی تھی۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے نرس "سوزن" رکھ لی جو ان کے سارے کام کرتی۔ مسز ولیم کو بیٹی کے گھر رہنا مناسب نہیں لگتا تھا تو اینا اور ڈیوڈ نے اپنا گھر بھی انہیں کے نام کر دیا تاکہ وہ سکون اور خوشی سے ان کے ساتھ رہ سکیں۔ تھوڑا آرام میسر ہوا تو برسوں کی تنہائی نے اب مسز ولیم کو اپنے ہونے کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت جلدی تھک جایا کرتیں۔ کبھی کبھی چلتے چلتے گر جاتیں تو اٹھ ہی نہ پاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ چلنے سے بھی معذور ہو گئیں۔ ڈاکٹرز کے مشورے سے وہیل چیئر کا انتظام کرنا پڑ گیا جس کا اینا اور سوزن کو بہت دکھ تھا، پر گھر میں کسی نے بھی انہیں شکوہ کرتے نہیں دیکھا۔ ہنستی مسکراتی شکر گزار سی مسز ولیم سب کو اور بھی عزیز ہو گئیں۔ سوزن انہیں ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑتی۔ گھنٹوں ان سے باتیں کرتی۔ انہیں شاپنگ پر لے جاتی۔ ان کے ساتھ مل کر کھانے پکاتی اور شام کو سامنے والے پارک بھی لے جاتی تھی۔ مسز ولیم جانتی تھیں کہ ٹونی، پال اور ٹینا ہر بات اور ہر فکر سے آزاد اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ ان کی ماں کن حالوں میں ہے۔ پر دنیاداری کی خاطر مدرز ڈے اور کرسمس پر کارڈ بھجوانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اینا اگر کبھی ان سے ماں کی معذوری کی بات بھی کرتی تو تینوں اسے ماں کو نرسنگ ہوم داخل کروانے کا مشورہ دینا کبھی نہ بھولتے۔ پھر وہ رات اینا پر بہت بھاری گزرتی۔ رو رو کر آنکھیں سجا لیتی۔ اب تو کافی عرصے سے اینا نے اپنے بہن بھائیوں سے بات کرنی بھی چھوڑ رکھی تھی اور نہ ہی ان میں سے کسی کا فون آیا تھا۔ مسز ولیم نے بھی کبھی اینا سے ان تینوں کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں اینا کو یہ نہ لگے کہ اس کی خدمت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔

وہ اینا اور دوسرے بچوں میں فرق کو جانتی تھیں۔ سرسری سی محبت اپنی جگہ اپنا مقام رکھتی ہے پر سچی محبتیں ہمیشہ سے ہر مقام پر اپنی الگ پہچان بنا کر رہتی ہیں۔ خدا نے ایسی ہی محبتوں کا نصیب رکھا تھا کہ وہ کبھی مرتی نہیں تھیں بلکہ کسی نہ کسی روپ میں مرتے دم تک ساتھ رہا کرتی تھیں۔ ازل سے محبت کی وہی چمک، وہی دمک، وہی آن اور وہی شان تھی۔ اینا کے لیے ان کی محبت بھی ایسی ہی تھی اور اینا نے بھی ان کی خاطر کیا کیا نہ کیا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کی خاطر دوسرے ملک تو دور کی بات دوسرے شہر تک کبھی نہ گئی تھی۔ خدا نے اینا کو اولاد جیسی نعمت نہیں دی تھی جس کا مسز ولیم کو بہت قلق رہتا، پر وہ ہنس کر کہہ دیتی، جن کے پاس ماں ہو اسے کس رشتے کی کمی ہو سکتی ہے۔ اینا نے اپنی ساری توجہ اور محبتیں اپنی ماں پر نچھاور کر دیں۔ وہ بھی تو کبھی اینا سے الگ نہیں ہوئی تھیں۔

ملگجے سے اندھیرے میں مسز ولیم نے ڈبڈباتی آنکھوں سے کونے میں پڑی وہیل چیئر کو دیکھا۔ پھر اپنے بے جان ہوتے جسم کو۔ وہ خود کلامی کے لمبے سفر پر تھیں۔ مجھے اپنی بیٹی کے سارے احسان یاد ہیں۔ کیسے بھول سکتی ہوں جب میں چلنے پھرنے سے معذور ہوئی تو اینا ہی نے میرے بدبودار کپڑے بدلے۔ مجھے نہلا دھلا کر سجایا۔ میں تیری احسان مند ہوں میری بیٹی۔ تم نے مجھے اپنی چھت کے نیچے رکھا۔ کھلے آسمان کو دیکھنے کے لیے ہر کھڑکی کھول کر دی۔ صاف ستھری خوشبودار ہواؤں کو میرا مقدر بنائے رکھا۔ چاند ستاروں کے نیچے بٹھا کر میری امیدوں کو زندہ رکھا۔ پر میری بیٹی مجھے اس بار کیوں لگ رہا ہے جیسے تم ہار جاؤ گی۔ ٹونی، پال اور ٹینا تمہیں ہرا دیں گے۔ وہ دیدہ ور نہیں دنیادار ہیں۔ دل کے غریب ہیں، وہ تینوں تمہیں ہرانے کے لیے کسی بھی حد

سے گزر سکتے ہیں اور میں تمہیں ہارتا ہوا کیسے دیکھ سکتی ہوں۔
مسز ولیم کی آنکھیں شدت غم سے جل رہی تھیں اور دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اینا کی تصویر کو سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر پہلے تو غور سے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے اسے چوم کر اپنے دل سے لگالیا۔ میری بیٹی، یہ سطحی سے لوگ بھلا محبتوں کے راز اور اس کے سکھ کیا جانیں۔ اس کی طاقت اور پرواز کو کیا سمجھیں۔ محبت تو خدا کا نور ہے جو پاکیزہ اور کشادہ دلوں کو ودیعت ہوتا ہے، محبت اگر ساری عمر بھی دودھاری تلوار پر چلتی رہے تو بھی کبھی ڈگمگاتی نہیں ہے۔ پتہ ہے کیوں بیٹی؟ مسز ولیم اینا کی تصویر کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے آپ میں مسکرادیں۔ جیسے سچ مچ اینا نے پوچھ لیا ہو ''بھلا کیوں؟'' وہ اپنے دھیان میں دھیرے دھیرے اسے بتارہی تھیں۔ وہ اس لیے کہ محبت کو یقین ہوتا ہے کہ وہ تم جیسے پاکیزہ دلوں میں شمع کی طرح دھیمے دھیمے جلتی رہے گی اور تم جیسے روشن چہروں والے جی جان سے اس کی حفاظت کریں گے۔ کتنا ہی کڑا وقت کیوں نہ آجائے اس کی لو کو کبھی بجھنے نہیں دیں گے۔ یوں تمام عمر محبت ہر انسان کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتی ہے، کسی بھی روپ میں، کسی کا بھی بدن اوڑھ کر سکھ بانٹنے کا آفاقی منصب نبھاتی رہتی ہے۔ کاش لوگ جان سکتے کہ محبت ہی درد کی سخن آشنا ہے۔ غم میں رفیق ہے۔ اسی کو ثبات ہے۔ اسی کا ہنر ہے۔ جسموں کے چولے بدل بدل کر آتی رہے اور ویران دلوں کو شاد و آباد کرتی رہے۔
اینا، مجھے کہنے دو، تم وہی محبت ہو جو مسٹر ولیم کے مرنے کے بعد تمہارا چولا پہن کر میری زندگی میں سکھ بانٹنے آگئی تھی۔ محبت کے ہر ہنر سے آباد مسٹر ولیم جنہوں نے مجھے جینا سکھایا۔ دنیا کی سب سے بہادر عورت سمجھا۔ مجھ سے سانس سانس محبت نبھائی۔ ہر پل میرے ساتھ رہے۔ وہی بولتی ہوئی آنکھیں۔ بے نیازی مسکراہٹ۔ دلاسہ بانٹتی باتیں۔ اینا مجھے اقرار کرنے دو، میں تم سے فقط اس لیے ٹوٹ کر محبت نہیں کرتی ہوں کہ تم میری اچھی بیٹی ہو بلکہ اس لیے کہ تم میں میرا سخن آشنا بستا ہے۔ تم میری محبت کا مدار ہو۔ تمہاری صورت مسٹر ولیم ہر رخ سے زندہ ہیں۔
اپنی ماں کی خاموشی کو خود غرضی نہ سمجھنا بیٹی، میں کیا کروں، مجھے قرار نہیں آرہا۔ کل اٹھائیس مئی ہے۔ فیصلے کا دن ہے، سوچتی ہوں اگر تم ہار گئیں تو شاید میں تمہارے بغیر تو زندہ رہ جاؤں پر مسٹر ولیم کے بغیر جی نہیں سکوں گی۔ اینا...... مسز ولیم کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ وہ نڈھال ہو رہی تھیں۔ اینا...... اینا...... میری بیٹی۔ میری بچی مجھے معاف کر دینا۔ اینا...... اینا...... وہ اسے پکار رہی تھیں۔

بے بی مونیٹر سے ڈوبتی ابھرتی آوازیں مسز ولیم کی تھیں۔ اینا اپنا نام سنتے ہی دوڑ کر اپنی ماں کے کمرے کی طرف لپکی۔ ماں...... ماں...... اینا نے بے قراری سے ان کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ اس کی تصویر کو سینے سے لگائے ٹوٹتی ہوئی سانسوں میں کہہ رہی تھیں...... اینا مجھے معاف کر دو۔ میں مسٹر ولیم کے بغیر نہیں جی سکوں گی۔ اینا کو اپنی ماں کی کوئی بات سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی، انہوں نے محبت پاش نظروں سے اینا کو دیکھا، مسکرائیں اور پھر سکون سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اینا بے قراری سے اپنی ماں کو پکارتی چلی گئی۔ مسز ولیم جو اینا کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتی تھیں، آج اس کی آہ و زاریاں بھی انہیں گہری نیند سے جگا نہ سکیں۔

..........☆..........

شیلا

محمد حنیف

زبیر نے ڈرتے ڈرتے اِک انجانے خوف کے ساتھ انگشتِ شہادت کو کال بیل پر رکھ کر زور سے دبایا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر دیکھا ٹیرس پر کوئی کھڑا اُسے جھانک رہا تھا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

کوٹھی کے گیٹ کا در کھول کر ایک نوعمر لڑکے نے پوچھا۔

''جمیل صاحب سے ملنا ہے۔'' زبیر نے لڑکے کو جواب دیا۔

اسی اثناء میں ایک خوش شکل نوجوان ٹیرس پر آیا اور زبیر کو دیکھ کر خوشی کے ملے جُلے لہجہ میں بولا...... ''زبیر تم ٹھہرو میں آیا۔''

پھر قدموں کی تیز تر آواز سیڑھیوں سے قریب آتی محسوس ہوئی۔ جمیل نے دروازہ کھولا اور زبیر کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا...... ''شکر ہے ایک شہر میں رہتے ہوئے تمہاری شکل دیکھنے کو ملی۔'' اور پھر ہاتھ پکڑ کر کہا ''آؤ اندر کمرے میں بیٹھتے ہیں۔'' کمرے میں بیٹھ کر ملازم کو چائے لانے کا کہہ کر جمیل نے زبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ تم نے چہرے پہ بارہ کیوں سجا رکھی ہے؟''

زبیر تھوڑی دیر خاموش رہا اور دونوں ہاتھ کی انگلیوں کو آپس میں مروڑنے لگا۔ جس سے اُس کے اندر کی بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔

زبیر نے نظروں کو نیچی رکھتے ہوئے کہا...... ''میں بہت دنوں سے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اب حالات اس قدر پریشان کر دینے والے ہو گئے ہیں کہ تم سے بات کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں اور تمہاری مدد لینے آیا ہوں۔''

''کہو کہو تکلف کس بات کا۔'' جمیل نے ہنستے ہوئے کہا...... جمیل دیکھ رہا تھا، بات کرتے ہوئے زبیر کے ہونٹ ہی نہیں الفاظ بھی کانپ رہے تھے۔

زبیر نے کہنا شروع کیا...... ''تم تو جانتے ہو والد صاحب سیلف میڈ انسان تھے۔ انہوں نے ساری زندگی محنت کی اور جو کچھ کمایا اپنی محنت اور دیانت سے کمایا اور زیادہ تر ہماری تعلیم پر خرچ کیا۔ ایک پلاٹ تھا جو انہوں نے قسطوں میں لیا تھا جس کی

قیمت وقت کے ساتھ اب کافی بڑھ گئی ہے۔ والد صاحب کے فوت ہوتے ہی ایک عزیز بھی زبردستی حصہ دار بن گئے ہیں۔ یہ لوگ صاحب وسائل ہیں۔ جرائم والے ہیں۔ انہوں نے شادیاں بھی مضبوط گھرانوں میں کی ہیں۔ وہ ہمارے لیے عذاب بن گئے ہیں۔ وراثت ٹرانسفر کا فائل جن صاحب کے پاس ہے وہ دستخط نہیں کر رہا۔ اس کے سیکرٹری کو میری حالت اور بار بار چکر لگانے پر ترس آ گیا ہے۔۔۔ اس نے مجھے کہا ہے۔۔۔''

زبیر اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ضبط اور آنسوؤں سے اس کا گلا رندھ گیا۔

جمیل کو زبیر کی اس حالت پر دکھ ہو رہا تھا۔۔۔۔ زبیر جمیل کا سکول سے لے کر یونیورسٹی تک کا کلاس فیلو اور بہترین دوست تھا۔ انگلش میڈیم اور مخلوط اداروں میں پڑھنے کے باوجود زبیر انتہائی پاک طینت اور پاک نظر تھا۔ اس کو اپنی پڑھائی سے دلچسپی تھی جس میں وہ ہمیشہ ممتاز پوزیشن لیتا تھا۔ جمیل فطرتاً انتہائی شوخ طبیعت رکھتا تھا۔ یونیورسٹی میں لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے شوق نے اس کو تک بند شاعر بنا دیا تھا۔ دوست تفریح طبع کے لیے اور لڑکیاں چائے پیسٹری کی دعوت پر اُس کے شعر سنتیں اور داد کے ڈونگرے برساتیں، مذاق اڑاتیں اور جمیل خود بھی اس مذاق میں شامل ہو کر قہقہے لگاتا۔ جمیل کے بارے میں اساتذہ سمیت سب کی رائے تھی کہ یہ فطرتاً نیک غمگسار اور محفل سجانے کا شوق رکھنے والا مخلص نوجوان ہے۔ جمیل اور زبیر کی گھریلو اور معاشی زندگیوں میں بڑا فرق تھا۔ جمیل کے گھر کے بہو بیٹیاں پڑھی لکھی، ملازم پیشہ اور اُس سول سوسائٹی کے متحرک افراد تھیں جہاں ذاتی زندگی کا تصور اور انفرادی حقوق کی حد بلند ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک زمانے کے ساتھ چلنا کوئی فیشن نہیں بلکہ یہ تو ترقی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ زبیر جب بھی جمیل کے گھر جاتا تو اس کے گھر والے بہت اچھے طریقے سے ملتے تھے مگر زبیر وہاں جتنی دیر بھی بیٹھتا اپنے آپ کو احساسِ کمتری میں مبتلا محسوس کرتا تھا۔

جمیل ایک اچھی ملازمت، خوشحال گھریلو زندگی کے ساتھ مضبوط دوستوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتا تھا۔ جن میں نئے دولت مند خوشحال گھرانوں کے لڑکے، لڑکیاں رئیس زادے نوابزادے، نئے نئے اعلیٰ منصب حاصل کرنے والے نوجوان، این جی او، سول سوسائٹی، ماڈل ایکٹر، ترقی یافتہ معزز خوشحال خاندانوں کے لوگ جن کے بہن بھائی یورپ، امریکہ، مڈل ایسٹ وغیرہ میں بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازمت کر رہے تھے اور جنہوں نے کیپٹل سٹی میں جائیدادیں بنائی تھیں۔ ان میں ایسے پڑھے لکھے رومانوی مزاج نوجوان بھی تھے جن کا مقصد کسی بھی طریقے سے عہدوں اور دولت کا حصول تھا۔ جن کا نظریہ پانی کی مانند تھا کہ جس میں ڈالو وہی شکل بن جائے۔ جن کا کردار عام طور پر درباریوں اور جوکروں کی طرح کا ہوتا ہے۔ جمیل خود تو صرف سگریٹ پیتا تھا مگر اس کے حلقہ میں دوست چرس کا سگریٹ بھی پی لیتے تھے۔ وائن تو ان کے جسم کی اور پارٹیوں کی ضرورت تھی ہی۔ ان دوستوں کا ملنا جلنا کسی کلب میں، فور سٹار ہوٹل میں، فن فیئر کی تقریبات میں اور خاص موقع پر سارا سال چلتا تھا۔ جہاں دوست اپنی منگیتروں، دوستوں، بیویوں، کزنوں کے ساتھ آتے تھے۔ ایک بار جمیل نے ہنستے ہوئے بتایا تھا، تقریبات کے اختتام پر رات گئے واپسی پر کبھی کبھی جوڑے بدل بھی جایا کرتے ہیں۔ زبیر کو یہ بات اب بھی یاد تھی۔

جمیل نے اٹھ کر زبیر کے سر کے بالوں اور چہرے کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپایا اور کہا ''تم جو کہنا چاہتے ہو، بے جھجک کہو۔ گھبراؤ نہیں۔ جو بھی مسئلہ ہے، اس کو انشاء اللہ حل کر لیں گے۔'' زبیر نے ہونٹوں کی پپڑیوں پر زبان پھیرتے ہوئے اک لمحہ توقف کیا۔ جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا، پیا۔ آنکھوں کی الجھن چہرے کا رنگ اور الفاظ کی لرزش اندرونی دباؤ کی غمازی کر رہی تھی۔ نظروں کو فرش کی طرف پیوست کرتے ہوئے زبیر نے کہنا شروع کیا ''متعلقہ افسر کے پاس جاتے مجھے سال ہو گیا۔ جب

بھی جاتا ہوں، وہ مزید کوئی عذر لگا کر تاریخ دے دیتا ہے۔ مجھے چکر لگاتے اور میری حالت کو دیکھ کر اس کے سیکرٹری کو شاید ترس آ گیا۔ سیکرٹری نے بتایا...... صاحب بغیر پیسے کے کام نہیں کرتے یا پھر کوئی بڑی سفارش الا دیا پھر صاحب کی کھانے کی دعوت وغیرہ کر دو جس میں...... جس میں لڑکی کا ہونا ضروری ہے۔" زبیر نے جب بات ختم کی تو اس کی سانس دمے کے مریض کی طرح پھولی ہوئی تھی جو برف کے اونچے پہاڑ پر عریاں کھڑا ہے۔

جمیل کو زبیر کی پریشانی پر بڑا ترس آیا۔ جمیل نے زبیر کو دباؤ سے نکالنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا ...."میرے شہزادے! گھبراؤ نہیں، تمہارا کام ہو جائے گا۔ یہ کام کروانا اب میری ذمہ داری ہے۔ تمہارے جیسے لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ حرام حلال، غیرت بے غیرتی کے چکروں میں پڑ جاتے ہو اور جب کام نہیں ہوتے تو خودکشی یا خود سوزی کر لیتے ہو۔" زبیر نے سر جھکا لیا۔

"سیکرٹری نے بتایا تو ہوگا یہ آفیسر کس ہوٹل میں بیٹھتا ہے۔" جمیل نے پوچھا۔

"ہاں! سیکرٹری نے ہوٹل شیلٹن کا نام لیا تھا۔ ہفتہ کی رات کو وہ وہاں ضرور بیٹھتا ہے۔ اب اگر تم سفارش کروا دو گے تو میری مشکل کم ہو جائے گی اور بڑی مہربانی ہوگی۔" زبیر نے اٹھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

جمیل نے زور دے کر کہا کہ کھانا کھا کر جانا مگر زبیر کے انکار اور اس کی حالت دیکھ کر جمیل نے تسلی دیتے ہوئے اسے کہا "اس ہفتہ کو ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان میں شیلٹن ہوٹل میں آ جاؤں گا۔ تم وہاں ہونا، فائل ساتھ لے کر آنا، دل چاہے تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر کمپنی دینا یا لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پی لینا مگر اب پریشان نہیں ہونا، مطمئن ہو کر جانا ہے شاباش!"

ہفتہ کے دن زبیر ہوٹل شیلٹن کے گیٹ پر کھڑا جمیل کا انتظار کر رہا تھا۔ فور سٹار ہوٹل تھا۔ اس ہوٹل میں وہ بہت کم آیا تھا۔ کسی دوست یا عزیز کی شادی یا ولیمہ میں۔ مگر آج وہ اکیلا کھڑا دل میں عجیب خوف سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے آنے جانے والے لوگ صرف اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ ہوٹل میں آنے والے لوگ گاڑیوں سے گیٹ پر اتر رہے تھے اور گاڑیاں ان کے ڈرائیور پارکنگ کی طرف لے جا رہے تھے۔ تقریباً ۹ بجے جمیل کی گاڑی آ کر رکی۔ جمیل کے ساتھ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی جس کا لباس اور زیبائش جاذب نظر تھی۔ وہ گاڑی سے ایک ادا کے ساتھ اتری۔ جمیل نے زبیر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور زبیر سے لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ہمارے بہت اچھے دوست مولوی زبیر صاحب ہیں۔ میرے ساتھ سکول سے لے کر یونیورسٹی تک پڑھے ہیں اور عالم یہ ہے کہ شرافت کی وجہ سے اپنے جائز کام بھی نہیں کروا سکتے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے زبیر پر اک نگاہ ڈالی اور اپنا ہاتھ زبیر کی طرف بڑھا دیا۔ زبیر نے شرماتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

جمیل نے لڑکی سے مسکراتے ہوئے کہا "آج کا یہ ایڈونچر خوب رہے گا۔ دوست سنیں گے تو خوب انجوائے کریں گے۔ فنٹاسٹک اچیومنٹ۔" جمیل نے لڑکی سے ایک بار پھر مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تم نے بابے کے ساتھ جو کھانا کھانا ہے، اس کا بل بھی اس سے دلوانا ہے۔" لڑکی نے اک خاص ادا اور دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ سے کہا۔ اس کی آواز میں بھی اک ترنم اور کشش تھی۔

"جمی پلیز تم میرے آس پاس ہی رہنا، یہ بابے بڑے معصوم ڈاکو ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ بابے کس وقت کیا موڈ بنا لیں۔" جمیل اور لڑکی نے قہقہہ لگایا اور تینوں اکٹھے ہال میں داخل ہو گئے۔ ہوٹل کا ماحول روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں سے مہک

رہا تھا۔ ہر کوئی اپنی کیفیت میں مگن تھا۔ دھیمی دھیمی موسیقی تھی اور دودھیا روشنی نور بکھیر رہی تھی۔ قہقہوں کی جھنکار میں ساز و آواز کی آمیزش گھلی ہوئی تھی۔ زبیر نے سوچا، نیک لوگوں کو تو جنت مرنے کے بعد ملے گی مگر کچھ لوگوں نے اپنے لیے جنت کا بندوبست دنیا میں ہی بنا رکھا ہے۔ پھر وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا ایک ٹیبل کی طرف پہنچا جہاں دو صاحب بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے اٹھ کر زبیر سے ہاتھ ملایا، دوسرے شخص نے جو اپنے لباس سے اعلیٰ حیثیت کا لگتا تھا، سر اٹھا کر سرسری نظروں سے زبیر کو دیکھا۔ اُس آدمی کی شکل دیکھتے ہی جمیل کے ساتھ آنے والی لڑکی پر بدحواسی چھا گئی اور وہ گھبرا کر وہیں رک گئی۔ لڑکی کی اس اچانک گھبراہٹ سے جمیل اور زبیر دونوں پریشان ہو گئے۔ اعلیٰ حیثیت کے شخص نے جو اَب اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، لاشعوری طور پر اپنی ٹائی کی گرہ کو انگلیوں سے ٹھیک کرتے ہوئے لڑکی سے بولا ''شیلا بیٹی! آپ...... یہاں کیسے؟''



پچھل پیری اور میم صاحب

فرخ ندیم

''وہ دیکھو پچھل پیری......!''

''ہاں ہاں......ہنی جلدی چلو......ورنہ بچہ کمپنی ڈر کے مارے بے ہوش ہو جائے گی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو......میرے پیچھے پیچھے آؤ اور ایسا ناٹک کرو کہ پچھل پیری کے پیر سیدھے ہو جائیں۔''

''یو ڈونٹ وری ڈیئر......آج سے یہ تماشا بند سمجھو۔''

''ہا......ہا......ہا......اور ہمارا ناٹک شروع۔''

بھرے بازار کی پرسکون زندگی میں ایک ہنگامہ خیز شور گرد آلود بگولے کی طرح گھومتا اور مقامی تجارت کی خاک اڑاتا ہے۔ قریبی سکولوں میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بچوں کی چیخیں ہر خاص و عام کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ دکاندار، راہگیر اور اردگرد کام کرنے والے بھی بھاگتے ہوئے اس چھوٹے سے چوک میں پرانے بوڑھ کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں جہاں ایک پچھل پیری سفید اور شرپسند دانت کچکچاتے ہوئے اپنی سانسیں بحال کر رہی ہے۔ ماحول پہ ایک ملگجا پن طاری تھا جو اب تشکیک کے رنگوں سے ملتا ہوا بازار کے در و دیوار پہ ایسے پھیل جاتا ہے کہ روایتی پھیکے پن کو حیرت کا لباس پہنا دیا گیا ہو۔ تین چار سو سال پرانے قصبے کے اس بازار سے کئی کھیل تماشے اپنے سوالیہ نشان چھوڑ کر گزر چکے ہیں۔ پہلے کی طرح آج بھی لوگ تجسس کی پیاس بجھانے پرانے برگد کی چھاؤں تلے ڈیرے ڈال رہے ہیں۔ ان کو تو تبدیلی چاہیے تھی، چاہے وہ ایک آدھ گھنٹے ہی کی کیوں نہ ہو۔

پیٹ کی آگ سے مجبور پچھل پیری بے خبری کی بُکل مارے برگد کی ننگی موٹی جڑوں پہ بیٹھی ہے۔ کوئی ڈرے یا مرے......تیوریاں چڑھائے یا چیخیں مارتا بھاگ جائے......ایندھن لے کر گھر جانا ہے......پاس ہی ایک بوسیدہ سی چادر پڑی ہے۔ جو سمجھدار ہیں وہ کچھ نا کچھ پھینکتے جا رہے ہیں۔ جو نہیں وہ ان کی نقل میں ایسا کر رہے ہیں۔ بازار کی آنکھیں کوئی نیا حیرت کدہ نہیں۔ اس کے گرد دائروں میں لوگ جمع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہر طرح کے، بچے، بوڑھے، جوان، جان انجان......اس لیے وہ آگے بڑھتے ہوئے جسموں اور ان کی نظروں سے بالکل بھی پریشان نہیں۔

''مگر یہ دو کون ہیں......؟''

مخالف سمت سے جواب گرجتا ہے، خبردار......!!!

پچاس ساٹھ کھوپڑیاں ایک ساتھ یوں گھومتی ہیں جیسے کسی نے عقب سے وار کیا ہو۔

"تم چڑیل کا بچہ اگر اپنی جگہ سے ہلا تو ہم گولی مار دے گا۔"

پچھل پیری نے زمین پر ہاتھ پاؤں پٹخے، بالوں کو دائیں بائیں جھٹکے دیے، بڑھکیں اور چیخیں ماریں، رانوں اور تختہ چھاتی پہ دو ہتھڑیں ماریں، بڑی چڑیلی چالیں چلیں مگر وہ دونوں کسی نوآبادی چارٹر کی تکمیل میں اس کے گرد دائرے کھینچتے چلے گئے۔

پچھل پیری نے ایک بھرپور جست لگائی مگر لڑکے نے جلدی سے اس کی چادر اُتار دی اور گلے میں ڈال کر تیزی سے بل دینے لگا۔ پچھل پیری کا سانس پھولنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کسمسانے اور کلبلانے لگی۔ مارے حیرت اور تکلیف کے اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ تماشائیوں کی طرح اسے بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

جب اس پر مکمل قابو پا لیا گیا تو سب سے پہلے لڑکی نے اس کے نقلی کان اور بال اتارے، پھر حیرانی سے بولی:

"ہائیں یہ تو برکت مراثی ہوتا......"

برکت نے ہاتھ جوڑ کر اور تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا "ہاں میں برکت مراثی ہوں، پر شاہ جی اپنا تعارف وی کراؤ۔"

میم صاحب کی طرف مڑی اور بایاں پاؤں زمین پر پٹختے ہوئے پوچھنے لگی:

"ہنی ہم شاہ ہوئے......؟"

"Y not ڈارلنگ...... جو بھی شاہ ہوتا ہماری ٹرح گورا چٹا ہوتا، گورے گورے کام اور گوری گوری باتیں کرتا۔"

میم پچھل پیری کو تہہ در تہہ کھولتی ہوئی پوچھنے لگی "تو آج ہم گوروں والے کام کریں گے؟"

"Yes, Yes مائی ڈارلنگ، ہم وقت کا بادشاہ ہوتا جو دل میں آئے...... کرنے گا۔"

دانتوں کے بعد پیروں سے کٹے بھاری بھاری پاؤں اور پھر دُم۔ ایک ایک چیز اتارنے کے بعد میم لوگوں کو ایسے دکھاتی جیسے گاؤں میں عورتیں بَری دکھاتی ہیں۔ ہر بار لوگ تالیاں بجا بجا کر داد دیتے اور اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سب برکت مراثی کو جانتے ہیں جو آئے دن کسی نئے بہروپ میں گلیوں، بازاروں کا چکر کاٹتا اور اپنے مداحوں سے پانچ دس روپے کی داد وصول کرتا یا پھر شادی بیاہ کی محفلوں میں غزلیں گا کر اپنے سُریلے ہونے کا ثبوت دیتا۔ جہاں کہیں بھی دو چار لوگوں کا اکٹھ دیکھتا، بغل سے چِمٹی یا ڈھولک نکالی اور سُروں کے ساتھ وہ مکھڑے سنائیاں انترے نکلے کہ اُستادوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

پہلی بار جب وہ پچھل پیری کے ناٹک کی ریہرسل کرنے لگا تھا تو بے چین سا نظر آیا۔ اس چڑیل کو اُس نے زندگی میں کہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک وہم کو تجسیم کرنا یا کسی بھیانک سانچے میں اپنے وجود کو ڈھالنا بڑا مشکل عمل تھا مگر برکت فن کی سنجیدگی سے لاعلم نہیں تھا۔ اسی فن میں اسے سہولت بھی تھی کیونکہ اس نے بارہا اپنے آباؤ اجداد کو اس روپ میں ڈھلتا دیکھا تھا۔ وہی نقلی چادر، بال، لمبے لمبے دھاگوں والی گچھے دار دُم اور وہی پھٹے پرانے ٹائروں والے جوتے جو وہ خود کبھی نہ پہنتا۔ ہمیشہ بیوی بچے ہی دربانوں کی طرح صاف کر کے پہناتے۔ کسی مذہبی رسم کی ادائیگی سے کم نہ تھا اس کے بچوں کا اس وقت اس کے پاس رہنا۔

اس چلتے پھرتے ڈرامے کا مرکزی کردار ہونے کے ناطے وہ بہروپ کی سجاوٹ اس لگن سے کرتا کہ کبھی کبھی تو اس کی بیوی بھی آنکھیں جھپک کر پوچھتی 'برکتی جی! اے تُسی او......؟' جواب میں برکت سونے کا دانت نکال کر ہنستا تو وہ پھر کہتی "تسی تے جی واقعی ڈرامے چہ برکت پا دتی اے۔" لیکن وہ اپنی مسند سے ہلے بغیر گرم گرم چائے کے ساتھ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا، کھانستا اور ناٹک کے پلاٹ میں گم ہو جاتا جیسے خود ساختہ زندگی کے حق میں فیصلہ کر چکا ہو۔ اپنی زندگی میں برکت نے کئی فیصلے کیے اور یہ فیصلے برکت کا گھر کمزور کرتے چلے گئے۔ جس دن وہ کچھ کما کے آتا، اس دن کئی یار دوست اس کے پاس

بیٹھے سگریٹ پیتے، برکت کی جوانی کے دور کے گانے گاتے اور چائے پکوڑوں پہ برکت کے لازوال فن کی داد دیتے۔ میلوں منڈیوں کے دنوں بھی حالات کچھ ایسے ہی رہتے کیونکہ برکت بس بہروپ ہی میں رزق تلاش کرتا۔ اس کے کئی رشتہ دار لاہور جا کر قوال، گویئے یا سٹیج کے فنکار بن چکے تھے۔ جو یہاں تھے وہ بھی میلوں منڈیوں میں رانس لگا کر اچھی خاصی کمائی کر لیتے۔ انہی دنوں برکت چھوٹا موٹا تماشا کرتا اور جب بیس پچیس روپے جیب میں آ جاتے تو اس کے کھبے ہاتھ میں خارش شروع ہو جاتی۔ اب تو بھائی بندوں نے بھنگ اور چرس بھی شروع کرا دی تھی۔ گھنٹوں سوئے رہنا، اٹھنا تو دوستوں یاروں میں گپیں ہانکتے رہنا ہی اسے اچھا لگتا۔ اس کی بیوی دبے لفظوں اس کی کاہلی اور کام چوری کی شکایت کرتی مگر یہاں بھی برکت کی ڈرامہ بازی جیت جاتی اور گھر کے برتن اکثر خالی ہی رہتے۔ بس اپنے روپ بہروپ میں مگن برکت اس ادراک سے دور ہی رہا کہ گرد و پیش بھی کروٹ کروٹ زندگی بدلتی ہے۔

بڑا بیٹا بڑے انہماک سے اس کردار کو چڑیل میں ڈھلتے دیکھتا اور سوچتا کہ کارخانوں کی دنیا میں کوئی مشین ایسی تو ہوگی جو مراثیوں کا روپ بدل دیتی ہو۔ اس کا نام پپو ہے۔ پپو مراثی کو ماحول میں ہر شے بدلنے کا شدت سے احساس ہے۔ پھیلتی ہوئی منڈیوں میں جو اناج مقرر کیا جا رہا تھا، پپو مراثی سمیت اس سے ہر شخص آگاہ اور بے چین تھا مگر مراثیوں کے دروازے پہ لٹکتی بوسیدہ دری برکت کی طرح ہر قسم کے تفکر سے بے نیاز وہیں کی وہیں تھی۔ ہر روز پپو میراثی گلی سے گزرتی ہوئی بھرپور زندگی کو بوسیدہ دری کی طرح سکڑتی ہوئی فنی میراث سے تقابلی موازنہ کرنے کے لیے بیرونی دیوار پر کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو جاتا۔ خاکی پتلونوں اور نیلی قمیضوں میں ملبوس چست و چالاک اُجلے اُجلے جسموں کو سائیکلوں، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں میں اور گھر کے پاس سے گزرتے دیکھتا تو محرومیوں کے بوجھ سے دیوار سے گرتا محسوس کرتا۔ چکرا جاتا اور اپنے گھر کو شہر سے دور ہٹتا محسوس کرتا۔ بائیں طرف چھوٹا بھائی دلبر ننگے پاؤں باقر خانی کھاتا یوں گھر کی طرف پلٹتا جیسے ہاتھ میں باقر خانی نہیں بلکہ وقت کا پہیہ ہو۔

وقت گزرنے کے ساتھ وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ سارا علاقہ مراثیوں کے گھر کو عجیب اور اجنبی نظروں سے دیکھتا ہے اور ایک دن وقت کے اٹل فیصلوں کے سامنے برکت کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔ بچوں کے سوالات سے گھبرا کر اسے کہنا پڑا کہ تم بڑے ہو جاؤ گے تو ہر شے بدل جائے گی۔

اور آخر وہ دن بھی آ گیا۔

......جب ہر شے بدل چکی تھی۔ دونوں لڑکے بڑے ہو چکے تھے اور برکت کے چڑیل پن کو احتساب کی عدالت کی طرف گھسیٹنے لگے تھے۔ خود ساختہ دنیا کی کھوٹ واضح ہونے لگی تو پہلی دفعہ برکت کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر کی چچھل پیری کھٹی میٹھی ہوتی، جسم کے اندر ہی چھپنے لگی ہے اور باپ سامنے آنے لگا ہے۔ گزشتہ سالوں میں لڑکوں نے ماحول سے کیا سیکھا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ کتنے ڈرامے، کتنی فلمیں وہ دیکھ چکے تھے جن کا نچوڑ اُن کی حرکتوں اور جگتوں سے ٹپک رہا تھا۔ کس طرح کماتے اور کیسے اڑاتے ہیں اس پر برکت کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر آج شام جگتوں کے نشتر اس کی کھال میں چھید کرنے لگے تو وہ پہلے ہنسا پھر پریشان ہوا اور پھر ایسا ڈرا کہ کچھ کھائے بغیر بستر پر لیٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چچھل پیری اوڑھ کے سوجاتا اس کی نظر ڈھلتی شام پر پڑی۔ کبوتروں کی حواس باختہ غٹرغوں چھت سے اتر کر اس کے اعصاب پر پھڑ پھڑانے لگی۔ بے چینی بال نوچنے لگی تو آنکھیں الٹ کر اپنے اندر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ پورے جسم کی کایا پلٹ چکی تھی۔ لمبی اور تاریک غاریں جن میں سیاہ بال اُگ چکے تھے، اس کو کھینچتے ہوئے اس کھنڈر میں لے گئیں جو کبھی اس کا گاؤں ہوا کرتا تھا۔ تقریباً سبھی دروازے کھٹکھٹائے مگر کہیں سے کوئی جواب

نہ ملا۔ اس نے گاؤں کے قبرستان جانا چاہا تا کہ پُرکھوں سے اپنے کھوئے ہوئے سوالوں کے جواب لے سکے۔ شکستہ ماضی میں مدفون وقت سے والہانہ محبت اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگی۔ ملبے تلے موسیقی کے ٹوٹے ہوئے آلات سُر بکھیر نے لگے تو بے اختیار اُس نے گانا شروع کیا:

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار

واہ واہ کی داد نے اسے چونکا دیا۔ آنکھیں پلٹ کر دیکھا تو چھوٹا بیٹا کبوتروں کا آلا بند کرتے ہوئے واہ واہ کر رہا تھا۔ ماں بڑے کو چولہے میں لکڑیاں جلانے کے لیے پکار رہی تھی مگر وہ کمرے میں اپنی ہی دنیا کا نقشہ پھیلائے کوئی واضح ٹھوس اور جامع حکمتِ عملی ترتیب دے رہا تھا۔ بڑے کے پیچھے پیچھے چھوٹے نے بھی کمرے کا رخ کیا اور دونوں مل کر آنے والے کل کے خواب بُننے لگے۔ گارمنٹس سے خریدے ہوئے ریڈی میڈ کپڑے اور کاسمیٹکس سامنے پھیلائے گئے۔ دلبر ماں کی طرح گوری رنگت اور تیکھے نقوش سے فطری طور پر سجا تھا۔ لباس پہن کر آئینے کے سامنے آیا تو اس کی اپنی ہی چیخ نکل گئی۔ پپو پیچھے سے اس کو خبردار کرتے ہوئے بولا ''ابھی نہیں...... دیکھتا جا...... ابھی تو وگ پڑی ہے...... پمپی شوز اور پایلیا...... شور مچائے نیند اُڑائے......''
(پُرمعنی انداز سے گاتا ہے)

برکت ان کی کھسر پھسر سنتے ہوئے چارپائی سے بولا۔

''اوئے تم لوگ کوئی نیا چن نہ چاڑھ دینا۔''

اندر سے نسوانی اور تیکھی سی آواز آئی:

''اب تُم ہمارے آئٹم ڈیکھے گا...... ایک ڈم پٹاخہ۔''

دوسرا بڑبڑاتے ہوئے بولا:

''اب ایسی فنکاری ہوگی کہ پوری برادری میں زندگی تھرکتی دھڑکتی نظر آئے گی۔ اس سے کیا ملتا ہے۔ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں......''

چارپائی پہ لیٹے لیٹے برکت نے ان کی ماں سے پوچھا ''یہ کس چیز کی نشانیاں ہیں......؟''

''قیامت کی۔'' جواب ملا۔

کمرے سے آواز آئی ''ہمارے دھندے میں دخل نہیں دینے کا......''

''ہاں۔''

''ورنہ......''

''خلاص۔''

اور کمرہ منہ سے بجنے والے طبلے کے ساتھ ''شام ہے دھواں دھواں'' کی میزبانی کرنے لگا۔

آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل تیر رہے تھے۔ دونوں میاں بیوی ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو ایک ایک کر کے بادلوں میں چھپتے دیکھتے ہیں۔ ریہرسل کے بعد لڑکے اپنی اپنی چارپائیوں کا رخ کرتے ہیں۔ برکت ستاروں کو بادلوں میں چھپتا دیکھتا ہے اور ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا ہے۔ لڑکے آنکھوں میں امید کی کروٹیں بدلتے ہیں۔ ان کی ماں خوش بختی کی منتیں مانگتی سو جاتی ہے۔ برکت پھر پچھل پیری کے اندر کوئی نیا برکت ڈھونڈتا ہے۔ اس کے بعد سناٹا صحنوں میں کروٹیں بدلتا ہے۔ کچھ دیر بعد بڑے اسٹیشن

سے چلنے والی ریل گاڑی سکوت کا سینہ چیرتے ہوئے مراثیوں کے پچھواڑے سے گزرتی ہے اور ایک کھڑ کھڑانے والی صبح کا پیغام دیتی ہے۔

دن بارہ بجے کا وقت تھا جب برکت چنچل پیری کے روپ میں بازار پہنچا تھا۔ ہجوم کے درمیان اس کی خاموشی کسی احساسِ گناہ کی خبر دے رہی تھی۔ اعتراف کی صورت میں لمبے بالوں سے پسینہ نچڑتا ہوا پاؤں پر گرنے لگا۔ جب خفت گلا دبانے لگی تو اس نے چادر پکڑ کر الٹی طرف موڑنا چاہا مگر کمپنی بہادر کی گرفت سے آزادی مشکل تھی۔ منت سماجت کے باوجود کمپنی بہادر کا علاقہ اور ارادے نہ سمجھ سکا۔ اپنی ساری طاقت اکٹھی کر کے اس نے چادر کی گرفت ڈھیلی کی اور چلا کر پوچھنے لگا:

''گوراشاہ جی میری روٹی روزی کا مسئلہ ہے!! اور تم لوگ سرِ بازار میری عزت اور میرے فن سے کھیل رہے ہو۔''

بڑی حیرانی سے میم نے اس کی طرف دیکھا اور ایک آنکھ سے عینک کا لال شیشہ اٹھاتے ہوئے بولی:

''اس ٹرح کی روٹی روزی میں اسی ٹرح کا عزت ہوتا ہے۔''

''مگر تم لوگ کون ہو.....؟''

''فن کے بادشاہ.....''

''میرے اڈوں پر ناجائز قبضہ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو.....؟''

کمپنی بہادر میم سے کہنے لگے۔

''ملکہ عالیہ فنکاروں کا بوڑھا سردار آپ سے کچھ سوال کر رہا ہے۔''

''یو اولڈ چڑیل.....تم کو پتہ نہیں.....؟؟ ہم نئی نئی منڈیاں تلاش کرتے ہیں اور اپنے فن کے زور پہ اپنا سکہ جماتا ہے۔ ابھی ہمارے فن اور ہاتھ کی صفائی کا کمال ڈیکھو۔''

پھر وہ ہجوم کی طرف مڑی اور اونچی آواز میں پوچھنے لگی۔

''ٹماشا ڈیکھوگے؟''

ہر طرف سے جواب آیا:

''ہاں دیکھیں گے۔''

''ہاں ابھی ڈیکھو، ٹمہارے سامنے فن کے بادشاہ کا فن کیسے خلاس ہوتا ہے..... یو کریزی گائز..... ایسا ٹماشا کہ ٹم لوگوں کے ہوش اڑ جائیں گے۔''

''ہاں ایسا ہی ٹماشا ڈیکھیں گے.....'' (چند منچلے نوجوانوں نے بڑی معصومیت سے میم کے سانگ لگاتے ہوئے کہا)

''ٹو پہلے میری ایک شرٹ، اس پاپی پیٹ کی خاٹر پانچ ڈس روپے کی بات ہے۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے..... ہمارا خون پسینہ ایک ہوگا..... برکٹ ناٹک کرے گا..... چنچل پیری کا..... وہ بھی آخری بار..... ڈھولک کی تھاپ پہ..... ڈانس کروں گی میں..... مگر پہلے پانچ ڈس روپے۔''

ہر طرح کی جیب سے آواز آنے لگی۔

''منظور ہے..... منظور ہے۔''

کمپنی بہادر نے برکت کی ڈھولک جو بوڑھ کی جڑوں پہ پڑی تھی، اٹھا کر گلے میں لٹکالی اور دونوں طرف سے وہ ہاتھ

مارے کہ برکت کے ذہن کی سبھی گتھیاں سلجھ گئیں۔ ڈھولک کے شور میں اس نے تماشائیوں سے مخاطب ہو کر کہا" دیکھو اپنی چھل پیری کے کرتب اور میم صاحب کا ڈانس۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔۔۔ تو ان ون..... تو سب مل کے گاؤ

نصیب ساڈے مار مار کے

مرگئی چھل پیری

برکت دنیا دی

ہر گئی چھل پیری"

تماشائیوں کے چہروں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی دیوتا کی خوشنودی کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں یا کسی بزرگ ہستی کے نورانی چہرے کی زیارت کے لیے دیہاتی دائروں میں کھڑے ہوں اور یا پھر کسی عرس میلے پہ دھمال یا رہس دیکھ رہے ہوں۔ میم صاحب کے تھرتھراتے بدن کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ ایسا ناٹک.....!! برکت تو چکرا گیا۔

کمپنی بہادر نے چادر کے بل نرم کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ برکت دیکھ..... دنیا بدل چکی..... پیسہ کمانے کا انداز بھی..... اب..... آخری بار..... ان لوگوں کو چھل پیری کا ناٹک کر کے دکھاؤ۔"

برکت نے چادر اوڑھی، بالوں کو جھٹکا دے کر ہو گیا، منہ پہ الٹی سیدھی تیوریاں چڑھائیں اور چڑیلوں کی طرح گھٹنوں کے بل چل کر ہجوم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانچ، دس روپے لیتا اور بھاگ لگے رہن کہتا گیا۔ پھر یکدم کمپنی بہادر نے ہاتھ بلند کیے اور زور سے چیخا "خاموش۔" جب سب خاموش ہو گئے تو گورا صاحب نے میم سے آہستہ سے پوچھا "اب برکت کا کیا بنے گا؟"

"خلاص۔" میم نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔

"You mean کالے پانی کی سزا؟؟؟"

"Yes ہاں Yes۔"

میم صاحب نے بڑے سُریلے انداز میں کمپنی بہادر کے ساتھ مل کر گانا شروع کیا۔

"میرے پیا گئے رنگون

وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون

تمہاری یاد ستاتی ہے۔"

دائرے میں ڈانس کرتے ہوئے میم دس بیس روپے کے نوٹ پکڑتی گئی..... پھر دونوں برکت کو کھینچتے ہوئے قطاروں سے باہر نکلنے لگے۔ ہجوم نے تالیاں بجا بجا کر پتلی چھل پیری کو رخصت کیا۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں سوالیہ نشان کھٹکنے لگے..... مگر اس سے پہلے..... تینوں نقطوں کی طرح معدوم ہو چکے تھے۔

..........☆..........

ندیا دھیرے بہو

سلمیٰ افتخار صدیقی

سارے دن کے کام سے تھک کر میں نے ٹی وی آن کیا تو اس پر بڑا ہی بیکار ڈرامہ آ رہا تھا۔ کسی بھی چینل پر کسی اچھے پروگرام کا شیڈول مجھے یاد نہیں آیا، لہٰذا میں نے انگلش فلموں والا چینل لگا لیا۔ کوئی فلم ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ نام گزر چکا تھا، بہرحال میں نے دیکھنا شروع کر دی۔ کسی شہر کے مضافات میں ایک چھوٹا، پیارا سا گھر تھا۔ ایک عام سی فیملی تھی، میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل۔ بظاہر ایک ہلکی پھلکی سی فلم نظر آ رہی تھی، لہٰذا میں نے وہی چینل فکس کر دیا اور اطمینان سے صوفے پر لیٹ گئی۔ توقع تھی کہ کسی معاشرتی مسئلے پر کوئی اچھی کہانی والی فلم ہوگی۔ شروع کے مناظر ایسے ہی تھے بیٹی۔ کی عمر کوئی سولہ سترہ سال تھی جبکہ بیٹا سات آٹھ سال کا تھا۔ بیٹی کا نیا نیا رزلٹ آیا تھا۔ اس کی نمایاں کامیابی اور پسند کے کالج میں داخلہ ملنے پر سب بے حد خوش تھے۔ گھر والے چند دن بعد اس کے دوسرے شہر میں کالج کے ہوسٹل جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ مبارکباد کے فون آ رہے تھے اور ایک متوسط فیملی کی اپنے بچوں کی کامیابی کی مسرت گھر کی ہر بات سے عیاں تھی۔ ایسے میں بچی نے ہوسٹل جانے سے پہلے اپنی دوست سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جس کا گھر کچھ فاصلے پر تھا۔ یورپی ملکوں میں مضافاتی علاقوں کے مخصوص، کھیتوں اور میدانوں کے درمیان بے حد کھلی چوڑی سڑکوں والے، ماحول میں ہلکا پھلکا سادہ لباس پہنے بچی اپنی سائیکل پر روانہ ہوئی۔ سڑک بہت چوڑی ہونے کے باوجود نہ تو اس نے رفتار بہت تیز کی نہ ہی سڑک کے درمیان میں سائیکل چلانے کی کوشش کی۔ بے حد مہذب اور پرسکون انداز میں وہ سڑک کے کنارے سائیکل چلاتی رہی۔ سڑک پر نہ تو رش تھا نہ ٹریفک کی بہتات۔ اکا دکا گاڑیاں مناسب رفتار سے گزرتی رہیں۔ اچانک سامنے سے ایک تیز رفتار گاڑی آتی دکھائی دی۔ سڑک پر ایک موڑ تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور نے بالکل نزدیک پہنچنے پر موڑ کو دیکھا۔ اچانک موڑنے کی کوشش میں گاڑی بے قابو ہو کر سائیکل سے ٹکرائی اور بچی کو روندتے ہوئے سڑک کی سائیڈ پر اتر گئی جہاں اس کا پہیہ ایک گڑھے میں پھنس گیا۔ ڈرائیور کو ہلکی سی چوٹ آئی۔ پولیس موقع پر پہنچی۔ بچی کو ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ رستے ہی میں جاں بحق ہو گئی۔ پولیس نے رپورٹ درج کی۔ گاڑی چلانے والے کے خلاف مقدمہ چلا۔ دراصل تمام فلم ہی مقدمے کے بارے میں تھی۔ شروع کے واقعات صرف مقدمے کا پس منظر تھے۔ گواہیاں، شہادتیں اور بحث۔ کافی بور فلم تھی۔ گاڑی کا مالک جو خود گاڑی چلا رہا تھا، خاصا دولت مند اور معتبر شخص تھا۔ اہم عہدوں پر کام کرتا رہا تھا۔ اس کے بارے میں سب نے یہی گواہی دی کہ اس سے کسی غیر ذمہ دارانہ رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنے تمام فرائض احسن طریقے سے نبھائے۔ اپنے کیریئر میں کامیابی حاصل کی۔ کسی کو

بھی اس کے رویئے سے کسی قسم کی شکایت نہیں تھی۔ وہ ایک ذمہ دار شوہر اور محبت کرنے والا باپ تھا۔ کئی سماجی تنظیموں کا ممبر تھا یا ان کے اہم عہدوں پر فائز تھا۔ سماجی اور سیاسی حلقوں میں جانا اور پہچانا جاتا تھا اور معاشرتی بہبود کے کسی پراجیکٹ میں اس کی شمولیت پراجیکٹ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ تمام شہادتیں سننے کے بعد جیوری کے ممبران کی متفقہ رائے تھی کہ حادثے کے لیے اسے قصوروار نہیں گروانا جاسکتا۔ ان کے خیال میں غلطی یقیناً بچی کی تھی جس نے غالباً بارش نہ ہونے کے باعث سائیکل چلانے میں بے احتیاطی برتی اور نتیجتاً حادثے کا شکار ہوگئی۔ گاڑی کے مالک کو بری کر دیا گیا۔ مقدمہ ختم ہوگیا۔ بس صرف بچی کا باپ سکون سے نہ بیٹھ سکا۔

بچی کے گھر والوں کو پورا یقین تھا کہ ان کی بچی اتنی ذہین اور سمجھدار تھی اور انہوں نے اس کی تربیت اتنے اچھے انداز میں کی تھی کہ وہ اس قسم کی غلطی کی مرتکب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ان کے ہمسائیوں کا بھی یہی کہنا تھا کہ بچی نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کے باعث اس سے ایسی غلطی کی توقع رکھی جاتی۔ نہ ہی ڈرائیور اپنے بیان سے اس کی کوئی غلطی ثابت کر سکا، سوائے یہ کہنے کے کہ لڑکی اچانک ہی سامنے آ گئی تھی۔ سڑک کے موڑ کے باعث یہ بات سمجھ میں تو آتی تھی کہ گاڑی اچانک موڑنے کی کوشش میں بے قابو ہوگئی ہوگی لیکن اس بات کو ثابت کرنے کا کوئی طریقہ سامنے نہیں آ سکا۔

بچی کے والد نے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کیں اور اپنے طور پر تفتیش میں مصروف رہا۔ امریکا کی جس کاؤنٹی کا یہ قصہ تھا، وہاں کے قانون کے مطابق دو پیگ سے زیادہ شراب پی کر ڈرائیو کرنا جرم تھا۔ ایسے معاشروں میں جہاں شراب حرام نہیں سمجھی جاتی اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی طرح استعمال ہوتی ہے، وہاں نشے کی حالت سے محفوظ رہنے کے لیے شراب کی مقدار متعین کی جاتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ دو پیگ والا قانون پورے امریکا میں ہو۔ بہر حال تفتیش اس پہلو سے شروع ہوئی کہ ڈرائیور اس دن کہاں کہاں گیا تھا اور حادثہ کے وقت اس نے کتنی شراب پی ہوئی تھی۔ تمام واقعات یہی ثابت کر رہے تھے کہ ڈرائیور نے ڈرائیونگ سے پہلے دو پیگ سے زیادہ شراب نہیں پی تھی۔ بچی کے باپ نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر اس بات کا ثبوت مل گیا کہ حادثہ کی جگہ سے گزرنے سے پہلے ڈرائیور اپنے کسی دوست کے ہاں رکا تھا جہاں موجود دوسرے لوگوں کا ساتھ دیتے ہوئے اس نے مزید دو پیگ پیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ حادثے کے وقت وہ شراب کے چار پیگ پیے ہوئے تھا۔ اس ثبوت کے ملتے ہی صورتحال تبدیل ہوگئی۔ مقدمہ ری اوپن ہوا۔ ثبوت پیش کیے گئے اور کار کے مالک ڈرائیور کو سزا ہوگئی۔ سزا اناؤنس کرتے ہوئے جج نے ایک فقرہ کہا جو جانے کیوں میری یادداشت کے کسی گوشے میں محفوظ ہوگیا۔ اس نے معتبر اور متمول مجرم سے کہا "At a certain point in your life, you stopped caring." واہ! میں نے سوچا "You stoped caring" کیا بات ہے! You just stopped caring۔ بھئی یا انسان Care کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ You stopped caring عجیب ہوتی ہیں یہ انگریزی فلمیں بھی۔ ایک تو اس قدر بور کہ سوائے حادثے اور مقدمے کے اس میں تھا ہی کچھ نہیں۔ نہ رومان، نہ مزاح، مار دھاڑ نہ کار ریس حتیٰ کہ کپڑے بھی تمام لوگوں نے پورے اور مناسب پہنے ہوئے تھے۔ پھر نتیجہ بھی نکالا تو کیا کہ The Criminal had just stopped caring at some point in time اپنے وقت کا ماتم کرتے ہوئے میں نے ٹی وی بند کیا اور سونے چلی گئی۔ جانے کیوں میں نے دو گھنٹے برباد کیے۔ جلدی سو جاتی تو اچھا تھا۔ اگلے دن ڈھیروں کام کرنے تھے۔

گارڈن ٹاؤن آفس، اس کے بعد اردو بازار، پھر گھر اور شام کو ابو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا اور اس پر لاہور کی ٹریفک، خدا کی پناہ۔ اس قدر رش اور اندھوں کی طرح ڈرائیو کرتے ہوئے لوگ۔ اس پر صبح اور دوپہر کے وقت سائیکلیں چلاتے سکولوں کے بچے اور موٹر سائیکل پر جاتے طلبہ جنہیں سڑک کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ جانے لوگ بچوں کو کس طرح کی تربیت دیتے ہیں؟ مجھے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد آ گیا۔ میں فیروز پور روڈ کی ایک ذیلی سڑک پر جا رہی تھی۔ ارد گرد رہائشی مکانات تھے۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ گاڑی کی رفتار نہ بہت ہلکی تھی نہ تیز۔ بائیں جانب ایک مکان کا گیٹ اندر کی جانب کھلا ہوا تھا، لہٰذا نظر نہیں آیا۔ اچانک ایک چھ سات سالہ بچہ سائیکل پر سوار اندر سے برآمد ہوا۔ وہ موٹر سائیکل کے لیے اپنے گھر کے گیٹ پر بنے ہوئے سلائیڈ پر سے اتنی تیزی سے پھسلتے ہوئے اتر کر میرے سامنے آیا کہ اگر میں پوری طاقت سے بریک نہ دباتی تو یقیناً اس کی سائیکل میری گاڑی سے ٹکرا جاتی۔ یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ میرے اوسان بحال رہے اور میں گاڑی روکنے میں کامیاب ہوئی البتہ وہ بچہ میری جانب اس طرح غصّے اور ملامت سے دیکھتا ہوا رخصت ہوا جیسے قصوروار میں تھی کہ اس کے رستے میں آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ گاڑی سے اتروں اور اسے اس زور کا تھپڑ لگاؤں کہ اسے تمام عمر یاد رہے۔ ساتھ میں اس کے گھر جا کر اس کے گھر والوں کو بھی کھری کھری سناؤں۔ لیکن پھر یاد آیا کہ میری بہن جو ہسپتال میں داخل تھی، میرا انتظار کر رہی ہوگی اور میں وقت ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ میں گاڑی بھگاتی ہوئی ہسپتال پہنچی۔ مسائل، مصروفیات اور اس پر لاہور کی ٹریفک۔ بعض اوقات اپنے حواس بحال رکھنا ناممکن محسوس ہونے لگتا تھا۔ آفس، گھر کی روزمرہ ضروریات کی شاپنگ، ڈاکٹر، ہسپتال، عدالت میں پراپرٹی کا جھگڑا، وکیلوں سے رابطہ، پراپرٹی ڈیلر سے بات چیت، گاڑی اچانک بند ہو جانے پر ورکشاپ لے جانا، سروس کے دوران لاء کی شام کی کلاسز اور مردوں کے اس معاشرے میں باہر نکلنے والی تمام خواتین کو قدم قدم پر پیش آنے والی صورتحال کی ساری کوفت۔ پر میں کون سا ایسے حالات سے گزرنے والی واحد خاتون ہوں۔ مجھے اچانک وہ خاتون یاد آ گئی جس کی بیٹی کے دائیں ہاتھ کی انگلی کسی حادثہ میں کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ وہ بیٹی کو گود میں اٹھائے اور کٹی ہوئی انگلی ہاتھ میں تھامے پاگلوں کی طرح بھاگ رہی تھی کہ اتنی دیر نہ ہو جائے کہ انگلی جڑ ہی نہ سکے مگر اسے کوئی ڈاکٹر نہیں مل رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر سب ہی پریشان ہو گئے تھے مگر کوئی اس کے لیے کچھ کر نہیں پایا اور پھر مرد کون سا بہت اطمینان بھری زندگی گزار رہے ہیں اس معاشرے میں۔ تبھی تو کوئی شخص باہر جا کر واپس نہیں آنا چاہتا۔

گھر پہنچی تو گیٹ میں گاڑی داخل ہونے کی آواز سنتے ہی ساتھ والے گھر سے عثمان آ گیا۔ عثمان ہمارے Next door neighbours کا بیٹا اور میرا ننھا سا دوست تھا جو اس وقت تقریباً پانچ چھ سال کا تھا۔ وہ عموماً ہر جگہ میرے ساتھ جاتا تھا سوائے دفتر کے۔ اس دن وہ میرے ساتھ ہسپتال اس لیے نہیں گیا تھا کہ میں دفتر سے براہ راست ہسپتال گئی تھی۔ اس کے ساتھ دوستی کے بعد مجھے زندگی میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ بچے کیا چیز ہوتے ہیں اور ماں باپ کی سارے دن کی تھکن بچوں کو دیکھ کر کیسے دور ہو جاتی ہے۔ دراصل ہم انسان زندگی کے مختلف مرحلوں پر جن حالات سے گزرتے ہیں، وہ کئی حوالوں سے تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ بچپن، تعلیم، روزگار، شادی، بچے، پھر بچوں کی تعلیم اور ان کی شادیاں۔ ان تمام مراحل میں انسانوں کی جذباتی صورتحال بھی تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ اگر عمر کے کسی مخصوص مرحلے پر حالات اور جذباتی صورتحال عمر کے اس حصے سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو کہیں نہ کہیں کوئی Abnormality در آتی ہے۔ میں بھی اپنے حالات کے حوالے سے شاید اسی قسم کی صورتحال سے گزر رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ میری ذہنی کیفیت میں ایک عجیب طرح

کی کرختگی شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کرختگی کو نرمی میں تبدیل کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت تھی، وہ شاید مجھے اس بچے نے فراہم کر دی۔ دماغ کی وہ رگیں جو شدید تناؤ کے باعث سکڑتی جا رہی تھیں، اپنی اصلی حالت میں آنا شروع ہو گئیں۔ اس سے پہلے میں خود بھی اپنی کیفیت سے لاعلم تھی۔ اپنا غصہ، جھنجھلاہٹ، جھگڑا، بدتمیزی، ناگواری، برداشت کی کمی، یہ تمام چیزیں فطری اور Justified لگتی تھیں۔ اپنی ہر کیفیت کے لیے دوسروں کو الزام دینا عادت بن چکا تھا۔ تحمل عنقا ہو چکا تھا لیکن جب میں نے اپنے ننھے دوست کو چڑیا گھر، واٹر پارک اور سندباد لے جانا شروع کیا تو ایسا لگا جیسے زنگ آلود پرزوں پر سے زنگ اترنا شروع ہو گیا۔ یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اولاد کی نعمت سے محروم رکھنے کے باوجود اس تجربے سے روشناس کرایا۔

ایک دن میں دفتر سے گھر پہنچی تو مجھے پتہ چلا کہ عثمان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ وہ ہماری گلی کے نزدیک ہی سڑک پر سائیکل پر جا رہا تھا کہ کسی گاڑی نے ٹکر مار دی۔ گرتے ہوئے اس کا سر جانے کس چیز سے ٹکرایا کہ عین بائیں آنکھ کے اوپر گوشت پھٹ گیا اور آنکھ اور چہرہ خون سے بھر گیا۔ دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ آنکھ پر چوٹ آئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت کرم کیا کہ اس کی آنکھ محفوظ رہی۔ ڈاکٹر کا کلینک سامنے ہی تھا۔ اتفاق سے عثمان کا پندرہ سولہ سالہ بڑا بھائی اس وقت پاس ہی کہیں سے گزر رہا تھا۔ عثمان کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ جب طیب کی نظر عثمان کی حالت پر پڑی تو پہلے تو اس نے گاڑی والے کو دروازے سے باہر کھینچ کر چار پانچ مکے رسید کیے۔ پھر عثمان کو اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ بیچارے گاڑی والے کا حادثے میں کوئی قصور نہیں ہوگا۔ عثمان کو محتاط رہنے اور اپنے اردگرد کا خیال رکھنے کی تربیت دینے میں اس کے گھر والوں سمیت ہم سب بری طرح ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ اپنے سے بڑے بھائی سے پانچ سال چھوٹا ہونے کے باعث اس کی اور اس کے باقی بہن بھائیوں کی عمروں میں کافی فرق تھا۔ جس کے نتیجے میں سب کے سب اس کے بے جا لاڈ کے عادی ہو چکے تھے۔ شاید بے جا کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ وہ دراصل خود ہی کچھ ایسی Independent چیز تھا کہ اس پر کنٹرول حاصل کرنے کا کوئی حربہ کامیاب ہوتا ہی نہیں تھا۔ کچھ ہاتھ اس صورتحال میں میرا بھی تھا کیونکہ میں بچوں پر جبر کی قائل نہیں ہوں اور اس کے ماں باپ کسی حد تک میرے لحاظ میں بھی اس پر ہاتھ اٹھانے یا سختی کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ میں چشمِ تصور میں دیکھ سکتی تھی کہ وہ کس طرح چاروں طرف دیکھتا، سائیکل لہراتا، سڑک کے عین درمیان میں اپنی دھن میں جا رہا ہوگا جیسے کوئی اور سڑک پر موجود ہی نہ ہو۔ سڑک کے پار نظر آنے والے دوست کو دیکھتے ہی اس کی جانب سائیکل موڑنے کے لیے بالکل تیار جیسے درمیان میں کوئی ٹریفک ہو ہی نہیں۔ ایسی صورت میں گاڑی والے کے ساتھ یہ سلوک کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ میں ہوتی تو ایسا نہ ہونے دیتی۔ میں ہوتی تو ایسا نہ ہونے دیتی......؟ میں ہوتی تو کیا کرتی؟...... میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ چشمِ تصور سے میں نے عثمان کی خون سے لت پت آنکھ اور چہرہ دیکھا۔ میں ہوتی تو کیا کرتی؟...... میں ہوتی تو سڑک سے اینٹ اٹھا کر پہلے ڈرائیور کا سر پھاڑتی، پھر عثمان کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی۔ اوہ خدایا! ...... خدایا...... تو اگر ہمیں ایسے امتحانوں میں نہ ڈالے تو ہم دوسروں کا دکھ کیسے جان پائیں۔ ان کے احساسات کا اندازہ کیسے لگا پائیں۔ مجھے وہ بچہ یاد آیا جس کی سائیکل تیر کی طرح پھسلتی ہوئی میری گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔ ٹھیک ہے، میں بریک لگانے میں کامیاب ہو گئی لیکن اگر ایسا نہ ہوتا؟ اگر وہ بچہ مر جاتا؟ اگر اس کی آنکھ ضائع ہو جاتی؟ میں تو عثمان کی ماں بھی نہیں ہوں۔ جب اس بچے کی ماں خون میں لت پت بچے کو بازوؤں میں اٹھاتی تو میں اسے کیا جواب دیتی؟ کہ غلطی میری نہیں تھی، بچے کی تھی؟ میں سُن سی ہو گئی۔ Did I also stop caring at some point in time? Or was I

bad enough to not have cared ever, at all? مجھے کسی دانا دوست کا دیا ہوا مشورہ یاد آیا" گاڑی چلاتے ہوئے یہ مت سوچنا کہ دوسروں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ یہ سوچنا کہ تمہی نے اپنے آپ کو بھی بچانا ہے اور دوسروں کو بھی۔"

اب بھی کبھی کبھی کسی بڑے چوک میں ٹریفک سگنل پر رکے ہوئے، چیختے چنگھاڑتے ہارنوں اور پاگلوں کی طرح دوڑتی گاڑیوں، رکشوں اور موٹر سائیکلوں کے شور کے درمیان سٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے چند لمحوں کو میرے لیے وہ تمام شور یکدم معدوم ہو جاتا ہے اور ارد گرد کا ماحول لتا جی کے بے حد دھیمے سُروں میں، گھروں میں بیٹھی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی ملی جلی آوازوں سے گونجنے لگتا ہے...... "میرے سیاں جی اتریں گے پار ہو ---- ندیا دھیرے بہو ---- دھیرے بہو ---- دھیرے دھیرے ---- دھیرے بہو ندیا...... ہو ندیا دھیرے بہو۔"



گڑیا......

ارشد علی

سردیوں کے دن شروع ہو چکے تھے...... اماں بھی اسے متعدد بار کہہ چکی تھیں کہ رضائیاں بستر نکال کر دھوپ لگوا لے تاکہ استعمال کے قابل ہو سکیں لیکن ایک تو اس کی صبح سے شام تک کی بے انتہا مصروفیت نے اسے موقع نہ دیا اور دوسرا وہ پیٹی کے قریب جانے سے دانستہ گریز کرتی تھی اور جب تک ضرورت، مجبوری کے درجے میں داخل نہ ہو جائے پیٹی نہیں کھلتی تھی۔

تھی تو وہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی بیٹی لیکن ایک عرصے سے وہ ایسے فرائض سنبھالے ہوئے تھی جن کی انجام دہی کا اس عمر میں تصور بھی محال ہے۔ گزشتہ چھ برسوں سے وہ نہ صرف 65 بچوں کے پرائمری سکول کو واحد ٹیچر کی حیثیت سے چلا رہی تھی بلکہ اس کے علاوہ اسے تمام تر گھریلو ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا پڑ رہا تھا۔ اگر یہاں تک ہوتا تو بھی شاید گزارا تھا لیکن اس کے پاس مختلف کاموں کے لیے آنے والوں کا تسلسل بھی کبھی نہ ٹوٹتا۔

''باجی! یہ سوٹ تو کاٹ دے۔''

''باجی! موبائل میں کارڈ فیڈ کر دے۔''

''باجی! ذرا بازار تک چل لے۔''

''باجی...... باجی...... باجی......''

گو اس کی عمر تو لگ بھگ بائیس برس تھی لیکن گاؤں میں استانی کی حیثیت کی وجہ سے اسے احتراماً باجی ہی کہا جاتا۔

وہ جب پیدا ہوئی تب بھی اس کے باپ کے علاوہ کسی نے خوشی کا کھل کر اظہار نہ کیا تھا بلکہ کسی نے خوشی کا اظہار کیا ہی نہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ پیدائش سے قبل ہی بھانجا بھانجیوں والی ہو چکی تھی۔ اس کے مہینوں بعد تک اس کی ماں اڑوس پڑوس کے گھروں تک میں جانے سے کتراتی رہی، لہٰذا اماں کی جانب سے اسے کبھی بھی بحیثیت بیٹی اس طرح اپنایا ہی نہ گیا جیسے کہ وہ حق دار تھی۔ رہ گیا باپ تو اسے بہر حال اس سے بے تحاشا پیار تھا اور وہ جب تک زندہ رہا اس نے اس کے ناز و نخرے اٹھانے میں کوئی کسر روا نہ رکھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو کریم داد نوکری کے آخری حصے کو تھا اور ایک عرصے سے وہ کبھی سال چھ مہینے بعد ایک آدھ دن کے لیے گھر کا منہ تکتا تھا لیکن اب وہ باقاعدگی سے دوسرے تیسرے مہینے آنے لگا۔ طویل عرصے بعد اس کے خطوط بھی وقت پر ملنے لگے۔ پر خط بھی کیا تھے۔

مانی کیسی ہے؟

میری بیٹی کا خیال رکھنا،
اُسے ڈھیر سارا پیار......
وہ ٹھیک تو ہے......
بہت یاد آتی ہے......

اور ایسے ہی لاتعداد جملوں کا جال بُنا ہوتا۔ ایک آدھ لائن باقی سب کے حال احوال کے واسطے اور بس۔

جب پنڈ میں دتّو کے گھر پہلا فون لگا تو کریم داد نے ایک نئی عادت پکڑ لی۔ اب وہ ہر جمعہ کو گیارہ بجے گھر سے نکلتا۔ پی سی او پہ پہنچتا، بٹوے میں موجود نمبروں کی کاپی پہ درج واحد نمبر آپریٹر کے سامنے رکھتا اور گھنٹی ہوتے ہی ریسیور بے تابی سے تھام لیتا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی کم از کم دو منٹ لازماً دتّو سے پنڈ کی، ڈنگروں، فصلوں، پانی، ہل، بوائی، کٹائی اور دیگر موضوعات پر بات کرنا پڑتی۔ آخر وہ منت آمیز لہجے میں کہتا:

''اچھا بھا دِتّو بچہ بھیج کے ناجو کی ماں نے تو بلا دے۔'' دتو شاذ و نادر انکساری اور اکثر ایسے انداز میں جس سے اس تکبر کا اظہار ہوتا کہ پورے پنڈ میں کلا فون میرے گھر ہے، کہتا ''ہلا چل فیر انتظار کر۔''

''اور ہاں اسے کہیو مائی کو ساتھ لائے۔''

''ہلا ہلا۔''

اور اس کے ساتھ ہی دتو فون منقطع کر دیتا۔ اور وہ گھڑی کی سوئیوں پر ٹنگا انتظار کا آدھ گھنٹہ پورا کرتا، پھر پانچ دس منٹ احتیاط کے ملانے کے بعد پی سی او والے سے کہتا ''اچھا بھائی اب ملا۔'' اس کا یہ معمول طویل عرصے تک برقرار رہا۔ اور نہ معلوم کب تک چلتا کہ ایک روز یوں ہوا کہ فون سننے مائی ہاجرہ کے ساتھ نہ آئی۔ وجہ پوچھنے پر معلوم پڑا کہ سیڑھیوں سے پھسلنے پر چوٹ لگ گئی تھی۔ کریم داد کے تو جسم کا رواں رواں کانپ اٹھا اور وہ فون چھوڑ چھٹی کی عرضی دے شام کی گاڑی سے گھر روانہ ہو گیا۔ اگلے دن پو پھوٹنے سے پہلے وہ گھر تھا۔ جاتے ہی اس نے مائی کو گود میں اٹھایا اور سسکنے لگا۔ اس دن ہاجرہ نے بھی شاید پہلی بار اسے روتے دیکھا۔ خیر مائی تو دو چار دن میں ٹھیک ہو گئی پر اس کا دل نوکری سے ہمیشہ کے لیے اچاٹ ہو گیا۔ جب چار دن بعد وہ واپس ہوا تو انتیس سالہ دورِ ملازمت میں پہلی بار اتنے دکھی دل کے ساتھ لوٹا تھا۔ پھر اس تڑپ نے اسے وہاں رکنے نہ دیا اور وہ کوئی دو چار مہینوں میں ہی پنشن پر آ گیا۔ واپس آ کر اس نے بیٹھک میں گولیوں ٹافیوں کی دوکان کر لی اور کچھ سامان کریانے کا بھی ساتھ میں رکھ لیا۔

پنڈ آنے کے بعد کریم داد کی زندگی کا محور صرف مائی تھی اور اس نے حقیقتاً اسے کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ ہر وقت اس اندیشے میں مبتلا رہتا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ یہ تو رُل جائے گی۔ اسی لیے وہ بیشتر وقت مستقبل کے تانے بانے بننے میں گزارتا کہ کیسے مائی کی زندگی کو سہل بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے سارے ٹبر کی مخالفت مول لے کر نہ صرف مائی کو سکول داخل کروایا بلکہ یہاں تک کہا کہ میں اپنی دھی نوں شہر وڈے گیٹ والے کالج وی پڑھاؤں گا۔ فیر ایہہ ماسٹرنی لگے گی۔ اس کی اس حرکت پر بہت لے دے ہوئی اور برادری کے وڈوڈیروں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ بچی کو سکول بھیج کر شرک کا مرتکب نہ ہو بلکہ جیسے پہلیوں کو نماز سپارہ سکھا کے اپنے اپنے گھر کا کیا، اس کا بھی یوں ای کر۔ پر جب وہ کسی طور نہ مانا تو اس سے قطع تعلق بھی کیا گیا لیکن آہستہ آہستہ سب کو اس کے ارادے کے آگے ہار ماننا پڑی۔ کریم داد روز رات پڑے مائی کو لے کر بیٹھ رہتا اور کبھی کسی تصویر اور کبھی کسی لفظ پر انگلی رکھ کر پوچھتا ''پُتری یہ کیا؟'' اور مائی یہ نہ جانتے ہوئے کہ باپ تو

صرف اپنے جذبے کی تسکین کو، باپ ہمیشہ درست جواب دینے کی کوشش کرتی۔

مہینے میں ایک بار اسے کریم داد کو دکان کے لیے سامان لینے شہر جانا پڑتا۔ وہ پورا دن اس کے لیے مانندِ عذاب ہوتا۔ تمام وقت اس کی آنکھیں اسپتال، دکانوں، بازاروں اور ذہن چند کی گلیوں میں الجھا رہتا اور جب شام کو وہ ریڑھے پہ سامان لدوا کر گھر پہنچتا تو دروازے میں سے ہی مانی کو پکارنے لگتا۔ وہ بھی باپ کی آواز پر بانہیں پھیلائے اس کی سمت دوڑی چلی آتی یا بستر میں چھپ کر پکارنے لگتی۔

"بابا مجھے ڈھونڈو۔"

اور وہ جانتے ہوئے بھی اس وقت تک مانی کو چارپائی تلے، کبھی دروازے یا پردے کے پیچھے ڈھونڈتا رہتا جب تک "مجھے ڈھونڈو" کی صدا لگاتی مانی بابا کی شکست کے احساس سے پیدا ہونے والی دھیمی دھیمی ہنسی روکنے کی کوشش میں اونچا اونچا ہنسنا شروع نہ کر دیتی اور یہی وہ پل ہوتا جب وہ لپک کر اسے اٹھالیتا۔

"وہ تو یہاں پڑی ہے۔" اور وہ مزید کھلکھلا کر ہنسنے لگتی اور پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہتی:

"بابا میرے لیے کیا لائے؟"

اور وہ فوراً ایک لفافہ اس کی جانب بڑھا کے کہتا:

"دیکھ لے۔"

یہ وہ پل ہوتا جب اس سوچ سے کہ مانی کو میری لائی شے پسند آئے گی یا نہیں، چند لمحوں کے لیے شاید اس کے بدن میں لہو کی گردش بھی یوں ٹھہر جاتی جیسے اس کی آنکھیں مانی کے چہرے پر۔ جب مانی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی تو اس کا دل جیسے ازسرِنو دھڑکنے لگتا۔ اس کا اس حد تک لاڈ پیار، ہاجرہ کو انتہائی ناگوار گزرتا۔ وہ جب بھی موقع دیکھتی، اسے کہہ گزرتی:

"اتنے چونچلے نہ کر...... آخر کو پرایا دھن ہے۔ کلیس پتا نہیں قسمت میں کیا ہو۔" اور وہ ہر بار ہنس کر ٹال دیتا یا غصے میں کہتا:

"تمیں جا اپنا کام کر۔"

ایک روز وہ شہر سے لوٹا تو خاصا تھکا تھکا تھا، لہٰذا آتے ہی لیٹ گیا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اٹھا اور مانی کی ماں کو پاس بلا کر کہنے لگا:

"دیکھ ناجو کی ماں، زندگی موت کا تو مالک نے پتا پر میں اچھے بختوں میں پنشن تیرے ناں لگوادی تھی۔ تو بس میری مانی کا کھیال رکھیو۔ اور دیکھ اس کا ہاتھ برادری ماں نہ دیو۔ مئے ڈر ہے کہیں میری دھی رُل نہ جاوے۔"

اور یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ ہاجرہ جو قدرے ناگواری سے اٹھی تھی یکدم پریشان ہوتے ہوئے بولی:

"ہائے کیا ہویا۔ تیری طبیعت ٹھیک ہے۔ دوائی کھائی تھی؟" اس نے ماتھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"کتنی واری کہا دوائی ماں ناغہ نہ کرا کر۔ ٹھہر میں دودھ گرم کر کالاری فیر گولی لیو۔"

وقت کے پہیے کی اپنی ایک رفتار ہے۔ کسی کو ساتھ لیے چلنے کے لیے نہ اس کی رفتار میں کمی آتی ہے اور نہ کسی کے ساتھ چلنے کے لیے تیزی۔ اگر کوئی اس کی رفتار کا ساتھ نہ دے پائے تو یہ اسے روند کر گزر جاتا ہے۔

کریم داد کی بیوی جب واپس لوٹی تو وقت کا پہیہ تھک کر رکنے والے کریم داد کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل چکا تھا۔ مانی کی جب آنکھ کھلی تو اس نے باپ کے سرہانے ماں کو روتے اور گرد ایک ہجوم دیکھا تو گھبرا گئی اور باپ کو اونچا اونچا پکارنے اور جواب نہ پا

کر اس سے زیادہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ اب تو شاید یہ اس کی فطرت بن چکی تھی کہ وہ جب بھی باپ کو پکارے تو رونے لگتی ہے۔ پہلے پہل کئی دن تک وہ چارپائیوں، پردوں اور دروازوں کے پیچھے باپ کو ڈھونڈتی رہی لیکن پھر اس نے باپ کی تصویروں، بستر، چارپائی اور کمرے پر اکتفا کر لیا۔ اسے جب بھی باپ سے ملنا ہوتا وہ تصویریں لیے اس کی چارپائی پر آ بیٹھتی اور کہتی

"بابا! ایسے تو نہیں کرتے جیسے آپ نے کیا۔۔۔ وہ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ۔۔۔" پھر اس کے آنسو ان تصویروں سے گھنٹوں باتیں کرتے۔ گزرتے وقت کے اثرات سے اس اثاثہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک روز اس نے تمام اسباب جمع کیا اور بابا کی تمام یادوں کو ان کی مائی سمیت پیٹی میں بند کر دیا۔

اس دن کے بعد سے وہ کریم داد کی مائی نہیں ہاجرہ کی فردوس تھی جسے اپنے گھر کو چلانا تھا۔۔۔ بوڑھی ماں کو سنبھالنا تھا۔۔۔۔ اور دنیا کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اپنے دامن کو کانٹوں سے بھی محفوظ رکھنا تھا۔

فردوس ایک خاموش طبع اور سخت دل انسان تھی جسے نہ کبھی ہنستے دیکھا گیا اور نہ روتے۔ کسی تہوار، عید، بقر عید، شب برات، شادی بیاہ پر اس نے کبھی چوڑیاں چڑھائیں، نہ مہندی رچائی۔ اسے جب معلوم پڑتا کہ دنیا میں کوئی اس سے زیادہ مشکلات کا شکار ہے تو طمانیت کی لہر اس کے اندر دوڑ جاتی اور اگر کوئی خدانخواستہ کسی کے لیے ہمدردی کے دو بول اس کے سامنے بول دیتا تو اس کے تن بدن میں آگ لپکنے لگتی۔ اس کا جی چاہتا کہ کسی طرح اس کا منہ نوچ لے۔ اس کے گرد بنے اس مضبوط خول پر چوٹ اس صورت میں پڑتی تھی جب اس کا ماضی کسی بھی شکل میں زندہ ہو کر اس کے سامنے دھڑکنے لگتا۔

سردیوں کے دن شروع ہو چکے تھے۔ اماں بھی اسے متعدد بار کہہ چکی تھیں کہ رضائیاں بستر نکال کر دھوپ لگوا لے تاکہ استعمال کے قابل ہو سکیں لیکن ایک تو اس کی صبح سے شام تک کی بے انتہا مصروفیت نے اسے موقع ہی نہ دیا اور دوسرا وہ پیٹی کے قریب جانے سے دانستہ گریز کرتی تھی اور جب تک ضرورت، مجبوری کے درجے میں داخل نہ ہو جائے پیٹی نہیں کھلتی تھی۔

ایک دن وہ جیسے ہی سکول سے آئی، آتے ہی بیگ رکھ کر گاؤن اتارا اور پیٹی پر سے بکسے اتارنے لگی۔ اماں نے کہا بھی کہ پہلے کچھ کھا لے پر اس نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں صرف نہیں کہا۔ اور پیٹی کا ڈھکن اٹھا کر دیوار کے ساتھ ٹیک دیا۔ آنکھیں بند کر کے رضائیاں کھینچنے کے لیے ہاتھ پیٹی میں ڈالا تو اس کا ہاتھ براہ راست کسی ملائم سی چیز پر جا پڑا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو پریشانی سے وہ پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انتہائی عجلت میں اس نے وہ لفافہ باہر نکالا تو اس کے ایک جانب سے گتے کا ڈبہ زمین پر آ گرا۔ اس نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور تیزی سے کھولا تو ڈبے میں سے ایک گڑیا برآمد ہوئی۔ گڑیا جو کسی زاویے سے قابل دید تو کیا قابل توجہ بھی نہ تھی۔ جس کے نصف سر کے بال ادھڑ چکے تھے اور باقی کے نصف خاردار جھاڑیوں کی مانند آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ جسم پر موجود اور زمین پر بکھری گلابی کترنوں کو دیکھ کر یہ قیاس بھی ممکن نہ تھا کہ یہ ٹکڑے کبھی ایک خوبصورت فراک کی مانند باہم جڑے ہوئے تھے۔ بے نور آنکھیں بے رنگ ہو چکی تھیں۔ ناک، ہونٹ، کان کترے ہوئے تھے۔ غرض گڑیا کا کوئی نقش بھی قابلِ شناخت نہ تھا اور وہ اس ادھ کچلے وجود کو سختی کے ساتھ سینے سے بھینچے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔



...... سے ملاقات

نیر حیات قاسمی

آنکھوں پر بیٹھی نیند کو ہُشکانے کے بعد جب میں نے گھڑی پر نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ رات کا ایک بج چکا ہے۔ اس تصور نے میری آنکھوں پہ ڈولتا ہوا بچی کچھی نیند کا کٹورا بھی انڈیل دیا۔ میں بس کی سیٹ پر تھوڑا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آس پاس نظر دوڑائی تو تمام مسافروں کی آنکھوں پر نیند کا عنقا، بیٹھا خوابوں کے دانے چگتا دکھائی دیا، ماسوائے ڈرائیور کے جو نیند کے شکنجے سے بچنے کے لیے سگریٹ سلگائے شکستہ سڑک کے گڑھوں کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں جھولتا نظر آ رہا تھا۔ بس کے اندر ایک مدہم سی روشنی کا بلب جل رہا تھا جو روشنی سے زیادہ نیند کی کرنیں چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ نظر گھماتے گھماتے جب میں نے کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر باہر کی طرف جھانکا تو وقتی طور پر صرف گہرا اندھیرا ہی حاوی دکھائی دیا مگر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد لمبے، سیاہ درختوں کے جھنڈ اور گھنی جھاڑیاں دکھائی دیں جن میں رات کا اندھیرا سر سرا رہا تھا۔ کس قدر خوفناک ماحول ہے، یہ سوچ کر ایک سنسنی سی میرے اندر دوڑ گئی اور میں نے بس کی کھڑکی کا شیشہ سختی سے بند کر دیا اور تحفظ کے خود ساختہ کھلونے سے جی کو بہلانے لگا۔

میرے ہلنے جلنے سے ڈرائیور کو معلوم ہو گیا کہ ایک مسافر تو جاگ رہا ہے۔ اس نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور نیند کے حاوی ہوتے جھونکوں سے بچنے کی خاطر نہایت ہمدردانہ آواز میں ہولے سے بولا: ''کیا ہوا جناب! سب خیریت تو ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

ماحول کے تاریک خوفناک انجماد میں میرے لیے یہ آواز ایک خوشگوار حیرت تھی اور میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اعتماد سے بولا: ''ہاں ہاں! بالکل خیریت ہے۔ بس آنکھ کھلی تو یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کتنا سفر باقی ہے۔''

ڈرائیور جھٹ سے بولا: ''آپ نے شب نگر اترنا ہے نا! بس کوئی پندرہ منٹ زیادہ سے زیادہ اور۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھر بولا ''ویسے صاحب! یہ کہنا تو نہیں چاہیے مگر کتنا عجیب سا نام ہے اس گاؤں کا، شب نگر! پتہ نہیں کیا سوچ کر یہ نام رکھا ہوگا لوگوں نے۔ شب کا مطلب تو رات ہوتا ہے نا جناب؟''

اس کے سوال نے میرا بھی دھیان اس موضوع کی طرف موڑ دیا اور میں اس بات کی توجیح تلاش کرتے کرتے بولا: ''ہاں۔ ہر نام کا کوئی مقصد تو ہوتا ہے یا پھر کسی نہ کسی چیز سے اس کا تعلق جڑا ہوتا ہے، معلوم نہیں اس نام کی کیا وجہ ہے۔ میں تو خود پہلی مرتبہ وہاں جا رہا ہوں۔''

ڈرائیور اب تک کی گفتگو اور میرے جوابات سے شہ پا کر پھر بولا ''اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا بتائیں گے کہ وہاں کیوں جا رہے ہیں۔ آپ نے کہا ہے نا کہ آپ پہلی بار جا رہے ہیں۔''

''میں ایک استاد ہوں اور محکمے کی طرف سے، کچھ دنوں کے لیے عارضی طور پر وہاں قائم ایک سکول میں تعلیم دینے کی غرض سے جا رہا ہوں۔''

میرا جواب سن کر ڈرائیور نے ''جی اچھا۔'' پر ہی اکتفا کیا۔ اس کے بعد چند لمحوں کی خاموشی نے ماحول کو پھر منجمد کر دیا اور میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

باہر کتنا اندھیرا ہے، کتنی خاموشی ہے اور درختوں، جھاڑیوں سے پرے کسی کچے گھروندے میں کوئی ٹمٹماتا بلب بھی نہیں دکھائی دیتا، اُف! رات کے دو، اڑھائی بجے کسی ایسی جگہ پر اترنا!...... کیا کروں، بس کے ساتھ ہی آگے چلا جاؤں اور صبح یہاں واپس آ جاؤں؟ مگر یہ بس تو کہیں جا کر رک جائے گی تو اتنی رات گئے وہاں کہاں ٹھہروں گا؟

''صاحب! آپ کا سٹاپ آ گیا۔''

ڈرائیور کی اس آواز نے میرے بچے کھچے حوصلے کو بھی روند ڈالا اور میں ہڑبڑا کر بولا ''ہیں۔ کیا۔ سٹاپ آ گیا؟ اتنی جلدی؟ کیا مطلب؟''

اس ٹوٹے پھوٹے جملے کے جواب میں ڈرائیور بولا: ''جناب آپ نے شب نگر اترنا تھا نا، تو وہ آ گیا۔''

میں نے بس کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہاں کسی گاؤں کے آثار تک نہ دکھائی دیئے۔ بس وہی لمبے، گھنے، کالے درخت اور بے شمار جھاڑیاں۔ میں نے ہمدردی کی آخری توقع لیے ڈرائیور سے پوچھا: ''بھائی! یہ تو ویرانہ ہے، اجاڑ ہے۔ یہاں تو کوئی گاؤں دکھائی نہیں دیتا۔''

مگر اس موقع پر ہمدردی کی توقع ہی فضول تھی، ڈرائیور اپنی دھن میں بولا ''صاحب! وہ...... دیکھیں، ذرا غور سے دیکھیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں سے ایک راستہ، پرے اتر رہا ہے۔ یہ راستہ سیدھا شب نگر کو ہی جاتا ہے۔''

اس کے جواب سے میرا دھک سے رہ گیا اور میں نہایت کمزور آواز میں بولا ''اچھا...... تو...... مگر یہاں سے فاصلہ کتنا ہے گاؤں کا...... میرا مطلب کوئی تانگہ، رکشا وغیرہ اگر......''

ڈرائیور کے چہرے پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا: ''جناب! اب آدھی رات کو کون سا تانگہ اور رکشا ملے گا یہاں۔ آپ کو پیدل ہی جانا پڑے گا۔ ابھی آدھی رات ہے۔ تقریباً۔ شاید آدھا پونا گھنٹہ تو کم از کم لگ جائے گا آپ کو۔''

اس کے طنزیہ تاثرات دیکھ کر میں غصے سے بولا ''رات، رات ہی ہوتی ہے۔ آدھی یا ساری نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

میرے لہجے کی خفگی محسوس کرتے ہوئے وہ پھر بولا ''جی یہ رستہ بہت تنگ اور کچا ہے۔ اس پر بس نہیں جا سکتی ورنہ میں، آپ کا خادم آپ کو ضرور منزل تک چھوڑ آتا۔''

میں نے سر ہلایا اور فقط یہی بول سکا ''کوئی بات نہیں، تمہاری بڑی مہربانی۔'' اس کے بعد اٹھ کر میں نے بس کا دروازہ کھولا اور تمام ہمت جمع کر کے کڑے دل سے باہر اُتر گیا۔

میرے زمین پر قدم رکھنے کی دیر تھی کہ ڈرائیور نے بس کو دوڑا دیا۔ فضا میں ہوا نہ ہونے کے برابر تھی اور بس کی تیز

رفتاری سے اٹھنے والا غبار جیسے وہیں ٹھہر کر جم سا گیا۔ میں گھپ اندھیرے ماحول میں خشک مٹی کے اس غبار سے بچتا چند قدم آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے باعث مجھے احساس ہوا کہ چاند کی مدہم سی روشنی میں اگر تھوڑا غور کیا جائے تو کسی حد تک نظر دیکھنے کے قابل ہو ہی جاتی ہے۔ اب میرے سامنے ایک چھوٹا سا کچا رستہ تھا جو درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ کے بیچوں بیچ پرے اترتا ہوا سامنے اندھیرے میں کسی انجان رخ کو غائب ہو رہا تھا۔ ہوا کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ اور جھینگروں کی اکا دکا آوازوں کے سوا وہاں تیسری آواز بس مجھے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکن کی سنائی دے رہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس طرح کی انوکھی صورتحال کا سامنا تھا، دل میں ایک خیال آیا کہ سامنے کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاؤں اور رات بسر کرلوں۔ مگر ذہن نے فوراً اس خیال کو رد کر دیا اور میں نے سوچا کہ آدھا گھنٹہ ہی تو چلنا ہے، یہاں کھڑے رہنا کوئی عقلمندی نہیں۔ تو یوں اس سوچ کی ہمسری میں میں نے قدم کچے راستے کی طرف بڑھائے اور آگے چل دیا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں ٹمٹماتے خوف کے دیے کو نہ بجھا سکا مگر جھجکتے قدموں سے چلتا گیا۔ ابھی مجھے چلتے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ میرے سامنے وہ کچا راستہ تین مختلف راستوں میں تقسیم ہو گیا۔ غصہ اور افسوس کے ملے جلے جذبات میں میں نے بس ڈرائیور کو کوسا کہ اس نے یہ تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ ان تین راستوں میں سے کونسا شب نگر کی طرف جاتا ہے۔ اب اس وقت راستہ بھٹکنے کی ہمت تو مجھ میں بالکل نہ تھی۔

اسی بے چینی میں دائیں بائیں ٹہلنے سے وہاں پڑے خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز ماحول میں نمایاں ہو گئی۔ ابھی میں نے دائیں جانب والے رستہ پر چل پڑنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اچانک ایک انتہائی نرم، نفیس سی نسوانی آواز کانوں میں پڑی۔ میں ٹھٹھر کر رہ گیا اور میرے قدم غیر ارادی طور پر وہیں رک گئے۔ اس ویرانے اور سنسان میں اتنی رات گئے کوئی آواز اور وہ بھی نسوانی، یہ سوچ کر میرے خیالات میں سوئے بچپن کے ڈراؤنے قصے جاگ اٹھے اور بھتوں کی طرح میرے دل اور دماغ کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ چند ثانیے وہاں ٹھہرنے کے بعد اس آواز کو اپنا خبط قرار دے کر میں سر جھٹکتے ہوئے آگے دائیں والے رستے کی طرف بڑھا کہ پھر وہی آواز آئی: ''سنو! کدھر جا رہے ہو؟''

میں سنی ان سنی کر کے چلتا گیا مگر کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتا بھی گیا لیکن مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ اسی اثنا میں مجھے اپنے دائیں طرف کسی کی موجودگی کا شائبہ ہوا۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا ''کون...... ہے؟''

جواباً وہی آواز آئی: ''میں ہوں!''

میں ٹھہر گیا اور دائیں جانب تھوڑی سی گردن گھما کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اندھیرے میں ضم ایک شبیہ سی نظر آئی۔ میں نے مزید غور کیا تو مجھے ماسوائے دھیمی ہوا میں لہراتے کالے، اندھیرے چغہ کے کچھ اور دکھائی نہ دیا۔ خوف کا سیلاب میرے بچے کھچے الفاظ کو بھی بہا کر لے گیا اور میں گنگ ہو کر وہیں کھڑا اس شبیہ کو گھورتا رہا۔

وہاں سے پھر وہی نرم سی آواز آئی: ''کہاں جا رہے ہو؟...... کیا ہوا بولتے کیوں نہیں؟''

''وہ...... میں...... دراصل شب نگر جانا چاہ رہا ہوں...... اور...... بس۔'' میں بولا۔

وہاں سے پھر سوال ہوا: ''راستہ بھٹک گئے ہو نا؟''

میں نے جواب دیا ''جی...... جی ہاں...... کچھ کچھ۔''

اس شبیہ سے پھر مسحور کن آواز آئی: ''آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں راستہ دکھا دوں۔''

اس موقع پر کوئی اور چارہ نہ پاتے ہوئے میں نے ''جی'' کہا اور اس شبیہ کی طرف چل دیا۔ وہ شبیہ درمیان والے راستے

کی طرف چل پڑی۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ صرف میرے ہی قدموں تلے سے خشک پتوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی ہے اور وہ شبیہ تو جیسے ہوا کے ایک نرم جھونکے کی مانند اڑی چلی جا رہی ہے، بغیر کسی آواز کے۔ میرے بار بار دیکھنے پر وہاں سے پھر آواز آئی ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے سٹپٹا کر کہا ''کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔''

''یہ دیکھ رہے ہو نا کہ میں کون ہوں، مجھے جاننا چاہتے ہو؟''

جواب میں میرے منہ سے محض چند لفظ ایسے ٹپکے جیسے کسی خالی برتن میں کوئی چیز لڑھکے ''جی ہاں، اگر آپ بتانا چاہیں۔''

میرے یہ الفاظ گفتگو کی آخری لہر ثابت ہوئے اور اس کے بعد سفر خاموشی سے کٹنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد چند الفاظ ایک دوسرے کی انگلیاں تھامے میری سماعت میں داخل ہوئے ''تم، دائیں والے راستے پر کیوں جا رہے تھے؟'' میں نے فوراً جواب دیا ''میرا خیال تھا کہ دائیں جانب ہی سیدھا رستہ ہے جو مجھے منزل تک پہنچا دے گا۔'' کچھ دیر کی پیش قدمی کے بعد اس شبیہ کی جانب سے آواز آئی ''آؤ! تمہیں دائیں جانب والے رستے کا نظارہ کراؤں۔'' ہلکا سا دائیں جانب جھاڑیوں کے درمیان سے مڑ کر جب منظر واضح ہوا تو سامنے ہی مجھے چند افراد بے حس و حرکت کھڑے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں روشنی کی ڈلیاں تھیں جن سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میرے پوچھنے سے قبل ہی جواب مل گیا۔ ''یہ روشن ڈلیاں آج کے دن کے ٹکڑے ہیں۔ تم غور سے دیکھو، ان کی چمک میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مسافر بھی شب نگر جانا چاہتے تھے مگر انہوں نے سمجھانے کے باوجود دائیں رستے کا انتخاب کیا جو کہ شب نگر کو نہیں جاتا اور اب صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ ڈلیاں ان کے جسموں سے سارا نور کشید کر کے سورج کی کرنوں میں جا ملیں گی۔''

دائیں رستے کے انجام سے اپنے محفوظ رہنے کی تسلی اور انجانے خوف سے کسی حد تک نجات پانے کے بعد میرے جذبات پرسکون ہو چکے تھے۔ بس ایک ہی سوال ذہن میں گھوم رہا تھا کہ آخر یہ میری راہنمائی کرنے والی ہے کون؟ خاموشی کے حصار کو توڑتے ہوئے میرا ایک اور سوال زبان پھلانگ کر نکلا ''یہ علاقہ رات کے وقت اس قدر ویران کیوں ہے؟ اور یہاں دور دور تک ہم دونوں کے علاوہ کوئی بھی ذی روح دکھائی نہیں دیتا؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد جواب آیا ''یہ تو تمہارے ذہن کی سوچ ہے۔ رات ویران نہیں رات تو سہارا ہے، یہ خوبصورت بھی ہے، دیکھو تو سہی۔ اور ہاں خیال رہے اس وقت یہاں صرف ایک ہی ذی روح ہے دو نہیں۔''

میں ابھی اس بات کی گہرائی میں غوطے کھا رہا تھا کہ اُدھر سے آواز آئی ''تمہاری منزل آنے کو ہے، وہ سامنے دیکھو منڈیر پر ٹمٹماتی ہوئی دیئے کی لَو دکھائی دے رہی ہے۔'' منظر نامہ کچھ واضح ہو چلا تھا۔ اب افق کی جھلک بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ اندھیرے میں روشنی کی آمد سکون کا باعث تھی، آج اس موقع پر پہلی مرتبہ مجھے لگا کہ واقعی اس اندھیری رات میں بھی بڑی پرکشش خوبصورتی ہے۔ میرے قدم تیزی سے حرکت کرنے لگے اور منزل کو سامنے پا کر میں اپنے دھیان میں مگن چلتا گیا۔ یہ انسان کی نمایاں خصلتوں میں سے ایک ہے کہ نظروں کے سامنے اپنی منزل کو پا کر وہ اپنے راہنما کو بھول جاتا ہے اور اپنی ہی دھن میں مگن ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں مبتلا کچھ دور جا کر مجھے اس کا خیال آیا جس کی راہنمائی میں میں یہاں تک پہنچ پایا تھا۔ میرے ذہن میں دوبارہ چند تشنہ سوالات سوکھے پتوں کی طرح چٹختے ہوئے اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے۔ میں نے فوراً اپنے دائیں جانب نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ میری راہنمائی کرنے والی شبیہ کافی پیچھے بجھتے ہوئے اندھیرے اور بڑھتی ہوئی روشنی کے حسین

امتزاج میں کھڑی ہے۔ منزل کو پا لینے کی خوشی پر شرمندگی کی اوس پڑ چکی تھی۔ میں سر نیہوڑائے واپس مڑا تا کہ شکریہ ادا کرسکوں تو وہاں سے صبح سویرے کی صاف اور ٹھنڈی ہوا کی مانند آواز کا ایک جھونکا آیا۔ ''پلٹ کیوں گئے، بڑھو اپنی منزل کی طرف۔'' شرمندگی کے مارے چند الفاظ ایک دوسرے کو دھکیلتے میرے زبان سے ادا ہوئے۔ ''وہ، میں ایک تو شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا اور...... اور بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ ہیں کون؟'' صبح کاذب کی چمک کچھ بڑھ چکی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ روشنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ شبیہ دھندلی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کی سانس لیتی خاموشی کے بعد وہاں سے اسی خوبصورت، مسکراتے لہجے میں جواب آیا ''میں!...... رات ہوں۔''

اس مختصر سے جملے نے تیز جھکڑ کی طرح میرے ذہن پر چھائے سوالوں کے گھنیرے بادلوں کو سمیٹ کر ایک طرف کر دیا اور یوں لگا کہ جیسے بس کے تیزی سے گزرنے کے بعد لمحہ بھر کو بکھرنے والی دھندلی گرداب جا کر بیٹھی ہے اور مجھے چند قدموں کی مسافت پر شب نگر کی بستی واضح طور پر دکھائی دینے لگی۔ میں نے لمحہ بھر کو پلٹ کر دیکھا تو چغے میں ملبوس شبیہ اب دھندلا چکی تھی۔ تب میں جھکے ہوئے سر کے ساتھ، مگر مضبوطی سے قدم بڑھاتا اس اطمینان کے ساتھ شب نگر میں داخل ہو گیا کہ اب مجھے کسی سے یہ نہیں پوچھنا پڑے گا کہ شب نگر کے نام کی توجیح کیا ہے!



داغ دل کا سرمایہ (زیر تصنیف ناول کے دو باب)

اُمِ عمارہ

ہماری نانی کہتی تھیں:

"جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو زمین سوا بالشت دھنس جاتی ہے۔"

"اچھا ایسا ہے۔" اس نے اپنے لمبے بالوں کو تولیے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں! نانی تو ایسا ہی کہتی تھیں۔" وہ مسکرائی۔ زیر لب ہنسی اس کے چہرے کو روشن کر گئی۔ اسے اپنے گھر والوں کے فرمودات یاد آنے لگے۔

کہتے ہیں جب وہ پیدا ہوئی تو زمین و آسمان کانپ اٹھے تھے اور گھر کے لوگ خود اس کی ماں، گھر سے باہر نکل پڑے تھے۔ یہ غالباً اس کی پیدائش کا تیسرا دن تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس کی اماں نے اپنے سینے سے لگی پوٹلی کو ذرا سا پولا کیا کہ تین دنوں کی جان کا دم ہی نہ گھٹ جائے۔ دس فرلانگ کے فاصلے پر واقع باغ میں جب سارے پہنچے تو اس نے رلائی کھول کے دیکھا...... وہاں سب کچھ تھا...... یعنی بچی کی دودھ دانی، نپی، ننھا سا تکیہ لیکن...... وہ دشمن ایمان نہیں تھی جسے آل اولاد کہتے ہیں...... اس کی ماں نے ایک چیخ ماری اور گرتے گرتے اپنے باپ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں جھول گئی۔ باپ نے اچنبھے سے اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھا جو ابھی تین دن پہلے تخلیق کے عمل سے گزرتے ہوئے مرتے مرتے بچی تھی، اب سچ مچ موت کے قریب نظر آ رہی تھی۔

سفید چہرہ سفید ہونٹ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔

"کیا ہوا، کیا ہوا بیٹا۔" نانا ابا پریشان حال۔ دوسری طرف زلزلے کے جھٹکے پر جھٹکے آ رہے تھے۔ اپنا آپ سنبھالنا مشکل، اوپر سے جوان بیٹی کا بوجھ۔ جو اپنی بیٹی اپنی بانہوں میں نہ پا کر بے ہوش ہو رہی تھی۔

"کیا ہوا اسے۔" اس کی سوتیلی ماں نے میاں کی محبت میں سوکن کی اولاد کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"یہ تو بے ہوش ہے۔ تم کیسے اسے سنبھال سکتی ہو۔ اوپر سے یہ قہر کی گھڑی، قدم زمین پر......" ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ وہ ان کے اوپر آ رہیں۔ وہ جو پہلے ہی بیٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ اب یہ حال تھا کہ ان کے اوپر بیٹی اور بیٹی کے اوپر بیوی۔ ساتھ ہی زمین انہیں دو حصوں میں بٹتی نظر آئی۔ دہشت زدہ ہو کر شیخ ہشام نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

بس اب یہ ہمارا آخری وقت ہے اور یہ زمین ہی ہماری قبر بن جائے گی۔ انہوں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پل کے پل سوچا اور پھر ان کے اوسان خطا ہو گئے، کچھ ہوش نہ رہا۔ دوسرے ہی لمحے انہیں کوئی آواز دے رہا تھا۔ انہیں نام لے کر

پکار رہا تھا اور وہ جو ناقابل برداشت بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، اچانک ہلکے پھلکے ہو گئے تو جیسے اپنے حواسوں میں آ گئے اور انہوں نے سوچا۔

یہ ہماری روح ہے جو ہلکی پھلکی ہو کر پرواز کر رہی ہے اور کوئی دم میں فرشتے..... مگر بیٹی میری بیٹی..... اور میری بیوی..... کیا وہ بھی..... وہ بھی..... مگر مجھ پر کوئی بوجھ تو نہیں ہے..... انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے زمین کی سختی محسوس ہوئی اور دوسرے لمحے کسی ہاتھ کے سہارے وہ اپنے قدموں پر سیدھے کھڑے تھے۔ افراتفری کی ایک دنیا آباد تھی۔ شور پریشانی۔

''گویا میں مرا نہیں ہوں۔''

ان کی اپنی آواز کانوں میں آئی اور دوسرے لمحے بیوی کی آواز گونجی۔

''نانا نہیں کیسی باتیں کرتے ہیں، مریں آپ کے دشمن۔ زلزلے کے جھٹکے سے میں آپ پر گر گئی تھی اور ہم ڈھے گئے تھے۔ آپ نے عافیہ کو اٹھایا ہوا تھا نا..... اس لیے سنبھل نہ سکے۔''

''ارے ہاں، عافیہ کہاں ہے۔ عافیہ بیٹا۔ تم کہاں ہو؟''

''وہ دیکھیے حویلی کی طرف جا رہی ہے۔''

''مگر کیوں.....؟'' نانا نے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

''وہ اس کی بیٹی وہیں کہیں راستے میں گر گئی یا افراتفری میں اس کے ہاتھ سے پھسل کے وہیں پلنگ پر یعنی حویلی میں.....''

''ارے روکو اسے کوئی روکو۔ وہاں اب کچھ نہیں ہوگا۔ حویلی تو ملبے کا ڈھیر ہو چکی ہے۔'' ہشام حیدر اپنے پاؤں کی موچ بھول کر تیزی سے گھسٹتے ہوئے اس تک پہنچے۔

وہ جو تین دن کی زچہ تھی اور جس کے کچے جسم کے سارے زخم ہرے ہو رہے تھے اور اس کا لباس بھی سارا کا سارا خون آلود ہو رہا تھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''بابا میری بیٹی..... میری بیٹی یہاں نہیں ہے۔'' اس نے زمین پر پڑی دوہر، پوتڑے اور دودھ کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

''مگر تم جا کہاں رہی ہو؟''

''وہاں اپنی حویلی میں۔''

''حویلی میں.....؟ حویلی کہاں ہے، وہ مٹی کا ڈھیر.....''

''نہیں بابا، اُدھر دیکھیں دیواریں کھڑی ہیں۔''

''مگر دیکھو تو راستہ بند ہے۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سب کچھ مٹ گیا ہوگا، وہ بھی کہاں بچی ہوگی.....''

''ارے وہ کیوں نہیں بچی ہوگی۔''

''کچھ بھی ہو تم اندر نہیں جاؤ گی۔ تم نے اپنی حالت دیکھی ہے۔ اگر تم کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا تم جو ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔''

''وہ ہماری بھی اکلوتی بیٹی ہے۔ ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟''

عافیہ نے جھٹکے سے اپنے آپ کو باپ کی گرفت سے آزاد کرایا اور بجلی کی سی تیزی سے حویلی کی طرف بھاگی۔

حویلی کا پھاٹک گر گیا تھا۔ دیواریں پھٹ گئی تھیں لیکن حویلی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے گرے ہوئے

پھاٹک پر قدم رکھا۔ ٹھوکر کھائی، سنبھلی اور ڈیوڑھی کے ملبے سے گزرتی ہوئی وہ دوسری طرف کی اکنائی میں بنے ہوئے کمرے کی طرف دوڑی کہ یہی کمرہ حویلی کا زچہ خانہ تھا جو مرکزی علاقے سے الگ تھا۔ درد اٹھنے سے لے کر کراہنے، درد سہنے کا شور دوسروں تک اور خاص طور سے مردوں تک نہ پہنچے — یہ ان کا خاندانی نظام تھا — اور یہ نظام پشتوں سے ان کے خاندان میں چلا آرہا تھا اور زچہ بچہ کی دلچسپی میں ساری حویلی کا مرکز یہی علاقہ بن جاتا تھا۔

عافیہ نے الجھتے قدموں، رکتی سانس کے ساتھ اس کشادہ کمرے میں قدم رکھا تو تین دن کی وہ، زمین پر بکھری مٹی میں، ہرن جیسی آنکھیں کھولے پڑی ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچے ٹپکتے جسم والی عافیہ نے اپنے گوہر بے بہا کو سینے سے لگایا اور وہیں ڈھیر ہوگئی۔ نانا ہشام حیدر اپنی بیٹی کی چاہت میں اسے بھی سمیٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب بتاتے ہیں، اس کے بعد کتنے ہی دنوں تک ان کا سارا خاندان باغ میں کھلے آسمان کے نیچے پڑا رہا کہ چھوٹی حویلی کا کوئی کمرہ ایسا نہیں تھا جسے کمرہ کہا جا سکتا تھا۔ کہیں دیواریں نہیں، کہیں دیواریں ہیں تو چھت ندارد...... سامان، وہ بھی سب وہیں دفن، اناج کے کوٹھلے، کوٹھیاں سب مٹی کا ڈھیر۔ کپڑے غارت، پیٹیاں دفن، عجیب قیامت کی گھڑی تھی کہ نہ جسم پر کپڑے نہ پیٹ میں روٹی۔ اوپر سے کھلا آسمان۔ گویا حشر کا میدان تھا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کچھ اِدھر اُدھر سے رشتہ دار مدد کو دوڑے۔ کچھ بستی والوں نے مل جل کے سمیٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے تاڑ کے بلکوں (پتوں) سے چھائے ہوئے چھپر باغ میں تیار ہوگئے۔ حویلی کے بچے کھچے سامان سے سونے، رہنے کا بندوبست ہوگیا اور زمیندار اور رعیت مل کر بستی کی تعمیر نو میں جٹ گئے۔ کون ہندو ہے، کون مسلمان، کسی کو اس سے غرض نہیں تھی۔ بس غرض صرف یہ تھی کہ کسی طرح بستی کے گھر دوبارہ کھڑے ہو جائیں۔ بستی آباد ہو جائے اور پھر وہی بہار واپس آجائے۔ مسمار بستی کے ساتھ جو باغ تھا، اس میں بے وقت کی بہار آگئی تھی۔ پھول اور پھل تو عنقا تھے لیکن انسان کی اپنی رونق ہوتی ہے، سو ایک ہنگامے سے سارا باغ گونج رہا تھا۔ کہیں بچے کھیل رہے تھے۔ کہیں نوجوان باغ کے قدموں میں بہنے والی ندی میں بازی لگا کے اس کنارے سے اس کنارے تک تیر رہے تھے۔ ایندھن نہ ہونے کی وجہ سے باغ کے سوکھے درختوں پر دنادن کلہاڑے چل رہے تھے۔ خاص طور سے تاڑ کے درخت کاٹے جا رہے تھے کہ مالک سے لے کر پرجا تک کو چھت کی ضرورت تھی اور تاڑ سے بہتر شہتیریں کس درخت کی بن سکتی تھیں۔ اس لیے بے محابا آرے چل رہے تھے اور گول گول تاڑ کے تنے کٹ کٹ کر ڈھیر ہو رہے تھے۔

سہہ دیو بڑھئی کو سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ پورا خاندان ''کرنی بسولہ'' لیے کام کیے جا رہا تھا۔ یہ لوگ بڑے فنکار تھے۔ اس زمانے میں آرے مشین نہیں ہوتی تھی کہ دنوں کے کام گھنٹوں میں ہو جاتے۔ وہاں تو سب کچھ دست و بازو تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دل کے سچے تھے۔ زبان میٹھی تھی، کھلی فضا تھی، خوش مزاجی تھی، دکھ کو اوڑھتے نہیں تھے، مدادا کرنے میں کوتاہی نہیں تھی۔ کیا کمی کیا مالک۔ ایک سے ایک ہنرور، کیا رعیت اور کیا زمیندار سب ہی امداد باہمی پر یقین رکھتے تھے۔ گاؤں کے سربراہ اعلیٰ کی حیثیت سے ہشام حیدر نے یہ طے کر رکھا تھا کہ ان کی حویلی کی مرمت سب سے آخر میں ہوگی۔ پہلے رعیت اپنے گھروں میں جائے گی۔ فلسفہ یہ تھا کہ اگر ان کا گھرانہ تاروں کی چھاؤں سے نکل کر حویلی کی چھت تلے چلا گیا تو سب کچھ پردے میں چلا جائے گا اور رعایا تنہا ہو جائے گی اور کام کرنے کا یہ جذبہ باقی نہیں رہے گا جو اَب ہے۔ سب ہی کو آباد ہونا ہے۔ ایک طرف تو یہ دوڑ بھاگ تھی کہ کام جلد سے جلد نمٹایا جائے دوسری طرف رمضان کے آخری دن تھے اور عید سر پر تھی۔ ساتھ ہی ساتھ دیوالی بھی آرہی تھی۔ دونوں تہواروں میں بس چند دنوں کا فرق تھا اور گاؤں کا کمہار سخت پریشانی میں تھا۔

ایک طرف حویلی کی چھت کے لیے کھپرے ڈھل رہے تھے تو دوسری طرف ہر گھر کے لیے برتن چاہیے تھے۔ ہانڈی، صراحیاں، گھڑے، مٹی کے تھال، کوزے، تسلے اور پھر دیوالی کے کھلونے۔ کلہیاں، مٹھائیوں کے لیے چوگھڑے...... وہ بوکھلایا بوکھلایا رہتا۔ بیوی سے لڑتا، اس کو برا بھلا کہتا۔ بیٹے سے دبتا تھا کہ بیر جوان سارے دن دریا کے کنارے سے مٹی ڈھونے پر لگا رہتا اور ایک پہر رات رہتے مٹی گوندھنے میں لگ جاتا۔

ہشام حیدر صاحب کا گاؤں جس کا نام سوگاؤں تھا جس کے معنی تھے اچھا گاؤں۔ یہ گاؤں اس لیے بھی اہم تھا کہ اپنے جوار کا سب سے چھوٹا گاؤں تھا اور اس علاقے کے بیشتر حصے کے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ہشام حیدر اپنی نیک فطرت کے باعث غرور و رعونت سے عاری ایک بے ضرر انسان تھے۔ رعب و دبدبہ تھا لیکن کسی کو بے جا دبانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بس وہ اپنے اس چھوٹے سے گاؤں میں صلح و آشتی سے رہتے تھے۔ ایک گھر لوہار کا، ایک خاندان دھوبی کا، ایک گھر کمہار کا، کچھ گھر کوئیری کے اور گوالوں کے۔ ایک تیلی، ایک جولاہا غرضیکہ سارے ہنروروں کا ایک ایک خاندان جبکہ مالک بھی اس گاؤں کا اکیلا اکلوتا تھا۔ اس کا نہ کوئی سگا بھائی اور نہ کوئی بہن۔

اس گاؤں کی بھی عجیب کہانی تھی۔

کہتے ہیں کہ سوگاؤں ایک ایسی بستی تھی جس میں مالک نہیں رہتے تھے۔ بارہ چھوٹے بڑے گاؤں آس پاس تھے اور سارے کے سارے اتفاق سے ایک ہی خاتون کی ملکیت تھے۔ وہ بہت بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ شوہر اس سے بھی بڑا تھا۔ اسلام پور کا قصبہ ان کا دارالاقامہ تھا۔ سارا خاندان وہیں ہوتا تھا اور اس بارہ گاؤں کے رکھوالے مالک سے زیادہ رعیت تھے۔ چاہے بہت پڑھے لکھے تھے اور بڑے عہدوں پر تھے۔ چاہے زمین کا سینہ چیرتے تھے یا ایک دوسرے کی خدمت کرتے تھے۔ پر اپنی تمام شرافت اور نجابت اور علمیت کے باوجود۔ یہ ہشام حیدر کی اکلوتی پھوپھی کی زمین پر بستے تھے اور بڑے دبنگ لوگ تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ بی بی صاحب کے علاقے کے لوگوں کو کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لیتا۔

سال کے سال حویلی کی صفائی ہوتی۔ دوہری دیواروں کی یہ حویلی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈی، بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی رہتی۔ اس کے ساتھ ملحقہ بنگلہ تھا جو حویلی کا مردانہ حصہ تھا اور مقامی زبان میں مردانہ علاقے کو وہاں بنگلہ ہی کہا جاتا تھا۔ اس کے آگے ایکڑوں میں پھیلا ہوا میدان جسے ہر موسم کی سختی کے بعد گوبر اور مٹی سے لیپا جاتا تھا۔ یہ کھیل تماشا اور دیہاتی کھیلوں کی آماجگاہ تھا اور اس کے ساتھ لگا ہوا آموں کا شاندار باغ اور باغ کے قدموں میں لپٹی جمنا ندی بہتی تھی۔ جو برسات کے موسم میں ہر لمحے گاؤں والوں کو موت کا آغوش لگتی تھی۔ کبھی کوئی بچہ ڈوب جاتا اور کبھی گھاٹ پر کپڑا دھوتے ہوئے کوئی زبردست لہر کپڑے سمیت دھوبی کو بہالے جاتی۔ کپڑے سے لوگ ہاتھ دھو بیٹھتے لیکن دھوبی کبھی مبرا بیگھا۔ کبھی دھیرا بیگھا کے لوگوں کی مدد سے بچ جاتا یا پھر دریا کے کنارے اگے بڑے بڑے برگد کے درخت میں اٹک جاتا۔ ہاں جن کے کپڑے غائب ہوتے وہ کہتے، کچھ بھی نہیں داہو کا ایمان خراب ہے ورنہ آئے دن ایسی واردات کیوں ہوتی اور داہو ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہر ایک کے آگے جاتا۔ رو رو کے یقین دلاتا کہ وہ بے ایمان نہیں ہے۔ بس اس کی قسمت خراب ہے۔ وہ تو سارے زمانے کا میل دھوتا ہے۔ وہ بھلا اپنا ایمان کیوں میلا کرے گا اور وہ بھی پھٹے پرانے کپڑوں کے لیے کہ سوگاؤں میں کون دھن وان رہتا تھا۔ مالک ہوتے نہیں تھے اور یہاں کاشتکار اور ہنرور ہی رہتے تھے۔ سفید پوش جو صاحب علم تھے، صرف دو گھرانے تھے اور ان کے گھر بھی بی بی صاحب کی زمین پر تھے اور یہ دو گھرانے ہی ایسے تھے جو نہ کاشتکار تھے اور نہ ہنرور، یا دستکار بلکہ یہ پٹنہ، کلکتہ میں نوکریاں کرتے

تھے۔ کوئی جہازی تھا تو کوئی جامعہ ملیہ کا استاد۔ کوئی پڑھتا تھا تو کوئی پڑھاتا بھی تھا۔ سال میں ایک بار گھر واپس آتے طرح طرح کی چیزیں لے کر۔ خوبصورت لباس اور کپڑے مزے دار بسکٹ سفید رنگ کے مزے دار جن کے بیچ میں سرخ رنگ کی بندی لگی ہوتی۔ ڈھاکے اور کلکتے کی چھ گز کی بنگلہ ساڑھیاں، ڈبوں میں بند ناریل کا تیل، انگریزی پاؤڈر، روژ، خوشبو کی بوتلیں، انگریزی کلپیں، سونے کے گہنوں کے ساتھ رولڈ گولڈ کے زیورات بھی۔ ان کی بیگمات اونچی ایڑھی کی جوتیاں پہنے، روژ پاؤڈر سے چہرہ سجائے۔ لپ اسٹک جو اس پرانے زمانے میں بڑی شے تھی اس سے اپنے خوبصورت ہونٹ خوبصورتی سے سجائے آپس ہی میں لگی رہتیں کہ ان کے معیار کی خواتین سارے گاؤں میں نہیں تھیں اور بی بی جان کی حویلی عموماً اپنے تمام کروفر کے ساتھ بند ہوتی ملازمان دیکھ بھال کرتے رہتے اور کوئی پرندہ وہاں پر نہیں مار سکتا۔

گاؤں کی عورتوں کو گندم، چاول پھٹکنے اور اناج سنبھالنے سے فرصت ملتی تو پھٹے پرانے گودڑ لے کر کھنڈر لے اور سوزنی سینے میں لگ جاتیں۔ ان کی زمین بہت اچھی تھی اور دریا کے کنارے تھی لیکن آدھا اناج بی بی جان کے کارندے لے جاتے۔ طرح طرح سے مالگزاری لگ جاتی۔ بی بی جان کی غیر موجودگی میں کسی قسم کی بھی رو رعایت ناممکن تھی۔ ہاں جب سردیوں میں بی بی جان آتیں تو حویلی میں ہی نہیں سارے گاؤں میں زندگی دوڑ جاتی۔ بنگلے پر آتے جاتے مسافر ہر زمانے میں ٹھہرتے تھے لیکن جب بی بی جان گاؤں میں ہوتیں تو بنگلے کی رونق ہی کچھ اور ہوتی۔ جھاتی اور عرفانی ہمہ وقت بنگلے پر موجود۔ صوفے پر بیٹھے، گھاس پھوس جلا کر آگ تاپ رہے ہیں۔ لکڑیوں کے کندے سے الاؤ روشن ہے۔ گیارہ بجے رات تک انہیں ہر حال میں الاؤ جلائے رکھنا ہے کہ پٹنہ گیا کی گاڑیاں جب تک گزر جائیں، وہ بنگلے کا صدر دروازہ نہیں بند کر سکتے تھے کیونکہ ان گاڑیوں سے اسٹیشن پر اترنے والے مسافر اس چھوٹی سی بستی میں شب بسری کے لیے ادھر ادھر نہ بھٹکیں اور آس پاس کے لوگوں کو بھی اچھی طرح پتہ تھا کہ سوگاؤں میں شب بسری کے لیے بنگلہ اپنا صدر دروازہ کھولے بارہ مہینہ ان کا منتظر ہے۔ اسی لیے جو بھی مسافر ٹھٹھہ اسٹیشن پر اترتا تھا۔ سیدھے سوگاؤں کی طرف رخ کرتا۔ رات کے وقت ندی پار کرنے کی کوئی ہمت ہی نہیں کرتا تھا اور اگر باڑھ آیا ہوتا تو پھر منومیاں کی کوٹھی کا احاطہ یا برآمدہ ان کا ٹھکانا ہوتا اور اس پناہ گاہ کے لیے نہ ذات کی قید نہ مذہب کی۔ بس انسان ہونا ہی کافی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کوہر بن جو سوگاؤں اور ٹھٹھہ کے درمیان ایک نالہ تھا۔ برسات میں اس میں ہاتھی ڈباؤ پانی ہوتا تھا اور رات کے وقت کوئی گھرنئی (Ferry) وہاں نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے منومیاں جو مانک گنج بڈکا کے ایک بنگالی مسلمان تھے۔ تجارت کی غرض سے یہاں آگئے تھے اور منومیاں کا مل، منومیاں کا باغ منومیاں کی کوٹھی۔ مسافروں کے لیے مددگار معاون کوئی کسی سے نہیں پوچھتا تھا کہ تم کون ہو اور اگر بارش یا سیلاب نہیں ہے تو بھی۔ شب بسری کے لیے سوگاؤں ہی ان کی قیام گاہ تھا۔ چاہے مسافر اکیلا ہو یا خاندان کے ساتھ اس سے کسی کو بھی غرض نہیں تھی۔ وہ رات کے وقت جمنا پار نہیں کرتے تھے اور بی بی جان کا حکم تھا کہ ان کی خاطر مدارت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔ اسی لیے حویلی والوں کا طریقہ تھا کہ رات کا کھانا پٹنہ، گیا کی گاڑیوں کے پاس ہونے کے بعد کھایا جاتا تھا۔ وہ اس لیے کہ اگر کوئی مسافر آجائے تو بھوکا نہ سوئے۔

بی بی جان اگر حویلی میں موجود ہوتیں تو کھانا شاہانہ ہوتا، ان کا اصول تھا کہ جو خود کھاؤ وہی ملازموں کو کھلاؤ اور مسافر تو مہمان ہوتے، ان کو خود سے اچھا کھلاؤ۔

بی بی جان کے ملازمین اچھی طرح جانتے تھے کہ بی بی جان کھانا سب سے آخر میں کھاتی تھیں۔ یہ نہیں کہ ملازمین کے ساتھ نہیں۔ وہ اپنے وقت سے کھا لیتے تھے...... ان اکیلی کے لیے لمبا چوڑا دسترخوان بچھتا تھا۔ بڑے شاہانہ انداز میں کھانا سینی

میں لگ کے آتا۔ وہی سب کچھ ہوتا جو سب کھا چکے ہوتے لیکن پیش خدمت سے لے کر ذاتی کنیز بھی باادب موجود ہوتیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پہلے نوالے کے ساتھ کوئی سوالی آ جاتا تو خوان کا خوان اٹھوا کے باہر بھجوا دیتیں۔ خود چنے کا ستو، کچی پیاز، مرچ اور نمک کے ساتھ نوش کر لیا۔ حالانکہ خانساماں ہوا فوراً کچھ نہ کچھ پکانے کو تیار ہو جاتیں۔

لیکن بی بی جان فرماتیں، انہیں چنے کا ستو پسند ہے۔ آخر آدھے سے زیادہ گاؤں کھاتا ہے تو پھر اگر انہوں نے کھا لیا تو کیا فرق پڑے گا۔ وہ بھی انسان ہیں۔ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز نہیں

گاؤں والے بی بی جان پر جان دیتے تھے اور ان کے گماشتے مختار کار یا کسی کارندہ کی مجال نہیں تھی کہ کسی کا استحصال کر سکیں۔ اس گاؤں میں کوئی خالی پیٹ نہیں سوتا تھا۔ جبر کہیں نہیں تھا۔ بارہ محال کی مالکہ تھیں بی بی جان۔

غرور، نخوت پاس سے نہیں گزرے۔ رہتی بہت ٹھاٹ باٹ سے تھیں، کہنے کو اکیلی جان تھیں وہ لیکن کم از کم پچاس جانیں ان کی ذمہ داری تھیں، ملازمین اور ان کا خاندان...... انہیں اپنے ہی جگر و جان لگتے تھے اور وہ سارے بھی ان پر جان وارتے تھے۔ سارے حویلی میں اہلی گہلی گھومتے رہتے، راہداریاں آباد۔ شہ نشیں پر بی بی جان کے بیٹھنے اٹھنے کا انتظام۔ بلاوجہ کی آواز بھی نہیں تھی لیکن اکیلے اٹھنے بیٹھنے کا دکھ یا سوت کا سوت بھی نہیں تھا۔ بی بی جان پردہ نہیں کرتی تھیں، کبھی انہوں نے برقعہ نہیں اوڑھا۔ ہاں چادر ہمیشہ ان کے سر پر ہوتی تھی۔ لباس بھی دودھ جیسا سفید۔ اپنا رنگ گندم کی طرح سنہرا۔ قد کاٹھ پانچ فٹ آٹھ انچ تندرست ہاتھ پاؤں آواز میں ٹھہراؤ اور اثر، ملازمین ایک اشارے کے منتظر رہتے۔ یہاں سو گاؤں میں جب تک رہتیں حویلی کا بڑا پھاٹک کھلا رہتا۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ اگر کسی مسافر کے ساتھ خواتین ہوتیں تو ان کی موجودگی میں انہیں حویلی کے اندر ہی ٹھہرایا جاتا اور اگر نہ ہوتیں تب بھی ڈیوڑھی سے ملحقہ کمرہ خواتین مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ انتظام ایسا تھا کہ کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ اگر خود موجود ہوتیں تو خود بھی ان کی دیکھ ریکھ کا خیال رکھتیں۔

کیا اپنے کیا پرائے سب ہی انہیں دعائیں دیتے لیکن پتہ نہیں اتنی دعائیں حاصل کرنے والی بی بی جان کی مانگ بھی اجڑ گئی اور گود بھی خالی تھی۔ خاندان تو ہم پرست تھا۔ اس لیے خاندان کی سہاگنیں کبھی ان کے سامنے اپنی شادی شدہ زندگی کا ذکر نہیں کرتی تھیں اور نہ ہی کبھی اپنے بچوں کو قریب جانے دیتیں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ سارے خاندان کے لیے بی بی جان نحوست کی علامت تھیں۔ مرد اس چکر میں نہیں پڑتے تھے اور عورتوں کو اس بیماری سے کوئی شفا نہیں دلوا سکتا تھا۔ بی بی جان نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنی جاگیر کے اس چھوٹے سے گاؤں میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جائے۔

سو وہ عموماً سردیوں کا سارا موسم، فصل خریف سے لے کر ربیع کی بیجائی تک وہیں ہوتیں۔ پھر بوڑھے باپ کا خیال انہیں اسلام پور کھینچ بلاتا۔ بھائیوں کو باپ سے زیادہ جائیداد کی فکر تھی۔ بھاوجیں بھی گھاس نہیں ڈالتیں، جہاں سب کی نگاہوں میں بی بی جان منحوس تھیں، وہاں ان کی بارہ گاؤں کی جاگیر پر تینوں بھاوجوں کی نظر تھی۔ وہاں سب سے چھوٹا بھائی ان سب باتوں سے بے نیاز، راج گیر کی پہاڑیوں اور جنگلات میں اِدھر سے اُدھر شکار کھیلتا پھرتا۔ اس نے کتنے ہی ہرن اور سانبھر شکار کیے تھے۔ شیر دیکھے تھے، مارے نہیں تھے کیونکہ راج گیر کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس جنگل میں شیر کا شکار مخدوم صاحب کو ناراض کر دے گا۔ عجیب و غریب معاشرہ تھا وہاں کا، ایک طرف ہندوؤں کا کنڈ تھا، دوسری طرف مسلمانوں کا کنڈ۔ دونوں اپنی اپنی طرف نہاتے۔ ایک کنڈ ٹھنڈا تو دوسرا گرم۔ کہیں دیوی جی کا کرم ہے تو کہیں مخدوم صاحب کی دعائیں۔ کوئی اس کے ساتھ سائنٹفک وجوہات تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا تھا۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ پہاڑوں کے اندر کہیں گندھک یا کوئی آتش فشاں عناصر۔ بس

ایک چھوٹے میاں ان باتوں کو نہیں مانتے تھے۔ پھر بھی شیر کو قریب سے گزر جانے دیا۔ اس پر بندوق نہیں تانی۔ اس لیے کہ مزار کے آس پاس شیر کو مارنا بستی اتار دینے کے مترادف تھا۔ اس کی بے نیازی، خدا ترسی اور خدا کی مخلوق سے محبت سے بی بی جان بھی بہت متاثر تھیں اور وہ اس کی اور بابا جان کی محبت ہی تھی کہ وہ سوگاؤں سے اسلام پور آتیں تو وہیں کی ہو رہتیں۔

اس بار جب اسلام پور میں انہوں نے قدم رکھا تو دیکھا کہ حویلی دلہن کی طرح سجی ہے۔ ساری دیواریں چونے اور چاول کے آٹے سے چھاپی گئی ہیں۔ بڑے پھاٹک پر اشوک کے پتے ڈوری میں باندھ کے لٹکائے گئے تھے اور کیلے کے تھم دروازے کے دونوں طرف گاڑے گئے تھے۔ بڑے آنگن میں منڈوا تانا گیا تھا اور مہندی کے پودے تلے سرخ ناڑے اور گیندے کے پھول سے سجی ہوئی پیڑھی رکھی تھی جس کے چاروں پایوں میں سنہرے روپہلے گوٹے بندھے ہوئے تھے۔

''یہاں کس کی شادی ہے اور اگر سچ مچ شادی ہے تو انہیں خبر کیوں نہیں؟'' وہ ڈیوڑھی میں سواری سے اتر کے ہر قدم پر سوچتی ہوئی بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''رے لوا ے ہو، آ گئیں۔'' بڑی بھابھی نے پریشان ہو کر دیکھا ''ان کو کس نے خبر کی۔'' انہوں نے ہواؤں میں استفسار کیا اور ہوا ہی سے جواب آیا۔

''پتہ نہیں جی......''

''ہم نے اسی لیے کسی رشتہ دار کو نہیں بلایا کہ کہنے کو ہوگا ہم نے کسی کو نہیں بلایا لیکن ان کی نحوست تو......''

''دلہن بڑی۔ بی بی جان اس گھر کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ رشتہ دار نہیں ہیں۔ آپ کس طرح کی باتیں کرتی ہیں۔'' جوہی پرانی نمک خوار تڑپ کے بولی۔

''افوہ بھئی، ان کے بیٹی یا بہن ہونے میں کس کو کلام ہے مگر ہیں تو نحوست کی پوٹ۔'' چھوٹی بھابھی نے جیسے بی بی جان کو سنایا۔

''کیسی بات کرتی ہیں آپ دلہن بی بی۔ سارا سوگاؤں ہماری بی بی جان کے واری صدقے ہوتا ہے۔ ایک بھی شادی ان کی شرکت کے بغیر نہیں ہوتی۔ سارا گاؤں پھل پھول رہا ہے۔'' چمیلی نے جوہی کے گلے لگتے ہوئے چہک کے کہا۔

''بس چپ کر جا چمیلی، یہاں اسلام پور میں تو سب...... مطلب ہے لوگ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں......'' جوہی نے چمیلی کو پیار کرتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیا سب لوگ کہت ہیں، ہمیں بھی پتہ ہے اور تم یہی تو نا جانت ہو۔''

''چپ کر جا چمیلی، ہم کو بھی سب معلوم ہے۔''

''کچھ بھی نہیں جانت ہو، یہاں تو بدفالی کی عادت ہے۔ ان کے آپس میں محبت جو نہیں، ہماری بی بی جان تو بے غرض ہیں......اور ہاں بڑی محبت والی ہیں......''

''وہاں سوگاؤں میں سارے شگن بی بی جان کے سائے میں کیے جاتے ہیں۔ دولہا دلہن بی بی جان کا آنچل چھو کے سلام کرتے ہیں۔ کوئی بدفالی نہیں ہوتی۔ ساری بستی ہنستی کھیلتی گاتی بجاتی بس رہی ہے واہ......''

''اور یہ دلہن بی بی، انہیں تو بہانہ......''

چمیلی بی بی جان کا اتنا بڑا سا پاندان تپائی پر رکھ کے وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی اور ہونٹ سختی سے بند کر لیا۔

بڑی دلہن بی بی غضب ناک انداز میں سامنے کھڑی تھیں۔
چمیلی لاکھ بی بی جان کی منہ چڑھی تھی لیکن تھی تو ملازمہ...... اور ملازمہ کسی کی بھی ہو، ان گھرانوں میں پاؤں کی جوتی بھی شاید مہنگی تھی لیکن یہ خانہ زاد بے قیمت تھے اور دلہن بی بی کی شان مبارک دیکھ کر چمیلی کی روح نکل گئی۔
''یہاں کیوں بیٹھ گئی، جا بی بی جان کے پاس۔'' جوہی نے جلدی جلدی آلو چھیلتے ہوئے ایسے کہا جیسے کسی کو دیکھا ہی نہیں۔
''ہاں ہم جا رہے ہیں، ان کا پاندان بھی ہمارے پاس ہے اور پان کے بغیر وہ رہ نہیں سکتیں۔'' چمیلی اپنی روح کو سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
''تو نے ابھی کیا کہا؟'' دلہن بیگم کا خوبصورت چہرہ سرد اور بے جان ہو رہا تھا۔
''کیا......؟ کچھ بھی نہیں، جی دلہن بیگم۔ بس اس کی سمجھ میں نہیں آتا نا۔ ان کی نوکرانی جو ہوئی ورنہ آپ کوئی غلط کہتی ہیں۔ ہمارا سارا گاؤں ہی اس دن کو روتا ہے۔ اس دن رحمو کی ماں سے مولوی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ بی بی جان کے لباس کی سفیدی بڑی منحوس ہے، سہاگنوں کو ڈرنا چاہیے۔'' مارے خوشامد کے جوھیا آپ ہی آپ جھوٹ کی دیوار اٹھائے چلی جا رہی تھی۔
''بالکل ٹھیک اور پھر دیکھنا جوھیا۔ شادی کے گھر میں ان کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے اس زمانے میں شادی رکھی ہی اس لیے تھی کہ یہ اپنی جاگیر پر تھیں۔ اب بھلا چھوٹے میاں کی قسمت...... اللہ خیر ہی رکھے۔''
''ہاں جی اللہ خیر رکھے گا۔ اس چمیلی کی مت ہی ماری گئی ہے دلہن بیگم۔ جی ورنہ سب کو پتہ ہے کہ نحوست صرف نحوست ہوتی ہے۔ آپ ہی دیکھو ۱۲ سال کی عمر میں بیاہی گئی اور چار سال کے بعد رانڈ ہو کر آ بیٹھیں۔ اوپر سے گود بھی خالی۔''
''ہاں! گود بھی خالی ہے لیکن دولت تو دیکھو بارہ گاؤں کی جاگیر......''
''مگر بی بی یہ تو ان کا اپنا حصہ ہے نا جی۔ ان کے میاں نے ان کے نام دین مہر کے عوض لکھ دیے تھے۔ یہاں سے اس جائیداد کا کوئی تعلق نہیں۔'' جوھیا نے چھری اور آلو تسلے میں رکھتے ہوئے عقل مندی سے کہا۔
''ہاں یہ تو ہے مگر جوھیا اتنی بڑی جائیداد اور یہی تو بڑی مصیبت ہے، پتہ نہیں......؟'' بہو بیگم گومگو کے عالم میں چپ ہو گئیں۔ ''لے ذرا پکڑ اسے۔'' بڑی دلہن نے بیٹے کو جوھیا کے حوالے کیا۔ سامنے سے چھوٹے میاں کلائی میں کنگنا باندھے، گاتے گنگناتے ہاتھ میں شکار کی مرغابیاں پکڑے چلے آ رہے تھے۔
''ارے بھیا کل تمرا بیاہ ہے اور تم آج بھی شکار...... پرندے معصوم ہوت ہیں ان کی دعا لینا چاہیے۔'' جوھیا نے بزرگی جتائی۔
''بس بس چل اپنا کام کر۔''
''یہ بیچاریاں کیا بددعا دیں گی، گھر میں تو مجسم نحوست آ موجود ہوئی ہیں پھر بھلا......'' بہو بیگم کے گلابی لبوں سے چنگاریاں جھڑ رہی تھیں۔
''ارے۔ ہائیں ہماری بی بی جان آئی ہیں......'' اور چھوٹے میاں ہمک کے بابا جان کے کمرے کی طرف دوڑے۔
وہاں بی بی جان، بابا سے پوچھ رہی تھیں۔
''بابا جان حویلی میں کس کی شادی ہے۔ کوئی مہمان بھی نہیں ہے، آپ نے کسی کو بلایا ہی نہیں۔''
''ہماری شادی ہے۔ مہمان بھی آ گئے ہم نے تو انہیں بلا ہی لیا۔'' چھوٹے میاں نے بہن کے گلے میں بانہیں ڈال دیں تو کنگن پر نظر پڑی ''ارے واہ جیتے رہو، ہمارے بغیر تم نے کنگن بھی بندھوا لیا۔ اکیلے ہی اکیلے حالانکہ ہم تمہاری اکلوتی بہن ہیں

اور ہم آنے ہی والے تھے۔''

''ارے ہاں بی بی جان تمہارے آنے کا پتہ ہی نہیں تھا اور وہ بڑی بھابھی کو بڑی جلدی تھی۔ پھر میرا کوئی واسطہ ہی نہیں، ان رسوم سے آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''انہوں نے ہماری بہن بن کے کنگن باندھ دیا کہ پتہ نہیں تم آؤ بھی یا نہیں۔''

''بہن تو وہ ہیں پچازاد اور دراصل، وہ میری نحوست سے بہت خوفزدہ رہتی ہیں۔'' بی بی جان مسکرائیں۔

''کیسی نحوست اور کہاں کی خرابی۔ یہ سب ان کے اپنے شاخسانے ہیں۔'' اس نے چٹاچٹ بہن کا منہ چوما۔

''اچھا......'' بی بی جان ہنسیں ''سب ہی مجھے منحوس کہتے ہیں چھوٹے۔''

''سب سے بڑی نحوست تو بی بی جان بڑی بھابھی کی سوچ ہے۔''

''ہاں خیر وہ تو ہے ہی۔'' بی بی جان کھلکھلا کے ہنس پڑیں تو چھوٹے میاں بھی بے تحاشا ہنسنے لگے۔

''ارے بندر تو نے انہیں کیوں نہیں بتایا کہ میں بس پہنچنے ہی والی ہوں۔''

''اوہ ہم ان کو کیا بتاتے، وہ تو سارے وقت کہتی پھر رہی تھیں، ہم کسی رشتہ دار کو بارات میں نہیں بلائیں گے۔ ہاں بھلے ولیمے میں سب ہی آجائیں۔''

''ساتھ ساتھ یہ گل افشانی بھی ہوتی، کون جانے کس کی نظر کیسی ہے اور کس کا سایہ کیا گل کھلائے۔ ہمیں تو یہی سایہ چاہیے تھا......'' ہنستے ہنستے چھوٹے میاں نے بہن کا آنچل سر پر ڈال لیا۔

''اچھا تو یہ سب کہا جا رہا ہے۔'' بی بی جان بھی ہنس رہی تھیں۔

''کون کون ہے بھئی۔''

''ارے سب ہی ہیں۔ تینوں کی تینوں۔''

''کیوں بابا جان۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ کیا بکتے ہو۔''

''اور بیٹی ہم نے سب سے پہلے تمہیں خط لکھا تھا۔ تم نے خود ہی آنے میں دیر کی۔''

''جی بابا جان، وہ تو آپ نے لکھا تھا فوراً پہنچو۔ شادی کا ذکر تو......؟''

''سوچا تھا خود بتائیں گے۔'' بابا جان مسکرائے۔ ''اور وہ تو بے وقوف ہیں اس لیے یہ سب ہوا اور بٹیا تم نے بھی پہنچنے میں دیر کر دی اور ان کی زندگی میں تو مفروضے، وہم اور گمان ہی اہم ہے۔''

''جی بابا جان وہ اپنے میر صاحب بھی کہہ گئے ہیں ؎

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا''

''اور ہماری بی بی جان تو یقین و اعتماد کا منبع ہیں۔''

''اچھا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بنو نہیں، چلو جاؤ یہاں سے، ویسے یہ سب دکھاوا ہے۔ انہیں کیا دلچسپی ہے...... تم میرے بھائی ہو، ان کے نہیں۔ ان تمام ڈھکوسلوں میں بھی ان کی غرض ہو گی۔''

"ارے وہ تو بے بی صرف تم منحوس ہو ورنہ وہ تمہاری وسیع وعریض جائیداد بالکل منحوس نہیں۔"

"ارے یہ تو کہہ رہا ہے۔" بی بی جان کے لہجے میں برہمی تھی۔

"ارے بی بی جان اللہ اللہ کریں، یہ ہم نہیں وہی دو جمع تین کہہ رہی ہیں۔"

"او ہو پھر تو بھئی ٹھیک ہے۔ ہم منحوس ہیں تو وہ جائیداد کچھ زیادہ ہی منحوس ہوئی نا کہ میرے نام ہوتے ہی میرے سر کا تاج بھی چھن گیا اور گود تو کبھی بھری ہی نہیں، پھر خالی کیا ہوگی۔"

"نہیں نہیں بی بی جان —— تم مایا کو منحوس کہہ رہی ہو۔ ارے بی بی......"

"یہ بات میں انسان ہو کر منحوس ہوں تو یہ جاگیر تو سچ مچ مٹی ہے۔"

"اللہ بی بی جان، یہ کیا بات ہوئی۔ یہ مٹی تو ہے مگر مٹی مایا ہے اور مایا منحوس ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ہیں، کیوں بھئی، یہ کیا بات ہوئی۔"

"ارے بی بی جان وہ اپنے تلسی داس بھی کہہ گئے ہیں۔

مایا سے مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ
تلسی داس غریب کی کوئے نہ بوجھے بات"

"چپ مداری، بہت باتیں بنانا آ گئی ہیں۔ واہ...... میں کچھ نہیں اور مایا......؟"

"باتیں سمجھا کرو بی بی جان۔ یہ میں کب کہتا ہوں، یہ سب تو مایا جال جس میں وہ بندھی ہوئی ہیں۔ مجھے تو تمہارا سایہ چاہیے، مایہ نہیں۔ اور بی بی جان میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو نا...... باقی سب کچھ تو وہ ہیں جن کا مجھے اعتبار نہیں۔"

"ہاں بالکل، میں تیری ہوں۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ پھر سن لے چھوٹے، اگر میں تری ہوں تو میرا سب کچھ بھی تیرا ہے۔ بابا جان گواہ رہیے گا کہ میری ساری جاگیر اس کی بڑی اولاد کی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" بی بی جان نے ہاتھ پھیلایا۔

"ہاں بالکل سوا سولہ آنے ٹھیک ہے مگر دیکھو مکر نہ جانا۔" اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"بابا جان گواہ رہیے گا۔"

بابا جان ہنسنے لگے۔ ساری باتیں، سارے مکالمے مذاق ہی مذاق میں ہوئے۔ باہر کھڑی بہو بیگم اوپر اوپر سے دہلتی رہیں وہ اندر ہی اندر اتنی بڑی جاگیر کے ہاتھ سے نکل جانے کے خیال سے ہی پگھلی جا رہی تھیں۔

دوسری طرف تقدیر ان کے اس مذاق پر ہنس رہی تھی۔ شام ہو رہی تھی۔ بستی والے جمع ہونے لگے۔ چمیلی کے منڈوے کے دولہا میاں کی چوکی رکھی گئی جس کے چاروں طرف چاندی کی کلسی کٹوری تھی۔ باہر سے کوئی مہمان نہیں آیا تھا، سارا انتظام ایک طرف مہمانوں کا نہ ہونا، دوسری طرف بی بی جان بولائی ہوئی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ اس گھر میں آخری شادی ان کی ہوئی تھی، پندرہ دن پہلے ہی سے سارے جمع ہو گئے تھے۔ میلے کا سا سماں تھا اور اب...... یہ کیسی شادی ہو رہی ہے۔ اگر یہ بستی والے نہ ہوتے تو یہ شادی...... تب اماں زندہ تھیں۔ اب بڑی بھاوج کا راج ہے۔ یوں تو بڑی دریادل تھیں لیکن ایک ایک پائی کو دانت سے پکڑتی تھیں۔ بابا کچھ مسجد اور کچھ مصلے کے ہو کر رہ گئے تھے۔ بی بی جان نے استفسار کیا تو بابا ہنس دیے۔

"سب آ جائیں گے بیٹا۔ یہ سب اس چھوٹے کی کارستانی ہے کہ جب تمہاری بھاوج نے نحوست کا نعرہ لگایا تو اس نے

بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں بدمزگی نہیں چاہتا تھا، وہ کہتا ہے کہ بلاوجہ کی رسم وغیرہ نہیں ہونی چاہیے اور پھر لڑکی والے ذرا غریب ہیں، اس لیے......''

''کیا غریب......؟ کیوں......؟؟ فہمیدہ کے گھر والے کیوں غریب ہو گئے؟'' بی بی نے حیرت سے بابا جان کو دیکھا۔

''فہمیدہ کہاں بی بی۔ یہ تو کوئی اور ہی گل نسرین ہیں۔'' چھوٹی بھابھی نے زور سے آواز لگائی۔

''کیا...... یہ کیا بات ہوئی، ہمیں کیوں نہیں بتایا گیا۔ لو بھلا اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔ فہمیدہ کے ساتھ اس کا رشتہ تو اماں بی طے کر گئی تھیں، پھر اچانک ہی ایسا کیوں ہوا......؟'' بی بی جان کی آواز میں صدمہ تھا۔

فہمیدہ ان کے مرحوم شوہر کی بہن تھی اور اس طرح ان کا خیال تھا کہ بیٹو بھائی کی سسرال ہوگی تو اس طرح ان کا بھی بھرم قائم رہے گا کہ ان کی بھی وہی سسرال تھی۔ کم عمری کی بیوگی تھی، دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ یہ بہار والے ہندو رسم رواج سے متاثر تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ حق مہر اتنا زیادہ باندھا جاتا تھا کہ سات پشتیں نہال ہو جاتی تھیں اور وہ بھی بارہ گاؤں کی شہزادی تھیں۔ کچھ باپ کا دیا کچھ سسر کا دیا۔ سسر بھی غیر نہیں تھے، سگے تایا تھے۔ پھر یہ فہمیدہ کی بجائے کوئی اور......'' اب فہمیدہ کا کیا بنے گا......'' بے خیالی میں ان کے منہ سے نکلا۔

''کچھ نہیں بنے گا۔ فہمیدہ کے گھر والوں نے ہی ناں کر دی کیونکہ چھوٹے میاں تمہارے بھائی ہیں۔ تم نے اپنے میاں کو کھا لیا، اس لیے اگر چھوٹے میاں کا سایۂ بد کہیں فہمیدہ کو......'' چھوٹی بھابھی نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ایسی بات ہے۔ آپ نے ہم کو وقت سے بتایا ہوتا تو پھر ہم دیکھتے کہ کون منحوس ہے۔'' بی بی جان نے اپنی سونی کلائیوں کو غور سے دیکھا۔ آگے بڑھیں اور چوکی پر بیٹھے میاں ظہور یوسف کا کف پکڑ کے کھینچا جن کے سر پر پگڑی باندھی جا رہی تھی۔

''کیا ہے بی بی جان، یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ دیکھتیں نہیں دولہا سنوارا جا رہا ہے ...... اور تم......'' بڑی بھاوج نے جھنجھلا کے انہیں دیکھا۔ اس وقت وہ سچ مچ دہل گئی تھیں کہ ان کا سفید آنچل انہیں نحوست کا پرچم لگا......

''ظہور یوسف تم ذرا یہ بتاؤ کہ وہاں تمہیں سچ مچ منحوس کہا گیا ہے......'' بی بی جان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''ادھر آئیے بھابھی جان۔'' فہمیدہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز سے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کسی نے کسی کو منحوس نہیں کہا ہے۔ دراصل یوسف کو خود ایک لڑکی پسند آ گئی۔ مجھے کہا تم انکار کر دو۔ سو میں نے اماں کو پٹی پڑھائی۔ خدا کی قسم بھابھی۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا خاندان تو ہمات کے جال میں گرفتار ہے اور یوسف کو اس نسبت سے چھٹکارا دلوانے کا اور کوئی طریقہ بھی نہیں تھا۔'' فہمیدہ نے اپنی اجڑی ہوئی بھابھی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تمہیں افسوس نہیں ہوا۔'' بی بی جان نے فہمیدہ کو غور سے دیکھا۔

''اتنے دنوں سے ان کے نام سے منسوب بھی تھی۔ افسوس تو فطری عمل ہے بھابھی۔ خیر کوئی بات نہیں زبردستی کا سودا بوجھ ہی بنتا ہے۔ پھر ہمارا کوئی مسئلہ بنا بھی نہیں۔ وہ ہمارا خالہ زاد زبیر ہے نا، وہ تو جیسے اس موقعے کا منتظر تھا۔''

''مگر اس نے ایسا کیوں کیا...... اور یہ گل نسرین کون ہے؟''

''ارے یہ سب کچھ نہیں۔ یہ نام تو بھابھیوں کے شاخسانے ہیں۔ کون ہے کا پتہ شاید بڑے ابا کو ہو تو یہاں کسی کو کچھ نہیں معلوم صرف قیاس آرائیاں ہیں۔''

''میں نے صرف یہ سنا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ ظہور یوسف کی کلاس فیلو ہے شاید یا کسی محفل میں ملاقات ہوئی تھیں۔ چلیں آپ آگے بڑھیں، بارات سج کر آگے بڑھنے کو تیار ہے۔'' فہمیدہ بڑے آرام سے بلا جھجک پٹر پٹر بول رہی تھی۔ بی بی جان نے اسے دہل کے دیکھا کہ یہ انیسویں صدی کا اواخر تھا یعنی یہ ۱۹۸۵ء تھا اور اس وقت کسی لڑکی کی انگریزی تعلیم یا اس سے ملاقات کا کیا سوال......؟ فہمیدہ کو بھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ بی بی جان کی استفسارانہ نظر دیکھ کے فہمیدہ وضاحتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔

''بھابھی خدا گواہ ہے، مجھے یوسف نے کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس نے دہائی دی تو میں نے اماں کو نحوست نامہ سنا دیا۔ باقی وہ کون ہے، کیا ہے، شاید بڑے ابا کو پتہ ہو ورنہ یہاں صرف چھوٹے میاں ہی چھوٹے میاں ہیں اور بس......''

بڑے اور منجھلے بھائی ناراض ہیں۔ بڑی بھاوج کو تو جیسے بہانہ ہی ہاتھ آ گیا ہے کٹوتی کا۔ نہ بری سجائی اور نہ زیور بنوایا، بس ایک شاہانہ اور ایک چوتھی کا جوڑا بنوا دیا اور کہا......''غریب ہیں، کیا فائدہ اور زیور......زیور بھی کچھ نہیں بس چچی جان مرحوم کی ہی ایک آدھ زیور ڈالا ہے جیسے چندن ہار......''''مگر یہ ہے کون......''

''پتہ نہیں بی بی جان آپ چھوٹے میاں سے ہی پوچھ لیں۔'' پاس سے گزرتی چھوٹی بھابھی نے جواب دیا۔

''ان سے کیا پوچھیں۔ انہوں نے اگر مجھے اس لائق سمجھا ہوتا تو اور بات تھی۔ ہمیں تو سارے ہی مجسم نحوست سمجھتے ہیں۔''

''کمال ہے بی بی کوئی آپ کو کچھ نہیں کہتا۔ آئیے آپ مجھے پیار کریں......میرے سر پر اپنے آنچل کا سایہ تو ڈالیں......میں آپ کو ابھی سب کچھ بتاتا ہوں......''

چھوٹے میاں دولہا بنے سفید کمخواب کی شیروانی میں چمک رہے تھے......بی بی جان نے نظر بھر کے دیکھا اور آیت الکرسی کا ورد کرنے لگیں کہ کہیں سچ مچ ہی اسے نظر نہ لگ جائے۔

''آپ خفا ہیں؟'' اس نے بہن کی پیشانی چومی۔

''بی بی جان آپ کو شیخ جی یاد ہیں؟''

''ہاں کون، وہ نو مسلم جنہوں نے ایک طوائف سے شادی کی تھی؟'' بے خبری بی بی جان اچھی طرح باخبر تھیں۔

''ہاں وہی......''

''ان کا کیا ذکر ہے؟''

''یہ لڑکی جس سے میں شادی کر رہا ہوں، انہیں شیخ جی کی بیٹی ہیں۔''

''ہائیں۔ چھوٹے میاں یہ کیسی انہونی ہے۔''

''کچھ بھی نہیں، ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں۔ وہ اتنی پیاری ہے کہ آپ جب دیکھیں گی تو......'' چھوٹے میاں نے پگڑی ہاتھ میں اتار لی۔

بی بی جان کا چہرہ اتر گیا، پاس کھڑی فہمیدہ کا خوبصورت چہرہ پیلا ہوا جا رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ ظہور یوسف نے اسے اس نو مسلم لڑکی کے لیے ٹھکرایا تھا وہ جو اس کی کلاس فیلو تھی یا کچھ اور......

''پتہ نہیں یوسف میرا دل......'' بی بی جان کو زمین و آسمان گھومتے نظر آئے۔ وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا بٹیا۔'' بابا جان لپکے۔

''کچھ نہیں چچا جان، بی بی جان کو یوسف کی شادی......؟''

''ارے وہ کچھ نہیں ہے۔ میں نے ہی اسے اجازت دی ہے۔ وہ بچی ہمارے یار امکا پرشاد کی پوتی ہے۔ اچھے ہیں سارے، کہیں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ بے عیب ذات صرف اللہ کی ہے۔ میرا بیٹا بہت بڑا ہیرو ہے۔'' بابا جان نے بی بی جان کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''اب سمجھ میں آئی میری بات کہ بارات پر کسی رشتہ دار کو کیوں نہیں نیوتا دیا۔''

''اور بڑی بھاوج میری نحوست کا ڈنکا پیٹتی رہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے، انہیں کیا پتہ ہے کہ کون کیا ہے، بس لڑکی متوسط طبقے کی ہے، شریف لوگ ہیں۔ بس انہیں یہی بتایا گیا ہے جبکہ لڑکی لکھ پتی ہے۔''

''اچھا جی......'' بی بی جان آنسو پونچھ کے مسکرائیں۔

''ہاں جی، اس نے مجھے فتح کیا ہے اور اسی لیے وہ لکھ پتی، کروڑ پتی سب کچھ ہے اور فہمیدہ نے بڑا ساتھ دیا ہے میرا۔ بڑی فہم ہے دیکھو ایسا اچھا بر ملا ہے اسے۔'' سامنے سے زبیر چلا آ رہا تھا، چمکتا دمکتا گورا چٹا۔

''ہاں بالکل۔ ماشاءاللہ......مگر تم......''

''ہاں ہم......ہم تو بی بی جان ہم ہیں......'' چھوٹے میاں نے بسم اللہ کر کے سجی ہوئی بارہ دری میں قدم رکھا۔ ابھی دس کوس کی مسافت طے کرنی ہے۔ باقی بارات سوگی (بیل گاڑی) پر جائے گی۔ شام تک کہیں یہ شیخوپورہ پہنچیں گے۔ بی بی جان نے سوچا۔ نکاح ہوگا......اور تب...... یہ بارات کتنے دن وہاں قیام کرے گی۔ وہ پہلی بار بڑی بھابھی سے مخاطب ہوئیں۔

''پتہ نہیں جی، تم خود ہی بابا جان سے پوچھ لو۔'' بڑی بھابھی نے اپنا منا جو ہی کو پکڑایا۔ انہیں بارات کے ساتھ جانا تھا اور زیور کی صندوقچی کی کنجی نہ جانے وہ کہاں رکھ کے بھول گئی تھیں۔

''ارے واہ، آپ بارات کے ساتھ جا رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ پتہ نہیں ہے۔''

''ہاں تو اور کیا، ہم کو کسی نے یہ تک نہیں بتایا ہے کہ بارات جا کہاں رہی ہے۔ بس نادر شاہی حکم سنا دیا گیا کہ بارات کے ساتھ جانا ہے۔ غضب خدا کا مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ کون لوگ ہیں۔ ابھی ابھی بابا میاں نے بتایا کہ امکا چاچا کی پوتی ہے۔ حد ہوگئی اور کوئی نہیں رہا تھا، بس امکا پرشاد کی پوتی ہی رہ گئی تھی ہمارے گھر کے لیے۔'' بھابھی غصے سے پھوں پھوں کرتی بولیں۔ بی بی جان کوئی جواب دینے کی بجائے دالان کی طرف پلٹ گئیں۔

''بی بی......بی بی جان بات سنو۔'' بڑی بھابھی نے پکارا۔

''ہاں کیا بات ہے؟''

''تم کیوں نہیں چلی جاتیں ظہور یوسف کے ساتھ......''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ ابھی گھنٹہ پہلے ہم اتنی لمبی مسافت طے کر کے آئے ہیں اور پھر یہ کہ ہمارے پاس تو اس شادی کی کوئی اطلاع ہی نہیں تھی۔ پھر ہم کیوں......؟ اوپر سے آپ کو ہمارے وجود سے خوف آتا ہے۔ نا بابا نا۔ اب آپ ہی جائیں گی۔ ویسے بھی بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' بی بی جان اپنی بھاوج کی فطرت سے واقف تھیں۔ خاندان کی بیٹی تھیں اور تمام داؤ پیچ سے آگاہ اور اس لیے وہ عموماً خاندانی سیاست سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ اللہ نے انہیں کس کام کے لیے پیدا کیا تھا، آج تک انہیں پتہ نہیں چلا۔ چڑھتی جوانی میں ویرانی اور تنہائی اور اب ظہور یوسف کی شادی......وہ بھی امکا پرشاد

کی اس پوتی سے جو ایک گانے والی کی بیٹی تھی۔
شادی کے لیے مسلمان ہونے والے بدری پرشاد دل سے مسلمان ہوئے بھی تھے یا نہیں۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مسکرا دیں۔ دفع کرو جی، ہمیں کیا۔ دل سے مسلمان ہوئے یا نہیں، کہنے تو مسلمان ہی گئے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ سات پردے میں بیٹھنے والی، گانے والی ساری عمر گانے والی ہی کہلائے گی اور کچھ نہیں...... بدری پرشاد مظہر علی بنے اپنے وقت کے سب سے بڑے بیرسٹر، قرب جوار میں جن کو ئی ثانی نہیں تھا۔ جن کے وجود سے چین و اطمینان دولت و خوشی کے دریا بہتے تھے۔ اپنے بچوں کو دنیا کے اہم ترین اداروں میں تعلیم دلوائی اور اب چھوٹے میاں جو پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے، کہاں ان کی بیٹی سے ٹکرائے، خواہ مخواہ ہی۔ بی بی جان کا دل مان کے نہیں دے رہا تھا کہ ان سات پشتوں سے کھٹکتے ہوئے خاندان میں کہاں سے یہ ٹیک لگ گئی۔ بی بی جان نے سوچا۔ بی بی جان...... جن کی وسعت نظری کی مثالیں دی جاتی تھیں...... اور یہ چھوٹے میاں نے مذاق نہیں کیا تھا۔ لڑکی تو سچ مچ لکھی پڑھی تھی کہ امکا پرشاد کی یہ پوتی ہر طرح سے امیر تھی۔ صورت، علم اور دولت کہ باپ اس کا اپنے علاقے کا سب سے بڑا قانون داں تھا۔ گاؤں چھوڑ کے مرزا پور جا بسایا تا کہ اس کی ذات کی کوئی خبر کسی کو نہ ہوئے۔ جو رہے سو بے خبری رہے اور اب یہ کیسی بے خبری ہے کہ بیٹی بیاہنے وہ شیخو پورہ آئے ہیں اور بابا اپنے لائق فائق سپوت کو بیاہنے کے لیے جا رہے تھے لیکن خاندان والوں سے ڈر گئے۔ ولیمے پر بلائیں گے۔ بارات مختصر ہو گی لڑکی رخصت اپنے دادا کے گھر سے ہو گی جو ہندو تھے لیکن برابر کے لوگ تھے۔ سات حال کے زمیندار۔ کوئی انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرے گا...... لیکن لڑکی...... یہاں آ کر ان کے دل کی سوئی اٹک گئی۔ وہ دالان میں چوکی پر بیٹھی فکر مندی سے بڑی بھابھی کو لپک جھپک جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں جن کی کارچوبی پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی اور زیور بھی انہوں نے گوندنی کی طرح لاد رکھا تھا۔ آخر برابر کے زمیندار کے گھر جانا تھا۔

اور وہ وہاں...... کہیں ہندو مسلم...... مگر یہ صرف ان کا خیال تھا۔

امکا پرشاد کائستھ ہونے کے ناطے ویسے ہی چھوت چھات کے قائل نہیں تھے۔ دوسرے ان کی یہ پوتی مظہر علی مسمی بدری پرشاد کی بیٹی تھی جس کا نام سلیمی مظہر علی تھا جسے انہوں نے سو گاؤں میں بھی دیکھا تھا۔ جو چھوٹے میاں کے ساتھ چادر میں لپٹی ہوئی بارہ سے اتری تھی۔ انہوں نے اسے ڈیوڑھی کے اندر اتارا تھا کہ یہ امکا چچا کے مسلمان بیٹے کی نور نظر تھی۔ اس وقت بھی ان کا ماتھا ٹھنکا تھا...... پھر انہوں نے اطمینان کر لیا تھا کہ ظہور یوسف مظہر العجائب بننے کی کوشش قطعاً نہیں کرے گا۔

''خداوند کریم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھ......'' بی بی جان نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ آسمان پر صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا لیکن سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ بی بی جان کا خوبصورت جوان چہرہ صبح کے نور سے آئینہ پوش ہو رہا تھا لیکن نصیب کی سیاہی نے زندگی میں روشنی نہیں بھرنے دی۔

آج دوسرا دن تھا، بارات شیخو پورے سے نہیں آئی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ پتہ نہیں کب تک یہ واپس آئیں گے۔ آنگن میں بڑی چوکی کے پاس بکھرے ہوئے پھول اپنی تازگی کھو چکے تھے۔ چھوٹی بھابھی کنیزوں اور خدمتگاروں کے ساتھ حویلی کی نوک پلک درست کروانے میں لگی ہوئی تھیں۔ آخر نئی دُلہن کا استقبال کرنا تھا۔ چھوٹی بھابھی کی مانگ میں سیندور کی تحریر تھی اور بالوں میں افشاں چمک رہی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ بی بی جان کو اپنے اس بھائی کی شادی سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے سر پر آنچل ڈال کر بارات کے ساتھ جانا بھی چاہتی تھیں لیکن بڑی بھابھی اور زمانے کی باتوں نے انہیں اپنی ہی نگاہوں میں بھی منحوس ہی قرار دے دیا تھا۔ انہیں شیخو پورہ جانے سے کوئی روکتا بھی نہیں لیکن کسی نے انہیں ساتھ چلنے کو کہا بھی نہیں اور وہ خود ہی

تو ہم کا شکار ہو رہی تھیں۔

فی زمانہ بارات چار گھنٹے میں دولہن کے ساتھ لوٹ آتی ہے لیکن عجیب رواج تھا اس زمانے کا، جتنے بڑے لوگ اتنا ہی بڑا لشاخا اور چھوٹے میاں کا بیاہ ایک الجھن اور پیچیدگی کا شکار تھا۔ بی بی جان اندر ہی اندر خوفزدہ تھیں کہ لڑکی کا دادا بہر حال ایک سر برآوردہ ہندو تھا اور آج کے ہندوستان کی طرح وہاں ہندو مسلم شادی کا کوئی رواج شاید ہی تھا مگر وہ اختر حسین رائے پوری کے نانا کی طرح یا نرگس کے والد کے جدن بائی پر مٹنے کی کہانی عام تھی۔

لیکن وجے لکشمی پنڈت اور سید حسن کی مثال...... بی بی جان نے سانس روک کر سوچا..... اور کہیں...... اور اسی لمحے شور اٹھا......

''دلہن آ گئی۔'' بی بی جان سامنے آ گئیں۔ دُلہن کی بارہ دری ڈیوڑھی میں داخل ہوگئی ہے اور کمخواب کی شیروانی پہنے اور گلے میں پگڑی ڈالے چھوٹے میاں بارہ دری کے ساتھ چلتے ہوئے بیچ آنگن میں در آئے۔ رواج کے مطابق پہلی رات سسرال میں گزار کے آئے تھے۔ قربت کی محبت سے سرشار چہرے پر گلزار کھل رہے تھے''حسین وجمیل ہے میرا بھائی، خدا اسے نظر بد سے بچائے۔''

بی بی جان تیزی سے برآمدے کی سیڑھی اترنے لگیں۔ ساتھ ہی چھوٹی بہو صاحب تیز تیز قدم اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ سوپ میں چاول، پان کے پتے اور گھی کا دیا جلا رکھا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھیں......

''بی بی جان ایک منٹ۔ ہم دولہن کی نظر اتار لیں، پھر آپ بے شک گھونگھٹ پلٹ دیں۔'' چھوٹی بہو صاحب نے دہل کے بی بی جان کے کفن پوش وجود کو دیکھا اور بی بی جان کھمبے کی طرح زمین میں گڑ گئیں۔ رسم ورواج...... وہ الٹے پاؤں پلٹنے لگیں۔ چھوٹے میاں لپکے اور بہن کی کمر میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئے۔''بی بی جان آپ کو بہت مبارک ہو، ہم دلہن لیکر آ گئے۔ آئیں میری دلہن کا استقبال کریں۔ آپ چلیں کدھر۔ ہم آپ کے اس طرح منہ پھیر لینے کے قائل نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ظہور یوسف ہیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ تم تو یوسف ثانی ہو اور اپنی زلیخا لے آئے ہو۔'' بی بی جان نے ہنس کے بھائی کا ماتھا چوم لیا۔

''میرا بھائی، میری جان، میرا وارث۔'' بی بی جان نے دل ہی دل میں دعائیں دیں اور نگاہوں ہی نگاہوں میں واری صدقے ہونا شروع کیا لیکن قریب نہیں گئیں۔ الٹے پاؤں لوٹ گئیں۔ بھائی کی استفسارانہ نگاہیں قدموں کا پھندا بنیں۔

''ہم دلہن کے لیے سلامی لینے جا رہے ہیں۔''

''ارے بی بی جان اس کی کیا ضرورت ہے، جو کچھ آپ کا وہ ہمارا ہی ہے۔ ہے نا۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ جو کچھ ہمارا ہے سب تمہارا ہے۔ تم بھی ہمارے ہی ہو'' انہوں نے اندر کی طرف مڑتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں کہ دلہن کے قریب جانے کی بجائے اندر اپنے کمرے میں داخل ہوگئیں اور اب دیوار میں گڑی الماری کھولے اپنا قلمدان ٹٹول رہی تھیں۔ سونا، چاندی اور کچھ ہیرے جواہرات بھی موجود تھے لیکن بی بی جان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دلہن کے لیے کون سا زیور نکالیں۔ ان کے زمانے میں تو سیٹ وغیرہ ہوتے نہیں تھے۔ ہاں یہ جھمکے ہیں، وہ کنگن ہے۔ یہ چندن ہار ہے اور اب وہ چندن ہار، چمپا کلی، کان کے جھمکے، کنگن اور پاؤں کی پائل۔ دُلہن کے دینے کے لیے چھانٹ چکی تھیں۔ انہوں نے بڑی دلجمعی سے دیوار میں گڑی الماری کو بند کیا۔ چلمن گرائی اور چھوٹی کوٹھڑی سے باہر نکل آئیں۔ سامنے ان کی کنیز نرگس کھڑی تھی۔

''آپ کو بلا رہی ہیں۔''

''کون؟''

''چھوٹی بہن صاحب، آپ کے انتظار میں ہیں۔ انہوں نے دُلہن کو ڈولی سے نہیں اتارا ہے۔''

''کیوں بھلا اب تک تو......''

''جی وہ چھوٹے میاں کہہ رہے تھے کہ بی بی جان اتاریں گی۔''

''اچھا چھوٹی بہو صاحب سے کہو، وہ اتاریں، ہم آ رہے ہیں۔ ہم کو وہم ہوتا ہے۔ ان سے کہہ دے، وہ رسم کر لیں......''
اور نرگس سے پہلے جوہیا پہنچ گئی۔

''بی بی جان کہہ رہی ہیں، ان کو وہم آتا ہے۔ آپ جی بہو صاحب رسم کر لیں۔ وہ آ رہی ہیں۔''

''اچھا......'' چھوٹی بہو صاحب کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ نئی بہو صاحب کے قدموں تلے تیل چوا کے انہوں نے دُلہن کو گود میں اٹھانا چاہا لیکن کالج، یونیورسٹی کی پڑھی ہوئی دُلہن نے سٹ کرا پنے قدم زمین پر رکھ دیئے اور سیدھی کھڑی ہو گئی......

نئی بہو نہ صرف دوسری ذات برادری کی ہے بلکہ خود سر بھی ہے۔ چھوٹے میاں نے لپک کے بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا کہ چھوٹی بھابھی نے کہاں تو گود میں اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے اور اس کے قدم زمین پر لگتے ہی بدک کر اس طرح ہٹیں کہ جیسے چھوت کی بیماری ہو اور چھوٹے میاں کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

بیوی کو بازو سے پکڑنے کی بدتہذیبی تو کر چکے تھے، اس لیے قدم سے قدم ملا کے آنگن میں بچھی چوکی تک پہنچ گئے جو کئی دن سے اسی رسم کے لیے بچھی چھوڑ دی گئی تھی۔ چھوٹے میاں نے راج دلاری کو بٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ گھر کے بڑے کدھر گئے۔

چھوٹی بہو صاحب بڑی بیگانہ بنی کھڑی تھیں۔ ان کا بھی عجیب مزاج ہے گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ......

ظہور یوسف نے کڑے تیور سے جوہیا کو دیکھا۔ مزاج شناس کنیز بول پڑی ''بڑی بہوا بھی ہی پہنچیں ہیں اور بوڑھے سرکار آ رہے ہیں۔ وہ دیکھیے۔'' بوڑھے سرکار سے پہلے کوئی بہو بیگم کا منہ نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سب کو پتہ تھا۔ رسم کے مطابق تو اس وقت دلہن کے پاس سرکار بیگم کو ہونا چاہیے تھا لیکن ان کی وفات ہو چکی تھی۔ بڑی بہو ہانپتی کانپتی آ رہی تھیں کہ یہ اب ان کی ہی جگہ تھی اور وہ پسینے میں ڈوبی اپنے ہار سنگھار سے بے نیاز ڈولی سے اترتے ہی دلہن تک پہنچی اور ادھر ادھر دیکھا تخت دار مچیا لا کر رکھی گئی۔ اس پر بیٹھ کر سسر کی طرف دیکھا جو اپنی جیب ٹٹول رہے تھے۔ آنکھ بھر کے بڑی بہو کو دیکھا اور ہونکارا سا بھرا۔ بڑی بہو نے اشارہ پاتے ہی دلہن کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ بوڑھے سرکار نے ہیرے کی جگمگ کرتی انگوٹھی بہو کی گود میں بچھے رومال پر رکھ دی جو سلامی کے لیے بچھایا گیا تھا۔ بڑی چھوٹی دونوں بہوؤں کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ساس کی انگلی سے اتری ہوئی انگوٹھی کی قدر و قیمت سے وہ اچھی طرح واقف تھیں اور دونوں ہی کا دل چاہتا تھا کہ یہ انگوٹھی ان کی انگلی میں جگمگائے۔ بدطینت تھیں، لیکن منہ پھٹ نہیں تھیں، روایتی خاندان سے تھیں اس لیے روایت کا بھرم رکھنا بھی آتا تھا، سو بڑی بہو نے ایک لمحے کے ساٹھویں حصے میں اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دلہن کا ہاتھ پکڑ کے انگوٹھی تیسری انگلی میں ڈال دی۔ پھر اپنے بٹوے سے سلامی کی رقم نکال کے مسکرائیں۔

''ہم تو راج دلاری، آپ کو روپے ہی دیں گے۔'' چاندی کے کھنکتے ہوئے ۵۱ روپے انہوں نے رومال پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہاں البتہ اس وقت آپ کی قسمت پر بڑا رشک آیا ہمیں کہ ماشاء اللہ اماں جان کی جانشینی آپ کو ملی۔ یہ انگوٹھی اماں جان کو ان کی دادی ساس سے ملی تھی اور اب آپ کی انگلی میں سج رہی ہے۔ خدا مبارک کرے، آپ کو پہننا نصیب ہو۔'' بہو بیگم کم

ظرف نہیں تھیں لیکن لہجے میں اداسی در آئی۔

آہستہ سے مچیا سے اٹھیں۔ بوڑھے سرکار مردانے کی طرف واپس ہو گئے۔ بڑی بہو اسارے کی طرف بڑھیں۔ سامنے سے آتی ہوئی بی بی جان سے جاٹکرائیں بی بی جان کے ہاتھ سے سرخ رومال کی پوٹلی زمین پر گر گئی جسے اٹھاتے ہوئے بڑی بھابھی نے وزن محسوس کیا۔

بڑی دیالو بن گئی ہیں بی بی جان تو، خاصہ سونا دے رہی ہیں۔ وہ الٹے پاؤں بی بی جان کے ساتھ واپس آئیں۔ بستی کی کچھ عورتیں، کچھ عزیز و رشتہ دار، خواتین دلہن کو گھیرے میں لیے تھیں۔ چھوٹے میاں عاجز عاجز سے بڑی بھابھی کی مچیا پر بیٹھے تھے۔ بی بی جان کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

''نہیں تم بیٹھو۔'' بی بی جان نے جگمگ جگمگ کرتی دلہن پر ایک نظر ڈالی اور سرخ پوٹلی گود میں رکھ دی۔

اِدھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھا اور پھر پاس کھڑے منے سے بھتیجے کو دلہن کی گود میں بٹھا دیا۔ نئی دلہنوں کی گود میں فوراً ایک بچہ ڈال دیا جاتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ نویں مہینے ماں بن جائے وغیرہ...... وغیرہ...... بی بی جان دل و جان سے چاہتی تھیں کہ ان کے ہاں ڈھیروں بچے ہوں اور ان کی اتنی بڑی جاگیر کا مصرف نکل آئے۔ اپنی اولاد تھی ہی نہیں، چلو بھائی ہی کی اولاد سہی۔ باوا بھیا کی جدی پشتی زمینیں تھیں کہ اگر ناپی جاتیں، وقت لگ جاتا۔ اس کے باوجود زمین کا لالچ کسے نہیں تھا۔ بڑی بہو، چھوٹی بہو۔ سب ہی متمنی تھیں کہ بی بی جان ان کی اولاد میں سے کسی ایک کو متبنیٰ لے لیں لیکن...... لیکن بی بی جان کی جان تو چھوٹے میاں تھے۔ نیت چاہے کچھ رہی ہو لیکن بی بی جان وہم کا شکار تھیں اور پھر انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ راج دلاری کی اولاد کے لیے ان کی ہی جاگیر مناسب رہے گی۔ اتنی بڑی جائیداد بے شرکت غیرے وہ ظہور یوسف کی اولاد کے نام کر دیں گی۔ انہوں نے ظہور یوسف کو نگاہ بھر کے نہیں دیکھا کہ کہیں اس کے خوبصورت وجود کو نظر نہ لگ جائے۔ دلہن کا نام کچھ بھی تھا، سب نے راج دلاری ہی کہا کہ بوڑھے سرکار نے اپنی سب سے چہیتی بہو کو یہی نام دیا تھا۔ وہ جو اُن کے دوست امکا پرشاد کے مسلمان بیٹے کی بیٹی تھی اور جس کی ماں...... یہ آخری حصہ صرف ان کی بڑی بہو کو یاد رہتا تھا۔

بی بی جان نے بھی اس پر پیار کی نظر نہیں ڈالی۔ اس بار وہ اپنے وجود سے ہی خوفزدہ ہو گئی تھیں اور وہم کا اس طرح شکار تھیں کہ اپنی راج نگری کی طرف لوٹ گئیں جہاں کوئی ان سے وہم نہیں کرتا تھا اور جہاں نئے دولہا اور دلہن ان کے سفید آنچل کے سائے میں گزر کر سہاگ اور طویل عمری کی نوید پاتے تھے۔

..........☆..........

گراں-۲ (آخری قسط)

طاہرہ اقبال

ان دنوں گندم کی بالیں رنگ بدل رہی تھیں۔ دودھی دانہ سنہرے پردوں میں سکڑ گیا تھا۔ جنگلی سبزیوں کی بیلیں پہاڑی کیکروں بکائنوں کو چڑھ رہی تھیں۔ کسوں میں خودرو خربوزے اور تربوز ڈٹوں کی طرح پڑے تھے۔ ان دیکھی چوٹیوں سے برفیلے پانی پگھل کر اتر رہے تھے۔ پگڈنڈیاں آبشاریں بن کر بہنے لگی تھیں۔ چشمے اور برساتی ندی بھر گئے۔ مچھلیاں سطح آب پر مچلنے لگیں۔ سبز ٹانگوں والے کلو کلو بھر کے مینڈک کناروں پر اچھلنے لگے۔ بے منہ سر والی جونکیں بھینسوں کے تھنوں سے چمٹنے اور لہو چوسنے لگیں۔ چٹانوں سے چپکی سوکھی پھلائیاں اور دھریکیں سرسبز ہو گئی تھیں۔ پتھروں کی دراڑوں سے پودے پھوٹ نکلے۔ چٹانوں پر جمی کائی سبز مخمل سی دبیز گھاس بن گئی۔ بیریوں کو بور لگ گیا۔ پھلاہیوں کی جڑیں کھود کر چونگیں نکال عورتوں نے سالن پکائے۔ خودرو جنگلی کریلے توری کدو پیلے پیلے پھولوں سے بھری بیلیں کسوں میں پھیلیں اور پگڈنڈیوں ڈھلانوں کا سنگھار بن گئیں۔

بہار کا موسم رنگ برنگ جنگلی پھولوں میں نکھر کر سارے پہاڑی سلسلوں اور کسوں پگڈنڈیوں پر بچھ گیا۔ جیسے ہر شے پر پھولدار چھینٹ کی چادر ڈھک دی گئی ہو۔ کچے مکانوں کو عورتیں چکنی مٹی میں گوبر ملا کر لیپنے لگیں۔ تنوروں کو نئے مٹھ لگے اور تپا کر مٹھیاں پکائی گئیں۔ میوے کھوپے ڈال کر گڑ کے شربت میں گندھے سخت آٹے کی یہ روٹیاں رات بھر انگاروں کی ہلکی آنچ پر تنور کے اندر پکتیں، اگلی صبح اتار کر ہر گھر میں دو دو روٹیاں تحفتاً بھیجی جاتیں، بدلے میں ان کے گھروں سے بھی یہی سوغات آتی۔

اظہار الحق امتحان دینے پنڈی شہر چلا گیا۔ دو بیگھہ میں چھتری کیے کھڑا بیری کا درخت سرخ موتیوں سے بھر گیا جس پر فاختائیں، چڑیاں گھونسلے بنانے لگیں۔ فاطمہ جان ان کی چوں چوں میں، دہکتے موسموں میں بھاپ چھوڑتی دھرتی کے دم میں لگی دن بھر بیر چنتی۔ بیری کے ٹہنوں پہ جھولتے پرندے برہا کے پرسوز گیت چھیڑتے۔ چرند پرند خود اپنے ہی وجود میں سے پھوٹ نکلے۔ فاطمہ بیری کے گھنیرے سائے میں چھپی پکے بیروں جیسے عنابی آنسو بہاتی۔ جھولی لالو لال بیروں سے بھری رہتی۔

آکھاں کہ نہ آکھاں پکیاں خان پورے نیاں نا کھاں
لمباں ڈوراں ماہی نا باز بنیرے تے

کلعام ریلوے اسٹیشن سے گزرتی ریل گاڑیوں کے موسم گرما کے اوقات کار شروع ہو چکے تھے۔ شکیلہ جان کے دل کے پنڈولم میں لرزتی سوئیاں آپ ہی آپ نئے نظام اوقات کے مطابق وقت تبدیل کر گئی تھیں۔ چھک چھک چھکا چھک گاڑیاں، وجود کی پٹڑیوں پر سے کانٹے بدلتیں۔ دل کی دھک دھک میں سیٹیاں بجاتیں۔ دھوئیں دخاتی گزرتی رہیں۔

پتو ہے پر کپڑے دھوتی لڑکیاں آخر میں جب اپنے تن کے کپڑے اتار کر دھوتیں تو انگلیوں میں پڑی منگنی کی چھاپ کو صابن مل مل صاف کرتیں۔ ہونٹوں سے لگاتیں تو صنوبر خالی انگلی ہی چوم لیتی...... جس میں پڑی تصوراتی چھاپ کو وہ کتنے برسوں سے مانجھ مانجھ چمکا رہی تھی۔ تبھی اصغر خان کی ہانک اس کے پورے وجود پر چھاپ بن کر کندہ ہو جاتی۔

''بیبیو چیلا کرو۔ ڈنگروں کو پانی پلانا ہے۔'' عورتیں خود کو ڈھکنے لگتیں۔ صنوبر کے وجود کے تار جھنجھنا اٹھتے۔

''لنگھ آؤ۔''

چھی او چھی۔ پیاسے جانور پانی پیتے تو جھیل کے کنارے سمٹنے لگتے۔

''چھی او چھی۔''

لڑکیاں پانی پلانے والے نوجوانوں کی چھی او چھی کی صداؤں کے ساتھ پتو ہے کے پانیوں میں سے گھڑے ڈبو ڈبو بھرتیں۔ تین تین گھڑے سروں پر ایک ایک کو لہے کی ہڈی پر جمائے سانپ کے لہریے سی پہاڑی پگڈنڈیاں چڑھتیں، اترتیں بھاری شلواروں اور لمبی قمیضوں والے نوجوان کبھی سر اٹھا کر انہیں نہ دیکھتے جن کے نینوں کی محرابوں میں جلتے دیئے انہی ناموں کے تیل سے مچ مچاتے تھے لیکن خود ان تک شاید کوئی سینک ہی نہ پہنچتا تھا یا شاید دل کی یہ آگ صرف عورت ذات کی خلقی مجبوری ہے۔ برھا کی ماری بنا چھاپ کی انگلی مسلتی فاطمہ بیری کے یاقوت جڑے پیڑ کے سائے میں ہو گئی۔ دھوپ جلاتی سایہ ٹھٹھراتا عجب بے اعتبارا موسم۔

ان دنوں گندم کی گاہی ہو رہی تھی۔ سجے ہوئے جیوٹ اور پنجالیوں والے بیلوں کی جوڑیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ موہڑے..... گوڑھے، تھلے، بگے، پرتھے، کرپال، پھڈے بیسیوں گراؤں سے بہترین بیل آئے تھے اور ڈھول اور گھنگھرؤوں کی آواز پر پڑ (کھلیان) گھاہ رہے تھے۔ بزرگ سروں پر مشہدی لنگیاں اور قراقلی ٹوپیاں جمائے پھلاہیوں دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے بیلوں اور نوجوانوں کو ہلاشیری دیتے تھے۔ بچے اور نوجوان کھراؤں اور فوجی بوٹ پہنے کھلیان پر دائروں میں گھومتے تھے۔ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی فرد فوج میں رہ چکا تھا۔ اس لیے فوجی بندوق فوج بوٹ اور جیکٹ ہر گھرانے کا اعزاز تھا۔ ہر گھر کے صفے (بڑا کمرہ) میں کھونٹیوں یا کیلوں سے سجاوٹوں کی طرح یہ اعزاز سجے رہتے تھے۔

کئی دن لگا کر گاہی کے لیے یہ چبوترہ بنایا گیا تھا۔ ماشکی پانی کی مشکیں بھر بھر ڈالتا جاتا، مرد کسیوں سے مٹی کا ڈھیر ہموار کرتے، عورتیں ہاتھوں سے انہیں لیپتیں۔ اب اسی پڑ (چبوترے) پر بچھے گیہوں کو آنکھوں پر چڑھے کھوپوں والے بیل دائروں میں گھوم گھوم گاہ رہے تھے۔ پنجالیوں کے رسے پکڑے ان کے مالک منہ سے بیلوں کو سمجھ آنے والی آوازیں نکالتے انہیں مزید تیز چلنے پر اکسا رہے تھے۔ ڈھول کی آواز اسی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ گندم کی بالیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ دانے سنہری پردوں سے باہر نکل رہے تھے۔ سٹہ چُور چُور ہو کر بھوسہ بن رہا تھا۔ سونا رنگ دانوں کے ڈھیر چڑھ رہے تھے۔ تبھی ڈاکیا وہ چٹھی لایا تھا جس نے گراں کے ہر گھر میں صف ماتم بچھا دی تھی۔ اس وقت اناج کی گاہی کرنے والوں کے لیے دوپہر کا کھانا تیار تھا، دو بکرے ذبح ہوئے تھے۔ عورتیں دس دس کلو والے دیگچے دیسی گھی کی تری والے شوربے کے پکا چکی تھیں۔ حلوے کی کڑاہیاں بنا بنا پھوڑیوں پر اوندھا رہی تھیں۔ لسی کی چاٹیاں ٹھنڈا پانی اور نمک کھور کر گھڑونچیوں پر دھری تھیں۔ لوح پر پھلکے پک رہے تھے۔ مرد کھانا کھا چکے تھے، اب عورتوں کی باری تھی کہ سارا میلہ اجڑ گیا۔ اگرچہ پھوڑی تو نہ پڑی لیکن بین ڈالتی آٹھ گراؤں کی عورتیں شکیلہ جان کے گھر میں اکٹھی ہوئیں اور شکیلہ جان کی ماں کے گلے لگ لمبے لمبے بین کھینچے جیسے لفافے میں بند ہو کر شکیلہ جان کی طلاق نہ آئی ہو بلکہ میت پہنچی ہو۔

صوبیدار حکم داد اپنی فوجی بندوق کی طرف جھپٹا جیسے کپتان اکبر خان سامنے کھڑا ہو اور ہواؤں، فضاؤں کو گولیوں سے چھیدنے لگا لیکن کوئی درندہ یا ڈاکو سامنے ہوتا تو مرتا، پھر وہ کارتوسوں والی پیٹی اچکن کے نیچے لگا اور بندوق کندھے پر ڈال کیپٹن اکبر خان کی پلاٹون میں پہنچا لیکن وہ تو اپنی پوسٹنگ سعودی عرب کروا کر اپنی نئی نویلی دلہن یعنی اپنے افسر کی بیٹی کے ہمراہ جا بھی چکا تھا۔ جانے سے پہلے طلاق بھجوا گیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو پیغام دے گیا تھا کہ میرے پیچھے سے اگر آئیں تو میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا اور کہنا کہ میں مجبور تھا۔ ان پڑھ دیہاتی لڑکی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کا قصور نہیں لیکن اسے میرا نام دینے والوں کا قصور ضرور ہے۔ اسی لیے پہلے طلاق بھیجی ہے کہ وہ میرے نام پر نہ بیٹھی رہے۔ اس کی کہیں اور شادی کر دیں لیکن کیا یہ اتنا ہی آسان تھا۔ شکیلہ جان جس تسبیح کے دانوں پر عمر بھر اکبر خاناں اکبر خاناں کی پوریں ثبت کرتی رہی۔ انتظار والی ریل گاڑی کی چھک چھک پر سدا بجتی رہی۔ گارڈ ڈبے میں لہراتی جھنڈی کی طرح ایک ہی نام پر پھریریاں کھاتی رہی تھی۔ ریل گاڑی کی سیٹیوں کی بانسری کی لے سے بندھی انتظار کے زینے چڑھتی اترتی رہی تھی۔ کوک کی گراری یکدم کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ وہ اب بھی ہر گاڑی کی آواز کے ساتھ ناہموار زینے بے اختیار چڑھ جاتی اور لبالب بھری لیکن خالی خولی گاڑیاں دیکھتی جو اس قصباتی اسٹیشن پر کبھی نہ رکتی تھیں۔ سوائے اس کے کہ کراس پڑ جائے یا انجن فیل ہو جائے لیکن انتظار والی گاڑی کا انجن کبھی فیل نہ ہوا وہ دھویں چھوڑتیں سیٹیاں بجاتی چھک چھک گزرتی رہی۔ عمریں اور صدیاں لد گئیں نہ گاڑیوں نے گزرنا چھوڑا نہ انتظار نے سانس توڑا۔ بنا گنتی کے بنا حساب شمار کے برھا کا گیت دھک دھک بجتا رہا۔

''کدمڑ آسو کیڑی گڈی توں لہسو۔''

آڑی ترچھی پٹڑیوں کی طرح بدن کی وریدیں دھواں چھوڑتی سنسناتی رہ گئیں جن پر سے تیز رفتار گاڑیاں زن زن تین سن گزرتی چلی جاتی تھیں لیکن کبھی کسی کو بھی کراس نہ پڑا...... پوٹھوار کے شدید ٹھٹھرے موسموں نے بہار کے رنگین پھولوں نے دہکتی دہکاتی دھوپ نے برستی بارشوں، اترتی آبشاروں، ابلتے چشموں نے جہیل کے پانیوں بکائن کے جھنڈوں کس کس نے شکیلہ جان کے ساتھ مل کر ایک ہی نام کا برسوں ورد نہ کیا تھا۔ سارا جغرافیہ ساری زبانیں سب بولیاں یکدم اپنی ہیئت ترکیبی بدل کیسے سکتے تھے۔ انتظار کی کہنہ مشق ریاضت کیسے چھوٹ سکتی تھی...... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپوں رانجھا ہوئی۔

صوبیدار حکم داد اپنی بارہ بور کی بندوق کلی سے اتارتے اور ہر گزرتی گاڑی پر فائر کھول دیتے جیسے ہر ڈبے میں اکبر خان چھپا بیٹھا ہو لیکن فائر درمیانی پہاڑی سلسلوں میں بازگشت چھوڑتے بے ہدف رہ جاتے۔ اس گاؤں کی تاریخ میں قدرت کی ستم ظریفی کے تو کئی واقعے موجود تھے لیکن بے وفائی اور حکم عدولی کا یہ واقعہ انوکھا تھا۔ چلو کشمیرن تو اس خاندان کی تھی ہی نہیں لیکن یہ اکبر خاناں تو اسی مٹی کا جنا پلا تھا جس کی سرشت میں تابع فرمائی، وفا شعاری اور قربانی والا خمیر گندھا تھا۔ صوبیدار حکم داد حیران تھے، ان کے خون میں یہ ملاوٹ کیسے ہو گئی۔

زرینہ جان میر حسن کی قبر سے لگی اس سے پوچھتی تھی۔

''ہائے کوئی زنانی ہیڈی وی بے وفا ہوسی، ایسا تو کنجریاں کرتی ہیں ہائے لوٹی...... ہو کولوٹی......''

زرینہ جان بیٹے کی موت کا صدمہ تو شاید جھیل جاتی لیکن کوئی عورت یوں بے وفا بھی ہو سکتی ہے، یہ تو اس کی زندگی کے فلسفے، اس کی دانش کے خمیر ہی سے میل نہ کھاتا تھا۔

شکیلہ جان روز صبح پورے خاندان کے کپڑوں کی پنڈیں سر پر رکھتی اور کس اتر جاتی اور برساتی جھیل کنارے تھاپے کی

دھمک بجتی رہتی۔

''کدمڑ آ سو کیہڑی گڈی توں لہسو۔''

پہاڑی سلسلے کے پیچھے ریلوے لائن پر سے گاڑیاں دھڑک دھڑک گزرتی رہتیں۔ ہر گاڑی کی سیٹیوں کے ردھم میں تھاپ کی دھمک تیز تر ہو جاتی...... اب کوئی لڑکی اسے اکبر خان کے نام سے نہ چھیڑتی جیسے اکبر خان نام نہ ہو کوئی دکھتا ہوا گم پھوڑا ہو جو شکیلہ جان کی جلد پھاڑ کر باہر نکل آیا ہو جس کی کینچوے سی جڑیں سارے وجود میں پھیلی ہوں، جہاں سے بھی چٹکی بھرو پیپ اور لہو ماس اور گند ہاتھ میں آ جائے لیکن جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہوں۔

دیگر ویلا (عصر کا وقت) تھا جب ڈاکیا پارسل لے کر آیا۔

گندم کا ڈھیر تیار تھا۔ اب بوریاں بھرنی تھیں۔ دھی دھانیوں کو بیج بیج سیریاں بھر کر دے دی گئی تھیں۔ بیواؤں، یتیموں کی کاری کا حصہ بھی نکال دیا گیا تھا۔ اب دسترخوان پر سہ پہر کا کھانا سجا تھا۔ آلو انڈوں کا سالن اور شکر بھری رکابیوں میں گرم دیسی گھی کا تار چھوڑ دیا گیا تھا۔ اچار کے مرتبانوں کے ڈھکن اٹھا دیئے گئے تھے۔ دیسی گھی میں تلے پراٹھے گرم گرم اتر رہے تھے۔ چائے کے دیگچے ابل رہے تھے۔ ڈاکیے کو بھی شریک طعام کیا گیا۔ دو ٹھل گندم کے بھر اس کے جھولے میں ڈالے تب ڈاکیے نے جھولے میں سے پارسل نکال کر صوبیدار حکم داد کے سامنے کاغذ قلم رکھ دیا۔

''صوبیدار جی! ست ست مبارکاں اللہ کے گھر سے بیٹے نے تحفہ بھیجا ہے۔ مکہ مدینے کی پاک زمین سے آیا پارسل چوم کر وصول کریں۔''

صوبیدار حکم داد کو لگا گندم کے ڈھیر کے سینے میں سے دھوئیں کا غبار نکلا ہے اور آتشیں لاوے کی طرح پوری فضا کو لپیٹ گیا ہے۔ بڑ کے درخت کے سائے تلے بچھی چارپائی پر پڑی فوجی بندوق اٹھانے کو وہ لپکا تو فوجی بوٹوں تلے گندم کے خشک نڑ چڑ چڑا کر چُورا ہو گئے۔

محمد جان نے ڈاکیے سے پارسل جھپٹ کر بکل میں چھپا لیا۔ ڈاکیا خطرے کی بو محسوس کر کے قلم کان پر دھر نکل لیا۔

مرد صوبیدار حکم داد کو تو مضبوط گرفت میں جکڑ کر بیٹھک میں لے گئے جو فضاؤں، ہواؤں کو واہی تباہی بک رہا تھا اور مردوں کی گرفت سے چھوٹ چھوٹ انجانے دشمن پر حملہ آور ہو رہا تھا اور عورتیں چور نظروں سے محمد جان کی بکل میں چھپے پارسل کو حسرت سے دیکھنے لگیں جو مکہ مدینے کی زمینوں سے آیا تھا۔ چاچی بختو نے آنکھوں سے پوریں مس کر کے منہ سے پٹاخے بجائے۔ درود شریف کا ورد کرتے نسوار زدہ دانتوں کے خلا سے پھونکنی سی آہ چھٹی۔

''ہائے کیا پتہ خانہ کعبہ کی خاک کا کوئی ذرہ اڑ کر اس پر لگا ہو......''

محمد جان تو خانہ کعبہ کی سرزمین سے آئے ان ریشمی کپڑوں کو چوم چوم کر عورتوں کو دکھانے لگی جیسے یہ کعبہ شریف کے غلاف کی پاک کترنیں ہوں اور وہ تصویر بھی جس میں بہو بیٹا کھڑے مسکرا رہے تھے اور عقب میں روضہ نبویؐ کے گنبد اور سبز جالیاں ہویدا تھے۔ آٹھ گراؤں کی عورتیں وضو کر کے دونوں ہاتھوں پر چادر کا پلو لپیٹ کر اور بسم اللہ پڑھ کر تصویر رکھواتیں اور چوم چوم کر آنسوؤں سے پلو گیلا کر لیتیں۔ پھر آنسوؤں کے دیپ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ محمد جان کو مبارکباد پیش کرتیں۔

''محمد جان تو بڑے نصیب والی یہ شہادت سے بھی بڑا درجہ ہے۔ کرماں آ لیے اللہ اللہ کہاں مدینہ منورہ کہاں خانہ کعبہ، کہاں خاک پا کی چٹکی محمد جان...... تو دونوں جہانوں میں سرخرو ہوئی۔''

''محمد جان تو بخشی گئی یہ مکہ مدینے کا لباس پہنے گی تو ساتوں پانیوں نہا کر پاک ہو جائے گی...... اللہ ایسا بیٹا ہر کسی کے نصیب میں کرے......''

شکیلہ جان نے بھی یہ تصویر دونوں ہتھیلیوں پر رکھوا کر تر آنکھوں کی دھندلاہٹ میں دیکھی جیسے سبز مقدس کپڑے سے ڈھکی ریل پر قرآن پاک پڑھتی ہو اور ڈرتی ہو کہ کہیں آنسو کا کوئی گرم قطرہ قرآن پاک کی سطح کو میلا نہ کر دے۔

مسیتی پڑھنی آں قاعدہ نکی عمراں اچ پے گیا وعدہ
تے کدوں نکھڑسی۔
مسیتی پڑھنی آں قرآن
میرا کڑیاں وچ دھیان
تے سبق نہ آوے......

صوبیدار حکم داد بیٹے کا پارسل بھیجنا تو شاید برداشت کر جاتے لیکن یہ دبی گھٹی محمد جان جو پچھلے پچیس برس تک صوبیدار حکم داد کے گھنیرے پیڑ تلے چونگ سی دبی پڑی رہی اس کے اندر سے یہ کوئی ال سی پھوٹ نکلی تھی جو کپتان اکبر خان کی ماں تھی، بیٹے کی کمائی پر اتراتی ہوئی عمر میں پہلی بار گھمنڈ کے جذبے سے سرشار۔ صوبیدار حکم داد تو بڑھ کر حملہ کرنا، پیچھے ہٹ کر دفاع کرنا جانتا تھا۔ یہ دومونہی سی اسے ڈس گئی۔ پہلے ہاتھوں کی انگلیوں پر رعشہ طاری ہوا، پھر آنکھیں پھڑکنے لگیں، پھر لقوہ ہو گیا۔ جب دیسی علاجوں سے لتے کبوتروں کی یخنی سے افاقہ ہوا تو دائیں آنکھ مستقل بند ہو گئی۔ زبان میں بھی لکنت آ گئی۔ کیا ایک صدمے کی زد میں انسان یوں بھی مصلوب ہو جاتا ہے۔ قطرہ قطرہ زندگی سنگلاخ پتھروں پر ٹپکنے لگی۔ کاگے بدن کا کھے اڑانے لگے۔ ریل گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ پہاڑوں کے بطن میں زلزلے اٹھاتی، طوفان مچاتی، سماعتیں سنٹھ کر گئی بینائی خالی خولی آسمانوں میں ٹنگی رہ گئی۔

شکیلہ جان کی نظر نہ تو مسجد نبوی کے میناروں پر گئی نہ روضہ مبارک کی سبز جالیوں پر۔ وہ تو اکبر خان کی دلہن کے سراپے کو ٹکر ٹکر دیکھتی تھی جس نے اپنے حسن و نزاکت سے شکیلہ جان کی برسوں جلتی جوت کو اک سبک سی پھونک سے بجھا دیا تھا۔ نازک خم دار پیر جس مہین سی سینڈل میں سجے تھے، اس میں تو شکیلہ جان کے ہاتھ بھی پورے نہ آتے۔ سنگلاخ چٹانوں، آڑھی ترچھی پگڈنڈیوں اور تیری سیدھی چڑھائیوں، اترائیوں پر ڈگر ڈگر پڑتے ہوئے پیر تو انہی پتھروں کے ہم شکل ہو گئے تھے۔ پھٹی بیایاں پھیلے ہوئے پنجے، شدید دھوپ اور سخت سردی میں جھلسی ہوئی جلد کھلے مسام، ہر مسام میں سے انتظار کے بجھے دیئے کا اٹھتا دھواں پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں حرام گدھ جن کی پتلیاں نوچ لے گئے تھے اور اب ویران گڑھوں میں حسرت کی ٹھنڈی راکھ اڑتی رہ گئی تھی۔

گراؤں کی لڑکیوں میں عجب سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ وہ تصویر والی اس شہرن کے نازک نازک ہاتھ پیر دیکھتیں، رواہاں کی نازک پھلیوں جیسی انگلیوں میں تارے ہیرے کی مندریاں ان میں تو کسی کی چیچی (چھنگلیا) میں بھی نہ کھبتیں چکی پیستے، مونگ پھلیاں کھودتے، دیگیں مانجھتے تین تین گھڑے پانی کے بھر کر میلوں چڑھایاں چڑھتے اور پنڈیں کپڑوں کی کوٹتے گٹے پڑی سیاہ ہتھیلیوں اور سخت گرہوں والے ہاتھ جن میں کسی کے نام کی چھاپ پڑی تھی۔ اتنی کھلی جتنا اس شہرن کے کان کا بالا! بغلی ریلوے لائن پر سے دن رات گاڑیاں گزرتیں لیکن انہوں نے کبھی کسی گاڑی میں پیر بھی نہ رکھا تھا۔ پنڈی چھوڑ ساگری، روات تک نہ دیکھا تھا۔ ان میں سے تو کبھی کوئی بیمار نہ پڑی کہ بہانے سے شہر ہی دیکھ لیتی۔ چوہے کا پانی کوئی بیماری لگنے ہی نہ دیتا تھا۔ لگ جائے تو آب شفا بھی یہی تھا لیکن وجود کے اندر دہکتے دھواں چھوڑتے روگوں کا علاج اب چوہے کی منتوں مرادوں میں نہ رہا تھا۔

دنیا بہت ترقی کر گئی تھی اور بیماریاں بہت پیچیدہ ہو گئی تھیں۔ لڑکیاں نواری پلنگوں پر دوسوتی کی کڑھائی کی ہوئی چادریں بچھاتے ہوئے ان کی ڈھو میں جڑے شیشوں میں خود کو دیکھنے لگتیں۔ کیل مہاسے داغ دھبوں سے بھرے چہرے جن کی رونق پہاڑی دھوپ کی لمبی زبانیں چاٹ لے گئی تھیں اور بارشوں کی سلیٹی اُمس ہڑپ کر گئی تھی۔ بے ڈول لباسوں میں چھپے بے شناخت سراپوں نے اصل عمر کو کہیں آگے دھکیل دیا تھا۔ جیسے وہ کبھی سرسوں کے پھولوں اور روہاں کی پھلیوں جیسی نازک ملوک رہی ہی نہ تھیں۔ وہ ایک دوسری کو تسلی دیتیں۔

اگر تین تین ٹائم تنور میں باجرے، مکئی کی روٹیاں لگانا پڑتیں، اگر گیلی بھاری لکڑیاں کاٹ کر ڈھینگر سر پر رکھ کر کس چڑھنا پڑتے۔ رات رات بھر بیٹھ کر کسی کے نام کے دیے میں دل کے دھاگوں سے سویٹر بنتی اور اون کے پھندنوں میں تسبیح کے دانوں کی طرح کسی ایک نام کو برسوں جپتی تو پھر دیکھتے اتنی ہی نازک، اتنی ہی گوری اتنی ہی حسین دکھتی کیا۔

شکیلہ جان کی زندگی کی دھڑکن تو دھڑ دھڑ گزرتی، ان گاڑیوں کی آمد و رفت سے جڑی تھی۔ اب بھی اس قصباتی ریلوے سٹیشن سے گزرنے والی ہر گاڑی کا وہ شمار کرتی۔ نان سٹاپ گاڑیوں کے ڈبے اس تیزی سے گزرتے کہ بوگیوں کی پوری لائن پھنبھیری کی طرح گھوم جاتی، جن میں آنکھوں کی پتلیاں ٹنگی رہ جاتیں۔ گاڑیوں سے چھٹتا دھواں اور راکھ جنہیں بے نور کر گئی تھی جن میں زنجیر کے اندھے حلقے خالی خولی پروئے تھے، جب وہ ناہموار زینوں پر کھڑی ہوتی تو سامنے چوٹیوں ڈھلانوں پر گائیں چراتی کملی اسے دیکھ کر تالیاں بجاتی۔

"ہندوستان کی قید سے چھوٹ آئے ہیں۔ ٹیلی فون آیا ہے آج۔ پنڈی اسٹیشن پر گڈیوں لہن۔"

اور دائیں ہاتھ قبرستان میں میر حسن کی پکی قبر کے ساتھ زرینہ جان کے بیٹے کی کچی قبر بنی تھی۔ لڑکیاں اپنے پڑھے لکھے منگیتروں کے نام سے باندھے منت کے دھاگوں میں بے تحاشا اضافہ کرنے لگیں۔ چوہے پر سایہ کیے کھڑی پھلاہی منتوں کی سیاہ ٹاکیوں اور پراندوں کے دھاگوں سے لد گئی۔ فاطمہ نے اظہار الحق کے پاس ہونے کی منت مانی تھی۔ صنوبر نے اصغر خان کے لیے پراندے کے دھاگے کئی بار باندھے تھے کیونکہ وہ پریشان رہتا تھا۔ اس کی پریشانی کا راز تو اس روز معلوم ہوا جب اس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اسے انگلینڈ کا ویزا مل گیا ہے اور وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر ولایت جا رہا ہے۔

مونگ پھلی کے کھیتوں پر سوار پُرے کی ہوا نے، ایکسپریس ٹرین کی وسلوں نے یہ خبر ہر سواڑا دی کہ فوج میں بھرتی ہونے اور یہ درپہ کھیتوں میں فصل اُگانے والے اس خاندان کے ایک نوجوان نے اپنے آبائی پیشے سے بغاوت کر دی ہے۔

صوبیدار حکم داد نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے کلی سے ٹنگی اپنی بندوق اتاری اور کوٹھے پر چڑھ کر کئی فائر کھولے اور جب فائروں کی آواز سن کر آٹھ گراؤں کے لوگ اکٹھے ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ ٹھیک چھ دن بعد اصغر خان کی شادی صنوبر سے ہوگی۔ پتہ نہیں ڈھولچی کہاں سے جھٹ پٹ نکل آیا جس کی تھاپ پر لڑکوں نے دائرہ بنا لڈی ڈالنا شروع کر دی۔ ہر گھر میں فوجی بندوقیں دیواروں سے بجی ہی تھیں۔ ہوائی فائرنگ میں شادی کی خوشی منائی جانے لگی۔ عورتیں سہرے اور ڈولی کے گیت گانے لگیں۔ سہرے کے گیتوں کی خوشی اور بدائی کے دکھ مشرقی عورت کی چپ کے انقباض کا کیتھارس کرتے ہیں شاید، محمد جان گڑ اور مونگ پھلیوں کی پراتیں بھر لائی۔ کمہاینوں نے گانے کی لڑیاں پروئیں۔

اصغر خان کو تو کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اسی روز تیل ہلدی مل کر مائیاں بیٹھا دیا گیا۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کہ اسے ولایت جانے کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن صنوبر سے نکاح کی شرط پر...... یہ شرط کوئی ایسی کڑی بھی نہ تھی۔ اس نے صنوبر کو کبھی

کسی بھی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ خاندان بھر کی خوشی میں شامل ہو کر وہ بہت خوش تھا اور اپنی شادی میں خود ہی ناچنے لگا تھا۔ پتہ نہیں شادی کی خوشی میں کہ انگلینڈ جانے کی خوشی میں۔

صوبیدار حکم داد بھی خوش تھا اور ان کا فوجی دماغ ایک جنگی چال کی پوری منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ انہوں نے اکبر خان کے جرم کو معاف کرتے ہوئے اسے بھائی کی شادی پر بہت تاکید سے بلایا تھا۔ اگرچہ شکیلہ جان کے طلاق کے کاغذات ملتے ہی پرزے پرزے کر کے وہ برساتی نالے میں بہا چکے تھے۔ پھر بھی شرع کے کسی مسئلے سے بچنے کے لیے وہ گراں کے موذن سے فتویٰ لے چکے تھے۔ جیسے ہی اکبر خان گھر میں داخل ہوتا۔ وہ چند مردوں کی مدد سے اسے قابو کر کے تجدید نکاح کرواتے اور شکیلہ جان اور اکبر خان کو ایک تنہا کمرے میں دھکیل کر باہر سے تالا لگا دیتے اور چابی اپنی صدری میں رکھ لیتے۔ اگلے روز دن چڑھے ساری برادری کے سامنے تالا کھولتے، چاہے وہ قید سے چھوٹ کر بگٹٹ بھاگتا اور عمر بھر واپس نہ لوٹتا لیکن شکیلہ جان تو سہاگن بن اس گھر میں رہنے کا حق تو حاصل کر لیتی۔ ایک بار وہ سسرال میں بہو کی حیثیت سے کسی بہانے داخل ہو جائے، پھر چاہے پلٹ کر عمر بھر وہ خبر نہ لے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ اکبر خان کی تصویر سے ہی شکیلہ کا لڑ باندھ کر گھر لے آتے یہاں پہیلیوں کے سرہانے ان کے مرد تھوڑی بیٹھے رہتے ہیں۔ کبھی عید تہوار کی طرح ہی ملتے ہوں گے۔ لائسنس نائیک یوسف خان مثل اپنے نام کے اتنا خوبرو ہے کہ افسر بھی یوسفِ ثانی کہتے ہیں لیکن محمودہ جان بیچاری سیاہ رنگت اور چیچک زدہ چہرے کے ساتھ کسوں کی ویرانی میں کبھی کسی مسافر کے سامنے آ گئی تو وہ چڑیل چڑیل پکارتا مر گیا تھا لیکن یوسف خان کے تین بچوں کی وہ ماں تھی، خود کہتی ہے کہ ہم بستری کے وقت یوسف اس کا چہرہ کپڑے سے ڈھک دیتا ہے اور ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بین ڈالتی ہے۔

''ہائے ہو کولوئی اوو چارے وی کے کرن میں تو آپ شیشہ دیکھوں تو ڈر جاتی ہوں پر نصیب جڑا تو یوسفِ ثانی سے۔''

پوٹھوار کی شادی اور مرگ دونوں اتنے شدید، بھرپور ہنگامہ خیز کہ ڈونگھے لڑ میں پوشیدہ بستیاں بسانے والے جنات بھی اس شادی یا ماتم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اصغر خان کی شادی تو یوں بھی کئی صدمات جھیلے ہوئے اس خاندان کی مدتوں بعد پہلی خوشی تھی۔ رج کے باجا گاجا ہوا۔ عورتوں کے حلق بیٹھ گئے۔ بارات کے روز اشاروں میں باتیں کرتی اور کھڑکھڑاتے گلوں کے ساتھ گھٹ گھٹ ہنستی رہیں۔ بعد میں کئی ایک کو ٹونسلز ہو گئے۔ عمر بھر کے لیے آوازیں پھٹ گئیں۔ جنتیوں کی ڈھولک کی تھاپ پہاڑوں کی بلند فصیلوں سے ٹکراتی گونجیلی بازگشت نشینوں کے حلق میں سے قطرہ قطرہ چھنتی شب بھر پلٹتی رہتی۔

اصغر خان کے گیارہ دوستالے پڑے تھے۔ پوٹھوار میں دوستالہ کسی بھی خاندان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جو عمر بھر کا پکا اور گوڑھا رشتہ بن جاتا ہے۔ ہر دوستالہ بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کی شامات کے ساتھ شادی میں شریک ہوا جیسے ان گیارہ گھروں میں سے ہر ایک میں شادی کا ہنگامہ برپا ہوا ہو لیکن صوبیدار حکم داد کو جس کا انتظار تھا، وہ نہ پہنچا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ چلا گیا تو پھر خاندانی دباؤ کے سامنے وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے گا اور اسی لیے تو اس نے شکیلہ جان کو پکی طلاق پھر بھیجی تھی کہ وہ امید کے تار سے بندھی کہیں کنواری نہ رہ جائے۔ شاید اس لیے کہ اس نے پکی عمر سے دھڑکنوں کا شمار کرنا نہ سیکھا تھا۔ قدموں کی چاپ کا اندراج کبھی نہ کیا تھا۔ اس انتظار اور شمار کی ریاضت اس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ ہر گاڑی کے گزرنے کے بعد اگلی گاڑی کے آنے کی گھڑیاں اور پل نہ گنے تھے۔ رات ڈھائی بجے گزرنے والی تیز رو سے پہلے تہجد کی نماز کبھی نہ نیتی تھی۔ دن بھر گزرنے والی گاڑیوں کی سلامتی کی دعائیں نہ مانگی تھیں۔ ہر آنے والی گاڑی کی حفاظت کے حصار کے لیے دو نفل نہ پڑھے تھے کہ شاید اکبر خان اسی گاڑی میں سوار ہو جس نام کا تار اس بدن کے ہر ہر ریشے میں گندھا تھا جس نام کے اسپیلنگ وہ دو سوتی کی

چادروں پر کاڑھتی رہی تھی۔ جس نام کے سویٹروہ اب بھی بنتی تھی، وہ نام اسی سوزن اٹھی سلائیوں سے پوروں کے رستے ہر ہر خلیے میں کندہ ہو گیا تھا اور وہ نکاح کا بے نام سا بوجھ بھی نہ سہار سکا۔ نکاح کبھی کاغذ کے پرزے سے بھی ٹوٹتا ہے بھلا۔ یہ نکاح تو نس نس میں پڑھا گیا تھا۔ خون کی روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ بھلا اس روانی کو یہ چار حرف کا اٹکاؤ کبھی روک سکتا ہے۔ جس کے انتظار کے رہٹ سے لگے آنکھوں کے بوکے عمر بھر بھرتے انڈیلتے رہے، وہ نہ آیا البتہ چھوٹے بھائی کے لیے اس کا بھیجا ہوا تحفہ اور خط دونوں مل گئے۔ خط میں ایک بار پھر شکیلہ جان کے دوسرے عقد کی تاکید لکھ کر بریت اور سرخروئی حاصل کر لی تھی لیکن یہ خط شادی کے ہنگاموں میں اپنی اہمیت کے مطابق توجہ نہ پا سکا۔ سوائے تائی بختو کے کہ جو کانوں کان خبر دیتی پھری۔

''تیسری طلاق بھی بھیج دی ہے اکبر خانے نے۔ بھلا کس لیے اس نے کوئی دوہری بار دوہنی بننا ہے۔ ایک بار جو نام زنانی کے ساتھ جڑ گیا، برے مقدر کی طرح اسے کون مٹائے۔ نہ بھیجتا تو جھوٹی تانگ میں عمر تو لنگھ جاتی ...... چیرا دو بولوں کا بھار بھی نہ اٹھا سکا۔''

چو ہے کے پانیوں میں تڑپتی مچھلیاں ڈوبتی ابھرتی رہیں۔ پھلاہی سے بندھے پراندوں کے دھاگے اور پلوؤں کی کترنیں بڑھتی رہیں۔ چہار اطراف ایستادہ پہاڑوں کی فصیلوں سے دن بھر کی آوازیں شب کے سیاہ کھوکھلے بدن سے ٹکراتیں اور پہاڑوں کے مہیب دھانوں میں بازگشت پلٹتی تو عورتیں انہیں جنیوں کے گیتوں اور بینوں سے تعبیر کرتیں۔ شاید اس غول بیابانی نے زرینہ جان، بھلی میرن اور شکیلہ جان کے وجود میں گھٹے بینوں اور بطن کے کھکھل میں سسکتی کرلاتی آہوں کو صورت بخش دی تھی لیکن کسوں کے بھنبھار سے حلق سے چھٹتی اور سنگلاخ سینوں کی کھرج سے نکلتی ان چیخوں پکاروں کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا تھا کہ نظروں کا محور تو نئی نویلی دلہن صنوبر تھی جو دن کے وقت بھی اپنے دولہے کو لے کر اندر کوٹھے میں گھس جاتی۔

بڑیوں نے کانوں کی لویں چھوئیں۔

''توبہ توبہ چودھویں صدی۔ دن دیہاڑے جنے نال اندر وڑی گشنی۔'' (شوہر کو کمرے میں لے کر گھس جاتی ہے)

''ہائے ساری عمر کبھی خاوند کی پٹی پر نہ بیٹھے، دن کی روشنی میں کبھی منہ نہ دیکھا، پتہ نہیں یہ تین چار بچے کیسے ہو گئے ......''

''نہ بھی ہوتے تو ہم تھوڑی کہتے کہ بچہ چاہیے......''

محمد جان سخت ہتھیلیاں آپس میں رگڑتی۔

''ہائے کنجری جاتکے آں ماندا کر چھوڑسی سارا روبک کڈ چھوڑسی ......'' (بدکار لڑکے کو کمزور کر دے گی)

ہائے جلم چمٹ گئی...... ہائے ہوکولوئی۔

لڑکیاں صنوبر سے ایسے شرمانے لگیں جیسے وہ بھی شہرنوں کی طرح ٹیڈی لباس پہن دوپٹہ گلے میں ڈال کر پھر رہی ہو۔

تائی بختو گھٹنے پیٹتی۔

''تکنا راتیں دونوں کے بیچ منجی (چارپائی) ڈھا سوؤں گی۔''

''ہائے ہائے ایسی بے شرمی، بے غیرتی اس پوٹھوار میں تو پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی...... لگتا ہے ترس ترس کر جنا (شوہر) ملا ہے......''

''اصغر خان نے چھٹے روز روانہ ہو جانا تھا۔ شاید وہ ان چھ دنوں کا سارا رس کشید کر لینا چاہتی تھی۔ نجانے پھر کتنی لمبی سنتھ پیاس جھیلنا تھی۔ بے اعتباری نے حریص بنا دیا تھا۔''

پچھتے روز جب وہ رخصت ہوا تو صنوبر کی بھوری آنکھیں اور گوری رنگت مکئی کے پکے ہوئے بھٹوں سی لالو لال تھیں۔ وہ دن بھر سوکھے باجرے کے سٹوں کو موسل مار مار کوٹتی اور آسمان پر اڑتے جہازوں کو دیکھتی رہی۔ انہی میں سے کوئی ایک ولایت جا رہا تھا۔ نجانے کب پلٹے۔

''ہائے کدوں مڑسن کدوں وچھوڑے مُک سن......''

سامنے وسیع و عریض پہاڑی سلسلے سیاہ بادلوں میں ڈھکے تھے، کسوں نشیبوں پر اوندھائے ہوئے آسمان کے سیاہ خیمے میں دھواں اور دھند بھری تھی، جیسے بہت سے تنوروں میں گیلی لکڑیاں دھخ رہی ہوں۔ ساون کی جھڑی اس زور سے لگی کہ پرال کھنچتے کھنچتے باجرہ، مکئی بھیگ گئے جیسے سبھی پہاڑیوں، چوٹیوں، کھائیوں، کسوں پر آسمانوں سے پرزور پرنالے چھٹے ہوں۔ ابلتے ہوئے چشمے اور جھرنے بہہ نکلے ہوں جن کا دھانہ آسمان جتنا چوڑا تھا۔ جس میں چاندی کے بے شمار تار لٹکتے تھے۔ جن میں آبدار موتی پروئے تھے۔ یہ پہاڑوں کی بارش بھی کتنی پر شور، ہنگامہ خیز، زوردار ہے۔ میدانوں کے مینہ جیسے نہیں کہ پیاسی مٹی حلق کھولے سب چوس لے جائے۔ گھونٹ بھرنے کی غٹاغٹ بھی سنائی نہ دے۔ یہاں تو بوندوں کے مضراب سے دھرتی کا ہر تار بج اٹھتا ہے۔ پتھر، چٹانیں، درخت، پتے، شاخیں، شوکارتی ہوئی ہواؤں کے کسے ہوئے ساز جیسے ساتوں سُر چھیڑ دیے ہوں۔ پرشور تانیں اور رنگیں زمین و آسمان روم روم سے دھڑک اٹھتے ہیں۔

بارش رکنے کے بعد بھی پہروں یہ جلترنگ جاری رہتا ہے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں، گرتے ہوئے پرنالے، پرشور پانیوں کی چادریں تانے میلوں بلندیوں سے گرتی آبشاریں، جیسے چوڑے دہانے والا کوئی طغیانی دریا جنات کی بستیوں کو تہس نہس کرتا ہوا۔ شب بھر گونجتی چیخیں کو کیں گرتے اوندھاتے ابلتے پگڈنڈیاں اترتے سمندروں پانی سارے کس دندیاں غوطا گئے اگلے روز جہاں کہیں بھی پتھروں میں درازوں میں مٹی کا ذرہ بھر بھی بچ رہتا تھا، وہیں وہیں کھمبیاں چھتریاں تان کر باہر نکل آئیں جیسے بارش کا مزا لینے چھاتا تان کر ہوا خوری کو نکلی ہوں۔ چتکبری کھمبیوں کے گرد بیر بوٹیوں کی سرخ مخمل بچھ گئی۔

تائی بختو نے تیل کا بھرا کڑاہا چڑھایا اور میٹھے پوڑے تلنے لگی۔ پوڑوں کی خوشبو سبھی گھرانوں میں کھلر گئی۔ انگلیاں چوستے بچے اکٹھے ہوئے۔

بکلیں لپیٹے عورتیں آٹے اور گڑ کی پراتیں سر پر دھر لائیں۔ آٹے کی پتلی لئی سی بنا چمچے کے ساتھ توے پر کڑکتے گھی میں بلوں کی شکل میں ڈالتیں اور تل کر انتظار میں دراز کی ہوئی کسی چھابی میں الٹ دیتیں۔ اس خالص زنانہ ضیافت میں مختار کے سوا کوئی مرد موجود نہ تھا جو چادر سے سر ڈھکے ناک پر انگلی جما جما کر باہر کی خبریں سناتا اور چولہے میں لکڑیاں جھونکے جا رہا ہوتا۔ مختار عورتوں کے بیچ باہر کی دنیا کا واحد رابطہ تھا جو ادھر ساگری، رواٹ، پنڈی، گوجر خان تک ہو آیا تھا۔ لاری اڈا، بازاروں، ہوٹلوں، شہر کی رہتل کے متعلق باتیں سناتا تو عورتیں ہنس ہنس پیٹ پکڑ لیتیں۔

''ہو کولوئی! یہ شہریے بڑے ہی کمینے، لچے اور چالاک ہوتے ہیں۔ اللہ ان سے بچائے ہر زنانی کے پاس گیدڑ سنگھی ہوتی ہے۔ تبھی تو...... اپنے اکبر خانے آں...... پھانس لیا...... ورنہ اپنی شکیلہ جان...... اُس شہرن کا کوئی مقابلہ...... ہے......''

شکیلہ جان دن بھر مٹھیاں گھڑ گھڑ چنگیر میں سجاتی رہی تھی۔ اب ہر روٹی کے اوپر مونگ پھلی کے دانے اور گری کی قاشیں سجا کر تنور کی دھیمی دھیمی دہکتی پٹھ پر چپکا رہی تھی۔ جس کے منہ پر الٹا گھڑا رکھ کر ڈھانپ دیا تھا جو ساری رات دھیمے دھیمے کوئلوں پر پکیں گی۔ شکیلہ جان کے ارمانوں کی طرح اندر ہی اندر دم پر لگی ہوئی یہ مٹھیاں...... صنوبر کھمبیاں توڑ لائی اور تیز مرچ مصالحہ ڈال

کر زنانہ ذائقے کا سالن بنایا لیکن کھاتے وقت جی متلا گیا۔ بڑیوں نے تجربے کا فیصلہ دیا۔

''دن چڑھے ہیں۔ تبھی تو مرچ اچھی لگتی ہے۔''

یہ کھمبیاں بھی نہ بس اک بارش کے ذرا سے قطرے کی منتظر رہتی ہیں۔ ادھر قطرۂ زندگی ملا، ادھر سر باہر نکال چھاتے اوڑھ لیے۔ جھینگر اور مینڈک ٹرٹرانے لگے۔ مچھلیوں کا پونگر برساتی نالوں اور جھیلوں میں بھر گیا۔ سارے کس نشیب جنگلی پھولوں، پھلوں اور خودرو سبزیوں سے مہکنے لگے۔ یہ برسات کا موسم بھی ان پہاڑوں میں کتنا شدید اور بھرپور اترتا ہے۔ گند کے ڈھیر میں سے بھی بہار پھوٹ نکلتی ہے۔ فاطمہ کب سے روہاں کی پھلیاں توڑ توڑ کر چادر پلو میں بھر رہی تھی۔ چند گز پرے بیری تلے بچھی چارپائی پر کتابوں کے ڈھیر میں اظہار الحق دبا تھا۔ فاطمہ کھیت کی مینڈھ ناپ کر بیری کے چھتارے سے باہر باہر بکھری ادھ پکری کھکھڑیاں چننے لگی۔ خربوزے اور تربوز پتھروں پر مارتوڑتی اور کچے پکے پھل پٹخ دیتی لیکن اظہار الحق نے کھیتی خراب کرتی اس چڑیا کو نہ تالی بجا اڑایا نہ پتھر مار بھگایا ورنہ فصل کریدتی فاختاؤں کو چڑیوں، لالیوں کو کھیتی اجاڑتی بکریوں، لومڑیوں کو وہ پتھر مار، تالی سیٹی بجا ایئر گن چلا ڈراتا رہتا یعنی پڑھنے کے ساتھ ساتھ فصل کی رکھوالی بھی کرتا رہتا لیکن اب کھکھڑیاں بھنتے توڑتی فصل ویران کرتی بیر چنتی اس فاختہ کو، اس چڑی کبوتر کو اس نے کوئی روڑا گیٹا نہ اٹھا مارا۔ کوئی سیٹی تالی بجا کر نہ اڑایا۔ فاطمہ پتھریلی پگڈنڈی پر دھڑ دھڑ پیر بجاتی لڑی میں اتر گئی اور کہاں نما سفید چٹان کے گلے لگ روئی۔

''ہوکولوٹی میں کھکھی ہی ہوتی۔ بکری ہی ہوتی چڑی کاں ہوتی جو پتھر لگتا تیرے ہاتھ سے مس ہو کر لگتا..... میں بھوری میں موئی..... میں ہوں..... اسے تو کیوں تالی سیٹی مار اڑائے۔''

ڈونگے لڑ میں بھرے پھلاہی اور بڑ کے جنگلوں میں زینت اور اس کی ماں رحمت جان صابرہ کو ہوکارے مارتی پتھر گیٹے چلاتی تھیں جیسے پرندوں کے ڈار بھری فصل اجاڑ رہے ہوں۔ صابرہ وہاں کیا کرنے گئی تھی جہاں جنات کی بستیاں تھیں، جہاں چڑیلیں شب بھر چکدار پوٹھواری زبان میں پرسوز گیت گاتیں اور سریلے بین ڈالتیں اور پہاڑوں کی طویل گھومتی فصیلوں میں ڈھولک کی تھاپ پڑتی رہتی۔

فاطمہ نے پتھروں اور ہوکاروں کی خفیہ ہوک کوک سے گھبرا کر چٹان کی لمبی گردن کو گلے سے الگ کیا۔ صابرہ گھنے درختوں کی گپھا میں سے نکلی اور اونچی ڈنڈی پر چڑھی اور اظہار الحق کی چارپائی کی پواکتی بیٹھ کر اس سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے مدتوں سے یہیں بیٹھی ہو۔ جب رحمت جان نے اسے چھپا سے تھما کر مکئی کے بھٹوں پر پھینکا تو کوئی بڑ کے جنگل میں دھڑ دھڑ بھاگا۔

''لچ کنجری کس خصم کے ساتھ تھی۔ جنوں سے یارانہ کرنے رکھ (جنگل) میں اتری تھی۔ جنڑاں لوڑنی (مرد ڈھونڈتی)..... کسی جنّی کا خصم کرنے گئی تھی۔''

اظہار الحق نے بڑھ کر چھڑایا۔

''کیا ہو گیا ہے چاچی جی! یہ تو بہت دیر سے یہاں میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی، کیا وہم ہو گیا ہے آپ دونوں کو.....''

فاطمہ نے خود دیکھا صابرہ جب ڈنڈی چڑھی تو باوے لہراسب کا پوتا وسیم جواد ھردینہ کے کسی اسکول میں ماسٹر بھرتی ہوا تھا، ڈونگھے لڑکی ایک گپھا سے نکل کر چٹا پڑ چڑھا۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا چیخ کر کہے یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے خود دیکھا یہ وسیم خانے نال ماڑی ہے لیکن اظہار الحق کو وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی اور پھر شاید وہ بھی اظہار الحق کے ساتھ ماڑی ہے جو اس کی طرف دیکھتا تک نہیں کبھی بولا بھی تو ڈانٹ کر ہی بولا لیکن وہ خود سے آپ ہی آپ اسی کے ساتھ ماڑی ہو گئی ہے۔ اگرچہ پورے گراں

میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اظہار الحق کے نال (ساتھ) ہے۔ ڈونگھے لڑ میں بچھے پڑے کے رتھ پر سوار یہ خبر آٹھ گراؤں میں گھوم گئی...... فاطمہ باوا لہراسپ کے پوتے ماسٹر کے ساتھ ہے۔ ادھلنے (فرار) جارہی تھی کہ ماں بہن نے پکڑ لیا۔ پورے گراں کے دس گھرانوں کی عورتیں ایک دوسری سے منہ جوڑے ناک پر دھری انگلی کی طرح ششدر رہ گئیں۔ اس پوٹھوار میں تو ایسی بے حیائی نہ دیکھی نہ سنی۔

بات نجانے کتنے پہاڑی سلسلے چڑھتی، کتنے چشموں، آبشاروں میں گف ہوتی بھیگتی کتنی مچھلیاں تڑپتیں مینڈک ٹراتے کہ خفتاں (عشاء) کی بانگ سے پہلے پہلے بابا لہراسپ صابرہ کی ہتھیلی پر روپیہ رکھ گیا اور اس پوٹھوار کی ایک اور تاریخی کہانی بنتے بنتے رہ گئی۔ اسی روز صنوبر نے اگلی کوٹھی میں مریم کو سپیدۂ سحر کے طلوع کے ساتھ جنم دیا۔ اس آس میں پوری رات اس نے درد زہ کی چیخیں بھی گھونٹ لیں کہ یہ تو وہ تحفہ ہے جسے دیکھنے کو اصغر خان انگلینڈ سے پھر آئے گا۔ کئی روز اس نے مریم کو نظر بھر کر نہ دیکھا کہ اصغر خان آجائے گا تو دونوں مل کر دیکھیں گے اور طے کریں گے کہ کونسا نقش کس پر گیا ہے۔ پورا پچھلا دھمیائیاں والی گھٹی کوٹھڑی کی نیچی چھت پر سے گزرتے ہر جہاز کی آواز کے ساتھ کان اور آنکھیں ٹنگی رہیں۔ دیسی گھی کی تری اور باداموں کی گریوں سے بھری سوجی کی چھاوانی کا پیالہ گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے بے جی سے آخر پوچھ ہی لیا۔

''اصغر خاناں مریم کو دیکھنے کب تک پہنچ جائے گا؟''

جواب جب وہ چیخی ہے تو گراں کے دسیوں گھرانوں نے سنا۔

''نہ جہاز کا ٹکٹ روات کی بس کا ٹکٹ ہے کہ تم چھینک مارو اور وہ کٹوا کر بھاگا چلا آئے۔ ہائے عمر گزر گئی، آج تک جنے کا نام زبان پر نہ آیا۔ ساری جوانی صوبیدار فوج میں رہا، کبھی نہ ساس سے پوچھا، کب چھٹی پر آئے گا، ساری عمر شرم کی آنکھ سیدھی نہ اٹھی۔ ہائے بے حیا، اصغر خاناں ! جس طراں جنوا نہیں جاتک الے انساں......'' (جیسے شوہر نہیں بیٹا ہے اس کا۔)

تیز گام دھڑک دھڑک گزر گئی۔ تادیر پٹڑیاں بجتی گونجتی رہیں۔ پتہ نہیں اب یہ گاڑیاں گزرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں نہ کبھی کوئی آیا نہ گیا یہ خالی خولی کیوں گزرتی رہتی ہیں۔ اس قصباتی اسٹیشن پر کراس کیوں پڑتے ہیں۔ ایک سوار بھی تو کبھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اترا نہ چڑھا کس کے انتظار کے ایندھن سے چھک چھک دھوئیں چھوڑتی ہیں یہ پاگل گاڑیاں۔

صنوبر کی نگاہیں تو آسمان کے ترازو میں ٹنگی رہتیں۔ اس گراں پر اوندھائے مٹھی بھر آسمان سے گزرنے والے ہوائی جہازوں میں سے نجانے وہ کونسا ہوگا جو انگلینڈ جارہا ہوگا جہاں مریم کا باپ رہتا ہے۔ جہاں کے ٹھنڈے موسموں میں مچھلی جیسی بے نمک گوریوں کو ٹیکسی کار میں لاتے لے جاتے کیا اسے کبھی صنوبر کا خیال بھی آیا ہوگا۔ اس نشانی کے متعلق خط میں کچھ لکھتے ہوئے شاید اسے شرم آتی ہوگی جو محض چھ دن کے وصل کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں پہاڑوں میں بسنے والوں کے دل بھی انہیں پتھروں سے بنے ہوئے ہیں۔ اصغر کا دل اس بچی کو دیکھنے کبھی نہ مچلا۔ کبھی کوئی پارسل مریم کے نام کا نہ آیا۔ کبھی کوئی منی آرڈر صنوبر کے نام نہ پہنچا۔ حالانکہ اب ہر دوسرے مہینے منی آرڈر اور پارسل آنے لگے تھے۔ یہ سب منی آرڈر محمد جان کے نام آتے جنہیں صوبیدار حکم دادا اپنے فالج زدہ وجود میں بٹ بٹ کھلی اور جاگتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا۔ یہ کبھی ٹمٹی مکئی کا دانہ سی محمد جان کس بھٹی میں تپ کر کھل گئی تھی جو اس وقت ان دس گراؤں میں سب سے مالدار عورت تھی جسے زندگی میں پہلی بار پیسہ جوڑنے کا عجب نشہ آور مشغلہ ہاتھ آیا تھا۔ انگلینڈ کی کمائی سے جدید طرز کا مکان بنا۔ فلش اور ٹونٹیوں والے غسل خانے بنے، موٹر والا کنواں کھدا، پورے علاقے میں انگلینڈیوں کی کوٹھی کے نام سے یہ جدید طرز کی عمارت مشہور ہوگئی۔ عورتیں ڈھوئے لے کر آئیں۔ بدلے میں محمد جان

نے ولایتی سوٹ جھولیوں میں ڈالے۔

بڑی بھابھی زینت اور چھوٹی بہو صنوبر کو تو اچار کے مرتبان کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ انگلینڈ کی کمائی نہ آئی تھی تو دونوں ٹائم ہانڈی پکتی تھی۔ دوسرے تیسرے روز دیسی مرغا چڑھتا لیکن اب اگر زینت اور صنوبر جٹھانی دیورانی کبھی اچار کی دوسری پھانک بھی روٹی پر دھر لیتیں تو محمد جان کی چیخم دھاڑ چوہے پر پانی بھرتی عورتیں بھی سنتیں اور کانوں کی لویں چھوتیں۔

''اہڈی دولتاں ناکے کرنا جے کررج کے روٹی وی نہ کھا سکے بندہ۔''

آخر دونوں جٹھانی دیورانی کھانے کے وقت میکے گھروں میں جا بیٹھتیں۔ ڈبوں مرتبوں میں پڑے مرچ مصالحے بھیگے موسموں کی اُمس بھری پرانی بساند چھوڑنے لگتے لیکن استعمال نہ ہوتے۔ محمد جان ناک کی پھنگ پر شہادت کی پور رکھ کر ناک غنغناتی۔

''مرد تو کوئی رہا نہیں گھر میں، کس جوگا رہن پکا کے رکھوں۔ ہائے کبھی عورتوں نے اس پوٹھوار میں دودھ چکھے جو ابال کے رکھوں گھی شکر مرد کھاتے ہیں کس کے لیے روٹیاں چپڑوں ڈاکٹر نے دودھ کے ساتھ دوائی بتائی ہے، ہائے کیوں بیوں جیون جوگے پردیس جھیل کر کمائیں اور میں اجاڑوں نہ کیوں اجاڑوں۔''

بڑے بھاپا جی فوج کی طرف سے چھ مہینے پہلے مسقط چلے گئے تھے۔ ان کے منی آرڈر بھی محمد جان کے نام ہی آتے۔ صوبیدار حکم داد اب نام کا حکم داد تھا۔ اپنے فالج زدہ وجود میں پوری کھلی آنکھوں کے ساتھ تبدیل ہوتے رویوں کو دیکھتا۔ پیسہ انسانوں، مزاجوں، عادتوں کو یوں بھی بدل دیتا ہے۔ یہ گھرانہ جو کبھی صوبیدار حکم داد کے نام کی شناخت رکھتا تھا، اب ولایتیوں کے نام سے مشہور تھا۔ یہ گراں جہاں بیٹھکیں، فصلیں، بستر، برتن، بچے سب کے سانجھے تھے، اب اپنی شناخت چاہنے لگے تھے۔ اب پوٹھوار کے ہر گراں کے نوجوان اس حسرت میں جیتے تھے کہ وہ کونسا جہاز ہوگا جو انہیں انگلینڈ یا پھر مشرقِ وسطیٰ کی کسی ریاست میں چھوڑ آئے گا، جہاں وہ فارن کرنسی میں کمائی کریں گے۔ ولایتیوں کی کوٹھی میں میڈ ان انگلینڈ ریڈیو کیمرے، ٹیلی ویژن، فریج جیسے نوادرات بھرے تھے۔ ہر آنے جانے والوں کے لیے کوٹھی کے تالے کھول کر اس عجائب گھر کی سیر کروائی جاتی اور پھر خزانے کے تالے چڑھا دیے جاتے۔ ہر ماں دنوں ایسی اشیاء کے خوابوں میں سونہ پاتی جنہیں استعمال کرنے کا نہ وہ طریقہ جانتی تھی، نہ خواہش رکھتی تھی لیکن ولایتیوں کی کوٹھی جیسا بھرا بھکنا ایک مکان ہو جس کے کنڈلے تالے لگا کر کنجیاں کھیسے میں ڈال خود کچی کوٹھری میں بیٹھ رکھوالی کریں۔ کسی بہو پوتی کو قریب پھٹکنے نہ دیں۔ فصل کریدتے پرندوں کو اڑانے والا سانگل ہاتھ میں رکھ چوکیداری کریں، نہ خود چھوئے نہ کسی کو چھونے دے۔ ولایت والی کمائی پلے میں باندھ سرہانے رکھ سوئے۔ عجب سُرور تھا اس خزانے کی حفاظت کا۔

صنوبر کے بری جہیز کے کپڑے صندوقوں میں پڑے پڑے مسک گئے۔ کسے دکھانے کو پہنے جاتے۔ سلے ہوئے پو رے نہ رہے، ان سلے چھد گئے گرم چادریں سویٹر اپنی ہی حرارت چھوڑتے کرم خوردہ ہو گئے۔ سرخی اور کریموں کی ڈبیاں خشک ہو کر پیندوں سے چپک گئیں۔ انتظار کے اسفنج نے چہرے اور ہونٹوں کی تازگی خود ہی نچوڑ لی۔

اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر سے گاڑیاں آج بھی گزرتی تھیں۔ نہ ٹھکیں نہ رکیں، ہر گزر جانے والی گاڑی اس پہاڑی گاؤں کے قلب کو لرزا جاتی، جہاں صوبیدار حکم داد کی چارپائی بچھی رہتی۔ ایک ہی کروٹ میں پڑے پڑے لاگے لاسے اور زخم جو پیپ چھوڑتے وہ اس فوجی جسم کی برداشت سے بھی باہر ہو جاتا کہ میجر اکبر خان نے گھات لگا کر جو فائر کھولا تھا جو برسٹ

مارا تھا، اس نے پورے وجود کا قیمہ کر دیا تھا۔ لہو اور بوٹیاں باریک باریک ریشوں کی شکل میں ابل پڑی تھیں لیکن وہ اعضا جن کی فوری موت تکلیف سے نجات کا سبب بنتی ہے، وہ بچے رہ گئے تھے۔ اب وہ قطرہ قطرہ بوند بوند گھسٹ گھسٹ رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ اکبر خان کی نافرمانی ان سے کسی فوجی کی پروقار موت کا اعزاز بھی چھین لے گئی تھی۔

محمد جان زخموں بھری کھال میں لپٹے اس فوجی وجود کو ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ مرتے ہوئے دیکھتی تو ناک پر شہادت کی انگلی ٹیڑھی کر کے رکھتی:

”جے کر امید ہوئے کہ پیسہ لگا کر بچ رہے گا تو اللہ جانتا ہے لگا گزرتی۔ پر مٹی کی ڈھیری پر روپیہ پھونکنے کا فائدہ۔ کوئی سوکھا کمایا جاتا ہے۔ برفوں کے ملک میں ہڈیاں کھرتی ہیں، لہو جم جاتا ہے تو ملکہ کے فوٹو والا نوٹ ہاتھ آتا ہے۔ ہائے میں کوئی ڈائن ہوں جو جیون جوگے کی کمائی روڑھ دوں۔ اک اک پیسہ جان سے بڑھ کر سنبھالوں گی۔ آپ مری جھاں تاں وی روپے نی نسوار نہ چکھی کنیاں پیسہ دنجاواں (خود مر جاؤں تو روپے کی نسوار نہیں پھینکتی پیسہ کیوں ضائع کروں) بڈھے نے کوئی بچنا ہے۔ ہو کو لوٹی......“

پوٹھواری زبان کے مخصوص اتار چڑھاؤ میں لفظوں کی ادائیگی جذبات کی ترجمانی کرتی۔ ریل گاڑیوں کے پہیوں تلے لرزتی سنسناتی پٹڑیوں کی لرزش پہاڑی سلسلوں میں ہوکار بھر جاتی، گہرے نشیبوں میں سیٹیوں اور ررکوں کی بازگشت بار بار پلٹتی جو جنتیوں کے وحشیانہ قہقہوں اور کربناک بینوں کو لپیٹ لے جاتی۔ تادیر اس پہاڑی گاؤں کی زمین یوں دہلتی رہتی جیسے اس کے سینے میں ہزاروں قیدیوں کی بیڑیاں اور زنجیریں جھنجھنا اٹھی ہوں۔ شکیلہ جان صوبیدار حکم داد کے زخموں کو سپرٹ سے دھوتی۔ آئیوڈین کے پھاہے رکھتی، حکم داد کا فوجی وجود درد کی پچھاڑیں کھاتا جیسے شکیلہ جان کے ہاتھ نہ ہوں، زہر میں بجھے تیر ہوں۔

”شکیلہ جان تیرا یہ صبر، یہ خدمت ہی تو مجھے مار رہا ہے۔ شکیلہ جان تیری یہ خاموشی اندر ہی اندر کنڈلی مارے دکھ کا ناسور، کنڈیاری کی طرح خشک ہوتا تیرا وجود ہی تو میری موت ہے۔“ صوبیدار بڑبڑاتا رہتا لیکن سوائے شکیلہ جان کے کوئی سمجھ نہ پاتا تھا۔

تین جنگیں لڑنے اور جانبر رہنے والا یہ سپاہی جب دل و جان کے اس روگ سے پچھاڑیں کھاتا۔ بازگشت ڈونگھے لڑ کی پتھریلی چٹانوں سے منہ سر ٹکراتی تو جنتیوں کے بین مزید پر شور ہو جاتے۔

جس روز گھر میں موٹر کار آئی، اس رات شکیلہ جان تکیوں کا پہاڑ کمر کے پیچھے رکھ کر صوبیدار حکم داد کے منہ میں نوالے ڈال رہی تھی۔ نوالے کے کچھ ذرے باچھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کچھ اڑ کر شکیلہ جان کے چہرے پر چپک جاتے۔ وہ رومال سے ذرے صاف کرتی، پانی کا کٹورہ منہ سے لگاتی اور دل ہی دل میں بین ڈالتی۔

”ہائے میں نکھتری نہ جنتی نہ ابا جی کا یہ حال ہوتا۔ ہائے مجھ کو ماں سڑی کا روگ کھا گیا ابا جی...... ہائے ابا جی...... ہائے میں مقدر پٹی مرتی بھی نہیں۔ ہائے ڈونگھے لڑ میں روز جنتیوں کے جنازے اٹھتے ہیں، مجھ پچھل پیری کو موت نے بھی نہ قبولا۔“

سامنے نئی کوٹھی کا گیٹ کھلا تھا۔ آٹھ گراؤں کے نوجوان انگلینڈ سے آئی گاڑی کو پوروں سے چھو کر اس کی ملائمیت محسوس کرتے اور اس کی قیمت کا تخمینہ لگاتے جس کا حساب روپوں میں تو بنتا ہی نہ تھا کیونکہ اب یہاں پاؤنڈز اور ریال زیادہ مروج ہو رہے تھے۔ محمد جان اندر ہی اندر کھولتی تھی۔ جس فرش پر یہ پیر پڑ رہے تھے، وہ کوئی سیاہ مٹی سے دبی ہوئی ہاتھ کی تلن نہ تھی جو ہماشا کے پیروں تلے بچھی رہتی جس گاڑی پر یہ ہاتھ لگ رہے تھے۔ ان کی پچھلی اگلی نسلوں نے کبھی کسی ایسی گاڑی کو نہ چھوا تھا۔ اس کی قیمت کا حساب لگانے کو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کم پڑ جاتی تھیں۔ کبھی پیسہ جوڑنے گن کے رکھنے کو ملا ہی نہ تھا۔ گنتی کیسے

کرنی آئے۔ محمد جان دیکھنے سننے والوں کو بتا رہی تھی۔ سارے گراں کے میرے (کھیت) بک جائیں تو یہ ایک گاڑی آتی ہے۔ ہائے چڑھنے کے لیے تھوڑی ہے سینت سنبھال کر رکھنے کے لیے ہے۔ اللہ جی نظر بد سے بچانا، ہائے میں کوئی ڈائین ہوں جو پردیسی کی کمائی لٹا دوں، مری گیساں پر پیسہ لائی کے دوائی نہ گنساں۔ (مر جاؤں گی پر دوائی پر بھی پیسہ نہ لگاؤں گی۔)

صوبیدار حکم داد کی نگاہیں گاڑی کی چمچماتی سطح سے چپکی تھیں اور اب پلٹ آنے کی ان میں سکت نہ رہی تھی، جیسے سورج کی تیز روشنیوں نے پتلیاں جلا دی ہوں۔ شکیلہ جان نوالہ ٹھونستی تھی لیکن ٹیڑھا جبڑا ایک طرف مڑ کر بند آنکھ سے جا لگا تھا اور خوراک کی رالیں سفید داڑھی کو بھگونے لگیں۔ ولایتیوں کی ولایتی گاڑی کو چندھائی آنکھوں سے دیکھنے والے اب صوبیدار حکم داد کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ سنگلاخ پہاڑی چڑھائیوں پر تنومند گھوڑے کی طرح بار برداری کرنے والا یہ فوجی ایک واقعے کی زد میں آ کر موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ شاید اللہ کی مرضی یہی تھی کہ اب بزرگوں کی وہ نسل مر جائے جس نے گراں کو اک عجیب وغریب رسن میں باندھ رکھا تھا، جہاں اپنے الگ الگ وجودوں کی شناخت بھی نہ تھی، سب گڈمڈ پتہ نہیں کس کا ہاتھ بازو چہرہ کہاں ختم ہوتا تھا اور کہاں دوسرے کا شروع ہوتا تھا، جب سے تیرا میرا کی حدود شروع ہوئی تھی۔ بڑے بوڑھے بے کاشت کھیتوں کو بے نور آنکھوں سے دیکھتے جن میں اب کوئی فصل نہ اُگائی جاتی تھی لیکن جن کی قیمت کا تخمینہ لگانے کو ادھر یورپی طرز کے نئے شہر اسلام آباد سے انوسٹر آنے لگے تھے۔ ناہموار ڈھلانیں بلند چوٹیاں بنجر زمینیں ریتلے ٹبے سب کا مول لگنے لگا۔ رتھ کٹنے لگے تھے، کنالوں میں پھیلے بڑ خشک ہونے لگے جن کی لمبی لمبی جڑوں سے لپٹے چگادڑ ویران ہو چکے کنوؤں میں اتر گئے تھے۔ راہٹ خشک ہونے لگے تھے۔ ٹریکٹر اور موٹریں متعارف ہونے لگی تھیں۔ بختو بنا دانتوں کے جبڑے سے دھواں اگلتی پھونکنی کی طرح دائیں بائیں بازو لہرا لہرا کر بین ڈالنے لگی۔

''ہائے کھانے کو کم تھا پر کبھی کوئی بھوکا نہ رہا۔ جوڑنے کو کچھ نہ تھا لیکن بنا علاج کے کبھی کوئی نہ مرا تھا۔ کوٹھے چھوٹے تھے لیکن دل بہت بڑے تھے۔'' عورتوں نے صوبیدار حکم داد کی میت کو بینوں سے سجا دیا تھا۔ جب میجر اکبر خان اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ پہنچا تو صوبیدار حکم داد کو دفن ہوئے چوتھا روز تھا اور اب اسے یہاں آنے میں کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ اب وہ صوبیدار حکم داد کی مٹی کی ڈھیری پر پھول بچھا کر بے خوف وخطر فاتحہ پڑھ سکتا تھا۔

پوٹھوار کی عورتیں سروں پر بانہیں گھماتی بین ڈالتی اسے اچانک سامنے پا کر اردگرد پھیلے پہاڑی سلسلوں کی طرح ساکت وصامت رہ گئیں جیسے زبانیں اپنے ہی دانتوں تلے کٹ کٹا گئی ہوں کہ ان کے بینوں کے روڑ بجر کے چھینٹے اس بدیع الجمال کو کہیں میلا نہ کر دیں۔ کسی کو بھی اسے بانہوں میں لپٹانے اور گلے سے لگا کر بے اختیار بین کھینچنے کی جرأت نہ ہوئی تھی جیسے ان کے بدبولباسوں اور کھردری جلد کا لمس اس کے لیے ضرر رساں ہو۔

سفید عربی اسکارف لپیٹے اور سیاہ عبایا پہنے جیسے کعبہ کے گرد طواف کا ساتواں چکر پورا کرتے ہی ادھر چلی آئی ہو۔ پوٹھوار کی روایت کے مطابق کسی کو اس کے دونوں گالوں پر بھی ناگوار بوسے دینے کی جرأت نہ ہوئی تھی جیسے کعبہ کے نرم لطیف پاکیزہ غلاف پر چلتے ہوئے گرد آلود بدرنگ کھردرے ہونٹ ثبت کرتے اس کے میلا ہو جانے کا خدشہ ہو یا بے حرمتی کا خوف ہو، یکبارگی ایک ہی خیال سبھی کو لپیٹ گیا۔ یہ کعبے کے ریشم کی کامدانی کترن اور شکیلہ جان پوٹھوار کا کوئی وٹہ روڑا پیر کی ضرب سے لڑھکتا لڑھکتا دور نشیب میں غرق...... ہجوم کے آخری چکر میں شکیلہ جان دھنسی پھنسی بجھے دیوں سی کالک بھری آنکھوں سے کعبے کے غلاف کی چمک میں چندھیائی ہوئی جس کی اپنی جلد کو ساون کی امس اور پوہ ماگھ کا کہرا چاٹ گیا تھا اور جسم دجاں کو انتظار کی زن

زناتی ہوئی ریل گاڑی روندتی کچلتی گئی تھی۔ ریل کی پٹڑی پر دھڑ ادھڑا انچا دجود دھونکار ہا تھا جس کا لوہا دخانی انجن کی حرارت سے پگھل کر چڑ مڑا گیا تھا۔

اکبر خان اگلی صبح ہی ادھر اسلام آباد کے کسی ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ شاید شکیلہ جان کے آسیب کو برداشت کرنے کی سکت اس فوجی کے حوصلوں سے سوا تھی۔ آنکھوں کے کالک بھرے دیوں میں جو واٹ جلتی تھی، وہ اب بھی اپنی ساخت میں برقرار تھی۔ ہڈیوں کے پنجرہ وجود کو جو روگ لگ گیا تھا، وہ اسی کا دیا تھا۔ جو آج بھی تازہ زخم کی طرح دھڑکتا اور لہو اگلتا تھا۔

اکبر خان کے لیے کسی بھی دفاعی حکمت عملی کے تحت سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دھتکار، نفرت، دوری، لاتعلقی کا کوئی ردعمل ہی ظاہر نہ ہو، ایسے بھوت پریت سائے یا آسیب کا انسانی زندگیوں سے کیا تعلق وہ منہ کی چوٹ کھا کر سٹپٹا کر لوٹ گیا۔ ''چڑیل بھوتنی آسیب'' یہ پوٹھوار کی پاگل عورتیں کب بدلیں گی۔ مریم چھٹے برس میں تھی جب اس کا باپ اصغر خان ولایت سے دو مہینے کی چھٹی پر آیا۔ پورے علاقے کے لڑکے جلوس کی شکل میں اسے لینے ایئرپورٹ پر پہنچے۔ وہ اپنی بھیجی ہوئی ولایتی ری کنڈیشن گاڑی پر پہلے قبرستان گیا اور فاتحہ خوانی کے بعد صوبیدار حکم داد کی قبر کی عالیشان تعمیر کا حکم دیا اور پھر نئی تعمیر شدہ کوٹھی میں یہ قافلہ جا اترا۔

محمد جان انگلینڈ سے آئے اٹیچی کیس گن گنا کر پہلے ہی اندرونی کوٹھڑی میں رکھ چکی تھی اور چابی پراندی کے دھاگے سے باندھ کر بیٹے سے ملی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا دیا تھا کہ تحائف کی تقسیم وہ خود سوچ سمجھ کر کرے گی۔ اب اس گراں میں مشترکہ ملکیت والا نظریہ بدل گیا تھا۔ فوجی بوٹ جیکٹ، لیمپ، لالٹین، ٹارچ، ریڈیو، ترپال، چھتری، دیگچے، بستر، بیگ، بستر بند کے مشترکہ استعمال میں اب ملکیت والا نظریہ پیدا ہو گیا تھا۔

نوجوان خوابوں کے دیس کے قصے سننے کے منتظر تھے۔ جہاں کمرے اور پانی ہر وقت گرم رہتے تھے۔ جہاں ہسپتالوں میں مفت علاج ہوتا تھا جہاں ٹرینیں زیرزمین چلتی تھیں اور میمیں مختصر لباس میں لفٹیں چڑھتی اترتی تھیں اور ہاتھ برابر دھجی لپیٹے خود کو سانولا کرنے کی خواہش میں دھوپ میں نہاتی تھیں اور جہاں شراب سرعام پی جاتی تھی لیکن صنوبر اس رات کی کوئی بچی رہی کترن ٹٹولتی رہی تھی جو ذرہ سی بھی اس کے حصے میں نہ آپائی تھی۔

اصغر خان نوجوانوں کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے تھک کر وہیں جدید تعمیر شدہ کوٹھی میں ہی سو گیا تھا۔ وہ خود جس کمرے میں لیٹی تھی، وہ انگلینڈ سے آئے صندوقوں اٹیچی کیسوں سے بھرا تھا اور مبارکباد دینے کے لیے آنے والی خواتین انہیں حیرت اور حسرت سے لتھڑی بینائی میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ مریم ایک بار ننھے ننھے پیروں کے ساتھ ان سیاہ اور نسواری پہاڑیوں پر چڑھنے کی کوشش کر چکی تھی لیکن بے جی کی ڈانٹ پڑنے کے بعد اب ماں کے وجود میں چھپی سرگوشیوں میں یہ پوچھتے پوچھتے سو گئی تھی۔

''صندوق کب کھلیں گے؟''

اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی کو فی الفور کھول کر دیکھ لیتی کہ کیا کسی میں اس کے لیے کوئی ولایت کی میم آئی ہے۔

محمد جان نے سبھی صندوقوں کی چابیاں پراندے سے کھول کر اب نالے سے باندھ لی تھیں۔ پراندے سے رات سوتے سمے کوئی کھول کر صندوقوں کی تلاشی لے کر دوبارہ چپکے سے باندھ نہ دے۔ ان صندوقوں کے اندر کیا بند ہے نہ کبھی وہ خود دیکھے گی نہ کسی کو دیکھنے دے گی۔ جان سے بڑھ کر حفاظت کرے گی۔ یورپ میں اتنے برس کمائی کرنے والا اصغر خان ویسا ہی پوٹھوار لوٹا تھا جیسا کبھی یہاں سے گیا تھا۔ یہاں کی پوٹھواری زبان اور رہتل میں کیا کچھ آمیز نہ ہو گیا تھا۔ انگریزی، اردو، پنجابی لیکن وہ وہی خالص دیہاتی پوٹھوار کی زبان اور بود باش لے کر پلٹا تھا جو کبھی یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اس کے لب و لہجہ، عادات،

کھانے پینے کے طور اطوار کسی میں بھی یورپ مخل نہ ہوا تھا۔ یہاں کے پوٹھواری نوجوانوں کے مقابل وہ بہت پینڈو دلگ رہا تھا۔ یہاں کے پوٹھوار کے قلب میں اسلام آباد جیسا یورپ آن آباد ہوا تھا جس نے جدتوں کو نئی سمتیں فراہم کردی تھیں لیکن خود ولایت میں رہنے والے پر ولایت نہ کھلا تھا۔ کہتے ہیں ولایت میں عورت مرد کے بیچ کوئی شرم نہیں ہوتی لیکن یہ اصغر خاناں کس ولایت میں رہا تھا کہ اپنی ہی بیوی سے یوں شرماتا، بدکتا اور بھاگ نکلنے کے رستے دیکھتا جیسے ڈونگھے لڑ کی کوئی جننی اسے دبوچ لے گی۔ وقت نے اس گھرانے میں ولایت کا پیسہ داخل کردیا تھا تو ولایتی اشیاء اور استعمال نے مزاجوں میں بھی ولایتی رنگ آمیزی کردی تھی لیکن اجتماعی بودو باش کا رواج ابھی بھی اس گراں میں مروج تھا، جو صدیوں سے جاری وساری تھا۔

چاندنی کسوں کے گہرے نشیبوں میں بھرتی مکئی کے کھیتوں اور جھیل کے شفاف پانیوں میں بجھ گئی تھی۔ چاندی کی کترنیں بہہ رہی تھیں۔ جھیلوں اور چشموں میں چاند پورا اتر آیا تھا۔ چوٹیوں پر آبشار میں چو ہے اور جھیل میں کئی چاند بھیگ رہے تھے جو خفتہ جذبات کو گرم موم کی طرح پگھلا رہے تھے۔ ڈونگھے لڑ میں جنات کی شادی تھی۔ شب بھر ڈھولک بجتی رہی تھی اور صنوبر ولایتی صندوقوں سے بھرے اکیلے کمرے میں انتظار کے دبے قدموں کی آہٹ بن بجتی رہی۔ سات برس کے تنہا حبس میں منہ بند پڑی لاش بو مارنے لگی تھی۔ برف کی سلوں میں لگے زخم گرم آہوں میں پگھلنے لگے تھے۔ خلیہ در خلیہ ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ سارے عضلات عجب توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکے تھے جو پچھلے سات برس رستے رہے تھے لیکن منہ کھولے ہونکتے ہوئے ان زخموں پر پھاہا رکھنے کو کوئی نہ آیا تھا۔ کیا آج بھی نہیں......

انہی دنوں بڑے بھا پاجی بھی مسقط سے چھٹی پر گئے ان کے استقبال کے لیے نوعمر لڑکوں اور بزرگوں کا قافلہ چکلالہ ایئرپورٹ پر جمع ہوا اور انہیں ہاروں، پھولوں سے لاد کر انگلینڈ سے لائی گئی گاڑی پر بٹھا نئی کوٹھی میں لا اتارا کیونکہ اب وہ حاجی بھی ہو گئے تھے۔

گراں کے بچے کھچے بزرگ مکہ مدینہ کی پاک فضاؤں، گنبد خضریٰ کے پرنور نظاروں کے تذکروں، خانہ کعبہ کے سیاہ جھلمل غلاف کے کسی ٹکڑے کو اور خاکِ پاک سے کلمہ طیبہ لکھے کفن کے خواہش مند تھے کہ خود تو حاضری کے قابل نہ ہوئے پر اپنے بچوں کے صدقے وہاں سے آئی کوئی نشانی تو چوم سکیں اور مرنے کے بعد سینے پر اسے سجا بستر قبر میں اتر جائیں تو اگلی منزلیں کتنی آسان ہو جائیں گی۔

اردگرد کے گراں کے نوجوان عرب ریاستوں کے ویزوں کی خواہش میں بھا پاجی کے پیر ٹانگیں شب بھر دباتے رہے اور زینت بھابھی اپنے حصے کی رات کا کوئی کونا ٹٹولتی رہی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پتہ نہیں یہ تھکن تھی، ملاقاتیوں کی مصروفیت تھی کہ مدتوں مجرد زندگیاں بسر کرنے والے دساور سے کمائیاں لانے والے ان مردوں میں عورتوں کے وجود سے ہی مغائرت پیدا ہو گئی تھی کہ پردیس کے ٹھنڈے موسموں نے مردانہ صلاحیتیں ہی منجمد کردی تھیں۔ ڈونگھے لڑ میں جنات کے ہاں کوئی مرگ ہوگئی تھی لمبے پرسوز بین، پتھریلی چٹانوں سے ٹکراتے تو جیسے دیگوں کے اندر کفگیر بجتے ہوں، یہ جنیاں بھی پوٹھوار کی عورتوں جیسی ہی دکھتی تھیں۔ ان کے بین اور آہیں بھی انہی کی طرح ہی کربناک تھیں جو چیختی گونجتی تیز آوازوں میں شب بھر نوحے رلاتیں رہیں۔ مشترکہ صحن میں سوئی عورتیں منہ کھولے خراٹے لیتی تھیں لیکن چھت پر سوئے مردوں میں کسی ایک کے پہرے پر بیٹھنے کی روایت ابھی بھی باقی تھی۔ اب تو یوں بھی دساور کی بے انت کمائیاں آ گئی تھیں، ان گراؤں میں بھی ہوس اور آپا دھاپی متعارف ہو رہی تھی۔ بھابھی زینت اور صنوبر اس کڑے پہرے میں رات بھر کروٹیں بدلتی تھیں۔

ہائے لوٹی ہو کو ہائے برسوں بعد پلٹنے والا اک بار تو پوچھے یہ سات برس کوہ گراں کو سر پر رکھ کر کتنی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں عبور کیں۔ کتنے چشموں، آبشاروں میں منہ ناک غوطائے پیاسی پیاسی پکارتی رہی، لیکن سب نظریں تو بند اٹیچی کیسوں اور بھرے بٹوؤں کی خیرگی میں حیران تھیں۔ چاند بھری رات میں پکارتی کرلاتی ان چکوروں کی تڑپ پھڑک کون دیکھتا۔

بڑے بھا پا جی کا چھٹی لے کر اور اتنے پیسے کرائے پر ضائع کر کے آنے کا ایک خاص مقصد تھا۔ انہوں نے فیصلہ سنایا، خاندان بھر کی کنواری لڑکیوں کی خاندان کے اندر موجود لڑکوں کا جوڑ دیکھ کر شادیاں کر دی جائیں۔ تین لڑکے تو گھر کے اندر موجود تھے۔ وہ اگر چوں چراں کرتے بھی تو بس صیاد کے پنجرے کے اندر ہی پھڑ پھڑا سکتے تھے۔ دو کے ویزے اصغر خان کے پاس تھے اور ایک کا بڑے بھا پا جی کی جیب میں محفوظ تھا۔

یہ ایک خاموش ڈیل تھی کہ شادی ہماری پسند کی اور ویزے تمہاری پسند کے۔ مسئلہ اظہار الحق کا تھا جو پچھلے پانچ برس سے کراچی میں نوکری کر رہا تھا اور واپس پلٹنا اسے اب یاد نہ رہا تھا۔ اس کے نام سے بندھی فاطمہ شاید حافظے کے کسی خانے میں گھر نہ بنا سکی تھی۔ وہ جو اس بیری کے پیڑ کی حفاظت میں کنکر پتھر اٹھائے برسوں سے چڑیاں گھگھاں لالیاں اڑاتی رہی تھی جس کے سائے میں کبھی اظہار الحق کتابیں پڑھتا تھا اور کھکھردیوں سبزوں کی واڑیوں کی حفاظت کرتا تھا جہاں اس کے پیروں کے نشان ذرے ذرے پر ثبت تھے۔ پانچ برس سے فاطمہ ان کھروں کی شناخت دل کے نقشِ پا میں چھپائے ایک ایک نشانی کا شمار کرتی تھی۔ بنا چھاپ کی انگلی میں ایک ہی نام کا چھلا دن میں ہزاروں بار گھماتی تھی۔ چوہے کے پانیوں میں ایک ہی شبیہ بنتی بگڑتی تھی۔ لال مٹی اور چتکبرے پہاڑوں کی فصیلوں کے اندر ایک ہی نام کی بازگشت ٹکراتی تھی جسے جنات بھی بار بار دہراتے تھے۔

''اظہار الحق، اظہار الحق۔'' خود جس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ان پڑھ پوٹھوارن آخر خود کو اس کے نام ہی کیوں وقف کرنے پر تلی ہے۔ اس خاندان کی لڑکیاں بھی وقف کی املاک کیوں بن جاتی ہیں۔

درگاہوں کی مجاور جیسے ایک ہی نام پر دھمال ڈالتی ہوئیں۔ حشیش کی بھنگ کوٹتی مست ملنگ ایک ہی ریشم کا تار خود سے لپیٹتی گھٹ کے مر جاتیں۔ خود ہی شہد بنائیں، اسی میں غوطاتیں۔ پتہ نہیں پوٹھوار کی عورتوں کو وفا کی گڑھتی یہاں موجود ہر ٹیلے پر بنے مزاروں، درگاہوں اور چڑھاوؤں نے پلائی تھی کہ پیروں، مریدوں والے کلچر نے دھونی دھکائی تھی۔

تین شادیاں تو باہر سے لائی گئی ڈالروں اور ریالوں کی کمائی سے دھوم دھام کے ساتھ انجام پائیں۔ اب کی بار دوستالے ادھر گوجر خان، دینہ، جہلم، اٹک تک سے بینڈ باجوں کے ہمراہ چاندی کی لڑیوں والے گانے اور سو سو روپے کے نوٹوں والے ہاروں کے ساتھ دھوم دھام سے پہنچے تھے اور عورتوں کے گیتوں کی لے کے ساتھ ادھر ڈونگے لڑکی جنتیاں باری دیتی رہی تھیں۔ ڈھلانوں نشیبوں میں پھیلے گھنے رتھ (جنگل) میں شکار کھیلتے اور بلندیوں سے گرتی آبشار سے پانی پیتے بھیڑیے سور اور چیتے ان آوازوں سے ڈر کر گپھاؤں میں چھپ جاتے اور ڈھولکی کی بازگشت ٹھنھار دھانوں والے کسوں میں بجتی رہتی۔ ابھی سہاگ پڑے کی خوشبو آنگنوں میں پھیلی تھی۔ کلیوں سے ٹنگے سہروں کے پھول ابھی تازہ تھے۔ مہندی والے ہاتھ ابھی مہک چھوڑتے تھے۔ شنیل کے سوٹوں پر دبکے کا کام ابھی جھلملاتا تھا۔ سونے کے کڑوں کی دمک ابھی گہری سنہری تھی کہ تینوں دولہوں کو لے کر جہاز اجنبی فضاؤں میں اڑ گئے اور تینوں دلہنیں انتظار کے بے کنار آسمانوں میں تنی بے انت خوابوں کی قوسِ قزح میں جھولتی رہ گئیں۔

یہ ستر کی دہائی تھی جب پوٹھوار میں سے ہر وہ مرد جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا تھا، ہر وہ بچہ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ پاسپورٹ بنوا کر بیرون ملک کمائی کرنے چلا گیا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا پوٹھوار مردوں سے ایسے ہی خالی ہوا ہے

جیسے کبھی لام کے زمانے میں اجڑ گیا تھا۔ عورتوں اور قریب المرگ بوڑھوں کے سوا چلتا پھرتا کوئی مرد نظر نہ آتا تھا جو کنواری تھیں، ان کے بیاہنے کو بر نہ رہا جو منگی تھیں، وہ سروں پر جمی سیاہ چادروں میں چاندی کے تار چھپائے انتظار کے بوجھ تلے کمر خمیدہ ہونے لگیں جو بیاہی گئی تھیں، وہ کوکھ میں نئی دھڑکنیں شمار کرتی فضاؤں میں اڑتے جہازوں کو گنتیں شاید کوئی جہاز اسے لے کر لوٹ رہا ہو جو اس نام کو شکل دے جائے جسے بچوں نے بس سنا تھا، دیکھا کبھی نہ تھا جو بے جی کو پیسے بھیجتے تھے اور بے جی چھپا چھپا رکھتی تھیں اور بچوں سے راہ جاتیں عورتیں پوچھتی تھیں:

''پیو کدوں مُڑسی آ۔'' (تمہارا باپ کب لوٹے گا) اور مائیں بین کے انداز میں ہجر کے گیت گاتیں اور آنسوؤں سے تکیے اور کان بھگوتی تھیں۔

بنا باپ کی نگرانی کے یہ بچے اب جوان ہونے لگے تھے۔ سہاگنیں بیواؤں جیسے شب و روز کے کولہو میں جتی قبل از وقت بوڑھی ہونے لگیں۔ ان پڑھ ماؤں کے بچے ادھر روات، سہالے، گوجر خان اور پنڈی کے انگریزی سکولوں میں پڑھتے تھے اور ولایتوں کے بچے کہلاتے تھے۔ ان دنوں گراں کے گھروں میں نل لگ گئے تھے۔ نئی طرز کے باتھ روم بن گئے تھے۔ لڑی ویران ہو گئی تھی۔ جہاں ہر جھاڑی کے پیچھے بیٹھے بچے مونگ پھلی چباتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ یہ قدرتی لیٹرینیں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ مخصوص تھیں۔ لڑی کی سمت کبھی کوئی مرد نہ پھٹکا تھا۔

پتھروں سے اسارے ہوئے مکانات شاندار کوٹھیوں میں تبدیل ہونے لگے تھے جن کی چھتوں پر پانی کے ٹینک رکھے تھے۔ ٹھنڈے گرم پانی کی ٹوٹیاں لگی تھیں۔ گیزر اور ہیٹر چلتے تھے۔ اب چوہے کا پانی کناروں کناروں بہتا تھا لیکن اسے پینے والا کوئی نہ تھا۔ فریج اور کولر کے ٹھنڈے پانی گھروں کے اندر دستیاب تھے۔ کوئی گھڑے بھرنے کی مشقت کیوں کرتا۔ پہاڑوں سے اترتی چٹانوں سے منہ زور ٹکراتی آبشار ندی بن نشیب میں پرشور بہتی تھی لیکن کپڑے دھونے کو کوئی عورت سر پر پنڈ اٹھا کر پگڈنڈی نہ اترتی تھی کہ اب تو واشنگ مشینوں کا رواج ہو چلا تھا دیسی صابن کی جگہ پاؤڈر استعمال ہونے لگا تھا۔ مونگ پھلی کے کھیت پہلے بٹائی پر دیئے گئے پھر بٹائی کرنے والے بھی ادھر مسقط اور دوبئی سینکڑوں منزلہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے سمگل ہو گئے۔ کاشتکاری کے طریقے فراموش ہو گئے۔ مونگ پھلی، مکئی، باجرہ، جوار اگانے والے کھیت سوکھنے لگے۔ مینہ اب بھی برستے تھے جنہیں کسان سونے کی بوند کہا کرتے تھے لیکن اب اس سونے کو کٹھالی میں پگھلانے والا کوئی کیمیا گر نہ بچا تھا۔ گندم کی گہائی اور مونگ پھلیوں کی کھدائی کے موسم میں سجنے والے میلے، خواب و خیال ہو گئے تھے۔ رہٹ کے کنویں سوکھ گئے تھے اور ٹنڈیں بے نور آنکھیں کھولے، گئے وقتوں کی یاد میں ڈھول سے اَٹی تھیں۔ کس اور پہاڑ اترتے چڑھتے رستے کانٹے دار جھاڑیوں سے بھر گئے تھے۔ اب ان پر کون آنے جانے کی مشقت کرتا کہ ہر گھر کے کار پورچ تک سیاہ کشادہ سینے والی پکی سڑک بنی تھی جس پر امپورٹڈ گاڑیاں فراٹے بھرتی تھیں۔

سولہ سترہ برس کے نوعمر لڑکے سکول چھوڑ کر باہر کے ویزوں کے منتظر باپ چاچوں کی بھیجی ہوئی کمائی سے بیل باٹم پتلونیں پہن، امپورٹڈ گھڑیاں اور عینکیں لگا کر ادھر چاندنی چوک اور راجہ بازار میں قلمیں بڑھا کر ون ویلنگ کرتے موٹر بائیک کے سائلنسر پھاڑ کر ڈن ہل کے دھوئیں چھوڑتے اور ڈالروں اور ریالوں میں ان کی قیمتیں بتاتے تھے۔

یہ علاقہ جہاں کا تقریباً ہر مرد انگریز کے زمانے میں بھی پڑھا لکھا تھا لیکن اب باہر کی کمائی سے پروان چڑھنے والے یہ لڑکے آٹھویں نویں جماعت سے ہی لڑھکنے لگے اور نئے ماڈل کی گاڑیاں فل اسپیڈ میں اسلام آباد کی یورپی طرز کی سڑکوں پر

گھماتے ہوئے اپنے ویزوں کا انتظار کرنے لگے۔

اسلام آباد اور پنڈی کی جدید کالونیوں، بلاکوں میں ولایت کی دولت سے ماڈرن کوٹھیاں بن گئی تھیں جو سفارت خانوں اور بیورو کریٹس نے مہنگے کرایوں پر اٹھا رکھی تھیں اور جن کے کرائے یہ نو عمر لڑکے وصول کرتے اور دن بھر اس جدید شہر کی مہنگی مارکیٹوں اور ریستورانوں میں بنا محنت کے ہاتھ آئے پیسے کی نمائش کرتے لیکن رہتے اسی گراں میں تھے جسے چتکبرے پتھروں والے نیلے پہاڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا جن پر بل کھاتی پگڈنڈیوں کے لہریے چڑھتے تھے جو اب قدموں کے لمس کو ترس گئے تھے جن پر خارزار پھیل گئے تھے اور بھوت پریت کی بستیاں سدا سہاگن ہو گنجان ہو گئی تھیں۔

جھلی میرن کے چرانے کو کوئی گائے بھینس نہ رہی کہ گھروں میں تو اب ڈبے کا دودھ استعمال ہوتا تھا۔ وہ دن بھر تھور اور جنگلی جھاڑیوں سے اٹی پگڈنڈیوں پر لیر و لیر پیروں کے درمٹ مارتی شرم کے گھونگھٹ میں منہ چھپائے ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی۔

''اج ہندوستان نی قیدا چوں چھٹ آ سن جرنیل صاحبے ناں ٹیلی فون آیا ہے، پیشی ویلے گڈیوں لہسن۔''

اس روز وہ کلعام ریلوے سٹیشن پر اپنے فوجی کی گاڑی کا انتظار جنگلی پھولوں کے گلدستے کی مہکاروں میں لپٹی تا دیر کرتی رہی تھی۔ پیشی گزری دیگر بھی گزر گئی نفتاں کی بانگ آ گئی۔ آخر جب ناکام لوٹی تو اندھیری رات کسوں میں مہنا منہ بھر چکی تھی، ہر سو جنات چھل قدمی کو نکل آئے تھے۔ جن رستوں کو لیر و لیر تلووں سے عمر بھر روندتی رہی تھی، وہی سمجھ نہ آئے۔ جب اندھیروں کی پالکی میں سوار یہ کنواری دلہن اپنے سسرال اتری تو اسے ڈھونڈنے کے لیے جانے والا کوئی جوان مرد گراں بھر میں موجود نہ تھا۔

مغرب کی اذان کے بعد عورتوں کو یقین ہو چکا تھا کہ جھلی کہیں کھو گئی ہے لیکن کس اُترنے کی ہمت اب ان عورتوں میں بھی نہ رہی تھی۔ جو تین تین گھڑے اٹھا میلے کپڑوں کی پنڈیں سر پر رکھ تیری چڑھائی ایک سانس میں چڑھ جاتی تھیں۔

اگلی صبح ٹیلی فون کر کے ادھر روات سے مزدور بلائے گئے جو دوپہر تک جھلی کی لہولہان لاش ڈھونڈ لائے جس کے ہاتھوں میں ابھی بھی بنفشے کے پھولوں کا گلدستہ جکڑا تھا جسے الگ کرنے کو ہاتھوں کی انگلیاں کڑک کڑک توڑنا پڑیں لیکن ابھی بھی گھونگھٹ سر سے ذرا نہ پھسلا تھا۔ ہونٹ وا تھے جن پر زندگی کا گیت دھرا تھا۔

''ہندوستان نی قیدا چوں چھٹ آ سن جرنیل
صاحبے ناں ٹیلی فون آیا اے۔''

باہر کے ویزوں کے منتظر نو عمر لڑکوں اور موت کے ویزوں کے منتظر بزرگوں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تو دس پندرہ افراد سے زیادہ کی جماعت نہ بن سکی تھی۔ البتہ عورتوں کی تعداد اس قدر تھی کہ گھر بھرے تھے جنہوں نے جھلی میرن کا ماتم اس شدت سے کیا جیسے برسوں کی تنہائی، ڈھلتی جوانی کا کرب، بے سمت زندگیوں کا قلق اور تبدیل ہوتے حالات میں پتھرا جانے کا کرودسب مل کر بینوں اور سینہ کوبی کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ دنیاداری کا ضبط، پوٹھواری عورت کی بھاپ کے دم پر لگی شرافت کا ابال اور تنہا جوانیوں کا اُمس سینے اور رانوں پر پڑتے زوردار دھمکوں میں خارج ہو رہا تھا۔ یہ موتیں اور ماتم بھی اندر کے انقباض کا عجب نکاس قدرت نے رکھ دیا تھا ورنہ محرومیوں کا کچرا حسرتوں کا کوڑا، تقدیر کی بے رحمی کا فضلہ دل کی شریانوں میں جم کر دماغ کی نسوں میں بھر کر اک روز پھٹ نکلتا تو بہت جگ ہنسائی ہوتی۔

شکیلہ جان بے ہوش ہو کر گری۔ فاطمہ نے منہ سر پیٹ پیٹ زخمی کر لیا۔ صنوبر کے پرسوز بینوں سے بزرگ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو ئے۔

"ہائے میرن تیرا فوجی ہندوستان کی قید سے چھٹ کر نہ آیا تو آپ ہی اسے ملنے کو زندگی کی قید سے چھٹ گئی جو اک بار گیا کب مڑا جو سکھ چین کی گٹھڑی باندھ لے گیا، وہ بھار اٹھائے واپس کب پلٹا۔"

فاطمہ تو ذومعنی بین بھی نہ کر سکتی تھی کہ نہ نکاح، نہ منگنی کی اوٹ سوائے انتظار کے اخلاقی وسماجی دباؤ کے کوئی قانونی، کوئی معاشرتی ربط تو نہ تھا جو اظہار الحق کو کراچی سے کھینچ لاتا جو کراچی گیا، وہ کب پلٹا۔ کہتے ہیں چار چو فیرے سمندر پھیل جاتا ہے اور ساری کشتیاں ساحلوں پہ پھونک دی جاتی ہیں۔ یہ سمندر بڑے ظالم، لاشیں بھی پلٹنے نہیں دیتے۔

شکیلہ جان کے پاس نہ شہید شوہر کی وفا اور کارنامہ نہ قبر کا تعویذ جس سے لپٹ کر رونے کو سرہانہ تو میسر آ جاتا، وہ ٹوٹے ہوئے من والی چکی کو گھوں گھوں گھومتے ہوئے دیکھتی جس نے مدت ہوئی پیسنا چھوڑ دیا تھا کہ اب آٹے کے تھیلے ادھر پنڈی شہر سے منگوائے جانے لگے تھے۔ تندور کے مٹھ ٹوٹے تھے اور سینوں سے لپائے (پلستر) اتر گئے کہ روٹیاں تو اب گیس کے چولہوں پر پکتی تھیں۔ مرغیوں کے کھڈے پرانی بیٹھوں کی بدبو چھوڑتے تھے لیکن مرغیوں کے پرے مر گئے تھے کیونکہ فارمی گوشت کا رواج ہو چلا تھا۔ چونگیں اور خودرو جنگلی کریلے ڈھونڈ کر لانے والا کوئی نہ رہا تھا۔ مختار بھی ادھر افغانستان کے محاذ پر لڑنے چلا گیا تھا۔

جھلی میرن کے پاس پاگل ہونے کا جواز تھا۔ زرینہ جان کے پاس میر حسن کی قبر کو عمر بھر سنبھالنے کا جواز تھا۔

صنوبر کی ماں کے پاس شہید کے نشانِ جرأت اور وردی والی تصویر کو پہروں دیکھنے اور فخریہ آنسو بہانے کی پوری آزادی تھی لیکن شکیلہ اور فاطمہ نامحرموں کا نام بھی زبان پر کیسے لاتیں۔

رونے ماتم کرنے کا کوئی جواز نہ بچا تھا۔ ہمدردی جتانے، دکھ بانٹنے کا اخلاقی سہارا بھی نہ رہا تھا اور ان اکیلی رہ جانے والی سہاگنوں کے دکھ منانے، غم دکھانے کا حق بھی ہوائی جہازوں میں لد کر ان سے چھن گیا تھا کہ گودیوں میں کھیلنے والے ان کے بیتے سہاگ کی نشانیاں ان کے پاس جو تھے جن کے وجود سے جڑی وہ چند راتیں بار بار یاد کرنے کے باوجود اب اپنی جزئیات کی کڑیاں اور ذائقے گم کرتی جا رہی تھیں۔ وہ اتنی زرخیز کیوں تھیں کہ بس کوئی چھو کر گزر گیا اور اپنے لمس کی سند چھوڑ گیا۔ جس لمس کا ذائقہ تک محسوسات سے کہیں دور ہو گیا تھا جو پرانے درد کی طرح اندر ہی اندر ٹیسیں چھوڑتا گند مارتا تھا لیکن نکاسی کے لیے کوئی اخراج نہ بنتا تھا۔ وہ ایک دوسری کے گلے لگ کر ذومعنی بین ڈالنے لگیں۔

"ہائے رونے کا سواد نہ رہا۔ ماتم کا بھی اب مزا نہ رہا۔ ہائے کیا ویلے تھے چالیس دیہاڑے پھوڑی پڑی رہتی ایک گراں میں مرگ ہوتی۔ ماتم آٹھ گراؤں میں ہوتا۔"

"ہائے لوئی آنکھوں کے چو ہے چشمے سوکھ گئے کہ دلوں کے ٹوبے اہین بن جم گئے۔ ہائے لوئی کتنا پٹ کلنا پڑتا......"

رو رو کر دل کی آگ آنسوؤں سے بجھتی، پیٹ پیٹ جگر ٹھنڈے ہوتے۔ موت ایک ہوتی دکھ ہزار کھل اٹھتے۔ کس کس کھرانڈ سے درد چن لیتا یہ ماتم، یہ پٹ کلنا۔ ہائے اب تو مرگ کے بہانے دل کے دکھڑے رونے کا رواج بھی نہ رہا تھا۔ اب کوئی اندر کا دوتھڑ کیسے باہر نکالے۔

یہ دکھ اندر ہی اندر پلنتے کالے یرقان بننے لگے۔ دلوں کے روگ لاعلاج مرضوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اب کہاں کھل کر روئیں کہ اندر کی لگی بجھ پائے۔ ہائے لوئی ہو کو چندیرا......

شاید یہ آخری روایتی ماتم تھا جو تمام ہو رہا تھا۔ ہائے کیا کریں گی یہ بندھی گھٹی عورتیں اب تو رونے کے موقعے بھی ختم ہو گئے تھے۔ بھا پاجی جب گردوں کے مرض میں مبتلا ہو کر مسقط سے وطن واپس آئے تو ادھر گراؤں میں چپکے چپکے شہر داخل ہو چکا

تھا۔ بجلی کے کھمبے اور ٹیلی فون کے تار بچھے تھے۔ ہر سو پھیلی پکی سڑکیں گراؤں کو شہر سے جوڑ رہی تھیں۔ چوہے کا پانی منہا منہ ابلتا ضائع جا رہا تھا۔ گھروں میں تو واٹر پمپ لگ گئے تھے۔ نوجوان وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتے تھے اور پیپسیاں پیتے، ملک شیک اور برگر کھاتے تھے۔ منھیاں روٹیاں اور پوڑے اب یادداشتوں میں رہ گئے تھے۔

ما بختو نسوار کی چٹکی تھنوں سے کھینچتی بین بھرے بازو چار چو فیرے لہراتی۔

''ہائے جینے کا سواد نہ رہا۔ کبھی اوس میں بھیگتے گھڑوں میں چوہے کے پانی کا ایک پیالہ پی لو تو دل جگر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ ہائے یہ فریج کی بوتلیں تو نرا ساڑا، ہائے پٹھ کی بوٹیوں میں چونگیں ڈال دیسی گھی میں بھون کے پکاتی چپڑی تنوری روٹیوں کے ساتھ منہ سے نہ اترتے۔ ہائے یہ فاری گوشت کھادوں والی سبزیاں نہ شیری رہی نہ سواد رہا۔''

پچھلی نسل کی عورتیں بجلی کے پنکھے بند کر کے دستی پنکھے جھلتیں اور گئے موسموں کے ذائقے اور واقعے یاد کر کر اتیں کوٹتیں۔

''ہائے ہائے لوئی ہوکو۔''

زمانہ بدل رہا تھا۔ ان پڑھ ماؤں کی بیٹیاں کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔ کوئی وکیل تو کوئی فیشن ڈیزائنر بن رہی تھی۔ اسی کی یہ دہائی پوٹھوار کے ان گراؤں میں ایسے داخل ہوئی تھی جیسے کبھی یہاں گھونٹ گھونٹ بہنے والا برساتی نالہ بارشوں کی رُت میں دہانے کھول کر یوں ڈکرانے لگتا تھا کہ سامنے آنے والی ہر شے نگلتا چلا جاتا تھا۔ اتنے دھارے بہہ نکلے کہ پرانی نسل تنکوں کے سہارے گم کرتی ڈوبنے لگی۔ صنوبر کی بڑی بیٹی غزل جان تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی اور چھوٹی ابھی دس برس کی تھی کہ تبھی اچانک سب پر یہ انکشاف شدت کے ساتھ ہوا کہ اصغر خان کی تو کوئی اولادِ نرینہ ہی نہیں ہے جبکہ صنوبر جان چاندی جیسے بالوں کو سفید چادر میں ڈھکتی ہے تو بے جی محمد جان کی بڑی بہن معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کے پاس رائیگاں انتظار کے بے انتہا دن گننے کے سوا عمر بھر کوئی مصروفیت ہی نہ رہی تھی۔ کیا اسلام آباد کی یہ کوٹھیاں اور پنڈی کے شاپنگ پلازے بیٹیوں کے جہیز میں چلے جائیں گے۔ انہوں نے اصغر خان کو فون کیا کہ فی الفور تین مہینے کی چھٹی لے کر وطن پہنچے۔ شاید وہ یہ بھول گئے تھے کہ جانوروں، درختوں، جنگلی جھاڑیوں کے بار آور ہونے کی قدرت نے اک معیاد مقرر کر رکھی ہے لیکن اس پوٹھوار کی تاریخ کا یہ واقعہ عجب تھا کہ صنوبر جان نے اصغر خان کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ محمد جان جب اسے لینے کو گئیں تو وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

''بے جی! مجھے معاف کر دو۔ اب یہ بھاڑے کی ماں بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ جس مقصد کے لیے وہ اپنا ٹکٹ اور قیمتی وقت ضائع کر کے آیا ہے۔ جب میں وہ مقصد پورا ہی نہیں کروا سکتی تو اس سے مل کر خود کو شرمندہ کیوں کروں۔''

پوری برادری نے دباؤ ڈالا لیکن ساس کی ایک گھر کی سے لرزنے والی حکم کی رسی سے بندھی یہ کھونٹے کی گائے اڑیل ہو گئی۔ کسی کو سینگ پکڑنے ہی نہ دیئے۔ ان بیس برسوں میں ایک مہینہ اور چھ دن کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات و جزئیات پر وقت کی دھول یوں بکھری تھی کہ کوئی نقش بھی سجھائی نہ دیتا تھا جس نام کی دو بچیاں کوکھ سے جنی تھیں، اب اس پر مسافتوں کی بہت گرد اٹی تھی۔ بیوگی کے خارزار ویرانے پھیلے تھے۔ وہ ان بے آب و گیاہ بنجر پگڈنڈیوں پر اتنے سنگلاخ سفر طے کر چکی تھی کہ اب کسی نخلستان کے کھلنے کا احساس ہی مرجھا گیا تھا۔ پوٹھوار کے بارانی قطعات پر تھر کا ریگزار چڑھ بیٹھا تھا جس کی تہہ میں سارے بیج ستھ تھے۔ ساری ہریالی یرقان گھلے زہریلے پانی چوس لے گئے تھے۔

آٹھ گراؤں کی عورتیں ہکا بکا تھیں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں عورت کے حقوق اور مرد کی حاکمیت پر انقلابی خیالات کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ اصغر خان حیران تھا جیسے کسی اجنبی شہر میں آ نکلا ہو۔ وہ صدیوں پرانے ان کسوں پہاڑوں کی نئی

حیرتوں میں نقطہ سا سمٹ گیا۔ اب اس نئے سیٹ اپ میں وہ کس قدر مس فٹ ہو گیا تھا۔ وہ یورپ کی آزادیوں میں بھی اپنے ماضی کی طنابوں میں کسا رہا تھا۔ وہی ماضی جواب قیامت کی چال چل کر سامنے کھڑا منہ چڑا رہا تھا۔ اب اس کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ اپنے بھیجے گئے ڈالروں اور پاؤنڈوں میں ہی وہ مجسمد تھا، خود اپنے وجود کے ساتھ یہاں اس کی مناسبت کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی تھی۔ دونوں بچیاں بھی اس اجنبی باپ کے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب رہنا ہی نہیں تو آنے کا مطلب، کوئی کام کوئی ضرورت کوئی تعلق واسطہ برسوں عمروں بعد پھیرا مارنے والے جوگی سے کوئی کیا رکھے۔ پتہ نہیں پھر کبھی اس بستی سے گزرے کہ نا۔ اب اس کی معنویت سرد موسموں کی کمائی میں منہ بند ہو گئی تھی۔ وہ منہ کی کھا کر لوٹ گیا۔

نئی پود کی یہ لڑکیاں جنہیں ماؤں کی محرومیوں نے ثمر بار کیا تھا، جن کی مشقتوں کے صلے کی آسودگیاں انہی کے مقدر میں آئی تھیں، ان کی اذیتوں، صبر و قناعت، بھوک اور بے بسیوں کا بیاج سود کے ساتھ ان لڑکیوں نے وصول کر لیا تھا۔ دور پردیس میں تنہائی اور بے وطنی کی مشقتیں اور ذلتیں جوان کے باپوں نے جھیلیں، قانونِ قدرت کے عدل کا انعام اب اس نسل کو عطا ہو گیا تھا۔ جن کی تاریخ پیدائش ان کے باپوں کی آمد کے یادگار سال سے ذہنوں میں تازہ رہتی تھی۔ اس سال کی یاد میں ان بچوں کی سالگرہیں منانے کا رواج اب ہو چلا تھا۔ ادھر پنڈی سے کیک اور غبارے لائے جاتے اور انتظار کے سینے پر دھڑکتے ہوئے برسوں کے شمار کے لیے موم بتیں جلائی جاتیں اور پھر انہیں بے معیاد انتظار کی پھونکوں سے بجھا دیا جاتا۔

شکیلہ اور فاطمہ کے پاس تو اس دھول آلود راہ کی نشانیاں بھی نہ تھیں۔ گزری مسافتوں کے کوئی سنگ میل بھی نہ تھے جن سے عمر گزشتہ کا کوئی حساب ممکن ہوتا۔ سارا ارد گرد جغرافیہ ماحول سب تبدیل ہو چکا تھا لیکن دل کے کھونٹے سے بندھی، گزرے موسموں کے سنٹھ لمحوں کے کھکھل میں کمتی یاد کے بجھے چراغوں کے دھویں میں لپٹی وہ کسی یادگار پر موم بتیاں روشن نہ کر سکتی تھیں کہ جن جھرنوں میں یاد کی روپہلی مچھلیاں تڑپتی تھیں اور گم نشانیوں کے ندی نالے بہتے تھے، وہاں اب دھواں اگلتی فیکٹریاں کھڑی ہو رہی تھیں۔ جن پگڈنڈیوں پر عمر کے ماہ و سال اترتے چڑھتے تھے، وہاں اب تارکول کی سیاہ پکی کشادہ سڑکیں بچھ گئی تھیں۔ اب گزری یادداشتوں کے نقش پا کوئی کہاں سے ڈھونڈ نکالے۔ جن چوٹیوں پر پھلاہی اور بکائن کے جنگلوں میں اکا دکا دیودار اور کیل کے دراز قد پیڑ آسمانوں کو چھوتے تھے، وہاں اب رہائشی کالونیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ چوہے کا پانی پمپ لگا کر بوتلوں میں بھر بھر ادھر اسلام آباد کے بڑے اسٹوروں میں منرل واٹر بن کر بک رہا تھا اور خود اس گراں میں ٹونٹیوں اور فریجوں کا پانی پیا جانے لگا تھا۔

گزرے موسموں میں دس دس کوس کی چڑھائی چڑھ کر عورتیں تین تین گھڑے اٹھائے یہاں بھرنے کو آتیں اور فجر سے عصر تک واپس چڑھائیاں اترائیاں عبور کرتی گھر پہنچ پاتیں لیکن یہ اس پانی کی شفا کی تاثیر تھی شاید کہ پھر بھی کبھی نہ تھکتیں۔ بعض اوقات غذا کی کمی اور بیماریوں کا معالجہ کسی غیر مرئی نسخہ ہائے کیمیا سے ہو جاتا ہے لیکن اب صدیوں پرانے اس چشمے کے پانی پر کائی کی تہیں چڑھ آئی تھیں جس میں مینڈک ڈبکیاں لگاتے تھے جن کی لمبی جاہنگوں سے لپٹے سیاہ جالے پانی میں گھلتے تھے۔ چاروں کناروں پر کاہی اور سیاہی کا ملائم پھسلتا استر چڑھ آیا تھا اور پیندے پر سبز مخمل سی کاہی کا فرش بچھ گیا تھا جس کا عکس چوہے کے شفاف پانیوں کو سمندری پانیوں کا سا رنگ دیتا تھا۔ ماڈرن کالجوں میں پڑھنے والے اس پانی کو Inhigeinic قرار دے چکے تھے۔ اس لیے پائپ کا پانی اور سوڈا واٹر پیتے تھے۔ پانی کے بدلے ہوئے اطوار دیکھ کر پرانی نسل کے لوگ سہمے سہمے رہنے لگے کہ جب پانی اپنی تاثیر بدلتا ہے تو بپھر کر سیلاب ہو جاتا ہے یا پھر سوکھ کر نمک بن جاتا ہے۔ اس وقت زمین اپنی مٹھاس خود ہی چوس لیتی ہے اور جسم و جاں میں تھور بھر جاتا ہے لیکن اب اس تھور کی حفاظت کے لیے چڑھاووں اور منتوں مرادوں والا درخت سونا پڑا تھا اور شفایاب پانی

کہیں باہر سیلائی ہونے لگا تھا اور زیرِ زمین موجود سارے پانی کھارے تھے۔ پرانی نسل چڑھاووں، منتوں اور شفایاب پانیوں کی قلت کے خوف میں مبتلا ہو کر زرد پڑنے لگی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر شے بکنے کے لیے نہیں ہوتی مثلاً پانی، زمین، اور منتوں والے پیڑ۔ ان پچھلی پیڑھیوں کی پرداخت چوہے کے بیٹھے پانیوں نے کی تھی اور خوف کی حفاظت منتوں مرادوں والے جھنڈوں نے لیکن اب خوف پھلائی کے جھنڈوں سے نکل کر خودان کے اندر اتر کر بسنے لگا تھا اور چوہے کا پانی کہیں باہر سیلائی ہونے لگا تھا جس کے بدلے اتنی زرملی تھی کہ گراؤں کے گھروں کے فرش سونا رنگ ٹائلوں اور بوٹی سینا کے سنگ مرمر سے سنہرے ہو گئے تھے۔ امپورٹڈ باتھ روم گولڈن کونٹڈ تھے۔ فالس چھتیں سنہری اور آف وائٹ تھیں۔ فرنیچر سنہری ڈیکو پینٹس یا پھر براس جیسی سونا رنگ دھات کے بنے تھے۔ کراکری سنہری دھاریوں والی بون چائنا کی اور کٹلری گولڈن کوٹڈ تھی جیسے ہر شے پر سونے کا پانی چڑھا ہو کہ زیرِ زمین بہنے والے پانیوں میں سونے کی ڈلیاں گھل گئی ہوں۔ ہر چیز سنہری بھا مارنے لگی تھی۔ سنہری زمین، سنہرا آسمان اور سنہری پانیوں نے یہاں کے باسیوں کو بھی جیسے سونے کی قیمتی دھات میں لپیٹ دیا تھا۔ زرد آنکھیں، زرد چہرے، زرد ناخن جیسے کوئی مصری ممیاں جن پر سونے کا خول چڑھا ہو۔ یہ پرانی نسل زرد رو ہو کر کمیاب ہونے لگی کہ گراں کا گورستان جو پسماندگی کی بے شمار صدیوں میں اتنا نہ بڑھا تھا جتنا ترقی کے ان چند سنہرے برسوں میں پھلا پھولا پتہ نہیں یہ زیرِ زمین بہتے پانی زرد رنگ کب سے ہو گئے تھے۔ شاید اس وقت سے جب قناعت کے خمیر میں گندھی اس دھرتی میں زر کے دروازے کھلے کہ مونگ پھلی اور مکئی اُگانے والی زرخیز زمینوں پر فیکٹریاں اور ملیں لگنے لگی تھیں یا شاید تب جب قیمتی سامان سے جدید گھروں کو بھر کر قفل بند کر دیا گیا تھا اور اجتماعی استعمال کا صدیوں پرانا رواج ذاتی ملکیت میں تبدیل ہو گیا تھا یا شاید زینت صنوبر جیسی کتنی عورتوں کی ناتمام ہجر کی سیاہ راتیں قطرہ قطرہ گھل کر کالا یرقان بن گئی تھیں کہ شکیلہ اور فاطمہ کے بے انت انتظار کے بے فیض لمحوں نے اپنا زہر گھول دیا تھا۔

بزرگوں کی یہ پوری نسل جگر کے عارضے میں گھل گھل کر زرد پانی ہو رہی تھی۔ ان لاوارث بیماریوں کا علاج ادھر اسلام آباد کے جدید ہسپتالوں میں ہوتا تو یہ اور بڑھ جاتیں۔ عجب تماشا ہوا تھا کہ بھوک اور چوہے کا آلائشوں بھرا پانی افزائش صحت کا باعث تھا لیکن جیسے جیسے خوراک بڑھنے لگی کثرت کے باعث سڑنے لگی اور کھانے والے گھٹنے لگے تب یہ تشخیص ہوئی کہ ان گراؤں کا زیرِ زمین پانی سب یرقان زدہ ہے۔ جس نے اس سنہری بستیوں کے سنہرے گھروں میں رہنے والوں کو بھی زردہ رنگ میں رنگ دیا ہے۔

شکیلہ اور فاطمہ زرد رو چہروں اور بجھی پتلیوں والی مدقوق آنکھوں کے ساتھ کالے یرقان کی کٹھڑیوں میں بند ہوتی چلی گئی تھی۔ ہر کٹھڑی کے اندر یاد کی شبیہیں اور بے ثمر ماضی کی ٹیسیں بندھی تھیں۔

کبھی کبھار وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ رکھ چٹختی ہڈیوں کی پوٹلی سر پر اٹھا تھور بھری پگڈنڈیوں سے نیچے اترتیں اور چوہے پر کھڑی بکائن پر بندھی دھجیوں اور پراندوں کے سیاہ بوسیدہ ریشوں میں سے اپنی اپنی حسرتوں کی دھجیاں اور کترنیں شناخت کرتیں۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹی پگڈنڈیوں سے پرے آج بھی تیز رفتار ریل گاڑیاں گزرتی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اب کس کو سوار ہو کر یہاں آنا تھا؟ اب اس قصباتی اسٹیشن پر کسی کو نہ اترنا تھا۔ اب تو جہازوں پر سواریاں جاتی تھیں اور واپس آنا بھول جاتی تھیں۔

اظہار الحق ادھر کراچی میں کسی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر بن چکا تھا اور اتنا مصروف ہو چکا تھا کہ اس کے تینوں بچے شاید ددھیال میں سے کسی کا نام بھی نہ جانتے ہوں گے۔ انگریز کے زمانے کا یہ قصباتی ریلوے اسٹیشن ان کے لیے تو کہانیوں کے بھوت بنگلے جیسا ہی ہوگا۔ پتہ نہیں یہ گاڑیاں گرم آہوں جیسا دھواں چھوڑتی اور چیخیں، کراہیں مارتیں، کیوں گزرتی رہتی تھیں۔ کوئی تو ان سے کہہ دے کہ اب تمہیں تھم جاؤ، تمہاری ہوک کوک سے جن سانسوں کے تار بندھے تھے، وہ سانس تھک کر اب ٹوٹ گئے

ہیں۔ یہ نوے کی دہائی کی شروعات تھی۔ جب پوٹھواری زبان میں انگریزی لفظوں کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ لڑکیاں لڑکے امپورٹڈ اشیاء کی قیمتیں ڈالروں اور پاؤنڈوں میں بتانے لگے تھے اور یورپ کے خریداری مراکز کے نام بولنے لگے تھے۔ پھیلتے ہوئے شہر گراؤں کو لپیٹ رہے تھے، وہ زمین جو کبھی بس اتنی سی گندم اُگاتی تھی کہ طلائی زیور کی طرح بوری دو بوری کسی طرح مہمان کی خاطر داری کے لیے بینت سنبھال کر رکھ لی جاتی تھی۔

بس اتنا باجرہ، جوار کہ جس کسی کو پیٹ بھر کھانا میسر آتا، وہ امیر کہلاتا۔ بس اتنی سی مونگ پھلی کہ جس کے بکنے پر جوڑا دو جوڑا ششماہی خرید لیا جاتا تھا جیسے جھیل کے چلو بھر پانیوں میں نتھار کر ہی جھاڑیوں پر پھیلا کر بدن کی گٹھڑیاں ان کے سوکھنے کے انتظار میں گھنٹوں بندھی رہتیں۔ انتظار تو ان پہاڑوں کے خمیر میں شامل تھا۔ بارش کا انتظار، موسم کے بدلنے کا انتظار، فصل پکنے کا انتظار، چھوڑ کے جانے والوں کا انتظار، کبھی نہ مڑنے والوں کا انتظار شاید یہ انتظار نسل در نسل جمع ہوتا رہا تھا اور اب موجودہ نسل کو ان ساری بھوکوں، قحط سالیوں اور لا انتہا انتظاروں کو ڈھیروں منافع لگا کر لوٹا دیا گیا۔ گویا اس پہاڑی گاؤں کے پرکھوں کے سارے بے بس انتظار کی زرِ خالص کہیں انشورڈ تھی جو منافع کی بھاری شرح کے ساتھ یکمشت ادا کر دئے گئے۔ یہ کٹے پھٹے قطعاتِ اراضی جن کی پال میں لگے انتظار دکھ اور خشک سالیوں کے سلسلے حلق آسمان کی سمت کھلے رہتے۔ اگر تر ہو گئے تو گیہوں کی بالیوں کی لمبی لمبی شاداب زبانیں لہلانے لگیں نہ برسا تو حلقوم سے سینے تک سب پھونس لیکن اب آسمانوں میں جذب ہونے والے اور زمین کے سینے میں اتر جانے والے سارے پانی یوں موسلا دھار برسے کہ پلازوں، کوٹھیوں، ہوٹلوں، فیکٹریوں کی بھرپور فصل سے سارے بنجر لہلہانے لگے۔ یہ پتھر بھی عجب خصلت رکھتے ہیں۔ روڑی بجری بنتے ہیں یا پھر ہیرے موتی بن نادر ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں غزل جان لاء کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ جب بڑے بھا پا جی گردوں کے عارضے میں مبتلا ہو کر مسقط سے لوٹے تو اپنے ہمراہ بڑے بیٹے عثمان کا ویزہ بھی لے کر آئے لیکن یہ ویزہ اسے غزل جان سے شادی کے بعد ہی ملنا تھا۔ عثمان جو نویں جماعت میں فیل ہونے کے بعد اسی ویزے کا برسوں سے منتظر تھا، اس اطلاع کی سرشاری کے ساتھ امپورٹڈ ہونڈا اکارڈ اسلام آباد کی ولایتی سڑکوں پر دیوانہ وار دوڑاتا اور نازیہ حسن اور زوہیب حسن کے فاسٹ میوزک سنتا اور دوستوں کو اپنے ویزے اور شادی کے جشن میں شریک کرتا رہا۔ غزل جان یونیورسٹی سے لوٹی تو اس اطلاع پر ہنس دی جیسے کسی نے اس کے تلوؤں میں گدگدی کر دی ہو جیسے جھلی میرن اپنے قیدی کے چھوٹ آنے کی اطلاع دیتی تو عورتیں بے اختیار ہنس دیتی تھیں۔

''کیوں بے جی! آپ نے مجھے شکیلہ جان سمجھا کہ فاطمہ پھوپھی یا صنوبر جان...... بے جی آپ کو سمجھنے میں تھوڑی غلطی لگ گئی، میں غزل جان ہوں۔''

وہ یوں یکدم بول اٹھی جیسے بختاور مردانہ جسامت کے اندر سے زنانہ انداز میں کچھ بھی کہہ دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

کیا محبت قربانی، وفا کا بھی کوئی جواز ہوتا ہے۔ غزل جان کہتی تھی سیاں ہوتا ہے۔ اندھے جذبے رائیگاں زندگیوں کے نوحے ہیں جنہیں الاپنا حماقت ہے۔ ارد گرد پھیلی فیکٹریوں سے سفید دھوئیں کے مرغولے سورج کو دھندلا رہے تھے۔ بارشیں کئی منزلہ بلند فلیٹوں کے چہرے دھو رہی تھیں جن کے سنگ و خشت نکھر آئے تھے۔

شکیلہ جان، فاطمہ جان اور صنوبر جان کو لگا جیسے مدتوں پہلے سرزد ہونے والے جرم کی پاداش میں عدالت آج آن لگی ہے۔ وفا اور ایثار کی راکھ پھرولتے کوئی دبی چنگاری پوروں پر چھالے بنا گئی ہے۔ بے مقصد راست جذبے، بے لوث اندھے رویئے، بے فیض قربانیوں کا جواز طلب کیا گیا ہے تو کیا غلط کیا گیا ہے لیکن محبت کے تابوتوں میں مردہ پڑی یہ ممیاں لرز گئیں۔

خاندان کی دوسری لڑکیاں بھی کھل کر ہنسیں۔ نویں جماعت میں سے فیل لڑکا ایک ایڈووکیٹ لڑکی سے شادی کرے گا کیونکہ وہ اس کا تایازاد ہے اور اس خاندان کی روایت ہے کہ ہر لڑکی اپنے چچیرے، ممیرے، پھپھیرے، مسیرے بھائیوں کی بیوی بنتی ہے۔ چاہے یہ جوڑ کیسا ہی بے جوڑ کیوں نہ ہو لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا جس کی تبدیلی لڑکیوں کو بتا گئی تھی کہ ان کا بھی اک جوڑ ہے، ان کی کال کا بھی جواب آنا چاہیے اور جس کا جواب نہیں آتا تو وہ کوئی غلط نمبر ہوگا۔

ٹیلی فون تو گھر و گھر لگے تھے۔ پل بھر میں غزل جان کی بے باک گفتگو اصغر خان تک پہنچا دی گئی جو انگلستان میں بیٹھے پچھلے بائیس برس میں پاکستان میں تبدیلی کے طوفان کی آواز ہی نہ سن پایا تھا۔ اس گراں میں ڈالروں اور پاؤنڈوں کے ہمراہ خودمختاری اور حوصلے کی جو ہوا در آئی تھی، وہ اس سے بے خبر تھا۔

''اس کی رائے لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہماری روایت ہے کہ بچوں کے مستقبل کے فیصلے بڑے کرتے ہیں۔ یہ کوئی انگلینڈ نہیں، وطن ہے۔''

بزرگوں کی مشاورت سے شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور غزل جان کو اسی شام تیل ہلدی مل کر مایوں بٹھا دیا گیا۔ اتنے بہت سے ہاتھوں کے درمیان وہ تیل ہلدی سے لتھڑ پتھڑ ڈیزل کے ڈرم میں گری چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتی رہ گئی اور شگن سارے پورے کر لیے گئے۔

یہ نئے عہد کی لڑکی گانے کا بوجھ اٹھا کر پندرہ دن اگلی اندھیر کوٹھڑی میں کیسے مقید رہ سکتی تھی۔ اسے یونیورسٹی بھی جانا ہوتا تھا۔ شادی کا جوڑا بھی خود پسند کرنا تھا۔ زیور بھی نئے ڈیزائن کا بنوانا تھا۔ وہ تیل بٹنے میں لتھڑی مایوں والی اگلی کوٹھڑی میں کیسے بیٹھ سکتی تھی۔

وہ روز ہی رینٹ اے کار سے ٹیکسی منگوا کر باہر جانے لگی۔ کبھی صنوبر کو ساتھ لے جاتی، کبھی اکیلی ہی چل پڑتی، بے جی تاسف بھری ہتھیلیاں رگڑتیں۔

''ہوکولوئی! کڑی جے کر مایوں بیٹھتی تو مہینہ بھر کسی کی نظر نہ پڑتی۔ دن بھر پیشاب بھی روکے رکھتی۔ باہر نکلتی بھی تو جب سارا گراں سو جاتا تو سہیلیوں کے جھرمٹ میں یہ بڑی سی چادر میں منہ سر لپیٹے ہوئے نکلتی۔ گرمیوں میں بھی صحن میں نہ سوتی کہ کہیں تیل ہدی کی خوشبو سے کوئی جن پریت مست نہ ہو جائے۔ ہائے کیسی بے حیائی آئی ہے۔ کیا روپ چڑھنا اس بدذات کو ساری دیہاڑی تے چیچاں کھائی رہنی۔'' (آوارہ پھرتی ہے۔)

وہ دن اس گراں کی تاریخ کے گزشتہ بھی واقعات سے بڑھ کر لرزا دینے والا روزِ حادثہ تھا کہ جب غزل جان کی مہندی کا جشن گھر میں برپا تھا اور وہ خود گھر میں موجود نہ تھی۔ مرد شادی کے انتظامات میں مصروف تھے۔ کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں بھی حیران تھی۔ اگر پارلر گئی تھی تو ان میں سے کسی کو ساتھ کیوں نہ لے گئی جبکہ سبھی نے مہندی کے فنکشن کے لیے اسی پارلر سے تیار ہونا تھا۔ وہ دانتوں میں انگلیاں ڈالے اس سے عجیب نفرت اور حسد محسوس کرنے لگی تھیں جیسے ان سب کو ٹھینگا دکھا کر نمبروں کی ٹرافی وہی لوٹ لے گئی ہو۔

مہمان جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ دور دراز والے دوستانے آپہنچے تھے۔ بینڈ باجے اور جگتوں والے مراثیوں کو بیلیں ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ لڑکے والے گھر سے آتش بازی کے دھویں اٹھنے لگے تھے۔ شرلیوں کی آگ آسمانوں تک پہنچ رہی تھی۔ عورتوں میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو پا رہی تھی کہ مردوں کو غزل جان کی گمشدگی کی اطلاع کریں۔ اگرچہ دو تین لڑکیاں ٹیکسی منگوا کر چوری چوری بیوٹی پارلر بھی ہو آئی تھیں لیکن وہاں تو وہ سرے سے گئی ہی نہ تھی۔ یونیورسٹی بھی نہ گئی تو پھر گئی کدھر۔ لڑکیاں

پچھتاوے کے تاسف میں ایک دوسری کی آنکھوں سے چور ڈھونڈتیں۔ کبھی کسی کے ساتھ بھی تو سنا نہ تھا یونیورسٹی میں بھی کسی کے ساتھ نہ دیکھا۔ شاید اندر ہی اندر......

لڑکیاں یونیورسٹی کے کئی لڑکوں کو شک کی سولوں میں پروتی اور آنکھوں کی سوئیاں نکالتی رہیں۔

بے جی محمد جان بوڑھے حلق کے بیمار سروں میں نیچے نیچے بین کرتی بخار میں بھنتی لحاف کی قبر میں اتر گئی۔

''ہائے پتہ ہوتا کنجری ادھل ونج سی تے کدے نہ پڑھایاں پڑھواتی، ہائے کدے نہ موڑاں جھلواتی...... ہائے یہ لچیاں مونگ پھلیاں کھودتی، ہکی کوتی تین تین گھڑے سروں پر لاد کس چڑھتی ہی اچھی، ہائے میموں کے دیس کی کمائی کھا کرانہی کی ریس کرنے لگیں۔''

بے جی کے کمزور بینوں کے مرتے ہوئے سُر بڑھے بھاپا جی کے کانوں میں بھی پڑ گئے تھے لیکن اب وہ بینڈ باجے والوں کو روکیں کہ چکوال سے اٹک تک سے اکٹھے ہوئے دوستانوں کو واپس بھیجیں کہ پنڈی سے بلائے گئے خانساموں کو ادھ پکی دیگیں چھوڑ دینے کا حکم دیں۔

مردانہ حصے میں جو جشن برپا تھا، اسے ہونے دیا گیا۔ لڑکے کی رسومات پوری ہوتی رہیں، خود بھی جس کے علم میں نہ تھا کہ اس کی دلہن تو بھاگ چکی ہے۔

خاندان کی قریبی عورتوں کے سوا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ مایوں بیٹھی دلہن اگلی کوٹھڑی میں ڈھکی ہوئی نہیں ہے، کہیں کو نکل گئی ہے۔

حیرت تو صنوبر جان کے رویئے سے تھی جو نہ تو بیٹی کے غلیظ کردار کو توم رہی تھی، نہ اس کے فرار کے طنابے مختلف مردوں سے جوڑ رہی تھی۔ ایسی پراسرار ایسی پرسکون جیسے کسوں کی ڈھلانوں پر چھتری اوڑھے چتنکبری کھمبی ڈھکی چھپی بھیگی زمینوں کے سینے سے اچانک پھوٹ نکلتی ہے۔

بے جی محمد جان نے بوڑھے لرزتے ہاتھوں سے اس کے منہ سر پر جھانپڑوں کی بارش کر دی۔

''گشتی کنجری بولتی کیوں نہیں، نکی کنجری کو کس چکلے میں بٹھا آئی ہے۔''

اس نے خود پر برستے نہ ہاتھ روکے نہ زبانیں۔ شاید پچھلے بائیس برس کی اسی سنٹھ چپ میں سے غزل جان کی کونپل پھوٹ نکلی تھی۔

''دوری اچ بای کے تکی کتاں۔ داتری نال تھواڑے ٹوٹے کراں کنجریے دندیوں ٹھویں۔ لون مرچ بای کے تکی رناں۔'' (کونڈی میں ڈال کے تجھے کوٹوں۔ درانتی سے ٹکڑے کروں، اونچی چوٹی سے گروں نمک مرچ ڈال کے تجھے پکا ڈالوں۔)

محمد جان مخصوص پوٹھواری زنانہ زبان کی بددعائیں اور گالیاں دیتی اندر ہی اندر بین انڈیل رہی تھی۔ آواز کا کرارا پن اور لہجے کا اعتماد غزل جان اپنے ہمراہ لے کر کہیں فرار ہو گئی تھی۔ گراں کا آسمان آتش بازی کے رنگوں سے لال تھا اور بڑے بھاپا جی کو اس وقت غزل جان کی تلاش سے زیادہ اس تقریب میں عزت بچا لینے کی فکر لگی تھی۔

انہوں نے محمد جان کے کان میں فریاد پھونکی۔

''بے جی! کسی طرح عزت بچاؤ۔ کسی بھی لڑکی کو پکڑ کر بٹھا دو، ڈنگ ٹپاؤ کسی نے گھونگھٹ اٹھا کر تو دیکھنا نہیں۔''

لیکن اس دہائی میں عجب حادثہ ہوا تھا کہ فاطمہ جان اور شکیلہ جان کی پیڑھی کو یرقان کھا گیا تھا اور نئی نسل یورپ کی کمائی

اور اسلام آباد کے ماڈرن تعلیمی اداروں کی پروردہ تھی جس کے خمیر میں حکم عدولی، خود پرستی اور خود غرضی مل کر گھل گئے تھے یا شاید بھا پا جی اور محمد جان کے مرگ مفاجات جیسے حکم کو ضعف بیماری اور کہنگی کا دیمک لگ گیا تھا یا شاید شکیلہ، فاطمہ، صنوبر کی آہ ٹوٹی تھی کہ پھر لوٹیاں پڑ گئی تھیں۔ بے جی نے دو ہتڑوں سے اپنا ہی منہ سر پیٹ لیا۔

''ہائے ہو کولوٹی! گھر گھر جیبیں نکل آئی ہیں۔ ناسور نکلے ان کے منہ میں، پیو انگلینڈ گئے ہیں کہ آپ میمیں بن گئی ہیں۔ جوہے کا پانی پینا چھوڑا ہے کہ اپنے ہی دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔''

''ہائے ایک ہم تھیں کہ رسی پکڑ کر جس کلے سے چاہا باندھ دیا۔ ہائے لوٹی آج پیو دادے کی عزت بچانے کو کوئی بذات آگے نہیں آ رہی۔ ہائے لوٹی جلسان چمٹن نیں۔ دو موہی لڑے نیں ہائے موتو جوگیاں کسے نی آئے نیں۔'' (انہیں جونکیں لگیں، سانپ ڈسے کسی کی موت انہیں آئے)

بے بسی گالیوں، بددعاؤں کی صورت میں بہہ نکلی۔ مہندی کے گھلے ہوئے تھال پڑے رہ گئے۔ مہندی چوڑیوں کے سجے چنگیر پھول جھنڈیاں گوٹے کناریاں لڈو مٹھائیوں کے ٹوکرے خود کھانے کو دوڑنے لگے۔ اب گڑ بتاشے بانٹنے اور مائیاں بنانے کا رواج ختم ہو رہا تھا۔ کبھی مایوں کی رسم کے لیے کئی روز میٹھی ٹکیاں بنتی تھیں۔ پورے گراں کی عورتیں اکٹھی ہوتیں، کوئی گڑ کا شربت بناتی، کوئی اس شربت سے سخت سا آٹا گوندھتی، کوئی بیلنے پر ٹکیاں گھڑتی، کچھ ان ٹکیوں کو کڑکتے ہوئے تیل میں تلتی جو مایوں کی رسم میں عورتوں میں تقسیم کی جاتی تھیں لیکن اب یہ سب قدیمی رسمیں ولایت کی دولت نے ہڑپ کر لی تھیں اور آج ولایت سے آئی دولت کے یہ بھی امیرانہ اظہاریے اجڑی ہوئی اس محفل کا جیسے منہ چڑاتے تھے۔ شہنائیوں کے حلق گھٹ گئے۔ عورتوں کے گیتوں کے سُر بینوں میں تبدیل ہو گئے۔ محمد جان کی شوگر اتنی بڑھ گئی کہ بے ہوش ہو ہو گرنے لگی۔ بھا پا جی کے گردے جواب دے گئے۔ شکیلہ اور فاطمہ اپنے ہی وجود میں چھپنے لگیں جیسے اس جرم کا نقشِ پا ان کے دلوں تک پہنچتا ہو۔ فجر کی اذان تک سوائے صنوبر جان کے کوئی نہ سویا تھا کہ اصغر خان کا فون لندن سے کسی آسودہ حادثے کی طرح آ گیا۔

غزل جان بخیر و عافیت لندن پہنچ گئی تھی۔

بھا پا جی گردوں کے ناقابل برداشت درد میں چلائے۔

''اسے گدی سے گھسیٹ کر واپس بھیجو۔''

بڑے بھا پا جی ان چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی ڈیلائسس میں چلے گئے تھے۔

اصغر خان ہنس دیا۔

''بھولے سے بھی ایسی بات نہ کیجیے گا بھا پا جی، یہ یورپ ہے اس کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ اس نے جس یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اس کے ہوسٹل میں پہنچنے سے پہلے ایئرپورٹ سے ہی مجھے فون کر دیا۔ چلیں یہ تسلی تو ہو گئی کہ وہ بخیریت ہے۔''

تیز گام دندناتی ہوئی آہنی پٹڑیوں پر سے گزر گئی جن کی سنسناہٹ سارے پہاڑی سلسلوں میں گونج چھوڑ گئی۔

''غزل جان بھاگ گئی۔''

غزل جان انگلینڈ چلی گئی، خود سے اکیلی میموں کے دیس میں جو ننگی پھرتی ہیں اور کئی کئی جنے (مرد) کرتی ہیں۔ یہ صدمہ محمد جان کی جان سے کہیں بڑا تھا۔ وہ گالیوں اور بددعاؤں کے جھانپڑ حلق سے اگلتی رہی لیکن کمزور نسیں نرگٹ انہیں واپس اندر ہی کہیں انڈیل دیتے اور وہ شاید انہی میں غوطا کر مر گئی۔ اگر زہر کا یہ ریلہ باہر کو مار کر جاتا تو شاید بچ ہی جاتی۔

گھر کی عورتوں کو افسوس تو یہ رہا کہ محمد جان جو پانچ بیٹوں کی ماں تھی، اس کی چار پائی اٹھانے کو گھر کے مرد بھی پورے نہ ہو سکے اور دوستالوں نے میت اٹھائی۔

عورتوں نے بین کھینچا۔

''ہائے ہڈی دولتاں ناں کیہ کرنا جے پنجاں پتراں نی مائیوناں جنازہ وی غیراں چایا۔'' (اتنی دولتوں کا کیا فائدہ کہ پانچ بیٹوں کی ماں کا جنازہ غیروں نے اٹھایا۔)

شکیلہ جان اور فاطمہ جان ایک دوسری کے گلے لگیں تو بدن کے خشک ڈھینگرے کے اکتارے بج اٹھے۔

''ہائے یوں بھی ایسے بھی...... ہائے کوئی بھی......

اس طرح بھی۔ کبھی ایسا بھی...... نہ سوچا...... نہ دیکھا۔

ہائے لوٹی ہو کولوٹی۔''

وہ سر اور رانیں پیٹتے ہوئے پتہ نہیں کس کا ماتم کر رہی تھیں۔ غزل جان کے بھاگ نکلنے کا کہ محمد جان کے مر جانے کا اک عہد کے مٹنے کا کہ اک نئے عہد کے شروع ہونے کا۔

چہار کھونٹ پہاڑوں میں کسا سمٹا ہوا یہ صدیوں پرانا پہاڑی گاؤں جو بارانی زمین کی سی قناعت اور بے نیازی رکھتا تھا۔ گہری کھائیوں کی سی لمبی گہری نیند سویا ہوا دفعتہً سیلابی لینڈ سلائیڈ کی سی تعمیراتی گھر گھراہٹ سے ہڑبڑا کر جاگا۔ اسی سراسیمگی اور بدحواسی کے ساتھ جو غیر متوقع جھنجھوڑ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ چٹانوں کے چٹخاؤ جیسا تعمیراتی مشینوں کا شور ڈائنامائٹ کے دھماکے پہاڑی سیلاب سی سڑکوں کی گھر گھراہٹ غول بیابانی سا انسانی اژدہام کہ دور نیچے کھائیوں میں بسنے والے بھوت پریت آسیب آسیب پکارتے پناہیں ڈھونڈنے لگے۔ رات بھر کسوں میں بجنے والی ڈھولک اور سوئے ہوؤں کے ہاتھوں پر لگنے والی مہندی کی مصروفیت چھوڑ غول آبادی سے بچنے کی تگ و دو میں دور میدانوں کے ویرانوں میں اتر گئے کیونکہ چوٹیوں، کھائیوں پہ تن کر کھڑے کیل پھلاہی اور پہاڑی کیکروں کے جنگل کٹنے اور چٹانیں ترخنے لگی تھیں۔ انگلی انگلی بھر لمبی مونگ پھلی اور سفید دانوں والے بھٹوں کی جگہ بڑے بڑے پلازے، ہوٹل اور محلات کھمبیوں کی طرح سر نکال چھتنار ہو گئے۔ بیج پھینک کر آسمانوں کی سمت بیچارگی سے انتظار میں لگی نگاہیں اب بادلوں سے بھی کہیں بلند ہوتی عمارتوں کی چھتریوں سے الجھنے لگیں۔ بیوی کی پھانک بھر چوڑیاں رہن رکھ کر لیا ہوا بیج اور گڑ پتی جن پر بڑھتا ہوا سود ہر خشک سالی میں ایک ادھ قطعہ اراضی ہڑپ کر لیتا اور وہ ساری فصلیں جو پھونس ہو گئی تھیں، ضائع ہو چکی ساری کھادیں اور بیج نہ برسنے والے بھی پانی شاید کہیں اندر ہی اندر جمع ہوتے اور پھلتے پھولتے رہے تھے۔ آج جب یہ ناہموار اور بے اعتبارے قطعات اراضی بکے تو سود در سود پتہ نہیں کتنا بیاج لٹا دیا۔ شاید بھوک، کمزوری، بے بسی، استحصال بھی اک سرمایہ ہے جو نسل در نسل جمع ہوتا رہتا ہے اور پھر کس ایک نسل کو ان ساری بھوکوں، ساری قحط سالیوں اور ساری لاعلاج بیماریوں اور سلب شدہ حقوق کو ڈھیروں منافع لگا کر لٹا دیتا ہے۔

آسمانوں میں جذب ہونے والے اور زمین کے سینے میں اتر جانے والے سارے پانی یوں موسلا دھار برسے کہ ہر سو دولت اور سرمائے کی فصلیں لہلہانے لگیں۔ ان پتھروں کی خصلت بھی عجب ہے، روڑی بجری بنتے ہیں یا پھر ہیرے موتی اور اب یہ پتھر صدف بن کر بکے تو بستی کو افراط کی بدہضمی دے گئے۔ فریجوں میں بھری رہنے والی خوراک سڑنے لگی اور طباق کے طباق بھر بھر گٹروں میں بہائی جانے لگی۔ تب آبشار کے شفاف پانیوں میں تعفن بھر گیا۔ وہی آبشار جو کسی خوش گلو کی طرح قہقہے اچھالتی اور

کسی پنہاری کی طرح گاگریں چھلکاتی انڈیلتی تھی جس کے گرداگرد ساری ڈھلانوں، اترائیوں اور چڑھائیوں کے سبزہ زاروں پر باربی کیو بن گئے تھے۔ جن کے کھانوں کو اسی جھیل کے معدنی پانیوں نے ایسا ذائقہ بخشا تھا کہ شہر بھر کے خوش خوراک اس نئی کالونی میں پیٹ اٹھائے آتے اور ٹھونس ٹھانس واپس چلے جاتے۔ پھر بھی اتنا تیچ رہتا کہ قدیمی بستی کی خوراک ان کے گھروں میں سڑ جاتی کہ انہیں بھی انہی ہوٹلوں کی کی چاٹ لگ چکی تھی۔ تفریط کا منطقی نتیجہ افراط ہے اور افراط کا منطقی نتیجہ کوئی غیر مرئی سائنس ہے۔ یہ آبشار جس کے ڈھلانی چہرے پر کبھی پستئی رنگ جالے لٹکتے رہتے، نوکیلے پتھروں اور چٹانوں کے تیکھے نقوش پر کائی کی راکھ تہ در تہ جم جاتی جو مخملی سے برادے میں تبدیل ہو کر دبیز سی گھاس میں بدل جاتی۔ پھلاہی اور پیپل کے ننھے منے پودے پتھروں کی دراڑوں میں سے سر باہر نکال لیتے۔ پانیوں کی بوچھاڑ کھاتے اور درخت بنتے تھے لیکن اب ان کے میلے میلے چہروں پر سفید براق سنگ مرمر کا نقاب چڑھا دیا گیا تھا جس پر سے رنگ برنگ پانی پرشور ہو کر جھیل میں گرتے رہتے جس کے اطراف کو امپورٹڈ پھولوں، بیلوں اور پتھروں کے ساتھ انتہائی دیدہ زیب ترتیب سے سجایا گیا تھا جس کے شفاف پانیوں میں شفق رنگ قمقمے جلتے بجھتے تھے۔ جس کے گرد بچی کرسیاں قوسِ قزح کی دھاریاں معلوم ہوتیں۔ یہ وہی جھیل تھی جہاں عورتیں تن کے کپڑے سوکھنے کے انتظار میں کتنے دکھ آنکھوں کے گھڑوں میں بھر بھر بہا دیتی تھیں اور مرد چٹانوں کی اوٹ سے ہنکارا دیتے۔

”کپڑا لے لو ڈنگروں کو پانی پلانا ہے۔“

تب صنوبر، فاطمہ، صابرہ، بدن کی گٹھڑیاں گیلے دوپٹے میں لپیٹے گنگناتیں۔ ”لنگھ آؤ۔“

لیکن اب یہاں سوکھنے کو کوئی کپڑا نہ پھیلتا تھا کہ ہر جھاڑی تو رنگین قمقموں کی لڑیوں میں لپٹی جگمگاتی تھی۔ اب اس گراں کی لڑکیاں مہنگے بوتیکس کے سوٹ خریدتی ہیں جو افراط کی ناتجربہ کاری کے باعث گھر لاتے ہی دل سے اتر جاتے ہیں تو اور خرید لاتی ہیں۔ یہ سوٹ واشنگ مشینوں میں دھلتے اور ڈرائیر میں سوکھتے ہیں کہ اب اس جھیل کو بھرنے کے لیے آسمان کی سمت کوئی نگاہ نہیں اٹھتی کہ آبشار کے مصنوعی پانی شام بھر یہاں گرتے رہتے ہیں۔ شاید چوہے پر کھڑی بکائن سے بندھی ساری دھجیوں اور جھنڈوں کی سب مرادیں یکبارگی پوری ہو گئی تھیں۔ ان پڑھ ماؤں کی یہ پڑھی لکھی لڑکیاں اب اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے باپوں کی نیشنیلٹی لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں اپلائی کرنے اور گرین کارڈز ہولڈرز بننے لگی تھیں اور اس گراں کو چھوڑ رہی تھیں جو یرقان کے مرض میں جکڑا گیا تھا اور پرانی نسل زرد رو ہو کر مر رہی تھی۔ اس پیلاہٹ کے ماہر معالج درآمد کیے گئے۔ جدید ہسپتال بنے لیکن اس سنہری بستی کی پیلاہٹ کا علاج نہ ڈھونڈا جا سکا۔ پیلاہٹ پکنے کی نشانی ہوتی ہے۔ پکی فصلیں کٹ جاتی ہیں۔ یہ زرد رو انسانی فصل بھی تیزی سے کٹنے لگی جن کے مرقد کی لوحیں بھی طلائی حروف میں لکھی جاتی تھیں۔ اس سجے سجائے قبرستان سے پرے پہاڑی فصیلوں کے ادھر انگریز کے عہد کے اس قصباتی ریلوے سٹیشن پر اب بھی ریلیں گزرتی ہیں۔ اب بھی زیر زمین زلزلے برپا ہوتے ہیں، شاید اس لیے کہ یرقان کی پوٹلیوں میں دوہری تہری بندھی شکیلہ جان، صنوبر جان، فاطمہ جان، صابرہ جان ابھی بھی ریل کی انہی پٹڑیوں کی سنسناتی ہوئی جھنکاروں میں بج اٹھتی ہیں۔ جیسے وجود کی سبھی ہڈیاں سارے خلیات پابہ زنجیر ہوں۔ چھک چھک چھن چھک چھن۔ ریل گاڑیاں ہیں کہ گزرتی چلی جاتی ہیں۔

..........☆..........

احمد ندیم قاسمی



تیری جانب سفر حیات مری
تُو مرا ہے تو کائنات مری

عکس در عکس تُو نظر آئے
بٹ گئی آئنوں میں ذات مری

اپنی اپنی ہماری ملکیتیں
سارا دن تیرا، ساری رات مری

پوری دنیا سراپا استعجاب
سن کے اک سیدھی سادی بات مری

میں کہ مسجود ہوں فرشتوں کا
عرش تک حدِ ممکنات مری

میرے اندر ہزار دنیائیں
اور پھر ان گنت جہات مری

میرا فن میرے بعد بھی زندہ
یوں ہوئی موت سے نجات مری

اپنے باطن کا ترجماں ہوں ندیمؔ
میرا ہر شعر واردات مری

("بسیط")

احمد ندیمؔ قاسمی



شعور میں، کبھی احساس میں بساؤں اُسے
مگر میں چار طرف بے حجاب پاؤں اُسے

اگرچہ فرطِ حیا سے نظر نہ آؤں اُسے
وہ روٹھ جائے تو سو طرح سے مناؤں اُسے

طویل ہجر کا یہ جبر ہے، کہ سوچتا ہوں
جو دِل میں بستا ہے، اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے

اُسے بُلا کے مِلا عمر بھر کا سناٹا
مگر یہ شوق، کہ اِک بار پھر بلاؤں اُسے

اندھیری رات میں جب راستہ نہیں ملتا
میں سوچتا ہوں، کہاں جا کے ڈھونڈ لاؤں اُسے

ابھی تک اس کا تصور تو میرے بس میں ہے
وہ دوست ہے، تو خدا کس لیے بناؤں اُسے

ندیمؔ ترکِ محبت کو ایک عمر ہوئی
میں اب بھی سوچ رہا ہوں کہ بھول جاؤں اُسے

(''محیط'')

شہزاد احمد

O

آنکھ کے سامنے تجھے ہر دم رکھا میں نے
تُو وہ لمحہ کہ شب و روز سے چھینا میں نے

آپ ہی کاٹ لیے اپنے ہی دست و بازو
اپنی قسمت کا لکھا آپ مٹایا میں نے

اب ترا ذکر کروں بھی تو حوالہ کیا دوں!
اے گئی عمر! ترا نام نہ پوچھا میں نے

ہر گئی جنگ تو آیا مرے جھتے میں علم
کٹ گئی شب تو دیا پھر سے جلایا میں نے

تو ملا ہے تو ہُوا مجھ کو حسد لوگوں سے
آج دیکھا ہے لپکتا ہوا شعلہ میں نے

آج کی رات گزاری تری خوشبو کے بغیر
یہ سفر طے نہ کیا تھا کبھی تنہا میں نے

اس کے دل میں بھی جگہ میں نے بنا لی شہزاد
سنگ پر ثبت کیا نقشِ کفِ پا میں نے

مرتضیٰ برلاس



یا تھے دریا خشک یا صحرا ہے جل تھل، دیکھیے
اس برس کچھ اس طرح برسا ہے بادل دیکھیے

وہ جو تھی مخلوق جنگل کی، ملی ہے شہر میں
کیا ضروری ہے کہ پھر جا جا کے جنگل دیکھیے

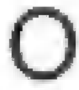
دیکھیے صحرا نشینوں کی عماراتِ بلند
یہ قیامت کے ہیں جو آثار اول دیکھیے

بیج سے بوٹا کوئی فوراً نکل آتا نہیں
آج کے اپنے رویہ کا اثر کل دیکھیے

خواب کی تعبیر پھر اچھی بری نکلے گی کچھ
خواب دیکھا ہے تو پھر اس کو مسلسل دیکھیے

نامکمل عشق تو ادراکِ لاحاصل ہے بس
اُس کو پاگل کیجیے یا ہو کے پاگل دیکھیے

لفظ و معنی کے ادب میں تجربے کرتے ہوئے
ہو نہ جائے شعر مبہم، بات مہمل، دیکھیے



اب سنائے گا تمھیں کون سخن، ہم جیسے
تم کہاں پاؤ گے یارانِ کہن، ہم جیسے

کوئی اِس دورِ کشاکش میں دکھائے ہم کو
وہ جو ہر حال میں رہتے ہوں مگن، ہم جیسے

لوگ کہتے ہیں تعیش کا وسیلہ، فن کو
کم ہی ہوں گے یہاں گرویدۂ فن، ہم جیسے

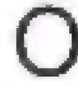
پارساؤں کی یہ محفل سہی لیکن پھر بھی
اس میں موجود ہیں کچھ توبہ شکن، ہم جیسے

پہلے کچھ سوچنا، پھر سوچ کے چپ ہو جانا
اب بُھلا بیٹھے ہیں بے ساختہ پن، ہم جیسے

تم سے لوگوں کو ملا مسندِ شاہی کا طواف
اور ہیں مستحقِ دار و رسن، ہم جیسے

بزم سے اٹھ گئے جب فیض و ندیم و دانش
معتبر ہو گئے پھر اہلِ سخن، ہم جیسے

عبداللہ جاوید



گریۂ ندامت کے ماسوا برا کیا تھا
اس کباڑ خانے میں اے خدا برا کیا تھا
آسماں بھی ان کا تھا اور زمین بھی ان کی
درمیان دونوں کے جو بھی تھا مرا کیا تھا
سب وسائلِ ہستی آپ ہی کی قدرت میں
جو پڑا تھا دنیا میں آپ کا، مرا کیا تھا
آتے جاتے لوگوں سے ہے بسی ہوئی دنیا
آتے جاتے لوگوں کا سلسلہ مرا کیا تھا
جگ بسائی تھی ان کی، جگ ہنسائی تھی میری
کھیل تھا، تماشا تھا، جو بھی تھا، مرا کیا تھا
میرے ہر سفر میں تھا، وقت کا سفر شامل
راستہ جو کتنا تھا، راستہ مرا کیا تھا
میری اک دعا بھی کیوں مستجاب ہو جاتی
ہر دعا سے یہ پوچھا مدعا مرا کیا تھا
مانتا ہوں رہتا تھا کوئی میرے اندر بھی
سوچتا ہوں اس سے بھی واسطہ مرا کیا تھا
جس کو میں نے چاہا تھا، جس کو میں نے پوجا تھا
وہ جو مجھ پہ مرتا تھا، کون تھا، مرا کیا تھا
میری سوچ جس کی تھی، جس کی سوچ میری تھی
جس کو میں نے اپنا دلِ دے دیا، میرا کیا تھا
حرف و صوت سے جاوید بارہا یہ پوچھا ہے
حرف و صوت میں جو بھی تھا رچا، مرا کیا تھا



مر گیا پانی جو تھا ٹھہرا ہوا
سوچیے، ہے اور کیا ٹھہرا ہوا

ڈھونڈتی پھرتی ہے جس کو اب دعا
ہے کہاں دستِ دعا ٹھہرا ہوا

دھیان کی شاخِ شجر پر ہے ابھی
ایک چہرہ پھول سا ٹھہرا ہوا

گھر کے اندر آ بسی، کیوں بے گھری
کون یہ گھر سے گیا ٹھہرا ہوا

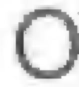
پاؤں چلتے ہیں، سفر کتنا نہیں
ہے سفر کا راستہ ٹھہرا ہوا

گھنٹیاں بجنے لگیں کانوں کے پاس
قافلہ دل کا چلا ٹھہرا ہوا

کام ایسا کیجیے جس کو کہیں
چشمۂ آبِ بقا ٹھہرا ہوا

آسماں پر ہے چڑھائی کا خیال
آسماں پر ہے خدا ٹھہرا ہوا
(کینیڈا)

تاب اسلم



چہار سمت وہ منظر اُداس شام کا ہے
کہ ایک خوف سا گھر گھر اداس شام کا ہے

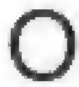
میں سوچتا ہوں کہ دل سے مرے اُتارے کون
جو ایک آہنی پتھر اداس شام کا ہے

جو ہو سکے کوئی سنگِ صدا گرا اس میں
بہت خموش سمندر اداس شام کا ہے

نہ چاندنی، نہ سیارے، نہ مشعلیں، نہ چراغ
یہ کیا عجیب مقدر اُداس شام کا ہے

بدن بچا کے چلیں اہل شہر سے کہہ دو
زمیں کے ہاتھ میں خنجر اداس شام کا ہے

لبوں پر تاب تبسم کے پھول مہکیں کیا
دلوں میں ٹھہرا ہوا ڈر اُداس شام کا ہے



سفر کی داستاں تحریر کرنے جا رہا ہوں
میں اپنے درد کو تصویر کرنے جا رہا ہوں

جو میری روح کی پہنائیوں میں گونجتی ہے
میں اُس آواز کو زنجیر کرنے جا رہا ہوں

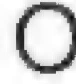
سنا ہے زندگی کوہ ہمالہ کی طرح ہے
میں بے تیشہ اُسے تسخیر کرنے جا رہا ہوں

سہانے خواب دیکھے تھے جو تیرے ساتھ میں نے
اُنہیں بھی آج بے تعبیر کرنے جا رہا ہوں

بنا رکھی ہے میں نے اس کی بہتے پانیوں پر
وفا کا جو محل تعمیر کرنے جا رہا ہوں

بھری ہیں آنسوؤں سے میری آنکھیں تاب اسلم
میں ذکرِ وادیٔ کشمیر کرنے جا رہا ہوں

آصف ثاقب



یوں نہ ہو شرم کا یہ ہار گلے پڑ جائے
اپنے اسلاف کی دستار گلے پڑ جائے

کس طرح تجھ سے محبت کا میں اظہار کروں
شہر کا شہر ارے یار گلے پڑ جائے

سرخیاں رات کی لوگوں کو جگائے رکھیں
صبح دم سرخیِ اخبار گلے پڑ جائے

اب کے جنت میں مرا کھیل پرانا ہی نہ ہو
کیا خبر پھر وہی کردار گلے پڑ جائے

آستینوں پہ نظر رکھتے رہو تم ثاقبؔ
عین ممکن ہے کوئی مار گلے پڑ جائے



دعا یہی ہے مری دوستی کے سجدوں میں
مرا رسوخ بڑھے دشمنوں کے حلقوں میں

انہی سے پھول سی تعبیر مجھ کو ملتی ہے
اُگائے رکھتا ہوں میں خواب گھر کے گملوں میں

مجھے گلوں کی ہواؤں سے کیا غرض ہوتی
جیوں میں ایسے کہ لیتا ہوں سانس زخموں میں

فلک پہ کون وہ جوہر تلاش کرتا ہے
جو کھو گئے ہیں مری سوئی ہوئی پلکوں میں

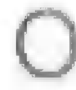
وہ منزلوں پہ پہنچ کر ہمیں تلاش کریں
بچھڑنے والے بچھڑتے رہے تھے رستوں میں

جو کھیل کھیل میں تفریق مٹنے لگتی ہے
بڑے بھی چھوٹے نظر آئیں گھر کے بچوں میں

چلو کہیں سے ستارے ہی توڑ لاتے ہیں
کوئی کرن تو نظر آئے کالے بختوں میں

نباہ کیسے فرشتوں سے اب ہوگا ثاقبؔ
کہ اپنی عمر تو ساری کٹی ملنگوں میں

سید عارف



(نذرِ غالبؔ)

اشکِ خوں کی اتنی قندیلیں فروزاں ہوگئیں
درد میں ڈوبی ہوئی آنکھیں گلستاں ہوگئیں

دوریِٔ جاناں فراقِ یار شامِ ہجر کی
چند گھڑیاں تھیں مگر پھیلیں تو صدیاں ہوگئیں

جو کسی کے پیار کی چھاؤں میں گزری تھیں کبھی
اب وہ گھڑیاں زینتِ دامانِ مژگاں ہوگئیں

لے گئے دل کو بگولے آہ کے، آنکھوں کو اشک
بستیاں کیا تھیں کہ نذرِ بادوباراں ہوگئیں

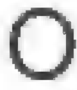
کیا بتائیں حالِ بے تعبیریِٔ خوابِ حیات
ایک اک کرکے تمنائیں پریشاں ہوگئیں

حرف کی سچائیاں ساری قلم کی حرمتیں!
ہوتے ہوتے سب تہہِ زنجیر و زنداں ہوگئیں

کتنی صدیوں کتنی نسلوں کا لہو پینے کے بعد
میری صبحیں اور بھی ظلمت بداماں ہوگئیں

قدرتِ حق کو ہوئی پیدا نمو کی آرزو
حسن کی رعنائیاں سمٹیں تو انساں ہوگئیں

مسرور احمد زئی



شعلہ سا اک چھپا رہا مجھ میں
کوئی مجھ سے جدا رہا مجھ میں
بت کہ وہ توڑ ہی دیا میں نے
جو خدا سا بنا رہا مجھ میں!!
زندگی کی اندھیری راہوں میں
اک دیا سا جلا رہا مجھ میں
سن سکا ہی نہیں میں اپنی بات
شور سا اک بپا رہا مجھ میں
سوئے ماضی نگاہ کرنے کو
اک دریچہ کھلا رہا مجھ میں
عہد سے اپنے باوفا تھا وہ
عمر بھر جو خفا رہا مجھ میں
رت بدلتی رہی زمانے کی!!
زخمِ الفت ہرا رہا مجھ میں
بس اُسی نے بچا کے رکھا ہے
جو کہ اب تک بچا رہا مجھ میں
اور اسی نے بجھا کے رکھا ہے
جو کہ مدت جلا رہا مجھ میں
اب اسے میں صدا بھی کیا دیتا
شخص وہ جو سدا رہا مجھ میں
آج تک یارِ من وہی مسرور
بن کے میری سزا رہا مجھ میں

سید مشکور حسین یاد



ہم اپنی تدبیر میں اپنے تک رہیں کیونکر
اس شوقِ تعمیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

کوئی ہمیں پہچانے اس کی فکر نہیں
ہم اپنی تصویر میں اپنے تک رہیں کیونکر

اپنے ساتھ شہادت سب کی رکھتے ہیں
شہ رگِ صد شمشیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

ہم تقدیر کو سمجھے ہیں سب کی جاگیر
ہم اپنی تقدیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

ہم نے چھلنی کیا ہے اک اک سینے کو
اپنی انا کے تیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

فرزانے بھی ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں
دیوانے زنجیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

یاد اس فتح میں سب کو شامل کرتے ہیں
ہم دل کی تسخیر میں اپنے تک رہیں کیونکر

سلطان سکون



خیر! اوروں نے تو جو بھی مجھے جانا، جانا
دکھ تو یہ ہے مجھے اس نے بھی دِوانہ جانا
نہ کبھی اُس نے بھی حق میں مرے اک خیر کی بات
طنز لوگوں کا تو میں رسمِ زمانہ جانا
میں نے رسماً ہی جو پوچھا کہ چلا جاؤں میں
اُس نے جھٹ کہہ دیا منہ پھیر کے جا، ناجا، نا
میں نے پھر اپنی تسلی کو مکرر پوچھا
اس نے پھر کہہ دیا بل کھا کے کہا نا، جانا
اس نے پھر اور کہیں نقلِ مکانی کر لی
میں نے رکھا جو اُدھر روز کا آنا جانا
وسوسے ڈال گیا اور بھی دل میں کیا کیا
اس کا محفل سے کوئی کرکے بہانہ جانا
چارہ گر چل دیا کہہ کر نہیں کچھ اس کا علاج
اس نے جب روگ مرے دل کا پرانا جانا
میں نہیں جانتا کیا اور ہے معیارِ وفا
میں نے جانا تو دل و جاں کو لٹانا جانا
میری رودادِ محبت ہی دل آویز سی ہے
جس کسی نے بھی سنی اس نے فسانہ جانا
اس نے بھی آج سرِراہ مجھے یوں دیکھا
جیسے لگتا ہو کوئی اجنبی جانا جانا
کیا نہیں جانتے تم کون ہے سلطان سکون
ایک مجذوب سا شاعر ہے وہ مانا جانا
واقعی آپ بہت سادہ سے انساں ہیں سکون
ورنہ ہم نے تھا بہت آپ کو دانا جانا

نجیب احمد

○

ہوا کا شاخ سے جھگڑا ہوا ہے
گریباں چاک پھولوں کا ہوا ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے
یہ منظر خواب میں دیکھا ہوا ہے

پرندے کیا اترتے آسماں سے
شجر کو برف نے ڈھانپا ہوا ہے

کمی پہلے تھی کچھ زادِ سفر میں
مجھے بارش نے اب روکا ہوا ہے

منافع بخش پیشہ ہے گدائی
سو دستِ شاہ تک پھیلا ہوا ہے

ابھی اک لٹ کا الجھاؤ ہے باقی
ابھی ہموار کب رستہ ہوا ہے

نجیبؔ اک عمر سے فرقت کا لمحہ
مرے اطراف میں ٹھہرا ہوا ہے

○

کون ہے کس کا گنہگار، یہ سب جانتے ہیں
لوگ اس شہر کے لٹنے کا سبب جانتے ہیں

جانے کیا بھید تری چپ میں چھپا ہے ورنہ
بات کرنی تری آنکھیں ترے لب جانتے ہیں

کوئی بھی وجہ بتانے کا تردد نہ کرے
کس لیے شہر میں ہے شور و شغب جانتے ہیں

اس قدر کام نہ لے جھوٹ کی بیساکھی سے
شہر کے لوگ ترا نام و نسب جانتے ہیں

اس لیے بھی کوئی ناراض نہ تھا گھر میں نجیبؔ
ہم کہ اک شخص کو خوش رکھنے کا ڈھب جانتے ہیں

یوسف حسن



تیرا مرا امتحان کیا ہے
پرچھائیں سی درمیان کیا ہے

ہم کس کی شفق پہ مر مٹے ہیں
اے شام، ترا گمان کیا ہے

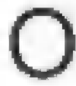
ہم کو جو ورا کرے نہ ہم سے
اس سارے سفر کی آن کیا ہے

حیرت کے سوا بھی کچھ بتاؤ
اس پار کی داستان کیا ہے

ہنگامۂ خاک ہی سے پوچھو
اندیشۂ آسمان کیا ہے

دیکھ اپنا خلا بھی انخلاء بھی
اشیاء سے بھرا مکان کیا ہے

بازار کی بندگی ہے یوسفؔ
دربار کی آن بان کیا ہے



بے گھری کے پڑاؤ بھی دیکھو
اب ہمارے الاؤ بھی دیکھو

خاک زرخیز دیکھنے والو
اپنی دھرتی کے گھاؤ بھی دیکھو

اپنا پرتو پکارتا ہے ہمیں
آؤ میرا سبھاؤ بھی دیکھو

چاہنے والوں کے قرینوں میں
چاہے جانے کے چاؤ بھی دیکھو

عمر بھر کے خلاء کو بھرتا ہوا
لمحہ بھر کا لگاؤ بھی دیکھو

تمتمانے لگی ہے خاک مری
اپنے سینوں کا تاؤ بھی دیکھو

اتنی وحشت بجا نہیں یوسفؔ
حسن کا رکھ رکھاؤ بھی دیکھو

خورشید بیگ میلسوی



پیش منظر، پسِ منظر بھی تو ہو سکتا ہے
یہ تماشا مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے

ہدفِ سنگِ ملامت نہ بناؤ لوگو
دل کا یہ آئینہ پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

تو جسے سایۂ دیوار سمجھ کر چپ ہے
وہ ترے قد کے برابر بھی تو ہو سکتا ہے

تو کبھی لفظ و معانی کے سمندر میں اُتر
تجھ میں پوشیدہ سخنور بھی تو ہو سکتا ہے

ڈھول کی تھاپ پہ کیوں پاؤں تھرک اٹھے ہیں
تجھ میں خوابیدہ قلندر بھی تو ہو سکتا ہے

جس کو دھتکار رہے ہیں یہ زمانے والے
کل وہ قسمت کا سکندر بھی تو ہو سکتا ہے

غور سے دیکھ پسِ دیدۂ گریہ خورشیدؔ
کوئی خاموش سمندر بھی تو ہو سکتا ہے



مکینِ شہرِ جاں آزار میں ہیں
دراڑیں سی در و دیوار میں ہیں

انہیں اک ایک کرکے کھولنا ہے
کئی گرہیں ابھی دستار میں ہیں

مرے اجداد کو تھا ناز جن پر
وہی قدریں مرے آثار میں ہیں

ازل سے دائرہ در دائرہ ہم
مقید نقطۂ پرکار میں ہیں

ابھی تو منکشف ہونا ہے ہم کو
ابھی ہم پردۂ اسرار میں ہیں

نہیں ہیں جو کسی تیغ و سناں میں
وہ سب جوہر تری گفتار میں ہیں

جہاں والو ابھی ہم کو نہ چھیڑو
ابھی ہم نشۂ پندار میں ہیں

مہ و خورشیدؔ کتنے ہی نہ جانے
حصارِ ثابت و سیار میں ہیں

سلیم کوثر



چلو مانا کہ تم کو دوستی اچھی نہیں لگتی
مگر اک بات ہے کیا واقعی اچھی نہیں لگتی

اندھیرا ہی اندھیرا پھیلتا جاتا ہے ہر جانب
یہی ہے روشنی تو روشنی اچھی نہیں لگتی

میں اکثر مسخ ہوتے دیکھتا ہوں ان کے چہروں کو
جنہیں بچوں کے ہونٹوں پر ہنسی اچھی نہیں لگتی

میں اب بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہوں
تمہیں کس نے کہا کہ زندگی اچھی نہیں لگتی

بچا لائے ہو سر، دستار اپنی چھوڑ آئے ہو
محاذِ عشق سے یوں واپسی اچھی نہیں لگتی

جنہیں قسمت سے فرشِ سبز پر چلنا میسر ہے
انہیں دیکھو ردائے شبنمی اچھی نہیں لگتی

میں چھپ کر دیکھتا ہوں گھر میں سارے لوگ ہی خوش ہیں
مجھے یہ وہم تھا میری کمی اچھی نہیں لگتی

تمہارے بعد بھی دنیا ہمیں اچھی تو لگتی ہے
مگر دنیا کی یہ بے رونقی اچھی نہیں لگتی

سلیم ایسا بھی کیا کہ سانس لینے میں اذیت ہو
محبت میں اب اتنی بے بسی اچھی نہیں لگتی



آخر کہاں گیا، ستم ایجاد کیا ہوا
وہ بادشاہِ ملکِ خداداد کیا ہوا

کُھلتے ہی آنکھ خواب کا صحرا ہے ہر طرف
وہ تخت کیا ہوا وہ پری زاد کیا ہوا

وہ جس کو اختلاف رہا مجھ سے ساری عمر
وہ میرا دوست وہ مرا ہمزاد کیا ہوا

جب میکدے میں حسنِ نوازن نہیں کوئی
پھر شاد کیا ہوا کوئی ناشاد کیا ہوا

پھر اس نے احتجاج کا سوچا نہیں کبھی
وہ ایک بار مائل فریاد کیا ہوا

تھی جس سے تیرے سانس کی ڈوری بندھی ہوئی
کچھ تو بتا وہ سلسلۂ یاد کیا ہوا

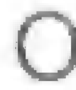
تیشہ تھا ایک نہر تھی، دنیا تھی تم نہ تھے
شیریں سخن وہ قصۂ فرہاد کیا ہوا

سینے میں یاد بن کے دھڑکنے لگا کوئی
میں خواہشوں کی قید سے آزاد کیا ہوا

میں تھا تو مجھ سے ساری خرابی تھی دہر میں
اب کس سے پوچھیے کہ مرے بعد کیا ہوا

اِک جشن ہے خرابۂ دل میں مگر سلیم
تنہائی کے سوا یہاں آباد کیا ہوا

قائم نقوی



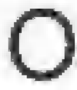
موسم کے ساتھ ساتھ بدلنے نہیں دیا
اس کی کسی بھی چال کو چلنے نہیں دیا

لے کر جلو میں چاند کی کرنوں کو رات بھر
ماہتاب تیری یاد کا ڈھلنے نہیں دیا

یادوں کی زمہریر ہواؤں میں گم رہے
برفاب راستوں کو پگھلنے نہیں دیا

گرنے لگے تو اپنے ہی قدموں پہ آ گرے
اپنی انا نے ہم کو سنبھلنے نہیں دیا

قائم بہت دنوں سے جو شدت کی بھوک تھی
رزقِ حرام خود کو نگلنے نہیں دیا



ابھی تو خطرہ نشان تک ہی رکا ہوا ہے
کہ ایک قصہ بیان تک ہی رکا ہوا ہے

یقیں دریدہ گماں کی گلیوں میں رہ رہا ہے
مکین حدِ مکان تک ہی رکا ہوا ہے

کہ کشتیوں کو ملے بھی اذنِ سفر تو کیسے
یہاں سفر بادبان تک ہی رکا ہوا ہے

فضائیں بوجھل ہوائیں آلودہ ہو رہی ہیں
کہ فیصلہ درمیان تک ہی رکا ہوا ہے

یہ دل مسخر کیے ہیں ابلیس نے ہمارے
خدا ہماری زبان تک ہی رکا ہوا ہے

دلوں میں قائم ہیں جانے کتنے ہی عزم اپنے
یہ تیر اپنا کمان تک ہی رکا ہوا ہے

نصیر احمد ناصر



نہ آسماں نہ زمیں پر، کہاں گرا آخر
مِرے وجود کا پتھر کہاں گرا آخر

افق کے پار تو کچھ بھی دکھائی دیتا نہیں
نظر سے ٹوٹ کے منظر کہاں گرا آخر

میں ابرِ خواب تھا، آنکھوں میں جا بسا اُس کی
وہ اشکِ تر، وہ سمندر کہاں گرا آخر

ہر ایک شخص کی آنکھیں تلاش کرتی ہیں
میں ایک خواب کے اندر کہاں گرا آخر

لہو کی دھار ہے، مقتول بھی ہے، قاتل بھی
رگوں کو کاٹ کے خنجر کہاں گرا آخر

یہ کائنات مسلسل اسی تلاش میں ہے
محیط چھوڑ کے محور کہاں گرا آخر

میں بھول جاتا ہوں ٹھوکر کہاں لگی مجھ کو
میں بھول جاتا ہوں اکثر کہاں گرا آخر

بچھڑ کے خود سے میں خود کو کہاں تلاش کروں
میں اپنے آپ سے باہر کہاں گرا آخر

کوئی نہ دیکھ سکا رات کے اندھیرے میں
وہ ماہتابِ منور کہاں گرا آخر

مکاں تو مل گیا ملبے کے ڈھیر سے ناصرؔ
مگر جو دل میں تھا وہ گھر کہاں گرا آخر



میں سوچتا رہتا ہوں دماغوں میں نہیں جو
وہ کون سا ہے پھول کہ باغوں میں نہیں جو

پانی میں، زمینوں پہ، ہوا میں اسے کھوجا
وہ کیسا نشاں ہے کہ سراغوں میں نہیں جو

ہوتی ہے کسی دیدۂ نمناک کی لَو سے
وہ روشنی کیسی ہے چراغوں میں نہیں جو

اک کارِ مسلسل ہے اسے چاہتے رہنا
لطف اس کا لگاتار ہے ناغوں میں نہیں جو

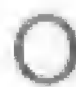
اس محفلِ احباب کی سرشاری عجب ہے
وہ مے بھی چھلک جائے ایاغوں میں نہیں جو

رنگت ہی نہیں، آب و ہوا کو بھی تو دیکھو
بگلوں میں کوئی بات ہے زاغوں میں نہیں جو

دیکھو نہ مرا جسم، مری روح جلی تھی
یہ داغ ہے وہ جلد کے داغوں میں نہیں جو

ناصرؔ ہیں عجب بولیاں طاؤسِ زماں کی
اشجار کے پرغول کلاغوں میں نہیں جو

گلزار بخاری



اوروں کے حق میں عالمِ امکان چھوڑ دے
جب کھیل ختم ہے ترا میدان چھوڑ دے

خالی نہیں نشست ابھی انتظار کر
شاید جگہ کبھی کوئی نادان چھوڑ دے

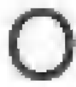
اندھے نہیں سبھی کہ تری بات مان لیں
ظلمت بڑھا کے نور کا اعلان چھوڑ دے

اپنا مفاد سوچ مگر اس کے واسطے
حد سے فزوں جہان کا نقصان چھوڑ دے

ہوتا ہے خوار پھر بھی نہ دیکھا کہ دل کبھی
ناقابلِ حصول کا ارمان چھوڑ دے

جس نے اڑائی ہیں مرے دامن کی دھجیاں
وہ مجھ سے کہہ رہا ہے گریبان چھوڑ دے

گلزار سیخ پا نہ ہو ایفا کے ذکر پر
بہتر ہے یہ کہ وعدہ و پیمان چھوڑ دے



رہے خاموش ہم اس پر کہ برگ و بار لے جائے
مگر حد ہے وہ چاہے کاٹ کر اشجار لے جائے

زبانِ خلق پر تالے لگائے جا نہیں سکتے
کوئی جب گھر کی باتوں کو سرِ بازار لے جائے

ہوائے تند کے خائف اسی خدشے میں رہتے ہیں
اڑا کر سر سے جانے کس گھڑی دستار لے جائے

ارادے اس کے ایسے ہیں اگر بس چل سکے اس کا
ستم گر ہر کہیں سے زیست کے آثار لے جائے

بھروسا بازوؤں پر ہے نہ کچھ امید کشتی سے
تن آساں چاہتے ہیں ان کو دریا پار لے جائے

اذیت کوش قاتل رفتہ رفتہ موت دیتا ہے
کہے اب کون اس کو تن سے جاں اک بار لے جائے

انا سے دست برداری پہ مائل بھی نہیں کوئی
تباہی کی طرف چاہے اسے پیکار لے جائے

صفدر سلیم سیال



اپنی تو خوشی اس میں تھی ہم ساتھ نبھاتے
اتنا تو کرم کرتے ہمیں یاد نہ آتے

گر تجھ سے بچھڑ جانے کا امکاں نظر آتا
اتنے بھی ترے ساتھ مراسم نہ بڑھاتے

تھامے ہوئے سانسیں ابھی سرحد پہ کھڑے ہیں
ہمت نہیں حائل ہے جو دیوار گراتے

جتنا بھی کڑا وقت ہو ہم ایسے قلندر
گھبرا کے کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

اس شہر نگاراں میں کشش اب بھی ہے باقی
اپنی تو کٹی عمر تجھے جی سے بھلاتے

کچھ حد سے زیادہ تھی درختوں کی رعونت
ہم ایسے پرندے تو نہ تھے لوٹ کے آتے

اتنی بھی تو فرصت نہ ملی بیٹھ کے اک دن
اس لمبی جدائی کا سبب کچھ تو بتاتے

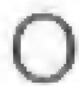
گر اس نے سوئمبر ہی رچایا تھا بہرحال
تم بھی وہاں جاتے کوئی اک تیر چلاتے

جتنے بھی ملے زخم ہمیں تیرے سبب سے
اے کاش تجھے ہم تری خواہش پہ دکھاتے

کرتے جو بھروسہ تو ابھی لوگ ہیں باقی
جو دورِ خزاں میں بھی یہاں پھول کھلاتے

حیرت ہے سلیم اس پہ، بچھڑ کر بھی سرِ راہ
گھبرایا ہے کس بات پہ وہ ہاتھ ملاتے

انوار فیروز



جو اشک ہے لعل ہو گیا ہے
اے آنکھ کمال ہو گیا ہے

اس شخص نے ایک بات کی تھی
اس بات کو سال ہو گیا ہے

ہر شخص جواب چاہتا ہے
ہر شخص سوال ہو گیا ہے

کیوں اس کو خیال ہو کسی کا
آزاد خیال ہو گیا ہے

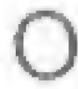
جینا بھی محال تھا پر اب تو
مرنا بھی محال ہو گیا ہے

دل پھر اُسی کو سوچتا ہے
جو خواب و خیال ہو گیا ہے

لوگوں سے کہو کہ ہونٹ سی لیں
آئین بحال ہو گیا ہے

ہنسنے کا پڑا ہے صبر انوؔار
ہر گل جو نڈھال ہو گیا ہے

امتیاز الحق امتیاز



ہے وہی اک لفظ لیکن معنویت اور ہے
وہ اذیت اور تھی اور یہ اذیت اور ہے

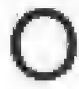
پہلے اک رسمی تعلق بھی غنیمت تھا ہمیں
اب مگر مطلوب ہم کو واقفیت اور ہے

کذب سازی شرط ہے اب کارسازی کے لیے
کیا کروں لیکن مری ماں کی وصیت اور ہے

جنگلوں کی وحشتیں مشروط ہیں فطرت کے ساتھ
شہروں میں لیکن جنونِ بربریت اور ہے

اے وصالِ یار اس منظر سے آگے کچھ نہیں
سارے پردے اٹھ چکے ہیں اجنبیت اور ہے

دیکھ کر جمہوریت کی ایسی صورت امتیازؔ
کون کہہ سکتا ہے خوئے آمریت اور ہے



لمحۂ انتظار ہو گیا میں
بے حد و بے کنار ہو گیا میں

ایسے ماحول میں یہ ہونا تھا
بے حسوں میں شمار ہو گیا میں

وہ نظر اتنی پُر اثر بھی نہ تھی
جس نظر کا شکار ہو گیا میں

میں نے دیکھا تھا آئینے میں اُسے
خود پہ پھر آشکار ہو گیا ہوں

کیسے تجھ کو بھلا دیا میں نے
کیسے خود سے فرار ہو گیا میں

اس نے دیکھا تھا امتیازؔ مجھے
پھر ہوا پر سوار ہو گیا میں

اشرف جاوید



وہ بات کرتا نہیں، بات کو چھپاتا ہے
اُسے ہنر بھی، فریب ہنر بھی آتا ہے

بس اک الاؤ مہکتا ہے اس کے چار طرف
لباسِ رنگ میں شعلہ کہاں سماتا ہے

میں اُس کا لمس نہ پاؤں تو گھٹ کے مر جاؤں
ہوا مثال ہے، ہر سانس آتا جاتا ہے

عجیب شہرِ طلسمات ہے یہ شہر اُس کا
ہر ایک رستہ نیا راستہ دکھاتا ہے

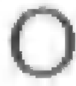
طلوعِ ماہ سے جگمگ ہوئی ہے دل کی منڈیر
وہ اک نظر میں ہزاروں دیے جلاتا ہے

نہ خواب ہیں، نہ کہیں خواب دیکھتی آنکھیں
مگر یہ نیند کا جنگل مجھے بلاتا ہے

حصارِ حیرت و حسرت کے درمیاں پڑا ہوں
مرے نواح میں دیوار کون اٹھاتا ہے

بس ایک ریت کا دریا ہے اور اک میں ہوں
ستارا وار کہیں پانی جھلملاتا ہے

اتر رہی ہے فصیلوں سے رات کی چادر
چراغ ساتھ لیے دن بھی چڑھتا آتا ہے



طویل شب کی مسافت میں مبتلا لوگو!
یہیں سے صبح کا نکلے گا راستا لوگو!

غبارِ راہ مٹاتا ہے نقشِ پا اُس کے
کسے خبر ہے کہ وہ آکے جا چکا لوگو!

کوئی تو بولے، کوئی توڑے خاموشی کا طلسم
کبھی کھلے تو سہی کیا ہے ماجرا لوگو!

بہت قریب تھا ساحل، بہت قریب تھے دوست!
میں ہاتھ اٹھائے ہوئے ڈوبتا رہا لوگو!

اُسی کے ساتھ رہ و رسمِ دوستی بھی گئی
تمام شہر مجھے اجنبی ہوا لوگو!

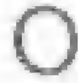
چمک رہے ہیں ستارے، دمک رہے ہیں چراغ
پتا کرو! کہ کہاں رہ گئی ہوا لوگو!

لرز رہا ہے شجر کے نحیف ہاتھوں میں
وہ برگِ سادہ جو اب تک نہیں گرا لوگو!

اب اس کا ملنا کوئی خواب دیکھنا ٹھہرا
وہ ایک شخص جو مجھ میں بہت رہا لوگو!

یہ ارضِ پاک، یہ حسنِ ازل، یہ میری غزل
میں ان کے ساتھ جیا جب تلک جیا لوگو!

نسیم سحر



اتنا ڈھونڈا بھی، مگر کوئی دِکھائی نہ دیا
اتنی دستاروں میں سر کوئی دکھائی نہ دیا

ہم نے دیوار کے اندر سے بنایا رستہ
جب بھی دیوار میں در کوئی دکھائی نہ دیا

جن درختوں نے جھکا رکھی تھیں شاخیں اپنی
ان درختوں پہ ثمر کوئی دکھائی نہ دیا

لوٹنا پڑ گیا پھر سے مجھے بستی کی طرف
دشت میں خاک بسر کوئی دکھائی نہ دیا

غور سے دیکھ، یہ چادر تو ہٹا پانی کی
کیا تجھے، دیدۂ تر، کوئی دکھائی نہ دیا؟

شعر بارش کی طرح ہم پہ اُترتے ہی رہے
اپنا تو کارِ ہنر کوئی دکھائی نہ دیا

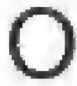
کچھ پرندوں کو تو گرتے ہوئے دیکھا تھا، مگر
ان کا ٹوٹا ہوا پَر کوئی دکھائی نہ دیا

آنکھ تو مان گئی، دل نہیں مانا ہرگز
ضبطِ گریہ کا اثر کوئی دکھائی نہ دیا

یہ حقیقت تو فقط اہلِ نظر جانتے ہیں
تھا اُدھر کون، جدھر کوئی دکھائی نہ دیا

کتنی آسانی سے پانی میں وہ ڈوبی ہیں نسیم!
کشتیاں، جن کو بھنور کوئی دِکھائی نہ دیا

حمیدہ معین رضوی



نہ جس پہ بس تھا وہی کام کر چکے اب تو
تمہاری یادوں کے دکھ سے گزر چکے اب تو

مروتوں کی روایت کو ڈھونڈنا ہے عبث
ہر ایک، شاخِ تمنا، کتر چکے اب تو

بتاؤں ذات کے آئینے کس طرح ٹوٹے؟
اذیتوں میں کئی بار مر چکے اب تو

خزاں کی شامِ خوں آشام نے جگائے زخم
سمجھ رہے تھے کہ ہر زخم بھر چکے اب تو

یہ سانحہ ہے کہ کم بینی پر وہ کہتے ہیں
ہر ایک موئے بدن سے سنور چکے اب تو

زمانے جو نہیں دیکھا تھا تو نے دیکھ لیا
لہو، لہو ہیں سب اعضاء بکھر چکے اب تو

عدو کے محلوں میں جو چل رہے ہیں پیمانے
ہمارا خون ہے، جو خون کر چکے اب تو

فریب کھائے ہیں الفت کے سارے رشتوں سے
ملے ہیں زخم وہ جن سے نکھر چکے اب تو

خزاں کے پتوں کی مانند کچلے جاتے ہیں
زماں کے دل سے کچھ ایسے اتر چکے اب تو

کرامت بخاری



دنیا کی اس بھیڑ میں کھو گئے جانے کتنے لوگ
ان آنکھوں سے اوجھل ہو گئے جانے کتنے لوگ

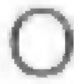
صدمے سہتے سہتے ساری عمریں بیت گئیں
اور زمین کو اوڑھ کے سو گئے جانے کتنے لوگ

کچھ لوگوں کے گھر میں اتری خوشیوں کی بارات
اور غموں کے بوجھ کو ڈھو گئے جانے کتنے لوگ

وقت کے اس بہتے دریا میں خاموشی کے ساتھ
اپنی ناؤ آپ ڈبو گئے جانے کتنے لوگ

ایک نظر سے اس نے ہر اک دل کو جیت لیا
ایک نظر میں اس کے ہو گئے جانے کتنے لوگ

اشکوں کی برسات میں بہہ گئی مجبوری کی راکھ
اپنے دل کے داغ کو دھو گئے جانے کتنے لوگ



لکھ کے آبِ رواں پہ چھوڑ آیا
نامۂ دل کہاں پہ چھوڑ آیا

بے خودی میں یہ ہُوا ہے مجھ سے
اپنا سب کچھ کہاں پہ چھوڑ آیا

اس سے آگے مقامِ حیرت تھا
خود کو جا کر جہاں پہ چھوڑ آیا

وہ جہاں حسن کی حکومت تھی
اپنے دل کو وہاں پہ چھوڑ آیا

عمر ساری حروف لکھتا رہا
لکھ کے لوحِ جہاں پہ چھوڑ آیا

آگہی کی عجیب منزل تھی
لامکاں کو مکاں پہ چھوڑ آیا

اپنے شوقِ سفر کا ہر سجدہ
اُس قدم کے نشاں پہ چھوڑ آیا

ہارون الرشید



چوم آنکھیں مری مسندِ شاہی سے اتر کر
آیا ہوں میں اک آگ کے دریا سے گزر کر

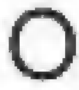
تو ہو گا نہ میں، عمر کی دہلیز پہ کل کو
جو وقت میسر ہے مرے ساتھ بسر کر

آواز تری سنتا ہوں پر رُخ نہیں ملتا
چہرہ ترا آجاتا ہے اشکوں میں ابھر کر

کیسی یہ مسافت ہے کہ کم ہی نہیں ہوتی
یہ جسم بھی اب رہ گیا رستے میں بکھر کر

کتنی یہ کٹھن زیست ہے کیا تجھ کو خبر ہے
ممکن ہو تو کچھ دن مری دنیا میں سفر کر

اس عشق میں ممکن ہے کہ جانا پڑے جاں سے
ہارون پیالہ سدا رکھ زہر کا بھر کر



دوست اچھا! تم سے رخصت چاہتا ہوں
تھک گیا ہوں کنجِ عزلت چاہتا ہوں

اس کہانی کا مقدر تھا یہیں تک
واپسی کی اب اجازت چاہتا ہوں

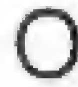
ریت منہ میں بھر گئی ہے آنسوؤں کی
اب تو سونے کی اجازت چاہتا ہوں

جلدی جلدی کام سب نمٹا لیے ہیں
اب تو بس تیری ریاضت چاہتا ہوں

اب پرندے بھی یہاں سے جا رہے ہیں
الاماں! سب کی حفاظت چاہتا ہوں

شہر کے لوگو اٹھو وقتِ دعا ہے
میں تو سب پر رب کی رحمت چاہتا ہوں

ہارون الرشید



اک تماشا بنا دیا جاؤں
کیا خبر میں مٹا دیا جاؤں

تیز آندھی میں عین ممکن ہے
گھر کے اندر بجھا دیا جاؤں

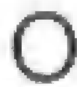
کٹ چکے پیڑ سارے گاؤں کے
میں بھی شاید گرا دیا جاؤں

قتل ہونے کے بعد امکاں ہے
پانیوں میں بہا دیا جاؤں

حادثہ ایسا ہو بھی سکتا ہے
راستے سے ہٹا دیا جاؤں

اس میں کیا شک ہے دوسروں کی طرح
میں بھی اک دن بھلا دیا جاؤں

عزیز اعجاز



بہت آگے نکلنا چاہتا تھا
تمہارے ساتھ چلنا چاہتا تھا

اگر تم بھی مرے ہمراہ چلتے
ہوا کا رخ بدلنا چاہتا تھا

میں پروانہ نہ تھا اے شمع محفل
پر اس آتش میں جلنا چاہتا تھا

جہاں ٹھوکر لگی تم یاد آئے
کہ میں گر کر سنبھلنا چاہتا تھا

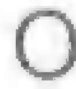
کسے ڈھالا نہ جانے اُس میں تم نے
میں جس قالب میں ڈھلنا چاہتا تھا

زمانے نے مجھے فرصت نہیں دی
میں یادوں سے بہلنا چاہتا تھا

بجھا دی کس لیے وہ آگ تم نے
میں جلنا، اور جلنا چاہتا تھا

بدل دی راہ تب اعجاز اس نے
میں جب خود کو بدلنا چاہتا تھا

عابد ودود



کس نے افلاس کی دنیا میں بنا ڈالی ہے
ایسے لگتا ہے کہ یہ زندگی اک گالی ہے

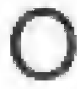
میں تو بے ساختہ لپٹوں گا جو وہ مل جائے
میں نے تسلیم کی خُو دل میں نہیں ڈالی ہے

دل کی دنیا پہ یہ چھائی ہے اداسی کیسی
گھر کے آنگن میں تو ہریالی ہی ہریالی ہے

گرچہ مفلس ہوں مگر میرا تخیل ہے بلند
پستیوں میں میرا احساسِ جنوں عالی ہے

کیسے اب حال کہوں دورِ ستم کا یارب
سچ کا اظہار تو قاتل کے لیے گالی ہے

شہرِ افرنگ میں عابدؔ ہوں جہاں مدت سے
دھن کی بارش ہے مروت کی قحط سالی ہے



امیر شہر کی ہر بات مان لی جائے
بس ایک میرا لہو ہے سو وہ بھی پی جائے

کچھ اس طرح سے زہر بار یہ فضائیں ہیں
کہ سانس لوں تو مروں روک لوں تو جی جائے

خوشی کے دن ہوں تو سب لوگ ساتھ دیتے ہیں
مزہ ہو ساتھ کوئی کربلا میں بھی جائے

ہمارے جیسے تو لاکھوں یہاں پہ ملتے ہیں
کہ جن کے حرف پہ کل کی سلامتی جائے

غضب کی دھوپ ہے اور پیاس بھی غضب کی ہے
اے شاہِ تشنہ لباں! آ کہ تشنگی جائے

وہ عابدین کی زینت تھے تم فقط عابدؔ
مگر تمہاری حقیقت انہی سے لی جائے

(بریڈفورڈ)

عابد ودود



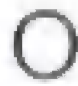
نہ یوں ملو کہ تجھے پھر کبھی بھلا نہ سکوں
نہ یوں جدا ہو کہ خود کو بھی یاد آ نہ سکوں

کچھ اس طرح سے ہے افتاد آ پڑی اب کے
کہ زخم سی لوں مگر پھر بھی مسکرا نہ سکوں

کچھ اب کے بار سلیقے سے وار کر لینا
وہ اس طرح سے کہ میں اور زخم کھا نہ سکوں

نہ جانے کیا ہوں کہاں ہوں سمجھ نہیں آتا
کہ سوچتا ہوں مگر پھر بھی خود کو پا نہ سکوں

وہ پتھروں کے زمانے کا بت شکن عابدؔ
مجھے بھی اس سے ہے رشتہ مگر بتا نہ سکوں



نہ روشنی ہے نہ خوشبو نہ وہ اجالا ہے
یہ کس نے شہر سے وہ نو رتن نکالا ہے

وہ جس نے سوچ کے مفلس کا خوں بہایا تھا
خود اس کے ہاتھ میں اب زہر کا پیالہ ہے

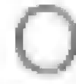
وہ میرے سوچ کے سانچے میں ڈھل نہیں سکتا
وہ جس کو شعر کے سانچے میں، میں نے ڈھالا ہے

گدا کے بدلے سخاوت کے قصیدے لکھوں
یہ میرے شہر کا حاتم بھی کیا نرالا ہے

کسی کو قتل کیا تیغ میرے ہاتھ میں دی
یہ سوچ کر کہ یہ عابدؔ تو بھولا بھالا ہے

(بریڈفورڈ)

شوکت مہدی



محبت سرگراں ہے بخت بھی سونے لگے ہیں
لپٹ کر خود سے ہم بے ساختہ رونے لگے ہیں

وہ جن داغوں سے پیوستہ محبت تھی ہماری
انہی داغوں، انہی زخموں کو اب دھونے لگے ہیں

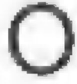
یہ منظر بھی تو ہجرت کے ہے منظر سے مماثل
لئے اسباب کی ہم گٹھڑیاں ڈھونے لگے ہیں

نہ تم آئے نہ سندیسہ تمہارا کوئی آیا
ہمارے رتجگے اب نیند میں کھونے لگے ہیں

ہماری موشگافی کو نہ جانے کیا ہُوا ہے
خیال و خواب کے سب سلسلے کونے لگے ہیں

محبت بھی کچوکوں میں بدل جائے گی مہدی
یہ اب کے کس طرح کے بیج ہم بونے لگے ہیں

جان کاشمیری



بلندی کے کسی منظر سے نیچے آ رہی ہے
عجب دیوار ہے اُوپر سے نیچے آ رہی ہے

قمر، سورج، ستارے ٹھیک ہیں اپنی جگہ پر
مگر ضو اور ہی پیکر سے نیچے آ رہی ہے

مری دستار کو کس کی نظر نے آ لیا ہے
سرکتی ہے، مسلسل سر سے نیچے آ رہی ہے

سہیلی نے سہیلی سے کہا یہ مسکرا کر
خوشی ہے بات کچھ زیور سے نیچے آ رہی ہے

لرزتی، تھرتھراتی، تلملاتی بے ردا سی
ہوا چپکے سے کس کے ڈر سے نیچے آ رہی ہے

خدا کے واسطے ان کو کبھی آنسو نہ کہنا
کوئی حیرت سی چشمِ تر سے نیچے آ رہی ہے

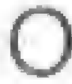
نظامِ وقت پر انساں کا جادو چل گیا ہے
یہ دن کیا، رات بھی محور سے نیچے آ رہی ہے

کہانی قتل کی چپ چاپ لکھتی جا رہی ہے
لہو کی دھار جو خنجر سے نیچے آ رہی ہے

ابھی تک زندگی آدم کی سنت پر رواں ہے
ابھی تک دم بہ دم اُوپر سے نیچے آ رہی ہے

پجارن تو کبھی پوجا سے اکتاتی نہیں جانؔ
غزل کیوں منصبِ دلبر سے نیچے آ رہی ہے

احمد جاوید



اُس آفتابِ غیب کا اصرار ہے یہ مستقل
اچھی طرح دیکھوں گا میں گنجائشِ آفاقِ دل

مجذوب ہے حلاج سا دل دجلۂ مواج سا
یا آتشِ دیرِ قدیم اک بار پھر سے مشتعل

جیسے کہ باراں اور باغ، جیسے کہ بادہ اور ایاغ
جیسے کہ شعلہ اور چراغ، جیسے کہ وحشت اور دل

میں رقصِ درویشی میں تھا، اُس بحرِ خوبی نے کہا
یہ گردِ بادِ دشتِ دل گرداب ہے دریا گسل

دیوانے کو اربابِ صحو، آئی ہے اتنی صرف و نحو
سوزن سے کہتا ہے نہ سی، دامن سے کہتا ہے نہ سل

ضو سے ایاغِ صبح کی، لو سے چراغِ صبح کی
سرمست ہیں، سرشار ہیں، سرگرم ہیں اصحابِ دل

ہر تہ میں غواصی کریں، ہر لے پہ رقاصی کریں
اعماق در اعماق ہے آہنگ در آہنگ دل

ہاں اہلِ دنیا مرحبا، ہم نے بھی آخر کر لیا
چاکِ گریباں کو رفو، زخمِ جگر کو مندمل

حرفیست اندر حرفھا، ژرفیست اندر ازژرفھا
ناگفتہ بالا لب بلب، نادیدہ جوشد دل بدل

یار آمدہ یار آمدہ، صبحِ شبِ تار آمدہ
خورشید انبار آمدہ برکشت رازِ آب و گل

ہم سے خفا خوئی نہ کر، اے ماہ بے روئی نہ کر
اس مرتبہ سامانِ دید ہے صرفِ دل پر مشتمل

زحمتِ فنا کیشی کے ساتھ، اسبابِ درویشی کے ساتھ
سامانِ بے خویشی کے ساتھ خود میں ہوا ہوں منتقل

گرداں ہے دل سیارہ وار اور عشق ہے قطبِ مدار
تبدیلیِ افلاک بھی اس میں نہیں ہوتی مخل

خورشید کی آواز ہے یہ روشنی، اک راز ہے
دیدار پر نامنحصر، اظہار پر نامشتمل

اتنا حسیں کوئی نہیں، ایسا کہیں کوئی نہیں
دیکھا ہے سارا روم ورے، چھانا ہے سب چین و چگل

نسیم عباسی



مرے سفر میں مرا گھر ابھی نہیں آیا
میں راستے سے پلٹ کر ابھی نہیں آیا

اگرچہ کھینچتے ہیں ہم عذابِ دربدری
مگر شعورِ ابوذرؓ ابھی نہیں آیا

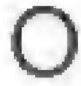
یہ تیز دھوپ عموداً سروں پہ اتری ہے
بدن کا سایہ زمیں پر ابھی نہیں آیا

نہ ماپ اتنے تیقن سے ڈیل ڈول مرا
میں اپنے قد کے برابر ابھی نہیں آیا

ہے چاند رات ابھی مہرباں سفینوں پر
مزید گہرا سمندر ابھی نہیں آیا

شکستہ آئینوں کا دکھ تجھے نہیں معلوم
تری طرف کوئی پتھر ابھی نہیں آیا

نسیمؔ اس لیے باقی ہے تاب آنکھوں میں
جو دیکھنا ہے وہ منظر ابھی نہیں آیا



چہرہ بھی تھا آنکھیں بھی تھیں نابینا نہیں تھا
دیکھا تو مرے سامنے آئینہ نہیں تھا

اس چھت پہ اتر آیا تھا میں بام فلک سے
جس چھت سے اترنے کے لیے زینہ نہیں تھا

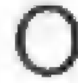
عائد تھی لبِ جو بھی مری پیاس پہ یہ شرط
پانی کسی قیمت پہ مجھے پینا نہیں تھا

ہر شخص کے تھے پیش نظر دوسرے چہرے
خود اپنے خدوخال کا تخمینہ نہیں تھا

وابستہ رہا ہوں میں ترے بعد بھی تجھ سے
قدرت نے تری یاد کا حق چھینا نہیں تھا

دشمن کو نسیمؔ آپ غلط فہمی ہوئی تھی
سچ یہ ہے مرے دل میں کوئی کینہ نہیں تھا

احمد فقیہہ



فقیہِ شہر بتا میرا تجھ سے کیا رشتہ
کہ میں عوام سے دربار سے تُو وابستہ

وہ جس کتاب میں رکھتے ہو تم پرِ طاؤس
اگر میں رکھتا تو اس میں ورقِ دل رکھتا

خدا کو پانے کے یوں تو ہزار رستے ہیں
مگر وہ ایک محبت کی رسم کا رستہ

پرندے شہر کے اڑتے ہوئے کھلونے ہیں
ستم ظریف پرندوں کو کر نہ پر بستہ

ہر اک جدید نے رفتہ سفر کیا ہے مگر
کوئی نہ حرفِ محبت کو کر سکا رفتہ

یہ دل کہ پہلے ہی کم کم تھا اس محبت کو
کہو میں کیسے پھر اس دل میں نفرتیں رکھتا

میں اپنے شہر کی پہچان بن سکا نہ کبھی
میں رنگ پھول سے وہ خونِ دل سے آراستہ

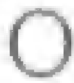
مجھے شہیدِ محبت کہو کہ میں نے بھی
چنا حسینؑ کا مسلک تو قیس کا رستہ

میں جس میں تیری محبت کے پھول رکھتا تھا
کتاب کیا کہ مہکتا ہے اب بھی وہ بستہ

تو ایسے شہر کے لوگوں کو شہر ہی سے نکال
غریبِ شہر کی جن کو، کوئی خبر نہ پتہ

جو باوضو ہیں محبت کے آنسوؤں سے فقیہہ
انہیں کے پیچھے میں پڑھتا نماز اگر پڑھتا

(سویڈن)



وہ جس کی باتوں سے جھڑتے ہیں اب شراب کے پھول
سنا ہے پہلے پسند اس کو تھے گلاب کے پھول

وہ رات جھیل میں کنکر گرا کے کھینچتا ہے
مچلتے پانی کی شاخوں سے ماہتاب کے پھول

ہو جس نگر میں گناہ حسن و عشق کے قصے
کوئی کھلائے وہاں کس طرح ثواب کے پھول

یہ میکدے کا پتہ ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں
نظر جہاں بھی گرائیں اُگیں گلاب کے پھول

ہو جس کا سارا اثاثہ نصابِ عشق کہو
کتابِ دل میں ہوں کیوں اُس کے پھر حساب کے پھول

یہ میری فکر کی جولانیوں کا ثمرہ ہیں
کہ آج بھی ہیں تر و تازہ میرے خواب کے پھول

پکارتے ہیں اسے لوگ اب گلاب گلی
وہ جس گلی میں کھلاتا رہا شباب کے پھول

نشاطِ دِل کی زمینوں پہ دادِ عیش اُگا
یہ گاہے گاہے لگا ان میں اجتناب کے پھول

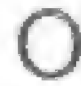
انہیں سوالوں کے پودوں کو سینچنا ہے ثواب
کہ جن کی شاخوں پہ اُگتے نہیں جواب کے پھول

حسین چہروں پہ عمرِ دراز کی شکنیں
کہ جیسے شامِ غریباں میں ہوں گلاب کے پھول

فقیہہ موت ہے برحق سو میرا خواب ہے یہ
کہ وقتِ مرگ میرے ساتھ ہوں کتاب کے پھول

(سویڈن)

نثار ترابی



گنگناتی ہر زباں خاموش ہے
کیوں محبت کا جہاں خاموش ہے

رک گیا ہے راستے میں کارواں
زندگی کا امتحاں خاموش ہے

کیوں نگر کی ہر صدا ہے سوچ میں
کیوں نگر کا ہر مکاں خاموش ہے

منزلوں کی آس ہے ڈوبی ہوئی
راستوں کا ہر نشاں خاموش ہے

کہہ رہی ہے شام کی افسردگی
بستیوں کا مہرباں خاموش ہے

کیوں زمیں یہ خون میں غلطاں ہوئی
کس لیے یہ آسماں خاموش ہے

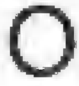
سب سلگتے ہیں اماں ملتی نہیں
امن کا ہر پاسباں خاموش ہے

کیوں ہمارے خواب ہیں ٹوٹے ہوئے
دیس کا ہر اک جواں خاموش ہے

جب سخن کے نام پر محشر نہ ہو
سمجھو حرفِ جاوداں خاموش ہے

کس نے بانٹا ہے لکیریں کھینچ کر
ہجرتوں کی داستاں خاموش ہے

دکھ میں ہے مٹی کا جایا جا بجا
دکھ میں اجڑی دیکھ ماں خاموش ہے



تری طلب ہے، طلب میں زمانہ کچھ بھی نہیں
جو تو ملے تو خوشی کا ٹھکانہ کچھ بھی نہیں

تری رفاقتِ خوش گام ہی سے کھلتا ہے
جو تو نہ ہو تو یہ موسم سہانہ کچھ بھی نہیں

یہ وہ سفر ہے جو کچے گھڑے پہ ہوتا ہے
محبتوں کے سفر میں بہانہ کچھ بھی نہیں

صداقتوں کی ادائیں جدا سی ہوتی ہیں
حقیقتوں کے مقابل فسانہ کچھ بھی نہیں

بدل گئے ہیں وفاؤں کے سلسلے سارے
کہ اب نظر سے کسی کو گرانا کچھ بھی نہیں

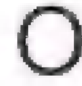
کہوں میں کیسے کہ ہوتا نہیں ملال کوئی
کہوں میں کیسے کہ پیاروں کا جانا کچھ بھی نہیں

لگے گی چوٹ تو میں اس کا حال پوچھوں گا
جو کہہ رہا ہے کہ دل کا لگانا کچھ بھی نہیں

یہ راہِ شوق ہے اس میں تو جاں بھی جاتی ہے
کسی کی راہ میں آنکھیں بچھانا کچھ بھی نہیں

پڑے جو وقت تو سب کچھ نثار کر دینا
یہ کارِ عشق ہے اس میں بچانا کچھ بھی نہیں

رانا ذکا اللہ خان



دامنِ عشق پکڑ کر جو میاں چلنے لگے
دشت میں خواب چراغوں کی طرح جلنے لگے

ایک مہتاب تری یاد کا کیا نکلا ہے
کتنے سورج ہیں مرے ذات میں جو ڈھلنے لگے

ہجر کی کالی سیاہ رات چلی آئی تو
ہم چراغوں پہ ترے نام کا دَم کرنے لگے

وقت نشتر لیے ہاتھوں میں چلا آتا ہے
تری یادوں سے اگر زخم کوئی بھرنے لگے

درد آنکھوں کے جزیروں میں اتر جاتا ہے
ناؤ اشکوں کے سمندر میں اگر چلنے لگے

باندھ رکھا ہے گلے میں ترے غم کا تعویذ
چھو کے آسیب مجھے کانپ اٹھے، ڈرنے لگے

ریت ہی ریت بکھرنے لگی دیواروں میں
سائے صحرا کے در و بام پہ یوں چلنے لگے

یہ شب و روز کہ کچھ اڑتے ہوئے ہنس ذکا
مرے چشمے پہ اتر آئے تھے اور مرنے لگے

آغا نثار



آئینہ مجھ پہ وہ ہُوا ایسے
جل پڑا طاق میں دِیا ایسے
تو نے چوما تھا پھول ہونٹوں سے
بس وہ پتھر مہک اٹھا ایسے
رہ گئی آنکھ بھی خلاؤں میں
رائیگاں ہو گئی دعا ایسے
دان کرنے میں گھر، چلا آیا
دے رہا تھا کوئی صدا ایسے
اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا
جانے والا چلا گیا ایسے
اب تو دیوار کا ہی حصہ ہوں
اس کی دیوار سے لگا ایسے
کانچ بکھرا پڑا ہے پتھر پر
اس کے ہاتھوں سے میں گرا ایسے
لوگ میرا یقین کرنے لگے
مجھ میں تُو بولتا رہا ایسے
تتلیوں سے بھری فضا ساری
اب کے آنچل ترا اُڑا ایسے
آشنا لوگ اجنبی گلیاں
میں کھڑا دیکھتا رہا ایسے
جس کی خوشبو گئی تھی شہروں تک
اب کے صحرا میں گل کھلا ایسے

کلام غالب اور غزل گائیکی

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

میرزا غالب، ہنداسلامی تمدن سے پھوٹنے والا ایک ایسا زندہ استعارہ ہے جو پونے دوسو سال سے زمان ومکاں کی قید سے ماورا بین الاقوامی سطح پر سرگرم عمل ہے۔

ہنداسلامی تمدن کی تشکیل عجمی اور ہندی عناصر سے تھی اور ان عناصر کو اس تمدن سے جڑے مختلف فنون میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس گنگا جمنی تہذیب میں ایک ترکستانی سلجوق مغل بچے کی جڑیں کتنی گہری ہیں، اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ مصوری، خطاطی، فلم، ڈراما، رقص اور گائیکی میں میرزا غالب ہمیشہ مرکز توجہ رہا۔ فنونِ لطیف سے میرزا غالب کی یہ جڑت آج کے طرز احساس سے ہم رشتہ ہے۔ محض اس لیے کہ غالب نے شعرگوئی کی سطح پر راہبوں جیسی ریاضت کے طفیل وقتی شہرت کی طلب سے بے نیاز رہ کر جس نوع کی کرافٹس مین شپ کا مظاہرہ کیا، وہ عدیم المثال ہے۔ کرافٹس مین شپ کے ساتھ موضوع اور خیال کو اہمیت دینا کتنا مشکل کام ہے، یہ کوئی کر کے دیکھے۔ ہر دو سے نباہ کا جتن اور وہ بھی شعری سطح پر، بظاہر پگلے کی پیغمبری ہے وہ یوں کہ شاعری کے برعکس مصوری، خطاطی، موسیقی اور رقص میں تو آزادانہ میلان کے باوجود فن پارے یا کمپوزیشن کو جمالیات کے دائرے میں رکھنا ممکن ہے۔ وہ یوں کہ لکیروں، رنگوں، آہنگ اور لے کاری کو بہرطور خود مختارانہ معروضیت حاصل ہے۔ مصوری اور خطاطی میں لکیر کھینچنے یا رنگوں کے ہر آزادانہ سڑوک یا مصور اور خطاط کے نجی منطقے سے تشکیل پانے والا ہر تجریدیا کیوبسٹک اظہار، بصری سطح پر جمالیاتی تسکین کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی طرح موسیقار اور رقاص کی طے شدہ نظام سے وقتی آزادخرامی، سامع یا ناظر کو بددل نہیں ہونے دیتی۔ نصرت فتح علی خاں جیسے بڑے لے کار کے ہاں کلاسیکل اور نیم کلاسیکل میں مغربی ڈرم بیٹ کی شمولیت، موسیقار اعظم نوشاد کے ہاں بطور خاص کورس میں گیت ترتیب دیتے ہوئے نیم کلاسیکل میں لوک موسیقی کا ورتارا اور عالمی شہرت کے حامل مصور اور خطاط صادقین کے ہاں خطاطی کے طے شدہ اصولوں سے انحراف، اسی آوارہ خرامی کی مختلف صورتیں ہیں لیکن شاعری میں لفظ کے خالص آواز نہ ہونے یعنی علامت ہونے اور مقصد کے حصول کی خاطر ایجادِ بندہ ہونے کے سبب لفظ اتنا آزاد اور خود مختار نہیں۔ لفظ تو قاری یا سامع کے ذہن کو ایک خاص تصور کی جانب ہی لے جائے گا۔ بصورت دیگر لفظ کا لایعنی ورتارا گمراہ کن نتائج سامنے لائیگا۔ یوں لفظ کو وسیلہ بنانے والوں کے لیے مقصد، موضوع اور معنی سے مفر نہیں۔ اس کے باوجود مرزا غالب نے لفظ ہی کے ذریعے وہ کچھ کر دکھایا جس کی خواہش بہت بعد میں ملارمے اور پال والری نے کی۔ (۱)

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آپ نے ملاحظہ کیا کہ غالب نے اپنے عہد کی زوال آمادہ تہذیب کو کیوں کر دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز بنا دیا۔
یہاں کرافٹس مین شپ بھی منتہا پر دکھائی دے رہی ہے اور موضوع وخیال سے جرأت تو قابلِ داد ہے ہی۔ یہ ہے وہ شاعرانہ استعداد جو مرزا غالب کے حصے میں آئی اور جس نے مختلف فنونِ لطیفہ سے جڑے فنکاروں کو غالب کا دیوانہ بنائے رکھا۔
تشکیلی فنون میں ہمیشہ ایک مشترک خصوصیت دیکھی گئی اور وہ ہے حسی تمثال کی۔ مصور کی بنائی ہوئی کسی تصویر یا موسیقار کی تیار کردہ کسی کمپوزیشن کی طرح شعر بھی ایک عدیم النظیر ہیئت ہے جو تمثالوں اور ردھم سے مرکب ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ خارجی ماحول اور شاعر کے باطنی تموج کے انوکھے تال میل یا یوں کہیے کہ زندگی اور محسوسات وتصورات کے بیچ پیدا ہونے والے ربط کی طنابیں گویا نسلِ انسانی کے بطون میں ہیں اور ہمارے باطن میں یہ طنابیں شعری تجربے اور فنونِ لطیفہ کی جرأت ایک سمفنی (Symphony) خلق کرنے میں مددگار رہوتی ہیں۔ یوں بڑا شاعر زندگی کے اجزاء اور اس کے تابع جذبات کو شعر میں ہی نہیں، رنگوں، لکیروں اور سُروں میں بھی زبان عطا کرتا ہے۔ کیرکے گور نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ اپروچ پر بات کرتے ہوئے اسی نوع کے شعری تجربے کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ بے شک جہاں منطق کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں، وہیں سے شاعرانہ خیال کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا
(غالب)

غالب کے ہاں ماضی وحال کی شاعری سے ہی نہیں جملہ فنونِ لطیفہ کے ساتھ بھی ہم عصری کا احساس اور بازآفرینی دکھائی دیتی ہے۔ مطالعۂ غالب کے دوران وزن وآہنگ، لے اور موضوع کے ساتھ ان کی جرأت، بیان کی کیفیت نیز پیکر تراشی اور لفظیات کی جذب اور خیال کے ساتھ مطابقت کے تحت قاری کے بطن میں ویسے ہی مختلف النوع جذبات، کیفیات اور محسوسات جاگتے ہیں جنہیں شاعر نے اپنی شعری تخلیق میں جگانے کا جتن کیا۔ یوں عام قاری کی جگہ جب فنونِ لطیفہ سے متعلق کوئی تخلیق کار غالب کی قرأت کرتا ہے تو اپنے اندر از سرِ نو جاگی ہوئی نفسی کیفیات کو بار دگر تخلیقی عمل میں ڈھالنے لگتا ہے۔
شاعرانہ طبائع کی زبان میں جو قدرتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اُس کے اعادے کے ایک باضابطہ قاعدے اور اس ہم آہنگی کا موسیقی کے ساتھ جو تعلق ہے، اسے ملحوظ رکھنے کے نتیجہ میں لسانی ہم آہنگی کی روایتی صورتوں کا وہ نظام وجود میں آیا جسے شاعر کی ''باطنی لے'' کہہ لیں۔ یوں تال کی سطح پر شاعری اور موسیقی ولے کاری کی جرأت از حد معنی خیز ہے۔
مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو لکھا تھا:

''مُغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔''

اب کون جانے مرزا کے اشعار نے اس ستم پیشہ ڈومنی زیب النساء عرف نواب جان بنتِ شمس النساء کی ادائیگی کے طفیل دلی کے بازارِ حسن کو کس ادا سے لوٹا اور غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران وہاں کے بالا خانوں میں شعر گوئی سے جنون کی حد

تک شغف رکھنے والی طوائفوں کی معرفت کیا کیا دھومیں مچائیں۔ (2)

معلوم سطح پر زہرہ بائی آگرے والی جو استاد عبدالکریم خاں کی ہم عصر تھیں، جب پیدا ہوئیں تو میرزا غالب حیات تھے۔ زہرہ بائی نے دُھرپد اور خیال کے علاوہ ٹھمری اور غزل بھی گائی۔ ان کی ادائیگی شستہ اور بول بانٹ واضح تھے۔ ان کا نام زندہ رکھنے کو یہی بہت ہے کہ استاد فیاض خاں خود کو زہرہ بائی کا خوشہ چیں قرار دیتے تھے اور استاد بڑے غلام علی خاں، زہرہ بائی کی گائیکی کے معترف تھے۔ انہوں نے یقیناً غالب کو بھی گایا ہوگا، پر اُس کا سراغ اب کاہے کو ملے گا۔ اسی طرح گوہر جان کلکتے والی تھیں جنہوں نے راگ ودیا میں نام کمایا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی غالب کو گایا اور یوں یہ سلسلہ کندن لعل سہگل، مختار بیگم، زہرہ بائی انبالے والی، بیگم اختر (اختری بائی فیض آبادی) استاد برکت علی خاں، طلعت محمود، نور جہاں، ثریا، محمد رفیع، ملکہ پکھراج، اقبال بانو، فریدہ خانم، استاد امانت علی خاں، استاد فتح علی خاں، علی بخش ظہور، بشیر علی ماہی، مہدی حسن، اعجاز حسین حضروی، کوثر پروین، سلیم رضا، فردوسی بیگم، غلام علی، زاہدہ سلطانہ، مالا، ذاکر علی خاں، حبیب ولی محمد، نسیم بیگم، ممتاز بیگم، ثریا ملتانیکر، بلقیس خانم، جمیل انجم، شوکت علی، احسان اللہ، پرویز مہدی، روبینہ بدر، غلام عباس، سلیم حسن، پنکج اداس، بھوپندر، سلامت علی، نگہت سیما، گل رعنا، بشیر احمد، رجب علی، ناہید اختر، اعجاز قیصر، مینا لودھی، راجندر مہتہ، مینا مہتہ، مجیب عالم، ارونا لیلیٰ، مظہر علی، چترا، جگجیت سنگھ اور شمو نارائے بسواس، سے ارشد محمود تک چلا آیا ہے۔ (3)

غزل گائیکی کے حوالے سے کلامِ غالب کو سُر کے ساتھ گائے جانے کی یہ پونے دو سو سالہ روایت کچھ کم اہم نہیں اور اس خصوص میں سوائے حضرت امیر خسروؒ کے غالب کا کوئی حریف نہیں۔ استاد برکت علی نے جب غالب کی غزل

آہ کو چاہیے اِک عُمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

گائی تو استاد بڑے غلام علی خاں نے بے تاب ہو کر کہا:

''بکو، مُرکی خوب لگاتا ہے۔''

واضح رہے کہ غزل گائیکی میں خیال سے استفادہ صرف راگ داری کی سطح پر ہوتا ہے اور راگ داری میں سے مُرکی لگانا۔ غزل گائیکی میں مستعمل تو ہے، مستحسن نہیں جبکہ استاد برکت علی خاں نے مستعمل کو مستحسن بنا دیا۔

اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ خیال، غزل گائیکی کی ضد ہے اور خیال کے گائیک، غزل ہی کیا، ٹھمری گیت اور کافی گانے کو بھی ادنیٰ کام تصور کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ گوالیار کے حیدر آبادی انگ کے استاد عبدالکریم خاں، مغل دربار کے آگرہ انگ کے استاد فیاض خاں، پٹیالہ گھرانے کے استاد عاشق علی خاں اور استاد بڑے غلام علی خاں، استاد امیر خاں اور شام چوراسی گھرانے کے استاد سلامت علی، نزاکت علی نے غزل کبھی نہیں گائی۔

غزل گائیکی میں سرگم اور لے کاری کی جا سکتی ہے لیکن حد میں رہ کر۔ غزل کو خیال کا انداز دیتے دیتے جہاں بات حد سے بڑھی تو اساتذہ نے اس کا تمسخر اڑایا ہے لیکن معاملات اتنے پُر پیچ ہیں کہ عام سامع انہیں نہیں سمجھ پاتا۔ نتیجتاً ''آہ'' اور ''واہ'' کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میں نے تو اچھے اچھوں کو اساوری ٹھاٹ اور جونپوری راگ میں فرق کرتے نہیں دیکھا۔

خیال گائیکی کے لیے گلوکار کی آواز میں بھی راگ نبھانے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر استاد نزاکت علی خاں میں اس صلاحیت کی کمی تھی جس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے بھائی استاد سلامت علی خاں کے ساتھ جوڑی بنائی۔ اونچے سُر

سلامت کے اور Base نزاکت کی۔ ایک ایسی Base جیسے کنویں میں سے دکھ کی لہر اٹھ رہی ہو۔ یہی صورت استاد امانت علی خاں اور استاد فتح علی خاں کی جوڑی میں دکھائی دیتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ نزاکت، سلامت نے غزل کبھی نہیں گائی اور امانت، فتح دونوں نے غزل گائیکی میں بھی نام پیدا کیا اور غالب کو بھی گایا۔

ان دونوں ہم عصر جوڑیوں سے قبل استاد بڑے غلام علی خاں اور ان کے چھوٹے بھائی استاد برکت علی خاں نے ہمیشہ الگ الگ گایا۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات، لیکن استاد بڑے غلام علی خاں کے مقابلے میں برکت علی کی آواز خیال گائیکی کے لیے اتنی موزوں نہ تھی۔ البتہ استاد برکت علی کو یہ پتا تھا کہ ان کی آواز کی غم ناکی غزل گائیکی میں کام آ سکتی ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ راگ داری کی تربیت...... لہٰذا انہوں نے مرزا غالب کی غزلوں کی غنائیت سے ہم دوش ہو کر ہر مصرع میں موجود اس لفظ پر توجہ دی جو شعر کا موڈ معین کر رہا تھا اور غالب کو ٹھمری انگ میں گاتے ہوئے غزل گائیکی میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ یوں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ وہ کلاسیکل گانے والے جن کی آوازیں خیال گائیکی کے لیے موزوں نہ تھیں، غزل گائیکی کی طرف آئے۔ غزل گائیکی کو محض روٹی روزی کا بہانہ کہنا سرے سے ایک غلط تصور ہے۔

رسولن بائی، زہرہ بائی آگرے والی، گوہر جان، زہرہ بائی انبالے والی، مختار بیگم، بیگم اختر اور استاد برکت علی تک تو غزل گائیکی کو جے جے ونتی، بھیرویں، راجیشری اور ٹھمری انگ میں گانے کے سبب نیم کلاسیکل کی ایک صنف شمار کیا جاتا رہا لیکن جب کلامِ غالب کو فلم میں برتنے کا وقت آیا تو غزلیں، گیت انگ میں گائی جانے لگیں۔ اب لائیٹ میوزک مقبولیت حاصل کر رہا تھا جس کی اولین مثال محمد رفیع کی گائی ہوئی غالب کی غزل ہے:

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

فلم ساز سہراب مودی نے یہ غزل ۱۹۵۳ء میں اپنی فیچر فلم "مرزا غالب" (تکمیل: ۱۹۵۵ء) کے لیے کمپوز کروائی اور اسی فلم کے لیے طلعت محمود کی گیت انگ میں گائی ہوئی تین اور ثریا کی نیم کلاسیکل میں گائی ہوئی دو غزلوں نے نے غزل گائیکی کو نئی توانائی بخشی۔ ثریا نے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

اور

نکتہ چیں ہے غمِ دل، اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کو نیم کلاسیکل میں گایا تھا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب پاکستان میں بننے والی عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی فیچر فلم "مرزا غالب" کے لیے نور جہاں بھی نیم کلاسیکل اور گیت انگ میں غزل سرا ہوئیں۔ اس کے بعد تو جیسے غزل گائیکی کے ایک نئے سکول نے جنم لے لیا اور اقبال بانو، مہدی حسن، فریدہ خانم، امانت علی خاں، غلام علی اور فتح علی خاں کے نام غزل گائیکی میں اپنے اپنے یکسر منفرد لحن کے ساتھ غالب کے اشعار کی طرح امر ہو گئے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ محمد رفیع، طلعت محمود، ثریا اور نور جہاں نے غالب کی بیشتر غزلیں گیت انگ میں گائی تھیں اور غزل گائیکی کو اس ادبی کام کے ذریعے ایک نئی زندگی مل گئی۔

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ اگر کلاسیکل کے متقدمین اکھڑ تھے تو انہیں چھوڑ یئے، متوسطین بالخصوص استاد عاشق علی خاں، استاد بڑے غلام علی خاں اور روشن آرا بیگم نے غزل گائیکی کو سہارا کیوں نہ دیا؟ استاد عاشق علی خاں دُھرپد سے باہر آئے تو صرف کافی گائی، بڑے غلام علی خاں، خیال سے نیچے آئے تو صرف ٹھمری گائی اور روشن آرا بیگم نے ترانہ اور خیال یا نیم کلاسیکل میں دادرا، ٹھمری اور کجری سوائے تین غزلوں کے۔ آگے چل کر یہی صورت ستر کی دہائی کی پروین سلطانہ کے ہاں دکھائی دیتی ہے جنہوں نے ایک گیت: ''ہمیں تم سے پیار کتنا، یہ ہم نہیں جانتے'' گایا یا مرزا غالب کی صرف ایک غزل:

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے

یقیناً یہ لوگ غزل گائیکی کو اپنے مقام اور مرتبے سے گری ہوئی حرکت شمار کرتے تھے لیکن ایک وجہ اور بھی تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بڑا گائیک یا نصرت فتح علی خاں جیسا بڑا نئے کار غزل کو بخوبی گا بھی سکے۔ یہ بات اگر کلامِ غالب، بالخصوص اردو غزلوں کے حوالے سے کی جائے تو سمجھنا اور بھی آسان ہوگا۔ دیکھیے غالب کے اشعار میں ایک باطنی لَے ہے جسے جس بھی گائیک نے پالیا، وہ اسے عمدگی سے گا گیا۔ بصورت دیگر مشکل۔ غالب موقوف آواز کے بعد وقفہ طلب کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کا مصرع ہے:

ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

اب اسے گاتے ہوئے ''نقش'' کے بعد وقفہ آئے گا۔ ''فریادی'' میں ''فریا'' پر زور ہوگا یا ''دی'' پر زور ہوگا۔ ''ہے'' میں غالب نے ''یے'' گرائی ہے۔ ''یے'' پر رُکیں گے تو غالب کے مصرع کا باطنی صوتیاتی نظام بگڑ جائے گا۔ ''شوخیِ تحریر'' میں ''شو'' کی واو پر رُکیں گے۔ ''تحریر'' میں ''ری'' اور ''کا'' کے الفاظ پر رُکنا از حد ضروری ہے۔ اسی طرح غالب سے مخصوص واول ساؤنڈز کے نظام کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔ مرزا غالب، الف، یے اور واؤ کے استعمال میں اتنے محتاط ہیں جتنا کوئی اور شاعر نہیں۔ مکمل لفظ میں وہ الف کو کہیں نہیں گرائیں گے۔ سوائے حروفِ اضافت کے، غالب نے اسما میں الف کہیں نہیں گرنے دیا۔ یوں موسیقار یا غزل گائیک کے لیے ایک انتباہ ہوا۔ خود غالب نے کہا تھا: ''جہاں الف دبتا ہے، میرے سینے میں ایک تیر لگتا ہے۔'' (4)

یہاں تک کہ غالب نے ایک شعر میں مذکر کو مونث باندھ دیا لیکن الف نہیں گرنے دیا

ع نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

یہاں اگر ''کرتی ہے'' کی جگہ ''کرتا ہے'' رکھا جاتا تو ''کرتا'' کا الف دب جاتا، لہٰذا انہوں نے اپنے شعر کے باطنی صوتیاتی نظام کو مجروح ہونے سے بچانے کی خاطر ''اثبات'' کی جنس ہی بدل دی۔ اس خصوص میں اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں اس نوع کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لاعلمی کے سبب ایسا ہوا ہو تو ہوا ہو۔ یہی سبب ہے کہ غالب کے نکتہ چینوں نے دیگر مقامات پر غالب کی تو پکڑ کی لیکن یہ ایک مقام ایسا ہے جہاں اُن کا ہاتھ نہیں پڑا۔

یوں غالب کو وہی گائیک عمدگی سے گائے گا جو انہیں Standing نوٹس پر گائے، یعنی سُر کو کھڑا کر کے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ غالب کے ہاں ایک باطنی لَے تو ہے لیکن بظاہر موسیقیت کی کمی دکھائی دیتی ہے اور غالب نے بحور میں بھی انتخاب سے کام لیا ہے۔ تیسرا یہ کہ غالب کے اشعار میں سبب اور نتیجہ کی خطِ مستقیم والی نثری منطق (یعنی معنی کا استخراج) ہمیشہ التوا میں رہتی ہے، نتیجتاً غالب کا متن اپنے اجزا کے باہمی ربط کو قدرے تاخیر سے ظاہر کرتا ہے اور جب ہم غالب کی علامات، اضافتوں، اوقاف اور مبتدا سے راہنمائی حاصل کر کے کسی معنی تک پہنچتے ہیں تو ہماری قائم کردہ نثری منطق میں سے کئی طرح کے نئے معنی

جھانکنے لگ جاتے ہیں۔ ایسے میں بطور قاری، گائیک کی اپنی مشکلات ہیں اور موسیقار کی اپنی۔ یوں متن سے مطابقت رکھنے والی کمپوزیشن کیونکر ہو؟ پھر یہ بھی طے ہے کہ کلامِ غالب میں برتا گیا لفظ بہت کھینچ کر یا بہت زیادہ دلتا کر نہ پڑھا جائے اور غالب کی طے کردہ آواز ہی نکلے۔

ماضی بعید میں دلی کے بازار حسن کی ستم پیشہ زیب النساء عرف نواب جان اور دیگر متقدمین کی طرزِ ادائیگی کی کیا صورت رہی، ہمیں نہیں معلوم۔ پر زہرا بائی انبالے والی، بیگم اختر اور مختار بیگم نے نیم کلاسیکل میں غالب کو Standing نوٹس پر گایا اور غزل گائیکی کے قدیمی شکوہ کے ساتھ۔

زہرا بائی، بیگم اختر اور مختار بیگم، حد درجہ شعر فہم اور کلاسیکل گانے والیاں تھیں۔ لفظ کے معنی کی پرکھ نیز سُر کی نشست و برخاست کا قرینہ تھا، اس لیے غزل کے نفسِ مضمون سے مطابقت رکھنے والی دُھنیں کمپوز کر سکتی تھیں۔ بیگم اختر کی آواز کٹیلی تھی جو عام طور پر غزل گائیکی میں بے رس ہو جاتی ہے لیکن وہ بے رس نہیں تھیں۔ زہرا اور بیگم اختر دونوں کی آواز پر دُکھ کا ایک سایہ سا تیرتا رہتا تھا جو غزل گائیکی کی ضرورت ہے جبکہ مختار بیگم جیسا کھرا گلا تو صدیوں میں جنم لیتا ہے۔

استاد برکت علی نے نیم کلاسیکل کے ٹھمری انگ میں سُروں کو ہلکا سا لٹا کر گایا تھا اور یہی صورت طلعت محمود کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ طلعت محمود کی آواز کا بُر چھوٹا تھا لیکن غزل گائیکی میں جچ گیا۔ ان کی آواز میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ تھی جو سلیل چودھری کو بھا گئی اور یوں فلم ''ایک گاؤں کی کہانی'' کا ناکام ہیرو بڑا غزل گائیک بن گیا۔

ثریا نے دو ایک غزلوں خصوصاً ''نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے'' کھڑے نوٹس پر گائی یا ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا'' گاتے ہوئے فلمی گیت انگ اور کلاسیکل کو یکجا کر دیا۔ ثریا کی آواز میں ایک خاص طرح کا لوچ تھا جو غالب کی ان غزلوں سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس کے بعد نور جہاں جیسی بے مثل گائیکہ نے غالب کو گایا۔

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

گاتے ہوئے ان کی آواز کی کوالٹی اور جتنا عبور انہیں کلاسیکل پر تھا، اب دیکھنے کو کہاں ملے گا۔ یہ غزل کا مجرہ انگ تھا اور اسی انگ میں اقبال بانو کے ہاں انترہ، ردم فری ہے اور استھائی ردم میں جبکہ الفاظ کی ادائیگی کھڑے نوٹس پر کی گئی ہے۔ اسے غزل گائیکی کے قدیم اور جدید میتھڈ کا شاندار امتزاج کہنا چاہیے۔ سمعی سطح پر تفہیم غالب سے متعلق مُحولہ بالا مشکلات پر قابو پانے کے لیے فریدہ خانم نے ایک الگ راہ نکالی۔ اس نے گیت اور ٹھمری انگ سے آزاد ہو کر After Beat گایا اور غالب کی غزل کے داخلی آہنگ کا دائرہ مکمل کر کے بہلاووں کے ساتھ غزل گائیکی کو ایک نیا انداز دیا۔ عہد موجود میں یہ سبھاؤ صرف گلبہار بانو، نیرہ نور اور ٹینا ثانی کے ہاں دکھائی دیتا ہے اور اس کی متضاد صورت ماضی میں کندن لعل سہگل نے غالب کو گاتے ہوئے پیش کی۔ سہگل نے غزل گاتے ہوئے گیت گائیکی کا پرانا انگ برتا اور وہ بھی الفاظ کی غیر مانوس ادائیگی کے ساتھ لیکن وہ دور سہگل کا تھا، نکتہ چینی کا کسے یارا تھا؟

ماضی میں استاد برکت علی نے غالب کی غزلیں ٹھمری انگ میں سُروں کو ہلکا سا لٹا کر گائی تھیں اور یہی صورت ان کے کیمپ فالوورز خصوصاً علی بخش ظہور، بشیر علی ماہی اور غلام علی کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ استاد برکت علی سے مخصوص انگ میں گانے والے علی بخش ظہور، بشیر علی ماہی اور غلام علی سُریلے تھے، پھر یہ کہ کھرے گلے اور سینے سے گاتے تھے۔ ان تینوں میں سے غزل کو مدھ لے میں ٹھاہ دُونی کی نیرنگی، باریکی اور تیاری کے ساتھ گانے والا غلام علی بڑا ٹیلنٹ تھا جسے غزل گانے کے دوران تانیں لگا

کر اتنخ پر دادطلبی نے مار دیا۔ استاد برکت علی اوران کے کیمپ فالوورز کی سواسپتک پر محیط طرز ادا کا ایک اپنا مزا ہے لیکن یوں ہی ایک وہم سا ہے کہ شاید یہ سب مرزا غالب کے لیے ناگوار خاطر ہی ہوتا۔ ان کے شعر کے باطنی صوتیاتی نظام کے بگاڑ کے سبب شاید یہی معاملہ پٹیالہ گھرانے کے استاد امانت علی خاں کے ساتھ بھی پیش آتا جنھوں نے غالب کی غزل Standing نوٹس پر گائی، لیکن غالب کے واول ساؤنڈز کی پروا کیے بغیر جبکہ ان کے چھوٹے بھائی استاد فتح علی خاں نے درست تلفظ کی ادائیگی کے ساتھ جہاں غالب کی قائم کردہ باطنی لے کا خیال رکھا وہیں غالب کے واول ساؤنڈز والی خوبی کو بھی برتا۔ اس کی بہترین مثال ہے غالب کی غزل

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے

طرہ یہ کہ استاد فتح علی خاں کی آواز کا گرام اور کھرج..... غزل گائیکی میں لتا منگیشکر اور بھوپندر کی آواز میں گائے گئے غالب کی غزل کے صرف ایک شعر کی مثال بالکل انوکھی ہے:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

یہاں گیت انگ میں گاتے ہوئے لے کاری کا مظاہرہ کیا گیا جس پر کلاسیکل سے شغف رکھنے والے بے شک ناک بھوں چڑھائیں، پر اُس کا لطف عجیب سا ہے۔ یہ سب تو ہوا پر غالب کی غزل گانے میں مہدی حسن سب سے بازی لے گئے۔ مہدی حسن کے ہاں نیم کلاسیکل میں غالب کی غزل سے مخصوص واول ساؤنڈز کے نظام اور غالب کی اپنی پیدا کردہ داخلی لے حیران کن ہے۔ بالخصوص بلمپت لے میں آکار کا سبھاؤ خصوصی عطا ہے کلامِ غالب کے بغور مطالعہ کی۔ لیکن اس کے برعکس بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو ملا۔ ملکہ پکھراج پہاڑی انگ میں اپنی سنگلاخ آواز کے ساتھ وہ تاثر نہ دے سکیں جو ان کے مقام و مرتبے کا متقاضی تھا۔ اسی طرح کلاسیکل کی تربیت کے ساتھ سریلے ہونے کے باوجود کوثر پروین، زبیدہ خانم، شاہدہ پروین، حامد علی خاں، بلقیس خانم، ذاکر علی خاں اور مہدی حسن کے شاگردانِ خاص پرویز مہدی، رجب علی اور غلام عباس کلامِ غالب کی ادائیگی میں ناکام رہے۔ فردوسی بیگم، منی بیگم، اخلاق احمد، اروی لیلیٰ، بشیر احمد اور شمونا رائے بسواس کا بنگالی سکول بھی اس حوالے سے بے رس ثابت ہوا جبکہ حبیب ولی محمد، نسیم بیگم، مالا، روبینہ بدر اور دیگر تو خیر تھے ہی سنگل ٹریک، ٹائپ گانے والے۔

اعجاز حسین حضروی، لفظ کی ادائیگی کے حوالے سے اپنی نوع کے اکلوتے گلوکار تھے اور سُر میں بھی بہت تھے، پر آواز کی کوالٹی نہ ہونے کے سبب وہ بھی ناکام رہے۔ اسی طرح گلزار کی ٹیلی سیریل "مرزا غالب" کے لیے چترا اور جگجیت کی گائی غالب کی تمام غزلیں، گیت اور ٹھمری انگ میں بس گوارا ہی کہی جا سکتی ہیں۔ یہی صورت سٹی بینک آف پاکستان کی جانب سے نیم کلاسیکل میں غالب کی غزلیات پر مشتمل سی ڈی کی تھی جس میں غزل گائیکی کے یکسر غیر مانوس انداز کے ساتھ ارشد محمود کی بے رس آواز سننے کو ملی۔ یہ اتنے سارے لوگ کیونکر ناکام رہے، اس پر حیرت ہوتی ہے جبکہ مرزا غالب تو گائیک کی خود راہنمائی کرتے ہیں اور کلامِ غالب سے متعدد داخلی اور خارجی شہادتیں ملتی ہیں کہ شاعر موسیقی کے جملہ اسرار و رموز سے واقف ہے۔ چند خارجی شہادتیں دیکھیے۔

ع محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ع ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

میں ہوں اپنی شکست کی آواز (5)　　نے گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

یہ تو ہوئیں خارجی شہادتیں۔ اس کے ساتھ ہی ملا کر دیکھیے ملائم آوازوں کے حروف ر۔س۔ن۔م اور ل کے استعمال کا ڈھنگ:

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یا اسی ردیف اور قافیہ کی ایک اور غزل ہے:

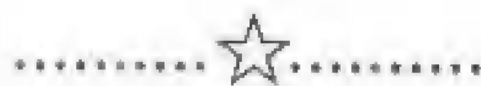
وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے　　جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

آخر الذکر شعر میں "سحر" کی "ر"، "رواں" کی "ر" اور "سراب" کی "ر"..."سحر" کی "س"، "سفینہ" کی "س" اور "سراب" کی "س" توجہ کی طالب ہے۔ کمال یہ ہے کہ ان اشعار میں تصویریت بھی ہے اور کومل آوازیں بھی۔ اب ایک داخلی شہادت دیکھیے:

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ تجربہ ہی ایک اعلیٰ درجے کے کن رس کا ہے۔ ظاہر ہے ایک عامی کے ہاں یہ کیفیت کب ملے گی کہ موسیقی کی سماعت کے وقت تن سے جان نکل رہی ہو۔ جان تو اُس کی نکلے گی جو بلا کا کن رس ہو یا موسیقی کے جملہ اسرار و رموز سے واقف۔

ٹی ایس ایلیٹ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ ہر جوہر خاص جب ہم عصری اور روایت کے شعور کے ساتھ کوئی نیا فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو بیک وقت نئے اور پرانے شاہکاروں کی ازلی و ابدی زنجیر کی کڑیوں میں ترمیم اور تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یوں ہر نیا جوہر خاص حال اور مستقبل پر تو اثر انداز ہوتا ہی ہے۔ پر ماضی بھی وہ ماضی نہیں رہتا جیسا کہ پہلے دکھائی دیتا تھا۔ آج کلامِ غالب اور غزل گائیکی کے اس ربطِ خاص کے طفیل خیال اور نیم کلاسیکل کے بڑے بڑے گائیک پس منظر میں چلے گئے اور ہم نے ایک ستم پیشہ ڈومنی نواب جان، زہرہ بائی آگرے والی، گوہر جان کلکتے والی، مختار بیگم، استاد برکت علی اور بیگم اختر کو یاد کر لیا۔



حواشی:

(۱)　ملارمے کے خیال میں شاعری، موضوع یا خیالات سے نہیں الفاظ سے تشکیل پاتی ہے اور پال والری نے شاعرانہ جدوجہد کا ماحصل کرافٹس مین شپ یعنی طریقہ کار کی تلاش قرار دیا۔ تخلیقی عمل میں لفظ کے حق میں اس قدر جابرانہ فیصلے صادر کرتے ہوئے ملارمے نے اپنی شعری کائنات خلق کرنے کو علامتوں کا ایک نظام مرتب کیا اور موضوع و خیال کو پس پشت ڈال کر لفظ کی معرفت نئے شعری تصورات پیش کیے جبکہ پال والری کے خیال میں طریقہ کار ہاتھ آ گیا تو سمجھیے فنکار کے لیے فن پارے کی تخلیق بھی ضروری نہیں رہی۔ گویا کرافٹس مین شپ ہی اسم اعظم قرار پائی۔

(۲)　مرزا ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے۔ شملہ بازار میں قیام کیا۔ باقی جو کچھ ہوا سو ہوا۔ غالب تادیر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہتے رہے:

ع　کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

(۳) بیگم اختر (اختری بائی فیض آبادی) کی آواز میں غالب کی دو غزلیں۔ مخزونہ۔ ریڈیو پاکستان، لاہور میوزک لائبریری

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

O

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

استاد برکت علی خاں کی گائی ہوئی غالب کی پانچ غزلیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

O

وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

ملاحظہ ہو آڈیو کیسٹ ''استاد برکت علی خاں'' لوک ورثہ اشاعت گھر، اسلام آباد، پاکستان
(اشاعت ثانی: ۱۹۸۷ء) بقیہ تین غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہیں جن کی تفصیل درج ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی

O

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے

O

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

طلعت محمود کی گائی ہوئی تین غزلیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

(برائے فلم ''مرزا غالب'' (۱۹۵۵ء)

ملکہ پکھراج کی آواز میں غالب کی دو غزلیں: مخزونہ ریڈیو پاکستان، لاہور میوزک لائبریری۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

O

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے

(موسیقی: کالے خان)

اقبال بانو کی آواز میں درج ذیل دو غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں۔

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے

O

مدت ہوئی یار کو مہماں کیے ہوئے

فریدہ خانم کی آواز میں غالب کی پانچ غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

O

بیا جوشِ تمنا دیدۂ نم
(فارسی)

O

پھر اس انداز سے بہار آئی
(موسیقی: استاد نذر حسین)

O

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
(موسیقی: حسن لطیف)

O

ہم پہ جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
(موسیقی: ماسٹر منظور)

استاد امانت علی خاں کی آواز میں غالب کی درج ذیل چھ غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ کہ وصال یار ہوتا

O

مزے جہان کے میری نظر میں خاک نہیں

O

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں

O

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

O

تابم ز دل بردا کافر ادائے
(فارسی)

O

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

علی بخش ظہور کی آواز میں اب غالب کی صرف درج ذیل ایک غزل ریڈیو پاکستان، لاہور کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے

مہدی حسن کی آواز میں غالب کی درج ذیل چار غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

O

عرضِ نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

O

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

O

کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اعجاز حسین حضروی کی آواز میں غالب کی تین غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں:

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

O

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

O

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

کوثر پروین کی آواز میں غالب کی دو غزلیں محفوظ ہیں ریڈیو پاکستان، لاہور میوزک لائبریری۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

O

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

سلیمہ رضا کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے

ثریا ملتانیکر کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

خورشید بیگم کی آواز میں غالب کی چار غزلیں:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

(موسیقی: حسن لطیف)

O

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

(سنگت: اختر علی)

O

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

O

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

نذیر بیگم کی آواز میں غالب کی چار غزلیں

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

O

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں

O

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

O

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے

حبیب ولی محمد کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

نسیم بیگم کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

فردوسی بیگم کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

پھر اس انداز سے بہار آئی

مالا کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

کہوں جو حال تو کہتے ہیں مدعا کہیے

منیر حسین کی آواز میں غالب کی دو غزلیں:

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں

O

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
(موسیقی: اختر علی)

نگہت سیما کی آواز میں غالب کی دو غزلیں:

پھر اس انداز سے بہار آئی

O

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

سلامت علی کی آواز میں غالب کی پانچ غزلیں

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

O

آئینہ کیوں نہ دوں، کہ تماشا کہیں جسے

O

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا

O

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

O

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

غلام عباس کی آواز میں غالب کی تین غزلیں:

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیا ہے

O

منظور تھی جو شکل تجلی کو نور کی

(موسیقی: کالے خان)

O

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور

سلیم حسن کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

بسکہ بہ خونش جادۂ
(فارسی)

بلقیس خانم کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

ذاکر علی خاں کی آواز میں غالب کی ایک غزل

گھر جب بنا لیا تیرے در پر کہے بغیر

روبینہ بدر کی آواز میں غالب کی دو غزلیں:

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا

(موسیقی: حسن لطیف)

O

میں ہوں مشتاق جفا، مجھ پہ جفا اور سہی

(موسیقی: ماسٹر طفیل)

بشیر احمد کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو

مینا لودھی کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

اروناً لیلی کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

حبیب عالم کی آواز میں غالب کی ایک غزل

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

پرویز مہدی کی آواز میں غالب کی تین غزلیں:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

O

سر چشمہ ای خونست ز دل تابہ زباں
(فارسی)

O

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا

رجب علی کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

وارستہ اُس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

شوکت علی کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

اب بھی کچھ دل کو بے قراری ہے

زاہدہ سلطانہ کی آواز میں غالب کی ایک غزل

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے

(موسیقی: وزیر افضل)

ناہید اختر کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

ممتاز بیگم کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے

جمیل انجم کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں

گلِ رعنا کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

(موسیقی: محمد صادق)

اعجاز قیصر کی آواز میں غالب کی ایک غزل:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

مظہر علی کی آواز میں غالب کی دو غزلیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

O

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

سلیم رضا تا مظہر علی کی تمام غزلیں ریڈیو پاکستان، لاہور کی میوزک لائبریری میں محفوظ ہیں۔ مودی ہاؤس، بھارت کی تیار کردہ ٹیلی

سیریل ''مرزا غالب'' پروڈیوسر: جے۔ سنگھ، ہدایات: گلزار۔ تکمیل: ۱۹۸۹ء کے لیے چترا سنگھ نے جگجیت سنگھ کی موسیقی میں غالب کی درج ذیل غزلیں گائیں:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

O

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

O

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

O

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا

O

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی

O

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

O

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا

اسی ٹیلی سیریل کے لیے جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غالب کی غزلیات درج ذیل ہیں:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں

O

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

O

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

O

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

O

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

O

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

O

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

O

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا

O

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

O

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

O

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

چترا اور جگجیت سنگھ کی آواز میں غالب کی غزلیات کے دو آڈیو کیسٹیں دستیاب ہیں۔ شمونا رائے بسواس نے غزل گائیکی کے قدیم اور جدید انگ میں غالب کی متعدد غزلیں ۱۳ فروری ۱۹۹۹ء کی شام نیشنل میوزیم، نئی دہلی میں پیش کیں جنہیں عین رشید نے محفوظ کر لیا تھا۔ عین رشید نے کثرتِ مے نوشی کے سبب کلکتہ میں انتقال کیا۔ اب کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ شمونا رائے بسواس کی گائی ہوئی وہ غزلیں کب منظرِ عام پر آتی ہیں۔ مجرا رنگ کی غزل گائیکی تھی۔ میں اُس موقع پر وہاں موجود تھا۔

غلام علی کی گائی ہوئی غالب کی درج ذیل غزلیں آڈیو کیسٹس محفوظ ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا

O

کی وفا ہم سے تو

O

تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا

O

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

O

وارستہ اُس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو

O

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں

O

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

O

چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے

O

ہے جستجو عبث جو تری

(4) دیکھیے، مکتوب بنام منشی میاں داد خاں سیاح۔

(5) نسخۂ نظامی (۱۸۶۲ء) میں "نے" کی بجائے "نہ" ملتا ہے۔

..........☆..........

ندیم نظم:

"جرسِ کارواں"

جرسِ کارواں کی موسیقی
کارواں کے خرام کی غماز
جرسِ کارواں کی خاموشی
کارواں کے قیام کی غماز
جرسِ کارواں کی نالہ زنی
سفرِ ناتمام کی غماز

نہ ترنم ملا، نہ سناٹا
نہ مقدر میں نالۂ شب تھا
جرسِ کارواں کے منتظرو!
چاپ قدموں کی سن سکو تو سنو
یہ کروڑوں نقوشِ پا، یہ گلاب
اپنی نظروں سے چن سکو تو چنو

("شعلۂ گل"......احمد ندیم قاسمی ۱۹۵۱ء)

ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم

تحریر و تحقیق: شبنم شکیل

برصغیر کی گانے والی خواتین میں خصوصاً کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کا نام ممتاز ترین ہے۔ کیرانہ گھرانے کے عظیم استاد خان صاحب عبدالکریم خان کی بے مثال تربیت اور اُن کی انتھک محنت اور خداداد صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ وہ نوعمری ہی میں بڑے بڑے استادوں کے برابر گانا گانے لگیں اور تمام عمر اُن کی یہ حیثیت مسلمہ رہی۔ اس میں کوئی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے استاد عبدالکریم خان اور اپنے رشتے دار جو کہ موسیقی کے ماہر تھے، استاد عبدالوحید خان کی وفات کے بعد صحیح معنوں میں ان لوگوں کے فن کی جانشین ثابت ہوئیں۔ ان کے استاد کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا۔ روشن آرا نے اگرچہ ان کا بہت غم کیا لیکن ان کو ایک بات کا اطمینان تھا کہ کلکتے میں جو میوزک کانفرنس ۱۹۳۴ء میں ہوئی، اس میں انہیں ملکۂ موسیقی کا لقب دے دیا گیا تھا اور استاد اس پر بہت خوش ہوئے تھے۔ راگ داری کی جو روایت ان تک پہنچی وہ سُروں کی پاکیزگی اور پُر خیال تان کاری سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنے گلے کی قدرتی نرمی کا بہت خوبصورت استعمال کیا، وہ تینوں سپتک حیرت انگیز آسانی اور سہولت سے گاتی تھیں۔ یہ وصف بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوا۔

قارئین! اس سے پہلے کہ ہم اُن کی زندگی کے حوالے سے کوئی بات شروع کریں، ہم ان کی شخصیت اور ان کے فن کے درمیان جو ایک پراسرار قسم کا ربط تھا، اس کا ذکر کرنا بہت اہم تصور کرتے ہیں اور اسے سب لوگ محسوس کرتے ہیں۔ ایسا ہے کہ ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کو خصوصی طور پر ان راگوں سے بہت محبت تھی جو عرفِ عام میں صبح کے راگ کہلاتے ہیں جیسے جونپوری، للت، بہارہ بھٹیار، آنندی، شنکرا اور بھیروں وغیرہ ان سے انہیں خصوصی محبت تھی۔ گو انہوں نے دوسرے کلاسیکی راگ مثلاً ٹھمری، میاں کی ٹوڈی، شدھ کلیان، کدارا، کاموود وغیرہ بھی گائے۔ آپ کو صبح کے راگوں کے حوالے سے ایک انوکھی اور منفرد بات بتانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ان راگوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ سب حقانی راگ ہوتے ہیں جیسا کہ ممتاز موسیقار خواجہ خورشید انور نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ''یہ تمام حقانی راگ وہاں استعمال کیے جاتے ہیں جہاں عبادت کا حوالہ ہوتا ہے۔'' مثلاً آپ تمام بھجنوں کو دیکھ لیجیے جو صبح کے وقت گائے جاتے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک میں اذان بھی اسی الحان میں ترتیب دی جاتی ہے۔

ملکۂ موسیقی اگر ان راگوں کو پسند کرتی تھیں تو اس سے ان کی درویشانہ اور پاکیزہ طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ روشن آرا بیگم کی باری سب سے آخر میں آتی تھی اور جب وہ گانا شروع کرنے والی ہوتیں تو صبح طلوع ہو رہی ہوتی تھی۔ کیا دونوں باتیں روشنی کی علامت نہیں کہلائیں گی؟ سچ پوچھیے تو ان کا گانا سننے والوں اور دیکھنے والوں کے لیے ایک جمالیاتی

مشاہدہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ راگ کو ایک دیوی اور مورتی کے طور پر لے کر اس کے سنگھار میں لگ جاتی تھیں۔ اس سارے عمل میں ان کے چہرے کی آسودگی قابلِ دید ہوتی تھی۔ یہاں وہ مکمل طور پر مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کے اس شعر کی تفسیر بن جاتی تھیں:

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

صبح کے روشن ستارے جیسی یہ خاتون روشن آرا بیگم ۱۹۱۵ء میں کلکتے کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالحلیم اور والدہ چندا بیگم کانپور سے آ کر پٹنے میں آباد ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو موسیقی سے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بہر حال روشن آرا کی ایک خالہ جو وہیں کلکتے میں رہتی تھیں اور جن کا نام عصمت بیگم تھا، انہیں اپنی نومولود بھانجی اتنی پیاری معلوم ہوئیں کہ انہوں نے اسے ان کے والدین سے مانگ لیا۔ یوں روشن آرا کی پرورش کلکتے میں ان کے ہاں ہونے لگی۔

شروع میں ان کا نام وحید النساء رکھا گیا مگر جب وہ فلموں میں آئیں تو روشن آرا نام رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اسی نام سے پہچانی گئیں۔ عصمت بیگم نے ان کی آواز کی خوبصورتی اور ان کا شوق دیکھ کر انہیں موسیقی کی تعلیم دلوانا شروع کی تھی۔ شروع شروع میں ان کے رشتے کے ایک بھائی جو کلکتے میں ایک میوزک ماسٹر تھے، جن کا نام لڈن خان تھا، وہ انہیں موسیقی کی تعلیم دیتے رہے مگر نو برس کی عمر میں خود روشن آرا نے اپنی والدہ سے کہا کہ اب ان کی باقاعدہ تعلیم شروع کر دی جائے اور میری بسم اللہ کی رسم ادا کر دی جائے۔ اب اس ذوق و شوق کو علامہ اقبال کے ایک مصرعے میں یوں بیان کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

گویا کہا نہیں جا سکتا کہ یہ سب کچھ قدرت سکھاتی ہے یا تربیت۔

بہر حال وہ تیرہ برس کی تھیں جب ان کے ایک استاد بہادر خان نے بمبئی سے آ کر انہیں استاد عبدالکریم کے فن سے متعلق حیرت انگیز باتیں سنائیں کہ ان جیسا استاد کوئی نہیں، لوگ ان کا گانا سن کر رو پڑتے ہیں۔ روشن آرا یہ سن کر ایسی بے قرار ہوئیں کہ فوراً اپنی خالہ جو ان دنوں بمبئی میں تھیں، ان کے پاس چلی گئیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے کسی ذریعے سے اپنی شاگردی کی بات چلوائی مگر استاد عبدالکریم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دینے سے موسیقی کا نقصان ہوتا ہے کیونکہ وہ شادی کے بعد راگ داری چھوڑ دیتی ہیں۔ خوبیِ قسمت سے اس عرصے میں روشن آرا موسیقی کے حوالے سے بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ انہیں آل انڈیا ریڈیو سے میوزک کے پروگرام ملنے لگے تھے۔ لوگ ان کی آواز کے اتنے گرویدہ تھے کہ ریڈیو پر ان کا گانا سنتے ہوئے پھول نچھاور کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں انہیں فلموں میں کام کرنے کی بھی پیشکش ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے کچھ فلموں میں ہیروئن اور سائیڈ ہیروئن کا کردار ادا کیا اور ان کے گانے بھی گائے۔ ''جگنو'' فلم کا گانا ''دیس کی پر کیف رنگیں سی فضاؤں میں کہیں'' بہت مشہور ہوا۔ اس کا میوزک فیروز نظامی نے دیا تھا۔ اس کے علاوہ نورِ اسلام، وطن پرست، جیلر، بھروسا، پروانہ اور پکار کے گانے بھی انہوں نے گائے۔

انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ انہوں نے فلم گلنار میں ایک راگ گایا جس کی بنیاد راگ شنکرا پر رکھی گئی تھی ''دو رنگ بھرے نینوں کی قسم'' یہ فلم مثنوی ''زہرِ عشق'' کی کہانی پر بنائی گئی تھی جسے قالب میں سید امتیاز علی تاج نے ڈھالا تھا۔ ''قسمت'' فلم میں ''البیلے نیناں'' راگ بروا میں گایا۔ روپ متی باز بہادر جس کی کہانی سید عابد علی عابد نے لکھی تھی، اس کا ایک گانا استاد شکن کے ساتھ گایا۔ ''تم رکھیو پربھو موری لاج'' ان سب میں خیال کی موسیقی کا انداز غالب تھا۔ ۱۹۶۱ء میں بننے والی اس فلم کو بہترین

میوزک پر ایوارڈ دیا گیا اور ملکۂ موسیقی کو طلائی تمغے سے نوازا گیا۔ ظاہر ہے جب ٹی وی شروع ہوا تو وہاں سے بھی گاتی رہیں۔

اعزازات تو انہیں بہت سے دیے گئے جن میں پرائڈ آف پرفارمنس اور ستارۂ امتیاز شامل ہے مگر در اصل اُن کا فن ہی ان کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ ہم اس وقت ان کی زندگی کی اصل کہانی سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ ہوا یہ کہ جب انہوں نے فلموں میں گانا شروع کیا تو خوش قسمتی سے استاد عبدالکریم خان نے فلم ''وطن پرست'' کا ایک دادرا جو روشن آرا نے گایا تھا، وہ سن لیا اور بے حد خوش ہوئے اور خود انہیں بلوا بھیجا حالانکہ پہلے وہ انکار کر چکے تھے۔ ان دنوں استاد عبدالکریم خاں کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے کئی میوزک سکول تھے جن میں وہ کئی ہونہار لوگوں کو تعلیم دیتے تھے مگر طبیعت کے لحاظ سے وہ ایک فقیر تھے اور موسیقی کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

قارئین! اس کے بعد ایک سخت ریاضت، محنت اور لگن کا دور شروع ہوا۔ روشن آرا نے استاد کے کہنے پر فلموں میں کام کرنا چھوڑ دیا اور پوری ایمانداری اور خلوص سے اپنے استاد عبدالکریم خان سے تیرہ سال تک تعلیم حاصل کی اور پوری توجہ فن پر رکھی۔ ان کی یہ ریاضت چالیس برسوں پر محیط ہے۔ اس تعلیم کے دوران انہوں نے استاد کی چلمیں بھرنے کا فریضہ بھی ادا کیا تا کہ ان کے دل سے ہر قسم کا غرور نکل جائے۔

کہتے ہیں کہ استاد عبدالکریم نے انہیں ایسے شوق سے تعلیم دی کہ اپنی ہونہار شاگرد کو کندن بنا دیا اور اسے اپنی روح کہنے لگے تو ان کی یہ پیش گوئی بھی غلط ثابت ہوئی کہ مسلمان لڑکیاں شادی کے بعد موسیقی کی تعلیم ضائع کر دیتی ہیں۔

۱۹۳۴ء میں روشن آرا بیگم نے بمبئی میں ملازمت کرنے والے ایک پولیس آفیسر چوہدری احمد خاں سے شادی کر لی۔ شادی کے لیے ہاں کرنے سے پہلے انہوں نے چوہدری صاحب کے سامنے ایک ہی شرط رکھی کہ وہ اسے راگ داری سے نہیں روکیں گے۔ چوہدری احمد خاں نے بھی انہیں کبھی راگ داری سے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ حوصلہ افزائی کرتے رہے اور روشن آرا تمام میوزک کانسرٹس میں بھی گاتی رہیں اور ریڈیو پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہیں۔

۱۹۴۷ء میں وہ بمبئی سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئیں اور اپنے شوہر احمد خان صاحب کے ساتھ لالہ موسیٰ جیسے قصبے میں جو کسی بھی کلچرل سینٹر سے بہت دور تھا، چونتیس برس تک رہیں۔ ممتاز شاعرہ اور ادیب کشور ناہید کہتی ہیں ''ایک دفعہ جب حجاب امتیاز علی ٹرین میں سفر کر رہی تھیں تو لالہ موسیٰ اسٹیشن پر اچانک جذباتی ہو گئیں اور کہا کہ اس اسٹیشن کا نام تو روشن آرا بیگم ہونا چاہیے۔'' کشور ناہید روشن آرا پر ترتیب دی ہوئی کتاب کے دیباچے میں کہتی ہیں کہ سید عابد علی عابد نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''روشن آرا بیگم کی آواز اور سارنگی کی آواز میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کہاں سارنگی ختم ہوئی اور روشن آرا بیگم کی آواز شروع ہوئی۔ یہ ایک لازوال آواز ہے، بے مثال آواز ہے۔'' وہ خود کہا کرتی تھیں کہ جب وہ گاتی ہیں تو راگ کا ایک ہیولہ ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ باقی سب دنیا غائب ہو جاتی ہے۔ ان کی آواز میں ایک رومانی اپیل بھی تھی، لوگ اسے سن کر ایک تصوراتی دنیا میں چلے جاتے تھے۔ جب ریڈیو پر انہوں نے یہ گانا گایا ''جھولنا جھلا دے آئی رُت ساون کی'' تو موسیقی کے کئی ماہرین نے کہا کہ ''ایسا لگا جیسے آسمان بادلوں میں گھر گیا ہے۔'' اس حوالے سے ایوب رومانی جو ریڈیو پر میوزک پروگرام کے انچارج تھے، انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ ایک مرتبہ روشن آرا بیگم کا ایک لائیو پروگرام جو صرف پندرہ منٹ کا تھا، مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ لائیو پروگرام کے دوران ایسا ہونا ایک جرم سمجھا جاتا تھا مگر خود اسٹیشن ڈائریکٹر ایسے مدہوش ہوئے کہ انہیں بھی کچھ یاد نہ رہا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی لوگ سناتے ہیں کہ ایک میوزک کانفرنس میں کسی نے ان سے حسد

کی وجہ سے بہت بڑی دشمنی کی اور تان پورے والے سے کہا کہ تان پورے کے دو تار توڑ دے۔ ملکۂ موسیقی کے ساتھ اس وقت استاد نتھو خان جیسے فنکار شامل تھے۔ جب وہ راگ کے درمیان پہنچیں تو خدا جانے قدرت کی طرف سے یا کسی انسان کی شرارت کی وجہ سے تان پورے کے دو تار اچانک ٹوٹ گئے۔ یاد رہے کہ پہلی آل پاکستان میوزک کانفرنس ۲۲ مئی ۱۹۶۰ء کو ہوئی تھی اور بقول حیات محمد خان مرحوم جو اس کے بانی تھے، انہوں نے اس میوزک کانفرنس میں پہلی مرتبہ روشن آرا بیگم کو بلایا تھا۔ بہرحال روشن آرا بیگم نے ان مشکل حالات میں بھی گایا اور کامیاب ہوئیں۔ تان کاری کے معاملے میں وہ بہت مشکل پسند تھیں۔ اس کی گواہی استاد سلامت علی اور فریدہ خانم دونوں دیتے ہیں۔ استاد فتح علی خان نے بھی کہا کہ وہ کئی مرتبہ لے اوپر لے گئیں اور پھر تین منٹ تک وہاں کھڑی رہیں۔ خواتین گانے والیوں میں یہ وصف صرف انہی میں تھا۔ آگرے والے استاد فیاض خان نے تو ایک مرتبہ کھڑے ہو کر ان کے گانے کی اتنی تعریف کی اور اتنی دعائیں دیں کہ ہر آنکھ اشکبار ہو گئی۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے اپنے ایک انٹرویو میں ان سے متعلق بات کرتے ہوئے کہا کہ ''ریاضت، ایک اچھے استاد کی تعلیم اور اپنے فن سے مکمل ایمانداری نے انہیں یکتائے روزگار بنا دیا۔'' انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''وہ گاتے ہوئے ایک پری معلوم ہوتی تھیں۔''

قارئین! کلاسیکی موسیقی کے فروغ کے لیے جو کوششیں اس Dedicated خاتون نے کی ہیں، وہ قابلِ فخر ہیں۔ انہوں نے محض قبولِ عام اور Popularity حاصل کرنے کے لیے کبھی کچھ نہیں گایا اور اس حوالے سے آخری دم تک کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا سمجھوتہ کر لیتیں تو ہیرے جواہرات سے ان کا دامن بھرا ہوتا مگر انہوں نے تو لالہ موسیٰ کے ایک عام سے گھر میں زندگی گزار دی کیونکہ وہ ایک سچی فنکارہ تھیں اور ایک سچا فنکار ہمیشہ درویش طبیعت کا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کچھ سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ کیا کسی پر قدرت ایسی مہربان ہو سکتی ہے کہ اس پر ساتواں در کشادہ کر دے یا کسی کو تھرڈ ڈائمنشن کا پتا چل جائے اور کیا واقعی قدرت کسی گانے والے کو آٹھویں سُر کا پتا دے دیتی ہے۔ یقیناً روشن آرا بیگم کو آٹھواں سُر مل گیا تھا اور ایسا فنکار فن کی مقررہ حدود سے ماورا ہوتا ہے۔ سو خود تو وہ ۶ دسمبر ۱۹۸۲ء کو دنیا سے رخصت ہو گئیں مگر ایسے لازوال نغمے اس دنیا کو دے کر گئیں جس سے ان کا نام اس جہان میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

چپ ہو گیا وہ ساز مگر اُس کے سوز سے
ذروں میں زندگی ہے غزل خواں اسی طرح
(عابد)

..........☆..........

زمیں اور زماں (غزلیں)

ضیاء حسن ضیاء
زرنگار فاؤنڈیشن۔ خیابان کالونی۔ فیصل آباد

اعجاز حسین حضروی کی گائیکی

علی تنہا

اعجاز حسین حضروی نے ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے ۱۹۵۳ء میں گانے کا آغاز کیا۔ اس دور میں ریڈیو راولپنڈی سے کئی یادگار آرٹسٹ وابستہ تھے۔ برصغیر کے نامور موسیقار رشید عطرے، ہندوستان میں کئی اہم فلموں میں گانے دینے کے بعد پاکستان آ کر ریڈیو پاکستان راولپنڈی ہی سے وابستہ ہوئے۔ انہیں ممتاز براڈ کاسٹر محمود نظامی ۱۹۵۰ء میں بحیثیت میوزک ڈائریکٹر لائے تھے مگر وہ جلد ہی فلم انڈسٹریز کی طرف لوٹ گئے۔

اعجاز حسین حضروی ۱۹۲۸ء میں ضلع اٹک کے مشہور قصبے حضرو میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نبی بخش حضروی بھی اپنے وقت کے اچھے گائیک تھے اور اعجاز حسین حضروی کے بڑے بھائی اللہ بخش حضروی کلاسیکل موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ اعجاز حضروی نے اپنے والد اور بڑے بھائی سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم پائی تھی۔

چونکہ وہ مبدائے فیض سے گائیکی کا وافر عطیہ لے کر آئے تھے، اس لیے ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں آنے کے بعد اپنے وقت کے تمام اہم کلاسیکل گائیکوں سے راگ ودیا کے حصول میں شبانہ روز محنت کرتے رہے اور استاد چھوٹے غلام علی خان، استاد امید علی خان اور بطور خاص استاد برکت علی خان کی محفلوں میں باقاعدگی سے شامل ہو کر کلاسیکل موسیقی کی باریکیوں کو سمجھنے اور مہارت حاصل کرنے میں مصروف عمل رہے۔

اعجاز حسین حضروی کی گائیکی پاک و ہند میں اس اعتبار سے بہت منفرد اور یگانہ ہے کہ انہوں نے گائیکی کے پرانے اسالیب میں سے نئے آہنگ کو کشید کیا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں غیر معمولی اور انتھک ریاضت اور غور و خوض کے بعد ۱۹۶۰ء میں اعجاز حسین حضروی نے علاقائی آہنگ اور مزاج کو اپنی گائیکی کی بنیاد بنایا۔

اعجاز حسین حضروی ہندکو بولنے والے خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن انہیں ہندکو، پوٹھوہاری اور سرائیکی سے محبت تھی۔ اس زمانے میں طفیل نیازی جیسا لائق گلوکار، اعجاز حسین حضروی سے پوٹھوہاری اور سرائیکی شاعری، ثقافت اور گائیکی کے مرکزی مزاج کے بارے میں بحث کرتا رہا کیونکہ طفیل نیازی ہندوستان سے ہجرت کے بعد ملتان میں آباد ہوا اور اپنا تھیٹر بنا لیا۔ یوں ملتان اور بہاولپور ڈویژنوں کا چپہ چپہ پھرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ سرائیکی علاقے کی ثقافت اور موسیقی کی روایات اور اس کی جڑیں کیا ہیں؟

اس لیے خواجہ فرید کو ان دونوں فنکاروں نے خوب گایا۔ بالخصوص اعجاز حسین حضروی نے خواجہ فرید کو اپنے پرسوز

اور نا قابل تقلید رنگ میں پیش کیا۔ یہ ان کا کمال ہے کہ وہ زاہدہ پروین جیسی ہم عصر کافی گائیکہ کے مقبول عام اسلوب سے بچ گئے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں جشن ملتان میں زاہدہ پروین، اعجاز حسین حضروی، اقبال بانو، ثریا ملتانیکر اور مہدی حسن نے اپنے موسیقی کے جادو سے بے پناہ دادِ تحسین حاصل کی۔

اس دور میں بیسویں صدی کے بے مثال گائیک استاد نزاکت علی خان، استاد سلامت علی خان بھی ملتان میں قیام پذیر تھے اور یوں ۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائی میں، سرائیکی خطہ شیریں سُروں کی روشنی میں جگمگاتا رہا۔ موسیقی کا یہی سحر تھا جس نے لوگوں میں ثقافتی وحدت کی وجہ سے امن اور جمالیاتی آدرش کو فروغ دیا۔ افسوس بعد کی آمرانہ حکومتوں نے فنونِ لطیفہ سے اغماض برت کر جنرل ضیاء کے دور میں بالخصوص، منافرت، جبر اور غارت گری کو رواج دیا اور آج ہم ثقافت وادب سے تہی دامن ہو کر بدترین بحران سے نبرد آزما ہیں۔

خیر، بات ہو رہی تھی اعجاز حسین حضروی کی، موسیقی کی دنیا میں، کلاسیکل سے غزل گائیکی، عارفانہ کلام کی گائیکی تک آتے آتے استاد برکت علی خان، استاد امید علی خان، بیگم اختر فیض آبادی، طفیل نیازی کے ہوتے کسی کا رنگ جمنا مشکل تھا مگر مہدی حسن سے بھی پہلے اعجاز حسین حضروی نے یہ شعور اور نیا پن عام کیا جس کی وجہ سے غزل اور گائیکی مقبول عام ہوئی اور غور کیا جائے تو مہدی حسن کے سُر لگانے، مینڈھ کے استعمال اور آکار کے بے حد درست اور راگ کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کے پس منظر میں اعجاز حسین حضروی کے اثر سے نکلنے کے بعد اپنا جہان موسیقی آباد کیا۔ اس سے اعجاز حضروی کے غیر معمولی اثرات کا اندازہ لگایئے کیونکہ ۵۰ء کی دہائی کے وسط میں نئی نسل کا کونسا گلوکار تھا جو ان سے متاثر نہ ہوا۔ اعجاز حسین حضروی نے جب غزل گائیکی کو اپنایا تو اس وقت استاد برکت علی خان کا طوطی بول رہا تھا اور ہندوستان میں بیگم اختر فیض آبادی کا ڈنکہ بج رہا تھا۔

اعجاز حسین حضروی نے نہایت ذہانت سے ان اساتذہ سے الگ اپنی راہ بنائی اور چند برسوں میں گونج دار، سُریلی اور پرسوز آواز کی وجہ سے اپنی گائیکی کا سکہ جما دیا۔ وہ تقلید سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ اصلاً وہ آرٹ میں انفرادیت کے قائل تھے۔ پوٹھوار جیسے دور افتادہ علاقے سے تعلق رکھنے اور معمولی تعلیم پانے کے باوجود ان کا یہ بڑا وصف رہا کہ اردو شاعری کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا۔ تلفظ، حتیٰ کہ عروض کے بارے میں یوسف ظفر اور باقی صدیقی سے فیض پایا۔ اس واسطے غزل گائیکی میں لفظوں کی نشست و برخاست اور تلفظ میں ان کا جواب نہیں۔ میر، سودا، غالب، اقبال، حفیظ، فیض، ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، قتیل شفائی اور احمد فراز ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ اس دور میں مہدی حسن میدان میں نہیں آئے تھے البتہ مختار بیگم، فریدہ خانم، اقبال بانو نے اپنا نام پیدا کر لیا تھا۔ اس عہد میں مہدی حسن بھی اعجاز حسین حضروی کے انداز کے دلدادہ رہے اور تمام عمر اعجاز حسین حضروی کا احترام اپنے سینئر کی طرح کیا۔ یہ دونوں نایاب گائیک اپنے اپنے رنگ کے موجد ہیں۔

اعجاز حسین حضروی کا ثانی ہارمونیم بجانے میں بھی کوئی نہ تھا اور پاکستان میں بڑے اہم لوگ ان کے شاگرد رہے۔ مثلاً فلم سٹار علاؤ الدین ان کے شاگرد تھے اور اپنے دور کے بے مثال اکارڈین نواز بھگ جی نے بھی اعجاز حسین حضروی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ ۵۰ء اور ۶۰ء کے کئی موسیقار بھی دھنوں کی تخلیق میں ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ہارمونیم پر ایسا رنگ جماتے کہ حیرت ہوتی۔ گلے کے ساتھ ساتھ ان کی انگلیوں میں بھی قدرت نے مسیحائی عطا کی

تھی اور حقیقت یہ ہے کہ بڑے اہم گائیک خواہش کرتے تھے کہ اعجاز حضروی ان کے ساتھ ہارمونیم پر سنگت کریں کیونکہ بول بانٹ کی تقسیم میں وہ کام جو ستار یا سارنگی پر بھی بجانا آسان نہ ہوتا، اعجاز حضروی ہارمونیم پر ایسا جتن دکھاتے کہ راگ کی باریکیاں ہارمونیم سے ادا ہو جاتیں ورنہ پرانے اساتذہ ہارمونیم والے کو پکے گانے کے دوران سنگت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے تھے کہ وہ مشکل بندشیں ہارمونیم سے نکال نہیں سکتے تھے۔

مثال کے طور پر برصغیر کی بے مثال کلاسیکل مغنیہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم سے بڑے بڑے جغادری ساز کار سنگت کرنے سے گھبراتے تھے۔ چہ جائیکہ ہارمونیم بجانے والے یہ ہمت کرتے، موسیقی کی ایک بڑی محفل میں اعجاز حسین حضروی اس وقت آنکلے جب روشن آرا بیگم راگ ماروا شروع کرنے میں تامل کر رہی تھیں کیونکہ ہارمونیم اور سارنگی بجانے والے گھبرا رہے تھے۔ احباب کے اصرار پر اعجاز حسین حضروی نے ہارمونیم چھیڑا اور ماروا کا الاپ اس کمال سے شروع کیا کہ ملکہ موسیقی نے تڑپ کر اعجاز حضروی کو دیکھا، بے پناہ داد دی اور سٹیج ہی پر انعام دے دیا۔ یہ غیر معمولی واقعہ تھا ورنہ ملکہ موسیقی کے ساتھ ہارمونیم بجانا کارے دارد تھا۔ وہ مشکل اور پیچیدہ راگ ہارمونیم پر اس کمال سے بجاتے کہ بڑے نامور اساتذہ انگشت بدنداں رہ جاتے۔

اعجاز حضروی کی آواز میں مردانہ حسن اور جلال کے ساتھ سوز تھا۔ چونکہ وہ نیم کلاسیکل موسیقی کے بھی استاد تھے، اس لیے غزل میں بے شمار ایسے راگوں کو انہوں نے پیش کیا جسے ہاتھ لگانے سے اچھے خاصے گائیک گھبراتے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اعجاز حضروی نے بے پناہ ریاض کیا تھا۔ وہ رات رات بھر ریاض کرنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ موسیقی ان کی روح تھی، وہ موسیقی کے لیے زندہ رہے۔

انہیں راگ داری سے خبط کی حد تک عشق تھا۔ اس لیے انہوں نے راگ کے مختلف اسالیب پرکھنے کے لیے بے حد احتیاط اور ہمہ تن گوش ہو کر استادانِ فن کو دن رات سنا، جن میں استاد عبدالکریم خان، استاد بہرے عبدالوحید خان، آفتاب موسیقی فیاض خان، استاد عاشق علی خان، استاد امیر خان، استاد بڑے غلام علی خان، استاد امید علی خان بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے پاس ان کے اور دوسرے اہم استادان موسیقی کے ریکارڈ وافر تعداد میں موجود رہے۔ وہ ان اساتذہ کی گائیکی کے انداز اور خوبیوں پر ماہرانہ گفتگو کرتے تھے اور موسیقی کے مشہور گھرانوں مثلاً کیرانہ گھرانہ، گوالیار گھرانہ، شام چوراسی گھرانہ، پٹیالہ گھرانہ، قصور گھرانہ، دہلی گھرانہ، آگرہ گھرانہ، جے پور گھرانہ وغیرہ کا تقابلی جائزہ تک کر سکتے تھے۔

اعجاز حسین حضروی بول بانٹ، تان، گمک یہاں تک کہ سرتی کے استعمال میں بھی منفرد تھے مگر انہوں نے نیم کلاسیکل موسیقی سے زیادہ غزل گائیکی، کافی گائیکی حتیٰ کہ لوک موسیقی کی بھی یادگار چیزیں گائی ہیں۔ ان کی گائی ہوئی مشہور غزلوں میں:۔

۱۔ رنج راحت فزا نہیں ہوتا (مومن)	۲۔ کی وفا ہم سے (غالب)
۳۔ اک فقط میں ہی نہیں (فراز)	۴۔ آپ سے عرضِ ملاقات (سیف الدین سیف)
۵۔ جہاں تیرا نقشِ قدم (غالب)	۶۔ کہنے دیتی نہیں (داغ)
۷۔ اب کے ہم بچھڑے (فراز)	۸۔ پھرتا ہے زندگی کے لیے (میر تقی میر)
۹۔ جب سے بلبل تو نے (امیر مینائی)	۱۰۔ ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر (مولانا حالی)

لیکن کن کن شہ پاروں کا تذکرہ کیا جائے۔ اعجاز حسین حضروی کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کے دور میں طفیل نیازی اور استاد فتح علی خان، ستار نواز جیسے جید فنکار راولپنڈی میں موجود تھے۔ پھر ان کے معاصر صادق پنڈی والے بھی ہم رکاب تھے۔ اس زمانے میں بحیثیت موسیقار اعجاز حسین حضروی نے ریڈیو راولپنڈی سے بڑی یادگار اور دلنشین دھنیں تخلیق کیں۔ موسیقی کے میدان میں ان کی جودت طبع کے بے شمار رنگ ہیں۔ پاکستان میں غزل گائیکی کے میدان میں مہدی حسن اور اعجاز حسین حضروی کا کوئی ثانی نہیں۔ وہ بڑے اہم گانے والوں کو منہ پر ان کی فنی کمزوریوں سے آگاہ کرتے تھے مگر اس حسن سلوک اور مہذب بھرے انداز میں کہ وہ سبکی محسوس نہ کریں۔ وہ بنیادی طور پر شریف النفس لیکن فن میں کوتاہی برداشت نہ کرنے والے فنکار تھے۔

اعجاز حسین حضروی کو بار بار فلموں کی دھنیں ترتیب دینے کی ترغیب جاری رہی کیونکہ کئی اہم موسیقار مثلاً خواجہ خورشید انور رشید عطرے، فیروز نظامی اور ماسٹر عنایت حسین ان کی خلاقانہ صلاحیتوں سے آگاہ تھے اور اعجاز حسین حضروی کے قدردان، پھر فلمی دنیا کے کئی ممتاز اداکاران کے شاگرد تھے مگر وہ استاد برکت علی خان کی طرح درویشانہ مزاج رکھتے تھے اور فلمی دنیا کی دورنگی سے گریزاں رہے۔ اس لیے کئی فلمیں دھنیں ترتیب دینے کے باوجود اپنا نام استعمال کرنے سے ممانعت کرتے تھے۔

اعجاز حسین حضروی نے بیرون ممالک بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور بالخصوص ۶۰ء کی دہائی میں جشن کابل میں کئی بار اپنے منفرد فن کا مظاہرہ کر کے بے اندازہ تحسین پائی۔ افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ ان کے انداز گائیکی کے بڑے شائق تھے۔ اعجاز حسین حضروی کے قدردانوں میں برصغیر کے نامور موسیقار مدن موہن بھی شامل ہیں۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ شاید یہ بھی ہے کیونکہ راولپنڈی کے قریب مشہور قصبے دینہ، مدن موہن کی جنم بھومی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس چھوٹے سے شہر دینہ نے ہندوستان کی دو عظیم ہستیوں کو جنم دیا۔ ایک مدن موہن اور دوسرے مشہور فلم ڈائریکٹر، شاعر اور سکرین پلے رائٹر گلزار۔

اعجاز حسین حضروی کے ہی کہنے پر مدن موہن نے ان کے کزن اور موسیقار عنایت حسین حضروی کو اپنی کئی فلموں میں کام دیا۔ خیر یہ بات تو محض برائے بات تھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں غزل کے نئے چلن اور انداز کے بانی اعجاز حسین حضروی ہی ہیں۔ انہوں نے غزل گانے میں سُر کے شفاف استعمال اور شعر کی حسن ادائیگی کو متعارف کروایا، آج پاک و ہند کے بے شمار گائیک اسی راستے پر چل رہے ہیں۔ ہر چند اب اصل گانا، ہماری ثقافتی زوال آثار صورتحال کے باعث پس منظر میں چلا گیا ہے مگر جب تک اعجاز حسین حضروی اور مہدی حسن کی گائیکی زندہ ہے۔ یہ پس منظر میں تو جاسکتی ہے مگر فن کی مضبوط بنیادوں اور تخلیقیت کی وجہ سے یہ آنے والی نسلوں کے لیے نشانِ منزل کا درجہ رکھے گی کیونکہ ثقافت و فن قوموں کی زندگی میں ایک دائمی قدر کی حامل ہوتی ہے۔ زمانی نشیب و فراز کبھی دائمی نہیں رہے۔

مہدی حسن اور اعجاز حسین حضروی کے آرٹ میں کئی چیزوں کا اشتراک موجود ہے۔ مثلاً دونوں کا تعلق کسی مشہور گائیک گھرانے سے نہیں، دونوں نے بے پناہ ریاض اور موسیقی سے سچی لگن اور عشق کی وجہ سے نام پایا۔ دونوں نے غزل گائیکی میں تلفظ اور سُر کے درست استعمال کی مثال قائم کی۔ ان دونوں بے مثال گائیکوں کی آواز میں پرسوز ارتعاش یا Biveration ہے۔ طلعت محمود کی طرح ان دونوں نے آواز کے ارتعاش کو فن میں کمال ہنر سے بدل دیا۔ دونوں کی آواز میں نہایت سکون اور گہرا سوز ہے۔ دونوں نے گانے میں مینڈھ اور بہلاوے کا استعمال انتہائی خوبی اور کمال سے کیا ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے مہدی حسن اور اعجاز حسین حضروی نے ابتدائی موسیقی کی تعلیم اپنے بڑے بھائیوں سے حاصل کی۔ مہدی حسن نے بڑے بھائی پنڈت غلام قادر سے اور اعجاز حسین حضروی نے اپنے بڑے بھائی اللہ بخش حضروی سے کسبِ فیض کیا۔ دونوں نے غزل کے ساتھ ساتھ نیم کلاسیکل میں بھی انفرادیت سے کام لیا اور دونوں نے لگ بھگ چالیس برس تک اقلیم موسیقی میں اپنے فن کا جادو جگایا البتہ اعجاز حسین حضروی نے مہدی حسن کے مقابلے میں نیم کلاسیکل بہت زیادہ گایا ہے۔ اعجاز حسین حضروی کے پسندیدہ راگوں میں بھیرویں، ایمن، درباری، جونپوری، مارِوا، مالکونس، بہاگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کئی ٹھمریوں کے بول بھی خود وضع کیے۔ اعجاز حسین حضروی ٹھمری گائیکی میں استاد بڑے غلام علی خان کے بڑے مداح تھے۔ وہ ٹھمری میں بہلاوے اور مرکی کے استعمال سے سماں باندھ دیتے تھے۔

اعجاز حضروی موسیقی کے تمام اصناف میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ مثلاً ان کی گائی ہوئی یہ کافیاں آج بھی کمال اثر اور حسن کی حامل ہیں:۔

کی جاناں میں کون او بلھیا (بلھے شاہ)   2- مائے نی میں (شاہ حسین)

3- سچ سبحانی غیر نہ جانی (خواجہ فرید)   4- سک غیر خدا دی (خواجہ فرید)

5- سجن تینڈی بے پروائی (خواجہ فرید)   6- اوہ ذات چنل دی

ان کافیوں میں سندھڑا، بھیروی، بہاگ اور پہاڑی راگوں کو بنیاد بنا کر انہوں نے کمال کر دکھایا ہے۔ وہ حسبِ ضرورت بہلاوے کے ساتھ شفاف اور خوبصورت تانوں کا استعمال بھی کرتے ہیں مگر زوردار پیچیدہ تانوں یا گمک سے گریز کیا تاکہ کافی کی معرفت اور مضامین کا تقدس مجروح نہ ہو۔ وہ گائیکی میں خواہ وہ غزل ہو، کافی ہو، گیت یا فوک ہو، اس کی معنوی اور باطنی حقیقت کو سُر کے ذریعے اجاگر کرتے تھے تاکہ سننے والے کے ذہن اور قلب میں اس کی تاثیر کو دوچند کیا جا سکے۔ کافی گائیکی میں یہ ہنر زاہدہ پروین، استاد منظور خان اور طفیل نیازی کے ہاں بھی موجود ہے مگر تینوں کا رنگ یکسر جداگانہ ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ برکت علی خان، مختار بیگم کی طرح اعجاز حسین حضروی کو حکومت نے تمغۂ حسن کارکردگی دینے میں اغماض برتا، گو ان کے شاگردوں اور کم تر گویوں کو نوازا گیا۔ ایسے تمام لافانی فنکار اگرچہ اس نوع کے اعزازات کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ تو اُس قوم کے لیے مایۂ افتخار ہوتا ہے کہ اپنے عظیم فنکاروں کو یاد رکھیں تاکہ ثقافت و فن کا نام دوبالا رہے۔

اعجاز حسین حضروی نہایت غیور، ستائش و صلہ سے بے پرواہ انسان تھے۔ انہوں نے عمر بھر اپنے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا بلکہ ہاتھ پھیلانے والوں کی مدد کی کیونکہ وہ نہایت دردمند اور انسانیت کا درد رکھنے والے فنکار تھے۔ اعجاز حسین حضروی ۵ فروری ۱۹۸۹ء کو اس دارِ فانی سے جاتے ہوئے تا ابد اپنی آواز کی مہک چھوڑ گئے۔



سی حرفی۔ ابیاتِ سلطان باھوؒ

تعارف، ترجمہ، شرح: سید احمد سعید ہمدانی

حضرت سلطانؒ باھو مغل شہنشاہ شاہجہان کی تاجپوشی کے سال کے آس پاس ۱۶۲۷ء اور ۱۶۳۱ء کے درمیان کسی سال میں قلعہ شورکوٹ (حال ضلع جھنگ، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ آپ اعوان قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اعوان محمود غزنوی کی ہمراہی میں جنگ سومنات کے معرکے کے بعد علاقہ سون سکیسر (ضلع خوشاب) اور گردونواح کے علاقوں میں آ کر آباد ہو کر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ حضرت سلطان کے والد بازید محمدؒ دیندار، متقی اور حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مرد سپاہی پیشہ تھے اور شاہجہان کے لشکر میں ملازم تھے۔

حضرت بازید محمد نے ادھیڑ عمر میں اپنی ایک ہم کفو خاتون حضرت بی بی راستیؒ سے نکاح فرمایا جو ایک عالی مقام ولیہ تھیں۔ سون سکیسر کے گاؤں انگہ میں وہ جگہ اب تک معروف و محفوظ ہے جہاں وہ ایک پہاڑی کے دامن میں چشمے کے کنارے ذکر میں محو رہا کرتی تھیں۔ کچھ مدت بعد حضرت بازیدؒ ملتان چلے گئے۔ وہاں بہادری کا ایک کارنامہ دکھانے پر ناظم ملتان نے ایک گاؤں نذر کیا۔ دوسری طرف آپ کی عسکری خدمات کے عوض آپ کو مغل شہنشاہ نے قلعہ شورکوٹ کے گردونواح میں جاگیر عطا کی جو وسیع رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ بعد ازاں حضرت بی بی راستیؒ وہیں پہنچ گئیں اور حضرت سلطان باھو بھی یہیں متولد ہوئے۔

کمسنی میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ گو والدہ ماجدہ نے آپ کو علمِ ظاہری کی بھی تعلیم دلائی مگر اصل تعلیم و تلقین حضرت بی بی راستیؒ کی یہ تھی کہ آپ کو ذکر و فکر کے طریقے سکھائے اور سیر و سفر کے ذریعے مکشوفات کا دائرہ وسیع کرنے کی ہدایت فرمائی۔ آپ کئی بزرگوں کے مزاروں پر گئے۔ کئی پیروں سے ملے مگر اصل رہنمائی ظاہری و باطنی طور پر آپ کو حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ سے ہی ملی۔ آپ نے اعتراف کیا ہے:

پیشوائے خود شریعت ساختم
ہر حقیقت از محمدؐ یافتم
دست بیعت کرد مارا مصطفےٰ
ولدِ خود خواندہ است مارا مجتبےٰ

رشد و ہدایت کا اذن بھی آپ کو کشفاً اسی بارگاہ سے ملا:

شد اجازت باھو را از مصطفےٰ
خلق را تلقین بکن بہر خدا

......آپ ہمیشہ سیر و سفر میں رہے اور سفر کے دائرے میں زیادہ تر ملتان، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسماعیل خان، چولستان، وادیٔ سُون اور کوہستان نمک کے دیگر علاقے شامل رہے۔ آپ ان علاقوں میں روحانی مشن لے کر حکمت و معرفت کی دولت لٹاتے پھرے۔

آپ نے تقریباً ایک سو چالیس کتب فارسی میں تصوف پر لکھیں مگر ان میں سے صرف تیس کے قریب اس وقت دستیاب ہیں جن میں پنجابی ابیات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ جب تک فارسی کی تصنیفات تراجم یا مخطوطات کی صورت میں منظر عام پر نہیں آئی تھیں، آپ کی وجہ شہرت بطور ایک عارف شاعر یہی ابیات تھے۔ یہ ابیات ''دوہڑہ'' کی فارم میں ہیں۔ اس زمانے میں ''دوہڑے'' لوک شاعری کی ایک بہت مقبول صنف تھے کیونکہ سُر تال کے ساتھ ایک ماہر موسیقار سے لے کر ایک گڈریا تک ان کو گا، یا گنگنا کر لطف اندوز ہو سکتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ سلطان صاحب کے ابیات کی روحانی و جمالیاتی حظ رسانی کا یہ عالم ہے کہ اگر انہیں صحیح ادائیگی کے ساتھ تحت اللفظ بھی پڑھا اور سنا جائے تو ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

آپ نے اورنگزیب کے عہد میں ۱۱۰۲ھ/ ۱۶۹۰ء میں وفات پائی اور شورکوٹ میں دفن ہوئے مگر تقریباً ستر سال بعد آپ کی تربت کو سیلاب کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا۔ ایک مدت بعد وہاں بھی سیلاب آ گیا تو اب جہاں آپ کا مزار ہے، تابوت کو لا کر وہاں دفن کیا گیا۔

صوفیاء کرام میں آپ سلطان العارفین کے لقب سے معروف ہیں۔ کشف میں آپ کو خبر دی گئی کہ آپ ان ارواح میں سے ہیں جن کا بشری زندگی میں ظہور سلطان الفقر کی صورت میں مقدر تھا۔ جدید دور میں آپ کی کتب منظر عام پر آئی ہیں تو یہ حقیقت اہل علم پر کھلی ہے کہ آپ بیک وقت ایک صوفی مفکر بھی تھے اور باعمل فقیر کامل بھی۔ اس وقت جو کتب اصل یا تراجم کی صورت میں طبع ہو چکی ہیں، مندرجہ ذیل ہیں۔

ابیات سلطان باہوؒ (پنجابی)	اسرار قادری	
امیر الکونین	اورنگ شاہی	توفیق الہدایت
تیغ برہنہ	جامع الاسرار	دیوان باہوؒ (فارسی)
رسالہ روحی (خرد)	رسالہ روحی	سلطان الوہم
شمس العارفین	عقل بیدار	عین العارفین
عین الفقر	فضل اللقاء	قرب دیدار
کلید التوحید (خرد)	کلید التوحید (کلاں)	کلید جنت
گنج الاسرار	مجالستہ النبی	محبت الاسرار
محک الفقر (خرد)	محک الفقر (کلاں)	محکم الفقراً
مفتاح العارفین	نور الہدیٰ (خرد)	نور الہدیٰ (کلاں)

سلطان صاحبؒ نے اپنی کتب میں صرف واعظانہ انداز میں پند و نصائح سے ہی سروکار نہیں رکھا بلکہ واردات و اسرار روحانی کی تشریح بھی کی ہے اور توحید کی تفسیر میں گہرے نکات بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان کا اسلوب وجدانی ہے یعنی اسے ایک صاحب حال صوفی کا کلام سمجھنا چاہیے۔ نومسلم صوفی سکالر شوآن نے اس نکتہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''صوفی مصنفین

بعض صورتوں میں اس وقت لکھتے ہیں جب ان پر حال طاری ہوتا ہے..... اب وہ ان احوال میں الہام کے مصادر کو دیکھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بلاوجہ نہیں ہوتی، وہ جو کچھ لکھتے ہیں اسے دوبارہ پڑھنے کا انہیں خیال بھی نہیں آتا، نہ ہی وہ اپنی تالیفات وتصنیفات کو کسی تنقیدی نظر رکھنے والے ذہین آدمی کو دکھاتے ہیں کیونکہ وہ ان کی نظر میں صاحب ذوق نہیں بلکہ ایک بے ادب خائی اور نفس روحانی سے ناآشنا شخص ہوتا ہے۔ وہ عمیق ترین اور تاریک ترین پانیوں میں موتیوں کی تلاش کا عمل قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان باہوؒ کی تمام تصنیفات بھی خاص احوال کے دوران لکھی گئی ہیں اور وہ ان احوال و مقامات کی ترجمان ہیں جن سے وہ گزر رہے ہوتے تھے مگر یہ ایک مبتدی درویش کی ہنگامی کیفیات نہیں بلکہ ایک صاحب تمکین صوفی کی اعلیٰ فکری وروحانی واردات ہیں جن سے اہل ذوق بقدر ظرف واستعداد ''خاص الخاص تعلیم'' اخذ کر سکتے ہیں۔ وہی جسے عرف عام میں علم تصوف کہا جاتا ہے۔

ان کی زبان سادہ وشیریں ہے مگر جب وہ اپنے روحانی تجربات وافکار کے اظہار کے لیے کچھ نئی تراکیب و اصطلاحات وضع کرتے ہیں تو ان کی تحریر مشکل اور غور طلب ہو جاتی ہے۔ اکثر وہ اشاروں سے کام لیتے ہیں اور تفصیل ووضاحت کسی اور موقع کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں۔

تلقین و درسِ اہل نظر یک اشارتست
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

(اہل نظر کی تعلیم وتلقین اشاروں میں ہوتی ہے، میں نے ایک بار اشارہ کر دیا اور اب دوبارہ بیان نہیں کروں گا۔)

تعلیمات:

حضرت سلطان باہوؒ اپنی نظری وعملی تعلیم کو تصوف کے بجائے فقر کہتے ہیں۔ (عمر کے آخری سالوں میں علامہ اقبالؒ بھی فقر کی جامع اصطلاح استعمال کرتے رہے) دراصل فقر میں ان خصائص پر زور ہے جو اعلیٰ اسلوب حیات میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جیسے خلوص، مروت، فیاضی، ایفائے عہد، جوان مردی، محبت فاتح عالم اور زہد وعبادت وغیرہ۔ وہ تمام صوفیاء کی طرح فرد میں ان خصوصیات کو بروئے کار لانے کے لیے کسی مردِ کامل کی رہنمائی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی توجہ (''قوت قدسیہ'') اور تربیت (''تزکیہ'') سے بندہ جلد اپنے مقام معلوم تک پہنچ جاتا ہے۔ پہنچے ہوئے مردِ خدا کو وہ ''عارفِ واصل'' اور ''فقیر کامل'' کہتے ہیں۔ ایسا ''زندہ دل'' اور ''روشن ضمیر'' شخص جہاں بھی ہو اور اس کے پیچھے کوئی چلے یا نہیں، معاشرے میں ایک مردِ کار اور تحریکِ عمل کے ایک نمائندہ کے طور پر زندگی بسر کرتا ہے۔

انہوں نے اپنی کتب میں ذکر وفکر کے وہ تمام طریقے لکھے ہیں جو بندۂ حق کو اپنا مقام حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ وہی شرف کا مقام ہے جسے اقبال ''خلیفۃ اللہ'' کہتے ہیں۔ اونچے درجے کے ''خلفاء'' کا فیض ان کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

نام فقیر تنہاندا باہوؒ قبر جنہاندی جیوے ہو

(فقیر نام ان کا جن کی قبر زندہ رہے)

شعری و معنوی محاسن:

ابیاتِ حضرت سلطان باھُوؒ پر اکادُکا تحریریں ضرور لکھی گئیں مگر ابھی تک کوئی ایسا جامع مضمون نہیں لکھا جا سکا جس میں اُن کے شعری و معنوی محاسن کا مکمل طور پر جائزہ پیش کیا گیا ہو۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ابتدائی طور پر سب سے بڑا کام ابیات کو جمع کرنے کا تھا جو مختصر سے مجموعے چھپے ہوئے ملتے تھے، ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس میں سب ابیات نقل کر دیے گئے ہوں۔ جناب ڈاکٹر سلطان الطاف علی نے یہ کام بدرجۂ احسن سرانجام دیا۔ میرے خیال میں کوئی بیت اب ایسا نہیں رہ گیا جو ان کے مجموعہ میں شامل نہ ہو چکا ہو۔

جہاں تک شرح کا تعلق ہے تو چونکہ حضرت سلطان العارفین سلطان باھُوؒ نے فقر و تصوف کے موضوع پر فارسی میں کئی کتابیں بھی لکھیں اور انہی کے مضامین کو انہوں نے ابیات میں ادا فرمایا ہے، اس پر ڈاکٹر سلطان الطاف علی نے انہی کی تحریروں کی مدد سے مکمل تشریح بھی لکھی ہے۔ ان کا کارنامہ اپنی مثال آپ ہے جس پر اب اضافہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ہاں البتہ اگر اپنے اپنے زاویہ نظر اور مطالعۂ تصوف کی روشنی میں شارحین آئندہ بھی شرحیں لکھتے رہیں گے تو ان کی افادیت کو جانچنے کے پیمانے بھی اور ہوں گے۔ جناب ڈاکٹر سلطان الطاف علی سے پہلے اور بعد اس سلسلہ میں چند ایک کوششیں کی گئی ہیں جیسے فقیر نور محمد مرحوم کی منتخب ابیات کی شرح ''انوارِ سلطانی'' یا ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کا مرتبہ ''کلام سلطان باھُو'' یا اب راقم کی فقیرانہ انداز میں زیرِ نظر شرح وغیرہ مگر سچ یہ ہے کہ اس ضمن میں مزید کام کرنے کی ہمیشہ گنجائش رہے گی۔

مجھے یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ ابیاتِ سلطان باھُوؒ کے مطالعہ کے دوران میں سب سے زیادہ جناب ڈاکٹر سید نذیر احمد مرحوم کے کام سے متاثر ہوا ہوں۔ اگرچہ انہوں نے ہر بیت کے بارے میں صرف چند جملے ہی بطور اشارات قلم بند فرمائے مگر وہ پہلے دانشور اور محقق ہیں جنہوں نے ابیات نقل کرتے ہوئے فکر و فن دونوں کا جائزہ لیا اور اپنی سوچ کو برملا ظاہر کیا۔ میرے خیال میں کسی اور شارح اور تبصرہ نگار نے ملامت کی پرواہ کیے بغیر ایسی چبھتی ہوئی باتیں نہیں لکھیں جیسی انہوں نے لکھ دیں۔ مجھے ان کی اکثر و بیشتر آراء سے سخت اختلاف ہے جس کا اظہار شرح میں جابجا ملے گا مگر حق یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ سوچا، اس پر پردہ نہیں ڈالا اور مجھ فقیر کو جو ان کا مداح ہوں، موقع ملا کہ وہ جن باتوں کو نہ سمجھ سکے، ان کی وضاحت کر سکوں۔

اسی طرح میں نے اپنے سے پہلے مترجمین و شارحین سے بڑھ کر اگر کوئی بات لکھی ہے تو اس بنا پر کہ مجھ سے پہلے وہ حضرات اپنے طور پر بہت کچھ کہہ چکے تھے۔ ان کی اولیت کا شرف مسلّم ہے، میں نے اگر کہیں ان کے حوالے سے آگے بڑھ کر بات کی ہے تو یقین جانیے کہ ان کی تحریروں کی روشنی میں ہی کچھ آگے دیکھنے اور کہنے کے قابل ہوا ہوں۔

ابیات کے شعری محاسن پر چند صفحات کا ایک تبصرہ تو راقم نے ''احوال و مقامات حضرت سلطان باھُوؒ'' میں لکھا تھا۔ کچھ اور حضرات نے بھی کسی نہ کسی پہلو پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا مگر جامع مقالہ اب تک نہیں لکھا جا سکا اور اب بھی صرف چند ایک ضروری نکات اس موضوع کے بارے پیش کیے جا رہے ہیں۔

ابیات کی زبان کے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ ان کی لغت اور لہجہ بیشتر صورتوں میں وادیٔ سکون سکیسر کی زبان سے ماخوذ ہے جہاں سے ان کے والدین اپنی زمینوں کو سنبھالنے کے لیے شورکوٹ آئے تھے۔ یہ زبان بجائے خود سرائیکی، پوٹھوہاری اور ونہاری بولیوں کی لفظیات اور لہجے سے مالا مال ہے۔ پھر سلطان صاحب کے رہائشی ماحول میں شاہ پور اور جھنگ کی جانگلی زبان بولی جاتی تھی، اس سے بھی انہوں نے ضرور اثر لیا۔ اسی طرح ان کی زبان میں ایک گونہ وسعت پیدا ہوگئی۔ اس لیے

عام طور پر ہر علاقہ کے لوگوں نے اس کو اپنی زبان سمجھا۔

اب جہاں تک ان کی شاعری میں لفظوں کے انتخاب واستعمال (Diction) کا تعلق ہے تو یہ صوفی وشاعر کے وجدان سے اثر پذیر ہے۔ وجدان کا خاصا جو عقل کے مقابلے میں نظر آتا ہے، وہ یہاں بھی ظاہر ہے۔ عقل جہاں پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے وہاں وجدان چھلانگیں لگا کر آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح عقل جہاں بالترتیب دلائل و براہین کے سہارے سچائی تک پہنچتی ہے، وہاں وجدان بلاواسطہ اور براہ راست سچ کو بھانپ لیتا ہے، دیکھ لیتا ہے، جانچ لیتا ہے اور پالیتا ہے۔ چونکہ شعر بھی وجدان کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں بھی شاعری میں صداقت کے اظہار وابلاغ کے لیے وجدانی طریق بروئے کار آتا ہے۔ تخیل اگرچہ اس میں رنگینی پیدا کرتا ہے مگر ابلاغ میں ایجاز واختصار کا تاثر ملتا ہے جو بجائے خود شعر میں ایک گونہ کشش پیدا کر دیتا ہے۔

شاعر عام طور پر اپنے جذبہ وخیال کے تلازمات کے لیے باہر کی طرف دیکھتا ہے اور فطرت کے کسی بھی منظر و پیکر کو تشبیہ واستعارہ کے طور پر چن لیتا ہے لیکن اگر یہی شاعر صوفی بھی ہو تو وہ اکثر اپنے کشفی علائم و رموز کو سامنے لے آتا ہے جو بیک وقت تشبیہات واستعارات کا بھی کام دیتے ہیں اور اس کے صوفیانہ تجربے کی بھی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً:

مرشد لُطفوں کرے نظارہ، گُل تھیون سب کلیاں ہو
انہاں وچ ہک لالہ ہوسی، گُل نازک گُل پھلیاں ہو

اب یہاں مرشد کی توجہ کے طفیل باطنی قوتوں کی بیداری کا ذکر ہو رہا ہے اور گلزار کے مناظر کے حوالے سے اس کی توضیح کی جارہی ہے۔ صوفی جب کشف میں یہ چیزیں دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ وہ مقصد کے قریب ہے۔ لالہ کا استعارہ دیکھ کر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم سمجھ نہ سکے کہ یہ کس شے کی علامت ہے۔ صوفی جب کشف میں لالہ دیکھتا ہے تو یہ اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اب اس پر معارف واسرار کھل رہے ہیں یا کھلنے والے ہیں۔

ویسے سلطان باہوؒ کے ہاں ایسی تشبیہات واستعارات بھی عام ہیں جو انہوں نے اپنے باہر کے ماحول سے چنے۔ دریا، طغیانی، گرداب، جنگل، پرندے، چنبیلی کے پھول اور دودھ، لسی، مکھن وغیرہ۔

حضرت سلطان باہوؒ بعض اوقات لفظوں اور ترکیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بھینچ کر اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ اس سے ایجاز واختصار پیدا ہو جاتا ہے مگر جب مطلب پر غور کرتے ہیں تو ایک جہان معنی وہاں آباد نظر آتا ہے۔

اکھیں سرخ مُہیں تے زردی ہر ولوں دل ہائیں ہو
مُہا مہاڑ خوشبوئی والا پہنتا وںج کدائیں ہو
عشق مشک نہ چھپے رہندے ظاہر تھیں اتھائیں ہو
نام فقیر تنہاں دا باہو جنھ لامکانی جائیں ہو

باہو باغ بہاراں کھڑیا نرگس ناز شرم دا ہو
دل وچ کعبہ صحیح کیتو سے، پاکوں پاک پرم دا ہو
طالب طلب طواف تمامی، جب حضور حرم دا ہو
گیا حجاب تھیوے حاجی، بخشیوس راہ کرم دا ہو

قلب کمال جمالوں جسموں جوہر جاہ جلیلوں ہُو
قبلہ قلب منور باہُو خلوت خاص خلیلوں ہُو

......عام طور پر سلطان صاحبؒ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، وہ بات کو بل دیئے بغیر بالکل سیدھے سادے انداز میں کہہ ڈالتے ہیں مگر ہر حال میں کفایت لفظی کا بہت خیال کرتے ہیں۔ الفاظ کو بعض اوقات شعوری طور پر بھینچ دیا اور جوڑ کر یا کشفی وشعری علائم ورموز کے ذریعے یا کبھی یوں:

تُلّہ بنھ توکل والا ہو مردانہ تریئے ہُو
جیں دکھ تھیں سکھ حاصل ہووے اُس تھیں مول نہ ڈریئے ہُو
اِنَّ مع العُسرِ یُسراً آیا چت اوسے دل دھریئے ہُو
بے پروا درگاہے باہو رو رو حاصل بھریئے ہُو

(توکل کا تلہ ''ٹہنیوں اور گھاس پھونس کی بنی ہوئی کشتی'' بنا کر مردوں کی طرح دریا عبور کرنا چاہیے۔
جس دکھ سے سکھ ملے، اس سے ہرگز نہ ڈرنا چاہیے۔
قرآن میں ''بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ملی ہوتی ہے'' لکھا ہے۔ اسی کو یاد رکھنا چاہیے۔
باہو، وہ بے پروا درگاہ ہے۔ اس کے حکم کی ہر حال میں تعمیل کرنی چاہیے۔)

آخر میں ایک بات۔ سلطان باہوؒ کے ابیات کے ہر بند کے آخری مصرع میں باہو بطور نام یا تخلص استعمال ہوتا رہا ہے۔ بعد کے محققین میں سے بعض نے اس کو زائد سمجھا اور خیال کیا کہ عقیدت مندوں نے اپنے مرشد کے نام کا اضافہ کر دیا۔ بیت کی صنف کی ابتداء و اصلیت ان کی نظر سے اوجھل ہو گئی کہ یہ ابیات پنجابی دوہے کی کلاسیکل فارم میں لکھے گئے ہیں۔ اس فارم کا یہ خاصا رہا ہے کہ شاعر ہمیشہ آخری مصرعہ میں اپنا نام یا تخلص استعمال کرتا ہے، لہٰذا ڈاکٹر نذیر احمد نے جہاں باہو بعض ابیات میں سے خارج کر کے اسے موزوں کرنے کی کوشش کی، زیادتی کی۔ اب کے محمد شریف صابر نے جب اس کام کی ذمہ داری قبول کی تو وزن اور آہنگ کو بھی درست کر لیا اور باہو کو بھی ہر مصرعے کے آخر میں عین مناسب انداز میں محلِ استعمال میں لے آئے۔

چاروں مصرعوں کے آخر میں ''ہُو'' اور آخری مصرع میں ''باہو'' تخلص یا نام کا استعمال سننے والوں کو کسی اور فضا میں پہنچا دیتا ہے جو دراصل خواب اور تخیل اور کشف کی فضا ہے جہاں بقول اقبال:

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

چند ابیات مع ترجمہ وشرح:

(۱):

الف اللہ چنبے دی بوٹی من وچ مرشد لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی مِلسیں ہر رگے ہر جائی ہُو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلاں پر آئی ہُو
جیوے مرشد کامل باہو جیں ایہہ بوٹی لائی ہُو

الف

اسم اللہ ذات
چنبیلی کی بیل کی مانند ہے
جو مرشد نے میرے دل میں لگا دی
ہر رگ میں اور ہر جگہ پر اسے ذکر کا پانی ملا
اب پھلنے پھولنے پہ آئی تو
خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی

باہو!
مرشد کامل سلامت رہے
جس نے یہ بوٹی لگائی۔

چار مصرعوں کے اس بیت میں ایک صوفیانہ تجربہ، ایک نہایت خوبصورت تشبیہ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ جب درویش پہلے پہل شیخ کے حلقہ میں آتا ہے تو اولین کارروائی یہی ہوتی ہے کہ ذکر اس کے قلب میں رواں کر دیا جاتا ہے، یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے پہلے اس کے دل کی زمین تیار کی جاتی ہے تاکہ اخلاق درست ہو جائیں اور نیت خالص اور پختہ ہو جائے، پھر ماحول اور آب و ہوا کی موافقت کا اہتمام کیا جاتا ہے یعنی خلوت، لوگوں سے کم میل جول اور درویشوں سے صحبت رکھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو پھر ذکر کو درویش کے دل میں ڈالا جاتا ہے۔ اسے یہ پڑھنے کی زبانی ہدایت ہی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت شیخ ذکر کو بیج کی طرح مرید درویش کے دل میں بوتا ہے۔ اسی خاطر ایمان کی مثال بھی بیج سے دی جاتی ہے۔ یہ پھر اُگتا یا بڑھتا ہے۔ شیخ کی نگرانی میں مزید ذکر سے اس کی نشوونما میں ترقی ہوتی ہے کیونکہ اب شیخ باغبان کا کام کرتا ہے جو درویش کے دل کی زمین اور اس کے اندر پودے کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔

عام طور پر ابتداء میں نفی اثبات (نفی لا الہ، اثبات الا اللہ) کی کثرت کا التزام کیا جاتا ہے۔ درویش دن میں کئی سو بار لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہیں، اس سے ذکر کے رواں ہونے میں مدد ملتی ہے۔

حضرت سلطان باہو نے یہاں ذکر کی تلقین کو چنبیلی کی بوٹی سے تشبیہ دی ہے جسے مرشد نے دل میں لگا دیا، پھر نفی اثبات کے ذکر نے گویا اس بوٹی کی آبیاری کی۔ خیال کے ساتھ ساتھ تشبیہ چاروں مصرعوں میں پھیل گئی ہے اور اس کی ہر جز و معنی خیز ہے۔

جب ذکر رواں ہو جاتا ہے تو درویش کے سارے وجود میں سرایت کر جاتا ہے۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ماحول تک ذکر سے بھر گیا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جس کے زیر اثر مختلف چیزیں وہی ذکر کرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ایک مستی کی کیفیت ہوتی ہے، اسے آگے چنبیلی کے پھلنے پھولنے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی خوشبو خود ذکر کرنے والے کو مست کر دیتی ہے۔ جن درویشوں کی روحانی حس بیدار ہوتی ہے، وہ ذکر کرنے والے کے دل سے یہ خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ اس بوئے آشنائی سے انہیں اپنے ہم ذوق لوگوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہی ان کے تعارف کی بنیاد ہوتی ہے۔

اس موقع پر درویش کا دل اپنے مرشد کے لیے شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس کے دل سے بے

اختیار اپنے مرشد کی درازیٔ عمر کے لیے دعائیں نکلتی ہیں جس نے ذکر کا یہ پودا لگایا تھا۔ مرید اس لیے ممنونِ احسان ہوتا ہے کہ یہ کام مرشد نے محض اللہ کے لیے کیا اور اپنے لیے اجر بھی اللہ کے ذمہ رکھا تھا۔

(۲):

چڑھ چنا تے کر رُشنائی ذکر کریندے تارے ہُو
گلیاں دے وچ پھرن نمانے لعلاں دے ونجارے ہُو
شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں تو بھارے ہُو
تاڑی مار اڈاوو نہ باہو آپے اڈن ہارے ہُو

اے چاند
اب نکل آ اور روشنی پھیلا دے
تارے کب سے ذکر میں مشغول ہیں
لعلوں کے بیوپاری
گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں
کسی پر مسافرت کی آزمائش نہ آئے
ورنہ تنکے بھی ان پر بھاری ہو جاتے ہیں
باہو!
ہمیں
تالی بجا بجا کر مت اڑاؤ
ہم تو پہلے ہی
اڑنے کے لیے
پر تولے بیٹھے ہیں

اس بیت کے پہلے مصرع کے امیجز میں ایسا سحر ہے کہ سننے والے کا تخیل اس سے مسحور ہو جاتا ہے اور باقی تینوں مصرعوں کے ساتھ اس کی ظاہری بے ربطی کی طرف اس کی توجہ نہیں جاتی۔ جناب ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے ساتھ بھی یہی ہوا، حالانکہ وہ ظاہری ربط کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

یہ چاند کی روشنی اور تاروں کا ذکر پھر علامتی انداز میں ہوا ہے۔ صوفیا کے ہاں ذکر کا مقصد معرفت تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ چاند کی روشنائی سے مراد نورِ معرفت ہے۔ اسی کو صوفیاء کرام صحیح دانائی سمجھتے ہیں۔

جب یہ دانش یا معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کو لوگوں میں بانٹنے کا حکم ملتا ہے مگر عام لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہوتی۔ فقیر جب اس بے قدری کے سلوک کے مقابلے میں اپنی محنت اور ریاضت کو دیکھتا ہے جس کے نتیجے میں اس کو معرفت کا یہ نور ملا اور لوگ اس کی بے قدری کر رہے ہیں تو قدرتی طور پر اسے دکھ ہوتا ہے، اس دکھ کا اظہار سلطان صاحبؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ دانائی کے ساتھ عوام نے شاید ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ دانائی اپنا فیض گلیوں میں لیے پھرتی ہے۔ ''امثال'' کا

مصنف، دانشور بادشاہ فرماتا ہے:

''حکمت کوچہ میں زور سے پکارتی ہے، وہ کوچوں میں اپنی آواز بلند کرتی ہے، وہ پُر ہجوم بازار میں چلاتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے مدخل پر اور شہر میں یہ کہتی ہے: اے نادانو! تم کب تک نادانی کو دوست رکھو گے اور ٹھٹھے باز کب تک ٹھٹھے بازی میں خوش رہیں گے اور احمق کب تک علم سے عداوت رکھیں گے۔''

شیکسپیئر کہتا ہے:

''دانائی گلیوں میں پکارتی پھر رہی ہے مگر کسی کو اس کا خیال نہیں۔'' (ڈرامہ ہنری چہارم)

اور سلطان صاحبؒ فرماتے ہیں:

گلیاں دے وچ پھرن نمانے، لعلاں دے ونجارے ہُو

جواہرات تقسیم کرنے والے گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ صوفیاء میں کچھ معلمین کو حکم ہوتا ہے کہ سفر کر کے اپنی حکمت و معرفت کا فیض لوگوں تک پہنچاؤ جنہیں قرآن میں سائحین (سیر کرنے والے، پھرنے والے) کہا گیا ہے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ کی عمر کا ایک خطیر حصہ اسی طرح پھرتے ہوئے گزرا۔ چنانچہ یہ ایک فقیر سائح کا تجربہ ہے:

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنہاں نوں بھارے ہُو

(۳):

دل دریا سمندر ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو
وِچے بیڑے وِچے جھیڑے وِچے ونجھ مُہانے ہُو
چوداں طبق دلے دے اندر تنبو وانگوں تانے ہُو
دل دا محرم ہووے باہو سوئی رب پچھانے ہُو

دل
دریاؤں اور سمندروں کی طرح گہرے ہوتے ہیں
اندر ہی کشتیوں کے بیڑے اور ہنگامے!
اور اندر ہی چپو اور ملاح!
چودہ طبق
دل کے اندر خیموں کی طرح تنے ہوئے ہیں
باہو!
بس جو دل کا محرم ہوگا
وہی
رب کو پہچانے گا

جناب ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے اس بند کی بہت تعریف کی ہے بلکہ فرمایا ہے: ''انسانی دل کی وسعت، گہرائی اور بلندی کے متعلق اتنے زوردار اور اثر انگیز مصرعے سارے پنجابی لٹریچر میں کہیں اور نہ ہوں گے۔''

دل کی گہرائی سمندروں سے بھی زیادہ سمجھو۔ ایک ہنگامہ اس کے اندر رہتا ہے۔ سفر و حضر کی ساری منزلیں اور ان کے سارے اسباب موجود ہیں۔ سلطان صاحب نے دوسرے مصرعے میں بحری سفر کے لوازمات کی طرف اشارہ کر کے سلوک کے مراحل کو بیان فرمایا ہے۔

تیسرے مصرعے میں فرمایا ہے کہ دل کے اندر پوری کائنات سمائی ہوئی ہے۔ چودہ طبق خیمے کی طرح اندر تنے ہوئے ہیں۔ جب فرد کی ذات مرکز سے پھیل کر وسعت اختیار کرتی ہے تو پھر کائنات (چودہ طبق) بھی اس کے لیے محدود و مختصر ہو جاتی ہے لیکن اس وسعت کو پانے کے لیے دل کے سمندر کی اتھاہ گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔

دل کا محرم ہونے سے دل کی ساری قوتوں، صلاحیتوں، کمالات اور کرامات سے واقف ہونا مراد ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر سوچیں تو اسی ''دل کا محرم'' ہونے سے اپنی پیدائش کے مقصد اور اس کے شعور کے معنی نکل آئیں گے۔ جس طالب حق کی سمجھ میں یہ باتیں آجاتی ہیں وہی رب کو پہچان پاتا ہے۔ سلطان صاحبؒ نے اس مصرع میں من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کا ہو بہو ترجمہ فرمادیا ہے۔

اس بیت کو پڑھتے ہو اور سنتے ہوئے قاری یا سامع ''دل دریا سمندروں ڈونگھے'' سے واقف ہو کر ''سوئی دل دا محرم ہووے'' کی تعلیم کو خود بخود پالیتا ہے۔ سلطان صاحبؒ کے ابیات میں یہ صفت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ وہ ربط جسے منطقی انداز میں سوچنے والے نہیں پاسکتے، وجدانی بلکہ فطری انداز میں سوچنے اور محسوس کرنے والے لوگ باآسانی پالیتے ہیں اور یہاں تو خیر ربط کا معاملہ بہت واضح ہے جسے دل و دماغ دونوں محسوس کرتے اور مفہوم کو پالیتے ہیں۔

(۴):

سَو ہزار تہناں توں صدقے منہ نہ بولن پھکا ہُو
لکھ ہزار تہناں توں جیہڑے گل کریندے ہکا ہُو
لکھ کروڑ تنہاں تو جیہڑے نفس رکھیندے جھکا ہُو
نیل پدم تنہاں توں باہو سُون سداون سِکا ہُو

ہزار باران کے صدقے جاؤں
جن کے منہ سے ترش بات نہیں نکلتی
لاکھوں باران کے صدقے جاؤں
جو پکی بات کرتے ہیں
کروڑوں باران کے صدقے جاؤں
جو جھک کر رہتے ہیں
باہو!
اربوں باران کے قربان جاؤں
جو سونا ہونے کے باوجود
سکہ کہلوانے پر راضی ہیں!

اس بیت میں حضرت سلطان العارفین سلطان باہو نے فقیروں کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں۔ وہ ان پر سے قربان جاتے ہیں جو زبان سے کوئی ترش بات نہیں نکالتے ہیں۔ بولتے ہیں تو دل موہ لیتے ہیں اور ان کی بات دل میں اتر جاتی ہے۔

جب بات کرتے ہیں تو وہ واضح اور پکی بات ہوتی ہے۔ قولو قولا سدیدا (پکی بات کرو)

علو مرتبت ہونے کے باوجود ان میں نیاز مندی ہوتی ہے، عاجزی ہوتی ہے اور انکسار ہوتا ہے۔

باہر سے بہت معمولی دکھائی دیتے ہیں اور اندر سے نہایت غیر معمولی ہوتے ہیں۔ اندر سے سونا ہوتے ہیں مگر سکہ کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے کبھی خواہش مند نہیں ہوتے۔ اسلام سے باہر ایک بڑی روایت کے نمائندے سے کسی نے پوچھا کہ تم کیا ہو؟ اس نے کہا: ''تم جو کچھ سمجھ کر آئے ہو، میں بس وہی ہوں۔'' صوفیاء بھی کبھی اپنے اصلی مرتبے کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے۔

(۵):

ہک جاگن ہک جاگ نہ جانن جاگدیاں ہک سُتے ہو
ہک ستیاں جا واصل ہوئے جاگدیاں ہک مُتے ہو
کے ہو یا جے گھگو جاگے لیندا ساہ اُپتے ہو
قربان تنہاں تو باہو جنہں کھوہ پریم دے جُتے ہو

ایک وہ ہیں
جو جاگ رہے ہیں
ایک وہ ہیں جو جاگنا جانتے ہی نہیں
ایک وہ ہیں جو جاگتے ہوئے بھی سو رہے ہیں
ایک وہ ہیں جو سوئے ہوئے بھی واصل ہوئے
ایک وہ ہیں جو جاگتے ہوئے بھی لوٹے گئے
اُلو جاگ رہا ہو اور الٹے سیدھے سانس لے رہا ہو
تو کیا فائدہ؟
باہو!
میں ان پر سے قربان
جنہوں نے
پریم کے کنوئیں
چلا دیے!

طبائع اور استعداد کے اختلاف کی وجہ سے عمل اور اس کے نتیجے میں کیفیت و اہمیت بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ حق کے طالبوں میں کچھ بیدار ہوتے ہیں، کچھ بیداری کے حال سے ہی بے خبر ہیں کیونکہ بس غفلت میں بے ہوش سوئے پڑے ہیں اور ایک وہ ہیں جو جاگ رہے ہیں مگر عمل ایسا ہے کہ جیسے ہوش و حواس سے کام نہیں لے رہے۔ اقبال کا بڑا خوبصورت شعر ہے۔

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

(بت کے آگے بیدار دل کافر اس دیندار سے اچھا ہے جو حرم کے اندر جا کر سو رہا۔)

دل کی بیداری بڑی بات ہے، خواہ کوئی کافر بیدار دل صنم خانے میں ہی کھڑا ہو مگر ایک دن وہ بیت اللہ میں ضرور پہنچ جاتا ہے یعنی حق کو پالیتا ہے کیونکہ اس کا دل جاگتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں لوگ سویا ہوا خیال کرتے تھے کیونکہ ان کا عمل دوسروں سے الٹ ہوتا تھا، وہ تو پہنچ گئے اور دوسرے، جو خود کو بیدار مغز اور عقلمند خیال کرتے تھے، راہ میں ہی لٹ گئے۔ ان کی حاضر دماغی ان کے کچھ کام نہ آئی۔

راتوں کو جاگنا اور الٹے سیدھے سانس لینا اور سمجھنا کہ مقصد برآری کا یہی طریقہ ہے، غلط بات ہے۔ شاید یہاں سلطان العارفینؒ ان خودسر طالبوں اور درویشوں کا ذکر کر رہے ہیں جو کہیں سے پڑھ سن کر پاس انفاس یا حبس دم میں مشغول ہو جاتے ہیں، سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو الو بھی کر لیتا ہے مگر الو کا الو ہی رہتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی مرشد کامل کے پاس جا کر سانس کے ساتھ ذکر جاری کرنے کے ٹھیک طریقے سیکھو ورنہ ویسے کے ویسے ہی رہو گے۔

ایسے ہی لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ لوگ قابل تعریف ہیں اور یہاں موجود ہیں جنھوں نے فیض جاری کر رکھا ہے۔ (گھوہ پریم دے جتے ہو) ہر ایک وہاں جا سکتا ہے اور ان سے رشد و ہدایت پا سکتا ہے۔ وہی توجہ کریں گے اور جسم کے اندر لطائف (شعور کے لطیف مراکز) کو بیدار کر دیں گے اور اس راہ پر گامزن کر دیں گے جو اللہ والوں کی راہ ہے۔

اس شعر میں یہ رمز پوشیدہ ہے کہ اکیلے کچھ نہ بنے گا، مرشد کامل کی رہنمائی اور اس کا روحانی فیض ضروری ہے ورنہ دربدر دھکے کھاتے پھرو گے!

(۶):

ایہہ تن میرا چشماں ہووے، مرشد ویکھ نہ رجاں ہُو
لُوں لُوں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں ہک کھولاں ہک کجاں ہُو
اتنیاں ڈِٹھیاں صبر نہ آوے ہور کتے وَل بھجاں ہُو
مرشد دا دیدار ہے باہو لکھ کروڑاں ہجاں ہُو

کاش میرا یہ سارا بدن آنکھ بن جائے
میں مرشد کے دیدار سے سیر نہیں ہوتا
ہر روئیں کے ساتھ لاکھوں آنکھیں پیدا ہو جائیں
تا کہ ایک بند کروں تو دوسری کھل جائے
پھر بھی کسی طرح قرار نہ آئے
تو بھاگ کر کہاں جاؤں؟
باہو!
مرشد کا دیدار

میرے لیے
لاکھ کروڑ حج کے برابر ہے

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے اپنے مرتب کردہ کلام سلطان باہو کے حواشی بعنوان ''اشارات'' میں اس بیت کے فنی حسن کے بارے میں لکھا ہے۔ ''یہ باہو کے بہترین ابیات میں سے ہے، مرشد کے عین مقابل بیٹھے ہوئے بھی مرید کو اس کے دیدار سے سیری نہیں ہوتی۔ اس کیفیت کو لاکھوں آنکھوں میں ایک کھولنے ایک بند کرنے سے جس طرح محسوس کرایا گیا ہے، وہ اعجاز ہے۔''

درویشوں کی نفسیات میں مرشد کو اس قدر اولیت دی گئی ہے کہ وہ جب سب سے الگ خلوت میں مصروف ہوتے ہیں تو مرشد کے تصور کو مکمل طور پر اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں بلکہ یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ میں نہیں بلکہ خود مرشد ذکر میں مصروف ہے۔ گویا ان کے اعضاء مرشد کے اعضاء ہیں۔ ان کا قلب مرشد کا قلب ہے اور ان کی زبان مرشد کی زبان ہے۔ یہی کیفیت جب بڑھتی ہے تو کبھی کبھی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود کام نہیں کر رہے ہیں بلکہ مرشد کر رہا ہے۔ کتاب لکھیں تو محسوس کرتے ہیں کہ مرشد لکھ رہا ہے بلکہ پھر کوئی کرامت بھی ان سے سرزد ہو تو مرشد کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

مرشد کے ساتھ تعلق پیدا ہوتے ہی اس انس و محبت کے جذبہ کی ابتداء ہو جاتی ہے جو بڑے دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے، درویش مرشد کو اس کے ظاہر و باطن سمیت قبول کر لیتا ہے۔ ہر معاملے میں اس کی پیروی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے کردار پر مرشد کی گہری چھاپ لگ جاتی ہے۔ اس سے درویش اپنی نسبت کے حوالے سے فوراً پہچانا جاتا ہے۔

مرشد کی صحبت میں یا غیبت میں درویش کی توجہ ہر آن مرشد کی طرف منعطف رہتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن اپنے تئیں مرشد کے ظاہر و باطن سے فیض یاب ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس عالم میں درویش جو وجد و اہتزاز محسوس کرتا ہے اسے اس بیت میں بیان کیا گیا ہے۔

مرشد کا دیدار لاکھ کروڑ حج سے یوں بہتر ہے کہ اسی دیدار اور فیض سے وہ ایسی قوت حاصل کرتا ہے جو اس کی تمام عبادات اور ریاضیات کا محرک اور سبب بنتی ہے۔ اس لیے مولانا روم نے فرمایا تھا:

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

ان بیت کی شعری خوبیوں کا ہر ایک معترف ہے بلکہ سماع کی تقریبات میں سن کر اس کے حسن صوت و تخیل سے سامعین اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ جھومنے لگتے ہیں۔ شدتِ شوق اور عشق کی تڑپ کا اظہار اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ ''لُوں لُوں دے مُدھ لکھ لکھ چشماں ہک کھولاں ہک کجاں ہُو'' یعنی پلک جھپکنا بھی گوارا نہیں۔ اگر ایک آنکھ کی پلک جھپکے تو دوسری کھلی رہے۔ عاشق کو نظارے کا وقتی طور پر ہی سہی، ایک لمحے کے لیے ٹوٹ جانا بھی گوارا نہیں۔

(سید احمد سعید ہمدانی کی کتاب ''سی حرفی۔ ابیات سلطان باہُو'' سے اقتباسات)



احمد ندیم قاسمی سے ایک مکالمہ

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

س ۱: پیرزادہ احمد شاہ کو احمد ندیم قاسمی نے کھو دیا لیکن احمد ندیم قاسمی نے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا، کبھی زندگی کے کسی لمحے میں یہ احساس تو نہیں ہوا کہ ''پیرزادہ احمد شاہ'' زیادہ بہتر تھا۔

ج: پیرزادہ احمد شاہ ہی احمد ندیم قاسمی ہے اور احمد ندیم قاسمی اندر سے پیرزادہ احمد شاہ ہی ہے۔ میں اپنی ''اصل'' کو نظر انداز کرنے کا قائل نہیں ہوں کہ شخصیت کے تناور درخت کی یہی تو جڑ ہے۔

س ۲: آپ کو کب احساس ہوا کہ آپ پیر نہیں ادیب ہیں؟

ج: پیر تو میں کبھی نہیں رہا۔ صرف ایک پیر کی اولاد ہوں، اس لیے ابتدا میں میرے نام کے ساتھ ''پیرزادہ'' کا سابقہ ''لاحق'' رہا۔ مجھے تو پیری مریدی سے باقاعدہ بیر ہے۔ میں نے مریدوں کے ساتھ پیروں کے ایسے ایسے برتاؤ دیکھے ہیں کہ الاماں والحفیظ! (میرے افسانے ''بین'' اور ''چھبن'' وغیرہ اس کے گواہ ہیں) میں نے جب مڈل کلاسوں میں اپنے سرپرست چچا کے کتب خانے میں شامل کتابوں اور رسالوں (نگار، صوفی، نیرنگ خیال، ہمایوں وغیرہ) کا مطالعہ شروع کیا تو تبھی میرے اندر کا ادیب آنکھ مل کر بیدار ہوا مگر میں نے چودہ سال کی عمر میں آغاز شاعری سے کیا۔ افسانہ نگاری کی طرف تو چار پانچ برس بعد مجھے میرے عزیز دوست محمد خالد اختر نے راغب کیا۔

س ۳: وادیٔ سکون سکیسر میں آپ کے آباؤ اجداد کا بسایا گیا ''اسلام آباد'' اور آج پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں (مادی ترقی سے قطع نظر) آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ج: مادی ترقی کے لحاظ سے میرے اجداد کا اسلام آباد، سکیسر کے قدموں میں پھیلی ہوئی وسیع و عریض جھیل کے کنارے ایک ڈھیری پر بکھرا ہوا ملبہ ہے اور پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد، گریڈوں میں بنا ہوا بظاہر نہایت خوبصورت شہر ہے جس کے قبرستان میں بھی (شنید ہے کہ) میتوں کو بھی گریڈوں کے مطابق دفن کیا جاتا ہے۔

س ۴: سرگودھا کے قصبہ ''انگہ'' سے لاہور شہر تک کا سفر، کتنے مراحل درمیان میں آئے؟

ج: میرا گاؤں ''انگہ'' قصبہ نہیں، گاؤں ہے اور اب یہ ضلع سرگودھا میں نہیں، ضلع خوشاب میں ہے۔ انگہ سے لاہور تک کے مراحل بے شمار ہیں۔ دہرانے بیٹھوں گا تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصراً عرض ہے کہ خوشاب، کیمبل پور اور شیخوپورہ سے ہوتا ہوا میں بہاولپور پہنچا اور وہاں کے صادق ایجرٹن کالج سے ۱۹۳۵ء میں گریجویشن کی۔ تین چار سال

بیکاری میں گزارے۔ کبھی گاؤں میں اور کبھی لاہور میں۔ یہ نہایت درجہ آزمائش کے دن تھے۔۱۹۳۹ء میں ادھر دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی، ادھر محکمہ آبکاری میں بحیثیت سب انسپکٹر میری ملازمت کا آغاز ہوا۔ مگر ڈیڑھ دو برس بعد وہاں سے بھاگا اور لاہور میں اپنے محسن مولانا عبدالمجید سالک کے ہاں آکر دم لیا۔ انہوں نے ہفت روزہ ''پھول'' اور ہفت روزہ ''تہذیب نسواں'' میں میری ادارت کا بندوبست فرما دیا۔ میں نے اس کے ساتھ ہی رسالہ ''ادب لطیف'' کی بھی ادارت سنبھالی۔ لاہور میں چار پانچ سال کے قیام کے بعد میں پشاور ریڈیو سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں لاہور آ گیا اور یہاں سے رسالہ ''نقوش'' جاری کیا۔ مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا اور اس کی پاداش میں ۱۹۵۱ء میں چھ ماہ کی نظر بندی بھگتی۔ رہائی کے بعد ۱۹۵۳ء سے روزنامہ ''امروز'' کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے پاکستان پر قبضہ کر لیا تو میں پھر جیل میں تھا۔ فروری ۱۹۵۹ء میں رہا ہوا مگر پھر ایوب خان نے اپنے پڑھے لکھے مشیروں کے مشورے سے ''امروز'' ''پاکستان ٹائمز'' اور ''لیل و نہار'' پر قبضہ کر لیا اور میں نے ''امروز'' کی ادارت سے مستعفی ہونے کے بعد ۱۹۶۳ء میں رسالہ ''فنون'' جاری کیا جو ابھی تک چل رہا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں مجلس ترقی ادب کی نظامت سنبھالی۔ ہر تین برس کے بعد اس کے کنٹریکٹ میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ اب تک اس ادارے کا ڈائریکٹر ہوں۔

س ۵: دیہات آپ کے ضمیر میں رچا بسا ہے۔ کسان، زمیندار، کھیت کھلیان، کنویں چشمے، چوپال، مویشی، گھبرو جوان، الہڑ مٹیار اور ظالم جاگیردار بھی آپ کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اگر آپ کا تعلق دیہات سے نہ ہوتا تو کیا وہ تب بھی آپ کو اسی طرح متاثر کرتا؟

ج: اگر میرا تعلق دیہات سے نہ ہوتا تو یہ میری بڑی بدقسمتی ہوتی۔ اس صورت میں دیہات مجھے کیسے متاثر کرتے کہ تاثر تو قربت اور برتاؤ سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے کتنے ہی شہری ادیب دیہات کے بارے میں اول تو لکھتے نہیں اور لکھتے ہیں تو جیسے اپنے موضوع سے جھگڑ رہے ہیں۔

س ۶: آپ کو عموماً دیہات کے موضوعات کا اہم افسانہ نگار مانا جاتا ہے جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ آپ نے دیگر موضوعات یا یوں کہیے شہری مسائل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ کن موضوعات پر لکھتے ہوئے آپ کا ذہن قلم کو رکنے نہیں دیتا؟

ج: میں نے دیہات سے متعلق موضوعات پر افسانے لکھے کیونکہ میں گاؤں میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا اور میری جڑیں وہیں ہیں۔ بعد میں جب میں شہر آ بسا تو ظاہر ہے یہاں کی زندگی کے بعض ایسے گوشے بھی میرے افسانوں کا موضوع بنے جو میرے تجربے اور مشاہدے میں آئے۔ جس مقام اور ماحول سے گزر ہی نہ ہوا ہو، اس کے بارے میں افسانے لکھنا حماقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے صرف انہی شہری موضوعات کے بارے میں کہانیاں لکھیں جن کو میں نے دیکھا اور پرکھا اور برتا ہے۔

س ۷: پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی تحریروں کو اگر دیہات کے موضوعات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان میں کیا فرق ہے؟

ج: میں منشی پریم چند کو افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنا استاد مانتا ہوں۔ ان کے افسانوں کا موضوع بھی دیہات تھے۔ میرے اور ان کے موضوعات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ان کی کہانیاں یوپی کے دیہات سے متعلق ہیں اور میرے

افسانے پنجاب کے دیہات سے کسب فیض کرتے ہیں۔ پھر بیسویں صدی کے آخری دہے تک آتے آتے ادب کے مواد و ہیئت میں بے شمار تبدیلیاں آتی ہیں اور میرے افسانوں میں ان کا انعکاس موجود ہے۔ منشی پریم چند اگر اس دور میں زندہ ہوتے تو ان کے ہاں بھی بدلتی ہوئی انسانی قدروں کا انعکاس یقیناً ہوتا اور مجھ سے بہتر ہوتا۔

س ۸: شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے، نئے افسانہ نگار نے پریم چندی افسانے کو مسترد کر کے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔ ''پریم چندی'' افسانہ صرف ایک دہے میں صرف ان نوجوانوں کے ہاں مسترد ہوا جنہوں نے اپنی کہانیوں میں علامت و تجرید کو اپنایا۔ اس ضمن میں اکا دکا عمدہ کہانیاں بھی لکھی گئیں مگر حقیقت پسندی سے فرار نے اردو افسانے کو بہت نقصان پہنچایا۔ بہر حال اب فاروقی صاحب نے دیکھ لیا ہوگا کہ ''پریم چندی'' افسانے کا ہمہ گیر احیاء ہو چکا ہے اور افسانے کا یہی اسلوب دنیا کے بڑے افسانوں میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ فاروقی صاحب حقیقت پسند ادیب ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق اب تک ان کی رائے بدل چکی ہوگی۔

س ۹: پہلی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی۔ اس پر فخر ہے یا چھپاتے پھرتے ہیں؟

ج: پہلا افسانہ ''بد نصیب بت تراش'' اختر شیرانی کے رسالہ ''رومان'' میں شائع ہوا۔ سال یاد نہیں۔ ۳۸۔۱۹۳۷ء ہی ہوگا۔ نہایت کمزور اور سراسر جذباتی افسانہ ہے۔ کوشش رہی کہ نقاد اس کی طرف متوجہ نہ ہوں مگر ابھی چند برس پہلے ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب نے سبھی معروف افسانہ نگاروں کے اولین افسانے کتابی صورت میں شائع کر دیے اور یوں میری اخفا کی محنت اکارت گئی۔

س ۱۰: ایک مذہبی گھرانے سے تعلق اور ترقی پسند تحریک، یہ دونوں امر اس دور میں متضاد تھے۔ آپ نے انہیں کیسے نبھایا؟

ج: ایک مذہبی گھرانے سے تعلق اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستگی کے درمیان مجھے کوئی تضاد محسوس نہیں ہوا۔ اسلام دنیا کا ''ترقی پسند ترین'' مذہب ہے۔ ملائیت کے مذہب سے الگ، سادہ اور سچا مذہب ہے اور میری ترقی پسندی نے بیشتر قرآن و حدیث اور حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے انسپریشن حاصل کیا ہے۔

س ۱۱: ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے بیشتر وہ تھے جو باقاعدہ ادیب نہ تھے لیکن اسے سہارا دینے والوں میں بڑے شاعر اور ادیب شامل تھے۔ آپ کے خیال میں کس تخلیق کار کا کردار زیادہ فعال رہا۔

ج: ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں سجاد ظہیر اور پروفیسر احمد علی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں اور یہ باقاعدہ ادیب تھے۔ بعد میں علی سردار جعفری اور سید سبط حسن اس تحریک کا سہارا بنے۔ فیض صاحب ذرا اونچی سوسائٹی کے ترقی پسند تھے، اس لیے ان کے کردار کو فعال قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر تاثیر بھی ایک اہم ترقی پسند تھے مگر قیام پاکستان کے فوراً بعد وہ اس نظریے سے پروفیسر احمد علی کی طرح ''تائب'' ہو گئے بلکہ انہوں نے ترقی پسند مصنفین کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کر لیا تھا۔

س ۱۲: انجمن ترقی پسند مصنفین ادبی تحریک تھی لیکن اسے بین، سیاسی جماعت ہونے کی بنا پر کیا گیا۔ کیا اس طرح قدغن لگانے سے کوئی جذبہ مر جاتا ہے۔ دیکھا تو گیا ہے کہ ایسے میں ردعمل زیادہ شدید ہوتا ہے۔ آپ کی نظر میں پابندی کے بعد لکھا گیا ادب زیادہ موقر ہے یا جو ادب پہلے تخلیق ہوا؟

ج: لیاقت علی خاں کی وزارت عظمیٰ کے دنوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا اور اس کے

اراکین پر ریڈیو اور دیگر سرکاری اداروں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ اس پابندی کا صرف یہ اثر ہوا کہ انجمن کے جو ممبر سرکاری ملازمتوں سے وابستہ تھے، وہ اس انجمن کی عملی سرگرمیوں سے دست کش ہو گئے ورنہ پابندی سے پہلے یا بعد کے تخلیقی ادب کا معیار یکساں ہے۔ ترقی پسندوں نے اس پابندی کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ مرکزی حکومت کے ایک دانشور سیکرٹری نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھ پر سے (صرف مجھ پر سے) ریڈیو نشریات کی پابندی ہٹانے کی پیشکش کی جو میں نے یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ میں چند روپوں کے عوض پوری تحریک اور اس کے اراکین کے ساتھ غداری کا ارتکاب نہیں کر سکتا اور مجھے شدید دکھ ہوا ہے کہ آپ کے سے دانشور نے جو کئی کتابوں کا مصنف بھی ہے، مجھے بالواسطہ انداز میں "رشوت" دینے کی کوشش فرمائی۔

س ۱۳: قیام پاکستان کے ابتدائی دور میں ترقی پسندی نے حقیقت کی ترجمانی کو اپنا مطمع نظر بنایا تو ایسا ادب بھی سامنے آیا جس پر مقدمے قائم ہوئے۔ تخلیق کار اور مدیر دونوں کو پیشیاں بھگتنی پڑیں۔ جیسا کہ ۱۹۴۴ء میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "بو" اور مضمون "جدید ادب" شائع کرنے پر حکومت نے ان کے خلاف فحش لٹریچر کی اشاعت کے سلسلے میں مقدمہ دائر کیا جو ایک برس تک چلا اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ آج ادب کے موضوعات میں وہ بیباکی موجود ہے جو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔ یہ صورتحال ادب کے لیے خوش آئند ہے یا نقصان دہ؟

ج: منٹو پر افسانہ "کالی شلوار" اور عصمت کے افسانہ "لحاف" کے خلاف مقدمات قیام پاکستان سے پہلے قائم ہوئے تھے۔ پھر میں ۱۹۴۴ء میں رسالہ "ادب لطیف" کا مدیر تھا اور میں نے ہی منٹو کا افسانہ "بو" اور مضمون "جدید ادب" شائع کیا تھا۔ چنانچہ منٹو کے علاوہ میں بھی ملزم ٹھہرا۔ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا اور انگریز حکمران کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ اس طرح کے افسانوں اور مضامین کا زیادہ نوٹس نہیں لیتا تھا۔ بہرحال ان مقدمات میں ہم دونوں بری کر دیے گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اتنا ہوا کہ حکومت نے بیک جنبش قلم لاہور کے تین اہم ادبی رسائل کی اشاعت چھ چھ ماہ کے لیے بند کر دی۔ "نقوش" "سویرا" اور "ادب لطیف" اس حکم نامے کی زد میں آئے۔ میں "نقوش" کا ایڈیٹر تھا۔ اس واقعے کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ اگرچہ محمد حسن عسکری نے ترقی پسند مصنفین کے خلاف تحریک چلا رکھی تھی مگر حکومت کے اس اقدام کی مخالفت میں وہ ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور مجھے یاد ہے کہ جب منٹو اور میں جاوید اقبال صاحب کے دولت کدے جاوید منزل میں ان کے سرپرست چودھری محمد حسین سے ملاقات کرنے گئے جو اس زمانے میں پریس برانچ کے انچارج تھے تو عسکری ہمارے ہمراہ تھے اور انہوں نے ہمارا کیس اخباروں میں بھی لڑا۔ منٹو کے افسانہ "دھواں" پر بھی کیس چلا تھا۔ یہ رسالہ "جاوید" میں شائع ہوا تھا۔ آج تو بے حدود اور بے قیود افسانہ نگاری اور شاعری بہت زوروں سے تخلیق ہو رہی ہے اور یہ صورتحال ادب کے لیے خوش آئند نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں اس طرح کے ادب کے بعض حصے اتنے کھلم کھلا فحش ہوتے ہیں کہ شاید یورپ اور امریکہ میں بھی ان کی اشاعت قابل اعتراض ٹھہرے۔ شعر و ادب کی تخلیق کے لیے یقیناً آزادی ہونی چاہیے مگر آزادی کے بھی بعض اپنے مطالبات ہوتے ہیں۔ میرا ایک شعر ہے:

عشق جنوں سہی مگر، عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی

س ۱۴: کیا آج اظہار خیال کی آزادی ہے؟ اگر ہے تو کیا آج کا ادیب اس تجربے سے محروم نہیں جو آپ نے سالوں پہلے جیل جانے کا کیا اور سی کلاس یا بی کلاس مقدر ٹھہری۔ کیا آج کا ادیب اس عہد کے تخلیق کار سے زیادہ خوش قسمت ہے؟ آپ نومبر ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ مئی ۱۹۵۱ء سے نومبر ۱۹۵۱ء تک تقریباً سات ماہ جیل میں گزارے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء پھر سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند رہے۔ غرض ترقی پسند تحریک کے ساتھ آپ کی وابستگی اور خدمات سبھی کے علم میں ہیں لیکن اس کا اعتراف جتنا کہ حق تھا، اس قدر نہ کیا گیا۔ اس کی وجہ؟

ج: تین مارشل لاؤں کو چھوڑ کر باقی ادوار میں ایک حد تک اظہار خیال کی آزادی تو یقیناً حاصل رہی ہے اور میں نے تو مارشل لاء کے دنوں میں مارشل لا، حکومت کو للکار کر ایک ادبی کانفرنس میں ایسی باتیں کہہ دی تھیں جو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو (خدا انہیں بخشے) سخت تلخ لگیں اور انھوں نے ان باتوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب ترقی پسند مصنفین یہ آزادی برتتے تھے اور جیلوں میں بند کر دیے جاتے تھے اور عرصے تک سی کلاس کی صورت میں ننگے فرش پر بازو کا تکیہ بنا کر سوتے تھے مگر آج خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اہل قلم کو آزاد گفتاری کی اس طرح کی سزائیں نہیں ملتیں اور وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی اس خوش نصیبی کا سلسلہ جاری رہے۔ ۱۹۴۹ء میں کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کی سیکرٹری شپ مجھ پر زبردستی ٹھونس دی گئی تھی، جب فیض کے سے سینئر شاعر اور ممتاز حسین کے سے سینئر نقاد بھی کانفرنس میں موجود تھے۔ میں نے (اور ابراہیم جلیس نے بھی) احتجاج کیا کہ یہ جو متعدد اہل قلم کے بائیکاٹ کی قرارداد مرتب کی گئی ہے اس سے ہمارا متفق ہونا مشکل ہے مگر اکثریت کی رائے ہمارے خلاف تھی اس لیے بائیکاٹ کی نہایت بیہودہ قرارداد منظور کی گئی جس نے ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے قدم اکھیڑ دیے۔ ۱۹۵۱ء کے اواخر میں جیل سے رہائی کے بعد میں نے ۱۹۵۲ء میں کراچی میں کل پاکستان کانفرنس کا انعقاد کیا۔ تین سیشن تھے جن کی صدارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا عبدالمجید سالک اور پیر حسام الدین راشدی نے کی۔ اس میں ہم نے انتہا پسندانہ منشور اور ساتھ ہی بائیکاٹ والی قرارداد واپس لے لی مگر جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ اس کانفرنس میں بھی مجھے سیکرٹری منتخب کر لیا گیا جبکہ میں نے ظہیر کاشمیری کا نام تجویز کیا تھا مگر ظہیر بھی میرے حق میں بیٹھ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے انجمن کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اور ۱۹۵۲ء میں اس اعلان کے ساتھ میں مستعفی ہو گیا کہ اگر کوئی صاحب انجمن کو انتشار سے بچانے کا ذمہ لیں تو میں ایک رضا کار کی طرح ان کا ساتھ دوں گا۔ مگر افسوس کہ کوئی آگے نہ آیا۔ میں نے ۷۷-۱۹۷۶ء میں انجمن کے احیاء کی کوشش کی اور معروف ترقی پسندوں کی اس بارے میں رائے پوچھی۔ ان سب کے جواب میرے پاس محفوظ ہیں۔ فوراً بعد ضیاء الحق نے پاکستان پر قبضہ کر لیا اور میرا پروگرام دھرا رہ گیا۔ رہی یہ بات کہ میری خدمات کا کماحقہ اعتراف نہیں ہوا تو یہ یقیناً درست ہے مگر مجھے اس اعتراف کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس سے میرا ضمیر مطمئن ہے اور ضمیر کے اطمینان سے بڑی نعمت شاید ہی کوئی اور ہو۔ آپ قدر دانی کی بات کرتی ہیں۔ چلیے، ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ ۱۹۵۶ء میں پاکستانی روزناموں کے سولہ ایڈیٹروں نے عوامی چین کا دورہ کیا اور تبت کے سوا چین کے ہر حصے میں گھومے۔ فیض احمد فیض اس وفد کے لیڈر تھے۔ ہم جس شہر میں بھی گئے وفد کے لیڈر نے وہاں ہمارا تعارف کرایا مگر مجال ہے جو فیض صاحب نے ''امروز'' کی ادارت کے سوا کسی بھی مقام پر یہ کہا ہو کہ یہ شخص شاعر بھی ہے اور افسانہ بھی لکھتا ہے۔

آخری دن جب چینیوں کو کسی طرح میری شاعری اور افسانہ نگاری کا علم ہوا تو وہ ہجوم کر کے مجھ پر محبت سے جھپٹے کہ تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ کیا میں خود جگہ جگہ کہتا پھرتا کہ میں ایک روزنامے کے مدیر کے علاوہ شاعر اور کہانی کار بھی ہوں؟ آپ یہ سوال میرے وفد کے لیڈر صاحب سے پوچھیے۔ اسی طرح ملتان کے ایک بڑے مشاعرے کا ذکر ہے۔ صدارت اس زمانے میں مغربی پاکستان اسمبلی کے ایک سپیکر صاحب کر رہے تھے جنہیں شعر و ادب سے شغف تھا۔ حبیب جالب نے وہاں اپنی نظم ''دستور'' پڑھ دی اور صدر کی حالت مارے گھبراہٹ کے غیر ہوگئی۔ میں نے جالب سے صرف اتنا کہا کہ یار یہ نظم پڑھنے کے لیے بے شمار دوسرے فورم موجود ہیں، مشاعرے کا صدر بیچارہ ''بی با'' آدمی ہے۔ تم نے یہ نظم پڑھ کر اسے پریشان کر دیا ہے۔ اسی بات کو حبیب جالب لے اڑا کہ دیکھو دیکھو یہ ترقی پسند بنا پھرتا ہے اور مجھے میری نظم پڑھنے سے روکتا ہے! میں نے زندگی میں جالب کے لیے بہت کچھ کیا جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں مگر اس نے مجھے اس کا جو بدلہ دیا وہ کچھ ایسا عجیب نہیں تھا کہ میرے ساتھ میرے بیشتر ''احسان مندوں'' نے یہی سلوک روا رکھا ہے، اس صورت میں میری خدمات کا اعتراف کون کرے!

س ۱۵: خود ساختہ جلاوطنی کی اصطلاح ہمارے بعض تخلیق کاروں کے بارے میں مروج ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: جو جلاوطنی محترم فیض صاحب اور میرے عزیز فراز صاحب نے اختیار کی، اسے میں ''خود ساختہ'' جلاوطنی تو قطعی نہیں کہوں گا۔ البتہ یہ خود اختیار کردہ جلاوطنی تھی اور اس کا اظہار دونوں نے کیا۔ یہ تو ان کے عقیدت مندوں کی محبت کا اعجاز ہے کہ انہیں جلاوطن قرار دے کر نظمیں لکھتے رہے ورنہ خود انہوں نے اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اس طرح تو کرۂ ارض پر پاکستان کے لاکھوں ''جلاوطن'' موجود ہیں۔

س ۱۶: علامہ اقبال آفاقی شاعر ہیں۔ آپ بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ شاعر کی تخلیق کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے معنی کے نئے نئے در وا ہوتے جاتے ہیں۔ ابتدائی دور میں چند ایک معاملات میں آپ کو اقبال کے نظریات سے اختلاف تھا۔ مثلاً شاہین کا کبوتر پر جھپٹنا، مرد مومن کا تصور پیش کرنے کے باوجود خود اقبال کا اپنی کتابوں کو غازی امان اللہ، شاہِ افغانستان، نواب آف بھوپال، نادر خاں شاہ افغانستان وغیرہ کے نام معنون کرنا۔ خانقاہوں کے بارے میں بھی آپ کا اختلاف واضح ہے۔ کیا آپ اس پر اب بھی قائم ہیں؟

ج: جی ہاں۔ اقبال کی عظمتوں کا معترف ہونے کے باوجود میں آج بھی ان اعتراضات کو دہرانے کو اس لیے تیار ہوں کہ آج تک ان کے کسی عقیدت مند نے مجھے میرے ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ کبوتر کے سے معصوم پرندے پر شاہین کو چھوڑ دینا ''پیامِ مشرق'' کہ امان اللہ خان والی افغانستان سے منسوب کرتے ہوئے یہ کہنا کہ ''اے امیر ابن امیر ابن امیر'' کچھ ایسی بات ہے جو اقبال کے منہ پر نہیں جچتی کہ امیر ابن امیر ابن امیر ہونا از روئے اسلام بھی کوئی قابل فخر بات نہیں ہے۔ پھر اپنی دوسری کتاب اسی امان اللہ خان کے تخت کو غصب کرنے والے نادر خان کے نام منسوب فرما دینا بھی مجھے بھلا معلوم نہیں ہوا اور اگر علامہ صاحب اپنی ''ضرب کلیم'' نواب بھوپال کی بجائے اپنے خدمت گار علی بخش کے نام منسوب کر دیتے تو ان کی عظمتوں میں مزید اضافہ ہوتا۔ اتنی سی بات ہے ورنہ میں علامہ کے کمالات کا بے حساب احترام کرتا ہوں۔ خانقاہوں کے بارے میں آپ نے بس اختلاف کا ذکر کیا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو علامہ کی ملائیت دشمنی، سامراجیت دشمنی اور فیوڈل ازم کی دشمنی کی وجہ سے انہیں اپنا

رہنما قرار دیتا ہوں۔

س ۱۷: کیا آپ کی ملاقات علامہ اقبال سے بھی ہوئی۔ آپ کے ساتھی حفیظ ہوشیار پوری ان لمحات کو ''عمر عزیز کے بہترین لمحے'' کہتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں عمر عزیز کے بہترین لمحے کون سے تھے؟

ج: جی ہاں۔ ایک بار علامہ اقبال کے حضور حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا چراغ حسن حسرت، حضرت علامہ کے ہاں جا رہے تھے۔ سو وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ یہ شاید ۱۹۳۷ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ مجھے سعادت صرف اس حد تک حاصل ہوئی کہ علامہ کو دیکھا۔ وہ جاوید منزل کے سامنے والے لان میں پلنگ پر نیم دراز حقہ پی رہے تھے۔ محترم سالک صاحب نے میرا تعارف کرایا تو انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور اس کے بعد میں ان کی گفتگو سنتا رہا اور بس۔ میں بیس برس کا لڑکا تھا۔ شاعری وغیرہ کا آغاز تھا۔ میں ان کی گفتگو میں کیسے شامل ہو سکتا تھا۔ علامہ اور سالک صاحب کی گفتگو کا موضوع بیشتر مولانا ظفر علی خاں رہے۔ اسی ملاقات کے دوران مولانا چراغ حسن حسرت نے ایک کلاسیکل جملہ کہا کہ جب خاصی دیر کے بعد علامہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ مولانا، آپ کیا سوچ رہے ہیں تو حسرت صاحب نے کہا ''میں آپ کے حقے کی خودی پر غور کر رہا تھا!'' علامہ یہ جواب سن کر بے حد محظوظ ہوئے۔ حفیظ ہوشیار پوری کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے زیادہ موقعے ملے۔ وہ عمر میں مجھ سے سینئر بھی تھے۔ میری زندگی میں ''عمر عزیز کے بہترین لمحے'' وہ تھے جب مجھے ہر دور میں اتنی بے شمار محبتیں ملیں جو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھیں۔

س ۱۸: ''انجمن ترقی اردو''، ''رائٹرز گلڈ'' اور ''اکادمی ادبیات'' کون سا ادارہ اردو کے لیے، کون سا ادارہ ادیبوں کے لیے اور کون سا ادارہ افسروں کے لیے خدمات انجام دے رہا ہے؟

ج: متذکرہ تینوں اداروں میں سے صرف انجمن ترقی اردو ہی اردو کے لیے خدمات انجام دے رہی ہے اور وہ بھی ایک حد تک۔ اکادمی ادبیات سرکاری ادارہ ہے۔ اس نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ محدود اور ایک طرح سے یکطرفہ رہیں۔ رائٹرز گلڈ بھی ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں صورت پذیر ہوا مگر اس کا یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ اس کے عہدیدار الیکشن کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے مقرر نہیں ہوتے۔ یہ الگ بات کہ گلڈ اب صرف نام کا ادارہ رہ گیا ہے۔

س ۱۹: کیا آدم جی ادبی انعام، داؤد ادبی انعام یا دیگر غیر سرکاری انعامات ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ضروری ہیں۔ آج کل ان کی کیا صورتحال ہے؟

ج: آدم جی ادبی انعام، داؤد ادبی انعام اور دیگر غیر سرکاری ادبی انعام کا اہتمام گلڈ کے جنرل سیکرٹری جمیل الدین عالی صاحب نے کیا تھا۔ یہ معمولی رقوم کے انعامات تھے مگر بہر حال ان کے قیام کے آغاز کے بعد یہ اہل ادیبوں میں تقسیم ہوتے رہے مگر بعد میں یہ بھی سفارش بازی کی زد میں آ گئے اور اپنی افادیت کھو بیٹھے۔ اس وقت ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

س ۲۰: اولین افسانہ ''بدنصیب بت تراش'' سے آج تک کے سفر میں افسانے نے کئی کروٹیں بدلیں۔ آپ خود اپنی تحریر کے متعلق کیا محسوس کرتے ہیں۔ اس نے اسلوبی اور تکنیکی سطح پر کتنے رخ بدلے؟

ج: ''بدنصیب بت تراش'' سے لے کر ''کوہ پیما'' تک میرا افسانہ اسلوبی اور تکنیکی لحاظ سے مسلسل تغیر پذیر رہا۔ ابتداء میں

میرے افسانوں پر میرا شاعرانہ مزاج غالب ہوتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ان ابتدائی افسانوں پر تو میں باقاعدہ ''نثری شاعری'' ہی کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے افسانوں پر سے شاعرانہ انداز جھڑنے لگا اور میں کھرے حقائق کی دنیا میں داخل ہوا۔ ''ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد'' میری افسانہ نگاری کا ایک اہم موڑ متعین کرتا ہے۔ قیام پاکستان کے دنوں میں فرقہ وارانہ فسادات نے میرے تصورات کو بری طرح مجروح کیا اور میں نے جو افسانے لکھے ان میں میرا یہ دکھ نمایاں ہے۔ پھر یوں ہوا کہ میرے افسانوں میں غیر معمولی اختصار آ گیا۔ اب میں کسی بھی غیر ضروری لفظ سے، کسی بھی غیر ضروری جملے سے افسانے کی فضا کو، اس کی روح کو مجروح کرنے کا روادار نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانوں میں Compactness پیدا ہو گئی ہے اور وہ صحیح معنوں میں ''مختصر'' افسانے ہوتے ہیں۔

س ۲۱: افسانے میں واقعیت کہاں تک ممکن ہے۔ کیا حقیقت نگاری اور واقعات کا اظہار افسانے کو تلخی عطا نہیں کرتا؟

ج: ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک فنی حقیقت ہوتی ہے۔ افسانے میں حقیقت محض کا بیان اسے اخباری خبر بنا سکتا ہے مگر حقیقت جب فن سے آراستہ ہو کر افسانے میں اظہار پاتی ہے تو زیادہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔ تلخی تو حقیقت نگاری سے بھی پیدا ہو سکتی ہے اور علامت نگاری اور تجرید نگاری سے بھی اور کہانی میں تلخی کا وجود بعض اوقات اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ فنکار کا ہدف ہی یہی تلخی ہوتی ہے۔

س ۲۲: آپ کے افسانوں کے مطالعے سے پاکستان کی مکمل تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ تحریک خلافت، قیام پاکستان، فسادات و ہجرت کے مصائب و مسائل، جاگیردار، نمبردار، سامراجی ذہنیت پھر ۱۹۵۶ء کا عہد آفریں تجربہ، ۱۹۷۱ء کا سقوط ڈھاکہ، کشمیر کا جذبۂ آزادی، غرض ادب اور تاریخ ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار کی واقفیت براہ راست اسی ماحول سے ہے اس لیے تاثر اور تاثیر بھرپور اور دیرپا ہے۔ کیا آپ سوچتے ہیں کہ دیگر عالمی مسائل کو موضوع بحث بناتے ہوئے اپنے آپ کو آفاقی و کائناتی حوالوں سے تسلیم کروائیں؟

ج: قطعی نہیں۔ کسی صورت میں نہیں۔ اگر مجھ میں پاکستانیت نہیں ہے تو پھر میری آفاقیت اور کائنائیت باطل ہو گی۔ اگر کوئی عالمی مسئلہ براہ راست میرے ملک و قوم پر منفی طور پر اثر انداز ہو رہا ہے تو ممکن ہے وہ میرے افسانے کا موضوع بن جائے مگر اولیت بہر حال میرے اپنے ملکی اور ملی مسائل کو حاصل ہے۔ میں انہی مسائل کے بارے میں زیادہ بہتر انداز میں لکھ سکتا ہوں جو میرے تجربے اور مشاہدے سے گزر رہے ہوں۔

س ۲۳: جنگ کی ہولناکی، آپ کے کئی افسانوں کا موضوع ہے۔ کیا اس آزار سے رہائی کی کوئی ترکیب موجود نہیں؟

ج: اب جبکہ ایٹم بم امریکہ کے علاوہ روس، چین، فرانس، برطانیہ، بھارت اور پاکستان کے پاس بھی ہے، جنگ کا امکان اگر ختم نہیں ہوا تو کم ضرور ہوا ہے۔ جب ایک دوسرے کو چند گھنٹوں کے اندر بھسم کیا جا سکتا ہو تو پھر جنگ صرف ایک صورت میں شروع ہو سکتی ہے جب ان ایٹمی طاقتوں میں سے کسی کے حکمران ایک دم پاگل ہو جائیں اور پورا کرہ ارض سلگتا ہوا انگارہ بن کر رہ جائے۔ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔ اسی طرح ایٹم بم ہی ایٹم بم کو روکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

س ۲۴: مذہبی رہنماؤں یا بالالفاظ دیگر مولوی صاحبان کے متعلق عوام کا نظریہ فاتحہ اور حلوے تک محدود ہے۔ آپ نے ان کی زندگی کے دکھوں اور مسائل کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا خیال آپ کو کیسے آ گیا؟

ج: میں ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جس میں پیری مریدی کے علاوہ مذہبی رہنمائی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مولانا غلام مرشد مرحوم جو بہت بڑے عالم دین اور شاہی مسجد لاہور کے خطیب تھے، میرے سگے خالہ زاد بھائی تھے۔ میرے متعدد دیگر رشتہ دار بھی مولوی تھے اور مساجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میں نے ان کی زندگیوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ میرے بعض افسانوں میں ان کی زندگیوں کے وہ رخ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں جن کی طرف دوسرے لوگ دیکھ ہی نہیں سکتے بلکہ سوچ ہی نہیں سکتے۔

س ۲۵: آپ کے افسانوں میں عورت کپاس چنتی بھی نظر آتی ہے اور فکر معاش کے لیے جدوجہد کرتی بھی۔ کہیں وہ کنول کا پھول ہے اور کہیں مجبوریوں کی دلدل میں دھنسی اپنے لیے وہ لفظ بھی سننے پر مجبور ہے جو وہ سننا نہیں چاہتی۔ آپ خود عورت کو کس کردار میں، کس مقام پر دیکھتے ہیں؟

ج: عورت ہمارے معاشرے کی مظلوم ترین مخلوق ہے اور شاید پورے کرہ ارض پر نام نہاد ترقی یافتہ معاشروں میں بھی عورت کے بنیادی انسانی حقوق پر مرد کابوس بن کر سوار ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے افسانوں میں عورت محنت کشی اور کارکردگی کی ایک مثال ہے مگر اس کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات کے علاوہ، علمائے دین نے عورت کی جس طرح ہتک کی ہے اور کر رہے ہیں، وہ عورت کی ہر جہتی مظلومیت کی ایک جھلک پیش کرتی ہے۔ البتہ بعض صورتوں میں عورت، عورت کا استحصال کرتی نظر آتی ہے۔ اس کی ایک مثال میرا افسانہ ''سناٹا'' ہے۔ یہ بھی گزشتہ کئی صدیوں کی ایک غلط روایت ہے اور اس کے پس پردہ بھی مرد کی جارحیت ہی ہو سکتی ہے۔ پھر یہ معاشرہ مرد کا ہے مگر ہم کتنی بے حیائی سے اعلان کرتے ہیں کہ ''پاکستان کی آبادی تیرہ کروڑ ہے جبکہ ان تیرہ کروڑ میں ساڑھے چھ کروڑ عورتیں ہیں جن کی حیثیت صفر سے بھی کم ہے۔ ساتھ ہی ایک ڈیڑھ کروڑ بچے ہوں گے باقی پانچ کروڑ بچتے ہیں اور اصل آبادی یہی ہے۔'' انہوں نے صدیوں سے عورت کی شہ رگ گرفت میں لے رکھی ہے۔ عورت قدرت کی نہایت درجہ خوبصورت تخلیق ہے۔ پھر وہ بچے پیدا کرنے کے جس لرزہ خیز عمل میں سے گزرتی ہے، اس کا مرد تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عورت ہماری ماں، بہن، بیٹی، بیوی، محبوبہ، غرض ہر کردار میں توازن اور اپنائیت کی تجسیم ہوتی ہے۔ اگر کسی صورت میں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو وہ اس کی غلط تربیت اور غلط ماحول کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال میں مرد اور عورت کے حقوق کی مساوات کا قائل ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ میرے افسانوں میں میرا جذبہ فن کے پردے میں بین السطور پڑھنے والے کو غیر محسوس طور پر متاثر کرتا چلا جائے۔

س ۲۶: آپ کے نزدیک انسان خدا اور کائنات کا آپس میں تعلق مضبوط ہے یا اس رشتے کی کڑیاں کمزور ہوتی جا رہی ہیں؟

ج: انسان، خدا اور کائنات کا رشتہ نہ کسی دور میں کمزور ہوا ہے نہ آئندہ ہونے کا احتمال ہے۔ جو لوگ اس رشتے کی کڑیاں کمزور کرتے ہیں، وہ دراصل خدا اور انسان کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں سے کتراتے اور فرار اختیار کرتے ہیں ورنہ خدا، انسان اور کائنات کے مضبوط رشتے کا اثبات ہمیں ذہنی توانائی بخشتا ہے۔

س ۲۷: پنجابیوں نے اپنی زبان کو پس پشت ڈال کر اردو زبان کی خدمت کی ہے۔ اردو سے محبت پنجابی زبان کے لیے نقصان دہ نہیں ہے؟

ج: پنجاب کے شاعروں اور ادیبوں میں سے بیشتر نے اردو زبان کو اظہار کا وسیلہ بنایا۔ دراصل ہم نے جب شعور کی آنکھ

کھولی تو علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان اور حفیظ جالندھری وغیرہ کا چرچا تھا اور یہ پنجابی ہونے کے باوجود اردو کے شاعر تھے اور ہم ان کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اردو میں لکھنے پڑھنے لگے ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اپنی ماں بولی یعنی پنجابی کی شدید حق تلفی کی۔ کم سے کم پنجاب میں تو اردو سے محبت پنجابی ادب کے لیے مضر ثابت ہوئی۔ ہمیں دونوں زبانوں کے مساوی حقوق ادا کرنے چاہیے تھے۔ بہرحال اب اردو میں لکھنے والے پنجابی میں بھی لکھتے ہیں اور یہ بہت خوش آئند رجحان ہے۔

س ۲۸: لسانی اور علاقائی عصبیتوں کو دور کرنے یا ہوا دینے میں ادیب کا کردار کیا ہے؟

ج: ادیب...... سچا ادیب علاقائی اور لسانی عصبیتوں سے بلند ہوتا ہے۔ ہم نے ان عصبیتوں کو ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے مگر حتمی طور پر سبھی علاقے اور لسانی حلقے صرف اس طرح ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں جب بین اللسانی تراجم کا ہمہ گیر سلسلہ شروع ہو۔ تب ہر علاقے کو اور ہر زبان بولنے لکھنے والے کو محسوس ہو گا کہ...... ارے! ہم تو ایک ہی طرح سوچتے ہیں اور ایک ہی سے لہجے میں ایک ہی سی بات کرتے ہیں! اس طرح عصبیتوں کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔

س ۲۹: آپ کے کن افسانوں کا ترجمہ علاقائی یا غیر ملکی زبانوں میں ہو چکا ہے اور کیا تراجم اصل تخلیق کی روح کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟

ج: افسوس کہ میں اپنے ان افسانوں کی فہرست پیش نہیں کر سکوں گا جن کے تراجم دوسری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ میرے متعدد افسانوں کے تراجم چینی، جاپانی، روسی، جرمن، ترکی اور انگریزی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مراٹھی، بنگلہ، اور پنجابی زبان میں بھی تراجم ہوئے ہیں۔ کسی صاحب نے بتایا تھا کہ فارسی میں بھی ہوئے ہیں۔ افسوس کہ اس سلسلے میں میرے پاس مفصل معلومات موجود نہیں ہیں اور چونکہ میں (انگریزی کے سوا) دوسری زبانوں سے بے خبر ہوں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ میری تخلیقات کی روح ان تراجم میں منتقل ہوئی ہے یا نہیں۔ انگریزی میں جو تراجم ہوئے ہیں ان میں میرے افسانوں کی اصل روح بہت حد تک برقرار ہے۔

س ۳۰: ہنری جیمس کا خیال ہے کہ ناول نگار دراصل ڈرامہ نگار ہوتا ہے اور جس طرح ڈرامے میں تمام واقعات کا اظہار کردار کے حوالے سے ہوتا ہے، اسی طرح ناول میں بھی ہونا چاہیے۔ آپ کے افسانوں میں کردار کی اہمیت کیا ہے۔

ج: افسانے (اور ناول) کا کردار ہی تو ساری تخلیق کا مرجع ہوتا ہے۔ کردار سے قطع نظر کر کے افسانے کی صورت میں واقعات بیان کرتے چلے جانے سے فن وفات پا جاتا ہے۔ کردار افسانے کا مرکز ہے اور مرکز سے گریز موت ہے۔

س ۳۱: اردو ادب میں بڑے ناول کم لکھے گئے۔ آپ نے بھی ناول کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کا سبب؟

ج: اردو میں اگر منشی پریم چند مختصر افسانے کے فن کا آغاز نہ کرتے تو افسانے کا فن بھی ناول کی طرح پسماندہ ہوتا اور ہم اب تک داستانیں ہی لکھ رہے ہوتے۔ دراصل انگریزی کے توسط سے مغرب کے ادب کے مطالعے نے ہمارے جذبۂ تخلیق کو مہمیز کیا اور پریم چند کے بعد اردو کے مختصر افسانے نے حیرت انگیز ترقی کی۔ ناول کے لیے وقت اور فرصت درکار ہوتی ہے اور مجھ سمیت بیشتر تخلیق کاروں کے ہاتھ معاش کی زنجیروں نے جکڑ رکھے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود خدیجہ مستور، مستنصر حسین تارڑ، انتظار حسین، عبداللہ حسین، الطاف فاطمہ اور انیس ناگی وغیرہ نے معیاری ناول لکھ کر ناول نویسی کے فن پر جمی ہوئی برف کی تہیں چٹخا دی ہیں۔

س ۳۲: کیا اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے غربت کی بھٹی میں جلنا ضروری ہے؟

ج: قطعاً ضروری نہیں۔ اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے اگر غربت و افلاس ضروری ہوتا تو ہم گوئٹے اور ٹالسٹائی وغیرہ کے فن پاروں سے محروم ہوتے۔ ''ادب کے لیے افلاس ضروری ہے'' کا مغالطہ سرمایہ داروں نے پھیلایا ہے۔ یہ درست ہے کہ غریب اور مفلس ادیبوں نے بھی اعلیٰ ادب تخلیق کیا ہے مگر میرا ایک شعر ہے:

وہ اور چیز ہے ہوتے ہیں جس سے دل شاداب
بری بہار سے ویرانی خزاں نہ گئی

س ۳۳: ادب میں گروہ بندی کبھی بھی پسندیدہ نہیں رہی لیکن موجود ہر دور میں رہی۔ انشاء و مصحفی کے معرکے ہوں یا آتش و ناسخ کی ادبی چپقلش۔ یہ نوک جھونک تو زندگی کی علامت ہے لیکن آج کا ادیب جس گروہ بندی کا اظہار کر رہا ہے وہ ایک عام قاری کی ادب سے دلچسپی زیادہ کرنے کے بجائے اسے ادب سے متنفر کر رہا ہے۔ آپ بھی لاہور بلکہ پاکستان کے ایک بڑے ادبی گروہ کے سرخیل تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کے ساتھ ایک بڑے انسان کا تصور تو جچتا ہے۔ ادبی گروہ کے لیڈر کا نہیں۔ اس دلدل سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ نیاز مندان لاہور کا حلقہ بھی قیام پاکستان کے بعد بہت فعال تھا۔ خصوصاً پطرس و تاثیر یوپی کے اہل زبان کو بھرپور جواب دیا کرتے تھے۔ یہ ادبی نوک جھونک دلچسپ تھی۔ نفرت انگیز نہیں۔ خصوصاً قاری اس سے حظ اٹھاتا تھا۔ کیا اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ تیسرا سوال یہ کہ کیا اپنی شناخت کے لیے کسی ادیب کو کسی گروہ سے وابستہ ہونا ضروری ہے؟

ج: آپ بھی دوسرے کئی لوگوں کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا معلوم ہوتی ہیں کہ میں کسی ادبی گروہ کا ''سرخیل'' ہوں..... میں آپ کو اور پوری ادبی دنیا کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا کوئی ادبی گروہ ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں آپ نے اسے استعمال کیا ہے۔ معیاری شاعری اور معیاری ادب لکھنے والے تمام لوگ میرا ادبی گروہ ہیں۔ وہ چاہے کسی بھی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی بھی نقطہ نظر کے حامی ہوں۔ میرا رسالہ ''فنون'' اس حقیقت کا گواہ ہے کہ میں گھٹیا قسم کی گروہ بندی کی رو سے رسالہ مرتب نہیں کرتا بلکہ اس میں ہر مکتب فکر کے تخلیق کار کو شامل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں ترقی پسند ادب کا مؤید ہوں مگر جو اہل قلم اس ادب سے متفق نہیں ہیں، وہ بھی مجھے عزیز ہیں کہ وہ تخلیق کار ہیں اور تخلیق کاری ایک محترم فعل ہے۔ یوں کہیے کہ کسی گروہ کی سرخیلی مجھ پر اتہام ہے۔ بعض اہل قلم میرے قریب ہیں اور میرے دوست ہیں۔ اگر وہ میرے آس پاس موجود ہیں تو وہ میرا گروہ کیسے ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک گروہ پچھلے پچیس تیس برس سے مجھ پر گندگی اچھال رہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرا بھی کوئی گروہ ہے۔ میں ایک مثال دوں گا۔ آج کل مسٹر منیر نیازی کہتے ہیں کہ ندیم نہ کبھی شاعر تھا اور نہ آج شاعر ہے مگر نیازی مجھ سے اپنی ایک کتاب کا دیباچہ لکھوانے آئے اور میں نے لکھ دیا اور میں نے ان کی کتابوں کی ایک سے زیادہ تقریبات رونمائی میں شرکت کی۔ ان کی تحسین کی اور ان پر الزامات کی تردید کی۔ آج وہ ایک سے زیادہ بار مجھ پر ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے ہیں مگر جب میں نے ان کی علالت کا سنا کہ وہ شیخ زید ہسپتال میں داخل ہیں تو میں اعجاز رضوی صاحب کو ہمراہ لے کر فوراً ہسپتال پہنچا مگر وہاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر تشریف لے گئے ہیں۔ ان کے گھر بار بار فون کیے مگر شاید گھر میں فون پر پابندی تھی اور مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے ملاقات پر بھی پابندی ہے کیونکہ انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔

مجھے اس کا دکھ ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے مجھ پر برسنے کیوں لگے ہیں جبکہ میں نے ہر بار انہیں معاف کیا ہے۔ آج معتدد حضرات بیشتر کسی وجہ کے بغیر مجھے بہتانوں کا ہدف بنا رہے ہیں۔ اگر میرا کوئی گروہ ہوتا تو وہ ان کا ضرور نوٹس لیتا مگر دیکھ لیجیے۔ کسی نے میرے حق میں بولنا مناسب خیال نہیں کیا۔ میں اس صورت میں کسی گروہ کا سرخیل کیسے ہو سکتا ہوں! میں گروہ بندی کی دلدل کا اسیر نہیں ہوں۔ اس دلدل میں وہی لوگ دھنسے ہوئے ہیں جنہوں نے خود اپنے اپنے گروہ بنا رکھے ہیں۔ ادبی اختلاف کا تو میں کھلے دل سے خیر مقدم کرتا ہوں مگر ذاتی حملوں کا جواب دے کر میں اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا۔

''نیاز مندان لاہور'' کا حلقہ قیام پاکستان کے بعد نہیں بلکہ اس سے پہلے وجود میں آیا تھا اور پطرس، سالک اور تاثیر وغیرہ ان ''نیاز مندوں'' کے رہنما تھے۔ ان کی نوک جھونک میں تعصب تھا۔ چنانچہ اہل پنجاب اور ''اہل زبان'' کے درمیان تلخی کا آغاز انہیں ''نیاز مندان'' کی سرگرمیوں سے ہوا۔

اپنی شناخت کے لیے کسی ادیب کا کسی گروہ سے وابستہ ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ ادیب کی شناخت تو اس ادب سے ہوتی ہے جو وہ تخلیق کرتا ہے۔ اگر یہ ادب اس کی پہچان نہیں بن سکا تو وہ ہزار گروہ بنائے، اس کی شناخت کا مسئلہ دگرگوں رہے گا۔

س ۳۴: شہرت عزت دیتی ہے یا دشمنی؟

ج: شہرت عزت بھی دیتی ہے اور دشمنی بھی۔ شہرت ملے تو دونوں ردعمل ہر تخلیق کار کے سامنے آتے ہیں...... وہ غالب ہوں، اقبال ہوں یا جوش ہوں۔

س ۳۵: ادب میں صفائی دینے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ نعت کے حوالے سے پچھلے دنوں بھی خاصی بحث رہی۔ کیا ہم شکوک و شبہات دور کر کے اعتماد کی فضا بحال نہیں کر سکتے؟

ج: صفائی دینے کی ضرورت اس وقت لازمی ہو جاتی ہے جب کسی شخص کے آس پاس غلاظت کے انبار لگا دیئے گئے ہوں۔ رہا اعتماد کی فضا پیدا کرنے کے لیے شکوک و شبہات کو دور کرنا تو شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے بھی تو صفائی دینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

س ۳۶: پاکستانی ادب، اسلامی ادب آپ ان اصطلاحات سے کس حد تک متفق ہیں؟

ج: میں ''پاکستانی ادب'' کی اصطلاح سے تو اس طرح متفق ہوں جیسے میں روسی ادب، امریکی ادب، فرانسیسی ادب، جرمن ادب وغیرہ سے متفق ہوں مگر ''اسلامی ادب'' کی اصطلاح سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ جب ہندو ادب، عیسائی ادب، بدھ ادب، سکھ ادب کا وجود نہیں ہے تو ''اسلامی ادب'' کا نعرہ سر کر کے آخر ہم دنیا کو کیا تاثر دینا چاہتے ہیں!

س ۳۷: تخلیق کار بحیثیت شاعر زیادہ کامیاب رہتا ہے یا بطور افسانہ نگار۔ آپ خود دونوں حیثیتوں سے معتبر ہیں۔ اس سوال کا جواب بیرون ملک مشاعروں میں شاعروں کو مدعو کرنے کی جو روش ہے، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے دیجیے۔

ج: تخلیق کار شاعر اور افسانہ نگار...... دونوں حیثیتوں میں کامیاب رہتا ہے۔ بیرون ملک مشاعروں کو کسوٹی نہیں بنانا چاہیے کہ بیرون ملک تو مزاحیہ فنکار بھی آئے دن جاتے رہتے ہیں۔

س ۳۸: زندگی میں ادب اور معاشرے میں ادیب کی کیا ضرورت و اہمیت ہے یا یوں کہیے کہ ادیب کا معاشرے کی تشکیل میں

کیا کردار ہے اور کیا وہ اسے کامیابی سے نبھا رہا ہے؟

ج: معاشرے کی صحت مند تشکیل میں ادیب کے کردار سے کون انکار کرے گا۔ شرط یہ ہے کہ یہ ادب معاشرے میں پھیلے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ تیرہ چودہ کروڑ کے ملک میں اعلیٰ سے اعلیٰ ادب کی کتاب ایک ہزار کی تعداد میں چھپتی ہے اور اگر یہ ادب سنسنی خیز یا جنسیت زدہ نہیں ہے تو یہ ایک ہزار کتابیں ایک سال میں بھی فروخت ہو جائیں تو سبحان اللہ۔ اس صورت میں اردو کا ادیب معاشرے کی تشکیل کا دعویٰ کس بوتے پر کر سکتا ہے۔ جب اس کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے والے تیرہ کروڑ میں سے تیرہ سو بھی نہ ہوں تو وہ معاشرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ چنانچہ جب تک ہمارے ہاں خواندگی کا تناسب صد فیصد نہیں ہوتا، ہم لوگ محض اپنے کیتھارسس کے لیے ادب تخلیق کرتے رہیں گے۔

س ۳۹: ڈش، وی سی آر متوسط اور نچلے متوسط طبقے میں بھی اکثر گھروں میں نظر آ جائیں گے۔ نقوش و فنون نہیں، وجہ؟

ج: ڈش اور وی سی آر بے شمار گھروں میں موجود ہیں مگر وہاں اردو کے معروف ادبی رسالوں کا گزر نہیں۔ وجہ اوپر عرض کر دی گئی ہے۔ ساتھ ہی الٹرا ماڈرن گھرانوں میں وہ ادبی رسالے بار پا ہی نہیں سکتے جن کی سطریں دائیں سے بائیں کو چلتی ہیں کہ یہ قدامت زدگی ہے!

س ۴۰: قیام پاکستان سے اب تک افسانہ مختلف تجربوں سے گزرا۔ استعاراتی، علامتی اور تجریدی راستوں سے گزر کر اب پھر بیانیہ کی طرف لوٹ آیا ہے۔ آپ کی نظر میں اردو افسانے کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو افسانے کا مستقبل بہرصورت اور بہرزاویہ صرف اور صرف وہ بیانیہ افسانہ ہے جو چیخوف اور ماپساں اور سومرسٹ مائیم کے بعد منٹو، بیدی، کرشن، عصمت اور غلام عباس وغیرہ نے لکھا ہے اور اب منشا یاد اور نیلوفر اقبال اور رفعت مرتضیٰ وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ تجربے ضرور ہونے چاہئیں۔ تجربہ ہر صنف ادب کے لیے لازمی ہے مگر تجربے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ علامتی افسانے یا استعاراتی افسانے یا تجریدی افسانے سے مجھے کد نہیں بشرطیکہ ان تجربات کا ابلاغ بھی ہوتا ہو۔ ابلاغ ہوگا تو یہ تجربات بھی بیانیہ کے خواص پیدا کر لیں گے۔

س ۴۱: شعر یا افسانہ انتخاب کا حق آپ کو دیا جائے تو آپ کسے منتخب کریں گے؟

ج: شعر و افسانہ دونوں میں میری تخلیقی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔ چنانچہ مجھے دونوں اصناف عزیز ہیں مگر میں شاعری کو اولیت دوں گا کہ شاعری بزم فنون لطیفہ کی صدر نشین ہے۔

(بشکریہ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ)

..........☆..........

ندیم افکار: مضمون ''ادب میں بے اطمینانی'' سے اقتباس

شروع ہی میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جن معنوں میں ''بے اطمینانی'' کا لفظ عنوان میں استعمال ہوا ہے' وہ کلبیت سے یکسر مختلف ہے۔ کلبیت کی حیثیت منفی اور تخریبی ہے مگر بے اطمینانی اس اثباتی اور تعمیری اضطراب اور بے چینی کو کہتے ہیں جس کا رخ خوب سے خوب تر کی سمت ہوتا ہے..... اگر ادب میں سے بے اطمینانی کو خارج کر دیا جائے تو ایک خوفناک انجماد کا ویران منظر ابھرتا ہے......

ادیب کی بے اطمینانی' کلبیت اور سنک سے قطعی مختلف چیز ہے۔ یہ بے اطمینانی سوچ اور فکر کے اس تموج اور تلاطم کا سبب ہے جس نے انسان کو وہ کچھ بنایا ہے جو آج ہمیں نظر آ رہا ہے...... یہ بے اطمینانی بے حد مبارک ہے۔ یہ انسانی ارتقاء کی جان ہے۔ اسی سے زندگی میں چلت پھرت' چہل پہل اور گہما گہمی ہے۔ یہ آگے بڑھنے اور آگے بڑھانے کی وہ قوت ہے جس سے انسان محروم ہوتا تو شاید غار بھی اُس کے نصیب میں نہ ہوتے بلکہ وہ اِدھر اُدھر رینگتے پھرتے رہنے کو اپنی زندگی کا مقصد و منتہا سمجھ لیتا۔ اس بے اطمینانی کی قدر کیجیے اور اپنے قاری تک منتقل کیجیے تاکہ وہ جمود کا شکار نہ ہونے پائے۔ نامرادیوں اور ناکامیوں کے باوجود صابر و شاکر ہو کر نہ بیٹھ جائے......

اطمینان جو ادب و فن کے حوالے سے جمود کا ہم معنی ہے' ادیب اور فن کار کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ سی مثال لے لیجیے۔ کتنے ہی ادیب اور فنکار ایسے ہیں جن کی ابتدائی تخلیقات کے کچھ زیادہ ہی ڈھنڈورے پیٹے گئے۔ اس فوری شہرت نے ان کے تخلیقی ذہن میں سے بے اطمینانی کو نچوڑ لیا اور وہ اپنے فن کی ابتدائی کارگزاری ہی کو انتہائے فن سمجھ بیٹھے۔ وہ اطمینان کا شکار ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کی ان کا فن جہاں تک پہنچا تھا وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پایا..... دراصل بے اطمینانی تو نئی سے نئی اُمیدوں کا منبع ہے.....

اقبال نے ایک بار شکایت کی تھی:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اُس وقت تو غیر ملکی حکمرانی کی مجبوری تھی۔ آج ہم آزاد قوم ہیں۔ قوم کو اس تعمیری اور اثباتی اضطراب سے مسلح کرنا ادیبوں اور فنکاروں کا فرض ہے جو ذہنوں کے معمار اور احساسات کے رہنما ہوتے ہیں۔ وہ اگر ہمیشہ کے لیے مطمئن اور آسودہ ہو جائیں تو نہ صرف قومیں بے حس ہو جاتی ہیں بلکہ فکرِ انسانی کا قافلہ ہمیشہ کے لیے پڑاؤ ڈال دیتا ہے اور ارتقائے حیات کے تقاضے اس کی طرف بانہیں پھیلائے رہ جاتے ہیں۔

(۱۹۶۶ء- ''پسِ الفاظ'' ــــــ احمد ندیم قاسمی)



تصویر کے بائیں جانب۔ جناب احمد ندیم قاسمی اپنے بھانجے جناب ظہیر بابر کے ساتھ۔



دورہ چین کے موقع پر جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب فیض احمد فیض اپنے میزبانوں کے ہمراہ۔



جناب احمد ندیم قاسمی، جناب حفیظ جالندھری، جناب عطاالحق قاسمی، جناب امجد اسلام امجد ایک شادی کی تقریب میں دیگر شرکا کے ساتھ۔



جناب احمد ندیم قاسمی اپنے بڑے بھائی جناب پیرزادہ محمد بخش کے ہمراہ اپنے گاؤں انگہ میں۔



جناب احمد ندیم قاسمی اپنی سالگرہ کی تقریب میں خطاب کے موقع پر۔



جناب احمد ندیم قاسمی مجلس ترقی ادب کے دفتر میں۔



جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان، اے آر وائی ایوارڈ کی تقریب میں۔



جناب احمد ندیم قاسمی۔

صوفی عبدالرشید



جو عمر بھر نہیں کہا اب کس طرح کہیں
سیلِ الم کو موجِ طرب کس طرح کہیں

حائل تعلقات میں جب ہوں تکلفات
پھر ان کے روٹھنے کا سبب کس طرح کہیں

آغازِ عشق میں ترے جور و ستم کی بات
ہم جب نہ کہہ سکے تھے تو اب کس طرح کہیں

جب تھا بہشتِ جاں ہمیں ہر خواب کا خیال
کیسے طرب کے رنگ تھے تب کس طرح کہیں

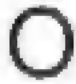
گلزارِ زیست کس کے سبب خارزار ہے؟
توڑی ہے کس نے حدِ ادب کس طرح کہیں

لوٹا ہے کس نے حسنِ زمیں لے گیا ہے کون؟
سورج سے تاب چاند سے تب، کس طرح کہیں

وہ دار پر گیا تو نہ جانے کہاں ہوئے؟
جو مدعی وفا کے تھے سب، کس طرح کہیں

تھی داغ داغ ساری فنا گھر تھے بے چراغ
کس کا تھا روز، کس کی تھی شب کس طرح کہیں

کس کا ہے نام وردِ زباں روز و شب رشید
کھلتے ہیں، کس کے ذکر پہ لب کس طرح کہیں



(نذرِ سودا)

نہیں ہے پاس تو یاد اس کی اب سوا بھی ہے
گیا ہے ہاتھ سے گر کچھ تو کچھ ملا بھی ہے

وہ اس کا ناز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے نیاز
دوائے درد بھی ہے دردِ لا دوا بھی ہے

گلہ ہے دل کو مرے تیری کم نگاہی کا
اگرچہ تیری اداؤں پہ مر مٹا بھی ہے

وہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہوا لیکن
زبانِ خلق یہ کہتی ہے کچھ ہوا بھی ہے

اسی کی ذات سے وابستہ حاجتیں ہیں مری
جو سب کے ساتھ بھی ہے سب سے ماورا بھی ہے

جو بَن کے بجلیاں گرتے ہیں بے کسوں پہ رشید
انہی سروں پہ یہاں سایۂ ہما بھی ہے

طالب انصاری



ہجر کامل ہے ملاقات نہیں ہو سکتی
دھوپ نکلی ہو تو برسات نہیں ہو سکتی

اذنِ اظہارِ تمنا جو نہیں ہے نہ سہی
آنکھوں آنکھوں میں بھی کیا بات نہیں ہو سکتی

کچھ نہیں گھر میں بچا تجھ پہ لٹانے کے لیے
اب تری اور مدارات نہیں ہو سکتی

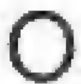
حسنِ مستور کی دریوزہ گری لازم ہے
راہ چلتے ہوئے خیرات نہیں ہو سکتی

سامنا ہو بھی اگر جائے کہیں رستے میں
دل نہ مانے تو کوئی بات نہیں ہو سکتی

ہر کوئی کیسے ترے غم کا تقاضا کرتا
اتنی سستی تو یہ سوغات نہیں ہو سکتی

میرے انکارِ مسلسل کی بدولت یہ کھلا
صبحِ روشن شبِ ظلمات نہیں ہو سکتی

اوصاف شیخ



(نذرِ مجید امجد)

فقط قرار نہیں ہے دلِ تپاں کے لیے
ترا کلام امر ہے سرورِ جاں کے لیے

مہکتے میٹھے زمانوں کی آرزو تو کجا
یہاں گلاب بھی کھلتے ہیں اب سناں کے لیے

کھلا کہ تیرے سبب اے امیرِ شعر و سخن
ہزار مشعلیں روشن ہیں کارواں کے لیے

اے شاعری کے مسیحائے فن کہاں ہے کہ ہم
ترس گئے تیرے اندازِ خوش بیاں کے لیے

جمالِ شعر کو اے حسن بخشنے والے
دعا بہ لب ہیں ترے نقشِ جاوداں کے لیے

رسیلے گیت ندی، تتلیوں، گلابوں کے
لکھے گا کون اب اس شہرِ بے اماں کے لیے

یہ کیسے لوگ ہیں، کیسا زمانہ ہے اوصافؔ
ترس گیا ہوں کرم ہائے دوستاں کے لیے

تشنہ بریلوی



جستجو کو مری انعام بڑا ملتا ہے
ڈھونڈنے جاؤں جو انساں تو خدا ملتا ہے

کوئی بھی شاہ نہیں کوئی شہنشاہ نہیں
تختِ طاؤس پہ بیٹھا بھی گدا ملتا ہے

ہم سفر راہِ وفا میں مجھے کوئی نہ ملا
راہزن ملتا ہے یا راہنما ملتا ہے

جانِ جاں تیرے ستم تیری جفائیں بھی قبول
کہ جفا میں بھی عجب لطفِ وفا ملتا ہے

موسمِ گُل کی تمنا ہے تو صحرا میں رہو
اور پھر جلد ہی محنت کا صلہ ملتا ہے

تیرے دربار سے ہر بار ملا مجھ کو بہت
میرا دل مانگتا کیا ہے مجھے کیا ملتا ہے؟

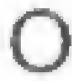
کیا یہ ممکن ہے کہ بندے کو خُدا مل جائے؟
عالمِ جذب میں ڈھونڈو بخُدا ملتا ہے

گلشنِ عشق میں آئی ہے دلہن بن کے بہار
شاخ در شاخ کِھلا رنگِ حنا ملتا ہے

زندگی کچھ نہیں الجھی ہوئی ڈوری ہے فقط
کسی مجذوب کو ہی اِس کا سِرا ملتا ہے

اُس کے سینے میں تو دل ہی نہیں شاید تشنہ
جب بھی دیکھا اُسے مصروفِ جفا ملتا ہے

قمرالدین خورشید



موسمِ گل بھی رُلانے آئے
داغِ دل اور جلانے آئے

صحنِ گل پھول سے خالی خالی
جانِ گل پھول کھلانے آئے

صحنِ گل بیچ رواں آب جو
مطربہ گیت سنانے آئے

چاندنی رات، ستارے، جگنو
سب تری یاد دلانے آئے

اے میری نیند سے عاری آنکھو
اب تمہیں کوئی سلانے آئے

کیا کوئی قیس ہوا عازمِ دشت
کیوں مجھے یاد ویرانے آئے

آپ رم خوردہ تھے آہو لیکن
دلِ وحشی کو منانے آئے

کونپلیں پھوٹ اٹھیں شاخوں پہ
پھول۔ کھلنے کے زمانے آئے

بالیاں ڈال میں جھک جھک جائیں
ان میں گیہوں کے جو دانے آئے

کھیتوں میں چار سو سرسوں پھولی
پیلی چنری کے زمانے آئے

صفدر ہمدانی



اس صدی میں کوئی آذر نہیں آنے والا
سر بلند نیزوں پہ اب سر نہیں آنے والا

دیکھ کر جس کو میں جیتا رہا لمحہ لمحہ
خواب میں میرے وہ منظر نہیں آنے والا

زخم اور درد کے رشتے سے میں آگاہ رہا
زخم سے درد بھی باہر نہیں آنے والا

راستے اپنے لیے خود ہی بنانے ہوں گے
اب یہاں کوئی پیمبر نہیں آنے والا

اب نہ آئے گا کسی کام عصائے موسیٰ
راہ میں سُن لیں سمندر نہیں آنے والا

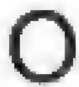
الوداع جس کو ستاروں نے کیا جاتے ہوئے
لوٹ کر اب وہ مسافر نہیں آنے والا

مطمئن سانپوں کو اس امر سے آگاہی ہے
گھر کے اب صحن میں پتھر نہیں آنے والا

کتنی پُرہول مسافت ہے کہ دم گھٹتا ہے
ایسے لگتا ہے کہ اب گھر نہیں آنے والا

چشمِ قتال، شفق رنگ، قیامت پیکر
اب تری باتوں میں صفدر نہیں آنے والا

(لندن)



کھلے سمندر کا ہر کنارا ہے نام میرے
عجب مقدر کا استعارہ ہے نام میرے

محبتوں کے سبھی جزیرے تمہاری قسمت
عداوتوں کا یہ شہر سارا ہے نام میرے

میں روز اپنا ہی زہر پی پی کے مر رہا ہوں
یہ کیا اذیت نشاں ستارہ ہے نام میرے

مرے لہو کی حرارتوں میں بسا ہوا ہے
وہ ایک دن تم نے جو گزارا ہے نام میرے

نہ لکھنے والے کا نام لکھا ہے کوئی صفدر
کہاں سے آیا یہ خط تمہارا ہے نام میرے

(لندن)

سعید الظفر صدیقی



پاؤں میں باندھ کر سفر رکھا
ہم نے صحرا کا نام گھر رکھا

عجز میں نے، تو کرّوفر اس نے
کچھ زیادہ سنبھال کر رکھا

اب وہ دیکھیں کہاں تک آتے ہیں
لو ہتھیلی پہ ہم نے سر رکھا

زندگی اور اعتبار اس کا
نقش ہے ایک آب پر رکھا

بھول کر آپ ہم کو بیٹھ گئے
اور ہمیں اس سے بے خبر رکھا

خشک رکھا ہے جیب میں رومال
اور تکیے کو اپنے تر رکھا

اک طلب راستوں میں ڈال گئی
اک محبت نے دربدر رکھا

جانے تم شہر میں رہے کیسے
ہم نے تو خود کو باندھ کر رکھا



تمہارا بھی محبت میں کوئی کردار ہونا تھا
ہمیں تو خیر سے رسوا سرِ بازار ہونا تھا

گماں تھا ان سے اب کی بار کھل کر گفتگو ہوگی
خبر کیا تھی یہ محشر بھی پسِ دیوار ہونا تھا

خزاں کی بات چل نکلی ہے تو کیوں بجھ گئے چہرے
اسی موسم میں تو ذکرِ لب و رخسار ہونا تھا

ہمیں پر کیا غمِ ہستی کے سب در باز ہونے تھے
ہمارا سر ہی کیا شانوں پہ اپنے بار ہونا تھا

ہمارے حوصلے ہی آزمانے تھے زمانے کو
ہمیں سے زندگی کو برسرِ پیکار ہونا تھا

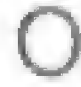
ہمیں کو ٹھوکریں کھانی تھیں آ کر اپنی چوکھٹ پر
ہمیں پر اپنے گھر کا رستہ دشوار ہونا تھا

ہمارے گھر ہی پر کیا شہر میں وحشت برسنی تھی
ہمارے ہی در و دیوار کو مسمار ہونا تھا

ہمارے ہی نفس کی ڈور الجھنی تھی رگِ جاں سے
ہماری سانس ہی کو جان کا آزار ہونا تھا

ہمیں کیا اک امیرِ شہر کی اب دسترس میں تھے
ہمارا ہی تماشا کیا مری سرکار ہونا تھا

افتخار یوسف



لمبی نیند سلا جاتے ہیں بعض اوقات
غم انسان کو کھا جاتے ہیں بعض اوقات

ہم جیسے لوگوں کی تو اوقات ہی کیا
سورج بھی گہنا جاتے ہیں بعض اوقات

ان کی عنایت، ان کا احساں، ان کا کرم
ہم سے ملنے آ جاتے ہیں بعض اوقات

موسم ہو بے رحم تو کھلنے سے پہلے
آس کے گل کملا جاتے ہیں بعض اوقات

عقل کی اک سرحد تو آخر ہوتی ہے
ہم ہی دھوکہ کھا جاتے ہیں بعض اوقات

خوشیوں کی برسات اچانک ہونے سے
آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں بعض اوقات

دے کر کچھ رنگین کھلونے وعدوں کے
وہ ہم کو بہلا جاتے ہیں بعض اوقات

چھپ جاتا ہے امیدوں کا چاند کہیں
غم کے بادل چھا جاتے ہیں بعض اوقات

اسلام عظمی



دام اک اور تہِ دام نکل آتا ہے
دشتِ بے در ہی میں بسرام نکل آتا ہے

ایک بے نام محبت کے ہنر کے صدقے
چاند سا روز سرِ شام نکل آتا ہے

پرزہ پرزہ سے شب و روز اکٹھے کرتے
بھولا بسرا سا کوئی نام نکل آتا ہے

روز جی اٹھتا ہوں میں سیرِ جہاں کرنے کو
تیری گلیوں میں کوئی کام نکل آتا ہے

جانے کس خوف کا پہرہ ہے مری بستی پر
چپ کے پردے سے بھی کہرام نکل آتا ہے

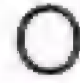
خواب جھوٹے ہی سہی دیکھتے رہنا لوگو
خود فریبی کے لیے دام نکل آتا ہے

اُلٹی سوچوں سے نہیں راہ نکلتی کوئی
بات سیدھی سے بھی ابہام نکل آتا ہے

پیر جیسا بھی ہے اپنا ہے کرامت والا
حالتِ جذب سے الزام نکل آتا ہے

ایک وحشت نے عجب کر دی ہے عظمی حالت
ہر ارادہ ہی مرا خام نکل آتا ہے

ثاقب مجید



رات کے تارے آوارہ اور میں شب گرد الگ
اس پر ہے وہ چاند اکیلا، اس کا درد الگ

آخر جسم کی کمزوری یہ کیسے سب سہہ پاتی
دل کی دھڑکن سست ہے اور موسم سرد الگ

بازاروں کی بھیڑ میں گم ہیں دیکھو کتنے لوگ
گھر کی چار دیواری میں ہے ہر اک فرد الگ

آنکھوں کی سب رونق کھو گئی ہو کر اُس سے دور
آئینے میں دیکھا جب تو چہرہ زرد الگ

اپنا آپ گنوا بیٹھے ہیں اُس منزل سے پہلے
اور رستوں کی جم گئی یارو ہم پر گرد الگ

ثاقبؔ اس انجانے پن میں بھی تھا اپنا پن سا
میں اک جانب چُپ بیٹھا تھا، وہ ہمدرد الگ

نوید سروش



یادیں، بادل اور برسات
آنکھیں، کاجل اور برسات

لیلیٰ لیلیٰ کی آواز
صحرا، پاگل اور برسات

مشکل، رستا اور راہی
جگنی، راول اور برسات

راتیں، حرکت کرتے سائے
بھیگا، آنچل اور برسات

بھیگی بھیگی ساون رُت
گاتی کوئل اور برسات

بڑھیا، بچے کل کی بات
چرخا، پیپل اور برسات

اس عالم میں کہاں چلے؟
تنہا، جنگل اور برسات

اُس کے جانے کا لمحہ
سانسیں، ہلچل اور برسات

محمد حنیف



ترا مکان تو بس راستے میں آیا ہے
کہ آسمان تو بس راستے میں آیا ہے

ترے جہان میں میرا نہیں ہے کوئی کام
ترا جہان تو بس راستے میں آیا ہے

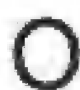
کئی دنوں سے ترا دھیان ہی نہیں آیا
مجھے یہ دھیان تو بس راستے میں آیا ہے

یہاں قیام بہت مختصر رہے گا مرا
یہ خاکدان تو بس راستے میں آیا ہے

نہیں ملا ہے مجھے میری کوششوں کے سبب
وہ خوش گمان تو بس راستے میں آیا ہے

گزر رہا تھا سفر کس قدر سکون کے ساتھ
یہ امتحان تو بس راستے میں آیا ہے

تاج الدین تاج



یاد رکھیں، بھول جائیں، کیا کریں
آپ ہی آ کر بتائیں، کیا کریں

بجھ گئے ہیں شہر کے سارے چراغ
سوچتی ہیں اب ہوائیں، کیا کریں

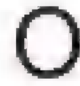
کیا کریں جز شکوۂ رنج و الم
بے اثر ہوں جب دعائیں، کیا کریں

ایک دھوکا ہے جہانِ رنگ و بو
ہم اگر دھوکہ نہ کھائیں، کیا کریں

بھاگنے کا راستہ ملتا نہیں
دیکھتے ہیں دائیں بائیں کیا کریں

ان کی قسمت میں لکھا ہے انتظار
کیا کریں پھر تاج مائیں، کیا کریں

تصدق شعار



اور اب کچھ سوچ کر ہی اُس کا میں جویا نہیں
صرف پانے کے سبب کس کو یہاں کھویا نہیں

اجنبی بن کر گزرنا اور مڑ کر دیکھنا
صرف اتنا ہے سرِ بازار میں رویا نہیں

کاٹنے کی دِقت و خواری سے کچھ بویا نہ تھا
اور اب وہ کاٹتا پھرتا ہوں جو بویا نہیں

آ گئی ہے کتنی تبدیلی تری آواز میں
تو پکارے بھی تو لگتا ہے کہ تو گویا نہیں

اور پرائے گھر میں اُس کو نیند آئے گی کہاں
وہ تو اپنے گھر میں بھی اِس فکر سے سویا نہیں



وہ مجھ سے بے خیال ہے، میں اُس کو جانتا نہیں
حالانکہ درمیاں کوئی صدیوں کا فاصلہ نہیں

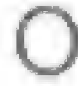
دنیا گمانِ حُسن میں سو بار بدظنی کرے
لیکن یہ میری خُو نہیں یہ میرا زاویہ نہیں

جی تو رہے ہیں یوں مگر یہ بھی ہے کوئی زندگی
میری اُسے خبر نہیں، اُس کا مجھے پتہ نہیں

دیکھا تجھے تو یوں لگا گویا کہ دنیا دیکھ لی
حالانکہ کائنات میں تیرے سوا بھی کیا نہیں

یہ میرے قلب و ذہن میں کیسی چلی ہے کشمکش
پانے کی آرزو نہیں، کھونے کا حوصلہ نہیں!

رستم نامی



آنے کا وقت ہے نہ ہی جانے کا وقت ہے
اب کس کے پاس ملنے ملانے کا وقت ہے

مدت سے ہم کو یاد نہیں آ رہا ہے وہ
یہ بات اُس کو جا کے بتانے کا وقت ہے

لگتا ہے خوشگوار بہت اس کا موڈ آج
یہ عین اس کے دل پہ نشانے کا وقت ہے

ایسی فضولیات کا ہے وقت کس کے پاس
اب کس کے پاس اُس کو بھلانے کا وقت

کرتا نہیں ہوں کام کوئی میں اسی لیے
یہ وقت قیمتی ہے بچانے کا وقت ہے

یہ وقت بھی ہے نیکی و مہر و وفا کا وقت
یعنی کسی کے کام نہ آنے کا وقت ہے

نامؔی یہ ہیر پھیر ہے سارا نصیب کا
وہ آ رہا ہے اور مرے جانے کا وقت ہے



کوئی بات چیت ہوتی، کوئی پیار ویار ہوتا
کوئی پیش رفت ہوتی، کوئی روزگار ہوتا

تو بڑا عجیب ہوتا یہ جدائیوں کا منظر
کوئی کِھل کھلا کے ہنستا، کوئی اشک بار ہوتا

کبھی کام سے گزرتا، کبھی کام کے علاوہ
ترے گھر کے راستے میں مرا رہگزار ہوتا

مرا دل نہ سیر ہوتا کبھی تیری آرزو سے
تجھے پا کے بھی ہمیشہ ترا انتظار ہوتا

ترے دل میں سر اٹھاتا کبھی دردِ عاشقی جب
تجھے ایک بار ہوتا مجھے بار بار ہوتا

یہ جو روز جی رہا ہوں، یہ جو روز مر رہا ہوں
"مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا"

مجھے نوکری ملی ہے درِ مصطفیٰؐ پہ نامؔی
میں ولی اگر نہ ہوتا تو ذلیل و خوار ہوتا

شہاب صفدر



کھنڈر میں گونجی ہُو حق، پرندے سنتے رہے
دلِ فقیر کی دھک دھک پرندے سنتے رہے

بھری بہار میں اُجڑے کسی چمن کے لیے
فغاں بلب تھا فرزدق پرندے سنتے رہے

نکل پڑے تھے دمِ صبح گنگناتے ہوئے
جو گیت رات گئے تک پرندے سنتے رہے

ندی کنارے پھر اک شام نَے نواز تھے پیڑ
لپیٹے پتوں کی اجرک پرندے سنتے رہے

کشادگی کے نئے موسموں کی خوش خبری
بہر زبانِ مبارک پرندے سنتے رہے

وہ شورِ شب تھا چُھپا کر پروں تلے منقار
نشیمنوں میں جگر شق پرندے سنتے رہے

غزل سنائی جو لحنِ پیمبراں میں شہابؔ
فضا میں ہو کے مُعلق پرندے سنتے رہے



تپتی تیز ہوائیں شاخِ گلاب سنبھال
یار دہکتی آنکھیں جھلمل خواب سنبھال

صفحے نہ سہوا آگے پیچھے جُڑ جائیں
جُز بندی پہ شمارۂ لطف و عذاب سنبھال

کس کا کتنا قرضِ رفاقت باقی ہے
ختمِ سفر سے پہلے حساب کتاب سنبھال

دونوں کو مت ہونے دے اک حد سے فزواں
ہجر کی تیرگی، وصل کی آب و تاب سنبھال

آنکھوں اور زبانوں کی گُل باری سے
زخمی ہوتے منبر اور محراب سنبھال

کر دیتی ہے شَل صحرا کی ٹھنڈی آہ
اپنے دریا، چشمے اور تالاب سنبھال

گزر گیا طوفانِ بغض و عناد شہابؔ
جاں بر ہو اور بچے کھچے احباب سنبھال

شہزاد نیّر



مرے روگ کا نہ ملال کر، مرے چارہ گر
میں بڑا ہوا اِسے پال کر، مرے چارہ گر

کبھی درد چُن مرے جسم سے، کسی اِسم سے
مرا انگ انگ بحال کر مرے چارہ گر

یہ بدن کے عارضی گھاؤ ہیں، انہیں چھوڑ دے
مرے زخمِ دل کا خیال کر، مرے چارہ گر

مجھے چیر نشترِ عشق، سوزِ سرِ شک سے
مرا اندمال محال کر، مرے چارہ گر

مجھے سی دے سوزنِ درد، رشتۂ زرد سے
مجھے ضبطِ غم سے بحال کر، مرے چارہ گر

فقط ایک قطرۂ اشک میرا علاج ہے
مجھے مبتلائے ملال کر، مرے چارہ گر

مجھے اپنے زخم کی خود بھی کوئی خبر نہیں
سو نہ مجھ سے کوئی سوال کر، مرے چارہ گر

میں جہانِ درد میں کھو گیا، تجھے کیا ملا
مجھے امتحان میں ڈال کر، مرے چارہ گر

ترا حال دیکھ کے روئے گا، ترا چارہ گر
مرا دل نہ دیکھ نکال کر، مرے چارہ گر



وہ حسیں ڈگر مرا راستہ نہیں ہو سکی
چلی دور دور مگر جدا نہیں ہو سکی

لب و حرف سے مرا اعتبار ہی اُٹھ گیا
ترے بعد مجھ سے کوئی دعا نہیں ہو سکی

مرا اشک چشمۂ چشم میں کہیں گھل گیا
کوئی روشنی تھی مگر دِیا نہیں ہو سکی

وہ عجیب رنگ کی بے کلی مجھے دے گیا
اسے دل سے دور بہت کیا، نہیں ہو سکی

تری آنکھ سے مجھے اِذنِ حرف نہ مل سکا
مری آرزو، مرا مدّعا نہیں ہو سکی

مرے ہونٹ پر گلِ گفتگو نہیں کھل رہا
یہ بہار بھی مرا ماجرا نہیں ہو سکی

دلِ شاعراں میں وہ پھانس بن کے چبھی رہی
کوئی واردات جو واقعہ نہیں ہو سکی

انیل چوہان



ہمارے سامنے منظر نجانے کس جہاں کا ہے
عجب ہے کہ یہاں سارا علاقہ آسماں کا ہے

ہمیں حیرت نہیں کوئی ہمارے خاک ہونے کی
دلِ آئینہ پر گرد و غبار اپنے گماں کا ہے

کہاں پر ڈھونڈنے جائیں ہم اپنے نام کا حصہ
زمیں کے پاس جو موجود ہے سب آسماں کا ہے

نہیں معلوم کیسے ہم جدا ہو کر بھی زندہ ہیں
ہمارا اور تمہارا یہ تعلق جسم و جاں کا ہے

انیلؔ اب کے مزاج ایسا سلگتی دھوپ کا بگڑا
جھلستا پیڑ بھی طالب کسی اب سائباں کا ہے



رات بھر کی تیرگی تنگ کرتی ہے
دن جو نکلے روشنی تنگ کرتی ہے

کل تلک تو ڈستی رہتی تھی تنہائی
اب کسی کی دوستی بھی تنگ کرتی ہے

جاں کے جانے سے یہاں لوگ ڈرتے ہیں
پر مجھے تو زندگی تنگ کرتی ہے

جانتا ہوں جب کسی کی نہیں دنیا
کیوں کسی کی بے رخی تنگ کرتی ہے

زندگی کی ڈور سلجھاتا رہتا ہوں
اور تیری یاد بھی تنگ کرتی ہے

یادِ گل کو شاخ پر ٹانک بھی آؤں
بے کلی بھی ہر گھڑی تنگ کرتی ہے

اب گزر ہوتا نہیں تیز جھونکے کا
گرد دل پر ہے جمی تنگ کرتی ہے

تجھ سے ملنے سے انا روک دیتی ہے
آگ سینے میں دبی تنگ کرتی ہے

دسترس میں ہے سمندر مرے لیکن
دشتِ دل کی تشنگی تنگ کرتی ہے

کل تلک اک اک خوشی کے لیے ترسے
اور انیلؔ اب ہر خوشی تنگ کرتی ہے

سرفراز زاہد

○

جہاں چوکھٹ ہے واں زینہ تھا پہلے
مرا مہمان نابینا تھا پہلے

محبت کی مروج داستاں میں
کہیں مرنا کہیں جینا تھا پہلے

میں دیواروں سے بھی سچ بولتا تھا
مرے کمرے میں آئینہ تھا پہلے

کسی دشمن کی بیعت کر چکا ہے
ہمارے دل میں جو کینہ تھا پہلے

جسے اب تحفتاً لوٹا رہے ہو
مرے اجداد سے چھینا تھا پہلے

○

قدم باہر نکالو آئینے سے
نیا رشتہ بنا لو آئینے سے

دِکھاتا ہے وہی، جو سامنے ہو
یہ پابندی اٹھا لو آئینے سے

کھڑی ہے خود کلامی، بن سنور کر
کوئی جملہ اچھالو آئینے سے

یہاں لگتا نہیں اب جی ہمارا
ہمیں واپس بلا لو آئینے سے

مری بے چینیوں کے خال و خد پر
نظر اک روز ڈالو آئینے سے

خود اپنے آپ سے الجھے پرندو!
مجھے باہر نکالو آئینے سے

خدائی رشک کرنا سیکھ لے گی
اگر تم دل لگا لو آئینے سے

بہت دھندلی نظر آتی ہے دنیا
یہ آنسو پونچھ ڈالو آئینے سے

حسن عباسی



چلتے چلتے گہرے پانی میں اُتر جاتا ہوں میں
روکتا رہتا ہے کوئی اور مر جاتا ہوں میں

پھول بن کر کھلتا ہوں نادیدہ خطے میں کہیں
اور کسی انجان رستے میں بکھر جاتا ہوں میں

ریت اُڑتی رہتی ہے مجھ میں ہزاروں سال تک
پھر اچانک ایک دن سبزے سے بھر جاتا ہوں میں

اجنبی دیسوں میں دونوں ملتے ہیں صدیوں کے بعد
ہاتھ اُس کا تھام کر جانے کِدھر جاتا ہوں میں

چاند اُڑتا رہتا ہے مجھ پر کبوتر کی طرح
کہکشاؤں سے گزرتا اپنے گھر جاتا ہوں میں

میں نے پانی پر بنا رکھی ہیں تصویریں کئی
پھول جب تالاب میں گرتا ہے ڈر جاتا ہوں میں

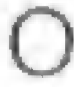
اک محل جس میں چُڑیلوں کا بسیرا ہے بہت
نیند میں چلتا ہوا ہر شب اُدھر جاتا ہوں میں

خوبصورت وادیاں پاؤں پکڑتی ہیں مگر
سپنے آنکھوں میں لیے اُن سے گزر جاتا ہوں میں

چاندنی راتوں میں اپنے گھر سے جنگل کی طرف
اک پرندے کی مدھر آواز پر جاتا ہوں میں

کتنا ہوتا ہے سُہانا اُس کی آنکھوں کا سفر
کیسے کیسے دشت و دریا پار کر جاتا ہوں میں

اب بھی ہے وہ پیڑ گاؤں کی حویلی میں حسنؔ
جس کے نیچے جا کے بیٹھوں تو سنور جاتا ہوں میں



یاد اذیت ناک بنا کر خوش ہوتا ہوں
جلتے دیئے کو ہاتھ لگا کر خوش ہوتا ہوں

یوں تو پھول بھی رکھے ہوئے ہیں کمرے میں
لیکن میں تلوار اُٹھا کر خوش ہوتا ہوں

اپنے پیار کا عادی کر لیتا ہوں جس کو
اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر خوش ہوتا ہوں

اُس کی بے بس آنکھیں جب بھی یاد آتی ہیں
میں چیزوں کو آگ لگا کر خوش ہوتا ہوں

اک دشمن نے ایسا جادو کر رکھا ہے
میں پیاروں کو زہر پلا کر خوش ہوتا ہوں

وہ جو میرے سپنے دیکھنے لگ جاتی ہیں
اُن آنکھوں کی نیند اُڑا کر خوش ہوتا ہوں

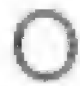
جس کے دل میں کوئی درد نہیں ہوتا ہے
اُس کے دل میں درد جگا کر خوش ہوتا ہوں

خود کو زخمی کرتا ہوں تالاب کنارے
اور پانی میں خون ملا کر خوش ہوتا ہوں

اُس کو ڈھونڈتا رہتا ہوں میں جنگل جنگل
مل جائے تو خود کو چھپا کر خوش ہوتا ہوں

سپنے مرتے ہیں تو دفنانے سے پہلے
اُن کے سرہانے ساز بجا کر خوش ہوتا ہوں

عامر سہیل



تعبیر اس بدن پہ تمنا ہے مختلف
خواہش کا اور خواب کا ملبہ ہے مختلف

آنکھیں ہیں اور رنگِ تماشا ہے مختلف
پھولوں کے پیرہن پہ یہ صحرا ہے مختلف

دامن بچا کے پھریے تو اپنائیت بہت
پوروں سے چھو کے دیکھیں تو دنیا ہے مختلف

اُترے تو کھال کھینچ کے لے جائے ساتھ میں
پہنیں اگر تو عشق کا چولا ہے مختلف

شاید ملیں دوبارا کسی تختِ خواب پر
اب انتظامِ دید کا وعدہ ہے مختلف

تیری طرف بڑھیں تو بھرے شہر روک لیں
پھر بھی ہمارا بھیڑ سے رستہ ہے مختلف

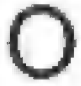
سارے نگوں کا نور جو مل کر نہ دھو سکے
اِس بار تو ضمیر پہ دھبّا ہے مختلف

جس کی خراش جسم کو دونیم کر گئی
سچ سے ڈھلا وہ کانچ کا ٹکڑا ہے مختلف

پتھر کے اور لکڑی کے گھر ایک سے نہیں
آبادیوں میں خوف کا دھڑکا ہے مختلف

کیسے کسی وجود نے اپنا تمام عکس
مخمل کی چادروں پہ اُتارا ہے مختلف

عامؔر بس ایک بار اُسے اور دیکھ لوں
یعنی پلک پہ نیند کا قصہ ہے مختلف



کسی کتابِ خدوخال کی تلاوت کو
کھڑے ہوئے ہیں مہ و مہر کی اجازت کو

کسی نے زین کسی اور دل کو باندھ دیا
کسی نے اشک مہیا کیے حفاظت کو

بدن پہ چلتے ہوئے نشتروں کا کچھ نہ کیا
خدا سمجھ کے میں بیٹھا رہا محبت کو

میں تہمتوں میں جوانی کو پار کر آیا
بدن سے باندھ لیا تھا اسی اذیت کو

مرا زمینوں پہ رُکنا نہیں رہا ممکن
سمجھ رہا ہوں میں کچھ دن سے اپنی حالت کو

مرے چراغ اُبھارے، مرے سُبو لوٹائے
سنبھالتی ہے یہ مٹی اگر امانت کو

مرے وجود کی حاجت تھی میں نے پیش کیا
لہو کی بُوند سے سینچی گئی عداوت کو

نشیب زادوں کی اک بھیڑ تھی مرے پیچھے
میں دھو رہا تھا، شرابوں سے اپنے خلعت کو

وہ بے گھری ہے کہ ہیں دربدر زمانے بھی
سو ایک خواب کا ٹکڑا ملے سکونت کو

یہ عشق اور مجھے کیا ستائے گا عامؔر
میں سہہ رہا ہوں زمانوں سے اس کی شدت کو

حسین اختر



سوچا ہے ایک بار دوبارا نہ سوچنا
ٹوٹا ہے آسمان سے تارا، نہ سوچنا

جلتا ہے جسم میرا گلابوں کے قرب سے
میرے لیے گلوں کا نظارہ نہ سوچنا

تیرے بغیر سانس بھی لینا محال ہے
رشتہ ہے تجھ سے خاص اجارہ نہ سوچنا

گزرے گی آج رات بھی پانی میں ساتھیو!
دریا ہے بے کنار، کنارا نہ سوچنا

خوشیوں کے پھول تجھ پہ نچھاور ہوں ہر گھڑی
اپنا خیال رکھنا، ہمارا نہ سوچنا

آ، ایک ساتھ چلتے ہیں ہاتھوں میں ہاتھ دے
جو ہو چکا ہے یار! خسارہ نہ سوچنا



رزق کثیر مجھ کو خودسر نہ بنا دے
میری ضرورتوں سے زیادہ خدا نہ دے

مجھ کو طلوع فجر کا کیسے یقین ہو
جب تک مرے دریچے پہ دستک صبا نہ دے

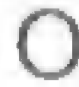
ہوتا نہیں عدالت و منصف کا اہتمام
ظالم نشان ظلم کا جب تک مٹا نہ دے

ممکن ہے پھر یہ آگ بجھائی نہ جا سکے
''گھر کے معاملات کو اتنی ہوا نہ دے''

اک خوف خوں میں دوڑتا رہتا ہے رات بھر
لفظوں کے یہ چراغ زمانہ بجھا نہ دے

اختر مرا قیام ہے کاغذ کے شہر میں
آندھی مرے وجود کے امکاں مٹا نہ دے

عنبرین صلاح الدین



اسیرِ خواب نئی جستجو کے در کھولیں
ہوا پہ ہاتھ رکھیں اور اپنے پَر کھولیں

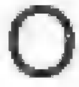
سمیٹ اپنے سرابوں میں بارشوں کا جمال
کہاں کا قصد ہے، یہ رازِ خوش نظر کھولیں

کریں یوں پھر سے اُسے بھولنے کی اک سازش
چلو کہ آج کوئی نامۂ دگر کھولیں

الجھتی جاتی ہیں گرہیں ادھورے لفظوں کی
ہم اپنی باتوں کے سارے، اگر مگر، کھولیں

جو خواب دیکھنا، تعبیر کھوجنا ہو کبھی
تو پہلے پاؤں سے لپٹے ہوئے بھنور کھولیں

اِک اینٹ سامنے دیوار سے نکال تو لیں
مگر یہ ڈر کہ نیا کوئی دردِ سر کھولیں



جب مرے شہر کی ہر شام نے دیکھا اُس کو
کیوں نہیں میرے در و بام نے دیکھا اس کو

حرف در حرف مرے دل میں اترتا آیا
مجھ سے پہلے مرے الہام نے دیکھا اُس کو

میری آنکھوں نے تو اِک بار ہی منظر دیکھا
پھر ہر اک لحظۂ دشنام نے دیکھا اس کو

جانے کس خواب کی حیرت نے جگائے رکھا
پھر مری حسرتِ ناکام نے دیکھا اُس کو

دن ڈھلے خواب دریچے میں اتر آتا ہے
جب بھی دیکھا ہے یہاں شام نے دیکھا اُس کو

مبشر سعید

○

کام مشکل تھا مگر چھوڑ آیا
میں محبت کا نگر چھوڑ آیا

خواب تو زادِ سفر ہوتے ہیں
اور میں زادِ سفر چھوڑ آیا

خود کو لے آیا میں اُس منظر سے
اور وہاں دیدۂ تر چھوڑ آیا

لو بچاتا تو یہ دن کب آتے
رات کی تیغ پہ سر چھوڑ آیا

آشیاں میں غمِ ہجرت کا نشاں
ایک ٹوٹا ہوا پر چھوڑ آیا

ایک دہلیز پہ کچھ پھول دھرے
اک دریچے میں سحر چھوڑ آیا

○

دل ترے غم میں گرفتار بھی ہو سکتا ہے
عشق اظہار سے انکار بھی ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے فقط دشت میں وحشت ہو میاں!
یہ تماشا سرِ بازار بھی ہو سکتا ہے

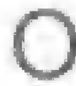
دکھ پرندوں کی طرح شور مچا سکتے ہیں
ہجر پیڑوں پہ نمودار بھی ہو سکتا ہے

یہ جو سردار قبیلے کا بنا بیٹھا ہے
آن کی آن سرِدار بھی ہو سکتا ہے

نیند آنکھوں کے جزیروں سے بغاوت کر کے
خواب، حیرت میں گرفتار بھی ہو سکتا ہے

تم جسے موسمِ آلام سمجھتے ہو سعید
یہ فقط زیست کی دیوار بھی ہو سکتا ہے

محمد مختار علی



نغمگی جیسے کسی ساز کو زندہ کر دے
اِک سماعت مِری آواز کو زندہ کر دے

پر شکستہ ہوں مگر جست تو بھر لوں شاید
یہی کوشش مِری پرواز کو زندہ کر دے

ہم اُسی عشق کی شمشیر سے گھائل ہیں کہ جو
بعض کو مار دے اور بعض کو زندہ کر دے

عین ممکن ہے کہ انجامِ سفر سے پہلے
حرفِ کُن پھر مِرے آغاز کو زندہ کر دے

عشق میں جذبۂ فرہاد کو معیار بنا
شعر میں میرؔ کے انداز کو زندہ کر دے

یہی اُجڑا ہوا منظر یہی بجھتا ہوا دیپ
جانے کب میری تگ و تاز کو زندہ کر دے

قحطِ آدم ہے یہاں بھیج کوئی شاہ لطیف
یا مجھی میں کسی شہباز کو زندہ کر دے

کیا عجب ہو یہی پیرایۂ سادہ مختارؔ
تیرے لکھے ہوئے الفاظ کو زندہ کر دے

(جدّہ)



یوں بزم میں سخن پہ ہے تالا پڑا ہوا
جیسے ہر اِک زباں پہ ہو چھالا پڑا ہوا

آنکھیں بجھی ہوئی ہیں مگر دل ہے نور بار
ہر اک چراغ میں ہے اجالا پڑا ہوا

قسمت میں اپنی موسمِ ہجرت ہے ان دنوں
کیا کیا ہے دھوپ میں گلِ لالہ پڑا ہوا

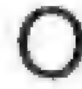
ہر آنکھ کو پتہ ہے کہ رونا ہے کس طرح
ہر شخص کا غموں سے ہے پالا پڑا ہوا

سنگِ سفید ہوں مِرے ظاہر پہ تم نہ جاؤ
آدم کے لمس سے ہوں میں کالا پڑا ہوا

مختارؔ کاروبارِ سخن کیا کرے کوئی؟
بازارِ شوق ہے تہہ و بالا پڑا ہوا

(جدّہ)

اطہر جعفری



خیر کے ہاتھ شر لگ نہ جائے
داغ بے داغ پر لگ نہ جائے

رات رکھی گئی کیوں جہاں میں
آسماں کو نظر لگ نہ جائے

اتنی اونچی اڑانیں ہیں تیری
آسماں سے یہ سر لگ نہ جائے

جتنی جلدی ہو نکلو جہاں سے
دل ہمارا اِدھر لگ نہ جائے

غیر مشروط "ہاں" کر چکے وہ
خوف ہے اب "اگر" لگ نہ جائے

ڈر رہا ہوں شب وصل سے میں
شام سے وہ سحر لگ نہ جائے

راستہ بٹ گیا راستوں میں
حوصلے کو خبر لگ نہ جائے

مار کر خود اٹھا مت پرندہ
اس کا خوں ہاتھ پر لگ نہ جائے

باغ معبد نہ بن جائیں اطہر
ہر شجر پر ثمر لگ نہ جائے

بہزاد برہم



مخملی بدن، روئے سمن، زُلفِ جواں رقص میں ہے
رقص میں ہے شمع کی لَو، لَو پہ دُھواں رقص میں ہے

رات ہوئی، مست اٹھے، پاؤں ہلے، گھنگرو بجے
جھن جھنا جھن، جھن جھنا جھن، سارا جہاں رقص میں ہے

کس کی یہ ہیں بانہیں بھلا! کس کا بدن! کس کی قبا!
کس کو خبر! کس کو پتہ! کون، کہاں رقص میں ہے

تھاپ جو مہمیز ہوئی، دھڑکن دل تیز ہوئی
آ گئی رگ رگ میں دھمک، رواں رواں رقص میں ہے

گرم فضا تا بہ کراں، سانسوں میں ہو جیسے دھواں
جوں ہوں قدم شعلہ فشاں، فرشِ تپاں رقص میں ہے

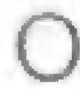
جھوم ذرا ساتھ میں آ! جو بھی ہے تو ہاتھ میں آ!
نام و نسب کا نہ کوئی نام و نشاں رقص میں ہے

ایسی لچک، ایسی پھبن، لہر ہے ہر ایک بدن
رقص گراں آتے ہیں یا آبِ رواں رقص میں ہے

لو وہ اٹھی شانِ غضب، دور ہٹے جاتے ہیں سب
شور اٹھا، حدِ اَدب! رقص کی جاں رقص میں ہے

گھوم اِدھر، گھوم اُدھر، گھومتے ہیں شمس و قمر
برہم ابھی تُو نہ ٹھہر! چاکِ زماں رقص میں ہے

جعفر حسن مبارک



ہیں محبت میں یا ملال میں ہم
پڑ گئے ہیں کسی وبال میں ہم

ایک دوجے کی کچھ خبر ہی نہیں
گم ہیں اب اپنے اپنے حال میں ہم

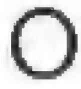
پھڑپھڑانے کی بھی مجال کہاں
پھنس گئے یوں وفا کے جال میں ہم

روشنی پھر نئے ستاروں کی
دیکھتے ہیں ترے جمال میں ہم

وہ نہیں مہرباں رہا اتنا
گویا ہیں آج کل زوال میں ہم

مانگتے ہیں جواب ہم اپنا
ہیں مجسّم کسی سوال میں ہم

ہو نہیں سکتا، غالباً سہواً
آ گئے ہیں تری مثال میں ہم



ایک لمحے کو اک صدی کرنے
آ گیا ہجر دل لگی کرنے

غم منایا یہاں بہت غم نے
پھر خوشی آ گئی خوشی کرنے

بجھ گیا مجھ کو دیکھتے ہی وہیں
وہ جو آیا تھا روشنی کرنے

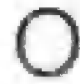
اُڑ کے آنے لگی ہے سر کی طرف
کیا لگی ہے یہ گرد سی کرنے

زندگی تیری جھیل آنکھوں میں
آ گیا ہوں میں خودکشی کرنے

لگ گئی گرد راہ سے اُٹھ کر
میرے قد کی برابری کرنے

پہلے ابجد تو سیکھ لے جعفر
بڑا آیا تُو شاعری کرنے

زاہد نبی



بُجھا پڑا ہوں، یہ رات حسنِ خیال دے گی
مجھے نجوم و قمر کی صحبت اُجال دے گی

میں اپنی نظروں میں اتنا بے وزن ہو گیا ہوں
مجھے یہ ڈر ہے زمین مجھ کو اچھال دے گی

بہت دنوں تک میں خود سے کٹ کر پڑا رہوں گا
بہت دنوں تک مجھے یہ ہجرت ملال دے گی

میں خشک پتے کی طرح یونہی اڑا پھروں گا
تمہاری خوشبو ہوا کے رستے پہ ڈال دے گی

تم اپنی باری پہ رزق حاصل کرو گے زاہدؔ
یہ جلد بازی قطار میں سے نکال دے گی



پانی پر اک نقش اُترنے والا تھا
جب میں اپنی آنکھیں بھرنے والا تھا

رات گئے اک خواب نے مجھ کو گُنگ کیا
میں خود سے دو باتیں کرنے والا تھا

بُجھا بُجھا مہتاب تھا میرے پہلو میں
میں تو دل کو طاق پہ دھرنے والا تھا

کشتی مجھ سے روز کنارہ کرتی تھی
دریا میرے پار اترنے والا تھا

میری آنکھ میں اپنا ترکہ چھوڑ گیا
ایک دِیا جو کل شب مرنے والا تھا

اب تک اپنا آپ سنبھالے پھرتا ہوں
کوئی میرے ساتھ بکھرنے والا تھا

خود کو میں تنہائی میں لے آیا ہوں
مجھ سے میرا سایہ ڈرنے والا تھا

خال و خد ترتیب دیے ہیں عجلت میں
ورنہ میرا عکس مُکرنے والا تھا

ایسے دیکھ رہا تھا مجھ کو حسرت سے
ابھی ابھی وہ جیسے مرنے والا تھا

وہ سینے میں پھانس بنا بیٹھا تھا زاہدؔ
میں سینے میں سانسیں بھرنے والا تھا

ریاض ندیم نیازی



ہم جو اشعار لیے پھرتے ہیں
غم کا اظہار لیے پھرتے ہیں

لب پہ اقرار لیے پھرتے ہیں
دل میں انکار لیے پھرتے ہیں

ایسا لگتا ہے کہ زندہ اجسام
دوش پر بار لیے پھرتے ہیں

سر میسر ہی نہیں ہیں شاید
لوگ دستار لیے پھرتے ہیں

اک مسیحا کی طلب میں ہم بھی
کتنے آزار لیے پھرتے ہیں

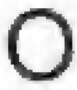
حالتِ جنگ ہے گویا طاری
لوگ تلوار لیے پھرتے ہیں

کوئی کردار نہیں ہے باقی
صرف پندار لیے پھرتے ہیں

کاش مل جائے سکونِ خاطر
قلب بے زار لیے پھرتے ہیں

دیر سے ہم سرِ بازار ندیمؔ
غم کا انبار لیے پھرتے ہیں

راحت نذیر راحت



بدلا نہیں کچھ اس کی پذیرائی وہی ہے
باتوں میں بھی اس شخص کی گہرائی وہی ہے

آئے ہیں مگر موسمِ رسوائی وہی ہے
لاحق ہمیں اس بار بھی تنہائی وہی ہے

شاید پھر اُسی طرح کیا جائے گا مسمار
محفل میں تری، دل کی پذیرائی وہی ہے

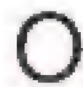
دل توڑا ہے بدلی ہے چلو راہ بھی اُس نے
آنکھوں میں مگر اس کی شناسائی وہی ہے

بدلا ہے جہاں، عشق کی دنیا نہیں بدلی
لیلیٰ بھی وہی دشت میں صحرائی وہی ہے

اس شخص کے جانے سے بھی منظر نہیں بدلا
آنکھوں میں ابھی تک مری بینائی وہی ہے

محفل میں بھی راحتؔ ہے مرے دل کا یہ عالم
خلوت بھی وہی ہے مری تنہائی وہی ہے

حماد نیازی



حجرہ خواب سے باہر نکلا
کون یہ میرے برابر نکلا

آنکھ بینائی گنوا بیٹھی تو
تیری تصویر سے منظر نکلا

پھڑپھڑایا میرے باہر کوئی
اور پرندہ مرے اندر نکلا

آنکھ سے اشک نکل آیا ہے
ریت سے جیسے سمندر نکلا

ہجر کو خواب میں دیکھا اِک دن
اور پھر خواب مقدر نکلا

میرے پیچھے مری وحشت بھاگی
میں جو دیوار گرا کر نکلا

رات پھر تن کی حویلی گونجی
اور دل شور مچا کر نکلا

شام پھیلی تو کھلا ازسرنو
میرا سایہ مرا پیکر نکلا



ہجر کی سرزمینوں سے چلتی ہوا، دل کے پیڑوں کا نقصان کرتی ہوئی
چاند جیسی وہ پیشانیاں بجھ گئیں، ایک آواز اعلان کرتی ہوئی

گھی لگی روٹیاں بوڑھے لرزیدہ ہاتھوں سے پکتی رہیں اور مہکتی رہیں
رنگ تصویر میں سانس لینے لگے، دھوپ کھیتوں کو گنجان کرتی ہوئی

ماں کے ہونٹوں سے خوشبو کی آیت گری اور سانسوں نے اُس کی تلاوت کی
گھر کے چاروں طرف اک صحیفے کی ضو آسمانوں کو حیران کرتی ہوئی

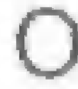
سر پہ رکھے ہوئے دھوپ کی گٹھڑیاں، حسرتوں کو لیے خوبرو لڑکیاں
گھر پلٹنے لگیں، اور اداسی کی لو، سب پرندے پریشان کرتی ہوئی

اور دن ڈھل گیا، وہ بستی کے کچے مکانوں میں پھر سے دیے جل اُٹھے
شور تھمنے لگا اور گاؤں میں پھر شام گلیوں کو ویران کرتی ہوئی

خشک سینوں کے زینے اترتے ہوئے، من کے کچے پیالوں کو بھرتے ہوئے
کھڑکیوں میں کئی خواب دھرتے ہوئے، رات وحشت کا سامان کرتی ہوئی

نیند معصوم آنکھوں میں آنے لگی، خواب کی فاختہ گنگنانے لگی
لوریوں کی صدا جاں سے ہوتی ہوئی، تنگ سانسوں کو آسان کرتی ہوئی

نعیم رضا بھٹی



خمار خانہ کی وحشت کمال کرتی گئی
میرے حواس مکمل بحال کرتی گئی

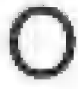
لیا تھا خاک کو جب کوزہ گر نے ہاتھوں میں
تو خاک جسم کو خوشبو مثال کرتی گئی

جو فرطِ شوق میں چوما زمین کو میں نے
جنونِ عشق میں مٹی دھمال کرتی گئی

بدن کو چھید گئی تھیں تمازتیں دِن کی
یہ رات زلف کے سائے سی شال کرتی گئی

وہ اک گھٹا جو ندامت کی قرض دار رہی
زمینِ کرب و بلا برشگال کرتی گئی

جنوں پہ ضبط کا مرہم لگا دیا غم نے
دعا کسی کی رضا اندمال کرتی گئی



حجلۂ جاں پہ نظر ہو گی تو کیسے ہو گی
ظلمتِ شب کی سحر ہو گی تو کیسے ہوگی

گر تجھے پرورشِ آب رسانی ہے عذاب
سبز یہ شاخِ شجر ہوگی تو کیسے ہوگی

فصلِ گریہ سے مرے دل میں بپا ہے کہرام
حیرتِ عشق دِگر ہوگی تو کیسے ہوگی

ہر گزرتا ہوا لمحہ ہے قیامت کی طرح
سوچتا ہوں کہ گزر ہوگی تو کیسے ہوگی

یادِ جاناں کے علاوہ کوئی موسم ہی نہیں
رونقِ ہجر اگر ہوگی تو کیسے ہوگی

تہمتِ عشق لیے سوچ رہا ہوں کہ رضاؔ
زندگی ایسے بسر ہو گی تو کیسے ہوگی

حسن رحمان



آج مشقِ سخن کا ارادہ نہیں
آنکھ بھی نم نہیں، درد زیادہ نہیں

نقش تیرا ہے آنکھوں میں اور عکس بھی
بزم رنگین ہے، کچھ بھی سادہ نہیں

مجھ کو آگے کرو اور چالیں چلو
میں ہوں عاشق تمہارا پیادہ نہیں

بجھ گیا ہے فلک اور زمیں پر مری
پھول، شبنم نہیں، آس، بادہ نہیں

پیار میں کیا نفع، کیسا سود و زیاں
یہ تجارت نہیں، استفادہ نہیں

جیسا ہوں میں، حقیقت میں آؤں نظر
اوڑھا چہرہ کوئی یا لبادہ نہیں

اور کیا ہو الم اُن کے جاتے ہوئے
کوئی پیماں نہیں، کوئی وعدہ نہیں

نیّر حیات قاسمی



تیرا احساں اُٹھائے رکھا ہے
ہم نے امکاں بنائے رکھا ہے

طاق پر رکھ دیا ہے وہ لمحہ
جس نے ہم کو ستائے رکھا ہے

آنچ اُتنی ہی آ رہی ہے بس
جس قدر غم جلائے رکھا ہے

تیرے تو کام کا نہیں شاید
ہم نے جو پل بچائے رکھا ہے

آپ کی یاد کا ہر اِک پہلو
بالمقابل بٹھائے رکھا ہے

دھوپ جلتی نہیں ہے سارا دِن
کس نے سُورج بجھائے رکھا ہے

آنکھ کُھلتی تو جان لیتا وہ
خواب کِس نے دکھائے رکھا ہے

قدرت اللہ شہاب

رضیہ فصیح احمد (شکاگو)

جن لوگوں نے زندگی میں مجھے متاثر کیا ان میں ایک قدرت اللہ شہاب بھی ہیں، یہ اور بات کہ ان کی ذات اور کتاب ''شہاب نامہ'' متنازع رہی۔ میں نے کئی مرتبہ کہا کہ مجھ سے پہلی نسل کے لکھنے والوں کو میں نے ہمیشہ سینئر اور قد آور سمجھا اور ان سے تھوڑا سا فاصلہ رکھا (گو کہ سوال کرنا نہ چھوڑا) قدرت اللہ شہاب کے بارے میں ایک کتاب دیکھی جس کے سرورق پر ان کی تصویر کا نصف چہرہ باریش تھا اور نصف بے ریش۔ اب یاد نہیں آتا کہ میں نے جب قدرت اللہ شہاب کو دیکھا تھا تو ان کے چہرے پر داڑھی تھی یا نہیں (میں چہروں کو ویسے بھی غور سے نہیں دیکھتی) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے مختلف اوقات میں انہیں دونوں طرح دیکھا ہو۔ ان کی جو تصویریں کتابوں میں نظر آتی ہیں، وہ مجھے اس سے تھوڑے مختلف یاد ہیں، نہ برف جیسے بالوں اور براق داڑھی والے، نہ بھرے بھرے جسم کے سوٹڈ بوٹڈ۔ مجھے وہ قدرے پستہ قد، چھریرے جسم کے سانولے سے انسان لگے تھے جن کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی مگر جو بھرے مجمع میں خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ ان لوگوں کے برخلاف جو جملہ حاضرین کی توجہ اپنی طرف رکھنے کے لیے مستقل کوشاں رہتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب سے کوئی بات کرتا تو وہ بات کرتے، کوئی سوال کرتا تو وہ جواب دے دیتے۔

میں نے انہیں پانچ ستاروں کے ہوٹل میں زمین پر چادر بچھائے اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ لنچ کرتے دیکھا ہے۔

کراچی کی ''سلسلے'' کی بیٹھکوں میں قدرت اللہ شہاب کا اکثر آنا ہوتا تھا بلکہ ایسی تاریخ مقرر کی جاتی تھی کہ وہ شریک ہو سکیں۔ قدرت اللہ شہاب کچھ نہ کچھ پڑھ کر سناتے تھے جو اکثر اسی شہاب نامہ کا حصہ ہوتا تھا جو وہ ان دنوں لکھ رہے تھے۔ ایک مرتبہ جب گورنر جنرل غلام احمد کی ناگفتہ بہ حالت کا بیان پڑھا تو میں نے بصد ادب عرض کیا ''شہاب صاحب آپ آج جو یہ باتیں بتا رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا سربراہ اتنا نااہل، لاچار بلکہ معذور ہو چکا تھا تو یہ باتیں اس وقت بتانے کی تھیں۔'' انہوں نے جواب دیا ''آپ کی طرح میں بھی لکھنے والا ہوں۔ مجھے بھی چیزیں نزدیک سے دیکھنے کا شوق ہے۔ میں ایوانِ صدر میں یہ دیکھنے گیا تھا کہ وہاں ہوتا کیا ہے۔'' بعد میں شہاب نامے میں انہوں نے یہ بھی لکھا کہ انہوں نے غلام محمد سے استعفیٰ دلوانے کے لیے کیا مشورہ دیا تھا۔

میرا بیٹا انجم فصیح ستر کی دہائی میں انگلینڈ کے کینٹ کے علاقے میں رہا ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے بھتیجے ڈاکٹر خالد شہاب وہاں ایک چھوٹے سے شہر سٹنگ بورن میں رہتے تھے، میرا بیٹا بھی وہیں تھا اور ان کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ یہاں تک

کہ ڈاکٹر خالد کی بیگم اسے اپنے خاندان کا ممبر جانتی تھیں اور شہاب صاحب کی بھابھی کا کہنا تھا کہ قدرت اللہ شہاب آپ کے بیٹے کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب بھی اپنے اسی بھتیجے کے گھر ٹھہرا کرتے تھے۔ انجم کا کہنا ہے کہ اس کی شہاب صاحب سے بہت باتیں ہوتی تھیں۔ وہ ان سے اتنا متاثر رہا کہ کہتا ہے قدرت اللہ شہاب نہ کوئی غلط بات کہہ سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں لیکن ان کے معاصرین میں ایسے لوگ رہے ہیں جو شہاب نامے کی بہت سی باتوں کو سو فیصد صحیح ماننے کو تیار نہیں۔ مثلاً قرۃ العین حیدر سنسنائی امریکہ آئی ہوئی تھیں۔ وہاں میزبان کے گھر ایک کتاب تھی جو قدرت اللہ شہاب پر لکھی گئی تھی۔ اتفاق سے جو صفحہ کھلا وہ قرۃ العین کے بارے میں تھا۔ کچھ اس قسم کا مضمون تھا کہ محترمہ ایک صبح آنکھوں میں آنسو بھرے قدرت اللہ شہاب کے پاس آئیں۔ یہ رونا رونے کہ ان کے ناول ''آگ کا دریا'' پر کیا فساد برپا ہو رہا ہے۔ میں نے قرۃ العین حیدر کو دکھایا تو وہ بگڑ کر بولیں ''کیا میں پاگل تھی جو صبح صبح بال بکھرائے، روتی ہوئی ان کے پاس دکھڑا رونے جاتی۔'' مشفق خواجہ کا کہنا تھا کہ قدرت اللہ شہاب نے گلڈ میں ہوتے ہوئے پیسوں سے لوگوں کی مدد کی جس سے بعد میں انہوں نے انکار کیا۔

ہندو لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چھبیس ستائیس میل چلنے کی بات کچھ لوگوں کو ناقابلِ یقین لگتی ہے تو کچھ کو شبہ ہے کہ رات کو پے بہ پے پتھر برسنے اور صبح ڈھیر باہر پھینکنے کی بات غور طلب ہے۔ میں نے ایک افسانے میں کوشش کی کہ کوئی بھی اس طرح کی باتیں لکھے تو اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ ''واللہ اعلم بالصواب'' کے عنوان سے افکار میں شائع ہوا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ شہاب نامے میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جو فی الوقت کسی کتاب کو مقبول بناتے ہیں یعنی رومان، روحانیت، مافوق الفطرت واقعات اور معجزے۔ مثلاً گراموفون پر سہگل کے ریکارڈ میں سے بھیانک آوازوں کا آنا اور کلمہ لکھ کر رکھتے ہی اس کی آواز کا نارمل ہو جانا۔ قدرت اللہ شہاب نے نومبر ۱۹۸۴ء میں طاہر مسعود کو بتایا ''بچپن سے لے کر اب تک جو واقعات میں نے دیکھے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ واقعات سب کو متاثر کریں لیکن جنہوں نے مجھے متاثر کیا، میں انہیں لکھ رہا ہوں۔ اس کا تعلق تاریخ سے نہ ہوگا۔ یہ شاید ناول بھی نہ ہو، پتہ نہیں یہ سوانح عمری بن پائے گی یا نہیں، یہ ملی جلی تحریر ہوگی۔ اس کا ہر باب اپنی جگہ مکمل ہوگا اور سارے ابواب تسلسل میں بھی ہوں گے۔ اس کا چوتھائی حصہ میں لکھ چکا ہوں۔'' اس بات سے کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہاب صاحب کے ذہن میں اس کتاب کا کیا نقشہ تھا۔ اب جو کتاب چھپ گئی ہے تو اس میں بعض باب تو کمال کے ہیں، جہاں انہوں نے اپنے بیوروکریٹ ہونے کو استعمال نہیں کیا اور جہاں استعمال کیا۔ جیسے ضلع جھنگ میں ڈپٹی کمشنر کا چارج لینے پہنچے تو اپنا بکس اور بستر تانگے پر رکھ کر کسی کو اطلاع کیے بغیر ریسٹ ہاؤس جا پہنچے اور سب متعلق اور غیر متعلق لوگ ان کی اس حرکت پر حیرت زدہ ہو گئے۔ بعد میں بھی وہ سب کچھ کرنے کی کوشش ہوتی رہی جو ایسے موقعوں پر عام طور پر ڈپٹی کمشنر صاحب کے لیے ہوتی ہے۔ ریسٹ ہاؤس کے باورچی کو بے دخل کر دیا گیا تھا کیونکہ ''حضور'' کا سارا انتظام ناظر بابو کی تحویل میں چلا گیا تھا۔ ''حضور'' کی سواری کے لیے موٹر بھی حاضر ہو گئی تھی مگر جب وہ گھوم پھر کر شہر دیکھنے نکلے تو اردلی ہٹو بچو! کرتا ساتھ ہو لیا۔

پھر بنگال کے قحط میں حکومت کے جمع شدہ غلے کے گوداموں کو تالا تڑوا کر غلہ بھوکوں میں تقسیم کرنا بھی کسی کم ہمت کا کام نہیں۔ زندگی بھر اپنے اصولوں کی خاطر حکومت کا غم و غصہ برداشت کرنا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ کاش ہمارے ملک کے دوسرے بیوروکریٹ ان سے سبق سیکھتے تو آج ملک کے یہ حالات نہ ہوتے جو ہیں۔

حکومت ہی کا نہیں کچھ اور لوگوں کے پردے بھی انہوں نے فاش کی۔ ''گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن'' کا باب ہماری آنکھیں کھولتا ہے۔ یونیسکو کے فرانسیسی ڈائریکٹر جنرل اور اس کے عملے کی بے حد و بے شمار بے اعتدالیوں کو سرِ عام

فاش کرنے کی ہمت ہر کوئی نہیں کرسکتا تھا۔

اسرائیل جانے کا ذکر اور وہاں جو کچھ بیتی اس کا ذکر پڑھ کر بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ اپنے بچوں کے ساتھ ہم مری میں کشمیر پوائنٹ پر قدرت اللہ شہاب کے گھر بھی جا پہنچے۔ کشمیر پوائنٹ کی سڑک پر ہم نے ایک جوان سے پوچھا کہ یہاں کہیں شہاب صاحب بھی رہتے ہیں، وہ سیدھا ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ وہ قدرت اللہ شہاب کا بھانجا تھا۔ ان کی بہن نے ہمیں زبردست کھانا کھلایا جس کے بعد ہم ایک بہت بڑے سے ٹیرس پر جا بیٹھے۔ میں وہاں سے منظر کا معائنہ کرنے لگی تو قدرت اللہ شہاب نے آزاد کشمیر کی طرف اشارہ کرکے کہا ''آپ کو معلوم ہے کہ وہاں جنگ میں ایک ٹرک میں آزاد کشمیر ریڈیو قائم کیا گیا تھا اور ساؤنڈ پروف کرنے کے لیے لحافوں کی مدد لی گئی تھی۔'' وہ دیر تک وہاں سے ہونے والی نشریات کا ذکر کرتے رہے۔ مجھے بھی یاد پڑتا ہے کہ غالباً آزاد کشمیر ریڈیو تراڑ کھیل کے نام سے نشریات ہوتی تھیں۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنے افسانے ''ماں جی'' میں اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔ ''ماں جی'' کی سادگی اور سادہ مزاجی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ''ماں جی'' کی سادہ دلی کچھ قدرت اللہ شہاب میں بھی تھی۔ گو کہ وہ آزاد کشمیر میں بحیثیت سیکرٹری رہے تھے۔ انہوں نے بھارت میں اور پاکستان میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا لیکن بنگال کے قحط کے زمانے میں اپنی ذمہ داری پر انہوں نے حکومت کے اناج کے گودام کھلوا دیے تھے۔ جھنگ میں تانگے میں ایک سوٹ کیس کے ساتھ ریسٹ ہاؤس جا پہنچے تھے جہاں ریسٹ ہاؤس سے قدم نکالنا دوبھر تھا کہ خادمین کی ایک فوجِ ظفر موج ان کی خدمت پر ہمہ وقت آمادہ تھی۔

یہ وہ لائق شخص ہے جو بہترین اردو اور انگریزی لکھ سکتا ہے، جو بیک وقت بیوروکریٹ بھی ہے اور صوفی بھی۔ جس نے اپنے عہدے سے نہ جانے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچایا اور شاید کبھی کسی سے ذکر بھی نہیں کیا۔ ان کے ایک قریبی دوست نے مجھے بتایا کہ قدرت اللہ شہاب ان کے پاس آنے والے خطوط لکڑی کے ایک بکس میں رکھتے تھے جو زیادہ تر کسی ''طلب'' میں ہوتے تھے۔ آخری زمانے میں انہوں نے لوگوں کا پردہ رکھنے کے لیے اس بکس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی تھی۔

میں نے بچپن سے یہی سنا تھا کہ پہنچے ہوئے لوگ اپنے کمالات کا ذکر سننا پسند نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ ''لوگ آپ کے بارے میں کیا کیا لکھتے ہیں مثلاً ممتاز مفتی نے لکھا ہے کہ آپ بیک وقت پنڈی اور لاہور میں پائے گئے۔ آپ ایسی باتیں لکھنے سے انہیں منع نہیں کرتے؟'' قدرت اللہ شہاب نے سادگی سے کہا ''کیا فرق پڑتا ہے۔'' لیکن طاہر مسعود کے انٹرویو میں انہوں نے کہا ''ممتاز مفتی خاکہ اڑانے میں ماہر ہیں، افسانہ نگار بھی بڑے ہیں، لہٰذا انہوں نے لبیک میں میرا خاکہ اڑایا ہے۔''

میں جس زمانے میں برانٹی فیملی پر ناول لکھ رہی تھی، میں نے کتابوں میں پڑھا کہ ایملی کو Mystical Experiences ہوتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کے تجربے کیسے ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ قدرت اللہ شہاب سے لاہور میں جمیلہ ہاشمی کے گھر ملاقات ہوئی تو میں نے ان تجربوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا ''مجھے ایسے تجربے کبھی ہوئے نہیں مگر میں بتا سکتا ہوں کہ اس میں انسان کیا محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس میں آدمی اپنے جسم سے باہر نکل کر فضاؤں میں آزادی سے اڑتا پھرتا ہے اور اس سے بے انتہا مسرت حاصل ہوتی ہے مگر جب وہ دوبارہ جسدِ خاکی میں داخل ہونے لگتا ہے تو بے حد کرب اور کوفت محسوس کرتا ہے۔'' ایملی کی نظموں سے اس کی تصدیق ہوتی تھی، چنانچہ میں نے اپنے ناول ''زخم

تنہائی'' میں وہی کچھ لکھا جو قدرت اللہ شہاب نے بتایا تھا۔

اسی زمانے میں جمیلہ ہاشمی کے گھر انہوں نے ہمیں ایک مزیدار قصہ سنایا جو یہ تھا۔ جب وہ اڑیسہ کے کسی شہر میں تھے، ان کے ایک ہندو ساتھی نے کسی کے عشق میں گرفتار ہو کر دنیا تیاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنے سب ساتھیوں کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور ان سے کہا کہ جو کھانا انہیں مرغوب ہے، کاغذ پر لکھ کر پلیٹ میں رکھ کر چھوٹی پلیٹ سے بڑی پلیٹ ڈھک دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ لوگوں نے مذاق سمجھ کر چینی، فرانسیسی اور ہسپانوی کھانے لکھ دیے تھے۔ چند منٹ بعد جب اس نے آنکھیں کھولنے کو کہا تو ہر شخص کی پلیٹ میں وہ کھانا رکھا ہوا تھا جو اس نے لکھ کر رکھا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے دلی کی مسجد کی سیڑھیوں کے کباب پر انھوں کی فرمائش کی تھی تو وہ اس شکل میں تھے کہ بھاپ چھوڑ رہے تھے۔ بس اس ڈنر کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے ہمالیہ کی کسی خانقاہ میں گم ہو گیا۔

میں نے ان سے پوچھا ''شہاب صاحب یہ کیسے ممکن ہے؟'' انہوں نے جواب دیا ''آسان بات ہے۔ اللہ کے صفاتی ناموں میں سے جس پر بھی آپ پوری طرح Consentrate کر لیں تو یہ صفت آپ میں پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً اس شخص میں رزاق کی صفت پیدا ہو گئی تھی۔'' چونکہ یہ بات میری فہم سے بہت بالا تھی، اس لیے میں نے خاموش ہو جانے ہی میں بہتری جانی۔

شہاب صاحب نے ''نی پا'' کے ایک فنکشن میں ایک اور دلچسپ قصہ سنایا کہ اس ہندو لڑکی نے جس کی نعش انہوں نے ریسٹ ہاؤس کے فرش سے نکلوائی تھی، پاکستان آتے وقت اس طرح ان کی جان بچائی کہ جو گیندے کے پھول انہوں نے اس جگہ رکھ دیے تھے جہاں وہ دفن تھی وہاں ایک پرچہ اس مضمون کا پنسل سے لکھا ہوا رکھا تھا کہ تمہاری بوگی نمبر یہ ہے اور سیٹ نمبر یہ مگر تم وہاں مت بیٹھنا۔ قدرت اللہ شہاب نے فرسٹ کلاس کی اس سیٹ پر کسی اور کو بھیج دیا اور اس طرح ان کی جان بچ گئی کہ جہاں وہ بیٹھے تھے اس سے پہلے کی ساری گاڑیوں پر حملہ ہوا اور سب لوگ مارے گئے۔ میں نے نیپا میں ان سے سوال کیا (جو لوگ وہاں موجود تھے، شاید ان میں سے کسی کو یاد بھی ہو) کہ جب ہندو لڑکی کی روح لکھ سکتی تھی تو اس نے اشاروں کنایوں سے یہ بتانے میں کہ وہ کمرے میں دفن کر دی گئی ہے، مہینے کیوں لگائے۔ اس کا جواب قدرت اللہ شہاب نے یہ دیا کہ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں نے جس طرح واقعات پیش آئے اس طرح بیان کر دیے۔

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد یہ دونوں واقعات شہاب نامے میں نہ پا کر میں نے اشفاق احمد سے پوچھا کہ کیا ان کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مافوق الفطرت کارنامے ہندو عورت اور ہندو مرد کے ہاتھوں سرانجام پائے تھے۔ اشفاق احمد نے کہا ''یہ واقعات میں نے بھی ان کی زبانی سنے ہیں مگر وہ کتاب میں کیوں نہیں ہیں، میں نہیں جانتا۔'' پھر کمال اطمینان سے انہوں نے کہا ''شاید پبلشر نے نکال دیے ہوں۔'' شہاب نامے کے شروع میں درج ہے کہ اس کتاب کو تمام و کمال اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے پڑھا ہے اور اس کی پروف ریڈنگ کی ہے۔

میرے ساتھ شہاب صاحب نے ایک مرتبہ اتنی مہربانی کی جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی۔ اسلام آباد کی اردو کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب سب لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ میں نے وہاں سے اپنی بہن کے پاس لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا۔ میرا جہاز شام کو جانے والا تھا۔ کانفرنس کا انتظام کرنے والے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ شام کو گاڑی آپ کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے آ جائے گی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، میرا وہم بڑھتا گیا کہ خدا معلوم گاڑی آئے گی یا نہیں۔ ہوٹل میں تنہا ویسے بھی میرا دل گھبرا رہا تھا۔ آخر میں نے شہاب صاحب کو فون کر دیا اور اپنی مشکل انہیں بتائی کہ شاید وہ اس کا حل بتائیں یا تسلی ہی دیں۔ شہاب

صاحب نے سن کر کہا، اچھا میں آتا ہوں۔ اگر گاڑی نہیں آئی تو میں آپ کو ایئر پورٹ چھوڑ دوں گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے بیٹے کے ساتھ تشریف لے آئے اور جب تک میری گاڑی نہیں آ گئی میرے پاس بیٹھے مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میں ان کی یہ نیکی کبھی نہیں بھولوں گی۔ اس وقت میں نے ان سے پوچھا کہ اختر جہاں کے بیٹے کو قید میں رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کچھ کوشش کریں۔ کہنے لگے ''میں نے کوشش کی اور ضیاء الحق نے مجھ سے وعدہ بھی کیا کہ اسے چھوڑ دیا جائے گا مگر چھوڑا نہیں، جھوٹا آدمی ہے۔'' بالکل یہی الفاظ انہوں نے میرے بیٹے سے کہے جب اس نے پوچھا کہ آپ کو جنرل ضیاء الحق نے محکمہ تعلیم میں جو پیشکش کی تھی تو آپ نے کیوں قبول نہیں کی تو انہوں نے کہا، جھوٹا آدمی ہے۔

شہاب نامہ میں شہاب صاحب نے اپنی بیگم عفت کے آخری زمانے کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شہاب صاحب سے بہت محبت کرتی تھیں اور شاید ان پر فخر بھی کرتی تھیں۔

شہاب صاحب کو اپنی بیگم کی بیماری اور موت کا بہت افسوس تھا اور اس بارے میں وہ خود کو مجرم بھی سمجھتے تھے کہ وہ اعصابی تناؤ میں رہیں، لگ کر ان کا علاج بھی نہ ہو سکا۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا وہ صرف اکتالیس سال کی تھیں۔ شہاب صاحب نے لکھا ''جب میں اسے بیاہ کر لایا تو وہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے فائنل ایئر سے نکلی تھی اور جب میں نے اسے دفنایا تو وہ واقعی ایسے لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔'' پورے شہاب نامے میں کہیں اتنا پچھتاوا اور ملال نہیں ہے جتنا اس عفت کے باب میں ہے۔



ندیم نظم:

''ہم''

اک عمر سے فریب سفر کھا رہے ہیں ہم
معلوم ہی نہیں کہ کہاں جا رہے ہیں ہم

یوں گرد سے اٹے ہیں کہ پہچان مٹ گئی
لیکن یہ وہم ہے کہ جلا پا رہے ہیں ہم

بنیاد پختہ کا تو نہ آیا کبھی خیال
چھت جھکتی آ رہی ہے تو پچھتا رہے ہیں ہم

برسوں سے انتظار ہے اک نخل سبز کا
آب حیات ریت پہ ٹپکا رہے ہیں ہم

یہ سوچتے ہیں ٹوٹتے تاروں کو دیکھ کر
منزل سے، رفتہ رفتہ قریب آ رہے ہیں ہم!

اک دائرے میں گھومتے پھرتے رہے ندیم
اس وہم میں مگن کہ بڑھے جا رہے ہیں ہم

(''بسیط'' احمد ندیم قاسمی)

ایوب خاور میرا دوست ہے

عرفان جاوید

(۱)

ایوب خاور کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ دراصل بات ہی کچھ ایسی تھی۔ گفتگو مختلف موضوعات سے ہوتی ہوئی باپ کی محبت اور محفوظ بچپن کی طرف آنکلی تھی۔ میرا موقف تھا کہ لوگ ماں کی ممتا اور محبت کا اتنا شد و مد سے اور موثر تذکرہ کرتے ہیں کہ باپ کی محبت جو ایک محفوظ بچپن کی ضامن ہوتی ہے، پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اس پر ایوب خان نے مجھے غور سے دیکھا اور بھیگی آواز میں بولے:

''عرفان جی! آپ کی بات اپنی حد تک تو ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اس کا سب پر اطلاق نہیں ہوتا۔''

یہاں پہنچ کر وہ خاموش ہو کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ میرے تجسس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے گویا ایک فیصلہ کر لیا۔ ہمارے درمیان درجنوں ملاقاتوں میں فنون لطیفہ سے لے کر خانگی مسائل تک بے شمار موضوعات پر بات ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے انہوں نے کبھی اپنے بچپن کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پس وہ رات دن ان کے بچپن، محروم بچپن کی یادوں کی نذر ہوئی۔

''عرفان جی! کہنے کو تو ہمارا ایک بھرا پُرا کنبہ تھا۔ ہم چار بھائی اور ایک بہن تھے۔''

یہاں پہنچ کر انہوں نے توقف کیا اور ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ سے بولے:

''میری تو دو دو مائیں تھیں۔ ایک حقیقی اور ایک سوتیلی۔ میرے باپ نے دو شادیاں کی تھیں لیکن ایسے بھرے پُرے کنبے میں بھی میں نے وہ تنہائی دیکھی کہ اس نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ یہ جو میری حساس طبیعت ہے۔ دل کو احساسات کے نرم ہاتھوں سے ٹٹول کر شعروں کی شکل میں نظم کرنا، بات کرتے کرتے کہیں کھو جانا اور ہجوم میں یکدم تنہا ہو جانا۔ یہ سب اسی دور کی عطا ہے۔''

میری نظروں میں شاید ایوب خاور نے ہمدردی پڑھ لی تھی اسی لیے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے بولے:

''اب تو میرے بچپن کی سب محرومیاں دور ہو چکی ہیں۔ اب تو میں بہت خوش ہوں۔''

نمی کی ایک مہین چادر ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔ انہوں نے نظریں چرا لیں اور لمبی سانس بھر کر بات جاری رکھی:

''میں نے تو اپنی حقیقی ماں کو صرف محنت کرتے ہی دیکھا، ان تھک محنت۔ میرا خاندان، فوجی خاندان ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں میرے والد صاحب جاپان میں قیدی بھی رہے۔ میں نے بچپن سے اپنے گھر میں بجی ہوئی برما اور جاپان سے والد صاحب کی لائی ہوئی چیزیں دیکھی ہیں۔ جاپان سے واپس آنے کے بعد میرے ماں باپ کی شادی ہوئی۔ میں جب دواڑھائی سال کا تھا تو میرے والد صاحب جو چکلالہ تعینات تھے، نے اپنی

ایک کزن سے چھپ کر دوسری شادی کر لی اور کراچی چلے گئے۔ نتیجتاً ان کا کورٹ مارشل ہوا اور ہم اپنی ماں کے سمیت گاؤں میں بالکل بے آسرا ہو گئے۔ کچھ عرصے کے لیے تایا نے ہمیں کراچی بلا لیا۔ جب والد صاحب قید میں تھے تو عجیب دن تھے۔ دھو نکے ہوئے، سنولائے ہوئے، ان کی رہائی کے کچھ عرصے بعد ہم ماں کے ساتھ واپس آ گئے۔ یہ مجھے اس لیے بھی یاد ہے کہ میں چھوٹا سا تھا اور ٹرین چلنے سے پہلے میرے والد صاحب نے مجھے اٹھا کر اپنی باہوں میں لیا اور سینے سے چمٹا لیا۔ بس اس کے علاوہ والد صاحب کی محبت کا کوئی لمحہ یاد نہیں۔ دس گیارہ سال کی عمر تک گاؤں میں، میں نے بہت مشکل زندگی گزاری۔ صرف ماں کی محنت کے بل بوتے پر۔ پرائمری تک اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھا، چھٹی جماعت چکوال کے ہائی اسکول میں مکمل کی۔ پھر والد صاحب نے کراچی بلا لیا۔ کراچی میں دوبارہ چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ وہاں میری سوتیلی ماں کے تخت رویے نے مجھے فرار پر اکسایا اور میں زیادہ وقت دوستوں کے گھروں میں رہنے لگا۔ میں اپنا گھر ہوتے ہوئے بے گھر ہو گیا۔ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا کہ ایک مرتبہ جب میری سوتیلی ماں مجھ سے برتن دھلوا رہی تھی تو میں نے اپنے ہاتھ پر چھری مار لی۔ اس سے میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کی ایک رگ کٹ گئی۔ میں نے چکوال میں تعمیراتی کاموں میں مزدوری کی ہے۔ اینٹیں لگائی ہیں۔ گارا بھی بنایا ہے لیکن اصل میں آپ کے قریبی رشتوں کا احساسِ لاتعلقی ہے جو آپ کو مار دیتا ہے۔ میرے سر پر میرے ماں اور باپ کا سایہ موجود رہا لیکن میرے باپ کا لاتعلقی کا رویہ، حقیقی ماں کی انتھک محنت اور سوتیلی ماں کا سخت رویہ مل کر کچھ ایسا تلخ آمیزہ بنے کہ میں جب بچپن کی حدوں سے نکل بھی آیا تو بھی یہ آمیزہ میرے حلق میں اترتا رہا اور رگوں میں دوڑتا رہا۔''

یہاں پہنچ کر ایوب خاور نے کچھ دیر توقف کیا۔ پھر بولے:

''اکثر لوگوں سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بچپن کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ سنائیں۔ میرے پاس بھی ایسے واقعات کی کمی نہیں۔ چلیں اسی واقعے کو لیجیے، میرا ایک ہم جماعت تھا۔ میرا اس سے اول پوزیشن کے لیے مقابلہ رہتا تھا۔ کبھی وہ اول آ جاتا تو کبھی میں۔ ایک مرتبہ ایک جگہ مزدوری کرنے گیا۔ دن بھر مزدوری کی۔ شام کو جب مجھے مزدوری کی ادائیگی کے لیے بلایا گیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مالک کے ساتھ میرا وہی ہم جماعت کھڑا تھا جس سے اسکول میں میرا مقابلہ رہتا تھا۔ پھر یہ عقدہ کھلا کہ وہ مالک کا اپنا بیٹا تھا۔ خیر میں کون سے پیسے چرانے گیا تھا، آخر کو مزدوری کی تھی۔ سو معاوضہ ضرور وصول کیا۔ پورا ایک روپیہ وصول کیا تھا۔''

یہاں پہنچ کر وہ شرارت سے بولے:

''چوری بھی کر لیا کرتا تھا۔ چوری کے گڑ کا تو مزہ آج بھی میرے منہ میں ہے اور ہاں کبھی اچار بھی چوری کر لیتا تھا۔''

اب ماحول قدرے خوشگوار ہو گیا تھا۔ ایوب خاور نے پھر سے کلام جاری کیا۔

''جہاں میرے بچپن سے تلخ یادیں وابستہ ہیں، وہیں پر اس دور کی خوشگوار یادیں میرے سراپے کو سبک ہوا کی طرح تھپکیاں دیتی رہتی ہیں۔ میں اس بات میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس دھرتی کا بیٹا ہوں۔ میں نے جہاں اپنے ہاتھوں سے مزدوری کی، وہیں پر اناج بھی کاٹا۔ جب میں دھرتی کے سینے سے پھوٹنے والے اناج کو کاٹتا تو گویا اس زمین کا حصہ بن جاتا۔ فصلوں بھرے کھیتوں اور اناج بھرے کھلیانوں کے مناظر مجھے ہمیشہ ہانٹ کرتے تھے۔ ڈھول کی تھاپ پر گندم کاٹنا فنکارانہ کام لگتا تھا۔ گندم کے زیادہ سے زیادہ ٹانڈے جڑوں سے کچھ اوپر سے پلک جھپکنے میں ایک ہاتھ کی مٹھی میں پکڑنا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی درانتی سے کاٹ دینا اور اس عمل کو ڈھول کی ایک خاص ردھم کے ساتھ انتہائی تیزی سے کچھ وقت تک جاری رکھنا۔ طاقت اور نزاکت کا یہ حیران کن مظاہرہ میں نے اکثر حبس بھری دوپہروں میں دیکھا ہے۔ میں اس دور کی کھیلوں میں بھی حصہ لیتا رہا۔ یہ گلی ڈنڈا، درختوں سے کاٹی گئی ہاکی نما شاخوں سے سڑک پر یا کچی گلی میں ہاکی کھیلنا، سائیکل کے رم کو بغیر گرائے دور تک چھڑی سے گھماتے چلے جانا، کوکلا چھپاتی جمعرات آئی ہے، پٹھو اور گیلیاں کھیلنا...... بس یہی تھے ہمارے بچپن کے کھیل۔ چونکہ میں اس گرد مٹی میں پلا بڑھا ہوں، اس لیے میں مٹی سے وابستہ ہر شے سے محبت کرتا ہوں اور اسی مٹی نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت ڈالی۔ آج بھی میں اپنے ہاتھوں سے کام کر کے ایک

گونہ مسرت حاصل کرتا ہوں۔''

ایوب خاور نے چائے کی پیالی پرچ میں رکھی اور اپنے ہاتھ سامنے پھیلا کر استفسار کیا:

''عرفان جی! کیا یہ ہاتھ ایک فنکار اور شاعر کے ہاتھوں کے علاوہ محنت کش کے ہاتھ نہیں لگتے لیکن ان ہاتھوں نے جب قلم تھاما تو آج تک تھام رکھا ہے۔ میرا یقین ہے کہ ہم قصباتی، دیہاتی لوگوں کی تعلیم میں استادوں کا بہت کردار ہوتا ہے۔ سخت اور ظالم استاد کی وجہ سے جہاں بہت سے بچے شروع ہی میں اسکولوں سے بھاگ جاتے ہیں، وہیں پر خوش قسمتی سے اچھے اور مخلص اساتذہ قلم سے محبت کی ایسی لت ڈالتے ہیں جو بہت دیر تک ساتھ چلتی ہے۔ میرے دادا کا نام نور خان تھا۔ وہ بہت شفیق انسان تھے۔ انہی کے ایک ہم نام استاد نور خان، ویسے ہی شفیق اور مخلص، مجھے ابتداء میں مل گئے۔ وہ بھی دادا کی طرح ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انتہائی شفاف اور جذباتی آدمی تھے۔ سبق پڑھاتے ہوئے اس میں اس طرح ڈوب جاتے کہ شدتِ جذبات سے ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتی۔ تعلیم کو مذہب کا اہم جزو جانتے تھے۔ بس یہ ان کا بجز کا یا ہوا شعلہ تھا جو ساری زندگی میرے سینے میں چراغ بن کر روشن رہا وگرنہ میں شاید علم میں اس طرح دلچسپی نہ لیتا۔ چکوال کے ہائی اسکول میں جب میں چھٹی جماعت میں پہنچا تو میرا ڈیسک کلاس روم کی کھڑکی کے ساتھ تھا۔ میں نے اپنے ڈیسک پر نشان لگا رکھا تھا۔ جب ڈھلتے سورج کی روشنی اس نشان کو چھوتی تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ چھٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ بس اسی دھوپ چھاؤں میں زندگی گزر گئی۔'' چند لمحوں کے وقفے میں چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہنے لگے: ''ادھر جس دور میں میں نے میٹرک کیا تو اس پر خوشی منانا تو کجا میری سوتیلی ماں اور میرے سگے باپ نے مجھ سے نتیجے کا پوچھا تک نہ تھا بلکہ شاید ان کے علم میں بھی نہ تھا کہ میں نے تعلیم کا ابتدائی زینہ عبور کر لیا ہے اور شاید ان کو اس سے دلچسپی بھی نہ تھی۔ میں نے کہا نہ تھا کہ لاتعلقی کا رویہ مار دیتا ہے۔''

عمومی طور پر زندگی کی رو سے بھرپور ایوب خاور اس بھیگی رات کو ماضی کی یادوں میں اس بری طرح بھیگے ہوئے تھے کہ میں نے بے جا مداخلت کو ان کے لیے ناگوار جانتے ہوئے ان کو ان کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ شاید انہیں کتھارسس کی ضرورت تھی۔ وہ گویا ہوئے:

''آپ نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ میرے ڈراموں میں قصباتی ریلوے اسٹیشن، تالاب اور ٹرین کی پڑیاں کیوں کر اس تواتر سے سامنے آتی ہیں۔ میرے بچپن کے چکوال میں ایک پرانا پُرسکون ریلوے اسٹیشن تھا۔ اسٹیشن کی قدیم عمارت میں انتظار گاہ، ٹکٹ گھر، ایک دو دفتری کمرے، بلٹی گودام اور سامنے پلیٹ فارم تھا۔ اس کی سال خوردہ عمارت کے سامنے سے گزرتی ریلیں آج بھی مجھے ہانٹ کرتی ہے۔ چکوال میں ایک پرانا تالاب تھا جس میں سیڑھیاں اترتی تھیں۔ میرے گاؤں کے قبرستان میں درختوں میں گھرا ہوا ایک چھپڑ بھی میری توجہ کا مرکز رہا۔ یہ سب چیزیں شاید میرے تحت الشعور میں اس طرح اتر گئی ہیں کہ کبھی خوابوں اور کبھی ڈراموں میں ابھر آتی ہیں۔ بچپن میں میں اکیلی پٹڑی پر دور تک چلا جایا کرتا تھا۔ بہت بعد میں میں نے اداکارہ عارفہ صدیقی کو اسی طرح ایک ڈرامے میں پٹڑی پر چلایا۔ تنہائی، بے سہارگی اور خون کے رشتوں پر سے اعتبار اٹھ جانے کی وجہ سے جو بے چارگی انسان کو گھیرتی ہے، اسے اجاگر کرنے کے لیے یہ منظر تخلیق کیا۔ یہی نہیں بلکہ بچپن میں جو ہم کڑی دوپہروں کو کیکر یا شیشم کی چھاؤں میں بیٹھ کر پیاز کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں دبا کر توڑتے اور پھر نچوڑتے تھے، اس عمل کو بھی ڈراموں میں ایک کردار کی ذہنی کشمکش کے اظہار کے لیے استعمال کیا۔ بچپن کی ان یادوں کے ساتھ یہ بات بھی میرے لیے باعثِ اطمینان رہی کہ اس دور کی محرومیاں میرے ارادوں کو کمزور کرنے کے بجائے مضبوط کرنے کا باعث بنیں۔ میرا تایازاد بھائی فلمیں دیکھنے کا شوقین تھا۔ جب وہ گاؤں آیا تو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے بوٹ جرابیں پہنے دیکھا۔ میں کہاں کسی سے کم تھا۔ سو کپڑوں کی پٹیاں پیروں پر لپیٹ کر اوپر اسکول یونیفارم والے جوتے پہن لیے اور یوں جرابوں کا شوق پورا کر لیا۔ شوق تو وقت کے ساتھ اور بھی ابھرتے رہے۔ میٹرک کے زمانے میں ریڈیو پر ڈرامے بہت سنے۔ سو ریڈیو کا شوق کچھ ایسا جاگا کہ بزم طلبہ میں حصہ لیا۔ بزم طلبہ ریڈیو پاکستان کراچی میں نوجوانوں کا ایسا نمایاں پروگرام تھا جس نے طلبہ و طالبات کی تربیت اور رہنمائی کی۔ ٹیلی ویژن کے معروف ڈائریکٹرز قاسم جلالی،

محسن علی، کاظم پاشا، فہمیدہ نسرین، اقبال لطیف، غلام محی الدین، نقاش کاظمی، اقبال فریدی، پروین شاکر، ثروت حسین، شوکت عابد، رضا ربانی اور خوش بخت شجاعت وغیرہ اسی پروگرام کا حاصل ہیں۔ اسی طرح میری تربیت ہوئی اور یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے مجھے بزم طلبہ میں اعزازی پروڈیوسر بھی رکھ لیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کی فیس کی ادائیگی میں بھی آسانی ہوگئی اور جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ اس وقت کے تمام نامور اور صاحب حیثیت اساتذہ، دانشوروں اور ادبی و ثقافتی شخصیات کے قریب رہنے کا موقع ملا۔"

ہمارے ہاں جو لوگ کسی میدان میں اہم مقام پر پہنچ جاتے ہیں، وہ عموماً اپنے محسنین کا ذکر تکلف سے کرتے ہیں مگر ایوب خاور کو میں نے اس معاملے میں بڑے دل کا دوست پایا۔ جیسے جیسے میرے سوالات بڑھتے رہے، ویسے ویسے ایوب خاور اپنے مہربانوں اور دوستوں کا محبت سے ذکر کرتے رہے۔ بات اب اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ اب بچپن، لڑکپن سے نکل کر ہم پختہ عمری کی جانب آ گئے تھے۔ ایوب خاور نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولے "یہ تو گویا انٹرویو ہو گیا۔" میں نے جھینپتے ہوئے توجیہہ پیش کی کہ یہ ایک دوست کو جاننے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ اس پر وہ کچھ توقف کر کے بولے:

"میری طالب علمی کے زمانے میں یہ بھی ہوا کہ ایک بار میری آٹھویں جماعت کی فیس میرے استاد محمد حنیف صاحب نے جماعت کے بچوں سے چندا اکٹھا کر کے ادا کروائی۔ بعد میں ان کے گھر جا کر میں ان کے بچوں کو پڑھاتا بھی رہا۔ ریڈیو میں سلیم احمد اور قمر جمیل جیسے لوگوں نے ابتدائی ٹریننگ دی۔ ان کے گھر میں جدید ادبی تحاریک پر مباحث ہوا کرتے تھے۔ ریڈیو پاکستان کراچی کی بزمِ طلبہ میں ادب کے جتنے طالب علم نمایاں ہو رہے تھے، وہ سب قمر جمیل صاحب اور سلیم احمد صاحب کے گرد جمع رہتے تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ ان دونوں ادبی شخصیات نے ہماری ذہنی تہذیب و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پھر زندگی نے اور بہت کچھ دیا۔ ایک لڑکی کو چاہا تھا، وہ آج میری بیوی ہے اور میرے بچوں کی ماں ہے۔ میرے جیسا لڑکا جو چھوٹے شہر سے اٹھا، اس کا ہاتھ احمد ندیم قاسمی جیسے لیجنڈ نے تھاما۔ نیشنل کالج شرف آباد میں داخلہ لیا تو پہلے یا دوسرے سال میں ایک شاعری کے انعامی مقابلے میں مجھے فنون کا یادگار زمانہ "غزل" نمبر انعام میں ملا۔ وہ فنون سے میری شناسائی کا پہلا دن تھا۔ یہ غزل نمبر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، جس میں اپنے وقت کے سارے قابل ذکر غزل گو اپنی بہترین غزلوں کے ساتھ موجود ہیں۔ جب سقوط ڈھاکہ کا حادثہ ہوا تو میں نے ایک نظم کہی اور فنون کے پتے پر قاسمی صاحب کو بھیج دی۔ اس وقت تک میں اقبال فریدی، ثروت حسین اور پروین شاکر فنون کے باقاعدہ قاری تھے۔ اگلے شمارے میں اپنی نظم دیکھ کر حیرت خوشی اور خوشی حیرت میں گڈمڈ ہوگئی۔ تب قاسمی صاحب سے خطوں کے ذریعے رابطہ شروع ہو گیا۔ پروین، ثروت اور میں مستقل فنون میں چھپنے لگے۔ اقبال فریدی چونکہ بہت موڈی نوجوان تھا، چنانچہ اپنی انتہائی منفرد شاعری کو سمیٹ کر دن دیہاڑے کونے میں بیٹھ گیا۔ یہ ریڈیو میں میری اعزازی ملازمت کا زمانہ تھا۔ ۷۶۔۱۹۷۵ء میں اسلام آباد ٹیلی ویژن جوائن کیا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک کار کے حادثے میں میری بائیں ٹانگ کی ہڈی ٹخنے سے ذرا اوپر سے ٹوٹ گئی۔ تین مہینے تک مسلسل جب میں پلاسٹر لگی ٹانگ کے ساتھ گھر میں رہا تو اس دوران "لاریب" کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ بھی میرا اعزاز ہے کہ قاسمی صاحب نے یہ طویل نظم فنون کے اوراق میں بہت محبت سے درج کی۔ اس دوران "اوراق"، "افکار" اور "ماہِ نو" میں بھی میری چیزیں چھپتی رہیں۔ ۸۱۔۱۹۷۸ء تک کراچی ٹی وی سینٹر پر واپس آ کر کام کیا۔ پھر ۸۲۔۱۹۸۱ء میں چھ مہینے پشاور اور پھر لاہور ٹرانسفر ہو گئے۔ ٹی وی پر میرا اصل کام لاہور اسٹیشن کا مرہون منت ہے۔ شہر لاہور کیا جیتا جاگتا شہر تھا اور اب بھی ہے۔ کیا کیا گنج ہائے گراں مایہ نے یہاں زندگی کی ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر سید عبداللہ، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، فیض صاحب، ڈاکٹر محمد اجمل، سجاد باقر رضوی، منیر نیازی، انتظار حسین، اختر حسین جعفری، اشفاق احمد، بانو آپا، شہزاد احمد، انیس ناگی، ڈاکٹر انور سجاد، عبداللہ حسین، مستنصر حسین تارڑ، صفدر میر، سرمد صہبائی، نعیم جوزی، قتیل شفائی، احمد راہی، کلیم عثمانی، مظفر وارثی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، اصغر ندیم سید، خالد احمد، نجیب احمد، وارث لدھیانوی، تنویر نقوی، مسرور انور، خواجہ انور، رشید عطرے، ماسٹر عنایت، سیف الدین سیف، ریاض شاہد، محمد سلیم الرحمن، نذرالاسلام،

محمد جاوید فاضل، سید نور، شہزاد رفیق یہ نام میری زندگی میں شامل ہوئے اور بہت سے آج رگوں میں خون کی طرح دوڑتے ہیں۔ ٹی وی نے مجھے بہت شہرت دی۔ شہر کی کئی بڑی ثقافتی تنظیموں کی طرف سے ہر سال کسی نہ کسی قابل ذکر پروگرام پر مجھے ایوارڈ ملتا رہا۔ پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ سات بار ملا۔ اس مصروف ترین پروفیشنل زندگی میں شاعری سے جان نہیں چھڑا سکا۔ یہ میرے ساتھ میرے سائے کی طرح رہی، میری روح میں گونجتی رہی۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی شاعری ''گل موسم خزاں'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ ضیاء دور میں میرا نام ان شاعروں کی لسٹ میں تھا جن پر ضیاء الحق نے اس ملک کی چاندنی حرام قرار دی تھی۔ کچھ سنگرز کے علاوہ ٹی وی ڈرامے کی دنیا میں ریشم، عفت رحیم، ماریہ واسطی، نبیل، علی ظفر، کاشف محمود کئی اور فنکاروں اور گلوکاروں کو پرائم ٹائم کے ڈراموں اور میوزک کے ناظرین سے بھی متعارف کرایا۔ کچھ تو میرے ڈراموں میں ابھر کر اپنی ہی ذات میں ڈوب گئے۔ جیسے خواجہ اینڈ سن کی ثمینہ (ڑ) والی اور قاسمی صاحب کی ''ست بھرائی'' (مہر النساء)۔

گو کہ اب نئے دور میں حالات بدل رہے ہیں اور بہت سے اداکار اور اداکارائیں فن کو بالائے طاق رکھ کر دیگر منفی رجحانات کو تقویت دے رہے ہیں۔ میرا کام ابھی جاری ہے اور آخری سانس تک جاری رہے گا۔ جب میری سانس باقی نہ رہے گی تو بھی میں اپنی تخلیقات میں سانس لیتا رہوں گا۔

سو عرفان جی! حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔''

ایوب خاور نے اس طویل گفتگو سے مجھے باور کرایا کہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ اس سفر کے کسی موڑ پر آپ کی ملاقات ایسے اتفاق سے ہو جائے جو آپ کو اڑا کر چاند نگری کی سیر پر لے جائے اور اس نے مجھے یہ بھی باور کروایا کہ کبھی کسی رائے کو حتمی نہ جانا جائے۔

وہ رات گزر گئی کہ ہر رات، سوائے شب آخر کے، نے تیزی سے گزر ہی جانا ہے۔ ایوب خاور کے ساتھ اس رات کی نشست برخاست ہوئی کہ ہر نشست کو برخاست ہونا ہے لیکن ان کے وہ جذبات سے پُر جملے اب تک میرے کمرے میں گونج رہے تھے جن کو میں نے کاغذ کی بوتل میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲)

ایوب خاور کے ''ایوب جی'' اور عرفان جاوید کے ''عرفان جی'' بننے تک کئی مراحل ہیں۔

ایوب خاور کا نام میں نے ٹی وی پر تو سن ہی رکھا تھا لیکن جب میرے کچھ افسانے احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' میں چھپے تو جہاں اس میں چھپنا میرے لیے ایک اعزاز ٹھہرا وہیں پر یہ امر بھی طمانیت کا باعث بنا کہ ایسے معیاری جریدے میں میرا نام احمد فراز، گلزار، ایوب خاور، تارڑ، منشا یاد وغیرہ جیسے نامی گرامی تخلیق کاروں کے ساتھ چھپا۔ ''فنون'' میرے لیے ایوب خاور سے غائبانہ تعارف کا باعث بھی بنا۔

ان کی نظمیں اپنی تمام تر رنگین امیجری کے ساتھ مجھے بار بار اپنی جانب متوجہ کرتی رہیں۔

بہت سال پہلے، ایک روز میں اپنے بچپن کے ایک دوست کے ہاں کھانے پر لاہور میں مدعو تھا۔

اس دوست کی بیوی ٹی وی کا ایک معروف چہرہ ہیں اور اس سے بڑھ کر اچھی خاصی پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ خیر وہاں کھانے کے بعد کافی پر پاکستانی ادب میں آنے والی تازہ اور معیاری تصنیفات پر بات چل ہی رہی تھی کہ بات کرتے کرتے خاتون خانہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولیں:

''عرفان بھائی! آپ یہاں جس صوفے پر بیٹھے ہیں، پچھلے ہفتے یہیں پر ایوب خاور صاحب بیٹھے تھے۔ ادب پر بات چل رہی تھی کہ میں

سے ان سے آپ کا ذکر کیا۔ وہ بہت تپاک سے بتانے لگے کہ انہوں نے ''فنون'' میں آپ کے افسانے پڑھ رکھے ہیں۔''

یہ سن کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ چونکہ میری نظر میں اردو ادب کے مستند ادیبوں اور شاعروں کی جانب سے نو واردگانِ ادب سے آگاہی تو کجا ان کی تحریروں کو پڑھ رکھنا ایک مختلف بات تھی۔ ایسے میں یہ انکشاف میرے لیے مسرت لے کر آیا۔

خیر بات آئی گئی ہو گئی۔

کئی برس اُدھر کی بات ہے۔

ایک روز شکیل بھائی (شکیل عادل زادہ) کو میں نے اپنے ہاں کراچی میں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اب تک ان سے تعلق، شناسائی اور گرمجوشی سے ہوتا ہوا قلبی بندھن میں ڈھل چکا تھا۔ کھانے کے دوران گفتگو موجودہ شاعری کی جانب رخ کر گئی۔ انہوں نے ایوب خاور کی شاعری کا خاص تذکرہ کیا۔ جب میں نے ان سے ایوب خاور سے تعلق کا پوچھا تو وہ مسکرا پڑے اور پُر معانی خاموشی اختیار کر لی۔

چند روز بعد ہماری ایک اور ملاقات طے ہوئی تو شکیل بھائی کہنے لگے ''عرفان بھائی! کیوں نہ آپ کی ایوب خاور صاحب سے ملاقات کروائی جائے۔ شاعر تو بہت اچھے ہیں ہی، انسان بھی کمال کے ہیں۔''

اُس شام شکیل بھائی کے ہمراہ ایک اور صاحب تھے۔ دیسی حلیے میں وہ صاحب کوئی پروفیسر دِکھتے تھے۔ پختہ سی رنگت، گھنگھریالے بال اور کھوئی کھوئی نظریں۔ میں نے سوچا کہ شاید ایوب صاحب کہیں مصروف ہو گئے ہوں گے۔ ایوب صاحب کا سراپا میرے تصور میں ایک نفیس سنہرا چشمہ لگائے کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں اور ملائم نسوانی ہاتھوں والے شخص کا تھا۔

خیر اب تو کوئی اور صاحب آ گئے تھے۔ ان صاحب نے گاڑی میں سے پھولوں کا ایک گلدستہ نکالا اور شکیل بھائی کے ساتھ چلتے ہوئے مجھ تک آئے اور گلدستہ میرے حوالے کرتے ہوئے بغلگیر ہو گئے۔

''مجھے پھول بہت پسند ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی پسند کرتے ہوں گے۔ ایوب خاور کہتے ہیں مجھے۔''

وہ شخص مجھے پہلی ہی ملاقات میں بہت اپنا اپنا سا لگا۔ کھری بات، بے نوک انداز میں کرنے والا ایوب خاور اور میں پہلی ہی ملاقات میں یوں گھل مل گئے کہ گویا بہت پرانا ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

باتیں ان کی شاعری سے ہوتی ہوئی ایک ایسے موضوع پر جا ٹھہریں جو ہم دونوں کے لیے مشترکہ جذباتی اہمیت کا تھا۔ وہ موضوع تھا ''احمد ندیم قاسمی''۔ اس پر بات کرتے کرتے ایوب خاور کی آواز بھرا گئی۔ قاسمی صاحب کو ابھی فوت ہوئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایوب خاور نے بھرائی آواز میں کہا ''میرا باپ مر گیا۔'' اس پر میں بھی خاموش ہو گیا۔ کمرے میں پُرسوگ خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے توقف کے بعد شکیل بھائی نے اس گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا ''واہ کیا وضع دار آدمی تھے۔''

ایوب خاور نے اجازت لے کر غسل خانے کا رخ کیا۔ کچھ دیر بعد غسل خانے سے لوٹے تو ان کی سرخ ہوتی آنکھیں ابھی تک نم تھیں۔ وہ قمیص کی آستینوں سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے ہمارے ساتھ آن بیٹھے۔

اس پہلی ہی ملاقات میں، میں ایوب خاور سے ڈر بھی گیا۔ جذبات سے دہکتا ہوا، گویا آتش فشاں۔ اتنا بے باک کہ سچ منہ پر اس طرح سے بے دھڑک بول دے کہ ششدر کر دے۔ جب بھی میری کوئی تحریر پسند نہیں آئی، بے دھڑک اظہار کر دیا۔ ہماری دوستی کے ابتدائی دنوں میں شکیل بھائی نے اپنی تمام تر وضع داری اور مروت کے ساتھ اس تعلق کو مضبوط بنانے میں خاموشی سے بہت شفیقانہ کردار ادا کیا۔ ایوب خاور کا ایک تکیہ کلام ہے۔ ''ہے نا۔'' شاید وہ خود بھی اس سے ناواقف ہیں۔ کسی بات پر

معصومانہ بے تکلفی سے سوال کرتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں'' ہے نا؟''

ان کی ایک اور بہت ہی پیاری ادا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں تالی کی صورت مخاطب کے ہاتھوں کو محبت سے تھام کر دباتے ہیں اور یوں اپنی گرم جوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

پچھلی آدھ دہائی میں ہماری درجنوں ملاقاتیں رہیں جن میں سے بیشتر میں شکیل بھائی بھی شامل ہوتے تھے۔ ایک چیز جو میں نے ایوب جی میں خاص دیکھی وہ یہ کہ دہائیوں کی ٹریننگ نے ان کو ایسا بنادیا ہے کہ وہ جب بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے گویا الفاظ اور جملے ڈھلے ڈھلائے کسی مشین میں سے نکل رہے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے برس ہا برس اداکاروں کی زبان، لہجے اور تلفظ کی درستی کی ہے اور ان کی راہنمائی کی ہے۔ پہلی ملاقات میں کوئی اجنبی شاید یہ گمان کرے کہ ایوب صاحب جملے بنا بنا کر بول رہے ہیں کہ ان میں بے ساختگی کا عنصر نمایاں نہیں ہو پاتا۔ ہر جملہ نپا تلا اور جانچ پڑتال کے بعد ادا ہوتا ہے۔ گویا ایک تکلف در آتا ہے لیکن ان کے پرانے شناسا جانتے ہیں کہ برسوں کی ریڈیو کی ٹریننگ نے ان کو الفاظ کی درست ادائیگی اور لب و لہجے کے زیر و بم کو ملحوظِ نظر رکھنے کا اس حد تک عادی بنا دیا ہے کہ یہ لب ولہجہ ان کی عام بول چال کا حصہ بن گیا ہے۔

ایک امر مجھے حیران کرتا رہا ہے کہ ایوب جی جتنے بھی جذباتی ہو جائیں آواز میں ایک ٹھہراؤ اور تسلسل برقرار رہتا ہے۔ کسی ماحول میں برانگیختگی کے دوران بھی میں نے ان کے لہجے کو ایک مخصوص توازن کا حامل پایا ہے۔

ایوب خاور میرا بہت عزیز اور حساس دوست ہے۔ ایسے لوگ کوئی نہ کوئی جسمانی عارضہ پال لیتے ہیں۔ سو اسے بھی شوگر لاحق ہو چکی ہے۔ ایک روز میرے ہاں میرا یہ دوست آیا تو عمدہ آموں کا ایک بڑا لفافہ تھام رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا ''فریج میں رکھوا دیجیے۔ آپ کی میٹھی کمپنی میں، میں نے سوچا کہ اس سے عمدہ کوئی اور موسمی پھل نہیں ہو سکتا ہے۔ ہے نا؟'' جب میں نے اس کی شوگر کی طرف اشارہ کیا تو شرارت سے مسکرایا اور بولا کہ کبھی کبھار پرہیز سے دامن چھڑا لینا چاہیے۔

ایوب صاحب کو میں نے اپنے کام میں اس حد تک استغراق میں دیکھا ہے کہ ایسے میں وہ گرد و پیش سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ عام واقف کار شاید اسے سرد مہری پر محمول کرے لیکن ان کے مزاج شناس چونکہ اس کے اندر کے سچے فنکار کو جانتے ہیں، اس لیے اس عالم جنون میں دخل در معقولات سے گریز کرتے ہی۔

سنا ہے کہ ایوب خاور کام میں اس حد تک عمدگی کے قائل ہیں کہ خلاف توقع کام پر اداکاروں کو شوٹنگ کے دوران ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔ بلکہ سنا ہے کہ چند بار کچھ نو وارد حسین اداکاراؤں کو اتنا ڈانٹ دیا کہ وہ روہانسی ہو گئیں۔ میں نے اور شکیل بھائی نے سمجھایا کہ حسن کا تقاضا ہے کہ اسے رعایت دی جائے۔ عجیب دوست ہے ہمارا کہ یہ بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھے فن کا تقاضا ہے کہ فنکار اپنی ذات کو اس میں سے نفی کر دے۔

میں ایک بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ نے ایوب خاور کو کہیں دیر تک بٹھانا ہو تو اس کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ کوئی پیچیدہ شعری یا ادبی مسئلہ چھیڑ دیجیے اور گھنٹوں کو منٹوں میں کھسکتے دیکھیے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ کراچی میں میرے ہاں شکیل بھائی اور ایوب جی اکٹھے تھے۔ ابھی کھانے کا انتظام ہو رہا تھا کہ ناگہاں بجلی چلی گئی۔ میں نے معلوم کیا تو پتا پڑا کہ دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اب مہمان آپ کے گھر ہوں، بجلی چلی جائے اور کوئی متبادل انتظام نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ خیر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں دونوں دوستوں کے ہمراہ ٹیرس پر آ گیا۔ کراچی میں رات کو سمندر کے قریبی علاقوں میں تازہ ہوا بجتی رہتی ہے۔ سو اس رات چند ایک درخت اور بیلیں لہلہا رہے تھے۔ ایسے میں میں نے

ایک شعر پڑھا۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

پھر ایوب جی سے سوال کیا کہ یہاں ''غیرت ناہید'' کی ترکیب سے کیا مراد ہے۔ وہ اور شکیل بھائی سوچ میں چلے گئے۔ پھر خوب بحث چھڑی۔ کئی فون موبائل پر ملائے گئے۔ بجلی آ بھی گئی۔ میں کھانے کے لیے درخواست کرتا رہا لیکن اب جب تک یہ گرہ نہ کھلتی، کھانا شروع نہ ہو سکتا تھا۔ قصہ مختصر کھانے کا آغاز اس شعر کے پڑھے جانے کے کوئی تین گھنٹے بعد ہی ہو سکا۔
ہماری دوستی کے دوران بے شمار ملاقاتیں کراچی میں میرے اپنے گھر، اسلام آباد کے ہوٹلوں اور لاہور کے مختلف مقامات پر ہوئیں۔ شاعری کے لاتعداد ادوار ہوئے۔ ایوب جی کی شاعری کے اندر کا سیلِ رواں جاری ہے۔ ایمجری اور تشبیہات کی رنگین آبشار آپ کے مسامِ جاں کو شرابور کر رہی ہے۔ نقرئی فوارے سے چاندی کی پھوار جاری ہے۔ ادھر آپ نے کوئی اپنا ذاتی مسئلہ بیان کیا، اُدھر شاعری کی رواں ندی خشک ہو گئی اور ایوب جی آپ کے مسئلے کو اپنا مسئلہ جان کر پوری ہمدردی سے آپ کی پریشانی میں شریک ہو گئے۔ پھر جب تک کوئی حل سامنے نہ آیا، ان کی پرخلوص اور تشویش آمیز توجہ آپ کی جانب مرکوز رہے گی۔ جب وہ چلے بھی گئے تو آپ کے مسئلے کو ساتھ لے گئے اور فون کر کے پیش رفت سے آگاہ کر رہے ہیں تاوقتیکہ کوئی حل سامنے نہ آ جائے۔ کسی دوست کی پریشانی کا کمبل اوڑھ کر وہ تب تک تپتی دھوپ میں چلتے رہیں گے جب تک کوئی منزل نہ آ جائے۔

ایک راز کی بات ہے۔ میرے دوست ایوب خاور داخلی طور پر بہت حد تک مذہبی آدمی ہیں۔ جادو ٹونے پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یقین رکھنا بھی چاہیے۔ آخر کو اتنی دنیا کو اپنے فن کے سحر میں گرفتار کر رکھا ہے۔ گوکہ شاعری کو بہت عزیز جانتے ہیں مگر ٹی وی کے حوالے سے زیادہ معروف ہیں۔ پاکستان کی مڈل کلاس معاشرتی زندگی کی عکاسی ''خواجہ اینڈ سن'' سے بہتر بھلا اور کیا کہیں ہو گی جو آج بھی عطاء الحق قاسمی اور ایوب خاور کے حوالے سے معروف ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ ایوب خاور ایک رائٹر، ڈائریکٹر کی حیثیت سے آرٹ اور کمرشل ازم کو انتہائی خوبصورت اور قابل قبول سطح پر یکجا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ تبھی تو ہر خاص و عام ان کو پسند کرتا ہے۔ دن، حصار، فشار، خواجہ اینڈ سن، نشیب، دلدل، غریب شہر، کانچ کے پر، انکار، یہ بھی کسی کی بیٹی ہے، قاسمی کہانی، گل زار کلاسکس، پاتال، کہانی گھر، یہ وہ سیریل اور سیریز ہیں جنھوں نے ایوب خاور کو ٹیلی ویژن کے اول درجے کے ہدایتکاروں میں شامل کر دیا ہے۔

اگر ان کی شاعری کی تعریف کی جائے تو شرما جاتے ہیں۔ گوکہ آنکھوں میں ایک چمک دوڑ جاتی ہے اور ٹی وی ڈرامے کی توصیف پر موضوع بدل دیتے ہیں۔ جس سے عشق کرتے ہیں تو انتہا کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی سے محبت کی تو ٹی وی ڈراموں کا سلسلہ ان کے افسانوں کے حوالے سے ''قاسمی کہانی'' بنا ڈالا۔

گلزار سے محبت نے جوش مارا تو ''گلزار کلاسکس'' کے نام سے ان کے افسانوں پر ڈراموں کا ایک سلسلہ بنا ڈالا۔ گلزار کہانیاں اتنے عمدہ طریقے سے فلمائی گئیں کہ کئی ڈرامے تو بھارتی آرٹ فلموں کے مقابل ٹھہرتے ہیں۔ کمرشل ازم مزاج کو زیادہ نہ بھایا، اس لیے لکیر کے فقیر نہ بنے اور بند کمروں میں ایلیٹ کلاس کے کلچر پر مقامی ثقافت کو ترجیح دی۔ اردو افسانوی ادب کو ٹی وی اسکرین پر متعارف کروانے میں ایوب خاور نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

اداکاروں سے ایسا کام کرایا کہ زمانہ عش عش کر اٹھا۔ قصباتی ثقافتی اور شہری زندگی کی ایسی عمدہ عکاسی کی کہ یہ ڈرامے

ناظرین کے حافظوں پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئے۔ حقیقی زندگی تو یہی ہے جو ان کے ڈراموں میں نظر آتی ہے۔ کہنے کو تو گریفیٹی آرٹ بھی آرٹ کی ایک قسم ہے مگر یہ استاد اللہ بخش کے فن پاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کمرشل ازم جتنی بھی دوڑ بھاگ کر لے، اسے واپس حقیقت کی جانب لوٹنا ہی پڑے گا۔

ایوب خاور انسان کی ازلی پریشانیوں اور دکھوں پر پیچ و تاب کھاتا ہی رہے گا، بھلے یہ غم بڑھتے رہیں۔ انسان کی بے بسی پر کڑھنا اس کی فطرت میں ہے۔ وہ خارج کے عناصر کا بھرپور جائزہ لے کر انہیں داخل میں جذب کرتا رہے گا اور شاعری کی شکل میں یہ پھول پتیاں بناتا اور ڈراموں کی صورت میں یہ مجسمے تراشتا رہے گا۔ فردا کا سورج جب ہمیں اس دھرتی پر نہ پائے گا تب بھی اس کی گلکاریاں اور مجسمے فن کی بساط کے کھلاڑی بن کر زندہ رہیں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ جب وہ خاموش ہو جائے تو اس کے تراشے ہوئے صنم بولنا شروع کر دیں۔

(۳)

ایوب خاور کی ابتدائی شاعری کی تشکیل میں جن عناصر ترکیبی کا نمایاں رنگ نظر آتا ہے ان میں یاسیت کا زرد رنگ نمایاں تر ہے۔ وہ اپنے شعری مجموعے "گلِ موسمِ خزاں" کے دیباچے ہی سے اس زرد رنگ کے تذکرے کا آغاز کرتا ہے۔

"میں ضلع چکوال کے ایک نواحی گاؤں میں گرمیوں کی ایک زرد سہ پہر کو پیدا ہوا۔"

یہ زرد رنگ تو اس کے مجموعے کے عنوان میں بھی جھلکتا ہے۔ رنگین بہاریں جہاں عمومی زندگی میں خوشی کا عنوان ٹھہرتی ہیں وہیں بہار کا موسم گریباں کے چاک ہونے کا موسم بھی ہے۔ اسی طرح گلابی جاڑوں کی اصطلاح بھی ادب میں عام ہے۔ خزاں کا موسم جہاں زرد رنگ سے رنگا ہوتا ہے، وہیں یہ زرد رنگ ایوب خاور کے پہلے شعری مجموعے کے عنوان سے سفر کرتا ہوا اس کی شاعری میں اس خاموشی سے وارد کرتا ہے جیسے کسی ہیجان خیز شب کی وارفتگی ایک دوشیزہ کو جب امید کے مراحل میں اتارتی ہے تو اس کے چہرے پر صبح کی دیوی اپنا زرد رنگ کھنڈ دیتی ہے۔ اس کا شعر ہے۔

ہجر کی شام، اکیلی رات کے خالی در
صبح فراق کا زرد اُجالا تیرے نام

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم "میری نظم اور میرے درمیان ایک اور نظم" کا آغاز کچھ یوں کرتا ہے۔

ـ ایک صبح زرد کی بے ترتیبی/ کچی نیند سے اٹھ جانے اور خواب کٹورے سورج کی/ دہلیز پہ رکھ کر لوٹ آنے کی سوچ میں دن چڑھ آتا ہے

جہاں کارخانۂ حیات کے گئے موسموں پر وقت کی زرد دھول ایک چادر بچھا دیتی ہے، وہیں پر ایوب خاور کے ہاں شب و روز کے زرد دائرے شعور کی زریں تاریکی میں ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے داخل کی تنہائی، خارج میں سناٹے کی شکل میں مجسم ہوتی ہے اور حیران کن طور پر یہ تنہائی بھی زرد قبا زیب تن کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی نظم "یہاں اک نظم رکھی تھی" کا انجام کچھ یوں کرتا ہے۔

ـ در و دیوارِ جاں سے لگ کے بیٹھی زرد تنہائی سے پوچھوں گا، کہیں تم نے دیکھی ہو، یہاں اک نظم رکھی تھی!

کچھ عجب نہیں کہ مصر اور برما میں زرد رنگ آج بھی باقاعدہ طور پر سوگ کی علامت ہے۔ پھر زردی تو تنبیہ کی علامت کے طور پر ہر چوراہے پر استعمال ہوتی آ رہی ہے۔ زرد صحافت کی اصطلاح بھی تو خوشگوار معانی نہیں رکھتی۔ ایام رفتہ کے ڈراموں میں کسی کردار کو مردہ ظاہر کرنے کے لیے زرد لباس اوڑھایا جاتا تھا۔

نہ جانے یہ زرد رنگ کس طرح انسان کے تحت الشعور میں یاسیت اور اداسی کی علامت کے طور پر ورود کر گیا کہ گرمیوں کی زرد دوپہریں ہوں یا سردیوں کا زرد چاند، اس کے پیرایۂ اظہار کے افق پر اُمڈ آتا ہے۔ شاید موثر شاعری کسی شعوری کاوش سے زیادہ لاشعور کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ یہ کثیر الجہتی ہونے کے ساتھ ساتھ تحت الشعور کے ارتعاشی عمل کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، اسی لیے یہ جذباتی سطح پر اثر رکھتی ہے۔ یہ ستر سے نوے کی دہائی تک کا بیس برس کا عرصہ تھا جس میں وہ پروڈیوسر اور ڈراما نگار کی حیثیت سے مصروف تو ضرور رہا مگر اس کے اندر شاعری سولہ سنگھار کر کے اپنا روپ نکھارتی رہی۔ جب اس کی چھب آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ہوئی تو وہ زرد پیرہن پہنا دیا جسے "گلِ موسمِ خزاں" کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور رقصاں ہوئی۔ زرد قبا کے ساتھ فیروزے، ہیرے، موتی کے زیور نے کچھ ایسا سماں باندھا کہ تماش بین بھی رقصاں ہوئے۔ بیس برس کا عرصہ تو دوشیزگی کے عروج کا عرصہ ہے۔ نو ساختہ شراب کو پُر اثر شراب میں تبدیل کر دینے کی مدت ہے۔ ایوب کی شاعری بھی دو آتشہ ہے۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں کہتا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ شاعری میری پہلی محبت ہے لیکن میں اس سے محبوبوں جیسا نہیں بلکہ محبوباؤں جیسا سلوک کرتا ہوں۔ شاعری کو میں نے اس وقت تک گلے نہیں لگایا جب تک اس نے ضدی بچے کی طرح نوچ نوچ کر اور مجھ سے لپٹ لپٹ کر مجھے اپنا جیسا نہ کر ڈالا۔"

"گلِ موسمِ خزاں" میں غزلوں کے علاوہ "ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں"، "یہاں اک نظم رکھی تھی"، "پردے کے پیچھے کون ہے"، "ابھی موسم نہیں آیا"، "کچی نیند کی دہشت"، "ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے"، "زندگی اور موت کے درمیان ایک نظم"، "گھروں میں ایک گھر ایسا بھی تھا" اور "ڈانسنگ فلور" کے ایسی نظمیں ہیں جو اس کے شدتِ اظہار کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

بعض اوقات ایک شاعر استغراقی کیفیت میں کسی ایسی آفاقی سچائی کو شعر کر دیتا ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر ہر قسم کے حالات پر منطبق ہو جاتی ہے۔

مارشل لاء کے خلاف لکھی گئی ایوب خاور کی نظم "پردے کے پیچھے کون ہے" کے آخری مصرعے:

"میرے مولا! / بس ..... / بس اک بارش ..... ترے بھیجے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں سے / میں اپنی دلدلی آنکھوں کو دھونا چاہتا ہوں / میں اپنے عہد کی تاریخ پر جی بھر کے رونا چاہتا ہوں"

کسی ایک دور کی کہانی بیان نہیں کرتے بلکہ وطن کی تاریخ کے ہر عہد پر منطبق ہوتے ہیں۔ یہ گریہ صرف ایک شاعر کا گریہ نہیں، یہ صرف ایک تخلیق کار کے آنسو نہیں، یہ اس مٹی سے اُگنے والے ہر آدمی کا نالہ ہے۔ پھر اس کی نظم "ابھی موسم نہیں آیا" جو خاکی استبداد کے خلاف شاعرانہ احتجاج تھی، کے آخری مصرعے:

"لیکن اے کارِ جنوں! / کارِ نمو آغاز ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے"

کیا دورِ حاضر کی آواز نہیں؟ یہ مصرعے تو پھر امید کے راہنما ستاروں سے روشنی پاتے ہیں۔ امن کا سفید بگلا تو آج بھی حال کے گدلے پانیوں میں امید کی خوراک تلاش کر رہا ہے۔

"حسب نسب خاک ہو رہے ہیں" برف میں دھنسے ہوئے ایک ایسے منظر نامے کا نعتیہ بیان ہے جس میں گریِ اظہار عروج پر ہے۔ ایوب رحمت اللعالمین ﷺ کے حضور گڑگڑاتے ہوئے کہہ رہا ہے:

وہی تماشائے آب و گِل ہے / وہی شب و روز کے تسلسل کا جبر ہے، آنکھ منظروں سے / پناہ مانگے جو عرصۂ انجماد میں ہے وہ دل بھی اب دخترکنوں کے مانند کوئی سچا گواہ مانگے / حبیب رب عظیم! میرے گلاب موسم کی برف باری نے ڈس لیے ہیں / نگاہ حدِ نگاہ تک اک ٹھٹھرتے سیال دائرے

سے الجھ رہی ہے/مری سماعت کے گہرے پاتال میں/صداؤں کا قحط اپنے عروج پر ہے/ان میرے ہاتھوں میں کوئی حرف دعا/نہ ہونٹوں میں تھرتھراہٹ/زبان صحرائے جاں میں پیاسے ببول کی طرح ایک/پیوند حلق ہے اور مرے سیاق وسباق کے سلسلوں کی/جانب انا کی دیمک قدم قدم بڑھ رہی ہے، سارے/حسب نسب خاک ہو رہے ہیں/یہ کیسا منظر ہے، میرے اندر یہ کون سی رزم گاہ کے/در کھلے ہیں/ہوا میں زہریلی سوئیاں ناچنے لگی ہیں/اندھیرا پلکوں پر اپنے لشکر اُتارتا ہے، صدائیں الفاظ کے اکھڑتے ہوئے وجودوں سے زخم کھا کر بکھرتی جاتی ہیں/وقت پرواز کر رہا ہے/یہ کیسا منظر ہے راستے کی نشانیاں برف میں چھپی ہیں/مگر مرے ان نڈھال کوؤں میں آگ کے/پھول کھل رہے ہیں

''گل موسم خزاں'' کی شاعری بہت گمبھیر ہے لیکن اس کتاب میں ایوب خاور کی محبت بھی اس کی روح کے پاتال میں سنہرے پانی کے ایک چشمے کی طرح سرسراتی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سینے کی محرابوں سے لپٹے کچھ مناظر ایسے ہیں جیسے کوئی آ کے ان کے ہاتھ پاؤں کھول کر آزاد کر دے گا۔ مگر ایوب خاور کو تو ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ اختر حسین جعفری اس کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ ایک ایسا خواب آمیز عالم بیداری ہے جہاں انسان اپنا وجود ہو یا پھر اپنی کوئی تازہ لکھی ہوئی نظم، خود اپنے سوادِ حیات میں رکھ کر بھول جاتا ہے۔ یہ احساس خود فراموشی یا برون وجود میں زندگی کو یاد رکھنے کا سلسلہ ایوب خاور کے پاس طلارمے کی تقلید میں اردو نظم لکھنے والے ان شعراُ سے یکسر مختلف ہے جن کی علامتیں محض ذاتی اور اردو شاعری کی مستند روایت سے منقطع ہونے کے ناطے ایک طرح کے احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتی ہیں۔''

جہاں اس کے ہاں سیاسی شعور ابتدائی شاعری میں نمایاں تھا، وہیں اب ''اے مری صبح ازل اے صبح رخشندہ'' اور ''سمفنی ۲۰۱۰ء'' میں نمایاں تر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ محبت کی خوشبو میں گندھی ہوئی کیفیت کے دلگداز منظروں کی داستان بھی ہے۔ کچھ غزلوں کے اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

- سپرد خاک کیا پہلے ہر تمنا کو
  پھر اس کے بعد بچھا دی ہے ان پہ چادر خواب
- لیلیٰ ہجر تری گرد کفِ پا کی طرح
  سینۂ خاک پہ اک خاک بسر ہے کہ جو تھا
- یہ جو خیمہ گاہ جمال خواب ہے آئینہ
  کفِ خاک میں ہو تو پھر سراب ہے آئینہ
- فریبِ جرس یہ سفر ہے ہجر و وصال کا
  ذرا دیکھنا کہ تہ رکاب ہے آئینہ
- زرد رُو ہو گئے ہیں، آخر
  کشتگان بہار ہیں ہم
- ضبط کرنا نہ کبھی ضبط میں وحشت کرنا
  اتنا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا
- جمع کرنا تہہ مژگاں تجھے قطرہ قطرہ
  رات بھر پھر تجھے ٹکڑوں میں روایت کرنا
- فروغ موسم گل پیش تھا سو میں نے بھی
  خزاں کے زخم کو دشتِ بہار میں رکھا
- یہ کس نے مثل مہ و مہر اپنی اپنی جگہ
  وصال و ہجر کو ان کے مدار میں رکھا

گلزار نے ایوب کے دوسرے شعری مجموعے ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' میں کیا خوب کہا:

''مجھے ایوب خاور کے مصرعوں کی چال بہت خوبصورت لگتی ہے۔ لمبے لمبے مصرعے بڑے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھتے ہیں۔ ہر بار لگتا ہے مصرعہ کتھک کی چال چل رہا ہے۔''

چھوٹے چھوٹے قدم تو کنواری بھی لیتی ہے۔ بچے تلے معصوم نا تجربہ کار قدم کہ اس میں وہ تجربے کا اعتماد نہیں ہوتا جو

ایک لمبے ڈگ بھرنے والی بیابانا میں ہوتا ہے۔ ایوب کے ہاں تو یہ خوبی ہے کہ اس کے نپے تلے قدم چلنے والی شاعری میں ایک بیاہتا کا سا اعتماد بھی ہے اور تجربہ بھی۔ اس کی ٹکسال سے جو بھی سکہ نکلتا ہے، خوب نکلتا ہے۔ وہ ایسا استاد ہے کہ مصرعوں کو حالت رقص میں لاتے لاتے خود رقصاں ہو جاتا ہے۔ وہ قونیہ کے موروں کی طرح تصویر ہو جاتا ہے۔ نظم کہتے کہتے خود نظم ہو جاتا ہے۔ مست کرتے کرتے خود مست ہو جاتا ہے۔ خالق ہوتے ہوئے خود تخلیق ہو جاتا ہے اور نقطۂ کمال پر یقیناً خالق اور تخلیق ایک ہو جاتے ہیں۔ گو کہ اسے ابھی نقطۂ کمال تک پہنچنا باقی ہے۔ پر زندگی میں اور بھی تو بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ باقی زندگی بھی بحیرۂ عدم میں اُتر کر معدوم ہو جاتی ہے۔ باقی رہے بس نام میرے اللہ کا!

ایوب کی دوسری کتاب پر محبت ہر طرح سے چھائی ہوئی ہے۔ لگتا ہے ''گل موسم خزاں'' میں جو محبت اس کی روح کے پاتال میں نقرئی چشمے کی طرح سرسرا رہی تھی، وہ اُبل پڑی ہے۔ اس شعری مجموعے کی نظمیں ''نظم لکھتی ہے تجھے''، ''ہیلو''، ''اجازت''، ''Obsession''، ''التماس''، ''تنہائی''، ''تمہارے لیے ایک نظم''، ''تمہیں جانے کی جلدی تھی''، ''آئینہ خانہ''، ''محبت آب ودانے کی طرح سے ہے''، ''مجھے تم سے محبت ہے'' اور ''محبت تم نے کب کی تھی'' کے عنوان سے نظمیں اور ان کے ساتھ جڑی کئی غزلوں کو ایک مخصوص ترتیب سے پڑھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ایوب نے تراشیدم، پرستیدم، شکستم کے مصداق محبت کا ایک عہد گزارا ہے۔

؎ جو ہماری نگاہ میں تھا اب اُسی کا شکار ہیں ہم

نظم ''مجھے تم سے محبت ہے'' اور ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' اس محبت کی انتہائی کیفیتوں کی غماز ہیں:

مجھے تم سے محبت ہے کا آخری حصہ:

؎ ''چل اب ہتھیار پھینک/ اور اپنے لشکر سے بھی کہہ/ وہ اپنی زرہیں کھول دے/ میں اک ہارے ہوئے لشکر کی جانب سے ترے خیمے میں آیا ہوں/ غرور فتح سے چمکا ہوا ماتھا اٹھا/ میں اس بھرے دربار میں اپنی شکست فاش کو تسلیم کرتا ہوں''

یہ محبت ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' کے آخری حصے پر یوں اختتام پذیر ہوتی ہے:

؎ سیف کی چابی تو تم نے خود ہی گم کی تھی/ سو وہ تب سے کھلا ہے/ اور اس میں کچھ تمہاری چوڑیاں/ ایک آدھ انگوٹھی/ اور ان کے بیچ میں کچھ زرد لمحے/ اور ان لمحوں کی گرہوں میں بندھی کچھ لمس کی کرنیں/ نظر کے زاویے/ پوروں کی شمعیں/ اور سنہرے رنگ کی ٹوٹی ہوئی سانسیں ملیں گی/ اور وہ سب کچھ جو میرا اور تمہارا مشترک سا اک اثاثہ ہے/ سمٹ پائے تو لے جانا/ مجھے جانے کی جلدی ہے

دراصل ڈراما نگار اور ڈراما ڈائریکٹر ہونے کے باوصف، ایوب کی نظموں میں بیانیہ، اسکرین پلے، مکالمہ، سچویشن، کرداروں کی نفسیات اور ان سب چیزوں کا اجتماعی تاثر ایسے عناصر ہیں جو شعوری طور پر نہیں، غیر شعوری طور پر اس کے شعری سانچوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس کتاب میں خاص طور پر بقول امجد طفیل کے موت کا جمالیاتی سحر غالب ہے۔

ایک اضطراب ہے جو ایوب کی شاعری میں مسلسل پیچ کھاتا رہتا ہے۔ اضطراب کا خاتمہ اور اطمینان آمیز داخلی زندگی، تخلیقی عمل کو ماند کر دیتی ہے۔ اگر مادی کامیابی ہی مطمئن زندگی کی ضمانت ہوتی تو دولت وشہرت کی بلندیوں کو چھونے والے فنکار منشیات کا سہارا نہ لیتے۔ یہ تخلیقی اضطراب شہ پاروں کو جنم دیتا ہے۔ شاید اسی لیے برصغیر کے قد آور ادیب شکیل عادل زادہ نے کیا خوب لکھا ہے:

''وہ ایک مضطرب آدمی ہیں۔ ان کی شاعری سے ان کے ہیجان و اضطراب کا احساس کچھ سوا ہوتا ہے۔ لگتا ہے، کہیں کچھ رہ گیا اور کہیں کچھ کھو گیا ہے، جس کی وہ تلاش میں ہیں۔ مآل یہ تخلیق کاری، یہ مثال آفریں سخن طرازی و سخن پردازی، یہ دل نشیں، نشاط افزا، فکر نما، خیال پرداز شاعری

تو...... تو ٹھیک ہے، اس کے سوا کیا...... باقی سب ہیچ، بے مقدار، ناپائیدار...... باقی سب ہوس!''

۔ میں جس کی سزا بھگت رہا ہوں   وہ جرم ابھی کیا نہیں ہے

۔ اس قدر غم ہے کہ اظہار نہیں کر سکتے   یہ وہ دریا ہے جسے پار نہیں کر سکتے

ایوب کی شاعری اضطراب کے رنگوں سے ہی عبارت نہیں بلکہ اس میں کچی امبیوں کی کھٹی کنواری خوشبو اور سانولی سلونی کی بانہوں میں چھنکتی چوڑیوں کی جھنکار بھی ہے۔ پھر استعاروں کا دل نشین اظہار بھی ہے:

۔ وہاں تکیے کے نیچے/ کچھ سنہرے رنگ کی ٹوٹی ہوئی سانسیں/ کئی نوز ائیدہ خوشبو کے تازہ خواب/ بستر کی شکنوں میں گرے کچھ خوبرو لمحے/ ڈریسنگ روم میں ہینگر سے لٹکی ایک صدرنگی ہنسی کو/ بس اچانک ہی یس پردہ لٹکتا چھوڑ آئے ہو

ایوب کلاسیکی کلاکار نہیں جدیدیت کا پیامبر بھی ہے۔

۔ ٹوٹے تو بدن حکن میں تر تھے   بستر میں بھی فرش رقص پر تھے

میرے ابتدائی تعلیمی دور کی یادوں میں جہاں کبھی کبھار بہت سے بے تکلف دوست تحت الشعور کی رنگین دلدل سے نکل کر شعور کی دھرتی پر دھمک چلتے ہیں۔ وہیں پر اس کنوارے معصوم زمانے کا جادوئی ماحول، دیو قامت بزرگ، کھیل کے میدان، پہلی بار سونگھی گئی خوشبوئیں، ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابوں کے مکمل مضمون اوران کے متن بار بار بارلوٹ کے آتے ہیں اور راتوں کو اپنا طلسم جگاتے ہیں۔ ایک طلسم میں تو میں آج بھی ہوں، خوشی محمد ناظر کی نظم ''جوگی'' کا طلسم۔ قرونِ وسطی کے کاہن کیا خوب جانتے تھے کہ الفاظ کا منتر جادو اثر ہوتا ہے۔ اگر کوئی مادی شے سے ناواقف ہوتو اسے ''جوگی'' سنائی جائے اور بار بار سنائی جائے۔ اس کا ماحول، جوگی کا بیان، مناظر کی لفظی امیجری، نظم کا ردھم اور مصرعوں کا رقص، کسی بے ذوق پر بھی وجد طاری کر دے گا۔

بعد کے آنے والوں نے بھی منظر کی منی ایچر کبھی افسانہ کی، کبھی شعر کی اور کبھی فلم (کاش زبانِ یار، اردو میں فلم کا کوئی متبادل ہو کہ یہ جادو اثر صنف کئی طور پر یکتا ہے) میں تصویر کی۔

''مون سونی رقص کے کچھ مناظر'' میں ایوب خاور نے قدرت کی عکاسی کچھ ایسے موثر انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا:

۔ یہ رقص مون سونی تیز ہوتا ہے/ ذرا دیکھیں کہ بادل کس تلاطم سے کمک کے ساتھ/ مشکیزہ بکف نیچے اترتا اور تہائی پر تہائی/ مارتا ہے اور ہوا سم سے نکل کر ماتروں/ کی گنتیوں اور ایڑوں کی سپتکوں میں ایک/ ایسی چال سے لے دیکھتی ہے جس میں کھوا کر گرد مٹی، پانی پانی ہوتے جاتے ہیں

اس کا ''شکوہ'' ملاحظہ ہو:

۔ تمہارا ذاتی خدا تمہیں خود بتا گیا تھا/ کہ کچھ دنوں میں یہاں نہیں ہوں/ میں کچھ برس کے لیے کسی اور ہی زمانے میں جا رہا ہوں/ میں چھٹیوں پر ہوں

پھر ''جوابِ شکوہ'' پیش ہے:

۔ خدا اور اس کا یوں چھٹی پہ جانا!/ کس قدر یہ لغو اور کتنا یہ بیہودہ تصور ہے/ اور پھر ذاتی خدا!/ کس کا!/ جسے تو چاہتا ہے اور تجھے ملتا نہیں/ صرف اس کی خاطر/ تیری کم ہمت محبت نے، خدا کے چھٹیوں پر یوں چلے جانے کا یہ بودا تصور/ تیرے دل کے گوشت میں پیوست کر ڈالا

پہلی نظم جس کو میں نے ''شکوہ'' لکھا ہے دراصل اس کا عنوان ہے "In the absence of God" اور دوسری نظم جس کو میں نے ''جوابِ شکوہ'' لکھا ہے، اس کا عنوان ہے "In the Presence of God"۔

ایوب خاور کے اندر کا پر خلوص دوست اس کی شاعری کی سطح پر بھی یوں ابھر ابھر آتا ہے جیسے عکس ماہتاب سطح پر ابھر ابھر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی بہت سی نظمیں عزیز ہستیوں کے نام کی ہیں۔ خواہ یہ نظمیں طاہرہ نقوی، فیض صاحب، اختر حسین جعفری، نصرت فتح علی، دلدار پرویز بھٹی، احمد ندیم قاسمی، پروین شاکر، علامہ اقبال کے لیے ہوں یا وطن کے نام ہوں۔ وفا اس کا جوہر خاص ہے اور زمانہ موجود میں جنس نایاب ہے۔

ایوب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ اس کا ڈراما سیریل ''دن'' ناظرین میں بہت زیادہ مقبول ہوا تو ٹی وی پر اس کا اختتامی شو نشر ہوا جس کے میزبان دلدار پرویز بھٹی تھے۔ جب انہیں سٹیج پر بلایا گیا تو دلدار نے دوران گفتگو ایک سوال کیا کہ زندگی میں صرف ڈرامے ہی کرتے رہے یا کسی سے محبت بھی کی تو ایوب نے جواب دیا ''موت میری محبوبہ ہے دلدار۔'' ہلکے پھلکے سوالوں کا اس قدر سنجیدہ جواب سن کر دلدار نے سوال کیا ''موت کو محبوبہ بنانے سے کیا مراد ہے تمہاری؟'' تو ایوب نے جواب دیا:

''محبوبہ کی پہلی اور آخری خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہاتھ نہیں آتی۔ بار بار اپنی چھب دکھا کر ادھر اُدھر ہو جاتی ہے لیکن آخر کار رحم کھا کر وہ آپ کو اپنے گلے لگا لیتی ہے۔ اس کے بعد نہ وہ رہتی ہے نہ آپ۔''

اب ایسے ہنستے کھیلتے پروگرام میں ایوب صاحب ایسی بات کر گئے کہ ہال پر سناٹا چھا گیا۔

''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' کی غزلوں پر بھی محبت، ہجر، وصال غالب ہے لیکن ایوب کے اشعار بتاتے ہیں کہ اس کے تجربے کچھ اور طرح کے بھی ہیں:

؎ یوں سرِ شام تری یاد میں آنسو نکل آئے — جس طرح وادیٔ پُرخار میں آہو نکل آئے
ہاتھ میں ہاتھ لیے تیرے خدوخال کے ساتھ — جانے کب آئینۂ جاں سے لبِ جو نکل آئے
دل کو چوکھٹ سے لگا بیٹھا ہے تنہائی کا چاند — اور اچانک کسی جانب سے اگر تُو نکل آئے

؎ میں تیرے بغیر کچھ نہیں ہوں — تو پھر بھی میرا خدا نہیں ہے
دیوار سی اک کھنچی ہوئی ہے — اور اس کا کوئی سرا نہیں ہے
میں تیرے ضمیر میں ہوں زندہ — کیا تو مجھے جانتا نہیں ہے

ایوب خاور کا تیسرا شعری مجموعہ ہے ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' اور میرا خیال ہے یہ مجموعہ پہلے اور دوسرے سے بھی مختلف ہے۔ ''محبت کا ایک سال'' اور ''اترن پہنو گے'' توجہ کی متقاضی ہیں کہ ''عکس مہتاب'' سے لے کر ''اترن پہنو گے'' تک سب کچھ ایک تسلسل میں دکھائی دے گا اور پھر نظم ''کبھی'' اور نظم ''بہت کچھ کھو گیا ہے''، ''حاصل لا حاصل'' والے باب کو اور تہہ دار کر دیتی ہے۔ آخر میں ایوب خاور کی ۱۹۷۷ء میں لکھی ہوئی طویل نظم ''لاریب'' ہے جو انسانی تاریخ و تہذیب کا ایک پینورامک منظر نامہ ہے۔ وہ انسان جس کے بے لگام ارادے کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی کسی ناگہانی لمحے میں آخر ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ باقی رہنے والی خدا کی ذات سے مخاطب ہے۔ یہ نظم پوری انسانی تاریخ و تہذیب و تمدن کا منظر نامہ ہے۔ گلزار صاحب اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پانچ سال پہلے میں ایوب کو کم سمجھ پایا۔ پانچ سال بعد اور بھی کم سمجھ پاتا ہوں، اس لیے کہ وہ پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، بڑے ہو گئے ہیں، وہ بڑے شاعر ہیں۔''

''بہت کچھ کھو گیا ہے'' پڑھنے کے بعد فنکار اور ادب و شعر کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ضیا محی الدین صاحب نے کہا:

''ایوب خاور اب ہمارے عہد کے Major Poet ہو گئے ہیں۔''

اور پھر شکیل عادل زادہ نے کیا خوب لکھا ہے کہ:

''ایوب خاور شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔ کیسے کیسے مناظر کس کس زاویے سے انہوں نے مصور کیے ہیں۔ سارے کلام، سارے مجموعے میں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔''

آگے چل کر کہتے ہیں:

''ان کی جامع الصفاتی کا کیا احوال۔ ادیب، کہانی کار، ڈرامانگار، ہدایت کار اور شاعر۔ ڈراموں کی ہدایت میں انہوں نے ایک مرتبت حاصل کی ہے لیکن سب سے بڑا ہنر ان کی شاعری ہے۔''

اس کی تازہ تخلیق ''محبت کی کتاب'' ایک بصری ڈراما ہے جس کی کہانی تو بالکل سادہ سی محبت کی کہانی ہے لیکن اس کا بیانیہ، منظر نامہ، ڈائیلاگ اور ہدایات سبھی کچھ شعر کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ مرکزی کرداروں کے علاوہ آئینہ، شام، چاند، در و دیوار، فون، کتابیں اور ان کے تخلیق کار بھی ایک سطح پر اس کہانی کے کردار ہیں۔ محبت کی یہ سادہ سی کہانی ایک ویلنٹائن ڈے سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے ویلنٹائن ڈے کو اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایوب خاور نے مجھے بتایا کہ ''محبت کی اس کہانی کو نظم کرتے کرتے ان کے گزشتہ مجموعوں میں درج بارہ چودہ نظمیں آپ ہی آپ کہانی کی مختلف ڈرامائی سچویشنز میں اپنی جگہ بناتی چلی گئیں اور وہ نظمیں ان مقامات پر اس قدر مضبوطی سے جم گئیں کہ میں انہیں وہاں سے ہٹانے کا حوصلہ نہ کر سکا۔''

یہ مست ملنگ، میرا دوست ایوب خاور دھیمی آنچ پر سلگنے والا کبھی ہلکی پھلکی اور کبھی گہری شعری واردات بیان کرنے والا گنگناتا شاعر اور ہولے ہولے ناچنے والا خود مگن مور، اس امر سے بے پرواہ ہے کہ وہ جنگل میں تنہا ناچ رہا ہے یا مشتاقانِ فن کی دید کا مرکز ہے۔ بس اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کمالِ فن کی جانب گامزن جو ایک جستِ نامعلوم کی دوری پر ہے، اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

تھکن نے پاؤں میں کانٹے بچھا دیئے خاورؔ
مگر یہ دھوپ سفر بے تکان میں نے کیا

..........☆..........

''سمندر مضطرب ہیں''
(غزلیں)
انوار فیروز
زیرو پوائنٹ پبلی کیشنز۔ راولپنڈی

غیر مطبوعہ کلام

بذریعہ: سیّد معین ظفر بلّے

سید فخرالدین بلے

از عدم تا بہ عدم، وسعت و تحدیدِ وجود

میں کس لیے اور کس کی خاطر
ازل سے ہوں اپنی جستجو میں؟
ہزاروں صدیوں سے میری طرح
مرا تفکر، مرا تجسس
اسیرِ ابہامِ آگہی ہے
سروشِ جہلِ خرد سے مجھ کو
ابھی بس اتنا پتہ چلا ہے
کہ میرے بارے میں آج تک بھی
ہر اک تصور ہے دھندلا دھندلا
کوئی خبر معتبر نہیں ہے
کوئی نظر دیدہ ور نہیں ہے

نظر کی حد ہے سماء کی سرحد
جہاں نجوم و قمر ہیں رقصاں
جہاں ہیں بے انت کہکشائیں
اور ان کو گھیرے الکھ خلائیں
میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں
چاند تاروں کے ایسے صحرا
جہاں ہوا کا گزر نہیں ہے
کسی فرشتے کا پَر نہیں ہے

میں اس حقیقت سے باخبر ہوں
کہ اربوں نوری صدی پرے بھی
ہے میری سوچوں کی حکمرانی
مرے تصور کی دسترس ہے
میں دھیان اور گیان سے گزر کر
مقامِ حیرت پہ آ گیا ہوں

تماشا گاہِ وجود میری نگاہ میں ہے
زمینِ امکاں، سمائے اعیان زیرِ پا ہے

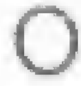
میں جانتا ہوں، وجود کیا ہے؟
چمکتا جگنو!
عدم کی تیرہ شبی میں کوندا!!
خلا کے حبسِ گراں میں تازہ ہوا کا جھونکا!!!
میں دیکھتا ہوں گزرتا امروز
دوش و فردا کے درمیاں ہے
ہر ایک فرد زماں کے صحرا میں
جانبِ دوش گامزن ہے
اور سفر میں
وجود وہ لمحۂ حضر ہے
جو دل کی دھڑکن کے
اور سانسوں کی آمد و شد کے درمیاں ہے

میں جانتا ہوں
کہ سرِ تخلیق و کارگاہِ وجود کیا ہے؟
شہود کیا ہے؟
میں کن فیکون کا راز داں ہوں
بدن کے زنداں میں قید رہ کر
میں دھڑکنیں دل کی سن رہا ہوں
عدم مسلسل وجود پا کر
عدم میں ڈھلنے کا منتظر ہے
عدم سے میں نے وجود پا کر
ابد کی جانب سفر کیا ہے
ابد بھی میری تلاش میں ہے

میں جانتا ہوں
ابد ازل ہی سے میری جانب رواں دواں ہے
مگر مری ذات ماورا ہے
ہر اک نگاہِ مکینِ امکاں ہے
گیان شکستی کی دسترس سے
میں اپنے بارے میں خود بھی تک
اسیرِ ابہامِ آگہی ہوں
ہنوز اپنی تلاش میں ہوں

(غیر مطبوعہ)

سید فخر الدین بلے



ایک ہی جیسے لگے سننے میں افسانے کئی
ہو بھی سکتا ہے کہ اس دنیا میں ہوں ہم سے کئی

چار آنکھیں چاہئیں اس کی حفاظت کے لیے
آنے جانے کے لیے جس گھر میں ہوں رستے کئی

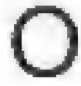
خود ارادی اور آزادی کی برکت دیکھیے
گھر کے آنگن میں نظر آتے ہیں اب چولہے کئی

دل نہ ہوں جب صاف تو مل بیٹھنے کا فائدہ
ہو چکے ہیں یوں تو ماضی میں بھی سمجھوتے کئی

بات قسمت کی نہیں دل تھا ہوس نا آشنا
ورنہ ہم کو بھی ملے تھے کام کے بندے کئی

بھیڑ میں ایسے گھرے کہ بڑھ گئیں تنہائیاں
ساتھ ہی لیکن ہوئے آباد ویرانے کئی

(غیر مطبوعہ)



ہے آب آب موج بپھرنے کے باوجود
دنیا سمٹ رہی ہے بکھرنے کے باوجود

راہِ فنا پہ لوگ سدا گامزن رہے
ہر ہر نفس پہ موت سے ڈرنے کے باوجود

اس بحرِ کائنات میں ہر کشتیِ انا
غرقاب ہو گئی ہے ابھرنے کے باوجود

شاید پڑی ہے رات بھی سارے چمن پہ اوس
روئے ہوئے ہیں پھول نکھرنے کے باوجود

میں اس مقام پر تو نہیں آ گیا کہیں
ہو گی نہ صبح رات گزرنے کے باوجود

الفاظ و صوت و رنگ و تصور کے روپ میں
زندہ ہیں لوگ آج بھی مرنے کے باوجود

(غیر مطبوعہ)

لفٹ میں جہنم کا سفر

مترجم: پیروز بخت قاضی

"The Lift That Went Down Into Hell."

Par Lagerkvist

(تعارف: پارلیگرک وِسٹ (Par Lagerk vist) کو بطور ناولسٹ، ڈراما نویس اور شاعر سویڈش ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ وہ ۱۸۹۱ء میں Vaxjo کے قصبہ میں پیدا ہوا۔ اُپسلا (Upsala) یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اس کی کئی نظمیں شائع ہوئیں اور ۱۹۱۲ء میں ایک ناول "People" کے عنوان سے چھپا۔ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد وہ فرانس چلا گیا جہاں اس نے Cubists سے اثر قبول کیا۔ Eternal Smile کے عنوان سے اس کے افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ یہ کہانی اسی کتاب سے لی گئی ہے۔ سویڈش شاعری میں اس کا مقام وہی ہے جو انگریزی شاعری میں T.S.Eliot کا ہے۔ اس کا ناول "Barabbas" نیکی اور بدی کے موضوع پر لکھا گیا۔ وہ خود کو Religious Atheist کہتا ہے۔ 1951ء میں اسے ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ "The Dwarf" اور "The Sybil" اس کے مشہور ناول ہیں۔ سویڈن میں اس کو اعلیٰ ڈراما نویس بھی مانا جاتا ہے۔)

☆☆☆

مسٹر سمتھ ایک دولت مند تاجر تھا۔ اس نے ہوٹل کی خوشنما لفٹ کا دروازہ کھولا اور پیار بھرے انداز سے ایک دبلی لیکن سمارٹ حسینہ کو اندر داخل کیا جس سے فر اور پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک گداز نشست پر دونوں جڑ کر بیٹھ گئے اور لفٹ نیچے کی طرف روانہ ہوگئی۔ مختصر سی حسینہ نے اپنے نیم وا ہونٹوں کو اس کی طرف بڑھایا جو شراب سے نم آلود تھے۔ دونوں نے بوسہ کیا۔ انہوں نے تاروں بھرے کھلے آسمان کے نیچے ٹیرس پر کھانا کھایا تھا اور اب ہوٹل سے باہر تفریح کے لیے جا رہے تھے۔

''ڈارلنگ وہاں اوپر کیسا شاندار سماں تھا۔'' وہ بولی۔ ''اس شاعرانہ انداز سے تمہارے ساتھ بیٹھنا، یوں لگتا تھا جیسے ہم خود بھی اوپر ستاروں میں سے ہوں۔ ایسا موقع ہوتا ہے جب آپ حقیقی معنوں میں جان پاتے ہیں کہ محبت کیا ہے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

مسٹر سمتھ نے جواب میں طویل بوسہ لیا۔ لفٹ نیچے جا رہی تھی۔

''تم نے اچھا کیا کہ آ گئیں۔'' وہ بولا۔ ''ورنہ میرا حال برا ہوتا۔''

''ہاں۔لیکن تم تصور کر سکتے ہو کہ وہ کتنا نا قابل برداشت تھا۔جونہی میں نے تیار ہونا شروع کیا، وہ پوچھنے لگا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ جہاں میں چاہوں گی، جاؤں گی، میں نے کہا۔ میں تمہاری قیدی نہیں ہوں۔تب وہ جان بوجھ کر سامنے بیٹھ گیا اور جتنی دیر میں تیار ہوتی رہی، وہ مجھے گھورتا رہا۔ میں نے لباس تبدیل کر کے، نیا اونی بیچ ڈریس پہن لیا...... کیا تمہیں اچھا لگ رہا تھا؟ تمہارے خیال میں کونسا رنگ میرے جسم پر سب سے زیادہ جچتا ہے؟ غالباً سرخ رنگ کا لباس؟''

''تمہارے جسم پر ہر لباس جچتا ہے۔'' آدمی بولا۔ ''لیکن میں نے تمہیں پہلے کبھی اتنا حسین نہیں دیکھا جتنا آج کی شام لگ رہی ہو۔''

اس نے تسکین آمیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا فرکوٹ کھول دیا۔ دونوں کے ہونٹ ایک طویل بوسے میں پیوست ہو گئے۔لفٹ اور نیچے چلی گئی۔

''لباس تبدیل کرنے کے بعد جب میں روانہ ہونے لگی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے دبایا کہ ابھی تک درد کر رہا ہے لیکن وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ وہ اتنا وحشی ہے کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔اچھا خدا حافظ، میں نے کہا لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ وہ اتنا نامعقول اور خوفناک ہے کہ میری برداشت سے باہر ہے۔''

''بیچاری پیاری گڑیا۔'' مسٹر سمتھ نے جواب دیا۔

''بھلا میں کچھ دیر کے لیے باہر نہیں جا سکتی اور خوش نہیں ہو سکتی؟ لیکن وہ اتنا شدید طور پر سنجیدہ ہے کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔وہ کسی بات کو سادہ اور قدرتی انداز میں نہیں لے سکتا۔ اس کے لیے ہر وقت معاملہ زندگی اور موت کا ہوتا ہے۔''

''بیچاری گڑیا۔تم کس کس مرحلہ سے گزری ہوگی۔''

''ہائے میں نے سخت دکھ اٹھائے ہیں، بڑا عذاب سہا ہے۔کسی اور نے اتنا عذاب نہیں جھیلا ہوگا۔جب تک میں تم سے نہیں ملی، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔''

''میری پیاری۔'' سمتھ نے اسے اپنی بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ لفٹ اور نیچے چلی گئی۔

اس کی بانہوں سے آزاد ہو کر اس نے لمبی سانس لی اور کہا ''ذرا تصور کرو، وہاں اوپر تمہارے ساتھ بیٹھ کر ستاروں کا نظارہ کرنا اور جاگتے میں خواب دیکھنا، میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔غور کرو واقعہ یہ ہے کہ آروڈ (Arvid) بہت مشکل شخص ہے۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتا ہے۔اس کے اندر شاعری کا ذرہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس میں اس کے لیے کوئی احساس بھی نہیں ہے۔''

''میری پیاری یہ تو نا قابل برداشت صورتحال ہے۔''

''ہاں بالکل نا قابل برداشت۔'' وہ ایک دل آویز انداز سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر بولی۔ ''ہم بھلا کیوں ہر وقت اس کے بارے میں سوچ کر وقت برباد کریں۔ ہم تو زندگی کا لطف لینے کے لیے باہر آئے ہیں۔تم سچ مچ مجھ سے پیار کرتے ہو۔''

''ہاں کرتا ہوں۔'' وہ اس کی کمر کو اپنی طرف جھکا کر بولا۔ لفٹ نیچے چلتی گئی وہ اوپر جھک کر اس کے جسم سے کھیلنے لگا۔ جذبات کی انگیخت سے اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

''آؤ آج کی رات ہم ایسا پیار کریں جو پہلے کبھی نہیں کیا۔'' وہ اس کے کان میں بولا۔

اس نے مستی میں آ کر سمتھ کو اپنے جسم کے ساتھ چمٹا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔لفٹ اور نیچے چلی گئی۔

لفٹ نیچے ہی نیچے جا رہی تھی۔

آخرکار سمتھ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا جبکہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اس لفٹ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟'' وہ پوچھنے لگا۔ ''یہ رکتی کیوں نہیں؟ کیا ہم ایک مدت سے اس کے اندر بیٹھے باتیں نہیں کر رہے؟''

''ہاں ڈارلنگ ہم دیر سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ وقت اتنی تیزی سے گزر رہا ہے۔''

''اوہ خدایا، ہم مدتوں سے، زمانوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کیا معاملہ ہے؟''

وہ گرل سے باہر جھانکنے لگا لیکن گہرے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا اور لفٹ ایک ہی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتی رہی...... نیچے اور نیچے۔

''اوہ خدایا، یہ کیا معاملہ ہے؟ ایسے لگتا ہے جیسے ہم نیچے گہرے گڑھے میں گرتے جا رہے ہوں اور یہ عمل خدا جانے کب تک جاری رہے گا؟''

انہوں نے نیچے گہرے گڑھے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور وہ دونوں اس کے اندر نیچے ہی نیچے غرق ہو رہے تھے۔

''یہ سب تو جہنم میں جانے والی بات ہے۔'' سمتھ نے کہا۔

''اوہ ڈیئر۔'' عورت نے اس کے بازو کے ساتھ چمٹتے ہوئے فریاد کی ''میں بہت نروس ہو رہی ہوں۔ تم ایمرجنسی بریک کیوں نہیں کھینچتے؟''

سمتھ نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بریک کھینچی۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لفٹ جھٹکوں کے ساتھ نیچے ہی نیچے گرتی گئی۔

''یہ خوفناک ہے۔'' وہ چلائی۔ ''آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''ہاں! ہم کیا کر سکتے ہیں۔ عجب معاملہ ہے۔'' سمتھ بولا۔

سمارٹ عورت مایوسی سے رونے لگی اور اس کے آنسو بہنے لگے۔

''ٹھہرو میری پیاری، ہمیں عقل سے کام لینا ہوگا۔ معاملہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ یہی بہتر ہوگا کہ ہم بیٹھ جائیں۔ ہم دونوں خاموشی سے یہاں بیٹھ جائیں گے...... ایک دوسرے کے قریب اور دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے۔ لفٹ کہیں پر تو جا کے رُکے گی۔''

وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

''تصور کرو کہ ہم تفریح کے لیے باہر جا رہے تھے۔'' عورت نے کہا۔

''ہاں یہی صورت ہے۔'' سمتھ نے جواب دیا۔

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ کیا نہیں کرتے؟''

''ڈارلنگ۔'' سمتھ نے اس کی کمر کے گرد حلقہ ڈال کر کہا۔ لفٹ نیچے اترتی گئی۔

آخرکار اچانک لفٹ رک گئی۔ ارد گرد اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ وہ جہنم میں آ گئے تھے۔ شیطان نے

آرام سے، آنرل کو ایک طرف ہٹا دیا۔

''گڈ ایوننگ۔'' شیطان جھکتے ہوئے بولا۔ اس نے سنا کش لباس پہن رکھا تھا اور اس کی دُم ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور یوں اوپر کی جانب اٹھی تھی جیسے کسی کھونٹی کے ساتھ لٹکی ہو۔

سمتھ اور عورت لڑکھڑاتے ہوئے باہر آئے۔ ان کے دماغ شل ہو چکے تھے۔ ''خدارا بتاؤ، ہم کہاں ہیں؟'' انہوں نے دریافت کیا۔ وہ غیر زمینی اور مافوق الفطری ہستی کو دیکھ کر خوفزدہ تھے۔ شیطان نے جو تاریک سائے کی مانند تھا، انہیں روشنی مہیا کر دی تھی۔

''یہ جہنم اتنی بری نہیں جتنی لگتی ہے۔'' وہ جلدی سے بولا ''مجھے امید ہے تم خوشگوار وقت گزارو گے۔ میرے خیال میں یہ صرف شب بھر کے لیے ہوگا۔''

''ہاں ہاں۔'' سمتھ نے تائید میں کہا۔ ''یہ صرف رات بھر کے لیے ہے۔ نہیں، ہم یہاں زیادہ عرصہ ٹھہرنا نہیں چاہتے۔''

عورت اس کے بازو کو مضبوطی سے پکڑے کانپ رہی تھی۔ روشنی بہت تیز اور پیلاہٹ ملی سبز رنگ کی تھی کہ وہ مشکل سے ہی دیکھ سکتے تھے اور وہاں گرم بُو پھیلی تھی۔ جب وہ اس ماحول کے کچھ عادی ہوئے تو ان پر منکشف ہوا کہ وہ ایک چوراہے پر کھڑے ہیں جس کے چاروں طرف مکان ہیں۔ جن کے دروازے گھپ اندھیرے میں چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ پردے گرے ہوئے تھے لیکن لگتا تھا کہ اندر کوئی شے جل رہی ہے۔

''تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو؟'' شیطان نے دریافت کیا۔

''ہاں، بے حد پیار کرتے ہیں۔'' عورت نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو اس کی طرف گھما کر جواب دیا۔

''تو پھر اس طرف چلیں۔'' اس نے انہیں اپنے پیچھے چلنے کو کہا۔

وہ چپکے سے ایک اندھیری گلی میں مڑ گئے۔ یہ گلی انہیں چوراہے سے باہر لے گئی۔ ایک گندے گریس کے دھبوں والے دروازے کے باہر ایک پرانی ٹوٹی ہوئی لالٹین لٹک رہی تھی۔

''یہ ہے آپ کی جگہ۔'' شیطان نے دروازہ کھول کر بتایا اور خود الٹے پاؤں غائب ہو گیا۔

وہ اندر داخل ہو گئے۔ جہاں ایک اور موٹی شیطان نے گلے مل کر ان کا سواگت کیا۔ اس شیطان کی بڑی بڑی چھاتیاں تھیں اور اس کے منہ کے گرد کاسنی رنگ کا پاؤڈر اس کی مونچھوں پر جما تھا۔ وہ گلے سے غراروں جیسی آوازیں نکالتے ہوئے مسکرائی۔ اس کی بٹنوں جیسی آنکھوں سے جان پہچان اور خوش طبعی نمایاں تھیں۔ اس کے ماتھے پر سینگوں کے گرد گندھے ہوئے بالوں سے نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے ریشمی ربن بندھے تھے۔

''اوہ یہ مسٹر سمتھ اور چھوٹی خاتون ہیں۔'' وہ بولی۔ ''آپ کے لیے کمرہ نمبر آٹھ ہے۔'' اور اس نے انہیں ایک بڑی چابی پکڑا دی۔

وہ چھوٹی چھوٹی اندھیری اور پھسلن والی سیڑھیاں چڑھے۔ سیڑھیاں چربی سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ دو منزلہ سیڑھیوں کے بعد سمتھ کو آٹھ نمبر کمرہ مل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ یہ خاصا بڑا کمرہ تھا جس میں بُو کی سڑاند پھیلی تھی۔ درمیان میں ایک میز پڑی تھی۔ جس پر گندا سا کپڑا بچھا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک بیڈ پڑا تھا جس پر چادر بچھی تھی۔ انہوں نے سوچا، یہ عمدہ رہے گا۔ انہوں نے اپنے اپنے کوٹ اتارے اور طویل بوسے لیے۔

ایک دوسرے دروازے سے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا جو ویٹر کے لباس میں تھا۔ اس کی ڈنر جیکٹ عمدہ سلی ہوئی

تھی اور اس کی شرٹ سامنے سے اتنی صاف تھی کہ اس نیم تاریک کمرے میں چمک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے چل رہا تھا اور اس کے پاؤں کوئی آواز نہ پیدا کرتے تھے۔ اس کی حرکات و سکنات مشینی اور غیر شعوری تھیں۔ اس کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔ اس کی آنکھیں جیسے آگے کی طرف ٹکٹکی باندھے تھیں۔ اس کی رنگت مُردوں جیسی پیلاہٹ لیے تھی۔ اس کی کنپٹی پر گولی کا زخم تھا۔ اس نے کمرہ درست کیا، ڈریسنگ ٹیبل کو صاف کیا۔ کمرے کے اندر چلمچی اور گندے پانی کا برتن رکھا۔

دونوں نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن جب وہ جانے لگا تو سمتھ نے کہا ''میرا خیال ہے ہمیں کچھ شراب چاہیے ہوگی۔ ہمارے لیے میڈیرا (Madeira) کا ادھا لا دو۔'' آدمی تعظیم میں جھکا اور غائب ہو گیا۔

سمتھ نے لباس اتارنا شروع کیا۔ عورت تھوڑا ہچکچا رہی تھی۔

''وہ واپس آنے والا ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسی جگہ پر تمہیں پروا نہیں کرنی چاہیے۔ بے شک اپنا لباس اتار دو۔'' وہ بھی بے لباس ہو گئی اور شرماتی ہوئی سمتھ کی گود میں بیٹھ گئی۔ یہ سب بہت دلکش لگ رہا تھا۔

وہ آہستہ سے بولی ''ذرا سوچو، تم اور میں ـــــ ہم دونوں ایسی رومانی جگہ پر اکیلے بیٹھے ہیں۔ اتنا شاعرانہ ماحول میں کبھی نہ بھول پاؤں گی۔''

''میری جان!'' وہ بولا اور دونوں نے طویل بوسہ لیا۔

وہ آدمی خاموشی سے پھر کمرے میں آ گیا...... بے آواز آہستہ سے اور میکانکی انداز میں۔ اس نے دونوں گلاس رکھے اور ان میں شراب انڈیلی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی جہاں کوئی خاص بات نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ چہرہ موت جیسا زرد تھا اور اس کی کنپٹی پر گولی کا زخم تھا۔

اچانک عورت چیخ مار کر کھڑی ہو گئی۔

''اوہ میرے خدا! آروڈ! یہ تم ہو؟ اے آسمانی خدا یہ مر چکا ہے! اس نے خود کو گولی مار لی۔''

آدمی ساکت کھڑا تھا اور اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے کوئی آثار نہ تھے۔ یہ محض سرد کھردرا اور بغیر کسی تاثر کے چہرہ تھا۔

''لیکن آروڈ یہ تم نے کیا کر لیا، کیا کر لیا! تم یہ کیسے کر سکتے تھے۔ میرے پیارے اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے تو تم جانتے ہو، میں گھر پر ہی رکی رہتی لیکن تم مجھے کبھی کچھ نہیں بتاتے۔ تم نے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ ایک لفظ نہیں بولے۔ جب تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں تو میں کیسے جان سکتی تھی۔ اوہ میرے خدایا......''

عورت کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ آدمی اس کی طرف ایک اجنبی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ برف کی طرح ٹھنڈی تھی اور ہر چیز میں سے گزرتی ہوئی سیدھی جا رہی تھی۔ زرد چہرہ چمک گیا تھا۔ زخم سے کوئی خون نہ خارج ہوا۔ وہاں صرف ایک سوراخ تھا۔

''اوہ! یہ خوفناک ہے۔'' وہ چلائی۔ ''میں یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ آؤ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔ میں یہ منظر برداشت نہیں کر سکتی۔'' اس نے جھپٹ کر اپنا لباس، ہیٹ اور فرکوٹ اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگی۔ سمتھ اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ سیڑھیاں اترتے وقت وہ پھسل گئے۔ وہ نیچے بیٹھ گئی اور اپنی کمر پر تھوک اور سگریٹ کی راکھ مل لی۔ سیڑھیوں کے نیچے مونچھوں والی

شیطان عورت کھڑی مسکرا رہی تھی اور سب کچھ جانتے ہوئے اپنے سینگ ہلا رہی تھی۔

باہر گلی میں پہنچ کر وہ قدرے پرسکون ہوئے۔ عورت نے اپنے کپڑے پہن لیے۔ خود کو سیدھا کیا اور اپنی ناک پر پاؤڈر لگایا۔ سمتھ نے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا اور ان آنسوؤں کو بوسے سے صاف کر دیا جو نیچے ٹپکنے والے تھے۔ وہ کتنا اچھا تھا۔ وہ پیدل چل کر بڑے چوک میں آ گئے۔

بڑا شیطان وہاں ٹہل رہا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ ''تم نے بڑی جلدی کی۔'' شیطان بولا۔ ''امید ہے تم وہاں آسودہ رہے ہو گے۔''

''اوہ، یہ بڑا خوفناک تھا۔'' عورت نے بتایا۔

''نہیں! ایسا مت کہو۔ تم ایسا نہیں سوچ سکتے۔ پرانے زمانے میں تم یہاں آتے تو سب کچھ مختلف پاتے۔ اب جہنم ایسی جگہ نہیں رہی کہ تم اس کی شکایت کر سکو۔ ہم وہ سب کچھ کرتے ہیں جو پہلے کے برعکس جہنم کو قابل نشاط (Enjoyable) بنا دے۔''

''ہاں۔'' مسٹر سمتھ نے کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ یہ کچھ زیادہ انسان دوست ماحول ہے۔''

شیطان نے بتایا ''ہم نے ہر شے کو جدید بنا دیا ہے اور چیزوں کی ترتیب ایسی کر دی ہے جیسی کہ ہونی چاہیے۔''

''بالکل! تمہیں وقت کے ساتھ چلنا چاہیے۔''

''ہاں آج کل صرف روح کو اذیت ملتی ہے۔''

''اس کے لیے خدا کا لاکھ شکر ہے۔'' عورت نے کہا۔

شیطان خوش اخلاقی سے انہیں لفٹ تک لے گیا۔ ''شب بخیر۔'' وہ جھک کر بولا۔ ''واپسی پر خوش آمدید۔'' ان کے پیچھے شیطان نے گرل بند کر دی اور لفٹ اوپر کی طرف چل پڑی۔

''شکر ہے یہ سب ختم ہوا۔'' دونوں نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا اور لفٹ کی سیٹ پر دونوں جڑ کر بیٹھ گئے۔

''میں تمہارے بنا کبھی اس جہنم سے نہ نکل پاتی۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ سمتھ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور دونوں طویل بوسے کی لذت میں ڈوب گئے۔ اس بغل گیری کے بعد جب اس کا سانس بحال ہوا تو بولی ''تصور کرو، اس نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا رویہ ہمیشہ مختلف ہی رہا۔ وہ معاملات کو کبھی سادگی اور قدرتی انداز میں نہیں لے سکا۔ اس کے لیے ہر وقت زندگی اور موت کا مسئلہ بنا رہتا۔''

''یہ نری حماقت ہے۔'' سمتھ بولا۔

''وہ مجھے بتا سکتا تھا۔ تب میں گھر پر رکی رہتی اور ہم کسی دوسری شام باہر جانے کا پروگرام بنا لیتے۔''

''بالکل۔'' سمتھ نے کہا۔ ''ہم ایسا کر سکتے تھے۔''

''لیکن ڈارلنگ! ہمیں بیٹھ کر یہی کچھ نہیں سوچتے رہنا۔'' عورت نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ ''یہ سب اب ختم ہو چکا ہے۔''

''ہاں پیاری! اب یہ ختم ہو چکا ہے۔'' اس نے عورت کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور لفٹ اوپر چلتی گئی۔

..........☆..........

آکیرا کرسوا اور گبرئیل گارشیا مارکیز کے درمیان گفتگو

مترجم: راجا ریاض الرحمٰن

فلم کو فنون لطیفہ (Art) میں جگہ دلوانے میں دو نام بے اہم ہیں یعنی سویڈن کے فلم ڈائریکٹر انمابرماں Ingmar) Bergman) (۱۹۱۸ـ۲۰۰۷) اور جاپانی فلم ڈائریکٹر آکیرا کرسوا(Akira Kurorawa) (۱۹۱۰ـ۱۹۹۸) کرسوا نے لاتعداد فلمیں ڈائریکٹ کیں لیکن اس کی اصل شہرت Rashomon (۱۹۵۰ء) کی وجہ سے ہے۔ یہ فلم جاپانی افسانہ نگار Rysnusko Akhtagawa کی اسی عنوان کی کہانی پر مبنی ہے جس میں ایک ہی واقعہ (قتل) تین چار مختلف کرداروں کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح اصل حقیقت بیان کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔ مصر کے نوبل انعام یافتہ مصنف نجیب محفوظ نے اپنے ناول Marimar کے لیے یہ تکنیک Rashomon ہی سے مستعار لی ہے۔ کرسوا سے مندرجہ ذیل انٹرویو مشہور ناول نگار گیبریل گارشیا مارکیز نے ۱۹۹۱ء میں لاس اینجلس ٹائمز کے لیے کیا تھا۔ اس وقت کرسوا کی عمر ۸۱ سال تھی۔ مارکیز سے پاکستانی قارئین بخوبی واقف ہیں۔ One Hundred Years of Solitude سے بھلا کون ناآشنا ہوگا۔

نوٹ: انٹرویو کا وہ حصہ جس کا تعلق سیاست سے ہے، حذف کر دیا گیا ہے۔

گبریل گارشیا مارکیز: میں نہیں چاہتا کہ اس گفتگو کو احباب ایک اخباری انٹرویو سمجھیں لیکن مجھے آپ کے اور آپ کے کام کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا بہت تجسس ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اپنا سکرپٹ کیسے تحریر کرتے ہیں اور یہ دو وجہ سے ہے۔ اول تو یہ کہ میں خود بھی ایک سکرپٹ لکھنے والا ہوں۔ دوم یہ کہ آپ نے کئی ادبی شہ پاروں کو فلمی سکرپٹ میں ڈھالا ہے۔ اگرچہ میں اپنے ناولوں کے فلمی سکرپٹ جو تیار ہو چکے، اس یا آئندہ تیار کیے جائیں گے، خاصا مشکوک ہوں۔

آکیرا کرسوا: جب مجھے کوئی خیال سوجھ جائے جسے میں فلمی سکرپٹ کا روپ دینا چاہتا ہوں تو میں کاغذ پنسل لے کر ہوٹل کے کسی کمرے میں بند ہو جاتا ہوں۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس خیال کا پلاٹ تا انجام کیسا ہونا چاہیے۔ اگر مجھے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پلاٹ کا آغاز کس سیشن سے کرنا چاہیے تو پھر میں خیال کے فطری بہاؤ پر بھروسہ کرتا ہوں۔

مارکیز: پہلی چیز جو آپ کے دماغ میں آتی ہے، وہ کوئی خیال ہوتا ہے یا تمثال؟

کرسوا: مجھے صحیح علم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ پہلی چیز بکھری ہوئی لاتعداد تمثال ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس جاپان میں عام طور پر سکرپٹ رائٹرز منظر بہ منظر ایک مکمل پلاٹ کا خاکہ تیار کرنے کے بعد اسے تحریر کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ صحیح طریقہ نہیں ہے کیونکہ ہم خدا نہیں ہیں۔

مارکیز: کیا آپ شیکسپیئر، گورکی یا دوستوفسکی کے شہ پاروں کو فلمی سکرپٹ میں منتقل کرتے ہوئے وجدان پر بھروسہ کرتے ہیں؟

کرسوا: وہ فلم ڈائریکٹر جو جز وقتی یہ کام کرتے ہیں شاید یہ نہیں جانتے کہ ادبی تمثیلوں کو سینمائی تمثیلوں میں منتقل کرنا انتہائی دشوار عمل ہے۔ مثال کے طور پر ایک جاسوسی ناول میں ایک لاش پٹڑی کے قریب دکھائی گئی ہے۔ ایک نوجوان ڈائریکٹر کا اصرار تھا کہ فلم میں بھی ہو بہو ایسا ہی دکھانا چاہیے لیکن میں نے اسے باور کرایا کہ ایسا ضروری نہیں ہے۔ تم ایسا اس لیے سوچ رہے ہو کہ تم نے یہ جاسوسی ناول پڑھ رکھا ہے لیکن جن لوگوں نے یہ ناول نہیں پڑھا، ان کے لیے جگہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ نوجوان ڈائریکٹر ادب کی طلسماتی طاقت کے زیر اثر یہ بھول گیا تھا کہ سینمائی تمثال کا اظہار مختلف انداز میں ہونا ضروری ہے۔

مارکیز: کیا آپ کو حقیقی زندگی سے کوئی ایسی تمثیل یاد ہے جس کا فلم پر اظہار ناممکن ہو؟

کرسوا: جی ہاں! ایک قصبہ Llidochi جہاں کانکنی ہو رہی تھی، جہاں میں اپنی نوجوانی کے دنوں میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر اس کی فلم بندی اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ اس مقام کی فضا غیر مانوس اور پرکشش تھی لیکن فلمائی گئی تصویریں جلد بازی کا خمیازہ تھیں کیونکہ جو ہم دیکھ رہے تھے، وہ فلم میں منعکس نہ ہو سکی کہ لوگوں کی زندگی بہت خطرے میں ہے اور بچے اور عورتیں ایک کربناک زندگی گزار رہے ہیں۔ جب کوئی ننگی آنکھ سے لینڈ سکیپ کو دیکھتا ہے تو اس میں اپنے جذبات کی آمیزش کرتا ہے لیکن کیمرے کی آنکھ جذبات سے عاری ہوتی ہے۔

مارکیز: حقیقت یہ کہ بہت کم ناول نگار اپنے ناولوں کی فلم بندی سے مطمئن رہے، آپ کا اس حوالے سے کیا تجربہ ہے؟

کرسوا: پہلے ایک سوال پوچھنے کی اجازت دیجیے۔ کیا آپ نے میری فلم ''سرخ ریش'' دیکھی ہے؟

مارکیز: میں نے یہ فلم بیس سال میں چھ مرتبہ دیکھی ہے اور اپنے گھرانے میں اس وقت تک اس کا تذکرہ کرتا رہا جب تک میرے بچے خود اسے دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ آپ کی فلموں میں یہ میری اور میرے خاندان کی پسندیدہ فلم ہے بلکہ سینما تاریخ میں بھی یہ میری پسندیدہ فلم ہے۔

کرسوا: میرے فلمی کیریئر میں ''سرخ ریش'' ایک حوالے کا مقام رکھتی ہے۔ اس سے پہلے کی تمام فلمیں ایک الگ مقام رکھتی ہیں اور بعد کی والی فلمیں الگ۔ یہ فلم میرے ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے۔

مارکیز: یہ تو ظاہر ہے مزید یہ کہ اس فلم میں دو منظر ایسے ہیں جو آپ کے کل کام کے مقابلے میں شدید کہلائے جا سکتے ہیں۔ ایک عبادت گزار جھینگر والا منظر اور دوسرا ہاسپٹل کے احاطے میں کراٹے کی لڑائی والا۔

کرسوا: ہاں! لیکن میں آپ کو یہ بتلا دینا چاہتا ہوں، ناول کا خالق شوگوار ویاموتو ہمیشہ سے اپنے ناولوں کو فلمائے جانے کا مخالف رہا ہے۔ ''سرخ ریش'' کو اس نے میری وجہ سے مستثنیٰ کیا کیونکہ میں ایسا کرنے کے لیے بے رحمی کی حد تک مُصر تھا اور میں اس میں کامیاب ہو گیا لیکن جب وہ فلم دیکھ چکا تو اس نے میری جانب دیکھا اور کہا، یہ میرے ناول سے زیادہ دلچسپ ہے۔

مارکیز: اس کی پسندیدگی کی وجہ کیا تھی؟

کرسوا: وہ سینما کی موروثی خصوصیات سے کماحقہ واقف تھا۔ البتہ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ ناول کے مرکزی کردار کی فلم بندی میں بہت احتیاط کی جائے۔ وہ جو ایک مکمل ناکام عورت کی صورت عیاں نہیں تھا۔

مارکیز: میرے خیال میں ایسا ہے کہ کئی دفعہ اپنے ناول پر مبنی فلمیں دیکھ کر ناول نگار کہتے ہیں، میرے ناول کا یہ حصہ بہت اچھا پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ حصہ ہوتا ہے جو فلم ڈائریکٹر نے اضافے کے طور پر شامل کر دیا ہوتا ہے۔ میں جان جاتا

ہوں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ درحقیقت یہ ٹکڑا وہ ہوتا ہے جو وہ تحریر کرنا چاہتے تھے لیکن تحریر نہیں کر پائے تھے اور اب ڈائریکٹر کے وجدان نے اسے سکرین پر لا دکھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر جذبات کا ملغوبہ ہوتے ہیں، آپ کی موجودہ فلم کی طرف آتے ہیں۔ کیا سمندری طوفان کو فلمانہ دشوار کام ہے؟

کرسوا: نہیں! زیادہ مشکل کام جانوروں کی اداکاری ہے جیسے سمندری سانپ یا گلاب کھانے والی چیونٹیاں، پالتو سانپ لوگوں کے عادی ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر بھاگتے نہیں ہیں اور بام مچھلی کا سارو یہ رکھتے ہیں۔ اصل مسئلہ جنگلی سانپ کو گرفت میں لانا تھا جس سے وہ مسلسل فرار ہونے کی کوشش کرتا رہا اور خوفناک بھی تھا لیکن اس نے اپنا ناول اچھی طرح نبھالیا جہاں تک چیونٹیوں کا تعلق ہے، اصل مسئلہ وہ تھا گلاب کی جھاڑیوں پر ایک قطار میں اوپر چڑھنا۔ یہ اس کام کے لیے تیار نہ تھیں، یہاں تک کہ ہم نے جھاڑی کے پورے تنے پر شہد کا چھڑکاؤ کیا تب جا کر کامیابی ہوئی۔ دشواریاں بہت تھیں لیکن ہم نے ان سے سیکھا بہت کچھ۔



ندیم افسانہ: **"بابا نور"** (اقتباس)

"ڈاک خانے چلے بابا نور؟" دکان پر کھڑے ہوئے ایک نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں۔ بیٹا جیتے رہو۔" بابا نور نے جواب دیا۔

پاس ہی ایک بچہ کھڑا تھا۔ تڑاک سے تالی بجا کر چلایا "آہاہا۔ بابا نور ڈاک خانے چلا۔"

"بھاگ جا یہاں سے۔" نوجوان نے بچے کو گھرکا۔

اور بابا نور جو کچھ دور گیا تھا، پلٹ کر بولا "ڈانٹتے کیوں ہو بچے کو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔"

سفید براق بابا نور سیدھا مدرسے کے برآمدے کی طرف آ رہا تھا اور لوگ جیسے تھے جا رہے تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر اُس نے کہا "ڈاک آ گئی منشی جی؟"

"آ گئی بابا۔" منشی نے جواب دیا۔

"میرے بیٹے کی چٹھی تو نہیں آئی؟" بابا نے پوچھا۔

"نہیں بابا۔" منشی بولا۔

بابا نور چپ چاپ واپس چلا گیا۔ دُور تک پگڈنڈی پر ایک سفید دھبا رینگتا ہوا نظر آتا رہا اور لوگ دم بخود بیٹھے اُسے دیکھتے رہے۔

پھر منشی بولا۔ "آج دس سال سے بابا نور اسی طرح آ رہا ہے، یہی سوال پوچھتا ہے اور یہی جواب لے کر چلا جاتا ہے۔ بے چارے کو یہ یاد ہی نہیں رہا کہ سرکار کی وہ چٹھی بھی تو میں نے ہی اسے پڑھ کر سنائی تھی جس میں خبر آئی تھی کہ لام کے وقت اس کا بیٹا برما میں بم کے گولے کا شکار ہو گیا۔ جب سے وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔ پر خدا کی قسم ہے دوستو کہ اگر آج کے بعد وہ پھر بھی میرے پاس یہی پوچھنے آیا تو مجھے پاگل کر جائے گا۔"

(......احمد ندیم قاسمی)

انسانی ذہن کی طاقتیں

سید مشکور حسین یاد

ابنارمل کی بات نہیں کر رہا ہوں، نارمل انسان کے ذہن کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ قدرت نے کسی انسان کے ذہن کو کمزور نہیں بنایا۔ ہر انسان کا ذہن مضبوط بھی ہے، طاقتور بھی اور گوناگوں تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال بھی۔ کوئی انسان بظاہر کتنا بھی کمزور نظر آئے لیکن وہ ذہنی طور پر مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فطرتاً انسان ذہنی طور پر مضبوط اور توانا ہی ہوتا ہے۔ انسان اپنے ذہن کو خود کمزور کرتا ہے اور اس کمزوری کی کئی مختلف صورتیں ہیں جو اپنی اپنی جگہ دلچسپ بھی ہیں اور قابل غور بھی۔

انسانی ذہن کے کمزور ہونے کی پہلی دلچسپ صورت یہ ہے کہ اگر اسے استعمال نہ کیا جائے تو یہ لوہے کی صورت تو خیر پھر بھی اختیار نہیں کرتا لیکن اس میں لوہے کی ایک سطحی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے یعنی استعمال نہ کرنے سے انسانی ذہن پر زنگ لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے ذہن کو کیوں استعمال نہیں کرتا؟ اس کی وجہ نہایت دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ اپنی تن آسانی اور گریز کی عادت کے تحت انسان یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں اور اس کے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ اس لیے اسے اپنے ذہن کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں...... ''سب ٹھیک ہے'' سمجھنے کی وجہ سے انسان کو بہت بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کے خارج کی دنیا اور اس دنیا کی مختلف اشیاء جو انسان کی طرف ازل سے آنکھیں لگائے ہوئے ہیں کہ وہ ان کی طرف دیکھے اور انہیں سمجھے اور انہیں استعمال کر کے ان کے صحیح مقام پر فائز کرے، یہ سارے کام ادھورے رہ جاتے ہیں، اور اس ادھورے پن کی وجہ سے یعنی انسان کے ذہن کے استعمال نہ ہونے کی وجہ سے انسان خود ایک شے بن کر رہ جاتا ہے۔ گویا انسان اگر اپنے ذہن کا استعمال نہیں کرتا تو وہ اپنی انسانیت کے درجے سے گر کر ایک شے کے درجے پر آ جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انسان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ اشیا کی سطح پر آ کر بھی اس زعم کا شکار رہتا ہے کہ وہ اشیاء سے بلند درجے پر فائز ہے۔

ویسے تو جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ہر انسان کا ذہن طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے لیکن کتنا طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے، یہ جاننے کے لیے بنیادی طور پر ایک معیار ہے اور معیار یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں اس آدمی میں قوتِ برداشت کتنی ہے۔ جس قدر قوت برداشت ہوگی اسی قدر اس آدمی کو آپ طاقتور اور مضبوط سمجھیں۔ مثال کے طور پر دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے لیے میں آپ کے سامنے اپنی ذات کو پیش کرتا ہوں۔ میں برداشت کا خاصی حد تک قائل ہوں لیکن برداشت کرتے وقت غالباً لاشعوری طور پر یہ بھی سمجھتا رہتا ہوں کہ میرے برداشت کرنے کو دوسرا شخص سمجھ رہا ہے، اس لیے وہ اپنی اصلاح کر لے گا مگر

جب کوئی میرے برداشت کرنے کو نہیں سمجھتا تو میری برداشت میرے لیے قابل برداشت نہیں رہتی جس کے نتیجے میں مجھے غصہ آ جاتا ہے یا میں بپھر جاتا ہوں۔ میں اپنے اس غصے اور بپھرنے کو اپنے ذہن کی کمزوری سمجھتا ہوں۔ وہی بات کہ میں اپنے بارے میں کڑی تنقید سننا اور پھر اس پر عمل کرنا ..... انسان کی ذہنی طاقت کا سب سے اہم اور بنیادی مظاہرہ ہے۔ ہم اپنی تعریف تو جلدی سے سن لیتے ہیں لیکن اگر کوئی کتنے بھی خلوص سے ہماری خامیاں ہمیں بتاتا ہے تو عموماً ہم اس سے ایک طرح ناراض ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب کوئی بغیر سمجھے اور بغیر جانے ہماری خامیاں ہمیں بتاتا ہے اس وقت بھی ہمیں غصہ کرنے کی بجائے اس شخص کی بات کو ہنسی میں ٹال دینا چاہیے۔ پھر وہی اپنی مثال فرض کر لیجیے، میں فلسفہ کا آدمی ہوں اور بات کروں شعر و ادب کی اور پھر بات بھی بغیر سمجھے کروں تو یہ میرے ذہن کی واضح کمزوری ہوگی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بات بھی از خود نہ کروں، کسی کے اکسانے پر۔ ایسی صورت میں تو میری یہ ذہنی کمزوری حماقت کے حدود کو چھونے لگتی ہے۔ دیکھ لیجیے فلسفہ کا آدمی ہوتے ہوئے احمق بن جاتا ہے۔ برداشت کے ضمن میں ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ جب برہان اور قطع برہان کا قصہ چل رہا تھا تو کسی نے غالب سے کہا، آپ نے فلاں شخص کا جواب نہیں دیا تو غالب نے کہا، بھائی اگر کوئی گدھا میرے لات مار جائے تو میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں۔ میں نے غالب سے متعلق یہ گدھے کی لات والی بات کہیں نہیں پڑھی۔ چلیے میں ان صاحب کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے غالب اور گدھے سے متعلق میرے علم میں اضافہ فرمایا مگر گدھا تو پھر بھی ایک طرح معصوم جانور ہے۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ جو شخص غالب کے بارے میں غلط بات کرتا تھا، غالب کہتے تھے کتا بھونک رہا ہے، اسے بھونکنے دو...... بہر حال اگر ہمیں کوئی سمجھاتا ہے اور ہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو یہ بات بھی ہمارے ذہن کے کمزور ہونے کو ثابت کرتی ہے۔

ذرا توجہ سے کام لیں تو پتا چلتا ہے کہ ہماری عمدہ انسانی اقدار کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ ہمارے ذہن کو مضبوط کرتی ہیں اور ان اقدار سے ہمارا ذہن طاقتور اور توانا ہوتا ہے۔ غصہ پینے سے ہمارے ذہن میں طاقت آتی ہے جبکہ غصہ ہمارے ذہن کو کمزور کرتا ہے۔ اسی طرح وقت پر سچ بولنے سے ہمارے ذہن میں طاقت کا کرنٹ دوڑتا ہے۔ اس کے برعکس جھوٹ بولنے سے ہمارے ذہن کے غبارے میں سے طاقت کی ہوا خارج ہونے لگتی ہے اور اگر ہم مسلسل جھوٹ بولتے چلے جائیں تو ہمارا ذہن چھیچھڑے کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ کسی کی مدد کرنے سے ہمارا جسم اتنا مضمحل نہیں ہوتا جتنا کہ ہمارے ذہن میں توانائی کی چمک اور دمک پیدا ہوتی ہے مگر کسی کی مدد کے حوالے سے آپ اسی وقت مدد کر سکتے ہیں جب آپ کا ذہن مخلص ہو۔ گویا خلوص بھی ہمارے ذہن کے لیے ٹانک کا کام کرتا ہے۔ من و تو کی خلیج کو پاٹ دیتا ہے۔ ہم دوسروں کو اپنے جیسا سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے ذہن کی اس طاقت کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔

مکاری اور عیاری کرتے ہوئے بظاہر آدمی کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بہت کامیاب ہو رہا ہے۔ حالانکہ مکاری اور عیاری آدمی کے ذہن کو اندر سے کھوکھلا کر رہی ہوتی ہے۔ آدمی کا ذہن سطحی رہنا نہیں چاہتا اور مکر و ریا انسان کو سطحی بنا کر رکھتے ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ کوئی سطحی رہ کر اپنے آپ کو زیادہ خوش محسوس کرتا ہے مگر وہی بات کہ سطح تک محدود رہ کر احساس بھی ذہن کے اعلیٰ درجات تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے یہ عارضی خوشی بھی جھوٹ کا ملغوبہ بن کر رہ جاتی ہے۔

قدرت نے آدمی کے ذہن کو مضبوط اور طاقتور رکھنے کا سامان بڑی وافر تعداد و مقدار میں مہیا کر رکھا ہے۔ مثلاً آدمی حق بات کہنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی میٹھی چیز کے کھانے کے لیے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر...... آدمی کو سچ بول کر جتنا مزہ آتا ہے ممکن ہے سچ سن کر اتنا مزہ نہ آتا ہو مگر سچ انسان کے ارد گرد اس قدر دلکش انداز میں ہمہ وقت موجود ہے

کہ سچ بولنے کے لیے اس کی رال ٹپکتی رہتی ہے۔ کہتے ہیں کسی حسین کا بوسہ لے کر آدمی کا ذہن اتنا مضبوط اور طاقتور نہیں ہوتا جتنا کہ حق بات کہہ کر مضبوط ہوتا ہے لیکن کچھ حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ سچ سن کر بھی ایسا ہی لطف آتا ہے جیسا کہ کسی حسین کا بوسہ لے کر لطف آتا ہے۔ مطلب یہ کہ سچ بولنے کی طرح سچ سن کر بھی آدمی کے ذہن کی قوت میں معتد بہ اضافہ ہی ہوتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ سچ بول کر مزہ آتا ہے اور سچ سن کر لطف آتا ہے۔ مزہ اور لطف کے فرق کو سمجھنا ہے۔ سچ بولتے وقت سچ اپنی کثافت و لطافت کے ساتھ حاضر ہوتا ہے اور سننے کی منزل پر آ کر سچ کی کثافتوں کو دور کر کے سچ کو صرف لطافتوں کے ساتھ قبول کرنا پڑتا ہے۔ بظاہر یہ مجبوری نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں یہ بھی ذہن کی طاقت کا ایک قابل فخر مظاہرہ ہوتا ہے۔ دراصل آدمی کا ذہن تو لوح محفوظ کی طرح ہے۔ کیا کچھ اس پر تحریر نہیں ہوتا اور کیا کچھ امکانات اس کی تحریر کے احاطے میں نہیں آتے مگر ہم جب اس کی طرف سے غافل ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ جب ہم اپنی طرف سے غفلت اختیار کرتے ہیں تو ذہن کی یہی لوح محفوظ کمزور ذہن کا ورق بن کر کھڑکھڑانے لگتی ہے۔ شیخی بھگارنا، ڈینگیں مارنا، اپنے آپ کو خواہ مخواہ کچھ سمجھنا اور اس طرح کی ہر قسم کی چیخ و پکار انسان کے کمزور ذہن کے ورق کی کھڑکھڑاہٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کمزور ذہن کا آدمی کھڑکھڑاتا ہے اور کھڑکھڑا کر اپنی طاقت کا نہیں اپنی کمزوری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

مضبوط ذہن کا آدمی اپنے آپ کو صحیح رکھتا ہے۔ کبھی ایک شگفتہ پھول کی طرح اور کبھی ایک مضبوط چٹان کی طرح۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے کہ جب آدمی اپنے ذہن کو کمزور کر لیتا ہے تو اس وقت بھی وہ مضبوط ذہن کے آدمی کی طرح پھول کے مانند شگفتہ ہونا چاہتا ہے لیکن وہ شگفتہ ہونے کے بجائے بکھر کر ورق ورق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کمزور آدمی اپنی مضبوطی دکھانے کے لیے بزعم خویش چٹان بننا چاہتا ہے لیکن اس خواہش میں وہ پارہ پارہ ہو کر کہیں کا نہیں رہتا۔ وہی بات کہ ہر آدمی کا ذہن مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے لیکن وہ اپنی غفلت کے باعث جب اپنے ذہن کو کمزور کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے ناشکری کا سب سے بڑا مظاہرہ ہوتا ہے۔



وائے فوبیا (Wifobia)

محمد نعیم (دیپالپور)

لیجیے صاحب، آپ تو نام سن کے ہی بدک گئے کہ جانے کس آفت کا ذکر ہونے والا ہے تو آپ کو بتا دوں کہ آپ کا بدکنا کچھ ایسا بے جا بھی نہیں ہے کہ یہ مرض ہی کچھ ایسا ہے۔ اس تحقیقی مضمون کو یہاں رقم کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس مرض کی کچھ اہم علامات اور حفاظتی تدابیر کو زیر بحث لا کر اس کی پیش بندی سے متعلق کچھ اہم معلومات فراہم کی جا سکیں۔ وائے فوبیا ایک مزمن یعنی کرونک بیماری ہے۔ یہ ایک خالصتاً مردانہ مرض ہے لیکن کنوارے مردوں کو اس سے بہت زیادہ بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ مرض صرف اور صرف شادی شدہ مردوں پر ہی حملہ آور ہوتا ہے۔ خواتین کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھا ہوگا کہ آیا یہ بیماری ان پر بھی کسی نہ کسی طور اثر انداز ہو سکتی ہے؟ تو خواتین کو اس بیماری کے حوالے سے خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ایک جدید ریسرچ کے مطابق خواتین اس مرض سے سو فیصد محفوظ و مامون ہیں۔ اس ریسرچ میں ثابت کیا گیا ہے کہ وائے فوبیا کا مریض ہونے کے لیے بندے کی کم از کم ایک عدد بیوی کا ہونا لازمی شرط ہے اور ظاہر ہے خواتین اس مرض سے اسی لیے مکمل محفوظ رہتی ہیں کہ ان کی کبھی کوئی بیوی نہیں ہوتی اور نہ ہی مستقبل قریب میں ہونے کا کوئی امکان ہے۔ (کتنی خوش قسمت ہیں) لیکن یہ ریسرچ یہ بھی بتاتی ہے کہ خواتین ہی اس بیماری کے پھیلنے کا ایک بڑا اور واحد ذریعہ بھی ہیں۔

بیماری کے نام سے آپ کو لگ رہا ہوگا کہ شاید یہ بھی ایڈز کی طرح کا کوئی جدید مرض ہوگا لیکن آپ کو سن کے حیرت ہوگی کہ وائے فوبیا دنیا کا سب سے قدیم بلکہ اولین اولین مرض ہے اور اس کے شواہد پوری انسانی تاریخ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔

وائے فوبیا ایک بڑا ہی خطرناک وبائی مرض ہے اور شادی کے پانچ سات ماہ بعد ہی بڑی سرعت سے پھیلنے لگتا ہے۔ اس مرض میں انسان اندر ہی اندر گھلتا چلا جاتا ہے مگر اس بیماری کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس میں مبتلا ہو جانے کے معلوم ہونے کے باوجود انسان بے عزتی کے خوف سے اس کا کھل کر اعلان کرنے سے ڈرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی کرونک مریض کی طرح وائے فوبیا کا مریض بھی اپنی بیماری سے آخر کار سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

وائے فوبیا کے کرونک ہونے پر تو کوئی دو رائے نہیں ہیں البتہ اس کے وبائی ہونے پہ کچھ ماہرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن قبلہ جو کہ ازدواجیات کے ماہر ہیں (ماہر اس طرح ہیں کہ آپ پچھلے تیس سال سے بلا ناغہ شادی شدہ چلے آ رہے ہیں) اس کے وبائی ہونے کی دلیل میں فرماتے ہیں کہ وائے فوبیا وبائی اس لیے ہے کہ اس کا مریض لوگوں کی موجودگی میں اپنی

بیوی سے بڑی چہلیں کرتا ہے۔ ہنس ہنس کے باتیں کرتا ہے بلکہ قہقہہ لگانے تک سے نہیں چوکتا۔ ایسے میں بیچارے کنوارے میاں کو جب اپنی بیوی کے ساتھ یوں خوش وخرم رہنے کا یہ چشم کشا منظر دیکھتے ہیں تو ان کے دل سے وہ تمام واہمے جو اپنے ماں باپ یا کچھ اور بزرگوں کو دیکھ دیکھ کر پل رہے ہوتے ہیں، معدوم ہونے لگتے ہیں۔ میاں کو بیوی کے ساتھ یوں ہنستے مسکراتے دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی شادی کے حوالے سے بڑی خوش کن حسرتیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ ٹھیک یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وائف فوبیا کا مریض اپنا مرض نہ صرف آگے منتقل کر رہا ہوتا ہے بلکہ اس انتقال مرض میں مکمل کامیاب بھی رہتا ہے۔

گوکہ وائف فوبیا کے وبائی ہونے پر میرا ابھی اختلاف رہا ہے لیکن قبلہ کی اس دلیل کے آگے میں مکمل لاجواب بلکہ بے جواب ہوں۔

نوٹ:

وائف فوبیا چونکہ خالصتاً مردانہ مرض ہے، سو ہر مرد بشرطیکہ وہ مرد ہو (سوائے چند ایک خوش نصیبوں کے) اس مرض کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا نیچے بیان کی جانے والی تمام کی تمام علامات اور حفاظتی تدابیر صرف اور صرف شادی شدہ مردوں سے متعلق ہیں۔ تاہم مرد آزاد یعنی غیر شادی شدہ مردوں کے لیے بھی ان سے استفادہ کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ قبل از وقت احتیاط سے بہتر کوئی علاج دنیا میں نہ ہے۔

وائف فوبیا کی کچھ اہم علامات:

(۱) شادی کے پانچ سات ماہ بعد ہی ہمسائیوں اور دیگر تمام دائرہ مناکحت میں لائی جاسکنے والی عورتوں کا حد سے بڑھ کے حسین لگنے لگنا۔ حالانکہ شادی ہونے کے بعد وہ آپ کو سوکھی گھاس بھی نہیں ڈال رہی ہوتیں۔

(۲) بیوی کے سامنے پرائی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے خواہ مخواہ ذہنی دباؤ میں رہنا۔

(۳) سینڈوچ کی کیفیت کیا ہوتی ہے، ماں باپ اور سسرالیوں کے درمیان پھنس کر اس کا ادراک پا جانا۔

(۴) ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بلاوجہ ہی شرمندہ شرمندہ رہنے کی عادت ہو جانا۔

(۵) شام کے وقت بیوی کو میک اپ کرتے دیکھ کر اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہوتے ہوئے گھر سے فرار ہونے کی بے سود کوشش کرنا۔

(۶) بیوی کے ساتھ ہوتے ہوئے اس موقع کو خوشگوار بنانے کے لیے جان بوجھ کے کسی پسندیدہ ہیروئن یا محبوبہ کا تصور ذہن میں لانا۔

(۷) ہر وقت بیوی کو میکے بھیجنے کی مختلف سکیمیں سوچتے رہنا اور ان کے ناکام ہونے پر خجالت سے برا حال ہونا۔

(۸) اپنی کمزوریوں اور کمینگیوں سے بیوی کی توجہ ہٹانے کے لیے بلاوجہ بیوی کے للو چپو کرتے رہنے پر مجبور ہونا۔

(۹) بیوی کے پکے ہوئے کھانوں کا زہر لگنا لیکن پھر بھی ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہونا۔

(۱۰) بیوی کے بیمار ہونے پر انتہائی خوش کن تصورات کا ذہن میں آنا، بات بے بات مسکراہٹوں کے فوارے چھوٹنا لیکن بیوی کے ہر دفعہ ہی زندہ بچ جانے پر اپنی جھنجھلاہٹ مٹانے کو غربا میں صدقہ وخیرات بانٹتے پھرنا۔

(۱۱) زندگی کی ساری رنگینیوں کا قصہ پارینہ ہوتے محسوس ہونا۔

(۱۲) زندگی سے موت بہتر لگنے لگنا لیکن اس مرض کا سب سے اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ اس سے کبھی کسی کی موت واقع نہیں

ہوتی۔ بس ساری زندگی یونہی سسکتے سلگتے، آہ و بکا کرتے اور ایڑھیاں رگڑتے گزر جاتی ہے۔ اس ضمن میں قبلہ اپنی رائے کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں کہ جس کے جتنے زیادہ بچے ہوں گے، سمجھو وہ اتنا ہی زیادہ وائے فوبیا کا شکار ہوگا۔

(۱۳) جب بھی بیوی کو دیکھنا اپنی آزادی کے دنوں پہ اک ہوک سی اٹھنا۔

(۱۴) بہت سی عیاشیوں اور انسانی عادات مثلاً سگریٹ نوشی کرنا، بیہودہ انداز سے کھل کے ہنسنا، پاؤں پسار کے یہاں وہاں بیٹھ رہنا، رات گئے تک باہر رہنا اور دوستوں کے ساتھ لور لور پھرنا، یہاں وہاں تانکا جھانکی کرنا، سوتے میں قیامت خیز خراٹے لینا، صبح دیر تک سوتے رہنا، کئی کئی دن شیو کیے بغیر اور دانت برش کیے بغیر پھرتے رہنا، کپڑے اور جوتے اتارنے کے بعد ادھر اُدھر پھینک دینا، بدبودار جرابوں کا کئی کئی ہفتے نہ بدلنا وغیرہ کا بیک جنبشِ قلم چھٹ جانا وغیرہ۔

(۱۵) حسین خواب دیکھنے سے ڈرنے لگنا، مبادا نیند میں بڑبڑاتے ہوئے کوئی راز کی بات منہ سے نکل جائے اور صبح صبح ہی جواب طلبی ہو جائے۔

احتیاطی تدابیر:

یاد رکھیے کہ وائے فوبیا شوگر کی طرح کا ایک لاعلاج مرض ہے اور تا حال یعنی اس تحقیقی مضمون کے قلم برداشت ہونے تک اس مرض سے بچاؤ کی کوئی حفاظتی ویکسین یا انجکشن وغیرہ ایجاد نہ ہوا ہے۔ یوں سمجھئے کہ چونکہ شوگر کی طرح اس مرض کا بھی کوئی مستقل علاج نہیں ہے۔ بس شوگر ہی کی طرح اس پہ محض تھوڑا بہت کنٹرول ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاج کے بارے میں قبلہ یوں گویا ہیں: ''اس کو کنٹرول کرنے کا ایک عام، سہل اور مروجہ طریقہ یہ ہے کہ شادی کے ساتھ ساتھ ایک طوفانی قسم کا عشق (خواہ وہ عشق افلاطونی ہی کیوں نہ ہو) کیا جائے۔ یہ عشق وائے فوبیا کے اثرات کم کرنے میں کافی مدد ہوتا ہے۔'' کیونکر ہو سکتا ہے؟ قبلہ اس کی وضاحت میں مزید کہتے ہیں: ''محبوبہ کے سامنے بیوی کی چغلیاں کر کے دل کی جو بھڑاس نکلتی ہے، وہ وائے فوبیا کے لیے بالکل انسولین کا سا کام کرتی ہے اور طبیعت کئی گھنٹے سرشار سرشار سی رہتی ہے۔'' مزید فرماتے ہیں: ''یاد رکھیو اس دوران کسی بھی بداحتیاطی یا بدپرہیزی سے جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔''

کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہیں!

آپ کے شاد شاد پھرنے سے بیوی کی ساتویں حس فوراً اسے شک کے سگنل بھیجنا شروع کر دے گی (یہ حس تمام مخلوقات میں سے صرف عورتوں کے پاس پائی جاتی ہے اور اسے صرف قبل از وقت شک کرنے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے) کیونکہ دل میں اسے بھی پتہ ہوتا ہے کہ میری وجہ سے تو میاں جی خوش ہونے سے رہے، ضرور کوئی کلموہی ان کا جی بہلا رہی ہے! سو اس شک کا تدارک کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو پکڑے جانے سے محفوظ رکھنے کا واحد تیر بہدف نسخہ یہ ہے کہ گھر میں کبھی بھی خوش نظر آنے کی حماقت مت کیجیے بلکہ گھر داخل ہونے سے پہلے ہی لڑائی کا کوئی اچھا سا منصوبہ سوچ کر آئیے اور آتے ہی اس پر عمل درآمد کرنے کا کوئی جواز ڈھونڈنا شروع کیجیے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بہت ہی احمقانہ مشورہ ہے، بھلا بندہ پہلے سے کیا منصوبہ سوچ کر آئے؟ اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب محبوبہ سے ملنے کے بعد بندے کی طبیعت اتنی ہشاش بشاش ہو رہی ہو تو کس کافر کا لڑنے کو جی چاہے گا؟ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، یہ جھگڑا محض حفظ ماتقدم کی ایک تدبیر ہے۔ جب آپ جھگڑا کرنے کا ارادہ کر ہی چکے ہوں (جو کہ عائلی زندگی کا جزو لاینفک ہے) تو لڑنے کے بہترین جواز کا مل جانا بھلا کیا مشکل ہے! خدانخواستہ پھر بھی لڑائی شروع کرنے کا کوئی معقول جواز سجھائی نہ دے رہا ہو تو کسی بچے کے کسی بھی بہانے ایک آدھ چپت

رسید کر دیجیے۔ یہ تیر بہ ہدف حربہ ہے اور کبھی ناکام نہیں رہتا کیونکہ آپ کی بیوی کو یہ زعم ہے کہ وہ بچوں کو آپ سے زیادہ پیار کرتی ہے، لہٰذا فوراً ہی میدان میں اتر آئے گی۔ لیجیے صاحب آپ کا کام ہو گیا..... اندھا کیا چاہے دو آنکھیں!..... ہو گئی کل کل شروع اور آپ تو چاہتے ہی یہی تھے۔

اب آپ اپنے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق گھر کی دو چار چیزیں پٹخ دیجیے..... قبلہ فرماتے ہیں کہ لڑائی کے دوران بیوی کے جہیز کی چیزیں توڑنا زیادہ بار آور ثابت ہوتا ہے اور نتیجہ سریع اور سو فیصد رہتا ہے۔ آپ کی بیوی کے نزدیک آپ کا یہ رویہ نہ صرف نارمل اور روزمرہ معمولات میں سے ایک معمول ہے بلکہ آپ کے باوفا ہونے کا پکا سرٹیفکیٹ بھی ہے، لہٰذا آپ پہ شک تو در کنار، انشاء وہ انتہائی مطمئن رہے گی۔

سال ہا سال کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وائے فوبیا سے بچاؤ کی واحد صورت یہ ہے کہ شادی ہی نہ کی جائے۔ وہ بڑے کیا کہہ گئے ہیں کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے۔ قبلہ جو کہ اقوام مغرب اور افعال مغرب سے بے حد متاثر ہیں اور بات بے بات ان کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ: ''اہل مغرب اس میدان میں بھی ہم سے بہت آگے ہیں اور پورے زور شور سے اس مقولے پر عمل پیرا ہیں اور اگر کبھی کوئی ناہنجار شادی کرنے کی حماقت کر بیٹھیں تو جیسے ہی سال چھ مہینے کے اندر وائے فوبیا کا شکار ہونے لگتے ہیں، فوراً اس کی وجہ کو دور کر دیتے ہیں۔''

تنبیہ:

درج بالا احتیاطی تدابیر پہ سختی سے عمل کریں اور اگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو فوراً اپنے کنوارے دوستوں سے مشورہ کریں اور خوب سگریٹ پئیں۔ تمام راز بالخصوص موبائل فون اپنی بیوی کی پہنچ سے دور رکھیں۔

..........☆..........

شعری بے معنویت

محمد صغیر رفیق

''جناب والا، یہ شعر سنیے اور'' ''پھر اسی کو دُھنیے۔'' اس سے پہلے کہ ان کا جملہ پورا ہوتا ہم نے اپنے تنقیدی لقمے سے ان کے جملے کا کھلا ہوا منہ بند کر دیا۔ ''ارے بھائی! کس قسم کے دوست ہو تم سب لوگ؟ ہمیشہ ہر بات کو مذاق میں ہی اڑا دیتے ہو۔ کبھی غور کیا ہے کہ تم لوگوں کے درمیان آنے والا وقت کا سب سے بڑا اور قابل شاعر موجود ہے۔'' اس جملے کا ہم سب کی طرف سے ایک باجماعت جواب داغا گیا ''اجی! آپ کے بڑے ہونے پر تو کسی کو تنکا برابر بھی شائبہ نہیں، ذرا ملاحظہ کیجیے اپنی بڑائی کا کمال اور اس کا اثر کہ ہماری اس مثال میں بڑے اور تنکے کو کس خوبصورت سے ایک ہی جگہ استعمال کر لیا گیا ہے۔ ہاں تو بے شک آپ ماشاء اللہ چھ فٹ کے بنے کٹے جوان ہیں اور ایک عدد اچھی خاصی توند کے مالک بھی ہیں، جہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں، وہ خطۂ زمین رنجور ہو جاتا ہے۔ اب یہ مت پوچھیے کہ کیوں۔ تو ان خصوصیات کے بعد کیا کسی میں جرأت ہے کہ وہ آپ کے بڑے ہونے پر سوال کر سکے۔ آپ یقیناً بہت ہی بڑے ہیں۔ رہی بات قابل کی تو آپ نے یہ تو فرمایا نہیں کہ کس کا۔ بل؟'' اس سے آگے تکلم قہقہانہ کی نشست شروع ہو جاتی اور سلسلہ ایسے ہی رات گئے تک جاری و ساری رہتا۔

یہ بڑے شاعر حضرت جو اپنے آپ کو ہمارے ''دائرۂ ارباب ذوق'' کا شکار بدنصیب اور بدقسمت جینئس قرار دیتے ہیں، انہوں نے اپنے نام کے ابتدائی حروف کا جائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا شعری نام ''ٹی۔ ایس'' رکھ لیا تھا۔ جی ہاں آپ صحیح سوچ رہے ہیں، بات ٹی ایس پر ختم نہیں ہوتی۔ انہوں نے اس کے آگے ''ایلیٹ'' کو بھی استعمال کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھی۔ ارے ارے غلط طرف مت نکل جایئے، یہ مشہور شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی تقلید میں ہرگز نہیں کیا گیا بلکہ جناب کی ''ایلیٹ فورس'' سے گہری وابستگی، لگاؤ کی حد تک ہے اور اسی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے یہ لاحقہ اپنے نام کو لاحق کر دیا۔ جناب ٹی ایس صاحب اچھے بھلے ہوتے تھے چوتھی میں (ہمارا مطلب چوتھی دہائی عمر کی ہے) کہ اچانک ایک روز ان پر ایک بیماری کی علامات ظاہر ہوئیں۔ ایک سفید رنگ کے، بغیر لکیروں والے صفحے پر کچھ الفاظ اور پھر اسی کی تکرار اور ایسا ہی کرتے رہنے کی ضد! یہ دیکھتے ہی ہمارے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جس جس تک یہ خبر پہنچی، اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ ابھی عمر ہی کیا تھی کہ یہ کیسا حیرت انگیز مرض لاحق ہو گیا۔ باری باری سب نے اس کو جانچا، پرکھا مگر مرض کی درست تشخیص نہ ہو سکی۔ پھر سب نے مل کر طے کیا کہ ٹی ایس صاحب کو اسی حالت میں معہ بیماری کی علامات کے ہمارے دائرۂ یاراں کے ایک ایسے سمجھدار اور جہاندیدہ شخص کو دکھایا جائے جسے کچھ عرصہ قبل ایسی ہی کیفیت سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا مگر وہ معجزاتی

طور پر بہت جلد صحت یاب ہو گئے تھے۔

اس شخص نے حضرت ٹی ایس کی ظاہری شکل وصورت دیکھتے ہی نفی میں ایسے سر ہلایا کہ ہم سب کے دل دھک سے رہ گئے کہ یہ کچھ اچھے آثار نہیں۔ بہرحال ہم نے تفصیلی جائزے کے لیے ٹی ایس صاحب کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔ ٹی ایس صاحب اپنی دھن میں مگن، بڑھی ہوئی شیو، ایک ہاتھ میں بجھی ہوئی سگریٹ (جس کا وہ بار بار کش لگا رہے تھے) دوسرے ہاتھ میں قلم اور ایک صفحہ۔ معالج صاحب نے ہم سے دریافت کیا ''یہ حالت کتنے روز سے ہے؟'' ہم نے عرض کی ''جی دو روز سے تقریباً۔'' ''اچھا۔ انھیں اپنی انتہائی نگہداشت میں رکھیں، شاید یہ کچھ دن تک اپنے آپ ہی اس حالت سے باہر آ جائیں ورنہ ان کا شاعر بننا قرار پا گیا ہے۔''

خیر وہ دن اور آج کا دن ہر شام ہم دوستوں کی محفل جمتی، کچھ باتوں پر گفتگو ہوتی اور اگلے ہی دن اس گفتگو کے اہم نکات پر بنی ٹی ایس صاحب کی بلیغ شاعری سننے کو مل جاتی۔ اب ہماری گفتگو کا ایک بنیادی موضوع ٹی ایس صاحب کی شخصیت اور ان کی شاعری تھی۔ ایک روز ایک دوست نے یہ جاننے کی جسارت کی کہ قبلہ آپ کے اس بجھے ہوئے سگریٹ کا راز کیا ہے؟ جناب نے جواب مرحمت فرمایا کہ ''میں کیا بے وقوف ہوں کہ اس کام میں سگریٹ سچ میں پھونک ڈالوں۔ میں تو بس تخلیقی تحریک کے حصول کی خاطر اسے استعمال کرتا ہوں۔'' ٹی ایس صاحب نے بہت جلد اپنے شاعری فہم دائرۂ احباب میں ایک مقام حاصل کر لیا (یہ بحث الگ ہے کہ اس مقام کی نوعیت کیا تھی) بہرحال ہمارے ان دوستوں کے بقول جنھیں شاعری کی سمجھ بوجھ حاصل تھی اور جن کی بدولت ہمیں بھی ادراک ہونا شروع ہو چکا تھا، ٹی ایس صاحب نے بہت کم عرصے میں ہی شاعری کی ''تیسری دنیا'' میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ انہوں نے مختصر مدت میں ہی شعری اصناف اور رویوں میں کچھ ایسی گراں قدر خوبیوں کا اضافہ کیا ہے کہ اردو شاعری کو سمجھنے والوں کی جان پر بن آئی ہے کہ اس کے کون کونسے پہلو کو پرکھا جائے اور سب سے اہم اور کڑا امتحان یہ تھا کہ اسے کس طرح سے سمجھا جائے کیونکہ ٹی ایس صاحب نے اپنی شاعری میں ندرتِ کلام کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور اس کا معنی اس قدر اتھاہ گہرائیوں کا حامل ہے کہ سر توڑ محنت اور گھنٹوں کی ریاضت اور تشریحی کھدائی کے باوجود بھی نقاد حضرات ان کے کلام کے اصل معانی تک نہ پہنچ سکے۔

کئی مرتبہ درخواست کی گئی کہ جناب معنی کو اتنی گہرائی میں مت پوشیدہ کیا کیجیے کہ کھدائی کے دوران ہی اشعار کی موت واقع ہو جائے۔ مگر اس حوالے سے ان کا نکتہ نظر اس قدر واضح اور بے لچک تھا کہ ہم سب بے بس ہو جاتے۔ وہ فرماتے ''بھائیو! دراصل یہ اشعار عوام کی تخلیقی امانت ہیں، میں ان میں کسی قسم کی قطع و برید کرنے کے لائق نہیں۔ جس حالت میں ان کی درآمد ہوتی ہے، اسی طرح میں انھیں برآمد کر دیتا ہوں، لہٰذا مہربانی فرما کر آئندہ اس قسم کے مشوروں سے اجتناب ہی کیجیے۔'' کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ معلوم نہیں انہوں نے یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا ٹھیکہ کس بنیاد پر لے لیا ہے کیونکہ جیسا کہ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ وہ قطع و برید کے لائق نہیں تو بالکل درست ہی فرمایا ہے۔ بہرحال، جلد ہی ان کا ایک ایسا شعر منظر عام پر آیا کہ جس نے ہماری سوچ، فہم، اور ادراک پر ایک تہلکہ خیز پُر رعب سکوت طاری کر دیا اور ہم اس شعر کی بے انتہا، لامحدود اور آفاقی نوعیت کی بے معنویت کے سحر میں کھو گئے۔ شعر کچھ یوں تھا:

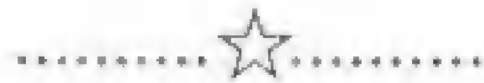
گراں نہیں اسے کیوں چلے آنا کیوں یکتا کا بے شمار نہیں آیا

اس شعر نے ایک لامتناہی بحث کو جنم دیا۔ دونوں مصرعوں میں علیحدہ علیحدہ بھی اور پھر بطور شعر بھی، اس قدر بے معنویت پائی جاتی ہے کہ اس کے حقیقی مطلب کو پالینا ایک چیلنج بن گیا۔ کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اگر جناب کی طبیعت پر گراں نہ

گزرے تو اس کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ کچھ اس طرح کر لیں:

گراں نہیں کیوں، اُسے چلے آنا   یکتا کا بے شمار اب تک نہیں آیا

اس تبدیلی سے خیر بے معنویت پر تو کچھ خاص اثر نہیں پڑے گا مگر ''کیوں'' کی تکرار ختم ہو جائے گی۔ لیکن ٹی ایس صاحب کسی بھی قسم کی تبدیلی کو ادبی خیانت تصور کرتے ہیں، لہٰذا ہم کم از کم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس شعر کی اصل اور واحد خوبصورتی اس کا ''اوریجنل پن'' ہے، جو کہ برقرار ہے۔ ٹی ایس صاحب اگر فرماتے ہیں ''مجھے شاعری کا جنون ہے۔'' تو بالکل بجا فرماتے ہیں کیونکہ اس قسم کی شاعری صرف اور صرف جنون کی حالت میں ہی کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس کا قاری اس کی بے معنویت پر اگر زیادہ توجہ دے تو وہ بھی اس کی حقیقت پاتے پاتے جنون میں مبتلا ہو سکتا ہے اور دیوانہ وار جنگلوں اور صحراؤں میں باآواز بلند شعر دہراتا بھٹک سکتا ہے۔ یہ یقیناً کسی کے فن کی معراج کہی جا سکتی ہے۔ مان گئے صاحب! آپ تو بہت ہی بڑے شاعرِ بے معنویت قرار پائے ہیں!! واہ بھئی واہ!!



''ندیم قاسمی کالم'' (ایک اقتباس - ''غلط اندیشیاں'' سے

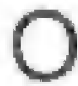
عرب ممالک کے تیل کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ ''ارے جناب۔ عرب ممالک کو اللہ تعالیٰ نے تیل کی صورت میں اتنی دولت دے رکھی ہے کہ چاہیں تو پورا کرۂ ارض خرید لیں!''..... ایک سیدھے سادے بزرگ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ بولے۔ ''تیل صرف عرب ملکوں کی خصوصیت نہیں۔ خود ہمارے گاؤں میں تیل نکلتا ہے۔'' ساری محفل ہکا بکا رہ گئی۔ ''آپ کے گاؤں!'' —— وہ بولے۔ ''جی جہاں۔ نورے تیلی کا کولھو پچھلی ایک صدی سے تیل نکال رہا ہے۔ میں اپنے سر میں اسی کولھو کا تیل لگاتا ہوں!''

باڈی بلڈر کی انجمن کے دفتر میں نہایت صحت مند اور پہلوان قسم کے چند نوجوان بیٹھے تھے' جب ایک دُبلے پتلے صاحب داخل ہوئے اور بولے۔ ''آپ میں سے باڈی بلڈر کون ہے؟'' سب نے کہا کہ ہم سب باڈی بلڈر ہیں۔ وہ صاحب یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ بولے'' مجھے تو صرف ایک باڈی بلڈر کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے سب سے اچھا باڈی بلڈر کون ہے؟'' سب نے ایک نوجوان کی طرف دیکھا جو مسکرا کر آگے بڑھا اور بولا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اور وہ صاحب بولے۔ ''میں نے دو نئے ٹرک خریدے ہیں۔ ان کی باڈیاں بلڈ کرنی ہیں۔ دونوں باہر کھڑے ہیں مگر یاد رکھئے لکڑی خراب استعمال ہوئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا!''

بابا جی شہر میں آئے اور اپنے بیٹے سے ملنے ضلع کچہری پہنچے۔ ایک اہلکار سے اسحاق حسین کا پوچھا۔ وہ بولا۔ ''ادھر گیلری کے آخری کمرے میں چلے جایئے اور اسحاق حسین ڈی سی کو پوچھ لیجئے۔'' بابا جی کو چکر سا آ گیا! ڈی سی! یعنی اسحاقا ایک دم ڈپٹی کمشنر بن چکا ہے اور گھر میں ہر مہینے وہی چند روپلی بھیجتا ہے۔ سخت غصے میں وہ اسحاق حسین ڈی سی کے کمرے میں پہنچے۔ بولے۔ ''تم آج کل ڈی سی ہو؟'' اسحاق حسین نے عرض کیا۔ ''جی ہاں۔ آج کل یہی مصیبت گلے پڑی ہوئی ہے۔'' بابا جی بولے۔ ''مصیبت؟ ارے بدنصیب! ڈپٹی کمشنری کو مصیبت کون کہے گا!'' اسحاق حسین سب سمجھ گیا۔ بولا۔ ''جی میں ڈپٹی کمشنر والا ڈی سی نہیں ہوں۔ ڈسپیچ کلرک والا ڈی سی ہوں۔''

(''کیسر کیاری''۔ احمد ندیم قاسمی)

سید ضمیر جعفری



نہ قالینوں میں ہوتی ہے، نہ دستاروں میں ہوتی ہے
بشر کی آبرو کچھ اور معیاروں میں ہوتی ہے

نہیں دیکھی تو دیکھو! میرے شہکاروں میں ہوتی ہے
جو مایوسی قریب المرگ بیماروں میں ہوتی ہے

ہماری عاجزی کی خُو پہ وہ بیگانہ خُو بولا
یہ وہ خوبی ہے جو خستہ نمک پاروں میں ہوتی ہے

چلو اچھا ہوا، ناداں ہیں وہ، کم فہم ہوں میں بھی
غلط فہمی، ہمیشہ دو سمجھداروں میں ہوتی ہے

کوئی رومیؔ، کوئی رازیؔ، کوئی اقبالؔ پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی، ان کے میناروں میں ہوتی ہے

چمک، تعلیم سے انسان میں آتی تو ہے، اب بھی
مگر، دل سے زیادہ آگ رخساروں میں ہوتی ہے

عجب کیا ہے جو بچے برق ہیں فہم و فراست میں
میاں بیوی کی بحث اب روز اخباروں میں ہوتی ہے

ہمیں تو کچھ پتا ملتا نہیں اُن کی طبیعت کا
کبھی تاروں پہ ہوتی ہے، کبھی غاروں میں ہوتی ہے

جنابِ جعفریؔ جو بول کہنا، تول کر کہنا!
کہ تیری شاعری کی بات بازاروں میں ہوتی ہے

ٹالنے کا فن

محمود ریاض

(نوٹ: مشہور امریکی مصنف اور صحافی ڈیل کارنیگی نے جینے کا فن، گفتگو اور تقریر کا فن، دوسروں کو جیتنے کا فن قسم کی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے ''ٹالنے کے فن'' پر مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون سے ادیب اور شاعر خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ دیگر قارئین بھی اگر اعوق پستان اور ستون پوست مغیلاں کے ساتھ استعمال کریں تو شفا کی امید ہے۔)

ایڈیٹر: ''رستم'' کا سالنامہ آ رہا ہے۔

میں: بڑی خوشی کی بات ہے۔

ایڈیٹر: آپ کا مضمون لینے آیا ہوں۔

میں: آپ کی دوست نوازی ہے لیکن آج کل میں کہاں لکھ رہا ہوں، فرصت ہی نہیں اور اگر فرصت نکال بھی لوں تو موضوع رومانی چیز لکھنے کی کوشش کروں تو خواجہ احمد عباس کا ''عشق پر زور نہیں'' پڑھ کر ہمت جواب دے دیتی ہے اور مزاحیہ لکھنے کی کہ مجھ سے پہلے لکھنے والے سب لطیفوں کے مضمون بنا کر قارئین کو پڑھا چکے ہیں۔ نقاد میں بن نہیں سکتا کہ دوسروں کی طرح کوزے میں بند کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ شاعر بننے کی کوشش کی تھی، کچھ غزلیں کہی بھی تھیں، مشاعروں میں بھی پڑھیں، شعر بھی اچھے تھے، داد بھی ملی، پتہ چلا کہ کوئی شاعر غالب نامی دلی میں شاعری کرتا ہے اور خاصے اچھے شعر کہہ لیتا تھا۔ بالکل یہی غزلیں اور اسی ترتیب کے ساتھ میں بھی موجود ہیں۔ ہم نے تو دیکھی نہیں، ممکن ہے سچ ہو۔

ایڈیٹر: یہ سب بہانے نہیں چلیں گے، میں اگلے پیر کو آؤں گا اور مضمون لے کے ٹلوں گا۔

اگلے پیر کو ایڈیٹر صاحب کی آمد

ایڈیٹر: السلام علیکم!

میں: وعلیکم السلام۔ کدھر بھول پڑے؟

ایڈیٹر: بھول پڑے سے کیا مطلب؟...... آج آپ کا مضمون کا وعدہ تھا۔

میں: بھئی وہ ہمارے دوست جمن خان ہیں نا۔ پچھلے جمعے کو ان کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی کبابوں کی ریڑھی تھی۔ دل اور گردے بھی بیچتے تھے اور شعر و شاعری کا بھی بڑا شوق تھا۔ ریڑھی کے دونوں

طرف شعر لکھوا رکھے تھے۔

اس چمن میں کباب کی بو ہے
دل بلبل جلا دیا کس نے

اور

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

ایڈیٹر: یہ سب تو ٹھیک ہے مگر میں تو مضمون لینے آیا ہوں۔

میں: بہت خوب...... بیٹھیے چائے پیجیے۔

ایڈیٹر: نہیں چائے کی ضرورت نہیں میں تو......

میں: لڑکے! ذرا جانا بھاگ کے ایرانی کے ہاں، دو چائے لاؤ لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر: چائے تو خیر تم نے منگوالی ہے تو پی ہی لی جائے گی مگر میں تو اس مضمون کی بات کر رہا ہوں جواب کے ''رستم'' کے سالنامے میں چھپے گا۔

میں: میں نے عرض کیا نا کہ جمن خاں کا دادا اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا (ٹھنڈا سانس بھر کر) جمن سے ہمارے بڑے دیرینہ مراسم ہیں۔ میں اور جمن بچپن میں اکٹھے پتنگ اڑایا کرتے تھے۔

ایڈیٹر: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن اب تو جمن کے دادا کو مرے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ اب مضمون کب ملے گا؟

میں: بس جمن کے دادا کا چہلم ہو جائے تو فراغت سے مضمون لکھوں گا۔

جمن کے دادا کے چہلم کے بعد

ایڈیٹر: پکڑے گئے نا آج۔

میں: جی ہاں، پکڑے تو جانا ہی تھا۔ آخر دن دیہاڑے اتنا بڑا ڈاکہ......

ایڈیٹر: اجی کن کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟

میں: وہی بینک والا معاملہ۔

ایڈیٹر: جی نہیں، میں آپ کی بات کر رہا ہوں کہ آپ پکڑے گئے۔ یہ میرا تیسرا چکر ہے۔

میں: (سنی ان سنی کر کے) لڑکے او لڑکے! ذرا ایرانی کے ہاں سے دو چائے لانا...... لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر: اجی ریاض صاحب! قبلہ میں چائے پینے نہیں آیا۔ آپ سیدھی طرح مضمون نکالیے۔

میں: بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے دنوں سے مجھے ذرا درد ہے۔

ایڈیٹر: درد......؟ کہاں؟

میں: یہ بائیں ہاتھ کو، گردن سے چھ سات انچ نیچے۔

ایڈیٹر: یہ تو دل کی تکلیف ہوئی۔

میں: جی ہاں، خوب یاد دلایا۔ یہ بالکل دل ہی کی تکلیف ہے۔ پچھلے سال بھی ہو گئی تھی اور جناب کرشن جی کے مشورے سے

ٹھیک ہوئی۔

ایڈیٹر: بھلا کیا مشورہ تھا وہ؟ میں نے تو سنا ہے کہ کرشن چندر ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے مگر تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکیم بھی اچھا ہے اور کیا معلوم اصل پیشہ یہ حکمت ہی ہو۔

میں: میں نے پچھلے دنوں کرشن جی کے خط کا جواب تاخیر سے دیا اور حسب ذیل خط لکھا۔

ایک خط

کرشن جی! آداب۔

آپ کا خط ملا تھا۔ جواب میں تاخیر ہوئی۔ بقول کسے ''ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا'' یعنی پچھلے دنوں میں لاہور گیا اور جا کر بیمار ہو گیا۔

لاہور

جی ہاں وہی لاہور جس کے بارے میں اب تک لوگ ''لاہور کی گلیاں'' جیسے مضمون لکھتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پچھلے دنوں لاہور گیا تھا اور وہاں جا کر بیمار ہو گیا۔ وہی میر تقی میر والی بیماری

ع دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

لوگ پتہ نہیں میر صاحب کی اس بیماری کی کیا کیا تشخیصیں کرتے ہیں لیکن میر صاحب بھی میری طرح ہارٹ ٹربل کے مریض تھے۔ لاہور سے میں سیدھا کراچی پہنچا اور یہاں آ کر ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب سے پہلے ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔

وہ بائیس سال کی سرو قد لڑکی تھی۔ گھنی اور دراز زلفیں جو اس کے ٹخنوں سے ذرا ہی اونچی تھیں۔ گورا رنگ، گلابی ہونٹ، سیبوں کو مات کر دینے والے رخسار، وہ اس وقت ہلکی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے تھی جسے دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ساڑھی کونسی ہے۔ تھوڑی میں ایک ہلکا سا گڑھا۔ ہنستی تھی تو رخساروں میں ہلکے ہلکے گڑھے پڑتے تھے۔ مسکراتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے موتیے کے پھول۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور ہائی بلڈ پریشر پایا۔

میرا دوسرا معالج ایک بوڑھا پارسی تھا۔ وہاں مجھے میرا دوست جمن خان ہی لے گیا تھا۔ ڈاکٹر کا چہرہ جھریوں سے بھرا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ تھا۔ سر کے بال سفیدی کے بعد کچھ زردی مائل ہو چکے تھے۔

اس نے سب سے پہلے میری نبض دیکھی (جو چند منٹ پہلے بخوبی چل رہی تھی) اس کا جھریوں بھرا ہاتھ میری نبض پر تھا۔ نظر میز پر رکھے ہوئے ٹائم پیس پر۔

اس نے میرا بلڈ پریشر لیا اور ''لو'' بلڈ پریشر نکلا۔

بات چونکہ خطرناک صورت اختیار کر گئی تھی، لہٰذا ایک تیسرے ڈاکٹر کی آمدنی میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔

یہ ڈاکٹر اگر تو جوان نہیں تھا تو بوڑھا بھی نہیں تھا۔ اگر خوش مزاج نہیں تھا تو زیادہ سڑیل بھی نہیں تھا۔ سر پر بال زیادہ نہیں تھے تو میرے سے گنجا بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی میز صاف نہیں تھی تو زیادہ گندی بھی نہیں تھی۔ اسٹیتھو سکوپ اگر چمک نہیں رہا تھا تو اس پر مکھیوں کے زیادہ نشان بھی نہیں تھے۔

بہر حال ان ڈاکٹر صاحب نے میرا معائنہ کیا تو بلڈ پریشر نارمل پایا۔ ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ دل تو ٹھیک ہے

لیکن دل کے آس پاس جو مسلز ہیں، ان میں درد ہے (ہوسکتا ہے کہ میر تقی میر کے بھی دل کے آس پاس جو مسلز تھے، ان میں درد ہو جسے وہ میری طرح بیماری دل سمجھتا رہا ہو۔)

کرشن چندر کا مشورہ

پیارے ریاض!

دل کا علاج کسی لیڈی ڈاکٹر سے نہیں بلکہ بوڑھے پارسی ڈاکٹر سے ہی کرانا چاہیے۔ انہیں دل کی بیماری دُور کرنے کے نہیں، دینے کے ڈھنگ آتے ہیں۔

ایڈیٹر: مشورہ تو خوب ہے مگر مضمون کب مل رہا ہے؟

میں: مضمون بھی مل جائے گا۔ ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے کہ ''رستم'' میں میرا مضمون نہ چھپے اور میں جو شہرت عام اور بقائے دوام کا بھوکا ہوں ''رستم'' کے لیے مضمون نہیں دوں گا تو...... آپ بیٹھیں چائے پئیں...... لڑکے! ذرا جانا ایرانی سے دو چائے لانا لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر: طے یہ پایا کہ آپ مضمون نہیں دیں گے۔

میں: مضمون کے لیے کون منع کرتا ہے مگر اس غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ دل اور وحشت دل سے بھی تو چھٹکارا ملے۔

ایڈیٹر: اب کیا ہوا؟

میں: مرزا جی بیمار ہیں۔

ایڈیٹر: کون مرزا جی؟

میں: آپ مرزا جی کو نہیں جانتے؟ آیئے آپ کو مرزا جی سے ملاتے ہیں۔

مرزا جی سے ملیے:

مرزا جی کی موجودہ عمر تو پتہ نہیں کیا ہوگی۔ یہ کام تو محکمۂ آثار قدیمہ کا ہے، البتہ وہ ٹھنگنے قد کے دبلے پتلے منحنی سے آدمی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چندھیائی ہوئی آنکھیں، آدھا سر گنجا اور باقی آدھے پر برائے نام بال ہیں۔ چہرے پر جھریاں...... جلد جلد آنکھیں گھما کر باتیں کرتے ہیں۔

اس قصے کا تعلق آج سے نہیں، لہٰذا باقی حلیہ بتانا بے کار ہے اور ویسے بھی راستے میں کبھی مڈبھیڑ ہوگئی تو آپ علیک سلیک کر بیٹھیں گے، لہٰذا محمود ریاض آپ کو اس زمانے میں لے چلتا ہے، جب مرزا جی پر جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی (حالانکہ میرا خیال ہے مرزا جی پر جوانی کبھی پھوٹی نہیں ہوگی کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ مرزا جی کا اس زمانے میں قد بڑا ہو یا جسم بھرا ہوا ہو یا پھر کچھ اور نہیں تو آنکھیں چشم آہو کو مات کر رہی ہوں۔) بہر حال بقول مرزا جی ایک زمانے میں جوانی ان پر پھوٹی پڑ رہی تھی۔ جب مرزا جی نے اپنی جوانی کا اور کوئی مصرف نہ دیکھا تو فوج میں بھرتی ہوگئے۔

انگریزوں کا زمانہ تھا اور انگریز فوجیوں کو کھانا اور وردی کے ساتھ شراب بھی ملتی تھی۔ چنانچہ پہلے پہل جہاں مرزا جی کی ڈیوٹی لگی وہ ایک ریلوے اسٹیشن تھا۔ (آپ اس مضمون کی حد تک اس اسٹیشن کا نام چھانگا مانگا فرض کرلیں) اور مرزا صاحب کا کام اپنی نگرانی میں شراب کی بوتلوں بھری پیٹیاں اتروانا تھا۔

تین چار دن تو مرزا جی اس کام کو چپ چاپ کرتے رہے لیکن مرزا جی کو اس حرام چیز سے نفرت تھی، لہٰذا وہ کہیں سے

ریلوے لائن کا ایک چھ فٹ لمبا ٹکڑا اٹھا لائے اور ریلوے کے ڈبے کے قریب پلیٹ فارم پر رکھوا دیا اور مزدوروں کو سختی سے اس بات کی تاکید کی کہ وہ جب پیٹی لے کر اتریں تو اس ٹکڑے میں پاؤں پھنسا کر گر پڑیں تاکہ حرام چیز کی کچھ بوتلیں ضرور ٹوٹ کر ضائع ہو جائیں لیکن مرزا جی نے اس بات کا اور انتظام کیا کہ یہ حرام شے زمین پر نہ بہہ سکے۔ لہٰذا ایک بہت بڑا لوہے کا ٹب لا کر رکھوا دیا اور مزدوروں کو سختی سے اس بات کی ہدایت تھی کہ وہ بغیر گرے وہاں سے نہ گزریں بلکہ مرزا جی ایک ہنٹر لے کر وہاں کھڑے رہتے تھے تاکہ یہ حرام شے پوری کی پوری بچ کر نہ جا سکے۔ اس طرح شام تک لوہے کا یہ ٹب لبالب بھر جاتا اور مرزا جی کو ایک گونہ سکون ملتا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ اس شراب کا کیا بنے۔ چنانچہ مرزا جی نے ایک ہندو شراب فروش سے پچاس روپے روز کا ٹھیکہ کیا اور یوں یہ شراب بھرا ٹب روزانہ ہندوؤں کا مذہب خراب کرنے کے لیے ہندو شراب فروش کے ہاتھ پچاس روپے روز میں بیچا جانے لگا۔

ہوتے ہوتے اس یونٹ کے ایک سکھ افسر کو اس کی اطلاع ہوگئی تو اس نے مرزا جی سے آدھوں آدھ حصہ بٹانا چاہا۔ مرزا جی نے کہا کہ ساری محنت تو وہ خود کرتا ہے، پھر آدھے حصے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہاں پانچ دس روپے روز کی بات ہو تو سوچا جا سکتا ہے۔ سکھ افسر کو اس پر غصہ آ گیا اور مرزا کو ایک اور اسٹیشن پر تبدیل کر دیا گیا (اس اسٹیشن کا نام آپ بھائی پھیرو سمجھ لیجیے) وہاں مرزا صاحب کو جو کام سونپا گیا، وہ گاڑیوں سے کوئلہ اتروانا اور فوجی افسران کو حسب ضرورت سپلائی کرنا تھا۔

مرزا صاحب سوچ میں پڑ گئے کہ یہ عجیب بات ہے کہ بیچارے مسلمان لکڑیاں جلا کر کوئلہ پیدا کریں اور وہ کوئلہ یہ انگریز استعمال کریں۔ چنانچہ مرزا جی نے پوری گاڑی کا سودا ایک مقامی کوئلے کے تاجر سے کیا تاکہ اس کے ہم وطن بھی یہ کوئلہ استعمال کر سکیں اور رفاہ عامہ کے خیال سے تین ہزار کا کوئلہ صرف آٹھ سو روپے میں دے دیا۔ اس کوئلے کے تاجر کے ٹرک آئے اور گاڑی خالی ہوگئی اور اس طرح مرزا جی بیچارے آنے والی تمام گاڑیاں اتنے سستے داموں بیچتے رہے۔

مرزا جی کے افسران بالا کا خیال تھا کہ کوئلے میں مرزا جی کیا کر سکیں گے، مگر کسی دشمن قوم نے یہ بات مرزا جی کے افسران تک پہنچا دی اور مرزا جی کو چارج شیٹ ملی اور ایک دور دراز مقام پر بھیج دیا گیا جہاں غیر ملکیوں کو فروٹ سپلائی ہوتا تھا۔

مرزا جی کو غیر ملکیوں سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کاغذ پر تو کیلے اور سیب کی سپلائی دکھائی اور انگریزوں سے دام بھی اسی کے وصول کیے لیکن وہ روز چار ٹرک گنڈیریاں اور بیر لے جاتے تھے اور وہ ان غیر ملکی فوجیوں کو دے کر رسید لکھوا لیتے تھے کہ ایک سیر فروٹ وصول پایا۔

یہ بات مدتوں چلتی رہی...... غیر ملکیوں کے جبڑے گنڈیریاں کھا کھا کر تقریباً چھل گئے تھے۔ وہ بیچارے اس کو اس ملک کا فروٹ سمجھ کر کھا لیتے تھے لیکن ان میں سے ایک بدمعاش کو تھوڑی سی شد بد تھی، اس نے رپورٹ کر دی اور یوں اس قصے کی انکوائری ہوئی۔

مرزا جی نے وہ واچر پیش کر دیے جن پر ایک ایک سیر فروٹ کی رسید تھی۔ افسران کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ آخر چونگی کے محکمے سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ گنڈیریوں اور بیروں کے ٹرک کے علاوہ اور کوئی چیز اس راستے سے نہیں گزری اور ایک بار پھر بیچارے مرزا جی ایک دور مقام پر بھیج دیے گئے جہاں ہاتھیوں کی دیکھ بھال ہوتی تھی۔

مرزا جی بیچارے یہاں بالکل مجبور ہو کر رہ گئے لیکن انہیں پتہ چلا کہ فلاں ریاست میں اور سب کچھ تو ہے لیکن مہاراجہ کی سواری کے لیے ہاتھی نہیں ہے۔ چنانچہ مرزا جی چھٹی لے کر فلاں ریاست میں گئے اور مہاراجہ سے ہاتھی کے بارے میں بات

جیت کی اور پچاس ہزار کا ہاتھی صرف بیس ہزار میں دے ڈالا۔

مرزا جی نے ریاست کے دو آدمی ساتھ لیے اور ایک دن ہاتھی ان کے سپرد کر کے اپنی ڈیوٹی میں تندہی کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ جب مرزا جی کو یقین ہو گیا کہ ہاتھی بخیر و خوبی ریاست میں پہنچ گیا ہو گا تو مرزا جی ہاتھی کی گمشدگی کی پرچی بنا کر افسر کے سامنے لے گئے۔ وہاں یونٹوں میں اگر کوئی معمولی چیز مثلاً چمچ، گلاس، پتی یا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز گم ہو جاتی تھی تو ایک قسم کی سلپ رکھی جاتی تھی۔ اس میں چیز بھر کے افسر کے سامنے پیش کر دی جاتی تھی اور افسر تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد اس پر دستخط کر کے داخل دفتر کر دیتے تھے۔

انگریز افسر نے جب پرچی پر ہاتھی لکھا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہاتھی گم کیسے ہو گیا۔

مرزا جی نے کہا "بس جی سمندر پر پانی پینے گیا اور وہاں دلدل میں پھنس گیا۔ میں بہتیرا امداد کے لیے چلایا لیکن کوئی مدد کو نہ آیا اور بیچارہ ہاتھی دلدل میں غرق ہو گیا۔"

یہ بیان دیتے ہوئے مرزا جی کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی امڈ آئے تھے۔ انگریز افسر بھی مرزا جی کی طرح رحم دل تھا۔ اس نے فوراً اس سلپ پر دستخط کر دیے اور پرچی داخل دفتر ہو گئی۔

ایڈیٹر: مرزا جی سے تو ملاقات ہو گئی لیکن مضمون کہاں ہے؟

میں: (سنی ان سنی کر کے) لڑکے! ذرا جانا ایرانی کے ہاں سے دو کپ چائے لانا...... لیکن ذرا کڑک ہو۔

ایڈیٹر: چائے تو خیر پی لی جائے گی لیکن مضمون......؟

میں: مضمون؟ وہ بھی مل جائے گا مگر یہ تو کہیے کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

..........☆..........

اختلافات وتاثرات

ڈاکٹر سلیم اختر، الطاف فاطمہ، جمیل الدین عالی، آصف ثاقب، پروفیسر قیصر نجفی، طالب انصاری، میجر شہزاد نیر، ڈاکٹر نجیب جمال، شہاب صفدر، صفدر ہمدانی، ڈاکٹر نگہت نسیم، عبداللہ جاوید، سلطان سکون، پروفیسر صوفی عبدالرشید، شہناز خانم عابدی، ہارون الرشید، ڈاکٹر مسرور احمد زئی، عزیز اعجاز، نوید سروش، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، طاہر نقوی، صفدر سلیم سیال، ڈاکٹر نثار ترابی، صلاح الدین ایوبی، انیل چوہان، اطہر جعفری، سرفراز زاہد، تنویر ظہور، زید اللہ فہیم، رفعت مرتضیٰ، اظفر جمیل۔

☆...... ''فنون'' ملا۔ گویا قاسمی صاحب سے ملاقات ہوگئی، وہی اسلوبِ ادارت اور وہی نگاہِ انتخاب!

نامساعد حالات میں آپ جس احسن طریقہ سے ''فنون'' شائع کر رہی ہیں اس کی داد تو ملنی چاہیے آپ کو، مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ قاسمی صاحب کے زمانہ میں جو حضرات مستقلاً ''فنون'' میں لکھتے تھے، ان سب کا تعاون آپ کو حاصل ہے۔ محمد ارشاد، مشکور حسین شاد، ظفر سپل، جلیل عالی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، گلزار، امجد اسلام امجد، شبنم شکیل، احمد عقیل روبی، نجیب احمد، ایوب خاور، محمد کاظم، منو بھائی جبکہ محمد خالد اختر کا ''چند پاکستانی پرندے'' دوبارہ شائع کر کے آپ نے انہیں بھی اسی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

''اقبالیات'' اور ''مضامین'' دونوں کی ذیل میں مقالات خوب ہیں کہ پُرمعنی ہیں۔ البتہ شبنم شکیل نے ''سچے گیت کی گونج'' لکھ کر حیرت زدہ کر دیا، انہوں نے اس ضمن میں روزنامہ ''جنگ'' میں بھی مضمون لکھا تھا۔ جدت پسند شبنم شکیل کی جدت پسندی کا یہ مظاہرہ اچھا لگا۔

بحیثیت مجموعی تازہ شمارہ نہ صرف یہ کہ معیاری نگارشات کا حامل ہے بلکہ گزشتہ شماروں کے مقابلہ میں ''بہت بہتر'' ہونے کا بھی احساس ہوتا ہے۔

قاسمی صاحب کی تصاویر بہت اچھی لگیں۔ بالخصوص اپنے نواسے نیّر حیات کے ساتھ۔ پیٹ پر نواسے کو بٹھائے ایک بڑا ادیب نہیں بلکہ محبت کرنے والا نانا نظر آتا ہے۔

آپ نے یہ اچھا کیا کہ محمد خالد اختر کا ''فنون'' میں مطبوعہ طنزیہ مضمون دوبارہ شائع کر دیا۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے اور ماضی کے ''فنون'' سے معیاری، دلچسپ اور یادگار تحریریں شائع کرتی رہیے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر۔ لاہور)

☆ ـــــ اس سہ ماہی کا ''فنون'' ملا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فنون بالکل زندہ و پائندہ ہے۔ وہی پہلی سی آن بان، وہی معیار اور وہی سلیقہ۔ فنون کے دیرینہ اور عالی قدر اہل قلم کا قافلہ جو وقتی اور حادثی غبار وقت کی زد میں آ کر اوجھل ہوتا اور بکھرتا محسوس ہو رہا تھا، ان کو ان کی ڈگر پر واپس لانے کا کام تم نے اور نیر نے کس سلیقے سے کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نئے اور دور افتادہ براعظموں کے اہل قلم کو بھی ان کی راہ دکھا دی ہے اور کس سلجھاؤ، سلیقے اور ترتیب سے۔ ان تخلیقات کے بارے میں نہ ہی کسی کو اور خصوصاً مجھ جیسی تنقید کے کوچے سے نابلد کو ان کی تعریف و تحسین کا حق نہیں ہر تخلیق اپنی جگہ خود حُسن ہے۔

البتہ نیر کے اداریئے کے بارے میں تو کچھ کہنے کا حق مجھے پہنچتا ہے۔ ناہید سچ کہتی ہوں کہ اس لیے نہیں کہ وہ تمہارا بیٹا یا قاسمی صاحب کے خانوادے کا فرد ہے...... ایک نو وارد اور نوخیز مدیر کی حیثیت سے میدانِ ادارت میں پہلا مثبت قدم (میں پچھلے عبوری دور کے دو اداریوں کو پہلا قدم نہیں سمجھتی) اتنا وقیع اور بھرپور اجمال و اختصار سے مزین اپنے موروثی انکسار کے باوجود متانت و بردباری کے ساتھ ساتھ ہر بات کہہ جانے کا انداز اس کے اپنے اور ذاتی وصف کی غمازی کر رہا ہے۔ نیر کے اداریئے کے علاوہ میں فنون کے مشمولات میں سے صرف ایک یعنی طاہرہ اقبال کے ناولٹ کے پہلے حصے کے بارے میں حرف زنی کی جرأت کر رہی ہوں۔ میں نے اس سے پہلے بھی ان کے کئی طویل افسانے پڑھے ہیں مگر یہ ان کے ناولٹ کا ابتدائی باب اس کے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ ان کا گراں...... تو بس ایں چیزے دگر است۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے قلم میں نہ اتنی طاقت ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کہ میں اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت کر سکوں۔ کوئی ایک بات ہو تو مجھ جیسی کوتاہ قلم کے قابو آئے۔ کیا سراسر فصاحت و بلاغت، کیا گاتی گنگناتی مدھر عبارت ہے، جس کی لہروں کا سارا اتار چڑھاؤ اور بدلتے تیوروں کا بیان طاہرہ کے قلم کی کرامت کہی جا سکتی ہے۔ ''گراں'' زندگی کے ایک ایک پل بدلتے روز و شب کے جلو میں لمحہ لمحہ بدلتی موہوم سے موہوم کیفیتوں کا بیان پوری رنگارنگ جزئیات اور صوتی تاثرات قائم کرنا، اس انداز کی خلاقی اور تخلیقی ہنر کسی کسی کا ہی نصیب ہوتی ہے۔ ''گراں'' ناولٹ کیا ہے، ایک جدید میورل ہے جس میں رنگ بھرنے والی کے قلم (قلم ہے یا موقلم) نے گراں اور اس کے تناظر میں پھیلی کو ہی نباتی اور حیاتی زندگی کے خفیف سے خفیف گوشے کو نظر انداز نہیں کیا۔ حد یہ کہ چُو ہے کہ ٹھہرے پانی کی تہہ میں جمی کائی کی تہہ سے پھوٹتے پودوں اور کناروں پر لٹکتے جالوں کے کتھئی رنگ اور لمبی لمبی ٹانگوں والے مینڈکوں کے رنگوں کو بھی نظر انداز کرنے کا کیا سوال، وہ تو مکئی اور باجرے کی گرم گرم بھاپ چھوڑتی روٹیوں پر مکھن کی سفید جھاگ سے پگھلتی رنگتوں کو بھی رنگ دیتی ہیں۔ میں کہتی ہوں اس خاتون نے اپنی نوک قلم کے اندر کتنے پیلٹوں اور رنگ کی کتنی پیالیوں میں کیسے کیسے اور کتنے رنگ بھر رکھے ہیں۔ کبھی پھلاہی کی لکڑی کے کوئلوں کی آگ پر جمی سفید راکھ ہے۔ کہیں کہیں مونگ پھلی کے کھیت کھودنے اور سرخ سرخ مٹی پر چھائی ہری ہری بیلوں کے رنگ ہیں۔ میں خود سے پوچھتی ہوں۔ اور پھر اس تمام رنگارنگ بنت کے تار و پود سے بنتی اور ابھرتی ہوئی ''گراں'' زندگی کی ہمہ رنگی کہانی۔ حرکات و جزئیات کی خفیف سے خفیف کیفیت کو ایک راگ ایک لے، سُر اور رنگ کے ساتھ کہانی میں سراسر بغیر تکلف یا کسی کوشش کے سموتے جانا۔

اور طاہرہ کا ذخیرۂ الفاظ ہے۔ مجھے تو انشاء کی رانی کیتکی کے بعد اسی ڈکشن نے متاثر کیا ہے۔ بس اب کیا کہوں اور کیا لکھوں، میرے قلم میں تو یہ سکت نہیں۔ اس ظالم نے تو رفتہ و گزشتہ کو حال اور آنے والے وقت کو اس طور اور انداز سے پاپیا کیا ہے کہ ہر زمانے کے قدموں کی چاپ آنے اور گزر جانے والے سایوں کے موہوم مسکن اس طرح موجود ہیں کہ کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے تاثرات صحیح ہیں یا غلط، پر میں نے اس کو پڑھ کر یہ دعا کی ہے کہ اس اسٹیج پر آ کر زندگی پر

بھروسہ کرنا عقلمندی نہیں مگر یا اللہ اس ناولٹ کو مکمل طور پر پڑھنے کے لیے ضرور زندہ رکھنا۔

(الطاف فاطمہ۔ لاہور)

☆...... ''فنون'' لاہور خاص شمارہ سالنامہ چار سو چھ صفحے میں ایک بار پھر بہتر ادب کے بہت سے نمونے پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مسلسل ترقی دے، آمین۔ اس شمارے میں جناب حسن رحمان نے لیو ٹالسٹائی کا اہم (بہت ہی اہم) قول نقل کیا ہے۔ اس پر خوب غور کیجیے گا۔ مجھے تشریح نہیں کرنی ہے۔

''مستقل انقلاب صرف ایک ہے اور وہ ہے اخلاق یعنی وہ ہے ہمارے ضمیر کی تشکیل نو۔ یہ انقلاب کیسے آئے گا؟ کوئی نہیں جانتا مگر ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ اس کے اپنے اندر کیسے آئے گا لیکن اس کے باوجود ہر شخص دنیا کو بدلنا چاہتا ہے اور کوئی بھی خود کو نہیں بدلتا۔''

''فنون'' انہی عظیم روایات کے مطابق ایک بڑا بیش قیمت نمونہ ہے۔ بہت حسن و محنت کے ساتھ لکھے ہوئے مواد کا۔ میر کاروان ''فنون'' جناب احمد ندیم قاسمی کے جانشینوں نیر حیات قاسمی اور ڈاکٹر ناہید قاسمی (مدیران) کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اردو ادب کے ذریعے پاکستانی زندگی کو اتنا بڑا تحفہ ملتے رہنا ہماری خاص الخاص خوش قسمتی ہے۔ (۱) ''حمد و نعت'' تازہ۔ (بارہ) (۲) ''احوالِ وطن'' تین (۳) ''اقبالیات'' تین (۴) ''مضامین'' چار (۵) ''فن اور فنکار'' چار۔ (۶) ''نظمیں'' اڑتیس۔ (۷) ''افسانے'' سولہ۔ (۸) ''ناولٹ'' ایک۔ (۹) ''یادداشتیں'' تین۔ (۱۰) ''فنون لطیفہ'' ایک۔ (۱۱) ''عکس ندیم'' آٹھ۔ (۱۲) ''غزلیں'' اٹھہتر (۱۳) ''انشائیہ'' ایک۔ (۱۴) ''فنون قند مکرر'' تین۔ (۱۵) ''روداد''۔ ایک۔ (۱۶) ''اختلافات و تاثرات'' اُنیس شرکاء۔ (۱۷) ''سرورق'' از محترمہ نفیسہ قاسمی بھی بہت خوبصورت اور کئی رنگوں کا ایک نہایت جاذب نظر امتزاج ہے۔ سالنامے کی قیمت تین سو روپے بتائی گئی ہے جو میں تو کہتا ہوں، کم ہے۔ رابطہ 251 بلاک F-2 واپڈا ٹاؤن لاہور۔ الحمدللہ کہ ''فنون'' اپنی روایات قائم رکھے جا رہا ہے۔ اتنی کم قیمت میں اتنا مفید۔ ضروری مواد مجھے تو حیرت انگیز بھی لگتا ہے۔ آگے اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر بہتر یہی ہے کہ آپ خود خرید کر پڑھیں۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ ایسے ''عجیب'' زمانے میں بھی پڑھنے کے لیے ایسا مواد میسر ہو جاتا ہے۔

(جمیل الدین عالی۔ روزنامہ ''جنگ'' کراچی)

☆...... نیا فنون، آب و تاب، رنگ رنگ، حسن و خوبی کے مرقعات سے مزین، متمول اور لائق اعتبار و اعتماد ہو کر پہنچا۔ اس کٹھن کے زمانے میں آپ نے ہمت نہیں ہاری، فنون کو فنون بنا کر پیش کیا۔ گویا دسوں، انگلیاں، دسوں چراغ...... میں یہ تو نہ کہوں گا کہ خوش وقتی بے سابقہ سی خوشی ملی کہ میر کاروان فنون احمد ندیم قاسمی مرحوم کا دور از حد جلیل و جمیل تھا۔ معیارات کا جلال و جمال ندیم ہی کے دم قدم سے رہا۔ بہر نوع آپ نے ندیمیت (ندیمی) کے پر لگا کر فنون کو پرواز دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ فنون متعاقب نہیں دو منزل آگے ہی آگے ہے۔ دریں خورد آپ نے میر کارواں کی استقامت، حسن ادارت اور تواضع کو تعویذِ کرامت بنا رکھا ہے۔ تازہ شمارے میں بھی ندیم کے خصوص میں نگارشات، دل سے نکلی ہوئی آوازوں سے کم نہ تھیں۔ اظہار خلوص و محبت کا ایسا اظہار دل کو لگتا ہے۔ ندیم کی ادبی شخصیت چھوٹے حلقے تک محدود

نہ تھی ۔ ندیم کی محبت ہمہ گیر تھی...... ان کا رتبہ تحریر بندگلی کا پابند نہ تھا بلکہ جذبہ وخیال کی وسیع فضاؤں کو محیط تھا۔ انہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس کی تکمیل میں خون پانی ایک کر دیا۔ سخن میں گل کاری، فن کاری، ریزہ کاری، فسوں کاری مایۂ مباہات ہے۔ ان کے لفظوں میں صباحت، سطروں میں راحت اور قصوں میں حسنِ وضاحت ہے۔ غرض ہر تحریر میں ریاضت کے بلند پایہ پیرائے موجود ہیں۔ سیاسی نظریات سرحدیں عبور کر کے کسی غیر کی جھولی میں نہیں جا پڑے۔ انہوں نے غریب، مزدور، محنت کش کی بات کی تو نظریۂ پاکستان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ پاکستان سے محبت اتنی شدید تھی کہ کسی ''بیرونی'' کے اعتقاد سے ان کی مصالحت قطعی غیر ممکن تھی۔ وطن کے لیے ان کی شاعری انتہائی پُر اثر ہے جہاں سنیے ان کی اس شاعری کا چرچا ہے۔ یہ واقعہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ چند برس پہلے ندیم شدید علیل ہو کر اسپتال میں داخل تھے۔ ان کی عیادت کے لیے ممبئی سے گلزار لاہور آئے تو انہیں ممبئی کے جدید سہولتوں کے اسپتال میں علاج کی مخلصانہ پیشکش کی تو آپ نے فرمایا، میرا مرنا جینا پاکستان کے لیے ہے (وہی قائداعظم والی بات۔ عظیم قائد نے بھی بیرونِ ملک علاج کو مسترد کر دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ میرا علاج جیسے ممکن ہے پاکستان میں ہو) اس واقعے سے متاثر ہو کر میں نے ایک غزل اپنے ندیم کی خاطر کہی تھی جو ''بیاض'' میں شائع ہو چکی ہے۔ اس غزل کے چند شعر ہیں:

برائے ندیم

مری غزلیں، مری نظمیں ہیں اس عنوان کی خاطر
کہ میں وہ شخص ہوں لکھتا ہے جو انسان کی خاطر
میں اس کا دل بڑھاتا ہوں بڑے اخلاص سے لیکن
مری تخفیف کرتا ہے وہ جھوٹی شان کی خاطر
پرائے ملک سے مجھ کو علاجِ دل نہیں کرنا
مرا جینا مرا مرنا ہے پاکستان کی خاطر
در و دیوار پر لکھتا رہا ہوں عمر بھر ثاقب
رہے ہیں ان کہے اشعار کچھ دیوان کی خاطر

ہرگاہ ندیم کی شاعری مذکور ہو تو نعت کی عظمتیں اور نسبتیں بھی سامنے آئیں گی۔ نعت ایسی کہ ذوقِ سلیم پر وارد ہو کر جنت نگاہ اور فردوس گوش بنے۔ میری استدعا ہے کہ فنون کے ہر شمارے میں ندیم ہمارا ندیم حاصلِ زیب و زینت ہو۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی اور احمد عقیل روبی کے مضامین اخلاص مندی اور تعلقِ خاطر کی عمدگی کا نمونہ تھے۔ نعمان منظور کی کتاب ''ایک تھا بادشاہ'' میرے سرمایۂ حیات کا حصہ بن چکی ہے۔ عزیز نے بڑے چاؤ اور لگاؤ سے اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ میں یہ کتاب بار بار پڑھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی کا ارشاد ہے ''جب گرد و غبار چھٹ جائے گا تو ندیم کا روشن روشن چہرہ دور دور (قریب و بعید میں) جگمگانے لگے گا۔'' فنون کے اس شمارے سے جگمگاہٹ سب کے ''مشاہدے'' میں آ رہی ہے۔ آپ ہزارے کے اہلِ قلم کو ان کا حق پہنچا رہے ہیں۔ وہی حق جو فنون کے مدیر کی حیثیت سے احمد ندیم قاسمی نے انہیں ودیعت کیا تھا۔ طالب انصاری نے ہزارے میں عمر گزاری ہے (حویلیاں میں) وہ یہاں کی تازگی، بہار آفرینی، دل نشینی، اخلاص مندی، اپنے خیالوں جذبوں لفظوں میں بھر کر لے گئے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر شاعری کر رہے ہیں۔ چشم بدور۔ دعا ہے کہ خدا فنون کا حامی و ناصر ہو۔

ڈاکٹر ناہید قاسمی بقول ے بارو گر عکس احمد ندیم قاسمی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ندیم کی شفقتیں، نوازشیں، صداقتیں، رفاقتیں کہیں نہیں گئیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کو خدا عمرِ خضر عطا فرمائے۔

(آصف ثاقب۔ بوئی ہزارہ)

☆...... ''فنون'' کی مجبوری کا کرب ان ''فنون'' دوستوں سے پوچھئے جن کے سینے میں اس جریدہ کا لفظ لفظ دل بن کر دھڑکتا تھا اور ہر اشاعت جن کے لیے ایک حیات بخش اور جان افزا ارمغان شعروادب کا درجہ رکھتی تھی۔ عظیم بابا کے سانحۂ ارتحال کے بعد ''فنون'' سے بوجوہ محرومی تو متوقع تھی...... لیکن وہ ایک طویل عرصہ تک کے لیے مقدر بن جائے گی، یہ ہمارے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کیونکہ عظیم بابا کی آغوش علم وادب میں پروان چڑھنے والے ٹیلنٹ سے ہم آگاہ تھے اور اپنے تئیں مطمئن تھے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' جلد کوئی نہ کوئی آفتاب ''فنون'' کی بازیافت کی روشن امید بن کر طلوع ہوگا۔ بہر کیف! قدرے دیر سے سہی لیکن ''دیر آید درست آید'' کی عملی تصویر بن کر ''فنون'' آج ہمارے سامنے ہے...... لطف کی بات یہ ہے کہ ''فنون'' کے افق پر ایک کے بجائے دو آفتاب روشن ودرخشندہ ہیں۔

''فنون'' کے دورثانی کا پہلا شمارہ بصورت ''ندیم نمبر'' منظر عام پر آیا جس کا ہر صفحہ عظیم بابا کے علم وفضل، فکروفن اور بصارت وبصیرت سے مزین تھا۔ اس شمارہ کی ترتیب وتدوین کے سلیقہ پر ہم مرتبین ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نیر حیات قاسمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں...... ''ندیم نمبر'' کے بعد ''فنون'' کے غالباً تین شمارے تاحال شائع ہوچکے ہیں۔ یہ شمارے معیار کے لحاظ سے اس قدر یونیک (Unique) ہیں کہ ''فنون'' کا مخالف کیمپ بھی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکا جبکہ ''موتاج'' کے معیار پر جسے ''فنون'' کا ہم زاد گردانا گیا تھا، اس کیمپ نے عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

افسانوی رنگ وآہنگ میں لکھی ہوئی تحریر ''حرفِ ثانی'' نیر حیات قاسمی کی اخلاص مندی کی مظہر ہے۔ نیر صاحب کے عزائم خوش کن اور ہدایات معقول وگوارا ہیں۔ ''بین السطور'' کے نام سے حسن رحمان نے ایک ایوان علم وآگہی سجایا ہے، جس کے دریچوں سے ان سمیت کئی ایک اہل علم جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مستی وسرمستی میں ڈوبی ہوئی جان کاشمیری کی حمدیہ نظم (ترجیع بند) ''الف سے اللہ'' پنجابی شعری لہجہ کی تمام تر شیرینی اپنے دامن صوت وآہنگ میں سمیٹے ہوئے ہے اور قرأت اول میں ہی عالم جذب وکیف میں لے جاتی ہے۔ یہ نظم رواں اور مترنم بحر کے ساتھ ساتھ ''اللہ اللہ اللہ ہو'' کی نغمہ بار ردیف سے اس نوع کی سرشاری سے ہم کنار کرتی کہ ہم ایسے دنیادار بھی ''آئینہ ہستی'' کے سامنے ''ہو'' کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں

مٹ جائیں ایک پل میں یہ سب خود نمائیاں
ہم آئینے کے سامنے آکر جو ہو کریں

ہمارے نزدیک عظیم بابا کے فن وشخصیت کی معرفت (معرفت اور آگہی میں جو فرق ہے۔ اس سے اہل علم باخبر ہیں) ڈاکٹر ناہید قاسمی کا قابل رشک اختصاص ہے۔ انہوں نے ان کے جہان شعر کی جادہ پیمائی کا آغاز کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہر جا ایک جہان دیگر پائیں گی۔ ان کا پیش نظر مضمون ''وطن کی کہانی...... ندیم کی نظموں کی زبانی'' ایک جہان دیگر کا ہی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس مضمون میں اساطیری انداز سے عظیم بابا کی حب الوطنی کے جذبہ سے مملو نظموں کی بُنت کی ہے۔

لاریب یہ نظمیں وطن عزیز کی ایک اجمالی منظوم تاریخ ہیں۔

جناب ارشاد احمد ''فنون'' کے لیے ہی نہیں ہم سب کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ ان کے قلم میں وہ روشنائی بھری ہوئی نہیں ہے جس کے معنی ہیں ''لکھنے کی سیاہی'' بلکہ وہ روشنائی بھری ہوئی ہے جس کے معنی ہیں ''روشنی''۔ لہٰذا یہ قلم جب صفحۂ قرطاس کو چھوتا ہے تو علم کے اجالے بکھیر دیتا ہے۔ ارشاد صاحب کا مضمون ''اقبال اور علم کلام'' ایک عالمانہ مبحث کا در وا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قبل ازیں بھی اس موضوع پر ''فنون'' میں ایک طویل بحث چلی مگر کسی منطقی انجام تک نہ پہنچ پائی۔ بقول مصنف:

> ''علی عباس جلالپوری کا شمار گزشتہ صدی کے نصف دوم کے شہیر اردو اہل قلم میں ہوتا ہے۔ اس دور کے وقیع ترین جرائد 'ادبی دنیا' اور 'فنون' میں ان کے مقالات ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے اور قارئین پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑتے تھے۔ انہوں نے لکھنے کا آغاز ''ادبی دنیا'' میں کیا اور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک افکار اقبال کے بارے میں سلسلہ وار مقالات لکھے جنہیں پڑھ کر کئی سٹپٹائے اور کئی گڑبڑائے اور بڑبڑائے۔ ''اقبال کا علم کلام'' انہی مقالات کا بصورت کتاب مجموعہ ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے معرکہ آرا ہے کہ ''فنون'' کے صفحات میں ''فلسفۂ اقبال'' کے منتہی بشیر احمد ڈار اور صاحب کتاب کے درمیان کئی اقساط پر مشتمل معرکہ گرم رہا اور بوجوہ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگیا۔ اقبال کے بارے میں مصنف کا موقف یہ ہے کہ اقبال متکلم تھے فلسفی نہیں، البتہ ایک عظیم شاعر ضرور تھے۔''

''اقبال متکلم تھے یا فلسفی'' اس نہایت اہم بحث کا بار دیگر طاقِ ''فنون'' میں چراغ روشن کر دیا گیا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ اہل دانش وبینش کب تک اس چراغ کی لو کو بلند رکھتے ہیں۔

پروفیسر عامر سہیل، اقبال شناس ہیں۔ ان کے مقالہ ''اقبال کا فکری نظام'' (عجمی تصوف کا مسئلہ) کی تیسری قسط زیر تبصرہ ''فنون'' کی زینت ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر صاحب نے تصوف بالخصوص عجمی تصوف کی نسبت سے اقبال کی فکری و نظری جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال عجمی تصوف کے خلاف تھے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے موقف کی اصابت، علامہ کے اردو فارسی کلام کے ساتھ ساتھ ان کے مکتوبات سے بھی ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نازک اور اہم مسئلہ اقبالیاتی ادب میں روایتی نقطہ ہائے نظر کی نذر ہوتا رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل نظر حضرات نے اس مسئلہ کا دقت نظر سے جائزہ لینے کے بعد بیک زبان یہ دعویٰ کیا ہے کہ اقبال اسلامی تصوف میں یقین رکھتے تھے اور عجمی تصوف کو اس کی ضد سمجھتے تھے مقالہ نگار نے ایک موقع پر اسلامی تصوف اور عجمی تصوف کی تفہیم ان الفاظ میں کرائی ہے:

> ''تصوف کی ایسی تعلیمات جو قرآن کے مطابق ہیں اور ''باطنی مفاہیم'' کا تقاضا نہیں کرتیں، وہ سب قابل قبول ہیں لیکن جو تصوف قرآن کے واضح احکامات کو پس پشت ڈال کر باطنی مفہوم پر اصرار کرے قابل مذمت ہے۔ اسی تصوف کو اقبال نے عجمی تصوف کہہ کر رد کر دیا۔''

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ایک ایسے قلم کار ہیں جو اپنی ہر تحریر میں قابل رشک ہیں۔ انہیں ملکی و عالمی ادب کی جس سطح پر جان کاری حاصل ہے اس کا کوئی توڑ نہیں۔ ان کا مضمون ''اردو میں ترجمے کی روایت'' خاصے کی چیز ہے اور ان کے تبحر علمی کی شہادت دیتا ہے۔ ان کی تخلیقات کے پس منظر میں علم و آگہی، فکر و فن، تجربہ و مشاہدہ اور بصارت و بصیرت کی جس وسعت، تعلق اور گیرائی کا احساس ہوتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پیش نظر مضمون میں انہوں نے تحقیق و تنقید کے نئے نئے آفاق کی نشاندہی کی

ہے۔ حیرت انگیزیاں اور تعجب خیزیاں مرزا صاحب کے عمومی علمی و ادبی قرینے ہیں۔

مشکور حسین یاد ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔ زود گوئی اور بسیار نویسی ان کا ایک اضافی وصف ہے۔ ان کی مطبوعات ۵۰ سے تجاوز کر چکی ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، انشائیہ نویس، مزاح نگار، فلسفی اور نجانے کیا کچھ ہیں۔ ان کے یہاں علم و ادب کی ارزانی ہے۔ ان کا خصوص یہ ہے کہ بات سے بات پیدا کرتے ہیں اور پھر اسی کے تناظر میں ایک ایسا سوال اٹھاتے ہیں کہ جواب کے لیے بھی قاری کو انہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے مضمون ''فلسفیانہ ظرافت'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس مضمون میں یاد صاحب نے مرزا غالب کے ایک فلسفیانہ شعر میں ظرافت کا سراغ لگایا ہے اور بجا طور پر یہ کہا ہے کہ ''ظرافت کا تعلق انسان کے ظرف سے ہے۔ اس لیے خواہ کوئی بھی ہو انسان کا ظرف اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔''

جلیل عالی نے ''ندیم کا شعری خصوص'' کے عنوان سے ایک مختصر مضمون رقم کیا ہے جسے عظیم بابا کے جہان شعر و سخن کے تناظر میں ایک غیر معمولی کاوش قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہم جلیل عالی کی صلاحیتوں سے آگاہ ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ اس مضمون میں اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ ان کے مضمون کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں انہوں نے عظیم بابا کی ترقی پسندی کا مشرف بہ اسلام ہونے کا ذکر کیا ہے مگر یہ واضح نہیں کیا کہ اقبال نے اپنی ترقی پسندی کے ابتدائی ایام میں خالصتاً ترقی پسند فکر و فلسفہ کے زیر اثر شاعری کی۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم ۔۔۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔۔۔ کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی ۔۔۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لیکن عظیم بابا نے بھولے سے بھی کبھی اسلام سے عاری ترقی پسندی کے افکار کو اپنے کلام میں پیش نہیں کیا اور یہی وہ دراصل شعری خصوص ہے جو انہیں حاصل ہے۔۔۔۔۔ جلیل عالی نے مضمون کے دوسرے حصے میں عظیم بابا کی کردار نگاری کی ہے جس میں ان کی سیرت کے کسی اختصاص کا تو کھوج لگایا جاسکتا ہے لیکن شعری خصوص کا نہیں۔۔۔۔۔

علی تنہا نے اپنے مضمون ''رفیق خاور جسکانی کی اقلیم شعر'' میں رفیق خاور کی شاعری کا نہایت بالغ نظری سے جائزہ لیا ہے اور انہیں انحراف و اجتہاد کا شاعر قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا ایک نظریاتی (ترقی پسند) شاعر کے طور پر تعارف کراتے ہوئے انہیں ایک رجحان ساز شاعر بھی باور کرایا ہے۔ علی تنہا کو رفیق جسکانی کی غزلوں میں عصری شعور اور تخلیقی تازہ کاری کی یافت ہوئی ہے جبکہ ان کی نظموں میں انہوں نے ترقی پسندی کی فضا اور آہنگ کو محسوس کیا ہے۔

(پروفیسر قیصر نجفی۔ کراچی)

☆۔۔۔۔۔ سہ ماہی ''فنون'' کا خاص شمارہ یعنی سالنامہ باصرہ نواز ہوا۔ زیر مطالعہ رسالہ تو گویا ایک مالا ہے جس میں مختلف رنگوں کے موتی حسن ترتیب سے پرو دیے گئے ہوں۔ حرف ثانی سے لے کر اختلافات و تاثرات تک تمام تحریریں حامل وقعت ہیں۔ ڈاکٹر مظہر شیرانی کے مکتوب سے ''ڈاگ'' لفظ کی معنوی جہتوں کے حوالے سے قابل قدر شناسائی ہوئی۔ امجد اسلام امجد صاحب نے اپنے مضمون میں یہ شعر مذکور کیا

عشق کے ہاتھوں سے نالاں ہیں سبھی خورد و بزرگ

ہیں کلیجے سینکڑوں کھائے ہوئے اس ڈاگ کے

یہ شعر پڑھ کر میں تادیر محو حیرت رہا۔ بار بار یہ خیال آتا رہا کہ قدما ایسے بدذوق تو ہرگز نہ تھے کہ عشق جیسے ارفع جذبے کو انگریزی لفظ ڈاگ سے تشبیہ دے کر مذموم کریں۔ شکریہ جناب مظہر محمود شیرانی صاحب کا کہ انہوں نے میری اس مشکل کو دور کیا اور اردو کے لفظ ڈاگ سے متعارف کرایا۔

پختہ کار تخلیق کاروں کی تحریروں سے مزین ''فنون'' کا معیار دیگر معاصر ادبی پرچوں سے بلند نظر آ رہا ہے۔ کس تخلیق کی تعریف کی جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے، یہ معاملہ اس وقت بہت مشکل ہو جاتا ہے جب مدیر نے تخلیقات کے انتخاب میں کڑے معیار کو ملحوظ رکھا ہو۔ تاہم غزلوں میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی غزل کا ''محیط'' سے انتخاب اور حلیم قریشی، نجیب احمد، نصیر احمد ناصر، سلطان سکون، سید عارف، عزیز اعجاز اور جان کاشمیری کی غزلیں پسند آئیں۔ نظمیں..... گلزار، ایوب خاور، ستیہ پال آنند، شوکت مہدی، احمد حسین مجاہد اور زاہد نبی کی بہت پسند آئیں۔ افسانے سب کے سب اپنے جداگانہ موضوعات کے اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔ سلمیٰ اعوان، افسانہ سومیتا دیدی + اروما مجھے کھینچ کر اس دور میں لے گیا جب محمد طفیل ''نقوش'' نکالا کرتے تھے۔ ''نقوش'' میں بمل مترا کا بنگالی ناول ''کوڑیوں کے مول'' قسط وار چھپا کرتا تھا۔ اسے احمد سعدی اردو کے قالب میں ڈھالتے تھے۔ ناول میں بنگال کے ساحرانہ ماحول، وہاں کے لوگوں کی روایات، رویئے اور بھیگے بھیگے دکھ کو ناول نگار نے کمال فنکاری سے قلم بند کیا تھا۔ ''نقوش'' کے قارئین کو تادیر اس تحریر نے اندر تک شرابور رکھا۔ محترمہ سلمیٰ اعوان صاحبہ کے افسانہ کے آغاز میں بھی مجھے وہی بنگال نظر آیا۔ کانجی وارم کی ساڑھی، بھات، ایلش، ماچھ جیسے الفاظ پڑھ کر میری ماضی بینی کچھ تعجب خیز تو نہ تھی اور ان جملوں نے تو تادیر مجھے رو کے رکھا۔

''رام بنگال کی عورت کو کبھی اچھی روٹی بنانی نہیں آئے گی۔ اب اگر یہ نرم ہوتی تو وہ کم از کم ایک تو کھاتا، یہ اتنی اکڑی ہوئی تو اس کے بوڑھے دانتوں تلے کسی پتھر کی طرح ہی محسوس ہوئی ہوگی۔ آج پانچ دن ہو گئے ہیں تپ چڑھتے ہوئے۔''

مضامین ابھی زیر مطالعہ ہیں۔

(طالب انصاری۔ واہ کینٹ)

☆..... فنون شمارہ ''۱۳۱'' نے سرشار کر دیا۔ مواد اور پیشکش، ہر دو اعتبار سے یہ شمارہ کم و بیش اسی سطح کو چھو رہا ہے جو عارضی تعطل سے پہلے ''فنون'' کی پہچان تھی یعنی یہ شمارہ پڑھتے ہوئے میں معیار تخلیقات کی اس سطح پر رہا جس پر کہ رہا کرتا تھا۔ احباب فنون بھی کم و بیش جمع ہو گئے ہیں۔ لیجیے رہبر جاوداں کا کارواں پھر سے رواں دواں ہوا اور ہو کر رفتار پکڑ چکا۔ سب کو مبارک ہو۔

''حرف ثانی'' اسی اعتماد کے اظہار کا مظہر ہے جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا۔ ''بین السطور'' میں حسن رحمان نے بہت اہم باتیں کی ہیں۔ (ہم تو لفظ اور معنی کی بڑھتی ہوئی مغایرت کے بارے میں پریشان ہیں۔'' (ص ۱۰) انہوں نے درست کہا کہ میڈیا (برقی) نے یہ سب دوریاں پیدا کی ہیں۔ برقی میڈیا پر ایک لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے ''بہت''۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو اور پھر تمام بولنے والوں کو 'جو ہے نا' اور ''جو ہے'' کی بیماری لگ چکی ہے۔ ذرا سی توجہ کر کے سنیے کہ یہ دو جملے کس قدر دہرائے جا رہے ہیں اور بالکل بے معنی طور پر۔ حسن رحمان کی تشویش کا دائرہ البتہ وسیع ہے۔ حضرت جان کاشمیری کی حمد ''الف سے اللہ'' موسیقیت سے لبالب چھلک رہی ہے۔ کیا خوب۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے ''وطن اور اہل وطن سے محبت'' میں

حسن و توازن سے اپنا مطمع نظر بیان کیا ہے یعنی حد سے بڑھی ہوئی قومیت پرستی اور کامل عالمگیریت کے بین بین ایک علاقہ دریافت کیا ہے جو فی الحقیقت اعتدال پر مبنی ہے اور عملی ہے!!! اسی سے منسلک ڈاکٹر ناہید قاسمی کا مضمون ہے جو حسب دستور، محنت اور محبت سے لکھا گیا ہے۔ مدلل اور مناسب حوالوں سے مزین۔

سلسلۂ اقبالیات کا پہلا مقالہ جناب محمد ارشاد نے ''اقبال کا علم کلام'' کے عنوان سے لکھا ہے جس کا مقصد بقول ان کے، اقبال کو فلسفی یا متکلم ثابت کرنے کے بجائے یہ ہے کہ جن دلائل کی بنا پر علی عباس جلالپوری نے اقبال کو متکلم ثابت کرنے کی کوشش کی، وہ یہ کام نہیں کر پائے۔ اگرچہ یہ مقالہ جاری ہے، تاہم میرے ذہن میں یہ استفسار پیدا ہوا کہ کیا فلسفی اور فلسفہ دان میں کوئی فرق ہے؟ یا پھر فلسفہ نگار (بقول مقالہ نگار، ص ۳۰) فلسفہ دان اور فلسفی کے مابین کیا حد فاصل ہے؟

وہ لکھتے ہیں ''(علی عباس جلالپوری) مواقع کے مطابق علم کلام کی تعریف بدلتے رہے۔ کبھی علم کلام کو عقل و نقل میں تطبیق کیا، کبھی موروثی عقائد اور سائنسی انکشافات میں تطبیق اور کبھی مذہبی عقائد اور فلسفیانہ انکشافات میں تطبیق۔'' (ص ۳۷)

مجھے تو یہ تینوں ایک سے لگے اور بہ یک وقت ہر سہ تطبیق ہا، ایک ہی تطبیق میں ڈھلتی محسوس ہوئیں۔ دیکھیے نا۔ نقل = موروثی عقائد = مذہبی عقائد اور عقل = سائنسی انکشافات = فلسفیانہ انکشافات۔ مانتا ہوں کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے لیکن بہرحال بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔

میں نے اپنے ایک سے زائد ان دوستوں سے جو بیرون ملک سے فلسفہ پڑھ کر آئے، یہ سوال کیا تھا کہ کیا عالمی سطح پر بیسویں صدی کے فلسفیوں میں اقبال شامل ہیں؟ جواب ہر بار نفی میں آیا۔ اہم یہ نہیں کہ ہم اقبال کو بڑا فلسفی قرار دے ڈالیں۔ شاید اہم تو یہ ہو کہ اقبال بین الاقوامی طور پر بطور فلسفی فہرست میں شامل ہو۔ محمد ارشاد صاحب سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ''اقبال گری اور اقبال فروشی ایک کامیاب صنعت کا درجہ پا چکی ہے۔'' (ص ۲۹) بہرحال اس مقالے کی تکمیل تک دیکھتے ہیں!

پروفیسر عامر سہیل نے عجمی تصوف اور اقبال کے فکری نظام کے حوالے سے تحقیقی مضمون لکھا تو تصوف کی علمی و تاریخی حیثیت سے ہٹ کر الٰہیاتی، اخلاقی اور شرعی میزان میں رکھ کر Puritanist رویے سے، اول الذکر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ تناسخ، حلول، وحدت الوجود کے افکار کی اب تاریخی، علمی اور فکری اہمیت ہی رہ گئی ہے بلکہ اب تو جملہ الٰہیات ہی عصری بیانیے کے حاشیے میں جگہ پاتے ہیں۔ ایسے میں عامر سہیل ہی بتائیں کہ جہاں ''منظم و مرتب شرعی معاشرے'' رہے وہاں ایجاد و خلق اور فکری کارنامے زیادہ انجام پائے یا جہاں بقول ان کے خالق و مخلوق کا فرق نہ کیا گیا۔ (ص ۵۰) ان معاشروں میں، فی زمانہ جن ممالک نے عجمی تصوف کو نکال باہر کیا (خاص طور پر پہلی عالمگیر جنگ کے دوران) انہوں نے کیا انقلابی عملی کارنامے سرانجام دے دیئے ہیں؟

ڈاکٹر خالد ندیم نے اقبالیات کا ایک اور دریچہ وا کیا ہے۔ عبدالکریم ثمر کے مکتوب میں، یوم اقبال پر، ثمر صاحب کے نظم پڑھنے اور اقبال پر رقت طاری ہونے کا ذکر ہے۔ خالد صاحب نے نہایت مشقت سے حواشی تحریر کیے ہیں اور اسی مکتوب کے حاشیے میں لکھا ہے کہ (حاشیہ نمبر ۱۴) اقبال اس تقریب میں بوجہ علالت شامل نہیں ہو سکے تھے۔ یہ وضاحت بھی انہیں کرنی چاہیے تھی کہ اقبال تو اس تقریب میں موجود نہیں تھے، نظم بعد از آن تقریب، سنائی گئی ہو گی یا پھر...... مرزا حامد بیگ، جلیل عالی اور علی تنہا نے اچھے معلوماتی و تجزیاتی مضامین دیئے ہیں۔ علی تنہا لکھتے ہیں ''ان میں کچھ تو سہلِ ممتنع کی نذر ہو گئے...... ان میں عدم، سیف جیسے لوگ تھے۔'' (ص ۱۱۰) بادی النظر میں یہ گمان گزرتا ہے کہ سہلِ ممتنع گویا کوئی بہت گری پڑی چیز ہے۔ حالانکہ اہلِ نظر

کے نزدیک۔۔۔ سے فنِ شعر میں بہت بلند مقام حاصل ہے!!

ظفر سپل صاحب خالص فلسفیانہ معاملات پر بات کرتے کرتے کہیں کہیں الٰہیات کا چھڑکاؤ بھی کر جاتے ہیں۔ چاہے اس مقام پر جاری فلسفیانہ مباحث میں یہ چھڑکاؤ کام آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ جیسے ''حضرت عمرؓ نے ایک بار کہا تھا، کتب خانوں کو نذرِ آتش کر دو۔۔۔۔'' وغیرہ۔ زیر نظر مضمون میں البتہ وہ افلاطون کے افکار کا اجمالی جائزہ لینے میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اندازِ تحریر دلچسپ اور ترتیب وہ جو مطالعے کو باسہولت رکھے۔ لکھتے ہیں ''ہماری زبانوں میں پلاٹو کو افلاطون سے بدل دیا گیا۔'' (ص ۸۷) میرے ذہن میں کافی عرصے سے یہ سوال موجود ہے کہ ایک زبان سے اسمائے معرفہ دوری زبان میں کب، کیسے اور کیونکر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جیسے قاہرہ (Cairo) حلب (Aleppo) دجلہ (Tigris) اور پھر متی (Mathew) لُوقا، مرقس، یوحنا وغیرہ یا بھر، بھارت (India) شاید کسی مضمون میں اس کا جواب بھی مل جائے۔ بہر حال یہ ایک اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ البتہ انہیں ''عالم پرچھائیں'' کی ترکیب پر غور کر لینا چاہیے۔

گوشۂ نظم حضرت ندیم سے شروع ہو کر غیر حیات قاسمی تک چلتا ہے تو گلزار، ایوب خاور، حلیم قریشی اور آفتاب اقبال شمیم سمیت کئی اہم ناموں سے سجا ہوا ہے۔ اس شمارے میں صفدر صدیق رضی، احمد عقیل روبی، احمد حسین مجاہد، طالب انصاری، آمنہ بہار، عنبرین صلاح الدین، اپنے اپنے انداز میں کامیاب اور دلپذیر اور معیاری نظمیں لائے ہیں۔ عامر سہیل، اسلوب اور مواد کی دلکشی سے گندھی ہوئی نظمیں لائے ہیں کہ یکسر منفرد۔ عامر سہیل کی نظم، ان کی پہچان بن گی ہے۔ ''آ کے دیکھو تو'' اور ''درد کے انبار'' نہ صرف سٹرکچر بلکہ زبان کی سطح پر بھی حد درجہ تخلیقی ہیں!

حصۂ افسانہ سب سے ثروت مند ہے۔ اس شمارے میں نثر (مضامین، فکشن)، شاعری (نظم، غزل) کی نسبت کہیں زیادہ بھرپور ہے۔ آنے والے شماروں میں شاعری کو ''بھراپُرا'' کرنے کی ضرورت ہے۔ مقدار میں نہیں، معیار میں۔

رفعت مرتضیٰ (عورت)، سلمیٰ اعوان (سویتا دیدی + اروما) اور نیلم احمد بشیر (خدا کے سپرد) نے معیاری افسانے عطا کیے ہیں۔ نگہت نسیم (پانی جیسی بیٹی) نے ڈوب کر افسانہ لکھا ہے اور یہ سب افسانے ''فنون'' کی شان بڑھا رہے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے ''بَراں'' لکھ کر ''پوٹھوہار'' کو لکھ دیا ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ ان دنوں کسی نے اتنی باریکی اور ایسی تفصیل سے پوٹھوہار کو لکھا ہو۔ معجزہ ہی کہیں گے۔ زبان، اسلوب اور منظر کی باریکی میں اتر جانے اور اسے Vividly لکھ ڈالنے کا معجزہ۔ طاہرہ اقبال جس خطے کی کہانی لکھتی ہیں اس کی زبان ایسے اردو میں پروتی چلی جاتی ہیں کہ زبان کشادہ ہو جاتی ہے۔ پھر لوک گیت، بین اور اکھان۔ پہلے انہوں نے پنجاب اور جنوبی پنجاب پر زیادہ لکھا ہے اور اب پوٹھوہار۔ بارانی، نیم فوجی مارشل پوٹھوہار جہاں بکریوں کو سردی سے بچانے کے لیے پرانے فوجی کوٹ پہنائے جاتے ہیں۔ شاید ستر کی دہائی کے نصف اول کے ٹائم فریم میں رکھ کر لکھا گیا یہ ناولٹ (یا ناول) خطۂ پوٹھوہار کی اس عہد میں تجسیم بن گیا ہے۔ وہ بھی ایک کہنہ مشق ادیبہ کے قلم سے۔ انہوں نے ''آہین پئی'' کا ترجمہ ''کہر پڑا'' کیا ہے۔ (ص ۲۶۲) یہ ''آہین'' ژالہ باری، اولوں کو کہتے ہیں نہ کہ کہرے کو۔ اسی طرح صوبے دار کے عہدے تک پہنچتے پہنچتے فوجی کی عمر اچھی خاصی اور بچے اچھے خاصے ہو جاتے ہیں۔ صوبیدار کو منگنی شدہ دکھانا عام طور سے خلاف مشاہدہ ہے۔ منگنی تو لانس نائیکی یا نائیکی میں عموماً ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پاک فوج میں افسر کے طور پر شمولیت کے لیے غیر شادی شدہ ہونا بنیادی شرائط میں سے ہے۔ ''جس روز کاکول اکیڈمی جانا تھا، اس سے پچھلی رات ہی تو شکیلہ جان سے نکاح کا جوڑ جڑا تھا۔'' (ص ۲۷۶) ایسی صورت میں تو اکبر خان کو اکیڈمی ہی سے نکال دیا جاتا، کپتان بننا تو دور۔ یہ اور اس طرح کی چند ایک

مزید فروگزاشتیں تو ایک طرف لیکن یہ نہایت عمدہ اور معیاری ادب پارہ ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ اسلام سراج الدین صاحب کو بھی شامل کیا کریں۔ وہ کاروانِ فنون کے مخلص ساتھی ہیں۔ جناب نعمان منظور نے رواں دواں، دلچسپ اور صاف نثر میں ندیم اور دفتر فنون کو مذکور کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ہاشمی میموریل کالج میں ان کا داخلہ کرواتے وقت گلزار وفا چودھری نے میرٹ کو بھی مدنظر رکھا یا محض سفارش کو؟؟ غزلیات ندیم کے بعد نجیب احمد (پہلی غزل) نسیم احمد ناصر، جان کاشمیری، ہارون الرشید (پہلی غزل) احمد حسین مجاہد (پہلی غزل) آغا نثار (دوسری غزل) توقیر ارتضیٰ، عامر سہیل، حسن عباسی (پہلی غزل) مبشر سعید، محمد مختار علی (پہلی غزل) اور زاہد نبی کی غزلوں نے فن و فکر اور طرزِ ادا کے حسن کے باعث متاثر کیا۔ بعض غزلوں میں کچھ تسامحات نظر آئے جیسے جعفر حسین مبارک کے ہاں "نفی" اور غیر حیات قاسمی کی غزل میں "نہ" کے الفاظ کھل نظر ہیں۔ راجہ ریاض الرحمان، محمد کاظم، محمد خالد اختر (موخر الذکر دونوں اشاعت مکرر) کی تحریریں کام کی ہیں۔ اختلافات و تاثرات کا حصہ امید ہے مزید بہتر ہوگا۔ سلطان فریدی کے خط میں صوابی، صوبہ بلوچستان چھپ گیا ہے۔ (ص ۴۰۳) صوابی صوبہ خیبر پختونخواہ میں ہے۔
(میجر شہزاد نیر۔ کوٹلی، آزاد کشمیر)

☆..... سہ ماہی فنون، لاہور، اردو زبان و ادب کی روایت میں ایک ایسا سنگ میل ہے جسے ایک نشانِ منزل کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ گزشتہ پانچ، چھ دہائیوں میں رسالہ "فنون" نے اردو زبان و ادب سے وابستہ کئی نسلوں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں شائع ہونے والے "فنون" کے آخری شمارے میں جن دو کتابوں پر ان کے تبصرے شائع ہوئے تھے ان میں دوسرا تبصرہ راقم الحروف کی کتاب "ندوۃ الخلیل" پر تھا جس کی وجہ سے راقم کا استنباط یہ ہے کہ ندیم صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی آخری تحریر یا آخری تبصرہ کا شرف راقم کی کتاب کو حاصل ہے۔ خیر یہ ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ "فنون" کا تازہ شمارہ نمبر ۱۳۱ جو خاص شمارہ بھی ہے، اب اس کے تازہ دم مدیران نیر حیات قاسمی اور ڈاکٹر ناہید قاسمی کی کاوشوں کا ثمر اور احمد ندیم قاسمی کی قائم کی ہوئی روایت کا ہی تسلسل ہے۔ ۶۰۸ صفحات پر مشتمل اس تازہ شمارے میں جہاں احمد ندیم قاسمی کا نقش ایک ایک صفحے پر دکھائی دیتا ہے وہاں مستقل روایات کا حامل یہ شمارہ بھی کچھ سینئر اور کچھ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے مزین ہے۔ اس شمارے میں بھی حسب معمول حمد و نعت کا ابتدائی حصہ خاصا جاندار ہے اور اس میں بھی کچھ ایسے نام نظر آتے ہیں جو آئندہ ادب کے حوالے سے اپنی پہچان قائم کریں گے۔ دوسرا حصہ "احوالِ وطن" کے موضوع پر جس میں احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم "غم وطن" اور ایک مضمون "وطن اور اہل وطن سے محبت" قند مکرر کے طور پر شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ناہید قاسمی کا ایک مضمون بعنوان "وطن کی کہانی ندیم نظموں کی زبانی" ندیم کی نظموں کے حوالے سے ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے جس میں ندیم نے وطن سے محبت کو ایک نئے پن سے روشناس کرایا ہے۔ خاص طور پر ان کی پُر تاثیر نظم "وطن کے لیے ایک دعا" جو مارچ ۱۹۸۰ء میں لکھی گئی تھی، کے حوالے کے بغیر تو اردو کی قومی و ملی شاعری پر لکھا گیا کوئی مضمون اور کوئی کتاب مکمل نہیں ہو سکتی۔ "اقبالیات" کے حوالے سے بھی تین مضامین اس شمارے میں شامل کیے گئے ہیں جن میں "اقبال کا علم کلام" از محمد ارشاد "اقبال کا فکری نظام" از پروفیسر عامر نہایت درجہ فکر انگیز ہیں اور ایک بڑے کینوس پر اقبال کے مذہبی افکار اور عجمی تصوف کے مسئلے کو بنیادی نقش کے طور پر ابھارتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد ندیم کا مضمون "چند اقبالیاتی مکاتیب" اردو میں مکتوب نویسی کے امکانات کے ساتھ ساتھ تفہیم اقبال کے حوالے سے اقبال کے بارے میں بعض نئے حقائق کی طرف

متوجہ کرتا ہے۔ مضامین کے حصے میں چار مضامین شامل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مضمون ''اردو ترجمے کی روایت'' اس سلسلے کا پہلا مضمون ہے۔ جس میں اردو میں ترجمے کی مکمل روایت کا احاطہ محض بارہ صفحات میں کر دیا گیا ہے۔ یہ اجمالی خاکہ اس موضوع پر بلیغ اشارے فراہم کرتا ہے۔ مشکور حسین نے ایک بالکل نئے موضوع ''فلسفیانہ ظرافت'' کو چھیڑا ہے۔ یہ موضوع اردو میں ایک بڑی ریسرچ کا عنوان بن سکتا ہے۔ جمیل عالی نے ''ندیم کے شعری خصوص'' کو موضوع بنایا ہے، جس میں ندیم کی مرکزی تخلیقی واردات کا سراغ لگانے کی کوشش ملتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ندیم کی توحید پرستی، نعت گوئی، انقلابیت، حق گوئی، استعمار دشمنی، احساس جمال، اس کی ناقابل شکست رجائیت اور ہمالیہ سے بلند و مضبوط پاکستانیت کو مرکز توجہ بنایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے اپنے تاریخی ادبی جریدے ''فنون'' کے ذریعے جینوئن تخلیق کاروں کو متعارف کرانے اور صحت مند ادبی و جمالیاتی قدروں کو فروغ دینے کا غیر معمولی کام کیا۔ ظفر سپل نے لاطینی، یونانی اور مغربی فلاسفہ کے علاوہ مسلم فلسفے کی تاریخ کو مستقل طور پر اپنی تحقیق کا موضوع بنا رکھا ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے افلاطون کو پہلے ''شہر خیال کا نقش گر'' کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے افلاطون کے بارے میں الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ کی اس رائے کو اپنے مضمون کی اساس بنایا ہے کہ ''انتہائی محتاط الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی فلسفے کی پوری روایت افلاطون کے کام پر فٹ نوٹس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس کے بعد سارا مضمون افلاطون کے علمی و فکری کمالات کے علاوہ افلاطون کے اس شہر خیال کی تاویلات کو سامنے لاتا ہے جس کے مطابق افلاطون نے اس شہرِ بے مثال کے دروازے پر جلی حروف میں لکھوایا تھا ''وہ شہر جس میں سے ''شاعر'' کو دیس نکالا دے دیا گیا۔'' افلاطون کا نظریہ مثال، نظریہ علم، نظریہ بقائے روح، نظریہ اخلاق بھی مضمون کے موضوعات خاص ہیں۔ ''فن اور فنکار'' فنون کا مستقل سلسلہ ہے۔ اس مرتبہ اس میں عابد وددو کے شعری مجموعے ''کڑی دھوپ کا مسافر'' ظفر سپل کے حوالے سے مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقاء، رفیق خاور کی اقلیم شعر اور اعجاز رضوی کی خاکہ نگاری پر بالترتیب معروف لکھنے والوں ڈاکٹر نثار ترابی، خورشید بیگ، علی تنہا اور عارف محمود کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

نظموں کے حصے میں کئی جانے پہچانے اور کئی نئے لکھنے والوں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اسی طرح افسانے کا حصہ حسب معمول سینئر اور نئے لکھنے والوں کی تخلیقات سے آراستہ ہے۔ اس مرتبہ طاہرہ اقبال کے ناولٹ ''گراں'' کی پہلی قسط بھی ''فنون'' کا حصہ ہے۔ طاہرہ اقبال اردو کے نئے افسانے کے حوالے سے جانا پہچانا نام ہے۔ ''گراں'' پوٹھوہاری زبان میں گاؤں کو کہا جاتا ہے۔ اسی پس منظر میں ''عورت'' کی ازلی و ابدی پہچان کے حوالے سے یہ ایک موثر تحریر ہے جس کا گداز تحریر کی ہر سطر میں ہے۔

''فنون'' میں یادداشتوں کا حصہ بھی خوب ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے پوتے ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ''سانجھ بھئی چودیس'' میں ندیم صاحب کی خوش مزاجی، زندہ دلی، دردمندی، معاملات حسن ظن اور مولانا حسرت موہانی سے ندیم صاحب کی ملاقات کی خوبصورت تصویریں بنائی ہیں۔ احمد عقیل روبی نے ''جب وہ یاد آتے ہیں'' میں ٹالسٹائی کے بارے میں چیخوف کی میکسم گورکی سے کہی اس بات کو بنیاد بنایا ہے کہ ''جب کسی ادب میں ٹالسٹائی جیسا ادیب موجود ہو تو اس عہد میں کسی بھی آدمی کا ادیب بننا بڑا آسان ہے۔'' دیکھا جائے تو ہمارے دور میں یہ کریڈٹ صرف اور صرف احمد ندیم قاسمی کا حق ہے۔ احمد عقیل روبی نے اس مضمون میں ندیم صاحب کے سفروں اور مشاعروں، محفلوں کی یاد کو زندہ کیا ہے۔ ''ایک تھا بادشاہ'' نعمان منظور کی زیر طبع کتاب کا تیسرا اور چوتھا باب ہے۔ اس کے پہلے دو ابواب بھی فنون نمبر ۱۲۹ میں شائع ہو چکے ہیں۔ موجودہ ابواب میں ندیم صاحب کے حلقہ احباب میں شامل نجیب احمد، ضیاء بٹ، خالد احمد، اختر حسین جعفری، گلزار وفا چوہدری اور منصورہ احمد کے حوالے

سے بعض چبھتے ہوئے واقعات کا خلاصہ کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے کچھ مندرجات کو دیکھتے ہوئے راقم کا خیال ہے کہ یہ مضمون کم از کم فنون میں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔

شبنم شکیل نے ''سچے گیت کی گونج'' کے عنوان سے پکھراج کی یادداشتوں پر مبنی کتاب کے انگریزی ترجمے "The True song sung" کا اردو ترجمہ اور اس کا خلاصہ کیا ہے جس میں مختصراً ملکہ پکھراج کی زندگی کے تمام پہلو موجود ہیں۔

فنون کا حصہ غزل نہایت عمدہ اور جان دار غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ''دوام'' اور ''محیط'' سے ندیم صاحب کی ایک منتخب غزل بھی شامل ہے۔

''فنون'' کے آخری حصے میں ایک انشائیہ ''لطیفے کی بوطیقا'' شامل ہے جو فنون کا مزاج نہیں۔ محمد کاظم نے مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر کہے گئے دو مرثیوں اور مولانا جوہر کی جرأت آمیز تاب سخن کا قصہ سنایا ہے۔ ان قصائد میں سے ایک مصر کے معروف شاعر احمد شوقی کا ہے، یہ وہی شوقی ہیں جو بہت عرصہ اندلس میں رہے اور مصر میں ان کی اور اقبال کی شاعری کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ دوسرا مرثیہ اقبال کا بہ زبان فارسی ہے جو فارسی کے کُلیات میں شامل نہیں۔ ان دونوں مرثیوں کی دریافت و بازیافت محمد کاظم ہی کر سکتے تھے کہ خاص طور پر عربی ادب پر ان کی گہری نظر سے کون واقف نہیں۔ اس کے علاوہ بھی محمد کاظم نے رواقی فکر کے حامل فلسفی سنیکا اور اس کی کتاب کے ساتھ ساتھ عربی شاعر زارتبالی کی نظم ''شاہ مغول کے ساتھ ایک مکالمہ'' کو موضوع بنایا ہے۔ نظم کا ترجمہ بھی محمد کاظم نے کیا ہے۔ محمود درویش کی نظمیں اردو میں مسلسل ترجمہ ہوتی رہی ہیں۔ ان کے ترجمہ نگاروں میں شمیم حنفی، امجد اسلام امجد، محمد کاظم اور منو بھائی نمایاں ہیں۔ ''فنون'' میں اس مرتبہ فلسطین کے حوالے سے محمود درویش کی تین نظموں کا خوبصورت ترجمہ منو بھائی نے کیا ہے اور انہیں ''تین فلسطینی نظمیں'' کا عنوان دیا ہے۔ ''چند پاکستانی پرندے'' محمد خالد اختر کی انتہائی خوبصورت تحریر ہے۔ محمد خالد اختر کی نثر پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ بلاشبہ وہ اردو کے ایک بڑے نثر نگار تھے۔ ان کا یہ مضمون ''پاکستانی پرندے'' جس سطر پر ختم ہوتا ہے، اسی سے مضمون کی بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ آخری سطر کچھ اس طرح ہے: ''اگلے کتابچے میں ہم پاکستانی درندوں کے بارے میں بتانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' یہ مضمون ۱۹۶۹ء میں فنون میں شائع ہوا تھا اور اب اسے مکرر شائع کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی غالب کانفرنس ۲۰۱۱ء کی روداد بقلم تسلیم احمد تصور بھی فنون کے زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔ تذکرہ غالب کانفرنس میں عمدہ اور اعلیٰ پائے کے مضامین پڑھے گئے تھے جس کی روداد فنون میں پیش کی گئی ہے۔ اب آخر میں فنون کا وہ حصہ جس کے ذکر کے بغیر شاید پورے شمارے پر تبصرہ لاحاصل ہوگا۔ یہ حصہ ہے اختلافات و تاثرات کا جس میں ندیم صاحب نے علمی نکات کی توضیح و تشریح کو متعارف کرایا تھا۔ خطوط کا یہ حصہ نہ صرف فنون کی ہر گزشتہ اشاعت پر ایک بے لاگ تجزیے اور تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس میں عام طور پر اختلافی پہلوؤں کو ذاتیات سے بالاتر ہو کر خالصتاً علمی و ادبی حوالے سے زیر بحث لایا جاتا ہے اور یہی شان موجودہ شمارے میں بھی برقرار ہے۔

(ڈاکٹر نجیب جمال۔ ''اخبارِ اردو''۔ اسلام آباد)

☆ ''فنون'' کے دوبارہ اجرا کی خوشی اردو اہلِ ادب کے لیے مشترکہ سرمایہ ہے۔ یوں لگتا ہے ایک کھوئی ہوئی جنت واپس مل گئی۔ یقیناً آپ دونوں مدیران کے ساتھ ٹائٹل کی مصورہ اور احبابِ ''فنون'' کی مساعی لائق داد ہے۔ اس وقت شمارہ نمبر ۱۳۱ میرے پیشِ نظر ہے اور نیر حیات قاسمی کے تحریر کردہ حرفِ ثانی میں انٹرنیشنل ''فنون'' کی سرخی نے میری خوشی دوچند کردی ہے۔ حسن رحمان کی قلمی گرفت مضبوط ہے۔ ہارون الرشید، نورین طلعت عروبہ اور سرور حسین نقشبندی کے نعت نذرانوں نے روح کو سرشار کیا۔ ندیم صاحب کے قلم نے دل و جاں کو تادیر مسحور رکھا۔

محمد ارشاد کی آمد نے ''فنون'' کو مزید جاذبِ توجہ بنا دیا۔ ''اقبال کا علم الکلام'' میں نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے پڑھا۔ پتہ نہیں میری طالب علمانہ رائے کو ارشاد صاحب کس نظر سے دیکھیں، تاہم گزارش ضرور کروں گا کہ علی عباس جلالپوری کا نکتۂ نظر کسی مسلک اور فرقے سے بالاتر محسوس ہوتا ہے جبکہ ارشاد صاحب کی رائے پر مسلکانہ چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہ اس مضمون کی پہلی قسط ہے، آئندہ صورتحال شاید اس سے مختلف ہو۔

پروفیسر عامر سہیل کا مضمون بھی مجھ کم علم کے لیے وافر مواد کا حامل تھا۔ عجمی تصوف کے حوالے سے صاحبِ مضمون نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی انہیں اس دقتِ نظر کی داد دی جانی چاہیے جس نے ان سے اتنے ماخذ کھنگلوائے۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کہ افسانہ و تحقیق کے میدانوں میں رسائی رکھتے ہیں ''اردو میں ترجمے کی روایت'' جیسے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے توازن و اعتدال سے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ سید مشکور حسین یاد کی نثر اور شاعری مجھے بوجھل بوجھل لگتی ہے۔ جلیل عالی صاحب نے ''ندیم کا شعری خصوص'' اپنے اسلوب کی ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ظفر سپل کی تاریخ نگاری دلکش اندازِ بیاں کے ساتھ معلومات و فرحت افزا ہے۔ ندیم صاحب کی خوبصورت نظموں سے آغاز ہونے والے حصہ نظم میں آفتاب اقبال شمیم، امجد اسلام امجد، حلیم قریشی، گلزار، شاہنواز زیدی، احمد حسین مجاہد، طالب انصاری، اقتدار جاوید، حسن عباسی، عامر سہیل، عنبرین صلاح الدین، ثروت زہرا، زاہد نبی اور بہزاد برہم کی شرکت سے خوبصورت رونق ہے۔

افسانے کا حصہ ایک تو مجھے نسبتاً کمزور لگا، دوسرا موضوعات میں کہیں کہیں یکسانیت نے بھی لطف پیدا نہیں ہونے دیا۔ نیلم احمد بشیر، محمد نعیم ان میں کچھ کامیاب رہے۔ طاہرہ اقبال کے گراں گو زبان کے تجربے نے کچھ گرانبار کر دیا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کے قلم کو اللہ نے تاثیر کے وفور سے نوازا ہے۔ ''سانجھ بھئی چودیس'' ان کی ہنرمندی اور کمال کا نمونہ ہے۔ نعمان منظور کی عقیدت مندی بھی پراثر نثر کے سانچے میں ڈھلی محسوس ہوتی ہے۔

آصف ثاقب، حلیم قریشی، امجد اسلام امجد، شبنم شکیل، جلیل عالی، نجیب احمد، ہارون الرشید، احمد حسین مجاہد، انیس چوہان، رانا ذکاءاللہ، سرفراز زاہد، عامر سہیل، حسن عباسی، جعفر حسن مبارک اور زاہد نبی کی غزلیں بہت جاندار اور دل میں کھنچتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ محمد کاظم کا کالم "روزنِ در سے" قندِ مکرر کے طور پر پڑھا۔ اسی طرح محمد خالد اختر کی تحریر بھی تکرار لطف کی حامل تھی۔ خطوط کا حصہ آہستہ آہستہ اپنی رونق بحال کر رہا ہے۔ بہت سے معتبر اہل قلم کے والا ناموں نے محفل کو آراستہ کر دیا ہے۔ اللہ ''فنون'' کی رونقیں دائم قائم رکھے۔

(شہاب صفدر۔ اسلام آباد)

☆ ..... میں اس عہدِ بے بصر کے ان گواہوں میں سے ہوں جو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہمارے سب کے بزرگ احمد ندیم قاسمی نے جس کاروانِ فنون کو خونِ دل دے کر پروان چڑھایا تھا ان کے ادبی ورثاء نے اس ''فنون'' کو گہن نہیں لگنے دیا بلکہ میر کارواں کے نقوشِ قدم کے ساتھ نئے ایسے نقوشِ قدم تخلیق کیے ہیں کہ جو ایسے مقبول، ممتاز اور موثر ادبی جریدے کے احیائے نو کے امین بھی ہیں اور شاہد بھی۔ احمد ندیم قاسمی سے میرے خاندان کے شش جہت تعلقات رہے ہیں اور ان میں سے ایک گہرا تعلق ریڈیو پاکستان کا جہاں وہ میرے والد مرحوم اولیں ناشر اعلان قیام پاکستان مصطفیٰ علی ہمدانی کے دوست بھی تھے، کرم فرما بھی اور مداح بھی۔ اس شمارہ ۱۳۰ کے سحر میں ابھی گرفتار تھا ہی کہ فنون کا خاص نمبر سالنامہ شمارہ ۱۳۱ موصول ہوگیا جس کے سرورق کو دیکھ کر جیسے موجد کی یاد تازہ ہوگئی لیکن سرورق کی تخلیق کے لیے نفیسہ قاسمی کا نام پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس تاریخی ادبی جریدے کا معیار سرورق سے صفحہ آخر تک اسی طرح برقرار اور مستحکم ہے جیسے اس کے بانی اور میر کارواں احمد ندیم قاسمی اسے چھوڑ کر گئے تھے۔

فنون کا تازہ شمارہ خاص سالنامہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور ہاتھوں میں وہی حدت محسوس ہو رہی ہے جو احمد ندیم قاسمی صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے ہوتی تھی۔ سرورق کی پشت پر احمد ندیم قاسمی اور عزیزم نیر حیات قاسمی کی تصویر دو زمانوں کی تصویر ہے لیکن ایک یقین کی غماز۔ تصویر کہ میر کارواں کا یہ کارواں انشاءاللہ کبھی نہیں رکے گا اور رواں دواں رہے گا۔ چار سو آٹھ صفحات کے اس سالنامے کو ترتیب دینے سے لے کر اس کی اشاعت اور ترسیل تک اس جریدے کی ٹیم کیسے کیسے مقام سے گزری ہوگی۔ اس کا شعور شاید عام قاری نہ کر پائے لیکن یاد رکھیں کسی تاریخ کی شہادت موجودہ عہد نہیں دیا کرتا بلکہ آنے والا عہد اس پر مہر صداقت ثبت کرتا ہے۔ میں نے اس سالنامے کا ایک ایک ورق پڑھا ہے، ایک ایک شعبے کی تحاریر دیکھی ہیں اور محسوس کی ہیں اور کسی لگی لپٹی بغیر کہہ سکتا ہوں کہ یہ شمارہ بھی ایک تاریخی اور شہادتی سالنامہ ہے۔

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو وراثت میں علم ملا اور وہ بھی عہد ساز شخصیت احمد ندیم قاسمی صاحب سے اور یہ آپ کا ان کے قلمی وارث ہونے کا اعزاز بھی ہے۔ ان کی بسائی ہوئی بستیوں کو آباد رکھنے کا بیڑہ مشکل تو ہو سکتا ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔

میں جانتا ہوں محدود سرمائے میں وراثتی اثاثوں کی حالت کتنی تکلیف دہ ہوگی لیکن جہاں لگن ہوتی ہے وہاں رستے خود بخود سامنے آ جاتے ہیں۔ فنون مجھے اس بار اپنے دوستوں میں سب سے پہلے ملا اور یوں مجھے ہر ایک کو بتانا پڑا کہ کیسا ہے۔ تزئین، آرائش، طباعت اور معیاری ادب اور تحقیقی مقالے بھی کچھ زیر بحث رہا اور واقعی فنون ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ تحریر چاہے نثر میں ہو یا نظم کی ہو اس میں جب تک اندر کے سارے موسم نہ ہوں وہ قاری کے لیے کبھی پر کشش نہیں بن سکتی۔ پڑھنے والے کو اپنے احساسات کی ترجمانی چاہیے ہوتی ہے۔ سوائے جہاں سے ملے گی وہی لکھنے والا اور اس کی تحریر قاری کو اپنی لگے گی۔ فنون میں چھپنے والے تمام افسانے، غزلیات، نظمیں اور مقالے عمدہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر پڑھنے والے کو کسی نہ کسی صفحے پر اپنا کوئی احساس یا خیال رکھا مل جاتا ہے اور یوں فنون کو اپنی وہ پذیرائی حاصل ہو جاتی ہے جس کا وہ حقدار ہے۔

اداریے سے اختلافات و تاثرات تک سب کچھ ایک ادبی شہادت ہے جسے آنے والے مورخ بے لاگ ہو کر اگر لکھے تو بے مثال لکھے گا۔ حمد و نعت ایسا وصف شعر گوئی ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے حبیب کی اجازت درکار ہوتی ہے اور اس شعبے میں لکھا ہوا ہر لفظ خاص عنایت خالق لوح و قلم ہے۔ احوال وطن میں باپ اور بیٹی ایک ہی معیار کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ اقبالیات میں پروفیسر عامر سہیل کی تحریر کتنے ہی فکری در باز کرتی ہے جبکہ مضامین کے شعبے میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی تحریر سے مجھ طالب علم نے فیض پایا ہے۔ فن اور فنکار میں عابد ودود پر ڈاکٹر نثار ترابی نے خوب لکھا ہے جبکہ نظموں اور غزلوں کے شعبے میں ہر ایک تخلیق اپنے خالق کی ہنرمندی کی شہادت ہے۔ شاید کسی کے لیے یہ بہت آسان ہو کہ نظموں اور غزلوں میں بحور و عروض کی خامیاں اور غلطیاں تلاش کرے جبکہ میں تو فرقہ عروضیہ کا آدمی نہیں ہوں۔ افسانے کا شعبہ بھی شاعری کے شعبے کی طرح مالا مال ہے جبکہ طاہرہ اقبال کا ناولٹ اگلی نشست میں مطالعہ کروں گا۔ یادداشتیں، فنون لطیفہ، عکس ندیم، انشائیہ اور فنون قند مکرر یہ سب مجھ جیسے ادب کے طالب علم کی روح کی غذا ہے اور شاید اسی لیے میں اپنے آپ کو روحانی اور ذہنی طور پر خوب صحت مند محسوس کرتا ہوں۔ بین الاقوامی غالب کانفرنس کا احوال تو پڑھا ہی لیکن اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے شعبۂ صحافت کے اپنے ہم جماعت تسلیم احمد تصور ایک بار پھر مل گئے، وہ کئی بار گم ہوئے اور کئی بار دریافت لیکن ہر بار پھر کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ اس بار اگر کوئی مجھے ان کا ای میل مرحمت فرما سکے تو ممنون احسان ہوں گا۔

اختلافات و تاثرات کے شعبے میں پوری ایمانداری سے کہوں گا کہ کچھ اختلاف تو واقعی اختلافات ہیں لیکن کچھ اختلاف برائے اختلاف اور اختلاف برائے عادت ہیں۔ رہی بات تاثرات کی تو اس پر رائے زنی ہو نہیں سکتی کہ یہ قطعی ذاتی معاملہ ہے۔ میں ادارہ فنون کے ہر ایک فرد کو اس شاندار اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(صفدر ہمدانی۔ لندن)

☆..... مجھے پرانے انسان —— پرانی چیزیں —— پرانی کتابیں —— پرانی تقافتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ خود کو سنوارنے کے جتن سے آزاد ہو چکی ہوتی ہیں یا پھر انہیں اپنا آپ ثابت کرنے کے عذاب سے رہائی مل چکی ہوتی ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ تھا کہ مجھے فنون اس لیے عزیز نہیں ہے کہ وہ اردو ادب کا موقر اور سندی جریدہ ہے بلکہ اس لیے عزیز ہے کہ وہ پرانا اور نایاب ہے —— اور اس سے بڑھ کر مجھے اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہ محترم المقام جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی یادگار ہے جن کی زیارت کو میں جنوری ۲۰۰۵ء میں خصوصی طور پر لاہور گئی تھی۔ انہوں نے میری کتاب ''گرد باد حیات'' کے لیے کچھ سطریں سند کے طور پر مجھے عنایت فرمائی تھیں۔

میں جانتی ہوں کہ فنون میں چھپنا ایک سند ہے۔ جس کے لیے میں خود کو خوش نصیب سمجھتی ہوں اور اس لیے تمام لکھنے والوں کو بے حد مبارکباد دیتی ہوں۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی افسانوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ پر افسانوں میں سب سے زیادہ متاثر کن تحریر غیر حیات قاسمی کی ''دستک'' تھی جس میں مجھے ہر آن یہی لگا، اب کوئی آیا، اب کوئی آیا..... پر کہانی میں جو آیا وہ سارے دکھ لے گیا اور سارے سکھ دے گیا۔ ''گریف کونسلنگ'' کرتی ہوئی مختصر سی تحریر دکھوں کے سارے مراحل طے کرتی رہی اور بغیر کسی اضافی کردار کے کہانی مسلسل آگے بڑھتی رہی..... واہ! جیتے رہیے غیر —— اس موقع پر میں خاص طور پر اپنے قلم کار ساتھی محمد نعیم کو ''حادثہ'' جیسی خوبصورت تخلیق پر بھی مبارکباد دینا چاہتی ہوں جنہوں نے بڑی مہارت سے ہر سطر میں ایک نئی سطر کی گرہ کھولی۔ غزلیات، نظمیں اور معلومات مضامین ہر فن پارہ اپنی جگہ پر۔ پھر احمد ندیم قاسمی صاحب کا وہ نوحہ جو انہوں نے ''اطہر نفیس'' کی یاد میں لکھا، پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ یہی ہی تو تخلیق کار کی سچائی پر دلیل ہے۔

اختلافات و تاثرات کے ضمن میں صرف اتنا کہوں گی کہ اصل میں دنیا میں کہیں بھی جب ادب لکھا جاتا ہے تو ایک مخصوص حالات اور اسی کے ٹائم زون میں لکھا جاتا ہے۔ اسی لیے کسی کا بھی فن پارہ اٹھا کر دیکھیے اس میں ایک خاص مزاج اور آہنگ ملے گا اور یہ ادبی فرق اور آہنگ لکھنے والے کا اپنا ادبی مزاج، مطالعہ اور مشاہدہ ہی کشید کرتا ہے لیکن یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک ادبی مزاج ہر زبان کے ادب میں مشترک ہے اور وہ یہ کہ جب بھی کسی لکھاری کی تحریر پر مخالف تبصرہ آتا ہے تو دو طرح کا ردعمل سامنے آتا ہے یا تو قلم کار اس تنقید کو اپنی ذات پر تبصرہ سمجھ لیتا ہے۔ (جو ایک غلط رویہ ہے) یا واقعی تبصرہ نگار نے قلم کار کی تضحیک کرنے کے لیے ہی قلم اٹھایا ہوتا ہے (یہ بھی انتہائی غلط رویہ ہے)

میرا ماننا ہے کہ تحریر قلم کار کے لیے ایسے ہے جیسے اس نے اپنا جگر کلیجہ اپنی روح سب کے سامنے رکھ دی ہو، اب جو بھی اس کو بلاوجہ، ذاتی عناد یا گروپ بندی کی سوئیاں ''تنقید و تنقیص'' کی صورت چبھوئے گا تو لکھنے والے کے لیے وہ تنقید برداشت کرنا واقعی بڑے حوصلے کا کام ہوگا۔ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیے جس جس قلم کار نے اپنی تحریر لکھنے کے بعد یا کسی کی تحریر پر تعریف اور تنقید کرتے وقت جب بھی اپنی ذات کو اپنے علم اور تحریر سے منہا کیا وہی ادیب بعد از مرگ حیات رہا۔ فنون کی تزئین و

آرائش سے لے کر چھپائی تک جس جس کی محنت شامل ہے، ہر ایک کو میرا سلام اور ڈھیروں دعائیں۔

''فنون'' ادبی ارتقاء کی تاریخ مرتب کر رہا ہے'':

مجموعی طور پر مسلمان امہ بالخصوص پاکستان کی باقاعدہ کوئی ایسی تاریخ کہیں بھی رقم نہیں ہوئی ہے جس پر کم از کم پچاس فیصد لوگوں کو ہی اتفاق ہو اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی تاریخ کے معاملے میں ہر قسم پر ہر پہلو سے نئے نئے اختلافات اٹھتے رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ اللہ کے حبیبؐ کے وصال کے کتنے برس بعد باقاعدہ ضبط تحریر میں آئی۔ یہ اب اپنے طور پر الگ سانحہ ہے اور اسی طرح پاکستان کے قیام کی تاریخ کو بھی آج پہلے ہی دن کے حوالے سے متنازع بنا دیا گیا ہے اور متنازعات پیدا کرنے کا ماہر ایک حلقہ گزشتہ دس سال سے دہائی دے رہا ہے کہ پاکستان ۱۴ اگست کو نہیں بلکہ ۱۵ اگست کو بنا تھا۔ کسی محقق کا یہ کہنا اپنی سمجھ میں تو آیا نہیں کہ تاریخ کہتے ہی اس کو ہیں جس میں اختلاف ہوتا ہے۔

دوسری طرف حیرت کی بات یہ ہے کہ خود شاعروں اور ادیبوں میں بھی بہت کم لوگوں کو اس بات کا شعور اور ادراک ہوگا کہ شاعر اور ادیب بھی تاریخ نویس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے عہد میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوتا ہے، وہ ایک تاریخ ہی رقم ہو رہی ہوتی ہے۔ اب ایک اور مسئلہ، شاعر اور ادیب کی لکھی ہوئی تاریخ کو محفوظ بھی کرنا ہے۔ وہ جینوئن شاعر ادیب جو قافیہ پیمائی اور لفاظی سے دور ہوتا ہے اور جس کا ہاتھ معاشرے کی نبض پر ہوتا ہے اور جسے احساس کی نعمت میسر ہوتی ہے، وہ دراصل اپنی تخلیقات میں اپنے عہد کی زندہ تاریخ لکھ رہا ہوتا ہے۔

یوں تو پاکستان میں الحمدللہ ادبی جرائد کی کمی نہیں لیکن وہ ادبی جرائد جنہوں نے شعوری اور لاشعوری طور پر پاکستان کی تاریخ کو محفوظ کیا ان چنیدہ جرائد میں سرفہرست ''فنون'' کا نام آتا ہے جس کا پہلا شمارہ اپریل تا جون ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا جس میں محترم المقام جناب احمد ندیم قاسمی صاحب لکھتے ہیں ''فنون کے اجرا کی یہی وجہ سمجھ لیجیے کہ ہم آزادیٔ اظہار، شائستہ آزادیٔ اظہار کو علم و فن کی بقاء اور ارتقاء کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔'' اور اسی طرح سہ ماہی اپریل تا جون ۱۹۶۷ء کے اداریے میں یوں میری بات کو تصدیق میں بدل دیتے ہیں کہ ''فنون اپنی سہ ماہی اشاعتوں کے ذریعے ادبی ارتقاء کی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔'' میں قارئین کی توجہ ایک ایسے اداریے کی طرف دلوانا چاہتی ہوں جو میری یہ بات بھی ثابت کرے گا کہ ادیب اور شاعر ہی اپنے ملک کی تاریخ لکھتے ہیں اور محفوظ کرنے والے چنیدہ محافظ ہوتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ختم ہونے کے بعد اکتوبر کے اداریے میں لکھتے ہیں ''بظاہر جنگ ختم ہو چکی ہے مگر درحقیقت جنگ جاری ہے۔ اہل قلم اور اہل فن کے لیے تو جنگ اب شروع ہوئی ہے اور برسوں جاری رہے گی۔'' پھر اسی تناظر میں فروری تا مارچ ۱۹۶۶ء میں مختار صدیقی کی شہرۂ آفاق نظم ''جنگ کے بعد'' بطور اداریہ شامل کی گئی۔

یہاں مجھے ایک بات اور کہہ لینے دیجیے کہ قومیت پسند اور قومیت پرست ہونا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ محترم المقام

جناب احمد ندیم قاسمی اگر اکثریت کی رائے میں بے شک ''قومیت پرست'' نہ ہوں لیکن ان کے قومیت پسند ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ اپنی بات کی دلیل کے لیے ۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات کو جب پاکستان کی نشریات کا اولین باب رقم ہو رہا تھا، ریڈیو پشاور اسٹیشن سے نشر ہونے والے ان کے لکھے ہوئے قومی نغمے ان کی قومیت پسندی پر مہر ثبت کر رہے تھے۔ اسی قومیت پسندی کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے فنون کے ہر شمارے میں متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ آیئے پہلے اداریوں کے عنوانات کا ہی سرسری سا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ جمہوریت اور اختلاف رائے (ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء)
۲۔ سیاسی اختلافات اور اہل قلم (ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء)،
۳۔ افسوس پڑھے لکھے محض ۱۶ فیصد (ستمبر ۱۹۷۱ء)
۴۔ ملکی تاریخ کا نازک ترین موڑ (اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء)
۵۔ پاکستان کو قائم رکھنا ہے (جون، جولائی ۱۹۷۲ء)
۶۔ نظریاتی آشوب (جنوری، فروری ۱۹۷۳ء)
۷۔ تاریخ سے سبق لیجیے (اپریل، مئی ۱۹۷۵ء)
۸۔ اردو زبان (اگست، ستمبر ۱۹۷۶ء)
۹۔ تاریخ کا موڑ (اپریل، مئی ۱۹۷۸ء)
۱۰۔ تحفظ پاکستان (ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۴ء)
۱۱۔ جمہوریت اور آمریت (جولائی تا دسمبر ۱۹۹۳ء)
۱۲۔ ادب حکومتوں کی ترجیحات سے خارج (مئی ۱۹۹۷ء)
۱۳۔ تشدد کی ایک اور لہر (جولائی، ستمبر ۲۰۰۱ء)
۱۴۔ جھوٹ سچ (ستمبر، دسمبر ۲۰۰۴ء)
۱۵۔ قیامت خیز زلزلہ (مئی، اکتوبر ۲۰۰۵ء)

(اس طرح کے کئی اور عنوانات ہیں)

فنون ''ندیم نمبر'' (شمارہ: ۱۲۸) پر تبصرے کی طوالت سے بچنے کے لیے آپ کی خدمت میں محترم المقام جناب احمد ندیم قاسمی کی ڈائری کے اوراق جسے ندیم نمبر میں ''رفتگاں'' (۱۹۶۳ء۔۲۰۰۶ء) کے عنوان سے شائع کیا گیا، اس میں سے چند اقتباس آپ کو سنانا چاہتی ہوں تاکہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ ''پاکستانی ادب اور تاریخ کی اہم دستاویز'' فنون بذاتِ خود پی ایچ ڈی کا موضوع ہے۔

قاسمی صاحب، مصطفیٰ زیدی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''انوکھا، پراسرار اور دلکش شعر کہنے والے مصطفیٰ زیدی کو کوئی بھی دیانتدار نقاد نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اگر اسے چالیس برس کی عمر ہی میں موت کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو اردو شاعری میں اس کی طرف سے یادگار اضافے ہوتے۔''

اسی محبوبیت سے ابن انشاء کا بھی ذکر کرتے ہیں ''ابن انشاء اردو شعر و ادب اور صحافت کی ایک محبوب شخصیت تھے مگر ان کی شخصیت میں غیر معمولی دلآویزی تھی۔''

پھر ایک جگہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''صوفی تبسم ایک چلتا پھرتا ادبی اور علمی ادارہ تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کے حلقے میں بچوں سے لے کر بوڑھے تک شامل تھے۔''

آل رضا لکھنوی کے لیے لکھا کہ ''وہ ایک ایک مصرعہ اتنے اہتمام سے کہتے تھے کہ لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔''

اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں اپنی یادداشتوں میں بچھڑنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''پاکستان میں سرور بارہ بنکوی، سبط علی صبا، زبیدہ خاتون، ابن صفی، مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب، فیض محمد بلوچ اور منیر سرحدی جیسے فنکار اور مصطفیٰ علی ہمدانی جیسے براڈ کاسٹر ہم سے جدا ہو گئے۔''

اطہر نفیس کے لیے لکھتے ہیں ''اطہر نفیس کا سا اندر باہر سے نہایت خوبصورت انسان ایک بے مثال غزل گو بھی تھا اور ایک ایسا وجود بھی جس کے خلوص اور نیکی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔''

ساحر لدھیانوی کے لیے لکھتے ہیں ''اس نے اپنی نظموں، غزلوں اور گیتوں میں عالم انسانیت کی اس اکثریت کی ترجمانی کی ہے، جو مروجہ غیر منصفانہ اور سفاک معاشی نظاموں کے پاٹوں میں صدیوں سے پس رہے ہیں۔''

اسی طرح انہوں نے اپنے عہد رفتگاں کا ذکر اس کی تخلیقات، شخصی خاکے اور فنی حوالوں کے ساتھ ایسے کیا ہے کہ ہر برس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جیسے حفیظ جالندھری، ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم، غلام عباس، احمد رشدی، ایم اسلم، یوسف کامران، خواجہ خورشید انور، ڈاکٹر نذیر احمد، ایوب رومانی، نسیم امروہی، صادقین، رئیس امروہی، سید انور، منصور قیصر، عصمت چغتائی، ڈاکٹر عبدالسلام، حکیم محمد سعید، شفیق الرحمٰن، یونس ادیب، میڈم نور جہاں، محمد خالد اختر، اشفاق احمد، تابش دہلوی، مشفق خواجہ، امرتا پریتم کے علاوہ سینکڑوں جید ادیب اور شعراٗ کا ذکر ان کے ادبی رتبوں کے ساتھ کیا ہے۔

آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ اگر قاری صرف قاسمی صاحب کی یہ ڈائری ''رفتگاں'' ہی پڑھ لے تو اسے پاکستان کی پوری سیاسی، سماجی، معاشی، ادبی تاریخ مع تاریخوں کے مل جائے گی۔

حرف آخر کے طور پر کہوں گی کہ اصطلاح کے طور پر تاریخ نویسی کو اکثر لوگ ایک بہت الگ سا شعبہ سمجھتے ہیں لیکن وہ

تاریخ نویس جو سینکڑوں صفحات کی تاریخی کتب مرتب کرتے ہیں ان میں سے بھی عاقل، محققین دراصل جس عہد کی تاریخ لکھ رہے ہوتے ہیں، اس عہد کے اخبارات اورادبی، سماجی اور دینی جرائد ورسائل سے مدد لیتے ہیں اور بلاشبہ ادبی جریدہ فنون ایسے تاریخ نویس اور محققین کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔

(نگہت نسیم۔سڈنی۔آسٹریلیا)

☆.....آپ نے نیر حیات قاسمی کو''فنون'' سونپا ہے۔اللہ آپ کی تمناؤں اور نیر کی مساعی جمیلہ کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔پرچہ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کی مانند بے حد سنجیدہ، باوقار لیکن بااین ہمہ پرکشش اور دلدار ہے۔''حرفِ ثانی'' ادب اور توجہ سے پڑھا۔حسن رحمان صاحب کے''بین السطور'' میں لفظوں نے خوب خوب الجھایا لیکن آخر میں'' ہر شخص دنیا کو بدلنا چاہتا ہے اور کوئی بھی خود کو نہیں بدلتا۔'' جناب حسن رحمان صاحب کو یہ شکوہ ہے۔اقبال کو شکوہ تھا:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

''فنون'' میں عام جرائد سے جدا یہ خصوصیت دیکھنے میں آرہی ہے کہ معمول کے شعبہ جات کے علاوہ مندرجہ ذیل شعبے بھی موجود ہیں:

بین السطور، احوالِ وطن، اقبالیات، فن اور فنکار، یادداشتیں، فنونِ لطیفہ، عکسِ ندیم، انشائیہ،''فنون'' قندِ مکرر، روداد، یہ اضافے خوش آئند ہیں۔

اختلافات وتاثرات کے شعبے میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے مصحفی کے''ڈاگ'' کی امجد اسلام امجد کی تشریح سے اختلاف کیا ہے۔میں تو ایک عرصے سے سگ پرستوں کے درمیان رہتا ہوں۔میں نے کبھی نہیں سنایا پڑھا کہ کسی''ڈاگ'' نے کسی کا کلیجہ کھالیا ہو البتہ یہ پڑھا بھی ہے اور سنا بھی ہے کہ کسی''ڈاگ'' والی کی چاہت نے کسی چاہنے والے کا کلیجہ کھالیا۔کلیجہ تو بھوت اور بھتنیاں چباتے ہیں، سگ نہیں۔ڈاک کو ڈاگ سے بدلنا قابلِ قبول نہیں لگتا۔مصحفی سے یہ بھی توقع نہیں کی جاسکتی کہ عاشقوں کے کلیجے انگریزی کے ڈاگ سے کھلوادیں۔یوں بھی سگِ لیلیٰ نے مجنوں کا کلیجہ نہیں کھایا، اس کے برعکس مجنوں نے لیلیٰ لیلیٰ کر کے سگِ لیلیٰ کا کلیجہ کھالیا ہوگا۔بہرحال کبھی کبھی یہ محقق حضرات بھی دلچسپ صورتحال پیدا کر لیتے ہیں۔

آپ دونوں کو سوسو مبارکباں۔

(عبداللہ جاوید۔کینیڈا)

☆.....فنون ملا۔غنچۂ دل کھلا! میں پھر اپنی وہی بات دوہراؤں گا کہ تازہ''فنون'' کو دیکھ کر پڑھ کر یہی محسوس ہوا کہ

پیارے قاسمی صاحب لاہور ہی میں موجود ہیں اور فنون خود انہی کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ آپ نے قاسمی صاحب کی روح کو یقیناً سرشار و نہال کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب کی روح آپ پر فخر محسوس کر رہی ہوگی اور آپ کی مزید کامیابی و کامرانی کی منتظر ہوگی۔ پھر عزیزہ نفیسہ قاسمی نے نفیس و خوبصورت سرورق تخلیق کر کے ہم سب قارئین اور قاسمی صاحب کی روح کو مسرت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ادھر عزیز محترم نعمان منظور نے ''ایک تھا بادشاہ'' شائع کر کے قاسمی صاحب کی روح کو مزید خوش کر دیا ہے۔

یہ دیکھ کر مزید خوشی و اطمینان ہوا کہ قاسمی صاحب کے بنائے گئے کاروان کے تقریباً سارے ہم سفر پھر سے اس کارواں میں آن ملے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اب ان معتبر و مستند اور خوش ذوق تخلیق کاروں کا یہ کارواں رواں دواں ہی رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

(سلطان سکون۔ کیہال)

☆ ..... قاسمی صاحب مرحوم سے عقیدت کا سلسلہ تو ساری عمر کا قصہ سمجھیے۔ جب تھوڑی بہت سوجھ بوجھ آئی اور ادب کو ادب سمجھ کر پڑھنا شروع کیا، اُن کی شاعری اور نثر سے استفادے کا آغاز بھی ہوگیا۔ ''فنون'' کے اجرا کے ساتھ ہی اس سے وہ ذہنی، قلبی اور ذوقی رشتہ قائم ہوا کہ اس کا مطالعہ گویا وظیفۂ حیات بن گیا۔ برملا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ''فنون'' سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کی وساطت سے علم و ادب اور فکر و فن کے نئے نئے آفاق مجھ پر روشن ہوئے۔ ندیم صاحب کی رحلت کے بعد ''فنون'' کی اشاعت میں جو تعطل پیدا ہوا، اس سے پریشانی ہوئی۔ الحمدللہ! آپ دونوں کی مساعی سے ''فنون'' کے نئے دور کا آغاز اس شان سے ہوا ہے کہ ندیم صاحب کے عہدِ ادارت کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ کیا شعر کیا نثر، مجلّے کے بیشتر مقالات عمدہ معیار کے حامل ہیں۔ ''فنون'' کے پرانے لکھنے والوں کی نئی تحریریں حسب سابق ذہن و ذوق کو متاثر کرتی ہیں۔ نواردانِ بساطِ ادب کے سلیقۂ تحریر سے اردو ادب کے شاندار مستقبل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب کی نظم و نثر کے منتخبات رسالے کے وزن و وقار میں اضافے کا موجب ہیں۔ مرحوم کی شخصیت اور فن و فکر کی بابت لکھے گئے مضامین سے ان کے معمولاتِ حیات اور حاصلات ہنر کے کئی پہلو ہویدا ہوتے ہیں۔ رسالے کے صوری و معنوی محاسن پر آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

(پروفیسر صوفی عبدالرشید۔ ہری پور ہزارہ)

☆ ..... ''فنون'' کا سالنامہ ملا، بے حد خوشی اور طمانیت محسوس ہوئی۔ پرچہ باہر سے خوبصورت ہے اور اس کا کریڈٹ جاتا ہے نفیسہ قاسمی کو۔ پرچے کے اوراق الٹے پلٹے اور خاص طور پر پرچے میں جب انگوٹھی میں تراشیدہ نگینوں کی

طرح جڑے ہوئے اقتباسات پڑھے تو خود فراموشی کی فضا تشکیل پا گئی۔ نہ میں رہ سکی نہ میرے معمولاتِ زندگی۔ میرے چاروں اور آپ کے بابا، فیر کے نانا اور میرے شریکِ حیات عبداللہ جاوید کے برادرِ معظم و محترم — شاعر، نقاد، فکشن نگار، کالم نویس، یادگار ادبی جریدے فنون کے مدیر اور ہر جہت میں مرتبۂ عزت پر متمکن جناب احمد ندیم قاسمی۔ خود فراموشی اور عقیدت کیشی کے اس عالم میں ''یادداشتیں'' کے تحت ''سانجھ بھئی چودیس'' کے صفحات نے نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا مضمون بیادِ احمد ندیم قاسمی سب قاریوں کے لیے ہے۔ سب میں میں بھی شامل ہوں لیکن میری ذات کی حد تک بیادِ لاڑکانہ ہے۔

لاڑکانے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

میں لاڑکانہ کی ہوں۔ تین برس کی تھی جب میں اپنی دادی، پھوپھی اور چچا سید علی شوکت عابدی کے ساتھ لاڑکانہ آئی اور یہیں کی ہوگئی۔ شیرانی خاندان کے دولڑکے میرے ہم مدرسہ، ایک لڑکی رضیہ شیرانی میری دوست اور رضیہ شیرانی کی چھوٹی بہن عذرا شیرانی میری شاگرد تھیں۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ''دیانتدارانہ تحریر'' کی فضا تشکیل دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔ بہرحال محترم ندیم صاحب کی ''فلاحی'' شخصیت منعکس ہوگئی ہے۔ ''گھڑی'' کے واقعے میں دونوں خوبصورت شخصیات کی جھلک جھلک بے نقاب ہو رہی ہے۔ احمد عقیل روبی کے مضمون ''جب وہ یاد آتے ہیں'' میں ریلوے کے پانی والے کے منہ پر جناب قاسمی کے تھپڑ کا جو تذکرہ ہے وہ چونکائے بنا نہیں رہتا..... افسانہ میرا شعبہ ہے۔ بہت سارے افسانے درج ہیں۔ کچھ پڑھے۔ رضیہ فصیح احمد صاحبہ نے اپنی پختہ کاری ''ہم خیال'' کے تحت ثابت کردی ہے۔ افسانہ بیانیے کی اساس پر استوار ہے۔ ایک خیال کو افسانہ کیا جاتا ہے، دیکھنا ہو تو جم کر پڑھیے۔ رفعت مرتضیٰ کا افسانہ ''عورت'' بڑی توقعات کے ساتھ پڑھا کیونکہ مجھے اپنا افسانہ ''عورت'' بہت پسند ہے۔ میری توقعات پوری نہ ہوسکیں، ضرور میرے پڑھنے میں کچھ کمی رہ گئی۔ ''گمراہی'' ضیابٹ کا افسانہ ''ٹین ایجرز'' کے ذوق کی چیز ہے۔ آخر ان کا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ کچھ افسانے انشائیے ہوتے ہیں۔ نگہت مرزا کا ''بدلتے موسم'' ایسا ہی لگتا ہے۔ محمد سعید شیخ کا ''حساب کتاب'' اچھا افسانہ ہے۔ عنوان اس کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔ نصرت منیر کا ''نیا آدم'' ایک ہنرمندی سے تحریر کیا ہوا کامیاب افسانہ ہے۔ اس کا عنوان مجھے بھلا نہیں لگا لیکن میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ''اچانک'' ایک ''ماسٹر کرافٹس مین'' کی تحریر ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ہم خیال کی مانند۔ طاہر نقوی نے اپنی مہارت اور بیانیے کی توانائی سے ایک ''اکہانی'' (نواسٹوری) کو کہانی بنادیا ہے اور ہاں ''ہم خیال'' اور ''اچانک'' کو افسانہ کون کہہ سکتا ہے "Suspension of disbelief" میں اتنی کامیابی دکھائی ہے، جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حقیقت لگتا ہے۔ سلمیٰ اعوان کا افسانہ ''سویتا دیدی + اروما'' بھی افسانہ کم زندگی زیادہ ہے۔ پڑھنے کے دوران آج کے پاکستانی صوبے سامنے آجاتے ہیں۔ کیا ایک بار پھر سینے کے کسی مقام سے ایک کراہ،

ایک چیخ، ایک سوال ابھرتا ہے؟ علی تنہا کا ''شکار'' اپنی افسانویت سے متاثر کرتا ہے۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''خدا کے سپرد'' اب تک کے پڑھے ہوئے افسانوں میں سب سے زیادہ کامیاب اور دلدوز افسانہ ہے۔ یہ خط بے حد طویل ہو گیا ہے۔ افسانے کے شعبے میں چھ افسانے باقی رہتے ہیں۔ اس شعبے کے آخری افسانے ''دستک'' کو پڑھا۔ نیر حیات قاسمی نے زبان و بیان پر اپنی قدرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ''ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ راستے میں پڑی ہوئی کرسی سے اسے ٹھوکر لگی مگر پھر سنبھل کر میری میز کی جانب بڑھا اور وہاں موجود میری ڈائری کے اوراق کو الٹ پلٹ دیا۔ بوسیدہ یادیں زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکیں اور چند لمحوں میں ڈائری کے تمام اوراق ہوا کے اسی جھونکے پر سوار کھڑکی کے راستے باہر دھند میں گم ہو گئے۔'' آپ نے دیکھا افسانہ کسی گوشت پوست سے بنے زندہ، توانا اور فعال کردار میں پرسانیفائی (Personify) ہو گیا ہے اور آپ نے زبان و بیان کا کمال ملاحظہ فرمایا۔

معذرت خواہ ہوں۔ لکھتے رقعہ، یہ لکھ گئے دفتر۔ سالنامے کی اشاعت پر بہت بہت بدھائی۔

(شہناز خانم عابدی۔ کینیڈا)

☆...... ''فنون'' کا تازہ شمارہ ایک مکمل شمارہ ہے۔ خوشی ہوئی کہ بعض پرانے احباب بھی لوٹ آئے ہیں اور کچھ نئے بھی اپنا رنگ جما رہے ہیں۔ ناہید قاسمی نے احمد ندیم قاسمی کی بعض نظموں کو نہایت عمدگی سے پینٹ کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے ذکر سے فنون کا لطف فزوں ہو جاتا ہے۔

محمد ارشاد، خالد ندیم اور عامر سہیل نے اقبال کے افکار کی گرہیں کھولی ہیں۔ اقبال ایسا موضوع ہے جو فرد کے حوالے سے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ رفعت مرتضٰی، ضیاء بٹ، محمد سعید شیخ اور نیلم احمد بشیر کے افسانے بہت پسند آئے۔ یہ ہمیشہ ہی متاثر کرتے ہیں۔ محمد کاظم اور محمد خالد اختر کی تحریریں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ مظہر محمود شیرانی اور احمد عقیل روبی کے مضامین نہایت پرتاثیر تھے۔

نعمان منظور کی ''ایک تھا بادشاہ'' کا اپنا ہی ایک انداز ہے۔ پچھلے دنوں ان کی یہ کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے احمد ندیم قاسمی سے اپنی بے پایاں محبت کا حق ادا کیا ہے۔ غزلوں اور نظموں کا شعبہ خاصا جاندار ہے۔ اپنی اپنی جگہ ساری چیزیں اچھی لگیں۔ اختلافات و تاثرات کا گوشہ ابھی وہاں نہیں آیا جہاں ماضی میں تھا، لیکن مظہر محمود شیرانی، آصف ثاقب اور مشکور حسین یاد کے خطوط میں گئے دنوں کی خاصی جھلکیاں جھلک رہی ہیں۔ نفیسہ قاسمی سرورق کی بہت خوبصورت ڈیزائننگ کرتی ہیں۔ نیر حیات قاسمی بھی نثر و نظم میں چھب دکھلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے۔

(ہارون الرشید۔ بالاکوٹ، ہزارہ)

☆......آپ کی محنت کا ثمر ''فنون'' عطا ہوا۔ جب بھی پرچہ آتا ہے قاسمی صاحب قبلہ کا چہرۂ انوار آنکھوں میں آ جاتا ہے۔ دراصل ''فنون'' ان کی یادوں کا ایک البم ہی تو ہے۔ ایک ایسا البم جسے وقت کی گرد سے آپ نے محفوظ کر لیا۔
(ڈاکٹر مسرور احمد زئی۔ حیدر آباد)

☆......''فنون'' کو محترم احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنی زندگی میں بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ ''فنون'' میں شامل اشاعت ہونے والا ادب، کہ اُس کی طباعت اور معیار اور سب سے بڑھ کر بطور مدیر جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم کا نام فنون کے معیار اور اعتبار دونوں کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ قاسمی صاحب کی رحلت کے بعد کچھ عرصہ اتار چڑھاؤ بالکل فطری تھا۔ اتنی قد آور شخصیت کے اچانک چلے جانے سے دنیائے ادب میں بہت وسیع خلا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ خلا تو کبھی پُر نہ ہو سکے گا مگر جہاں تک فنون کا تعلق ہے، میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ دونوں نے انتھک محنت اور جانفشانی سے اس موقر جریدے کو بڑی حد تک اس کا کھویا ہوا مقام لوٹا دیا ہے۔ اس ضمن میں یقیناً قاسمی صاحب کی شفقت اور تربیت نے آپ کی رہنمائی کی ہوگی۔ امید ہے آپ اس انہماک اور انتھک محنت سے ادب و فن کی خدمت جاری رکھیں گے۔

(عزیز اعجاز۔ پشاور)

☆......تاریخ ساز رسالہ ''فنون'' کا خاص شمارہ سالنامہ ملا، مطالعے کے بعد احساس ہوا کہ 'معیاری' پرچہ کس طرح ترتیب دیا جاتا ہے۔ علمی و ادبی پس منظر، وابستگی، جستجو اور اخلاص سے ایسے ہی ضخیم اور مستند رسالہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔

''یادداشتیں'' میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی صاحب کی تحریر ''سانجھ بھئی چودیس'' میں محبت و عقیدت اور رشتوں کے تقدس کے چراغ روشن ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے احمد ندیم قاسمی صاحب مرحوم کو اپنا ہمدرد اور راہنما اور علم و ادب کا حقیقی پاس دار اور دوستوں کا سچا غمگسار کے روپ میں پیش کیا ہے اور یہ حقیقت ان کی تحریر کی سادگی اور معصومیت سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے بڑے واقعات کو مختصراً بیان کر کے قاسمی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے جس میں انسیت، ایثار اور خیر سگالی کے جذبات پوشیدہ ہیں۔ احمد عقیل روبی نے قاسمی صاحب سے اپنی طویل رفاقت کا ذکر بڑی محبت اور فخر سے کیا ہے۔ نعمان منظور کا ''ایک تھا بادشاہ'' دلچسپ اور منفرد ہے۔ ایک ساتھ پڑھنے سے تاثر مزید بامعنی اور گہرا ہوگا۔

''سچے گیت کی گونج'' جس کا اردو ترجمہ و تلخیص شبنم شکیل صاحبہ نے موسیقی کی فنی باریکیوں کے ساتھ کیا ہے۔ تحریر اتنی دلچسپ اور مضبوط ہے کہ ''طبع زاد'' کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا صرف ترجمہ ہونا چاہیے۔ تلخیص نہیں، اسے تفصیل سے بھی بڑی دلچسپی

اور توجہ سے پڑھا جائے گا کیونکہ اردو میں فنِ موسیقی (موسیقاروں، گلوکاروں) کے حوالے سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ محترمہ شبنم شکیل صاحبہ نے کمال کیا ہے۔

پُر مغز مضمون "افلاطون ـــــ پہلے شہرِ خیال کا نقش گر" میں ظفر سپل صاحب نے تعارف کے بعد نظریات و مکالمات اور پھر نظریہ علم، نظریہ امثال، نظریہ اخلاق، نظریہ بقائے روح وغیرہ سے معنی خیز بحث کی ہے۔ ایک مشکل موضوع کو آسان بنا کر پیش کرنا سپل صاحب کی تحریر سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب کا اردو افسانے کی تحقیق اور ترجمے کے حوالے سے بہت اہم کام ہے۔ "فنون" میں شامل تفصیلی مضمون "اردو میں ترجمے کی روایت" نے پرچے کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ ابتداء، انیسویں اور بیسویں صدی کی اہم تحریروں کے تراجم اور مترجم، ترجمے کے حوالے سے علمی و ادبی نازک مسائل اور نقائص، تراجم کے ذریعے زبان و ادب کی ترقی و پھیلاؤ کو مستند حوالوں سے اس روانی و سادگی سے بیان کیا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے والی مثال صادق آتی ہے۔ بظاہر طویل مضمون ہے مگر موضوع جتنا اہم اور وسیع ہے، اس لحاظ سے ڈاکٹر صاحب نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔

پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کے سولہ منفرد افسانے تازہ شمارے میں شامل ہیں۔ آپ نے افسانوں کے انتخاب میں محنت سے کام لیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کا افسانہ "ہم خیال" میں اپنے باطن میں چھپی مشرقیت اور اس سے وابستہ محبتیں، قربتیں اور اپنائیت کو اپنے خاص انداز سے تحریر کیا ہے۔ ضیا بٹ کی کہانی تو پرانی ہے لیکن اسے میں نے ہمارے ملک کے سیاسی نظام اور سیاستدانوں کے اندازِ زندگی کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک پرانا لطیفہ بھی اپنے نام کر لیا۔ "یہاں کوئی برأت وغیرہ نہیں۔ یہاں تو مرحوم کا چالیسواں ہے۔" (ص ۱۷۰)

محمد سعید شیخ کا افسانہ "حساب کتاب" اپنے موضوع پر گرفت اور پلاٹ کی چستی کی بہترین مثال ہے۔ شروع سے آخر تک افسانہ قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے۔ نصرت منیر نے اپنے افسانے میں "معمولی" کو "غیر معمولی" بنا دیا۔ یقیناً یہ ان کی تحریر کا کمال اور مشاہدے کی گہرائی ہے۔ نگہت مرزا کا افسانہ "بدلتے موسم" ہمارے معاشرے کے ہر مہذب اور مشرقی روایت رکھنے والے گھر اور ہر پاکیزہ سوچ رکھنے والے حساس فرد کی کہانی ہے۔ افسانے میں بڑی خوبصورتی سے کہیں خود کلامی اور کہیں مکالموں کے ذریعے معاشرے سے مشرقی روایت کی پامالی اور مغربیت کے پھیلاؤ کو پیش کیا ہے۔ افسانے کی فضا میں "اماں" کا لفظ کھپا نہیں۔ اختتام نے ذرا مایوس کیا۔ نیر حیات قاسمی کا افسانہ "دستک" علامتی ہے جس میں باطن سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات کی تلاش کا سفر کیا گیا ہے۔ "اچانک" طاہر نقوی کا افسانہ ہمارے معاشرے میں عدم تحفظ اور خوف کی علامت کے طور پر حقیقت کا اظہار ہے۔ کیا ہم اپنے آپ سے خوفزدہ نہیں ہیں۔ نیلم احمد بشیر اور سیما پیروز مسلسل اچھے افسانہ لکھ رہی ہیں۔ یہ ایک محقق کی طرح اپنے موضوع اور اسلوب پر محنت کرتی ہیں۔ پرچے میں "خدا کے سپرد" اور "اور کنارا چھوٹ گیا" صادق جذبوں میں ڈوبی ہوئی ایسی کہانیاں ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

طاہرہ اقبال، ایک منفرد اور مضبوط افسانہ نگار اور ناولٹ نگار ہیں۔ اپنے موضوع پر خاصی محنت کرتی ہیں۔ جنوبی پنجاب کے دیہاتوں کے کرداروں اور زبان کو مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ناولٹ ''گراں'' (پہلی قسط) میں بھی موضوع کے اعتبار سے اسلوب، پلاٹ کی چستی اور زبان اور مکالموں پر گرفت سے طاہرہ اقبال نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ''فن اور فنکار'' میں چار مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی کا عابد وودود کی شاعری پر خوب صورت تجزیاتی مضمون ہے۔ مضمون میں ان کے فن کا گہرائی اور باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ عابد وودود برسوں سے حرف وقلم سے مضبوط رشتے کے ساتھ پردیس میں آباد ہیں۔ خوش فکر شاعر ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی ہمارے عہد کے زبردست غزل شناس، نقاد ہیں اور ایک شعری مجموعے کے خالق ہیں۔ دیگر مضامین کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔

غزل اور نظم کے انتخاب میں تو آپ نے کمال کر دیا ہے۔ مشکور حسین یاد کی دونوں غزلیں اسلوب کے منفرد ہونے کی دلیل ہیں۔

یاد ہمیں کرتا ہے کون ۔۔۔ یاد کسے ہم، آئے کون

حلیم قریشی کی غزل میں جدت طرازی کا انداز نرالا ہے۔

ہوں غزل کی چنائی میں مصروف ۔۔۔ لفظ اینٹیں ہیں اور میں مزدور

شبنم شکیل صاحبہ کی غزل میں نسوانیت کا بھرپور مزاج عہد حاضر کے تقاضوں اور جزئیات کے حسن کے ساتھ موجزن ہے۔ ناسٹلجیا کی کیفیت بھی مزا دے رہی ہے۔

یاد آتا ہے بہت ایک پرانا آنگن ۔۔۔ جس میں پیپل کا گھنا پیڑ ہوا کرتا تھا

بازارِ مصر تو نہیں بازی ہے عشق کی ۔۔۔ بالکل الگ تھلگ ہی یہاں کا حساب ہے

حسن عباسی کی غزل معاشرتی حالات کی بولتی ہوئی تصویر دکھائی دے رہی ہے۔

قصور اپنا یہی تھا کہ بے قصور تھے ہم ۔۔۔ سو دن دیہاڑے کسی رہ گزر میں مارے گئے

شہزاد نیر نے ''صاحب'' کی ردیف کی غزل میں، سادگی سے اپنی بات منوائی ہے۔ رستم نامی کی غزل خصوصاً مطلع ہمارے سیاسی نظام اور عدم تحفظ کا آئینہ ہے۔

تمہاری جی حضوری کر رہے ہیں ۔۔۔ کہ ہم میعاد پوری کر رہے ہیں

بہزاد برہم کی غزل میں حالات پر ''برہمی'' ہے۔ خود کلامی اور باطن سے اٹھنے والے سوالات ہیں، اس لیے کڑواہٹ آ گئی ہے۔ شہاب صفدر اچھی غزل کے لیے ''بے سکونی اور جنونی'' کیفیت لازمی ہے۔

بہت دنوں سے طبیعت میں بے سکونی سی ہے ۔۔۔ سو گھر میں بھی مری حالت کسی جنونی سی ہے

امجد اسلام امجد، جلیل عالی، نجیب احمد، سلطان سکون، اشرف جاوید، عابد ودود، جان کاشمیری، ہارون رشید، شوکت مہدی، رانا ذکا اللہ، عامر سہیل کی غزل ہمارے عہد کی ایسی غزل ہے جس سے غزل کا اعتبار قائم ہے۔ جو روایت سے جڑی ہوئی ہے اور جدید تقاضے بھی پورے کر رہی ہے۔

پچیس صفحات پر مشتمل نظموں کا گلدستہ مہک رہا ہے۔ موضوعات کا تنوع انہیں انفرادیت عطا کر رہا ہے۔ آصف ثاقب، آفتاب اقبال شمیم، گلزار، صفدر صدیق رضی، احمد عقیل روبی، طالب انصاری، احمد حسین مجاہد، رستم نامی، شباب صفدر، عنبرین صلاح الدین اور نیر حیات قاسمی کی نظمیں دلکش بھی ہیں اور فکر انگیز بھی۔ اسلوب کی سادگی بھی ہے اور روانی بھی۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کی نظمیں اور غزلیں تبرکاً شامل ہیں جو کہ ایک بہت اچھا عمل ہے۔ ہر شمارے میں ایک افسانہ اور کالم بھی ہونا چاہیے بلکہ ہر شمارے میں قاسمی صاحب کے لیے ایک گوشہ مخصوص کیجیے، چاہے صفحات کم رکھے جائیں۔ اس سے ان کی شخصیت اور فن پر نئے مضامین سامنے آئیں گے۔ ''فنون'' میں ایک اعلان یہ بھی کیا جائے کہ قاسمی صاحب نے جن اہل علم و فن کی کتابوں (نظم و نثر) پر فلیپ لکھے ہیں، وہ کتاب کے کوائف کے ساتھ فلیپ کی فوٹو کاپی ارسال کریں، وہ تبصرہ فنون میں شائع کیے جائیں۔ اس طرح وہ رشحات بھی محفوظ ہو جائیں گی۔

(نوید سروش۔ میرپور خاص، سندھ)

☆...... ''فنون'' کا شمارہ ۱۳۱ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ پرچہ اپنی روایت کے مطابق معیاری ہے اور سرورق تو رنگوں کے امتزاج کے باعث آنکھوں میں کھب جاتا ہے۔ البتہ پرچے کی پروف ریڈنگ محل نظر ہے۔ کوشش کیجیے کہ اس پہلو پر زیادہ توجہ دی جائے۔ آج کل ادبی پرچہ شائع کرنا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو ہمت اور توفیق ارزانی کرے کہ آپ یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

(ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی۔ شیخوپورہ)

☆...... ''فنون'' شمارہ ۱۳۱ میں میرے مضمون ''اردو میں ترجمے کی روایت'' میں غالباً میرے ہی قلم سے جانے کیسے بائبل کو پہلی بار بہ زبانِ انگریزی ترجمہ کرنے والے ولیم ٹنڈیل (William Tindill) پیدائش: ۱۴۹۲ء نزد ڈور سلے، گلوکیسٹر شائر، موت: ۶ ۱۵۳۶ء بہ مقام قلعہ ولوورڈ نزد برسلز کی گرفتاری کا سال ۱۹۲۵ء اور پھانسی پا کر آگ میں جھونک دیئے جانے کا سال ۱۹۳۶ء درج ہو گیا جبکہ وہ ۱۵۳۵ء میں گرفتار ہوا اور اسے سال بھر ولوورڈ کے قلعہ نزد برسلز میں قید رکھا گیا۔ اس پر انگریزی ترجمہ

کی صورت بائبل کے تقدس کو مجروح کرنے سے متعلق مقدمہ چلا۔ ۱۵۳۶ء میں اسے پھانسی دینے کے بعد جلا دیا گیا۔ براہِ کرم ''اختلافات وتاثرات'' کے گوشہ میں میری یہ سطور شائع فرما کر قارئین کو الجھن سے بچالیں۔

(ڈاکٹر مرزا حامد بیگ۔ لاہور)

☆......آپ نے اس ادبی رسالے کا وہی معیار برقرار رکھا ہے جو احمد ندیم قاسمی مرحوم کے دور میں رہا۔ یہ اتنا آسان نہ تھا مگر آپ نے سمجھوتہ نہیں کیا۔ البتہ اس کے لکھنے والوں نے بھی آپ کا ساتھ دیا۔

(طاہر نقوی۔ کراچی)

☆......مجھے اس امر کی بے پایاں مسرت میسر آئی ہے کہ آپ نے بڑے باپ کے بڑے ادبی ورثہ کو تابندہ کیا ہے جس پر میرے علمی وادبی آقا کی روح کو بے حساب طمانیت نصیب ہوئی ہوگی۔ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے نقوش، اوراق، ادبی دنیا اور سیپ تہ وبار چلے گئے۔ آپ کی ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خداوند کریم شہرِ علم کے صدقے آپ کی توفیق بڑھائے۔

(صفدر سلیم سیال۔ جھنگ)

☆......جہاں ''فنون'' کے دوبارہ اشاعتی تسلسل کا سلسلہ ہمارے عہد کا ایک ادبی اعزاز ہے وہاں اس ادبی حقیقت سے بھی صرفِ نظر ممکن نہیں کہ ''میر کارواں'' جناب احمد ندیم قاسمی کے بچھڑنے کا ملال اور ان کی جدائی سے پیدا ہونے والے خلا کی کمی ہمیں اداس کرتی رہے گی۔ ''فنون'' میں شامل جملہ شعری ونثری تخلیقات اپنے معیار وپیشکش کے اعتبار سے لائقِ توجہ ہیں۔ پرچے کی ہر لحاظ سے عمدہ اشاعتی پیش کاری کے حوالے سے آپ کی اور دیگر ''وابستگانِ فنون'' کی محبت اور محنت قابلِ داد ہے۔

(ڈاکٹر نثار ترابی۔ راولپنڈی)

☆......فنون کا سالنامہ ۲۰۱۱ء پیش نظر ہے۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم جتنے بڑے شاعر، ادیب، صحافی اور منتظم تھے، اس سے کہیں بڑے آدمی! مشرقی روایات کے امین اور سچے اور پکے پاکستانی۔ سب جانتے ہیں کہ ادباء اور شعراء میں بالعموم اور سیکولر سوشلسٹ مزاج رکھنے والوں میں بالخصوص یہ صفات معدوم ہیں۔ کتنی بڑی بات ہے اور ندیم صاحب کے حوالے سے اس عظمت کی قدر کی جانی چاہیے۔ ''فنون'' میں چھپنے والے اقبالی مضامین کے حوالے سے میرا تاثر یہی ہے اور یقیناً بالعموم اقبال

اور شارحین کا رویہ بھی یہی رہا ہے کہ وہ اقبال کے فکر کی بوقلمونی میں گم ہو جاتے ہیں۔ آخری منزل کی کامل نشاندہی سے گریزاں اور صد افسوس کہ اقبال کے حوالے سے ساری باتیں دین اور قرآن ہی کا حوالہ ہیں مگر شارحین کی اکثریت کثیرہ خود قرآن سے نابلد! بات بہت تلخ ہے مگر حقیقت یہی ہے اور ہم اقبال بطور ایک قومی و ملی رہنما کی قدر افزائی میں آپ کے قرآنی فکر سے انحراف کی انگشت نمائی سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ علی عباس جلالپوری نے بہت سی باتوں کی نشاندہی درست انداز میں کی ہے مگر ان کا اعتزال ہر گزری منزل پر ڈگمگا جاتا ہے۔ جس زاویئے سے تحقیق کی نشاندہی کی جارہی ہے، اُس پر نہایت عمیق تدبر و تفکر کی ضرورت ہے۔

(صلاح الدین ایوبی۔ لاہور)

☆...... رسالہ ہر لحاظ سے عمدہ اور آپ کی محنتوں کا ثبوت ہے۔ ''فنون'' ملتے ہی حسب سابق دل میں وہی مسرت کا احساس جاگا جو ہمیشہ ''فنون'' سامنے آنے سے جاگزیں ہوتا ہے۔ سرورق دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ آپ کے اداریئے متوازن، صحت منداور سماجی، ثقافتی و ادبی شعور سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اشرف جاوید، معصومہ شیرازی، اوصاف شیخ کی حمد و نعت نے ایمان کو منور کیا۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی کے ''وطن کی کہانی ندیم نظموں کی زبانی'' اور جلیل عالی کے ''ندیم کا شعری خصوص'' دونوں مضامین نے ندیم صاحب کی مزید کئی شعری جہات سے روشناس کرایا، مضامین لاجواب اور باکمال ہیں۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ''اردو میں ترجے کی روایت'' اور ظفر سپل کا ''افلاطون پہلے شہرِ خیال کا نقش گر'' مطالعہ کے لیے خاص مضامین ہیں جو معلومات کے ساتھ غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ نئے شمارہ میں ایوب خاور، حسن عباسی، عامر سہیل کی نظمیں پسند آئیں مگر گلزار صاحب کی نظموں کا اپنا ہی ذائقہ ہوتا ہے۔ ان کی نظموں پہ ان کا نام نہ بھی لکھا ہو، بتا دیتی ہیں ان کا نام۔ افسانوں میں رضیہ فصیح احمد، نگہت مرزا اور ڈاکٹر نگہت نسیم کے افسانے اپنے اسلوب اور تکنیک کی وجہ سے پسند آئے۔ نیلم احمد بشیر کے افسانہ نے تادیر اپنے زیر اثر رکھا۔ شمارہ میں فرحت پروین کے افسانے کی کمی محسوس ہوئی۔ جلیل عالی، نجیب احمد، نصیر احمد ناصر، صفدر ہمدانی، شہاب صفدر اور احمد فقیہہ کی غزلوں سے دل و دماغ معطر ہوئے۔

(انیل چوہان۔ دریاخان، بھکر)

☆...... ماشاء اللہ، کیا پر شکوہ شمارہ ہے یہ سالنامہ۔ دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ لفظ پرشکوہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ رسالہ دیکھ کر یہی پہلا لفظ میرے ذہن میں آیا تھا۔ آپ کی محنت اور قلم کاروں کی خوبصورت تحریروں نے اسے جو زینت بخشی ہے،

اس کا سرورق بھی اس کے عین مطابق ہے۔

اس شمارے میں موجود تمام نثری تحریریں کمال کی ہیں۔ ان کو فنی اعتبار سے تو اہل علم ہی پرکھیں گے میں تو ان میں موجود علمی مباحث اور علمی خزانوں پر تمام اہل قلم دانشوروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اسلامی تاریخ میں موجود جو گنی چنی چیزیں یا واقعات مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں باعث نزاع ہیں۔ انہیں ہم کھینچ تان کر اپنی تحریروں میں کیوں بیان کرتے ہیں، آخر اس کا مقصد کیا ہے جبکہ ان کے ذکر کے بغیر بھی تحریر مکمل کی جاسکتی ہو۔

(اطہر جعفری۔ راولپنڈی)

☆...... اس شمارے نے بتا دیا ہے کہ ''فنون'' اپنی شانِ رفتہ کو برقرار رکھنے کی نہ صرف یہ کہ صلاحیت رکھتا ہے بلکہ اپنی مسلسل جدوجہد اور لگن سے اس میں مزید نکھار لانے کا سودا بھی اپنے سر میں رکھتا ہے اور یہ کارِ جنوں اہل جنون ہی کا شیوہ ہے۔

(سرفراز زاہد۔ اسلام آباد)

☆...... سہ ماہی ''فنون'' کے خاص شمارہ ۱۳۱ (سالنامہ) میں آپ نے نعمان منظور کا مضمون شائع کیا ہے۔ اس مضمون میں صفحہ ۳۰۳ اور ۳۰۴ پر نجیب احمد صاحب کے حوالے سے میرے بارے میں (میرا پورا نام لیے بغیر) چند جملے شائع کیے گئے ہیں، جن کا میرے نزدیک حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

نجیب احمد صاحب ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت نفیس اور وضع دار انسان بھی ہیں۔ مجھے اب بھی اُن سے دوستی پر فخر اور مان ہے...... دراصل روزنامہ جنگ میں محترم احمد ندیم قاسمی کا انٹرویو شائع ہوا، جو میں نے کیا تھا اور نجیب صاحب کا موقف یہ تھا کہ مجھے اس قسم کے سوال نہیں کرنا چاہیے تھے۔ میرا جواب تھا کہ میں صحافی ہوں، کوئی بھی سوال کر سکتا ہوں۔ ندیم صاحب نے میرے ان سوالوں کا برا نہیں مانا بلکہ جواب بھی دیئے۔

(تنویر ظہور۔ لاہور)

☆...... شمارہ ۱۳۱ جستہ جستہ پڑھ سکا ہوں۔ نثر اور نظم دونوں تحریریں عمدہ ہیں اور یوں لگا جیسے جناب قاسمی صاحب بذاتِ خود اس پرچہ کی اشاعت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہی انداز، وہی ترتیب اور اُسی طرح کا سرورق...... یہ تمام پیمانے اُن کی یاد فوراً تازہ کر دیتے ہیں۔ اس اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر ناہید قاسمی نے جناب قاسمی صاحب کی وطن سے محبت سے متعلق عمدہ تحریر زیبِ شمارہ کی ہے۔ وطن سے محبت تو

جناب قاسمی کی زندگی کا اہم پہلو تھی۔ اس انداز کے ان کے اشعار کو شامل تحریر کر کے ڈاکٹر صاحب نے جہاں اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہیں پر جناب قاسمی کی اس عظمت کا پتہ بھی تمام قارئین کو بتایا ہے۔ جناب قاسمی کے شخصی خاکوں میں ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، جناب احمد عقیل روبی اور نعمان منظور صاحب کی تحریریں عمدہ ہیں اور ان کے دلی جذبات کا مظہر ہیں۔

''اختلافات و تاثرات'' کا حصہ اس قدر Rich نہیں جیسے پہلے ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو اس ضمن میں مکاتیب پورے مقالات کی صورت میں ہوا کرتے تھے۔ امید ہے آہستہ آہستہ وہی رنگ اس ذیل میں بھی دوبارہ پیدا ہو جائے گا۔

(زید اللہ فہیم۔ میر پور آزاد کشمیر)

☆...... احمد ندیم قاسمی صاحب کی رحلت کی خبر سنتے ہی مجھے یاد ہے کہ پہلا خیال جو ذہن میں آیا وہ تھا ''لاہور غریب ہو گیا'' مگر پھر کچھ دیر فنون کی خاموشی کے بعد کے منظر نامے نے ایک بار پھر قاسمی صاحب کی ہی یاد دلا دی:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

ناہید قاسمی اور نیر حیات قاسمی نے جس طرح فنون کے معیار کو قائم رکھا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے راستے پر کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں، بہت اچھا لگ رہا ہے اور اطمینان کا باعث بھی ہے۔ نیر حیات قاسمی سے میری بات جب بھی ہوئی کچھ ایسا احساس ہوا جیسے قاسمی صاحب جاتے جاتے کچھ اپنا آپ اُن کو دے گئے ہوں۔ بہت کچھ باتیں، عادتیں ایک سی ہیں۔

مجھ تک فنون کے تین شمارے پہنچ سکے اور ہر ایک کو ایک سے بڑھ کر پایا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ اگر فنون کی اشاعت کو کسی نے جاری رکھنا چاہا بھی تو اس کا اسٹینڈرڈ قائم رکھنا شاید نہیں ہو سکے گا مگر ہوا یہ کہ آن بان بھی قائم ہے اور مزید نکھار بھی آ رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ جس طرح قاسمی صاحب نئے لکھنے والوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیتے تھے، اب بھی اسی پر عمل ہو رہا ہے۔

حرف ثانی میں جس طرح اعتماد کے ساتھ نیر حیات قاسمی نے تمام اہم پوائنٹس کو رفتہ رفتہ، درجہ بہ درجہ آگے بڑھایا ہے بہت معتبر ہے۔ ہماری نوجوان، تعلیم یافتہ باشعور نسل!!

فنون ۱۳۱ میں مضامین، نظمیں، غزلیں، افسانے سبھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ ظفر سپل کا ''شہر خیال کا نقش گر'' دلچسپ ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ تاریخ، انفرمیشن، لکھنے کا انداز، دھیان بھٹکنے نہیں دیتے۔ عمدہ!

نظمیں، غزلیں سبھی اچھی سبھی معتبر، احمد فقیہہ کی نظم ''مجھے دیکھنے کی ہے چاہ اگر'' ایک بولتی تصویر کی طرح ہے اور بہت سے پرانے ناموں کو دیکھ کر خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔

پڑھنے کے لیے بہت کچھ ہے، ان پر کچھ کہنے کے لیے بہت کچھ ہے مگر میں فنون کے مدیران کو ایک اور کامیاب کاوش پر مبارکباد پر بات مختصر کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اسی آن بان کے ساتھ جاری رہے۔

(رفعت مرتضیٰ۔فلوریڈا)

☆...... مدت بعد ایک بھرپور رسالہ پڑھ کر لطف آ گیا۔ نہ کچھ غیر ضروری طور پر زائد تھا نہ کچھ بہت کم تھا۔ ایک اعتدال، ایک توازن۔ فہرست سے لے کر آخری صفحے تک۔ نوجوان مدیر کا ''حرف ثانی'' جنریشن گیپ کو کامیابی سے فل کرتا اور سب کو ساتھ لے کر آگے جانے کی کوشش کرتا محسوس ہوا۔ حمد و نعت حسب معمول عقیدت و محبت سے سرشار۔ احوال وطن اور ندیم لازم و ملزوم۔ صد شکر کہ آپ نے عالم و مفکر محمد ارشاد صاحب سے رابطہ کیا۔ اب آئندہ ہمیں اُن سے توقع ہے کہ نئے عالمی تناظر کے تحت فکری و نظری تبدیلیوں کے بارے میں ہماری راہنمائی بھی فرمائیں گے۔ بہت تجسس اور اشتیاق ہے کہ پروفیسر عامر سہیل اقبال کے فکری نظام کا اب کونسا پہلو ڈسکس کریں گے۔ ڈاکٹر خالد ندیم محنتی محقق لگے۔ اللہ کرے زورِ تحقیق اور زیادہ۔ آپ نے اس شمارے میں شامل ۱۶، ۱۷ امضامین کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر کے اچھا ہی کیا۔ ورنہ میرے خیال میں ایک ساتھ اتنے مضامین کا وزن عام قاری شاید اُٹھا نہ پاتا۔ ویسے انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر طرح کے یہ ''مضامین'' سبھی کے سبھی معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ مجھے خاص طور پر ظفر سپل کا افلاطون پر مضمون، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کا ''سانجھ بھئی چودیس''، شبنم شکیل کا ''سچے گیت کی گونج'' اور محمد خالد اختر کا ''چند پاکستانی پرندے'' بے انتہا پسند آئے۔ افسانوں کا تو کیا ہی کہیے۔ ہر طرح کا رائج رنگ، ہر طرح کا پسند آنے والا انداز اور سونے پر سہاگہ کہ بہت کچھ نیا نیا بھی۔ واہ سبحان اللہ! اور طاہرہ اقبال کا ناولٹ مجھے انوکھی نئی دنیا دکھا رہا ہے۔ پہلی قسط ختم ہوئی تو میں بڑی مشکل سے اُس نگراں سے نکل کر اپنے شہر، اپنے گھر آ پایا۔

اب آئی شاعری کی باری۔ یہ میری فیورٹ صنفِ ادب ہے اور ندیم میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی سچائی، سوچ اور تاثیر مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ میرے نزدیک نظموں میں آفتاب اقبال شمیم جیسی خوبصورت نظم کوئی نہیں کہتا۔ کیونکہ ''اسے پڑھنے سے دل کا بوجھ گھٹ جاتا ہے/ یہ نسخہ وفا کا/ زندگی کے خوبصورت خواب کو/ مرنے نہیں دیتا!''...... حلیم قریشی نے فراز کو اور صفدر صدیق رضی نے ندیم کو دل سے یاد کیا ہے۔ گلزار کے لاجواب، انتہائی منفرد اسٹائل کی تعریف میں بہت کچھ کہنا بھی کم پڑ جائے گا۔ جیتے رہیے گلزار اور خوبصورت فن پارے تخلیق کرتے رہیے۔ شوکت مہدی، اقتدار جاوید، عامر سہیل اپنی الگ پہچان منوانے کی کوششوں میں خاصے کامیاب رہے ہیں، جبکہ نسل تازہ میں سے حسن عباسی اور زاہد نبی تیز تیز چلتے اُن کی صف کی طرف بڑھتے آ رہے ہیں۔ عنبریں، سلمیٰ اور غیر بھی اچھے جا رہے ہیں...... اور غزل...... سردیوں میں دھوپ سی ہے، گرمیوں میں چھاؤں سی، آندھیوں میں چراغ سی اور برساتوں میں دوست سی غزل...... چند اشعار دہرانے کی اجازت دیجیے:

۔ ہم نے جنت کے عوض، خلوتِ دنیا پائی — آسمانوں سے فرشتے، ہمیں جھانکا نہ کریں (ندیم)

۔ صرف رنگت ہی نہیں پھولوں میں — ان سے نکہت کی بھی حکمت سیکھو (ندیم)

۔ کسی محفل میں کوئی شخص بہت کھل کے ہنسا — واقعہ یہ تو عجب آج یہاں پیش آیا (شبنم)

۔ آسماں جانے کہاں لے کے چلا ہے مجھ کو — اوپر اٹھتا ہے برابر میری پرواز کے ساتھ (عالی)

۔ ایک کچے مکان کی صورت — میں بھی ہوں بارشوں کے آنے تک (نجیب)

۔ جو ماں نہیں ہے تو گھر کے ہر ایک کمرے میں — نہ ڈھونڈتا ہے، نہ اب مجھ کو دیکھتا ہے کوئی (سکون)

۔ آپ نے میرا حال یوں پوچھا — مجھ کو کہنا پڑا کہ بہتر ہے (انوار فیروز)

۔ کیا منڈیر پہ روشن جو اُس نے لا کے مجھے — تو ناز اٹھانے پڑے سرپھری ہوا کے مجھے (اشرف جاوید)

۔ تمام عمر پھرا ہے وضاحتیں کرتا — اُسے بھی کچھ نہ ملا خاک میں ملا کے مجھے (اشرف جاوید)

۔ اتنا مانوس ہوا صحبتِ تنہائی سے دل — اب تیری یاد بھی لگتی ہے پرائی گھر میں (احمد فقیہہ)

۔ شب کو مہمان بننے والے، خواب — سارا دن میرے میزبان رہے (سرفراز زاہد)

۔ یہ کھنڈر، یہ ویرانے بے زباں نہیں ہوتے — ان کے پاس جائیں تو داستان سناتے ہیں (حسن عباسی)

۔ کچھ ایسا قحط پڑا ہے روئیدِ گلشن کا — کہ ایک پھول بھی، اک گلستاں سا لگتا ہے (جعفر مبارک)

۔ چھوٹی سی اک اور ضرورت جاگی مجھ میں — ایک اضافی سکہ جب خیرات میں آیا (زاہد نبی)

۔ پھول ہو کر بھی چبھ گئی مجھ کو — تیرے لہجے کی وہ انی ہوگی (نیر قاسمی)

اور آخر میں حصۂ اختلافات و تاثرات۔ وہ تو زبردست!!!

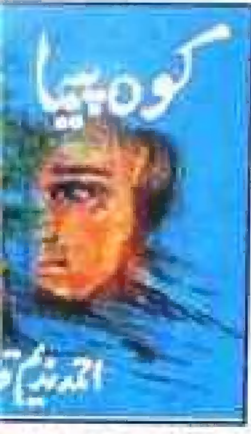
(اظفر جمیل۔ کراچی)



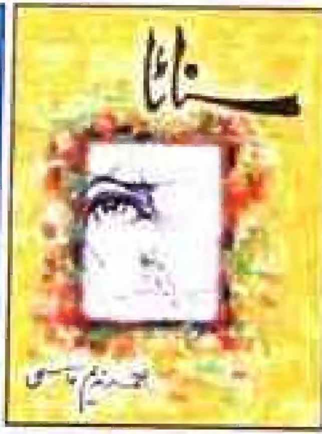


سنگ میل پبلی کیشنز

فون: (042) 37220100, 37228143 فیکس: (042) 37245101



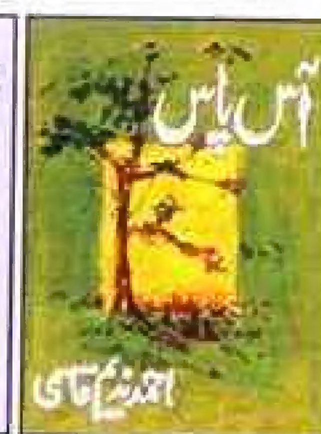
N 969-35-2055-6
Rs. 150.00



ISBN 969-35-2062-9
Rs. 300.00



ISBN 969-35-2061-0
Rs. 180.00



ISBN 969-35-2058-0
Rs. 160.00



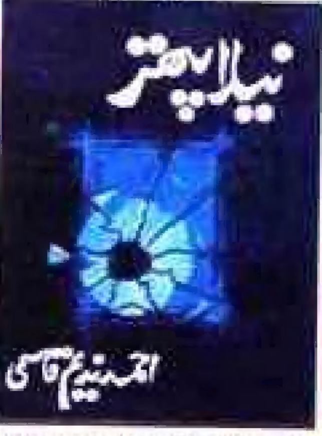
ISBN 969-35-2064-5
Rs. 180.00



ISBN 969-35-2056-4
Rs. 200.00



969-35-2088-2
Rs. 225.00



ISBN 969-35-2057-2
Rs. 150.00



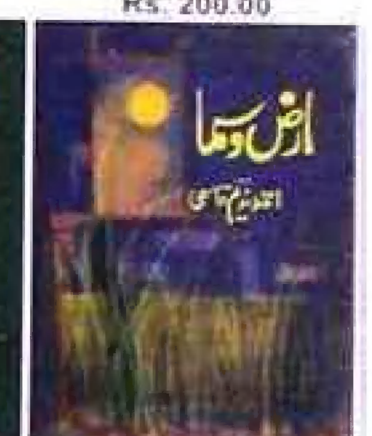
ISBN 969-35-2086-6
Rs. 300.00



ISBN 969-35-2087-4
Rs. 200.00



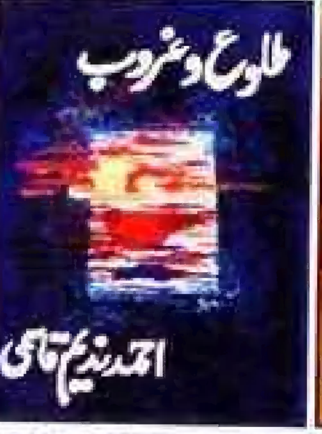
ISBN 969-35-2085-8
Rs. 180.00



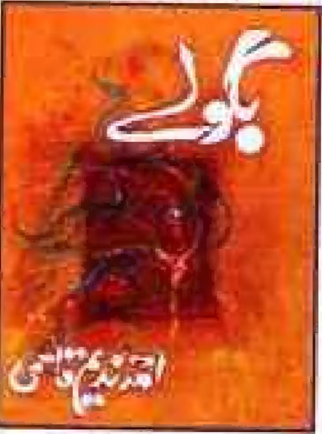
ISBN 969-35-1919-1
Rs. 175.00



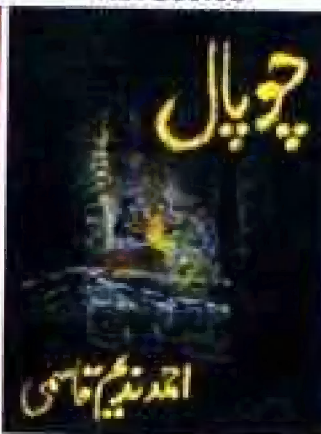
969-35-2065-3
Rs. 180.00



ISBN 969-35-2060-2
Rs. 200.00



ISBN 969-35-2063-7
Rs. 250.00



ISBN 969-35-2059-9
Rs. 180.00



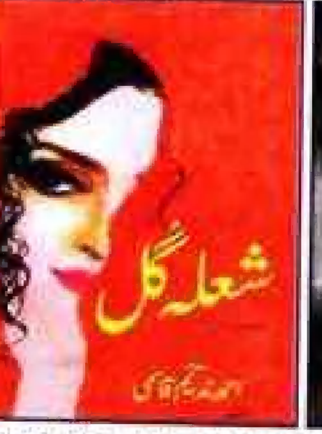
ISBN 969-35-2032-7
Rs. 350.00



ISBN 969-35-2031-9
Rs. 200.00



969-35-2321-0
Rs. 700.00



ISBN 969-35-2320-2
Rs. 450.00



ISBN 969-35-2318-0
Rs. 450.00



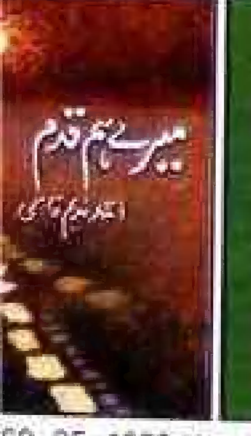
ISBN 969-35-2317-2
Rs. 450.00



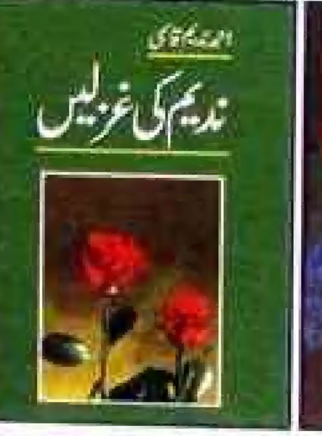
ISBN 969-35-2324-5
Rs. 350.00



ISBN 969-35-2252-4
Rs. 600.00



69-35-1923-X
Rs. 175.00



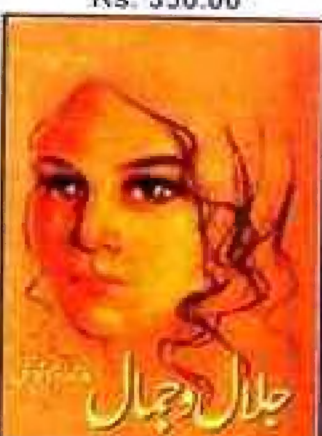
ISBN 969-35-0146-2
Rs. 750.00



ISBN 969-35-0147-X
Rs. 1200.00



ISBN 969-35-2319-9
Rs. 350.00



ISBN 969-35-2323-7
Rs. 900.00



ISBN 969-35-2322-9
Rs. 900.00



تصویر کے بائیں جانب۔ جناب احمد ندیم قاسمی، اپنے بڑے بھائی جناب پیرزادہ محمد بخش کے ساتھ۔